ابو الکلام آزادؒ

شورش کاشمیری

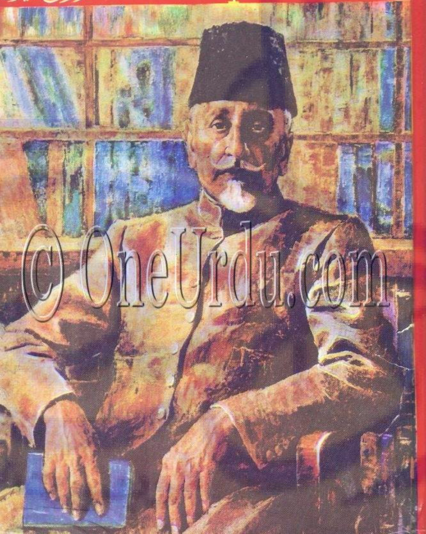

© OneUrdu.com

ابوالکلام آزادؒ

(سوانح و افکار)

شورش کاشمیری

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں۔

جون 2009ء

کتاب	:	مولانا ابوالکلام آزاد
مصنف	:	شورش کاشمیری
مطبع	:	ربال پرنٹنگ پریس، لاہور
ناشر	:	مطبوعات چٹان، لاہور
اشاعت	:	سوم
قیمت	:	-/600روپے

تقسیم کنندگان

الفیصل ناشران و تاجران کتب

غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

© OneUrdu.com

مطبوعات چٹان لاہور

۸۸۔ میکلوڈ روڈ ● لاہور

مولانا ابوالکلامؒ اور مہاتما گاندھی

برصغیر میں —— برطانوی سامراج سے حصولِ آزادی کیلئے مشاورت!

۱۹۵۵ء میں سعودی عرب کے فرمانروا شاہ سعود بھارت کے دورے پر آئے تو مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے رفقا جواہر لال نہرو، ڈاکٹر راجندر پرشاد کے ہمراہ اُن کا استقبال کیا۔

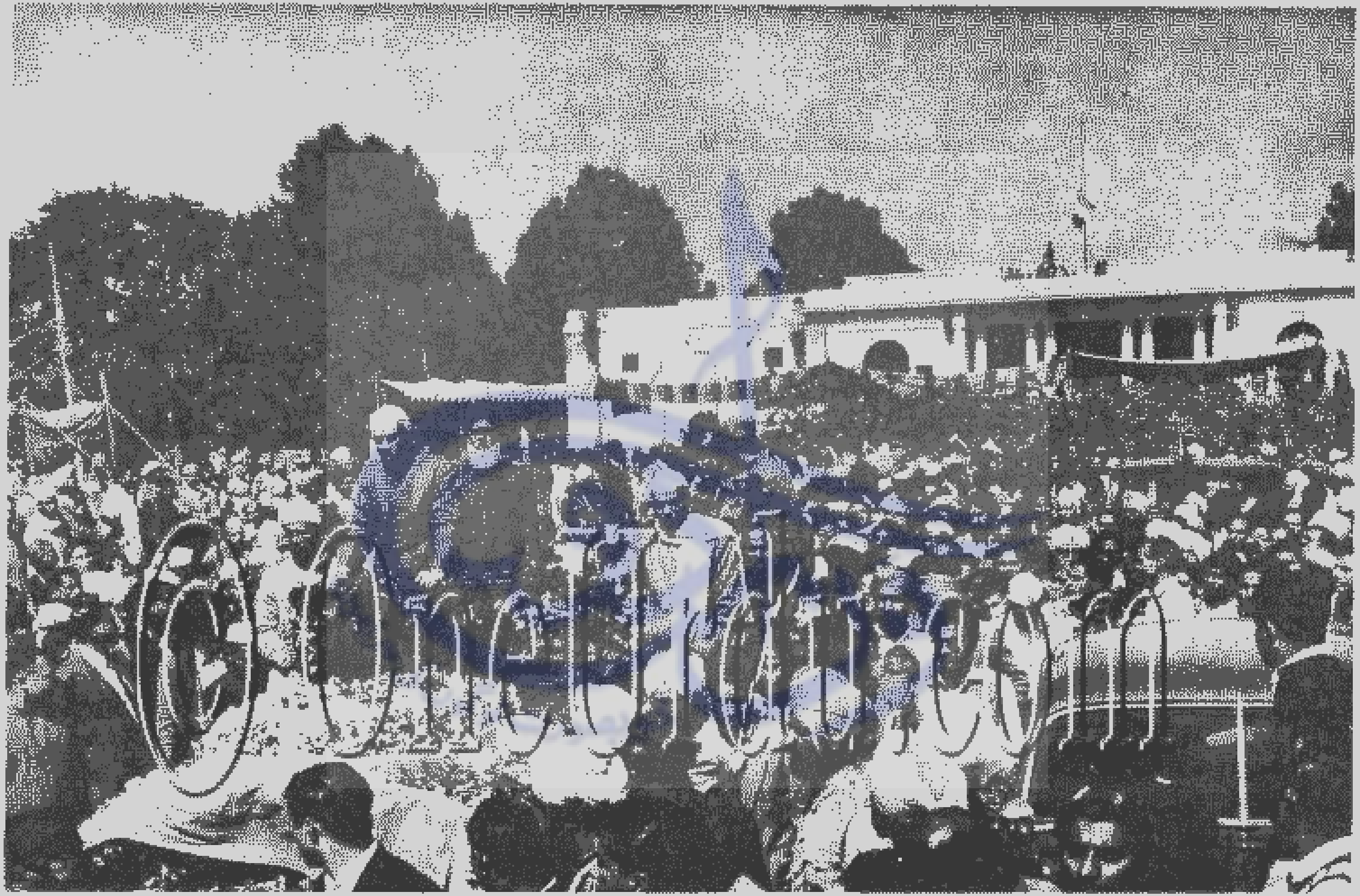

مولانا کا سفرِ آخرت ——

بھلا سکیں گے نہ اہلِ زمانہ صدیوں تک
مری وفا کے مرے فکر و فن کے افسانے

© OneUrdu.com

مولاناؒ کے اسلوب تحریر کا آستانہ میرے قلم کی سجدہ گاہ ہے

—— شورش کاشمیریؒ

© OneUrdu.com

مولانا کے عہدِ شباب کا ایک عکس ——

من شمعِ جانگدازم، تو صبحِ دلکشائی
سوزم گرت نہ بینم، میرم چو رخ نمائی

بہ ملکِ جم ندہم مصرعۂ نظیری را
کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

© OneUrdu.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خاندان

مولانا آزادؔ نے اپنے خاندان سے متعلق جو روایتیں بیان کی ہیں اور ان کے تذکرہ نگاروں نے ان کے حسب و نسب سے متعلق جو کچھ لکھا ہے۔ اس کے مطابق مولانا کا خاندان شہنشاہ بابر کے عہد میں ہرات سے ہندوستان آیا تھا۔ اہل خاندان کس حیثیت میں آئے اور کیونکر آئے اس کے متعلق کوئی روایت یا تذکرہ نہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ ہرات سے چلے تو ہندوستان کے حدود میں داخل ہونے کے بعد اولاً کہاں قیام کیا؟ ثانیاً کہاں کہاں پھرتے پھراتے اور ٹھہرتے ٹھہراتے رہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ پہلے انہوں نے آگرہ کو مسکن بنایا پھر دہلی منتقل ہو گئے۔ وہ علمی ذوق رکھنے والے لوگ تھے۔ ان میں شیخ جمال الدین معروف بہ شیخ بہلول دہلوی پہلے فرد تھے جو اکبری عہد کے مشاہیر علما اور اصحاب سلوک و طریقت کی صف اوّل میں تھے۔ انہیں شیخ محمد داؤد جہنی وال سے سلوک و طریقت میں شرف بیعت حاصل تھا اور علوم معقول و منقول میں سید رفیع الدین سلامی شیرازی سے فیضیاب ہوئے تھے۔

جب بعض علماء نے اکبر کے امامِ وقت ہونے کا محضر تیار کیا اور دارالحکومت کے تمام علما نے اس پر مہریں کیں تو شیخ بہلول دہلوی نے تصدیق و اقرار سے انکار کر دیا اور فرمایا "جس قدر ہو چکا کافی ہے ہم فقیروں اور گوشہ نشینوں کو تکلیف کیوں دی گئی ہے؟"

دوسری چیز مولانا عبداللہ سلطان پوری (شیخ الاسلام) کا حسد و عناد تھا۔ شیخ بہلول نے سید محمد جونپوری کے متعلق لکھا کہ وہ کبار اولیاء اللہ میں سے ہیں اور ان کی تکفیر و تضلیل سے متعلق علماء غلطی کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک کتاب تحریر کی کہ سید محمد جونپوری کی ولایت حق ہے لیکن

ان کے مہدی موعود ہونے کا اعتقاد باطل ہے۔ شیخ الاسلام کے ہاتھ حربہ آگیا۔ اس سے پہلے کہ شیخ الاسلام کوئی گل کھلاتا، شیخ بہلول دہلوی اپنے مریدوں اور شاگردوں کی ایک جماعت لے کر مکہ معظمہ چلے گئے۔

مرزا عزیز کوکلتاش (خان اعظم) چند برس بعد حج کو گئے وہ شیخ سے نہایت درجہ حسن اعتقاد رکھتے تھے ان کی منت سماجت کرکے اپنے ہمراہ واپس لے آئے۔ لیکن مراجعت سے چند ماہ بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ مرزا کوکلتاش نے کئی دفعہ چاہا کہ مال وجاہ دنیوی میں سے کچھ قبول کریں۔ فرمایا:

”گھر بناتے ہوئے ڈرتا ہوں کہیں دل ویران نہ ہو جائے“

اپنے خاندان سے متعلق مولانا نے تذکرہ مطبوعہ ستمبر ۱۹۱۹ء کے آغاز میں لکھا ہے کہ:

”میرے خاندان میں تین مختلف خاندان جمع ہوئے ہیں۔ تینوں علم وفضل میں ہندوستان اور حجاز کے ممتاز گھرانے اور ارشاد وہدایت کے افراد تھے۔ والدہ مدینہ منورہ کے مفتی شیخ محمد بن طاہر وتری کی بھانجی تھیں۔ وتری مکہ معظمہ کے آخری محدث تھے۔“

مولانا کے دادا محمد ہادی دہلی کے مشہور خاندان علم وفضیلت سے تعلق رکھتے تھے۔ اس خاندان میں بیک وقت درس وافتاء اور سلوک وطریقت کے پانچ پانچ اکابر پیدا ہوئے۔ مولاناؒ کے جدی سلسلے میں مولانا محمد محسن پہلے بزرگ تھے جو دہلی میں مستقلاً رہے تھے۔ مولانا کے والد مولانا خیرالدین تک آبائی وطن دہلی رہا۔ مولانا محمد محسن کے لخت جگر محمد افضل تھے۔ محمد افضل کے فرزند محمد احسن اور محمد احسن کے بیٹے محمد ہادی اور محمد ہادی کے نور نظر خیرالدین۔ محمد افضل، مولانا خیرالدین کے پردادا تھے اور محمد محسن پردادا کے والد۔

محمد افضل نے علم وطریقت میں خاص مقام حاصل کیا۔ شاہ کے لقب سے ملقب ہوئے اور دہلی کے سربرآوردہ اہل طریقت میں شمار کئے گئے۔ محمد ہادی ان محمد افضل ہی کے پوتے تھے۔ مولانا نے ”ہماری آزادی“ میں لکھا ہے کہ محمد ہادی آگرہ میں قلعدار تھے۔

شیخ بہلول دہلوی (جمال الدین) کی اولاد سے متعلق مولانا نے ان کے ایک بیٹے شیخ محمد کا ذکر کیا ہے کہ ان پر تصوف وسلوک کا غلبہ تھا اور دہلی میں حضرت مجدد الف ثانی کے خلیفہ تھے شہنشاہ جہانگیر نے اپنی تزک میں دو جگہ ان کا تذکرہ نہایت تعظیم وتکریم سے کیا ہے۔ شاہ جہان کو بھی ان سے ارادت تھی۔

مولانا خیر الدین کے نانا مولانا منور الدین کا تعلق ہرات کے ایک مشہور خاندان قضاۃ سے تھا۔ ان کے والد قاضی سراج الدین ، احمد شاہ ابدالی کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ احمد شاہ نے پنجاب کا الحاق کابل سے کر لیا تو قاضی سراج الدین کو پنجاب میں قاضی القضاۃ کا عہدہ دے کر گورنر پنجاب دلاور الدین ، کا مشیر مقرر کیا۔ اصلاً وہ گورنر کے نگران تھے اور گورنر عہد مغلیہ ہی سے چلا آتا تھا۔ بعض ملکی مصالح کے پیشِ نظر ابدالی نے اس کو ہٹایا نہ تھا۔ قاضی صاحب نے مستقل سکونت کے لئے قصور کا انتخاب کیا۔ قصور کا نواب آپ کا معتقد تھا۔ قاضی صاحب سرکاری فرائض لاہور ہی میں انجام دیتے تھے۔

سکھوں نے پنجاب میں زور پکڑا تو قاضی صاحب خود کابل گئے ، شاہ زمان کو غیرت دلائی اور اس کو پنجاب کے مسلمانوں کی دادرسی کے لیے تیار کیا ، شاہ زمان دولت سے کردستبردار ہو جانے کا عادی تھا۔ لیکن قاضی صاحب نے اصرار کر کے ٹھہرا دیا۔ مسلمانوں کی ہیبت ہوئی مگر شاہ زمان کے لوٹتے ہی رنجیت سنگھ نے بہ لطائف الحیل قلعہ لاہور پر قبضہ کر لیا۔ نواب مظفر خان ملتان کے گورنر تھے اور وہ سکھوں کا بارہ سال سے برابر مقابلہ کر رہے تھے۔ قاضی سراج دین قصور سے ملتان گئے اور نواب صاحب کے ساتھ ہو کر معرکہ آرا ہوئے۔ آخری معرکے میں قاضی صاحب اور نواب صاحب دونوں شہید ہو گئے۔ قاضی صاحب کی قبر لاہوری دروازے کے باہر ملتان میں ۱۹۴۷ء تک موجود تھی۔

مولانا منور الدین ان قاضی سراج الدین ہی کے فرزند تھے۔ انہیں دہلی جا کر شاہ عبد العزیزؒ کے حلقۂ درس میں تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا۔ والد سے کئی دفعہ اجازت چاہی لیکن وہ کبھی راضی نہ ہوئے۔ آخر ایک دن گھر سے چپ چاپ نکل گئے۔ شمالی ہندوستان کی تاریخ کا خونریز زمانہ تھا۔ پنجاب کی آخری سرحد تک سکھوں نے لوٹ مچا رکھی تھی۔ جمنا سے ادھر انگریزوں اور مرہٹوں میں لڑائی جاری تھی۔

مولانا منور الدین تب سولہ برس کے تھے۔ سرہند سے آگے بڑھے تو سکھوں نے لوٹ لیا۔ بالکل تہی دست ہو گئے اس کے باوجود اونے پونے دہلی کی طرف بڑھتے گئے۔ دہلی سے کچھ ادھر مرہٹوں نے پکڑ کے بیگار میں لگا لیا وہ گھوڑوں کی سائیسی ، چھکڑوں کے کھچاؤ اور خچروں کی نگہداشت کا کام لیتے تھے۔ انگریزوں سے مرہٹوں کی مڈبھیڑ ہوئی تو مرہٹے پٹ کر بھاگ گئے اور منور الدین مالِ غنیمت کے ساتھ انگریزوں کے قبضے میں آ گئے۔ گورہ فوج دہلی پہنچی تو منور الدین کی جان بخشی ہوئی اور وہ شاہ عبد العزیزؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ شاہ اسماعیلؒ ساتھ کے طالب علم تھے۔ انہیں کوئی چھ سال بعد پتہ چلا کہ

ان کے والد رقاضی سراج دین) شہید ہو گئے تھے۔ تو قصور واپس آگئی ایک اعزا کو ساتھ لیا اور بوٹ کر دہلی آباد ہو گئے۔ اس دوران میں خاندان کے افراد قصور سے کھیم کرن منتقل ہو چکے اور تشر فاگردی کے حالات کا شکار تھے۔ مولانا منورالدین نے فارغ التحصیل ہو کر اپنا حلقہ درس قائم کر لیا۔ ان کے ہاں جو لوگ پڑھتے رہے ان میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل مولانا سعید الدین، مولانا فضل الحق خیر آبادی کے والد مولوی فضل امام اور مولوی فضل رسول وغیرہم بھی تھے۔

ان کے تبحر علمی کی شہرت چار کھوٹ پھیلی تو شاہ عالم ثانی نے رکن المدرسین بنا دیا۔ ان دنوں علم سے متعلق مغلوں کی حکومت کے چار بڑے خطاب تھے۔ ملک العلما کا خطاب سب سے بڑے عالم کو دیا جاتا۔ نقیب الاولیا رکسی بلند پایہ صاحب طریقت کو، ملک الاطبا شاہی طبیب کو اور رکن المدرسین سب سے بڑے صاحب درس و تامیذ عالم کو ——— یہ ایک طرح کی وزارت تعلیم یا نظامت تعلیم تھی کہ نظم و نسق کے اعتبار سے ملک کا پورا نظام تعلیم اس کی نگرانی میں ہوتا۔ لیکن اس زمانے میں سلطنت مغلیہ کا عملاً خاتمہ ہو چکا تھا۔ شاہ عالم اکبر شاہ ثانی وغیرہ کی حکومتیں برائے نام تھیں۔ بادشاہ بجائے خود ایسٹ انڈیا کمپنی کا وظیفہ خوار تھا۔

مولانا منورالدین نہایت درجہ کے خوددار اور علم مست انسان تھے۔ امرا کے ہاں بالکل نہ جاتے۔ نواب جھجر نے ہر چند چاہا کہ ان کے بیٹے کی شادی میں چند لمحوں کے لئے آ جائیں، اکبر شاہ ثانی سے سفارش کرائی لیکن ہرگز نہ مانے۔

شہنشاہ اکبر کی بدولت ڈولے کی رسم ایجاد ہوئی تھی کہ ہندو راجاؤں کی بیٹیاں مغل بادشاہوں اور شہزادوں کے حرم میں آنے لگیں۔ علماء سو نے اس قبضہ و تملیک کو عقد و نکاح کا بدل قرار دیا اور لونڈیوں کے حکم میں لا کر جائز ٹھہرا دیا۔ کسی راست باز زبان نے کبھی اس کے متعلق اصل اسلام بیان نہ کیا۔ لیکن مولانا منورالدین پہلے شخص تھے کہ قلعہ معلی کی ایک تقریب میں وعظ کرتے ہوئے فرمایا "ڈولہ نہ نکاح ہے اور نہ ملک یمین بلکہ زنا کے حکم میں ہے"۔

شہزادہ فیروز بخت نے ایک فرضی مباحثے کا پرانا فارسی رسالہ حسنیہ جو صریحاً تبرا کا مضمون تھا کسی طرح شاہی قلعہ کے پریس میں چھپوا کر شائع کیا۔ مولانا منورالدین کو پتہ چلا تو دربار کے دبدبے سے بے نیاز ہو کر اس رسالے کی جھاڑ کی۔ حتیٰ کہ جامع مسجد میں اس کا رد بیان کیا۔ نتیجتہً بہادر شاہ ظفر

نے رسالہ ضبط کر لیا اور جرأت کا اظہار کیا۔ مولانا آزادؒ کی روایت کے مطابق مولانا منوّر الدین نے حضرت شاہ اسماعیلؒ سے بھی ان کے عقائد و افکار پر مناظرے کئے اور ان کی کتابوں کا رد لکھا لیکن شاہ اسماعیل کا پلڑا بھاری رہا اور اُنہی کا چراغ آج تک روشن ہے۔

ہندوستان اس حال میں تھا کہ مسلمانوں کا سانچہ ٹوٹ رہا اور انگریزوں کا اقتدار جم رہا تھا۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک افراتفری کا عالم تھا اکثر علما و فضلا قافلوں کی شکل میں حرمین جا رہے تھے۔ مولانا منوّر الدین نے بھی دہلی چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ اس سفر میں دہلی سے بھوپال پہنچے تو نواب سکندر بیگم کا زمانہ تھا۔ بیگم صاحبہ نے عقیدتاً روک لیا اور ان کے ہاتھ پر تائب ہوگئی۔ نواب جہانگیر خان بیگم بھوپال سے اٹکا دے رکھا تھا وہ بیگم کی نظر التفات سے محروم ہوگیا تو مولانا منوّر الدین کو زچ کرنے کے لیئے اس نے کئی سوانگ رچائے حتیٰ کہ کھانے میں زہر دلوانا چاہا مگر مزعفر کی پلیٹ جس میں زہر تھا، مولانا کے سامنے آئی تو آپ نے اٹھا کر نواب کی طرف بڑھا دی اور فرمایا: نواب صاحب! "یہ آپ کے کھانے کی چیز ہے۔" یہ سن کر اس کا عالم ہی دگرگوں ہوگیا۔ پھر یہ حال تھا کہ تمام معاصی و فسوق سے توجہ کرلی مولانا کی جوتیاں اٹھاتا اور ان کی پالکی کے ساتھ دوڑتا تھا۔

ایک سال بعد مولانا بمبئی چلے گئے، وہاں بیمار ہوگئے دو سال رُکنا پڑا، تیسرے سال مکہ معظمہ پہنچے وہاں پانچ سال رہے، پانچ حج کیئے، چھٹے سال وہیں انتقال کرگئے۔ یہ ۱۸۵۷ء کا سال تھا۔

مولانا منوّر الدین نے شاہ عبد العزیزؒ کے مشورے سے دہلی میں شادی کی تھی۔ جس سے ان کے دو لڑکیاں تھیں، بڑی لڑکی کی شادی شیخ محمد ہادی سے کردی، جو شیخ محمد احسن کے سب سے چھوٹے لڑکے اور مولانا جمال الدین (بہلول دہلوی) کے خاندان سے تھے ان کے دو بڑے لڑکے شیخ محمد یوسف اور شیخ محمد متقی علوم دینی میں ملکہ خاص رکھتے اور مسلکاً نقش بندی تھے۔ اول الذکر "غدر" سے پہلے اور ثانی الذکر "غدر" کے بعد مدینہ منورہ ہجرت کر گئے وہیں انتقال کیا اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

شیخ محمد ہادی نے علوم کی تکمیل مفتی صدر الدین سے کی اور پچیس برس کی عمر ہی میں وفات پاگئے اس وقت ان کے بیٹے خیر الدین تین یا چار برس کے تھے۔ نانا (مولانا منوّر الدین) نے پرورش کی۔

مولانا خیر الدین دہلی میں ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے۔ والد کے بعد والدہ بھی رحلت کرگئیں مولانا

منورالدین نے بیٹی کی واحد یادگار کو سینے سے لگایا، پہلے خود پڑھایا پھر مفتی صدرالدین کے تلمذ میں دیا۔ انہوں نے فارسی و عربی میں آتار دکر دیا ان کے علاوہ دوسرے نامور اساتذہ سے علوم دین حاصل کئے اور اٹھارہ برس کی عمر میں فارغ ہو گئے۔ بعض مردانہ ورزشیں اور تفریحی فنون بھی سیکھے۔ مثلاً پنجہ کشی، میر پنجہ کش سے، تیراکی میر مچھلی سے، تیر اندازی، قلعہ معلیٰ ہی کے ایک استاد سے اسی طرح کشتی لڑنا سیکھا۔ تب حافظ امام بخش خط نسخ کے امام تھے ان سے خوشنویسی سیکھی۔ نشانہ اندازی، شمشیر زنی اور لکڑی کے فنون بھی سیکھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ آخری وقت تک ان کا بدن کسرتی رہا۔

مولانا منورالدین نے ہجرت کی تو ان کے ہمراہ مکہ معظمہ چلے گئے وہاں کوئی دس برس گزار کے شادی کی۔ تب قانون تھا کہ جو شخص عثمانی رعایا نہ ہو وہ حجاز میں غیر منقولہ جائیداد نہیں لے سکتا۔ احباب کے مشورے سے عثمانی رعایا ہو گئے۔ شیخ عبداللہ مدنیہ کے اساتذہ حدیث میں سے تھے ان کی باب اسلام پر واقع محلہ قدوہ میں زمین تھی۔ ان سے زمین لے کر مکان بنا لیا اور مقیم ہو گئے۔ کچھ عرصہ شیخ حرم کی منظوری سے حرم میں درس دیتے رہے۔ ان سے پہلے کسی ہندوستانی عالم کو یہ شرف حاصل نہ ہوا تھا۔ پھر سلطان عبدالحمید کے زمانے میں قسطنطنیہ گئے وہاں دو سال رہتے۔ مطالعہ میں وسعت پیدا کی۔ سلطان نے وظیفہ مقرر کر دیا جو سارے خاندان کی کفالت کرتا۔

سلطان محمود ثانی نے دولت عثمانیہ میں جدید علوم و فنون کا آغاز کیا، دار التحریر میں پریس لگایا۔ کتب مفیدہ کی طباعت شروع کرائی۔ اور بعض دوسری اہم اصلاحات کے علاوہ عثمانی حرم سراؤں سے ہزارہا لونڈیوں کو آزاد کرایا۔ تب ہر سال سلطانی محل میں پندرہ سو کنیزیں خرید کے داخل کی جاتی تھیں سلطان محمود نے جہاں تہاں غلاموں کی منڈیاں تھیں انھیں بند کرا دیا۔ اور مکہ معظمہ میں ایک بڑی منڈی تھی۔ عبدالمطلب شریف مکہ نے اس حکم کو ذرا برابر وقعت نہ دی، منڈی قائم رکھی۔ گورنر ترکی، شریف کی آل ہٹ پر بے بس تھا۔ سلطان عبدالحمید تخت نشین ہوا تو اس نے سلطان محمود کی اصلاحات کو جاری رکھا اور مکہ سے منڈی ختم کرنے کا عہد کر لیا۔ حامد پاشا کو گورنر بنا کر بھیجا، اس نے مکہ پہنچ کر شریف کو سلطان کے احکام سے آگاہ کیا۔ شریف نے بظاہر کوئی مخالفت نہ کی، لیکن کچھ دنوں بعد مکہ و طائف کے بدوؤں سے بغاوت کرادی، اعلان کیا کہ سلطان نصرانی ہو گیا ہے اور اسلام کو مٹانا چاہتا ہے، بغاوت فرو کر دی گئی لیکن شریف کی گرفتاری ایک پیچیدہ مسئلہ تھا، کچھ عرصہ بعد شریف کو ایک جنگی جہاز

دکھانے کے بہانے جدہ پہنچایا گیا۔ وہ جہاز میں بیٹھا تو معلوم ہوا جہاز ساحل سے ہٹ رہا ہے اور وہ قیدی ہے۔

عبدالمطلب کے بعد اس کا بھتیجا غالب، شریف مقرر ہوا، وہ بھی شبہات میں آگیا۔ مولانا خیرالدین کے غالب سے تعلقات تھے۔ سلطان کو پتہ چلا تو بعض شکوک کی تصدیق و تردید میں ان سے مدد لینا چاہی، المختصر مولانا خیرالدین کی مساعی سے عبدالمطلب کی نظربندی موقوف ہوگئی، اس کا بیش قرار وظیفہ لگ گیا، اور تعلقات بگڑنے سے محفوظ ہوگئے۔

مولانا خیرالدین نے ترکی میں رہ کر ترکی زبان سیکھی، پھر اس کی صرف و نحو عربی میں لکھی، عربی فارسی ترکی کا ایک لغت تیار کرنا چاہا لیکن قاف تک پہنچ کر موقوف ہوگیا اور قونیہ چلے گئے وہاں سال بھر رہے پھر شام وغیرہ کا سفر کیا۔ وہاں سے مصر آگئے، دو سال قیام کیا پھر مکہ گئے، مکہ سے کچھ عرصے کیلئے بمبئی آئے پھر عراق کا سفر کیا۔ وہاں چھ سات ماہ رہے۔ اس زمانے میں شیخ عبدالرحمٰن نقیب الاشراف تھے۔ ان کے مہمان ہوئے ان سے طریقۂ قادریہ کی اجازت لی۔ اور انہوں نے ان سے طریقۂ نقشبندیہ کی۔ بغداد سے پھر بمبئی لوٹ گئے۔ کچھ دیر قیام کیا اور مکہ واپس آگئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب شہید سید احمدؒ بریلوی اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی جماعت نے جہاد فی القرآن کے حکم و عمل سے برطانوی گورنمنٹ کے لئے خوف پیدا کر رکھا تھا اور وہ اس کے پیرووں کو ختم کرنا چاہتی تھی۔ انگریزوں نے مسلمانوں کی وحدت میں دراڑ ڈلوانے کے لیے مرزا غلام احمد کو پیدا کیا۔ مولانا احمد رضا بریلوی عقائد کی ایک نئی اور مختلف دنیا لے کر سامنے آئے، شیعہ حضرات نے سواد اعظم سے ہمیشہ کی طرح علیحدہ روش اختیار کی۔ غرض مسلمانوں میں قرآن و حدیث کے مسائل پر ہنگامہ برپا ہوگیا۔ چکڑالوی فرقہ انہی ضرورتوں ہی کی پیداوار تھا۔ علما کی وہ جماعت جس نے انگریزوں سے مڈبھیڑ جاری رکھی اور سرحد کے علاقے میں جماعت مجاہدین کا نام اختیار کیا۔ انگریزوں نے انھیں وہابی کا نام دے کر مارنا اور مروانا شروع کیا جس شخص کو برطانوی حکومت نے وہابی گردانا اس کو گرفتار کیا۔ مقدمہ چلایا اور کم سے کم کالے پانی کی سزا دی۔ ورنہ پھانسی پر لٹکوادیا۔ اس طرح سینکڑوں علماء حوالہ دار و گیر ہوگئے اور بے شمار متمول خاندان تباہ کر دیئے گئے۔ جو لوگ اس ہلاکت اور بربادی سے کسی طرح بچ گئے وہ حجاز کو دارالامن سمجھ کر وہاں چلے گئے۔ لیکن اس زمانے میں حجاز کے علماء و عوام کو محمد بن عبدالوہاب اور ان کی جماعت

سے سخت عناد و تعصب تھا۔ سلطنت عثمانیہ نے بھی سیاسی مصلحتوں کے تابع انھیں معتوب و مغضوب گردان رکھا تھا۔

مولانا خیر الدین نے ہندوستان کی اس وہابی جماعت کے خلاف شریف مکہ اور قسطنطنیہ کے عوام کو تیار کیا، مولانا آزاد کے الفاظ میں فتنہ اُٹھایا، نتیجۃً اس جماعت کے اکیس آدمی گرفتار کر لئے گئے، لیکن تین کے سوا سب نے تقیہ کیا اور رہا ہو گئے۔ تین کو فی کس انتالیس کوڑے لگانے کی سزا دی گئی۔

ان گرفتار شدگان کے عقائد کے متعلق جو سوالنامہ مرتب کیا گیا، وہ مولانا خیر الدین کا تیار کردہ تھا۔ اس سلسلے کا عبرت انگیز پہلو یہ ہے کہ ان لوگوں کے اعزا نے ہندوستان سے جدہ آکر برٹش قونصل سے مدد مانگی کہ ان کی رعایا پر یہ عذاب نازل ہو رہا ہے۔ اس کی مداخلت سے وہ آدمی رہا کئے گئے۔ لیکن بمبئی پہنچے تو ان کے مخالفوں نے طوفان کھڑا کر دیا کہ حرم سے مخذول و مردود ہو کر آئے ہیں، گورنمنٹ کو ان کی گرفتاری کے لیے مجبور کیا گیا۔ لیکن کسی نہ کسی طرح وہ بچ گئے۔ قاضی سلمان دوستوں کی مدد سے بغداد چلے گئے۔ قاضی محمد مراد کلکتہ پہنچتے ہی گرفتار کر لئے گئے ان پر وہابیت کی پاداش میں مقدمہ چلا، انھیں جیل خانہ میں اتنی اذیت دی گئی کہ اس کے صدمے سے اندر ہی انتقال کر گئے۔

غرض مولانا خیر الدین نے وہابیوں کے لئے مکہ معظمہ میں رہنا ناممکن کر دیا۔ ایک عجیب اتفاق یہ تھا کہ حجاز کی حکومت اور ہندوستان کی برطانوی حکومت وہابیوں کے معاملے میں متحد العمل تھیں۔ اس زمانے میں مولانا خیر الدین نے وہابیت کے رد میں دس جلدوں پر مشتمل ایک کتاب لکھی لیکن اس کی دو جلدیں ہی چھپیں۔ سلطان ترکی نے خیر الدین کو تمغہ حمیدی دیا۔

حجاز میں نہر زبیدہ کو حجاج کے ہاتھوں پانی فروخت کرنے کے لالچ میں بدوؤں نے جگہ جگہ سے توڑ پھوڑ کے ویران کر دیا تھا وہ حجاج کو پانی کا مشکیزہ دو دو ریال میں فروخت کرتے اور دولت کماتے۔ ایک سال پانی کی نایابی کے باعث ہزاروں آدمی مر گئے۔ مولانا خیر الدین نے قصر سلطانی کو متوجہ کیا مگر مصر سے دولت عثمانیہ کی جنگ ہو رہی تھی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ انھوں نے اپنے طور پر چندہ جمع کر کے نہر کی مرمت کا بیڑہ اُٹھایا۔ حاجی عبدالواحد اور حاجی زکریا نے دو لاکھ روپیہ دیا۔ حسن اتفاق سے جدہ میں نواب کلب علی خان (رامپور) اور نواب عبدالغنی خان (ڈھاکہ) موجود تھے اول الذکر سے پانچ لاکھ اور ثانی الذکر سے

ایک لاکھ روپیہ لیا۔ ہندوستان سے انجینئر بلوائے۔ تین انگریز اور پانچ ہندوستانی آئے۔ انگریز جدّہ میں ٹھہرے، دولت عثمانیہ کو معلوم ہوا تو اس نے بھی دو ترک انجینئر بھیج دیئے، اُدھر چندہ تیز رفتاری سے جمع ہونے لگا۔ عزیز مصر نے بھی ایک معقول رقم بھجوائی۔ ایک روایت کے مطابق کوئی ۲۹ لاکھ روپیہ جمع ہوگیا۔ کوئی سات آٹھ لاکھ روپیہ خرچ ہوچکا تو معلوم ہوا باقی رقم شریف مکہ نے ہضم کرلی ہے، نتیجۃً نہر کی درستگی دیرپا نہ ہوسکی، مولانا خیرالدین کو دوبارہ تمغہ حمیدی ملا۔ اس فنڈ کی روداد مولانا خیرالدین نے بمبئی سے چھپوا کر دولت عثمانیہ میں تقسیم کرائی تو شریف مکہ مخالف ہوگیا۔ وہ انھیں کسی آزار میں پھانسنا چاہتا تھا لیکن قسمت نے اس سے پہلے ہی اس کی زندگی ختم کردی اور وہ اچانک وفات پاگیا۔

مولانا نذیر حسین ہندوستان میں اہل حدیث کے سب سے بڑے لیڈر تھے وہ دہلی میں اسّی برس تک حدیث کا درس دیتے رہے۔ انھوں نے حج کا ارادہ کیا تو برٹش قونصل کے نام اس مطلب کا سفارشی خط لے گئے کہ اہل حدیث سے بغض وعناد کی جو آگ حجاز میں بھڑکی ہوئی ہے، مبادا ان کے لئے کسی مصیبت کا پیش خیمہ ہو۔۔۔۔ مولانا خیرالدین نے ان کی آمد پر ہم خیال علماء کو ساتھ ملا کر ہنگامہ برپا کر دیا، ان کے کفر میں ایک فتویٰ جاری کرایا۔ نتیجۃً مولانا نذیر حسین اور مولانا تلطف حسین عظیم آبادی گرفتار کرلئے گئے اور انہیں ایک تنگ وتاریک قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ دوسرے دن شریف مکہ نے انھیں طلب کیا اور جرم بتایا کہ انھیں وہابی عقائد کی بنا پر قید کیا گیا ہے۔ مولانا خیرالدین نے وکیل استغاثہ کے فرائض انجام دیئے اور ان کے اصل عقائد کو عقائد وہابیہ سے تعبیر کیا۔ مولانا نذیر حسین اور مولانا تلطف حسین کو تو اس مصیبت سے نجات ہوگئی لیکن جو فتنہ ان کے خلاف کھڑا کیا گیا تھا وہ ہندوستان میں اشاعت کرکے پھیلایا گیا کہ انہوں نے وہابیت سے توبہ کرلی ہے۔ مولانا آزادؔ نے اپنی کہانی میں جو تفصیلات بیان کی ہیں اس میں والد کے مقابلے میں حق گوئی کی طرفداری کرتے ہوئے اس کہانی کو غلط قرار دیا اور جو کچھ ان کے خلاف ہوا اس کو 'فتنہ' کی شاخیں بیان کیا ہے۔

ایک دن کسی حادثے میں مولانا خیرالدین کی ران کی ہڈی ٹوٹ گئی، مکہ میں بندش ٹھیک نہ ہوئی تو اہل وعیال کو لے کر کلکتے آگئے یہاں علاج سے راضی ہوگئے لیکن پاؤں میں آخر عمر تک خفیف سا لنگ رہا۔

جس دن کلکتے پہنچے اسی سال اہلیہ (مولانا آزادؔ کی والدہ) کا انتقال ہوگیا۔ اس صدمے سے برداشتہ

خاطر ہو کر مکہ لوٹ جانا چاہتے تھے لیکن بعض مریدوں نے روک لیا۔ قاضی واحد کلکتے کے سب سے بڑے مسلمان تاجر اور آپ کے مرید تھے، انہیں تحریک کر کے جامع مسجد بنوائی۔ اس کے بعد سلطان ٹیپو کے خاندان سے ایک شہزادے فرخ سیر کو زور دیا اور مسجد ٹیپو سلطان کی بنیاد رکھی جو کلکتے میں جامع مسجد کے بعد دوسری بڑی مسجد ہے۔ اس طویل قیام نے ان کی پیری مریدی کے سلسلے کو پھیلا دیا، ہر روز پانچ پانچ سو یا ایک ایک ہزار آدمی مرید ہوتے۔ جمعہ کو یہ عالم ہوتا کہ نماز ختم ہوتے ہی جم غفیر ہو جاتا۔ اس بھیڑ میں ایک آدمی مسجد کے درمیان کلمات بیعت کا اعادہ کرتا اور عصر تک بمشکل فراغت ہوتی۔

مولانا آزادؔ کا بیان ہے کہ ان کا وعظ گویا ایک مرتب کتاب ہوتا۔ خطابت کے ربط، ترتیب، تقسیم، استنباط، استدلال، اجمال سے تفصیل اور تفصیل سے اجمال پر اختتام اس التزام سے کرتے کہ وعظ کو حقیقتاً ایک فن بنا دیا۔ کوئی وعظ تین گھنٹے سے کم نہ ہوتا، ہر وعظ میں بیس سے پچیس ہزار تک لوگ شریک ہوتے۔ آواز سب کو یکساں پہنچتی اور سب پتھر پر لکیر کی طرح بیٹھے رہتے، ایک چھوٹی سی آیت کا سلسلہ برسوں چلتا، بسم اللہ پر دو سال وعظ کیا۔ سورہ والضحیٰ پر دو سال بولتے رہے اور وعظ ختم نہ ہوا۔

سورہ یوسف پر سات برس تک وعظ کیا۔ لیکن تفسیر آدھی سے زیادہ نہ ہوئی۔ ان کے وعظوں میں نغمہ سرائی یا سخن آرائی قسم کی لیپا پوتی مطلق نہ ہوتی جو کہتے سادگی سے کہتے لیکن دلوں پر اس طرح نقش ہوتا کہ سامعین اسی کے ہو جاتے، کئی لوگ مختلف اوقات میں وعظ کی تاثیر سے جان ہار ہو گئے۔

عبد العلی خان نام کا ایک شیعہ بمبئی میں کوتوال شہر تھا، تب کوتوال ہی کے ہاتھ میں شہر کا نظم و نسق ہوتا، اس نے ایک کتاب لکھوائی جو صریح تبرا سے بھرپور تھی۔ ادھر وہ کتاب چھپ کر تقسیم ہوئی ادھر مولانا خیر الدین نے بمبئی پہنچ کر اس کے خلاف تقریر داغ دی، کوتوال شہر میں خدائی کر رہا تھا۔ اس نے مولانا کو قتل کرانے کی ٹھان لی، لیکن مولانا نے کتاب کی ضبطی کا مقدمہ دائر کر دیا، آخر جیت مولانا کی ہوئی اور عبد العلی نے معافی مانگ لی، مولانا صحابہؓ کے بارے میں اس قسم کی زبان درازیاں یا قلم درازیاں کبھی برداشت نہ کرتے تھے۔ لیکن اہل بیت سے ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ عشرہ کی شب اپنے ہاں ذکر شہادت کی مجلس منعقد کرتے تو گریہ و بکا اس اوج پر ہوتا کہ بہ قول مولانا آزادؔ لکھنؤ کی بڑی بڑی مجالس عزا بھی

اس درجے میں نہ تھیں۔

مولانا آزادؔ نے اپنی کہانی (از ملیح آبادی) میں بیان کیا ہے کہ "ہم دونو بھائی (بڑے بھائی ابوالنصر غلام یسین آہ اور مولانا آزاد)، والد کی مرضی کے خلاف عراق چلے گئے۔ میں تو جلد لوٹ آیا، لیکن ابونصر وہیں رہ گئے اور کچھ عرصہ بعد مرض الموت کا شکار ہو کر بمبئی واپس آئے۔ وہاں علاج کرایا افاقہ نہ ہوا تو مولانا کلکتے لے کر آگئے لیکن ایک ماہ بعد ۱۹۰۷ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ والد اس صدمے سے ایک بجھے ہوئے چراغ کی طرح ہوگئے، ان کی زندگی گورکنارے پہنچ گئی۔ اور ایک سال کے اندر اندر ۱۹۰۸ء میں رحلت کر گئے۔ مولانا آزادؔ لکھتے ہیں کہ اس وقت وہ پونا میں تھے جب مرض الموت نے والد پر حملہ کیا۔ ادھر وہ خبر ملتے ہی کلکتے پہنچے ادھر چند گھنٹے بعد ان کے والد ہوش وحواس ہی میں خالق حقیقی سے جا ملے، ظہر کے وقت رحلت ہوئی مغرب کے بعد جنازہ اٹھا تمام شہر اُمڈ آیا، پانچ مرتبہ نماز جنازہ پڑھی گئی اور عشاء سے پہلے اپنی اہلیہ (والدہ مولانا آزادؔ) کے پہلو میں دفن کر دیئے گئے۔

مولانا آزادؔ کی روایتوں کے مطابق مرحوم ایک ڈھیلے ڈھالے انسان تھے، ان سے وقت لئے بغیر ملنا مشکل تھا۔ عمر بھر کسی امیر و رئیس کی تعظیم نہ کی بلکہ متبحر علماء و جید اساتذہ کے سوا اور کسی کی تعظیم میں کبھی کھڑے نہ ہوئے۔ امراء کی دعوت کبھی قبول نہ کرتے لیکن غرباء کے ہاں ہو آتے۔ جس بات کو حق سمجھتے وہ بے دریغ کہہ گزرتے، جز خوفِ خدا اور کوئی خوف ان کے بدن اور روح میں نہیں تھا۔ فرماتے امیروں سے غرور اور غریبوں سے عجز، صحیح اور عادلانہ اخلاق ہے۔ طبیعت کے غنی اور ہاتھ کے سخی تھے، نفاست پسندی کے شیفتہ تھے، عمدہ سے عمدہ لباس پہنتے اور قیمتی سے قیمتی عطر لگاتے، آخر عمر میں موتیا بند اتر آیا تھا، کئی برس تک ایک ہی آنکھ کام دیتی رہی، پھر اس کی بینائی بھی مدھم پڑ گئی۔ پھر سفر میں کتابوں کے دس پندرہ صندوق ساتھ رکھتے۔ کتابوں پر اچھی سے اچھی جلدیں بندھوانے کا بے حد شوق تھا۔ کوئی جلد ناقص بندھ جاتی یا کتاب کاٹنے میں غلطی ہو جاتی تو دوسرا نسخہ منگواتے خواہ اس میں کتنی ہی رقم اٹھ جاتی۔ عسر ہو کہ یسر کتابیں خریدنے کا شوق تھا۔ اُردو کتابوں سے بالکل رغبت نہ تھی، اس کے علاوہ کشمیری شالیں اوڑھنے کے شائق تھے۔ قالین، دریاں، ہاتھی دانت اور صندل کی اشیاء خرید خرید کر جمع کرتے اور یہ گھر بار ان کی بابی تھی۔

مولانا خیر الدین کی اولاد

مولانا خیر الدین کی تین لڑکیاں اور دو لڑکے تھے، لڑکیاں بڑی تھیں۔ بڑی بیٹی کی پیدائش قسطنطنیہ میں ہوئی۔ ان سے دو چھوٹی تھیں لیکن دونو بھائیوں اور ان بہنوں کی عمر میں دو دو سال کا فرق تھا۔ بہنوں میں چھوٹی بہن کا نام فاطمہ بیگم معروف بہ آرزو بیگم تھا، مولانا خیر الدین کی بینائی میں ضعف آگیا اور بعض دوسری مصروفیتیں بڑھ گییں تو آرزو بیگم والد کے مسودے لکھتیں ان کو صاف کرتیں اور خط وکتابت املا کرتی تھیں۔ اس لکھا پڑھی کے علاوہ دوسرے علمی اشغال بھی ان کے سپرد تھے۔

مولانا آزادؔ فرماتے ہیں کہ ان کا خط والد مرحوم کے خط سے اس شبہ ہوتے کے باعث نہایت خوبصورت، اور ہم سب میں احسن تھا۔ جو لوگ والد سے خط وکتاب۔ کے عادی تھے۔ وہ اس تبدیلی کو آخر تک محسوس نہ کر سکے کہ خط والد کا ہے یا کسی اور کا لکھا ہوا ہے۔ ان سے بڑی بہن آبرو بیگم کا ابتدائی نام محمودہ بیگم تھا، دونوں کا تعلق آخر تک بھوپال سے رہا۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے آرزو بیگم کو نظامت تعلیم میں زنانہ مدارس کی لیڈی انسپکٹر کا عہدہ دے رکھا تھا۔ اور ان کے شوہر مولوی معین الدین عرب بھی کسی عہدے پر فائز تھے۔ وہ حجاز کے ایک ممتاز خاندان سے تعلق رکھتے اور نہایت فاضل انسان تھے۔ آبرو بیگم پرنس آف ویلز لیڈیز کلب کی سیکرٹری تھیں۔ ان کے میاں مولوی احمد ابراہیم سلطان جہاں بیگم کے سیکرٹری امور متفرقات تھے۔ مولانا قلعہ احمد نگر میں قید تھے کہ ان کی اہلیہ زلیخا بیگم کی وفات کے تین ماہ بعد جون ۴۳ ۱۹ء میں آبرو بیگم انتقال کر گئیں۔

مولانا خیر الدین اپنی قدامت میں اس درجہ متشدد تھے کہ انگریزی پڑھنا پڑھانا تو ایک طرف رہا لڑکوں کو اسکول بھیجنے ہی کے روادار نہ تھے۔ دونوں لڑکوں اور دونوں بچیوں کی تعلیم گھر میں شروع کی ان چاروں کو فارسی خود پڑھائی، اردو سکھائی اور عربی مقامات تک پڑھائی پھر دونو لڑکوں کو دوسرے اساتذہ کے سپرد کر دیا تو بہنوں کی تعلیم کا التزام رُک گیا، لیکن مطول چونکہ والد خود پڑھانا چاہتے تھے اس لئے دونو بہنیں پھر شریک ہوگئیں، مطول ختم ہوگئی تو دونو بھائی اساتذہ کی صحبت میں چلے گئے لیکن بہنیں والد سے عقائد نسفی پڑھتی تھیں۔

سب سے بڑی بہن جو قسطنطنیہ میں پیدا ہوئی تھیں، کلکتہ ہی میں رہ رہی تھیں۔ ان کے شوہر واجد علی خان بھوپال میں مالیات کے سیکرٹری تھے۔ وہاں سے سبکدوش ہو کر کلکتہ میں رہنے

گئے۔ اور کسی نئی ملازمت کے خواہشمند تھے۔ عبدالرزاق ملیح آبادی نے انھیں مشورہ دیا کہ کلکتہ کارپوریشن میں چیف ایگزیکٹو آفیسر کی جگہ خالی ہے۔ مولانا کانگرس ہائی کمانڈ میں ہیں ان کے ایک ہی بول سے آپ کا تقرر ہو سکتا ہے۔ وہ اپنی اہلیت کو لے کر مولانا کے ہاں گئے ان سے اصرار کیا۔ سوال مولانا کے بہنوئی اور بہن کا تھا۔ بہن سب سے بڑی تھیں، مولانا سب میں چھوٹے تھے، مولانا نے دوٹوک جواب دیا کہ وہ اس سلسلہ میں مدد کرنے سے معذور ہیں۔ بہن نے ضد کی، مولانا نے فرمایا "یہ کیا لغویت ہے، مجھے آپ ملوث کرنا چاہتی ہیں؟" کچھ عرصہ بعد واجد علی خان طبعی عمر گزار کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بہن کلکتہ ہی میں رہیں۔ لیکن مولانا سے الگ اپنے مکان میں اس کی کفالت مولانا نے اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔

مولانا کی وفات کے وقت بہنوں میں صرف آبرو بیگم زندہ تھیں اور بھوپال سے منتقل ہو کر اپنے داماد کے ساتھ بمبئی میں رہ رہی تھیں۔

مولانا آزادؒ کے بڑے بھائی ابونصر ان سے دو یا تین سال بڑے تھے لیکن تعلیم میں ہم درس تھے ان کا اصل نام غلام یسین تھا، کہا جاتا ہے کہ ذہانت، طباعی، حافظہ اور ذوق علمی میں غیر معمولی ملکہ رکھتے تھے۔ عربی ادب سے خلقی مناسبت تھی۔ ترکی زبان میں بھی خصوصی قابلیت پیدا کر لی تھی۔ اردو شاعری میں داغ مرحوم کے شاگرد تھے اور تخلص آہ تھا۔ ابونصر اپنے ایک دوست عبدالرحمٰن امرتسری کی تحریک پر عراق گئے۔ مولانا آزاد ہمراہ تھے۔ مولانا آزادؒ تو چند دن بعد واپس آ گئے۔ ابونصر وہاں سے بیمار ہو کر آئے اور یہی مرض ۱۹۰۷ء میں ان کی جان لے کر ٹلا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۱ برس کی تھی۔ شادی ہو چکی تھی ان سے ایک بچہ نورالدین تھا، جو مولانا آزادؒ کی وفات تک ساتھ رہا۔ مولانا کا حیدی کنبہ تین بہنیں اور ایک بھتیجا تھا۔ ابونصر عام روایت کے مطابق والد کی ہو بہو تصویر تھے، انہی کی طرح وعظ کرتے اور خاندانی روایات سے استغراق رکھتے تھے۔ بعض لوگوں نے ان کی کئی ایک غزلیں پرانے رسائل سے اکٹھا کی ہیں، وہی رنگ ہے جو کبھی داغ اور امیر مینائی کا تھا لیکن آج وہ غزل مر چکی ہے۔

ابونصر کے متعلق ثقہ روایتیں ہیں کہ بھائی کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہوتے کلام سناتے اور داد پاتے، وعظ شروع کیا تو چند مہینوں ہی میں عامۃ الناس کی توجہ کا مرکز ہو گئے۔ عوام مسحور اور خواص مبہوت ہو جاتے۔ اس کے علاوہ کئی شہروں میں بھائی کے ساتھ سفر کیا، مشاعرے پڑھے، تقریریں کیں اور داد پائی ان کے بعض مضامین "مخزن"، "خدنگ نظر"، "وکیل" اور "وطن" کے فائلوں میں ڈھونڈنے سے مل جاتے ہیں۔

یہ کہنا خیال کی شعبدہ بازی ہوگی کہ زندہ رہتے تو کیا ہوتے اب ان کا ذکر جتنا بھی ہے اس لیے ہے کہ مولانا آزادؒ کے بھائی تھے۔ جوان مرگ ہوگئے قدرت کو یہی منظور تھا۔ اللھم اغفرلہ۔

ابوالکلام آزادؒ

مولانا آزادؒ ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۸ء[1] محلہ قدوہ متصل باب السلام مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ سات آٹھ برس کی عمر تھی کہ ۱۸۹۵ء میں خاندان کے ہمراہ ہندوستان آگئے۔ اس رعایت سے مولانا کا مولد مکہ معظمہ اور متوطن ہندوستان ہے۔ چونکہ والد نے کلکتے میں قیام کیا اس لیے وہیں کے ہوگئے۔ ہندوستان کی مرکزی کابینہ میں وزارت تعلیم کا عہدہ سنبھالا تو کلکتہ چھوڑ کر دہلی کے ہوگئے۔ حتیٰ کہ موت کے بعد قلعہ معلیٰ اور جامع مسجد دہلی کے وسط کی گراؤنڈ میں دفن ہوئے۔ اُدھر الہلال کے ابتدائی دور تک اپنے تئیں دہلوی لکھا۔ ادھر جو لوگ نسلاً بعد نسلٍ دہلی کے تھے انہیں آپ کے دہلوی ہونے میں کلام تھا۔ لیکن موت نے دہلوی بنادیا اور اب ہمیشہ کے لیے دہلی ہی میں آسودۂ خاک ہیں۔ البتہ آپ کے والد، اہلیہ اور بھائی کی قبریں کلکتے میں ہیں۔

پیدائش کے وقت محی الدین نام رکھا گیا، تاریخی نام فیروز بخت تھا، آزاد تخلص، ابوالکلام کنیت؛ قلم کا سفر شروع کیا تو محی الدین عنقا ہوگیا، تب دستخط کرتے تو احمد لکھتے پھر ابوالکلام ہی نام ہوگیا اور جب ہمہ گیر شخصیت ہوگئے تو پورا نام ابوالکلام آزاد تھا۔

اپنی کہانی (بروایت ملیح آبادی) میں بیان کیا ہے کہ والد نے شیخ حرم سے پانچ برس کی عمر میں بسم اللہ کرائی، شیخ نے تین مرتبہ "یافتاح" پڑھوایا اور اتنی مرتبہ "یسّر ولا تعسّر" کہلوایا۔ اس کے بعد الف سے شین تک حروف شناخت کرائے۔ گھر میں پڑھائی شروع ہوئی تو پہلا استاذ خالہ تھیں۔ ان سے پڑھتے

---

[1] تذکرہ مولانا آزاد، آزاد کی کہانی (ملیح آبادی) اور انڈیا ونس فریڈم، ہماری آزادی) میں سن پیدائش یہی ہے، لیکن مولانا کی دوسری برسی کے موقع پر حکومت ہند نے مولانا سے متعلق مختلف مفکرین و مستشرقین کے مضامین کا ایک مجموعہ مرتبہ ہمایوں کبیر شائع کیا تو اس میں سالِ پیدائش تو ۱۸۸۸ء ہی ہے لیکن تاریخ پیدائش ۱۱ نومبر لکھی ہے۔ معلوم نہیں تاریخ کے اس تعین کا ماخذ کیا ہے۔ ۱۳۰۵ھ کے ذی الحجہ کی رُو سے ۸ اگست تا ۶ ستمبر کی تاریخ پڑتی ہے۔ ابوسلمان شاہجہانپوری نے اگست کو ماہ ولادت لکھا ہے۔

تھے۔ گاہ گاہ گھر سے باہر جاکر پڑھتے۔ والد مرحوم کے ہاں ایک خطاط حافظ بخاری تھے کبھی کبھار ان سے بھی سبق لیتے۔ مکہ چھوڑنے سے پہلے قرآن پاک ختم کیا، اور کئی ایک سورتیں زبانی حفظ کرلی تھیں، حرم میں اس وقت شیخ حسن سب سے بڑے قاری تھے، ان سے قرأت کا سبق لیا۔ کلکتے آگئے تو گھر کی چاردیواری مدرسہ اور والد اُستاد تھے۔ اُردو کا سبق انہی سے لیا۔ وہ مرکب حروف لکھ کر دیتے دونو بھائی مشق کرتے۔ اس طرح اُردو لکھنے کا آغاز کیا۔ عربی اور فارسی میں دستگاہ بھی والد ہی سے ہوئی اس زمانے میں مولوی محمد یعقوب دہلوی ایک مستند ماہرِ درسیات تھے ان سے بھی دو ایک کتابیں پڑھیں۔ والد بیمار ہو گئے تو مولوی نذیر حسین امیٹھوی سے بعض ضروری کتابوں کا سبق لیا۔ ان کے علاوہ دو اور اُستادوں سے پڑھنے کا اتفاق ہوا، ایک مولوی محمد ابراہیم، دوسرے مولوی محمد عمرؒ دونو اپنے فن میں خوب تھے۔

شمس العلماء مولانا سعادت حسن سے بھی کچھ دنوں فیض حاصل کیا۔ مولانا آزادؔ اور ان کے بھائی ابو نصر بہتیرا چاہتے تھے کہ انہیں کسی مدرسے میں بھیجا جائے لیکن والد مالی بے فکری اور معاشی فراغت کے باوجود راضی نہ ہوتے۔ اور نہ انھیں گھر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت دیتے۔ والد کے خادمِ خاص ایک صاحب حافظ ولی اللہ تھے ان کے ساتھ سال میں دو دفعہ شہر جانے کی اجازت ہوتی، ورنہ پورا سال گھر ہی میں کٹتا کسی کھیل سے واسطہ کیا اس کا علم ہی نہ تھا، گھر ماں سے خالی تھا اور والد کی ہیبت کے سامنے لب کشائی کا حوصلہ نہ تھا۔ دس برس کی عمر میں ابوالکلام کتابوں کے اتنے رسیا ہو گئے کہ ناشتے کے جو پیسے ملتے انھیں جمع کرتے اور کوئی نہ کوئی کتاب خرید لاتے، دن کا غالب حصہ تعلیم میں گزر جاتا پہلے والد پڑھاتے پھر اُستاد، اس کے بعد دوپہر تک سبق یاد کرتے۔ عصر کے بعد والد پڑھا ہوا سنتے پھر مغرب تک مختلف موضوعات و معلومات کا تذکرہ رہتا، جو کتابیں جیب خرچ سے خود خریدتے وہ شب کو موم بتی جلا کر پڑھتے، اس طرح ان کی صحت ضرور بل گئی لیکن تمام جذبات کا مصرف مطالعہ و درس کا ہو گیا اور چھوٹی سی عمر ہی میں لکھنے پڑھنے والے انسان کی سنجیدگی پیدا ہو گئی۔

مذکورہ اساتذہ کے علاوہ کئی اور اساتذہ سے فیض حاصل کیا۔ مثلاً مولانا محمد شاہ محدث حضرت جلال بخاری کے خاندان سے تھے۔ ان کا درس سنا تو خواہش کر کے ان سے بھی دو ماہ ترمذی شریف کا درس لیا۔ اس طرح درس نظامیہ سے سولہ یا پندرہ سال کی عمر میں اپریل سے قبل ۱۹۰۲ء میں فارغ ہو گئے۔ اس کے علاوہ لکھنؤ کے مشہور طبیب سید باقر حسین سے جو ایک سال کے لئے کلکتے ٹھہرے تھے،

والد کی خواہش پر سات آٹھ ماہ طب پڑھی، پھر ہاتھ اُٹھا لیا کہ اس طرف طبیعت آتی ہی نہ تھی۔

ایک صاحب عبدالواحد خان سہسرامی کی بہن مولانا کے ہاں ملازم تھیں وہ کبھی کبھار بہن سے ملنے آتے۔ ان کی طبیعت میں شعر کہنے کا ملکہ تھا۔ مولانا سے شاعری پر گفتگو کی تو مولانا کو بھی شاعری کی چیٹک لگ گئی۔ یہ تھا مولانا کی شاعری کا آغاز۔ اردو اور فارسی دو تو زبانوں میں شعر گوئی شروع کی۔ شاعروں کا چسکہ پڑا۔ ہر مشاعرے میں داد پاتے، ابو نصر داغ کے شاگرد تھے۔ مولانا نے امیر مینائی سے رجوع کیا۔ غزل بھیجی تو اصلاح سے طبیعت خوش نہ ہوئی۔ شوق نیموی اس وقت ایک مشہور محدث، محقق، مصنف، نقاد، شاعر اور پایہ کے زبان دان تھے۔ ان کا تلمذ اختیار کیا اور زبان و بیان کے متعلق گرانقدر معلومات حاصل کیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ وہ داغ یا امیر مینائی کی طرح شہرت عامہ نہیں رکھتے تھے لیکن ان کے علم اور ان کی نظر میں مقابلۃً بہت زیادہ وسعت و تنوع تھا۔

شاعری کے اس شوق میں کیا حاصل کیا؟ پہلی چیز یہ کہ محقق مولوی ابوالکلام محی الدین نہ رہے بلکہ عبدالواحد سہسرامی کی تجویز پر آزاد تخلص کیا اور مولوی ابوالکلام محی الدین آزاد دہلوی ہو گئے۔ دوسرے یہ کہ شاعری کی پہچان پیدا ہو گئی اور اس کا ذوق دوسروں کے لئے نظیر ہو گیا۔ تیسرے تمام متقدمین کے دواوین پڑھ ڈالے، چوتھے آپ کی شاعری نے تقریر و تحریر کو ایسا رنگ و روغن دیا جو تقریر میں زبان کا جوہر اور تحریر میں قلم کا سحر ہو گیا۔ مولانا کی شعر گوئی اس زمانے کے مذاق ہی میں رہی۔ اس سے کوئی نئی راہ یا نیا فکر پیدا نہ ہوا۔ آج جو لوگ ڈھونڈ ڈھونڈ ڈھانڈ کے ان کے اشعار جمع کرتے وہ اس طرح ان کے لڑکپن کی جھلکیاں تو جمع کر لیتے ہیں لیکن ان کی شاعری میں ایک آدھ شعر کے سوا کوئی تب و تاب نہیں۔

"لسان الصدق" ۱۹۰۳ء میں نکلا تو شاعری سے تقریباً دستبردار ہو چکے تھے۔ ممکن ہے کبھی کبھار کوئی غزل یا نظم کہی ہو لیکن سولہ برس کے سن ہی میں شاعری کا پنڈ چھوڑ دیا اور جب ۱۹۰۵ء میں "الندوہ" کی ادارت سنبھالی یا ۱۹۰۶ء میں "وکیل" امرتسر کے ایڈیٹر ہو گئے تو شاعری اگر طبیعت سے نہیں تو قلم سے ضرور نکل چکی تھی۔ پھر جب ۱۹۱۲ء میں "الہلال" نکلا تو شعر گوئی ان کی مطلقہ کا نام تھا۔

معلوم ہوتا ہے وہ شاعری کے لئے نہیں انشاء کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ قدرت نے اسلامی ہندوستان کو اس زمانے میں دو عظیم عطیوں سے نوازا، شاعری میں اقبال، نثر میں ابوالکلام۔ فی الجملہ ۱۹۰۰ء کی ابتدائی دہائی ان کے نشو و بلوغ کا سر آغاز تھا۔

مولانا نے اپنی کہانی (از ملیح آبادی) میں روایت کی ہے کہ ان کے والد کا حافظہ عجائبات روزگار میں سے تھا، حقیقت یہ ہے کہ خود ان کا اپنا حافظہ عجائبات روزگار میں سے تھا۔ ان کے دل و دماغ سولہ برس کی عمر میں عربی، فارسی اور اُردو کی عظیم کتابوں کا خزانہ تھے۔ فارغ التحصیل ہو گئے تو مولوی نذیر الحسن کی خواہش اور والد کی اجازت سے طلبا کی ایک ٹکڑی کو پڑھانا شروع کیا لیکن طبیعت کی پرواز کسی اور طرف تھی، بھائی کے ساتھ بمبئی چلے گئے، وہاں بعض دینی مجالس سے خطاب کیا ایک سولہ سترہ سال کے نوجوان کو جو بظاہر چودہ سال کا معلوم ہوتا تھا لوگ خطابت کی اس عالمانہ مسند پر دیکھ کر حیران ہوتے۔ خود ان کے اساتذہ مثلاً مولوی نذیر الحسن اور مولوی محمد ابراہیم وغیرہ کو ان کی عمر کے بارے میں تردد تھا۔ اس زمانے میں جب ان کی عمر چودہ برس تھی، وہ اکثر یہی کہتے کہ اٹھارہ بیس برس کی ہے، مولانا عبدالحق نعمانی بھی آپ کے اُستاد تھے۔ انہوں نے عمر پوچھی جواب دیا تو ہنس کے فرمایا تو یہ ایک بہت مابہ النزاع مسئلہ ہے۔ شاہ سلمان کہتے تھے کہ تمہاری عمر ۲۵ برس کی ہے۔ مولانا شبلی سے پہلے پہل بمبئی میں (م ۱۹۰۶ء) ملاقات ہوئی تو آدھ گھنٹہ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، پھر فرمایا ابوالکلام آپ کے والد ہیں؟ اس وقت آپ کی عمر سولہ برس کی تھی۔

مولف مولانا سے متعلق اپنی یادداشتوں کے اوراق دیکھ رہا تھا تو مولانا سے ایک گفت گو نظر پڑی۔ فرمایا تھا:

'ہندوستان میں برطانوی استعمار کا ہراول پادری تھے۔ انہوں نے ۱۸۵۷ء کی استعماری سے فتح یابی کے بعد اپنے سہ گونہ مقاصد کی خاطر ملک میں طوفان اُٹھا رکھا تھا، پہلا مقصد لوگوں کو عیسائی بنا کر اپنی حکومت کے لئے ہندوستانی تیار کرنا تھا، دوسرا مقصد، سادہ لوح مسلمانوں کو اسلام سے اچاٹ کرنا اور تیسرا مقصد ہندوؤں کے ذہن میں یہ ڈالنا تھا کہ اسلام ان کے ملک میں ایک اجنبی اور جارحانہ طاقت ہے۔ میں (مولانا) اس وقت عمر کی دوسری دہائی میں تھا، کلکتہ اور بمبئی عیسائی مشنریوں کی اس تبلیغ و دعوت کا مرکز تھے۔ وہ اسلام کی تضحیک پر اپنے افکار کی بنیاد رکھتے۔ میرے بھائی ابو نصر جو والد مرحوم کے طرز عقائد پر متشدد تھے اور اسی انداز کی طبیعت رکھتے تھے۔ ان پادریوں سے مقابلے میں بے جھجک تھے۔ آغا حشر سے اسی زمانے میں دوستی ہوئی وہ بھی مناظرانہ طبیعت کے تھے اور پادریوں کو چٹکلوں میں اڑاتے۔ چونکہ ہم تینوں کی طبیعت میں خطابت کا نیا انداز تھا اور پادریوں کے طرز تخاطب کی کاٹ

جانتے تھے۔ اس لیے ہم نے برس ڈیڑھ برس کے مناظروں میں پادریوں کو خاصا پریشان کیا۔ ہماری عادت ہوگئی تھی کہ جہاں پادری ہوتے وہاں پہنچ جاتے اور انہیں مختلف مباحث میں اتنا تنگ کرتے کہ آخر کار انہوں نے ہمارے خلاف گورنر بمبئی سے شکایت کی کہ ان نوجوانوں میں عیسائیت اور سلطنت دونوں کے خلاف سخت قسم کے معاندانہ خیالات پائے جاتے ہیں۔ جن سے مسلمانوں کی وفاداری کے متزلزل ہونے کا اندیشہ ہے۔"

کچھ عرصہ پہلے میں نے مناظروں اور مجادلوں کی مہمات سے ہاتھ اٹھالیا تھا لیکن والد مرحوم کی رحلت کے بعد تو یہ راستہ یک قلم منسوخ کر دیا۔ اب میرے سامنے بعض بڑے بڑے مثبت کام تھے جو "الہلال" کی آواز میں لوگوں کے سامنے آگئے۔

مولانا کے لیے ابتدائی زمانہ فکر و نظر کے معاملوں میں قطعی نہ تھا وہ ان دنوں موروثی عقائد سے بغاوت کی راہ پر اور نئے خیالات کے اضطراب کی منزل میں تھے۔ اس اثنا میں فارسی کی ہمہ جہت تکمیل کے لیے لغت و ادب کا مطالعہ شروع کیا اور فصیح ایرانیوں سے سبیل ملاقات پیدا کی۔ ان دنوں ایران کے ایک سیاح مرزا محمد حسین طبعی ہندوستان وارد ہوئے تو کلکتے میں ان سے استفادہ کیا۔ ان سے فارسی میں گفتگو کرنے کا یہ فائدہ ہوا کہ ہندی ترکیبوں سے خلاصی اور غلط محاوروں سے نجات مل گئی، ان سے فارسی تحریروں میں اصلاح لی، مولانا محمد حسین آزاد کی آب حیات کے ادبی حصے کا دو ردوم تک فارسی ترجمہ کیا اور ان سے اصلاح لی، ایک فارسی لغت لکھنے کا ارادہ کیا۔ جس سے مطالعہ وسیع تر ہو گیا۔ ادھر بمبئی میں سر آغا خان کے بنگلے میں شیخ الرئیس ایک ایرانی فاضل اور یگانہ استاد مقیم تھے، ان سے تقریباً سال بھر فارسی میں فیض پایا، ان کے علاوہ بعض دوسرے شرفائے ایران سے جو اکثر بمبئی آتے زبان و بیان کے گھر گھاٹ سیکھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جو مطبوعہ کتاب یا قلمی نسخہ جہاں تہاں نظر آیا پڑھ ڈالا اور وہ دل و دماغ پر نقش ہو گیا۔ شیخ الرئیس سے زبان ہی نہیں، نجوم، رمل، جفر حروفیات اور کیمیائے قدیم سے متعلق بہت کچھ سیکھا۔ وہ ان سب میں ملکۂ تام رکھتے تھے۔

مرزا فرصت شیرازی ایران کے ایک فاضل یگانہ اور علوم والسنہ کی نئی راہوں سے آشنا تھے۔ انھیں تحقیق و نظر کے جدید راستوں کا علم تھا وہ ان سب میں ایک گہری نگاہ رکھتے تھے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ "مجھ پر بلاشبہ ان کی صحبت کے بھی حقوق ہیں، ان سے مجھے فارسی ادبیات اور بعض علوم میں معتدبہ فوائد حاصل ہوئے۔" اس زمانے میں ایک ترک سیاح ظاہر بیگ جو اپنی زبان کے علاوہ اور کئی زبانوں کے استاد تھے کلکتے پہنچے۔ ان سے آشنائی ہوگئی۔ اپنے ہاں سات آٹھ مہینے ٹھہرایا، تھوڑی

بہت ترکی سیکھی، مولانا فرماتے ہیں کہ ترکوں سے متعلق ہر قسم کا علم انہی کی وساطت سے ہوا۔ وہ خامق کمال بگ، یوسف ادیب اور احمد جودت کا کلام شوق اور ترنم سے سنایا کرتے اور ہم ان سے محظوظ ہوتے تھے۔

بعض دوسری چیزوں سے قطع نظر سرسید کے افکار و اجتہاد کا یہی زمانہ تھا، مولانا ان سے کہاں تک متاثر ہوئے اس کی پوری روداد "آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی" (ملیح آبادی) میں بہ تفصیل موجود ہے اور نہایت دلچسپ ہے۔ اس سلسلے میں امام غزالیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "شک جستجو کی علت ہے، جستجو سے تحیر پیدا ہوتا اور تحیر، وسیلۂ یقین ہے"۔ فرمایا:

میری پیدائش ایک ایسے خاندان میں ہوئی جو مذہبی رہبانیت و پیشوائی رکھتا تھا۔ اس رہبانیت و پیشوائی کے خلاف خیالات میں تزلزل آرہا تھا اور میں عقیدت کی اس معصیت سے نجات پانا چاہتا تھا جو پیری مریدی کا خاصہ ہے۔ المختصر دماغ مذاہب سے متعلق منفی و مثبت خیالات کی گزرگاہ تھا اور جو چیز گھر میں ممنوع تھی وہ دماغ میں داخل ہوگئی۔ مثلاً وہابیت، لیکن کوئی سا نقشہ قطعی نہ تھا اس وقت دماغی حالت یہ تھی کہ:

۱۔ تقلید و رسوم کی بندشیں ٹوٹ چکی تھیں۔

۲۔ تقلید آباو اجداد کے تمام نقوش اگر محو نہیں تو مدھم ضرور ہوگئے تھے۔

۳۔ اکثر شکوک و شبہات سر اٹھا رہے تھے ان کی مدافعت کا سامان نہ تھا۔ الٹا مطالعہ کی وسعت سے ان کا میدان وسیع ہو رہا تھا۔

۴۔ طبیعت کا یہ حال تھا کہ وہ کسی نئی حالت کے لئے مضطرب و منتظر تھی۔ مولانا خود فرماتے ہیں کہ:

"ان دنوں میں سرسیدؒ کی ایک بت کی طرح پوجا کرتا تھا گو ان کے مطالعہ سے ترک تقلید کی راہ پر گامزن ہوا تھا، لیکن تب ان کی تقلید ہی علم یا فکر کا منتہی تھا۔ کچھ عرصے کیلئے معتزلہ کی طرف رغبت ہوگئی لیکن یہ بھی ذہنی سفر کا ایک پڑاؤ تھا۔ غرض اس طرح چلتے چلاتے اپنے ہاتھوں ایک دروازہ کھولا اور قصر الحاد میں داخل ہوگیا۔ مختصر یہ کہ آبائی مذہب سے بغاوت کی اور اس نے پورے مذہب سے بغاوت کی راہ پر ڈال دیا۔"

غرض وہ شخص جو آگے چل کر "الہلال" کا مدیر اور ترجمان القرآن کا مصنف ہوا اُس وقت ایک ایسے ذہنی اضطراب میں مبتلا تھا کہ اس کے عقائد و اعمال کی پوری دنیا ہل چکی تھی، وہ جو چاہتا وہ اس کو مل نہیں رہا تھا، جو موروثی تھا اس پہ قانع نہ تھا اور جس کی چاہت تھی وہ عنقا تھا۔ مولانا انکار و الحاد اور شک و اضطراب کی اس دلدل میں کب تک رہے اس بارے میں قطعاً کچھ کہنا مشکل ہے۔ اس سفر سے متعلق ان کی تحریریں ادھوری ہیں اور اس مدت کا تعین کرنا مشکل ہے۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے "ذکرِ آزاد کے نام سے" جو یادداشتیں لکھی ہیں ان میں کچھ واضح اشارات مل جاتے ہیں۔ مثلاً ذکرِ آزاد[1] میں مولانا سے منسوب ایک تحریر کے کلمات ہیں کہ:

"میں اب پکا دہری ہو گیا، میٹریلزم اور ریشنلزم کے اعتقاد پر میرے اندر فخر و غرور تھا، اور مذہب کے نام میں جہل و توہم کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا، لیکن دل کا اطمینان جس کی ڈھونڈھ میں نکلا تھا، وہ اور دُور ہو گیا تھا۔"

الندوہ کی ادارت کا زمانہ زندگی کا تاریک ترین دور تھا۔ مولانا فرماتے ہیں[2]:

"چودہ برس سے لے کر بائیس برس تک میرا یہی حال رہا گو ظاہری روپ ایک ایسے آدمی کا تھا جو مذہب کو عقل و علم کے ساتھ چلانا چاہتا ہے، لیکن میرے اندر اعتقاد میں قطعی طور پر الحاد تھا، اور عمل میں فسق۔ یہی منزل میری آخری منزل تھی۔"[3]

"ترجمان القرآن" جلد اوّل کے دیباچے میں رقمطراز ہیں:

"میرے دل کا کوئی یقین ایسا نہیں ہے، جس میں شک کے سارے کانٹے نہ چبھ چکے ہوں اور میری روح کا کوئی اعتقاد ایسا نہیں ہے جو انکار کی ساری آزمائشوں میں سے نہ گزر چکا ہو، میں نے زہر کے گھونٹ بھی ہر جام سے پیئے ہیں اور تریاق کے نسخے بھی ہر دارالشفا کے آزمائے ہیں، میں جب پیاسا تھا تو میری یہ تشنگیاں دوسروں کی طرح

---

[1] ذکرِ آزاد صفحہ ۲۵۹

[2] ذکرِ آزاد صفحہ ۱۱۴

[3] ذکرِ آزاد صفحہ ۲۵۹

نہ تھیں اور جب سراب ہوا تو میری سیرابی کا سرچشمہ بھی شاہراہ عام پر نہ تھا۔

دانہ ہے کہ خضر داشت ز سرچشمہ دُور بود

لب تشنگی ز راہ دگر بُردہ ایم ما

اسی مضمون میں ہے کہ :

۱۔ پیدائش اور خاندانی ورثے میں سے جو مذہب ملا تھا میں اس پر قانع نہیں رہا اور جونہی مجھ میں اتنی طاقت پیدا ہوئی کہ کسی چیز کو اپنے سے الگ کرسکوں، میں نے اسے الگ کر دیا اور پھر ایک خالی دل و دماغ لے کر طلب و جستجو میں نکلا۔

۲۔ میرے مذہبی عقائد نہ تو مجھے خاندان سے ملے ہیں نہ میرے استادوں نے ان کی تلقین کی نہ میری سوسائٹی ان کے لئے رہنما ہو سکتی تھی۔ یہ تمام چیزیں موافق ہونے کی بجائے میری راہ میں رکاوٹ کا حکم رکھتی تھیں، انہوں نے مجھے جو کچھ دیا وہ میں نے کھو دیا، مجھے جو کچھ مطلوب تھا وہ خود اپنی طلب و جستجو سے ڈھونڈ نکالا۔ عرصے تک میٹیریلزم اور ریشنلزم کے جلوۂ سراب کو آب حیات سمجھتا رہا اس راہ کی جتنی بیماریاں ہیں وہ بھی مجھے لگیں اور جتنے نسخے ہیں وہ بھی میں نے استعمال کیے۔ آخر کار سب سے بڑی بنیادی سچائی مجھ پر کھل گئی کہ مذہب کی راہ عقل و ادراک سے نہیں بلکہ خالص اور بے میل جذبات سے طے کی جا سکتی ہے اور مذہبی حقیقت کا پالینا اس لئے کٹھن نہیں ہے کہ مشکل ہے بلکہ اس لئے کہ وہ بہت ہی آسان ہے اور انسان کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ وہ سامنے کی آسان اور عام چیزوں کو ہمیشہ نظر انداز کر دیتا ہے۔

۳۔ مذہب اور عقل کے میدان بالکل الگ الگ ہیں اور دونوں کی ایسی پوزیشن نہیں ہے کہ ان کو باہم مخالف سمجھ کر توڑنے یا جوڑنے کی کوشش کی جائے۔ مادہ اور محسوسات کی راہ ہم ادراک سے طے کر سکتے ہیں مگر مذہب جس عالم کا پیغام لاتا ہے اس کے لئے ہمارے پاس صرف جذبہ ہے اور یہ بڑی بھول ہے کہ چاندی سونا تولنے کے کانٹے سے ہوا اور روشنی کا بھی وزن معلوم کرنا چاہیں[1]۔

---

[1] ذکرِ قرآن صفحہ نمبر ۲۶

اس سفر تشکیک والحاد کے ذکر کو مولانا سمیٹتے ہوئے اپنی اسی تحریر میں لکھتے ہیں:

"میرے تمام لاینحل سوالوں کے کیا کیا جواب ملے؟ یہ بہت لمبی چوڑی داستان ہے"۔

مختصراً۔ ایک سفر کے بعد مولانا اس منزل پر آگئے کہ قرآن ایک عالم گیر مشترک سچائی کا نام ہے اور اس سچائی کا دوسرا نام اسلام ہے گویا توحید ربانی کی آخری آواز ہے۔

۱۹۱۲ء میں "الہلال" نکلا، تو اس کا دور اول معنوی اعتبار سے قرآن کی آواز تھا، اس کے الفاظ قرآن کے الفاظ تھے، اس کے مطالب قرآن کے مطالب تھے۔ ۸ ستمبر ۱۹۱۲ء کے اداریہ میں لکھا۔

۱- "ہمارے پاس اگر کچھ ہے تو صرف قرآن ہی ہے۔ اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے"۔

۲- "ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا اور کسی تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہو کفر صریح ہے"۔

ایک دوسرے افتتاحیے "شاہراہ مقصود" (۱۹ اکتوبر ۱۹۱۲ء) میں لکھا۔

۱- "خدا، قرآن اور رسول وحدہٗ لاشریک ہیں۔ ان کی صفات وخصائص میں کوئی ان کا شریک نہیں"۔

۲- "اسلام اعتقاد وعمل کی ہر صداقت اور کائنات کے ہر حسن وجمال کا نام ہے"۔

ایک دفعہ ہم لوگ (راقم الحروف، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، سوشلسٹ لیڈر منشی احمد دین، شیخ حسام الدین اور مولوی عزیز الرحمٰن، خلف مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا کی خدمت میں حاضر تھے۔ ملاقات کی روداد میری یادداشتوں میں درج ہے۔ تاریخ مرقوم نہیں۔ اس گفتگو کے ارشادات بڑے قیمتی تھے۔ کسی نے سوال کیا؟ نام درج نہیں، بہر حال سوال تھا،

"حضرت، آپ انکار والحاد کے بیابان سے کیونکر نکلے؟"

مسکراتے فرمایا:

"اس کا جواب تو ترجمان القرآن کی دونوں جلدیں ہیں۔ تیسری جلد میں بھی اس کے باقیات آرہے ہیں۔ البیان کا موقع ملا، تو انشاء اللہ ان سوالوں کی مختلف نوعیتوں کا جواب اس میں ہوگا، سورہ فاتحہ کے مباحث بجائے خود بتاتے ہیں کہ دماغی سفر کی وادیاں کتنی سنگلاخ تھیں، یہ ایک دور دراز کا سفر تھا جو میں نے بفضل تعالیٰ عمر کی دوسری دہائی کے آخری ثلث میں طے کر لیا، ورنہ اس قسم کی منزلیں کئی ہی دہائیوں میں طے نہیں ہوتیں"۔

قرآن نام ہے ایک عالمگیر سچائی کا اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تمام مذاہب ربّانی کی سچائیاں جو ان کے پیروؤں نے گم کر دی تھیں اس میں مجتمع ہو گئی ہیں۔ اس کی دعوت میں کوئی شک نہیں۔ پھر جس پر وہ کتاب اتری ہے، اس کی اپنی سیرت قرآن پاک میں موجود ہے۔ فی الجملہ قرآن، خدا کی دعوت، اور رسولؐ کی سیرت کا صحیفہ ہے، میں نے قرآن پاک کو قرآن ہی سے حاصل کیا، جہاں کوئی مشکل مانع ہوئی، سیرت نے حل کر دی، ہر تعلیم اپنے معلّم کے شب و روز سے جلا پاتی ہے، ہر داعی کی سیرت اس کی دعوت کو فعال بناتی اور نافذ کرتی ہے۔ داعی اسلام کے سوا کسی دوسرے داعی کے احوال و آثار بکمال و تمام، تاریخ نے محفوظ نہیں کیے، نتیجہ معلوم کہ ان سب کے مذاہب کی سچائیاں گم ہو گئیں اور اسلام کی آمد تک مذہب انسانی اذہان کے طلوع و غروب کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ آخر کار اسلام نے آخری مذہب اور خدا نے آخری نبی بھیج کر قرآن کی آخری سچائی کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا کہ صبح قیامت تک مشیّتِ ایزدی اس کی محافظ ہے۔

مولانا نے فرمایا:

"لوگ قرآن کے مطالعے سے سیرت کی طرف آتے ہیں میں سیرت کے مطالعے سے قرآن کی طرف لوٹا تو میرے دل و دماغ کا ہر کانٹا صاف ہو گیا، اور میں بفضل تعالیٰ انکار و الحاد کے بیابان سے نکل آیا۔

سوانحی برگ و بار

میں مولانا سے ملنے ۱۹۵۶ء میں دھلی گیا تو پہلے دن کھانے پر مدعو کیا، اگلے روز دس بجے صبح بلوایا، دیر تک کئی مسئلوں پر گفتگو فرماتے رہے۔ دونوں دن میرے لئے کئی کتابوں کا موضوع تھے۔ پہلے دن ان کے پاس کئی گھنٹے بیٹھا رہا اور وہ سیاسیات و ادبیات پر کلام کرتے رہے۔ اگلے روز پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات اور تاریخ کے سیاسی مضمرات پر روشنی ڈالی۔ کئی ایک باتیں میرے لئے نئی تھیں۔ ان کے کلمات میں وہ سحر تھا کہ دل خود بخود ان کی طرف کھنچ رہا تھا اور غور و فکر کی وادیاں ابھر رہی تھیں۔ مولانا کو معلوم تھا کہ میں ان کے سوانح و افکار لکھ رہا ہوں۔ اپنی بعض مطبوعات کی پشت پر میں نے اعلان کیا تھا کہ "ہندوستان میں ابن تیمیہؒ کے نام سے مولانا آزادؒ کی سوانح عمری زیر قلم ہے۔ مولانا یہ سب پڑھ چکے تھے۔ میں نے سوانح کے متعلق بعض سوالات کئے تو عادتاً ٹال گئے فرمایا:

"ایک زمانے میں سوانح نگاری بعض خاص چیزوں کا نام تھا، تب شخصی حالات اور ان کے متعلقات کو اہمیت حاصل تھی۔ اب وہ نقطۂ نگاہ نہیں رہا بلکہ ایسی چیزیں تذکرۃً فروعی اور واقعۃً اجمالی ہو گئی ہیں۔ آخر اس میں کیا رکھا ہے کہ شرف و مجد کی وہ چیزیں تلاش کی جائیں کہ جس شخصیت کا تذکرہ مقصود ہو وہ ان بیساکھیوں پر چلے، یا بعض بڑے ستونوں سے نسبت دے کر اس کی فضیلت قائم کی جائے۔ اصل چیز علم و عمل کے آثار و مظاہر ہیں۔ ابوجہل قریش کے رؤسا میں سے تھا اور مکی تھا لیکن بلال حبش کا ایک کالا کلوٹا غلام تھا، پھر تاریخ کا فیصلہ موجود ہے کہ شرف کس کو حاصل ہوا؟ اور خاسر کون رہا،

اگر معیار زمین یا قبیلہ ہوتا تو ابوجہل کے بدن پر قبا سے فضیلت ہوتی۔ لیکن تاریخ کی ترازو مختلف ہے۔ نیتجتہً بلال کے سر پر کلاہ افتخار ہے اور ابو جہل کے سر پہ دھول اُڑ رہی ہے۔"

مولانا کی گفتگو کو دراز کرنے کے لیے میں نے عرض کیا کہ سید سلیمان ندوی نے بعض اشغلے چھوڑے ہیں۔" مولانا نے بات کاٹتے ہوئے کہا:

"مجھ تک یہ حکایت پہنچ چکی ہے۔ پاکستان سے بعض اشخاص نے اس مطلب کے خطوط بھی لکھے تھے ان میں اس طرح کے پہلودار سوالات تھے کہ ان میں ایک شریر مسکراہٹ صاف نظر آ رہی تھی۔ سید صاحب پاکستان جا رہے تھے تو اپنی ایک افتاد کے سلسلے میں مجھے مل کے گئے تھے۔ ہندوستان میں انہوں نے یا ان کے کسی عزیز نے کبھی اشارۃً وکنایۃً بھی ظاہر نہ کیا کہ سلیمان میرے کسی قول و فعل سے رنجیدہ یا کبیدہ ہیں۔ پاکستان کی معلومات سے پتہ چلا کہ وہ مجھ سے شاکی ہیں اور خلوت و جلوت میں فلاں فلاں باتیں ان کی زبان پر رہتی ہیں۔ رہ گئے بعض دوسرے لوگ تو انجمن ترقی اردو کے مولوی عبدالحق کا مزاج ہی ایسا ہے وہ مرفوع القلم ہیں۔ خود باتیں گھڑتے دوسروں سے لکھواتے ہیں۔ بہرحال علم یہ نہیں کہ دوسروں کے عیب تلاش کئے جائیں نہ ملیں تو وضع کر لیے جائیں، پھر ان میں طعن و طنز کے آب و گل سے چمک پیدا کی جائے اور غیبت سے رسم و راہ رکھی جائے۔ علم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ انسان کو تجلّی اللّٰہ کرتا اور فرش سے اُٹھا کر عرش پہ لے جاتا ہے۔ سید صاحب بہرحال ایک خوشگوار ماضی کی تاریخ ہیں، میں ان کے معاملے میں اپنی سوچ کو غلط راستے پر ڈال کر زبان کے گناہ کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ ان کے علاوہ بعض دوسرے لوگ جو اب تک مسلم لیگ کے تعصبات میں رہنا پسند کرتے ہیں اور ان کے نزدیک میرا ماضی و حال، حسب و نسب، مولد و متوطن، کلام و اقدام اور نظر و فکر، غرض صبح و شام میں سے کوئی لمحہ بھی عیب و نظار سے خالی نہیں رہا تو ان عزیزوں کے لیے میں دُعا ہی کر سکتا ہوں کسی غلط یا صحیح چیز کی تردید و توثیق کی جاتی ہے۔ جس چیز کا سرے سے وجود ہی نہ ہو، اس کے بارے میں تردید و توثیق کیا ہو؟"

میں نے عرض کیا۔

آپ کے اجداد میں سے کوئی بزرگ کبھی کھیم کرن میں رہے تھے یا خاندان میں سے کوئی شاخ کھیم کرن کی باشندہ تھی؟

فرمایا:

"میں نے ان اشغلوں کو بھی دیکھا ہے۔ اولاً کھیم کرن کا باشندہ ہونا کسی ذلت یا ندامت کا باعث نہیں ثانیاً میرے اجداد کھیم کرن کے ہوتے تو انکار سے فائدہ اور اقرار میں نقصان کیا تھا؟ ثالثاً کھیم کرن کی نسبت سے کوئی چیز گھٹتی نہیں۔ اور نہ کوئی شرف بڑھتا ہے۔ رابعاً، لوگ خطوں کے لئے باعث عزت ہوتے ہیں نہ کہ کسی خطے کا محض باشندہ ہونا کسی کے لئے باعث عزت ہوتا ہے ــــــ ہندوستان اور پاکستان کے بعض بڑے بڑے شہر صدیوں سے آباد ہیں، کیا ان سے منسوب لوگ صرف باشندہ ہونے کی وجہ سے بڑے ہو گئے یا بڑائی انسان کے ذاتی محاسن کا نام ہے؟ ــــــ برعظیم کی ہمہ جہت تاریخ کے ننانوے فی صد بڑے لوگ معروف شہروں کے باشندے نہ تھے وہ بڑا ہو گئے تو ان کے مولد بھی ان کی بدولت معروف ہو گئے۔ میرا خاندان کھیم کرن کا ہوتا تو اس میں ایسی کونسی چیز تھی جو مجھے اقرار واعتراف سے روک رہی تھی؟ ہاں یہ الگ بات ہے کہ میں دلیسہ یا ہاپوڑ کا باشندہ نہیں، اگر اس مفروضے پر مجھے کھیم کرن کے سر منڈھا جا رہا ہے کہ وہ دلیسہ یا ہاپوڑ سے فروتر قصبہ تھا، اور میری فروتری کی بنیادیں اٹھانے کے لئے مجھے اس سے نسبت دینا ضروری ہے، تو مجھے عذر و انکار نہیں۔ میں مانتا ہوں کہ میرے دوست مجھ سے بڑے ہیں"۔

مولانا کچھ دیر کے لئے رک گئے پھر فرمایا:

میرے خاندان میں تین خاندان جمع ہوئے تھے، ایک بابر کے زمانے میں ہرات سے آگرہ آیا تھا دوسرا احمد شاہ ابدالی کے ساتھ ہرات سے لاہور پہنچا تھا، تیسرا مکہ معظمہ کے آخری محدث وتری کا خاندان تھا۔ میری والدہ اسی خاندان سے تھیں۔ مولانا منور الدین والد کے نانا تھے، ان کے والد قاضی سراج الدین احمد شاہ ابدالی کے ساتھ لاہور آئے

تھے اُس نے پنجاب فتح کیا تو وہ لاہور ہی میں قاضی القضاۃ مقرر ہوئے۔ وہ قصور میں بستے تھے بالآخران کی شہادت ملتان میں نواب مظفر خان کے ساتھ ہوئی۔ ان معرکوں میں سکھوں نے جو لوٹ مار کی اس کا نتیجہ تھا کہ بے شمار خاندان برباد ہو کر منتشر ہو گئے۔ ان میں قاضی سراج دین کا خاندان بھی تھا، وہ قصور سے اُٹھ کر کھیم کرن چلے گئے۔ مولانا منور الدین (قاضی سراج دین کے فرزند) ان دنوں دہلی میں شاہ عبدالعزیز کے مدرسے میں پڑھ رہے تھے۔ انھیں اس سانحے کا چھ برس بعد پتہ چلا تو واپس آ کر اپنے قریبی اعزہ کو لے گئے۔ ممکن ہے کچھ لوگ کھیم کرن میں رہ گئے ہوں اور زمانے کی اُفتاد ان کی معاشی ابتری کا باعث ہوئی ہو، اب کھیم کرن سے جو رشتہ ممکن تھا وہ اس قدر ہے کہ مولانا منور الدین میرے والد کے نانا تھے۔ اب اگر بعض چہرے اسی طرح روشن ہوتے ہیں کہ ہمارا وطن مالوف کھیم کرن تھا، تو وہ اپنی رائے پر قائم رہنے کے مجاز ہیں۔ ان کے ثقہ ہونے کی اور کیا سند ہو سکتی ہے کہ سید سلیمان ندوی پاکستان جا کر ان کے ہمنوا ہو گئے ہیں۔

اب رہا میرے خاندان کا معاملہ تو میں نے تذکرہ ہی میں لکھ دیا تھا کہ میں حسب و نسب کا استخوان فروش نہیں۔ میں نے نسب فروشی کی دکان لگانے سے ہمیشہ احتراز کیا، اور کبھی اس طرح نقد عزت و شرف کی جستجو نہیں کی۔ اسلام کے نزدیک ایک انسان کا حسب و نسب اس کا علم و عمل ہے۔ خاندان پر فخر و ناز کا بُت دنیا کے عہد جاہلیہ کی ایک یادگار مشئوم ہے۔ اسلام نے اور بتوں کے ساتھ اس بُت کو بھی توڑ دیا تھا۔ بلال حبشیؓ اور صہیب رومیؓ کا حسب و نسب اسلام تھا اور سلمان فارسی ابن اسلام کہلاتے تھے۔ میں نے اپنے خاندان کے شرف کا ذکر کیا، تو اس لئے نہیں کہ سید صاحب کے فخر سادات کو ٹھیس پہنچانا مقصود تھا، حاشا وکلا، اس قسم کے بزدلانہ خیالات میرے دماغ میں کبھی بار نہیں پاتے۔ میں نے تو اپنے دل کی رونق بڑھانے کے لئے عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو ایسے خاندان میں پیدا کیا جس میں صدیوں سے سلسلۂ علم و ارشاد قائم وجاری ہے۔ سید صاحب میری تہی دستی کے اس سرمایہ پر صاد نہیں کرتے اور انھیں یہ ساری چیزیں اپنی عمر کے آخری دور میں افسانہ نظر آتی ہیں، تو میں اس کہانی کے ورق اُلٹا

نہیں چاہتا جو اس سخن سازی کا پس منظر ہے۔ میں اپنی بات اس مختصر جملے پر ختم کر سکتا ہوں کہ سید صاحب مولانا اشرف علی تھانوی سے بیعت ہونے کے بعد شاہراہ طریقت کی ایک ایسی منزل میں ہیں کہ ان پر دوستوں کے بواطن کھلتے جا رہے ہیں۔ اور جو چیز ان کے دوستوں کو خود اپنے بارے میں معلوم نہیں، وہ ان کے سامنے کھلی کتاب کی طرح پڑی ہے۔"

ایکا ایکی گفتگو کی باگ موڑتے ہوئے فرمایا کہ:

"ہر زمانے میں اس قسم کے لوگ رہے ہیں جو سر برآوردہ اشخاص کے خاندان پر شبخون مارتے رہے۔ ان کی زبانوں کو حسب و نسب میں مین میخ نکالنے کا چٹخارہ لگا رہا اور انسانی گوشت کا ذائقہ ان کے لیے سب سے بڑی نعمت تھا۔ آخر ان نسابین کا تعلق کسی دار المصنفین ہی سے تھا، جنہوں نے علویہ مصر کو سادات سے خارج کیا جن کے قلم سے قرون اولیٰ کی نسبی صداقتیں مجروح ہوئیں جو سید عبد القادر جیلانی علیہ رحمۃ کو عجمی الاصل کہتے تھے اور جو خوف خدا سے بے نیاز ہو کر اہل بیت کے ایرانی خون پر قلم اٹھاتے رہے۔ جن کے نزدیک اس خاندان اقدس کی اولاد لونڈیوں سے تھی اور حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ ایک جاریہ کے بطن سے تھے یا پھر خواجہ معین الدین چشتی علیہ الرحمۃ کا نسب حضرت موسیٰ کاظم تک پہنچتا ہے لیکن وہ حمیدہ نام کی بربریہ لونڈی کے بطن سے تھے۔"

مولانا تھوڑی دیر رک گئے پھر فرمایا:

"خاندان کو ہدف سخن میں لانے والے قصاب ہر دور میں رہے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں میں سے کون محفوظ رہا، خلجی بچے نہ سید، اور خاندان غلاماں تو خیر تھا ہی خاندان غلاماں؟

سر سید احمد نے جام جم میں مغل بادشاہوں کی ہندو ماؤں کے نام تک لکھے ہیں۔ اب اگر اسلام کے اصول نکاح کو ملحوظ رکھیں تو کتنی بڑی عمارت گر جاتی اور ملبہ رہ جاتا ہے۔

جہانگیر کی ماں کا نام جیہ راجہ بہارا مل تھا۔ شاہجہان کی والدہ کا نام جودھا بائی تھا —— اورنگ زیب عالمگیر کے بیٹے شاہ عالم بہادر شاہ نواب بائی کے بطن سے تھے محمد معظم الدین ملقب بہ بہادر شاہ نظام بائی کا لخت جگر تھا۔ جہاندار شاہ کی والدہ کا نام نظام بائی تھا

عالمگیر ثانی کی ماں الوپ بائی تھیں اور ابوالمظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ لعل بائی کا نورِ نظر تھا۔ علاؤالدین خلجی کی ماں جاٹنی تھیں، سکندر بن بہلول لودھی کی والدہ سنارن تھیں اور نام پتا تھا۔"

مولانا تھوڑی سی دیر رُک گئے پھر عربی کے دو شعر سنائے جو میرے فہم سے بالا تھے لیکن ان کے الفاظ سے جو مفہوم میری سمجھ میں آیا وہ یہ تھا کہ ان لوگوں سے بچنا ہی بہتر ہے جو حسب و نسب کے تعاقب میں رہتے اور آبروؤں میں نقب لگا کر اپنے کسی خاندانی اضطراب کی تشفی کرتے ہیں۔

پھر فرمایا:

مسلم لیگ کے خانوادہ ہیں، ظاہر ہے کہ میرے لئے الفاظ خوش نہیں ہو سکتے تاگو کچھ لوگ ان میں اس لب و لہجہ کے نہیں اور نہ وہ خاندانوں کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کے عادی ہیں لیکن اکثریت کا ایک مزاج بن چکا ہے، غصہ بے قابو ہو تو بگٹٹ طبیعتیں اس طرز ہی سے بولتی چالتی ہیں، پہلے معاملہ سب و شتم کا تھا پھر طعن و طنز تک پہنچا، اب حسب و نسب پر سنگ باری ہو رہی ہے۔ ملال صرف اتنا ہے اور وہ بھی مرحوم ماضی کی رعایت سے کہ سید سلیمان کہاں تھے اور کہاں آ رہے ہے بہر حال ذہنی ہی کوشش کے باوجود میں اس سطح پر نہیں آ سکا جو بعض دوستوں نے اپنے لئے پسند کی ہے، سید صاحب کو جو بات میرے سوانح میں ناگوار محسوس ہو، وہ قلم پھیر دیں۔ اس طرح ان کی طبیعت شگفتہ ہو جائے تو میرے لئے اس سے بڑی خوشی کیا ہو سکتی ہے؟ وہ میرے بارے میں یہ کیوں خیال نہیں فرماتے کہ میں ایک دور کی سرگزشت ہوں اور وہ اس دور میں ہم سفر تھے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ تب جو خوبیاں مجھ میں تھیں وہ ان کی تھیں اور جو خطائیں تھیں وہ میری ہیں۔"

مولانا ٹھہر سے گئے پھر فرمایا:

"پاکستان سے اپنے بارے میں مجھے ہر چیز معلوم ہو جاتی ہے، ایک زمانہ آئے گا جب پاکستان کے لوگ ممکن ہے میرے متعلق اپنی آراء میں تبدیلی کریں۔ وہ چیزیں جو اس وقت سربہ مہر ہیں اور وہ حقیقتیں جو جذبات کے چولہے کا ایندھن ہو چکی ہیں چند برس میں،

بس یہی دس پندرہ سال تک تاریخ کا نوشتہ ہو جائیں گی تب معلوم ہوگا کہ ہندوستان میں اسلام پر کیا بیتی ؟ پاکستان نے خود اپنے ساتھ کیا سلوک کیا اور جو لوگ علم و نظر دونو رکھتے تھے کیونکر ایک سیاسی سیلاب کی نذر ہو گئے "

مولانا کی آواز قدرے بھرا گئی فرمایا :

" باور کرو وہ زمانہ دور نہیں ، تاریخ انگڑائی لے چکی ہے ۔ جغرافیہ کمر کھول رہا ہے اذان فجر ہوگی اور ضرور ہوگی تب ، مسلمانوں کو احساس ہوگا کہ ان کی خانہ ویرانی میں اپنوں ہی کا ہاتھ تھا اور ان کی سوختہ سامانی کے ذمہ دار اپنے ہی چراغ تھے ، تب میری آواز تاریخ کے گنبد سے آرہی ہوگی ، کاش سلیمان اس وقت تک زندہ رہتے تب انھیں میرے حسب و نسب پر سیاسی کدال چلانے کی ضرورت لاحق ہوتی اور نہ میرے مولد کی مٹی ڈھونڈتے ان کا قلم تب اس غریب الدیار کے لئے سپر ہوتا ۔

عربی مقولہ ہے " سیاست کے پہلو میں دل نہیں ہوتا " سلیمان سیاسی نہ تھے لیکن ان کا علم سیاست کی نذر ہو گیا ابوالکلام ، ان کا بہترین صید ہے ۔ ایک زمانے میں ہم دونو یکجا تھے ، بہرحال ذاتیات کی افتاد کچھ ہی ہو میرے لئے سلیمان کو دل سے نکالنا مشکل ہے ۔ وہ علامہ شبلی کی یادگار تھے اور شبلی کی انمول صحبتیں کیوں کر فراموش کی جا سکتی ہیں ؟ "

چہرہ مہرہ

قد طویل نہ قلیل ، متوسط القامت ، اکہرا بدن ، نازک الجثہ ، سرخ و سپید رنگ ، بڑی بڑی آنکھیں ، متحرک اور روشن ۔ آخری عمر میں رنگ دار عینک کے شیشے ان کا غلاف تھے ۔ اس طرح پیشانی کی شکنوں اور آنکھوں کی لہروں سے پتہ چلانا مشکل تھا کہ ان کے ذہنی پس منظر میں کیا ہے ؟ چہرہ کتابی ، ڈاڑھی کچی ، آواز میں جمال و جلال ، مجسم کے حسن طبیعت اور رعب کے سوز دروں کی تصویر طبیعت باغ و بہار ، فطرت کم آمیز ، مزاج میں سطوت ، عوام سے بے نیاز ، ان سے ملنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا ۔ اس حد تک خلوت پسند کہ تنہا آئے اور تنہا چلے گئے ۔ فقر و استغنا کے پیکر اور صبر جمیل کا مجسمہ ۔ کئی کئی دن مہمان شرف ملاقات سے محروم رہتے ، گفتگو کے بادشاہ ، علم کے بحر ناپیدا کنار ، خطابت کے شہسوار قلم کے ایسے دھنی کہ بہ قول رشید احمد صدیقی الفاظ کو ربوبیت و نبوت کا جامہ پہنا دیتے ، اور دماغ سوچنے کے بجائے پوجنے کی طرف چلا جاتا ۔ اردو زبان کے سب سے بڑے خطیب (ORATOR) لیکن مجنوں

سے نفور، سفر کے دلدادہ سیاست دانوں میں عبقری، حافظ بے پناہ، کتابوں کے دوست، مطالعے کے مجنون، قرن اول کے شہ دماغ، مسلمانوں کی تصویر، عیب بینی اور عیب چینی سے متنفر، قرآن کے مفسر، کلام اللہ پر بہ قول حسن نظامی اتنا عبور کہ مصر و شام کے علمائے جدید بھی اس گہرائی اور گیرائی تک پہنچنے سے معذور، آزادی کی جدوجہد کے سالار، گذشتہ اسلاف کی یادگار، مستقبل کے نباض، چال میں طنطنہ ڈھال میں ہمہمہ، بولتے تو پھول جھڑتے، مطالب کے فرش پر الفاظ کا رقص، چاروں طرف سحر پھیل جاتا۔ وجدان جھومنے لگتے، سماعت موتی رولتی۔ ۱۸۵۷ء کی خونخواری کے بعد ۱۹۱۰ء میں اسلام کی پہلی آواز جس نے مسلمانوں کی پلکوں سے نیندیں اتاریں اور ان کے کانوں کا جھومر بن گئی، ان کے دلوں کا نگینہ ہمسان کے دماغوں کا سفینہ ہو گئی۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی دو عظیم ہستیوں میں ایک اقبالؒ تھا جو بے بصر عقیدت کی بھینٹ ہو گیا۔ دوسرا ابوالکلامؒ تھا جو حصول آزادی کے آخری ایام میں مسلمانوں کی غضب ناک نفرت کا شکار رہا۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی ہر زبان میں اس کو گالی دی۔

وہ اُردو زبان کا سب سے بڑا خطیب، سب سے بڑا ادیب اور سب سے بڑا سیاستدان تھا۔ لیکن ڈاکٹر ذاکر حسین کے الفاظ میں اُردو زبان کی ایسی کوئی گالی نہ تھی جو مسلمانوں نے اپنے اس سب سے بڑے محسن کو نہ دی ہو، وہ گالیاں کھاتا اور دُعا دیتا رہا۔

حسب ونسب

پروفیسر محمد اجمل خاں مولانا کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے، الہ آباد یونیورسٹی میں استاد رہے، پھر علی گڑھ میں کچھ عرصہ گزرا، وہاں سے رابندر ناتھ ٹیگور کے شانتی نکیتن میں چلے گئے۔ معلوم نہیں مولانا سے کس سال وابستہ ہوئے۔ ایک دفعہ پرائیویٹ سیکرٹری ہو گئے تو مولانا کی وفات تک ساتھ رہے۔ اجمل خود ایک فاضل انسان تھے، اردو، فارسی عربی اور انگریزی میں خصوصی ملکہ تھا۔ مولانا سے متعلق ایک ناتمام سا مضمون اُردو ادب علی گڑھ کے "آزاد نمبر" میں لکھا۔ "آجکل" دہلی میں بھی ایک واجبی سا مضمون تحریر کیا۔ مولانا کے نام بعض خطوط اور ان کے جوابات کا ایک کتابچہ "ملفوظات آزادؒ" مرتب کیا اور وہ کئی ناشروں نے چھاپا۔ لیکن ان کی تحریروں سے مولانا کے سوانحی خطوط شاذ ہی ملتے ہیں، ابوالکلام ان میں نہیں ہے۔

مہادیو ڈیسائی اور پیارے لال گاندھی جی کے سیکرٹری رہے، انہوں نے مہاتما جی کے سوانح و اسفار پر قلم اٹھایا ہے لیکن ان کے سوا کسی بڑے لیڈر کے سیکرٹری نے اس کام کی ضرورت

محسوس نہیں کی۔ قائدِ اعظمؒ کے متولی موجود ہیں، مولف نہیں، جواہر لال نہرو کے سیکرٹریوں کا بھی یہی خلا ہے۔ ابوالکلام آزادؒ کے سیکرٹری اجمل خان خود صاحب قلم تھے ان کے قلم سے غبارِ خاطر کا دیباچہ معمولی چیز نہیں۔ مولانا کی وفات کے بعد آزاد ساہتیہ اکیڈمی کے سیکرٹری بنائے گئے۔ حتیٰ کہ راجیہ سبھا کے ممبر ہو گئے لیکن ان سے مولانا کے متعلق ہر توقع رہ گئی تا آنکہ واصل بحق ہو گئے۔

احقر سے ان کے تعلقات دوستانہ ہی نہیں برادرانہ تھے۔ ایک دفعہ راقم سے اس سوال پر کہ مولانا ذات پات کے اعتبار سے کیا تھے؟ راقم سے کہنے لگے مولانا کا حسب ونسب ان کا علم وارشاد ہے۔ خواجہ حسن نظامی نے مولانا کو سید لکھا ہے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے "ذکرِ آزاد" میں صدیقی۔ مولانا کے والد ایک بڑے پیر تھے خاندانی کاروبار بھی یہی تھا لیکن مولانا نے خاندان کی اس روایت سے ہاتھ اُٹھا لیا اور اس سے اُلٹ راستے پر آ گئے۔

"ذکرِ آزاد" میں ملیح آبادی نے مولانا کے الفاظ نقل کیے ہیں کہ:

"دراصل میں خود اپنے باپ کا باغی تھا، میرے لیے پیری مریدی بھاری پتھر تھا۔ اُٹھا نہ سکا، چوم کر چھوڑ دیا"۔

مولانا فرماتے:

"ہندوستان میں ان دوکانداریوں سے جو بزرگوں کی اولاد نے خانقاہیت کے نام پر قائم کر رکھی ہیں ان کی نوعیت نہ صرف عظیم الشان کاروباری اداروں کی ہو گئی ہے والّا ماشاء اللہ، بلکہ خدا کی مخلوق بھی ان کی بدولت انسانی شرف سے محروم ہو رہی ہے۔ والد خلد آشیانی کے مریدوں کا حلقہ کلکتہ، بمبئی، سورت، ناسک اور مشرقی بنگال کے بعض اضلاع میں پھیلا ہوا تھا، ان سے مریدوں کی ارادت کے مظاہر دیکھتا تو مجھے وحشت ہوتی، ہر چیز میں بے سروپا قدامت کے نظارے تھے۔ اُدھر قدامت کے محاسن اوجھل اور مفاسد سر اُٹھا رہے تھے۔ یہ تمام انسان کی پرستش وتعبد کا ایک المیہ تھا جس سے طبیعت ابا کرتی۔ مریدوں کا تانتا بندھا رہتا، ان سادہ دلان اعتقاد کا طول وعرض دست بوسی اور قدم بوسی تھا۔ میں عقیدت کی اس مصیبت سے پریشان تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ہم پیرزادے تھے، لیکن ہمارے پاؤں میں کیچڑ لگا ہو، ہمارے پاؤں دھلے

نہ ہوں، جسم کو طہارت کی ضرورت ہو اور مرید ہیں کہ پاؤں چومتے، ہاتھوں کو بوسہ دیتے، قدموں کی دھول آنکھوں پر ملتے آخر کیوں؟ کیا یہ فریب نہیں تھا، وہ کونسی چیز تھی جس نے ہمیں بالا کر دیا تھا، علم و عمل کیا ہیں؟ مریدوں کی عقیدت کا ابتذال اس کا احاطہ کرنے سے قاصر تھا۔ وہ صرف والد کے وعظ و بیان سے مسحور تھے۔ ان لوگوں نے ہندومت کے شکنجوں سے نکل کے اسلام قبول کیا تھا۔ اور اپنے موروثی تصورات کے تحت، پیروں کو برہمنوں کا بدل بنا لیا تھا۔

عربوں میں قبائل کی تقسیم تھی وہ کوئی شرف نہ تھا اسلام نے اسے ختم کر دیا کہ یہ چیز ایک دوسرے کی پہچان کے لئے ہے، اور کوئی شرف ہے تو وہ علم ہے، عمل ہے، تقویٰ ہے۔ ہندوستان میں منوسمرتی نے فرائض کی تقسیم کے لئے ذوات کا جھنڈار قائم کیا، انسان برہمن تھا، کھشتری تھا، ویش تھا اور شودر تھا، پھر صدیوں کی مسافت میں نسلوں کے سربراہوں سے ذات پات قائم ہوئی، کچھ اور آگے بڑھے تو پیشوں کی نسبت ذات ہوگئی۔ ہندو خرافات نے ذات پات میں اتنی شدت پیدا کی کہ مسلمانوں نے بھی ان خود ساختہ بتوں پر اعتقاد کر لیا۔

بعض خاندانوں کی ذوات صوتی اعتبار سے اتنی مضحکہ ہیں کہ ہنسی آتی ہے۔ سوال ہے کہ ان میں شرف کیا ہے؟ نسل انسانی آدم و حوا سے چلی ہے، ہم سب ان کی اولاد ہیں اور اس شرف میں ساری کی ساری نسل انسانی شامل ہے۔ حقیقی شرف کوئی شے ہے تو اسلام ہے۔ اور اسلام میں علم، تقویٰ اور عمل اس شرف کے عناصر ترکیبی ہیں۔

بود و ماند

مولانا کے والد ہندوستان آئے تو ابوالکلام چھ سات برس کے تھے۔ وہ پہلے بمبئی میں ٹھہرے، جہاں والد نے پریل میں زمین کا ایک ٹکڑا لے کر مسجد بنوائی۔ اس کے ساتھ ایک بہت بڑا خام احاطہ تھا، وہاں اقامتی فلیٹ بنوانا چاہتے تھے لیکن کچھ عرصہ بعد کلکتہ چلے گئے۔ لنگ اسٹریٹ میں کرایہ کا مکان لے کر رہنے لگے اور وہیں ۱۹۰۸ء میں انتقال کیا۔ اس طرح بمبئی کی جائیداد کا پلان چوپٹ ہوگیا پھر کچھ معلوم نہ ہو سکا اس جائیداد کا حشر کیا ہوا؟

مولانا آزاد نے "الہلال" نکالا تو ۱۴ میکلوڈ اسٹریٹ میں دفتر اور مکان کرایہ پر لیا۔ وہ چھوڑ

دیا تو بالی گنج سرکلر روڈ میں اُٹھ آئے۔ یہ ایک عمدہ بنگلہ تھا، جب تک مرکزی کابینہ میں شامل ہو کر دہلی نہیں آگئے، اسی بنگلے میں رہے، مولانا ملیح آبادی نے "ذکر آزاد" میں لکھا ہے کہ رپن لین کا مکان دومنزلہ تھا لیکن چھوٹا ہونے کے علاوہ بوسیدہ تھا، اُوپر کی منزل میں مکانیت کم تھی اور نیچے کی منزل اتنی تاریک اور مرطوب تھی کہ ہر وقت پانی رسا کرتا تھا" مُلّا واحدی لکھتے ہیں کہ مولانا دہلی میں تھے تو دریا گنج کے علاقے میں ہمدرد دواخانے کے مالک حکیم عبدالحمید کی کوٹھی کرائے پر لے رکھی تھی مولانا کے اعداد کوچہ پنڈت اور لال کنوئیں کے علاقے میں رہتے تھے۔ ۱۹۲۳ء سے پہلے حکیم اجمل خان کے ہاں شریف منزل بلیماراں میں یا ڈاکٹر انصاری کے دولت کدے واقع دریا گنج میں ٹھہرتے تھے۔ ۱۹۲۳ء کے بعد آصف علی سے تعلق خاطر ہوا تو ان کے ہاں کوچہ چیلاں میں ٹھہرنے لگے۔ وہ سنٹرل اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے ونڈسر پلیس نیو دہلی چلے گئے تو وہاں قیام کیا۔

جنوری ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے وزیر تعلیم ہوئے تو سرکاری بنگلہ مل گیا، پہلے ۲۲ پرتھوی راج روڈ پھر ۱۹ اکبر روڈ اور آخر میں ۴ کنگ ایڈورڈ روڈ پر رہتے تھے وہیں وفات پائی، اور جامع مسجد لال قلعہ کے مابین سرمد شہید کی لحد اور مولانا شوکت علی کی قبر سے کوئی سو گز کے فاصلے پر پارک میں دفن کیے گئے، مزار کھُلا ہے، لیکن اس کے اُوپر سنگی گنبد کا طرہ ہے، اور چاروں طرف پانی کی جدولیں اور سبزے کی روشیں ہیں۔

مولانا غلام رسول مہر نے اپنے نام مولانا کے خطوط اور اور اپنی کتاب 'غالب' کے بارے میں مولانا کی بعض تحریرات کو "نقش آزاد" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس میں "شاہجہاں آباد کے چند مناظر" کے تحت صفحہ ۳۰۶ پر تحریر ذیل ہے (تلخیص)

"لال قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان اب جو میدان ہے یہاں دہلی کے سب سے زیادہ گنجان محلے آباد تھے، قلعہ کے لاہوری دروازہ سے جامع مسجد کی طرف اُردو بازار تھا۔ خانم بازار بھی اسی طرف تھا، اسی حصے میں امرا کی بڑی بڑی حویلیاں تھیں، منشی ذکا اللہ کا آبائی مکان قلعہ اور مسجد کے درمیانی حصے میں تھا، اس سارے علاقے کو انگریزوں نے ایکا ایکی بارود سے اڑا کر دیکھتی آنکھوں ویرانہ کر دیا تھا۔ مولانا آزادؒ کی آخری آرام گاہ ٹھیک اسی جگہ ہے۔

اے خاکِ پاک خاطرِ مہماں نگاہ دار
کیں نورِ چشمِ ماست کہ در بر کشیدہ

خوراک

ملیح آبادی نے "ذکرِ آزاد" (صفحہ ۳۶۹ تا ۳۷۱) میں لکھا ہے کہ[ٹ]:

"مولانا اپنے معمولات میں وقت کے بڑے پابند تھے، خصوصاً کھانے اور سونے کے اوقات میں خلل پڑنا گوارا نہ تھا۔ میری رفاقت کے زمانے میں ان کی خوراک جثے کے لحاظ سے کم نہیں، زیادہ ہی کہی جاسکتی تھی، آخری دور میں غذائیت کم ہوگئی، دوپہر کا کھانا موقوف ہوگیا۔ ڈھائی تین بجے چائے اور ہلکا سا ناشتہ رہ گیا تھا۔ صبح تین چار بجے ضرور جاگ جاتے تھے، ناشتہ کرتے اور مرغ کی یخنی پیتے تھے، سات بجے پھر چائے اور ناشتہ ہوتا۔ عام طور پر گوشت، مکھن اور بسکٹ ہوتے۔ مولانا کے سسرال کالن سٹریٹ میں تھے۔ بسکٹ اسی علاقے میں بنتے اور آتے تھے۔ چائے کبھی لپٹن کی اور کبھی بروک بانڈ ہوتی۔ عموماً خود بناتے تھے، گیارہ بجے دوپہر کا کھانا کھاتے، دسترخوان پر چاول، سالن، بھاجی اور دال ہوتی۔ مٹھاس سے رغبت نہ تھی۔ لیکن سرکے کے اچار کا شوق تھا۔ ہر کھانے میں سرکے میں گلی ہوئی پیاز اور ادرک وغیرہ موجود ہوتی۔ اس کے علاوہ کڑوے تیل میں اٹھا ہوا آم، سیم یا آنولے کا اچار پسند کرتے تھے۔ کھانے کے بعد قیلولہ ضروری تھا۔ دو ڈھائی بجے اُٹھ جاتے چائے پیتے۔ سہ پہر کی اس چائے میں بسکٹوں کے علاوہ پھل خصوصاً کیلے ہوتے رات کا کھانا جلد کھا کر دس بجے سو جاتے کھانا وہی دن کے کھانے کی طرح ہوتا، رات صرف روٹی کھاتے تھے، انواع و اقسام کے کھانوں کا شوق نہ تھا۔ چٹورپن سے نفرت تھی۔ سادہ غذا کھاتے، جو کچھ سامنے آجاتا خوشی سے کھاتے، کبھی کسی کھانے کی تعریف یا مذمت نہ کرتے۔ اپنے باورچیوں سے بھی کسی زحمت میں مبتلا نہ ہوتے۔ ایک باورچی ایسا تھا کہ جو ترکاری ایک دفعہ لے آتا وہی روز لاتا اور دونو وقت پکاتا ٹوکو تو اپنی مدافعت میں دیا کھیان دیتا۔

[ٹ] ملیح آبادی کلکتے میں مولانا کے ہاں تقریباً ۱۰ برس رہے لیکن باہمی روابط کی عمر ۳۶ سال تھی۔

ایک دوسرا باورچی اپنے ہی ڈھنگ کا تھا کھانے میں یا تو نمک ہی نمک یا پھر سرے سے نمک غائب اور دونوں حالتوں میں جواز موجود۔ ایک دفعہ مونگیر سے باورچی منگوایا لیکن وہ کھانے پکانے میں کورا تھا۔"

۲۴-۱۹۲۳ء میں مالی مشکلات شباب پر تھیں ادھر مولانا از حد نفاست پسند، صاحب ذوق، نازک مزاج، شاہ خرچ آدمی تھے کہ جو کچھ ہو بہتر سے بہتر اور اعلیٰ سے اعلیٰ ہو، سگریٹ قیمتی سے قیمتی پیا کرتے تھے لیکن ان دنوں میں گھٹیا سے گھٹیا سگریٹ پر قانع تھے، آنکھ کھولی تو سونے کا چمچہ ہاتھ میں تھا، ہر طرف دولت بکھری ہوئی تھی، اب اس ذہنی کوفت میں مبتلا تھے۔ لیکن مجال ہے کوئی شکن جبین پہ آئی ہو، یا دوسرے کو ان مشکلات کا احساس ہونے دیا ہو، ایک وضعداری اور خودداری میں ڈھلے ہوئے انسان تھے، اس حالت میں بھی ہشاش بشاش رہتے۔ ملیح آبادی لکھتے ہیں کہ:

"ان خشک دنوں میں" ان کی بشاشت و ظرافت عروج پر تھی۔ دوپہر کا کھانا مسور یا ارہر یا مونگ کی ابالی ہوئی دال اور پیچ نکلے ہوئے چاول تھے۔ جب دسترخوان اس طرح عسرت خوردہ تھا تو ان کی زبان مختلف کھانوں کے فضائل و صنعت پر کھلتی اور سامع حیرت انگیز معلومات کے سحر میں ڈوب جاتا۔ آفت سے ان دنوں میں ایک روز مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور مولانا آزاد سبحانی وارد ہوئے۔ مولانا آزاد سبحانی تو ان دنوں گاندھی جی کے چیلے تھے۔ ننگا سر، ننگے پاؤں، ڈاڑھی اور سر کے بال کھچڑی، لنگوٹ بندھا ہوا، مولانا کی نفاست پسند طبیعت کے لئے یہ حلیہ ناگوار تھا لیکن اس وقت وہ مہمان تھے اور مولانا کے لئے ان کی پذیرائی اخلاق کا لازمہ۔ علی برادران نے تو پلاؤ، زردہ، قورمہ اور اسی طرز کے دوسرے قوا کہات کی فرمائش جڑ دی، آزاد سبحانی نے کہا وہ مہاتما جی سے اناج چھوڑنے کا عہد کر چکے ہیں ہر پکوان سے قطعی اجتناب ہے، ان کے لئے کباب اور رس گلے منگوائے گئے تو شامی کبابوں کی ایک بڑی قاب اور دو سیر رس گلے چٹ کر گئے۔"

اس مہمان نوازی کے لئے ایک پشاوری تاجر سے روپیہ قرض منگایا گیا اور ملیح آبادی ہی قرض لائے تھے۔ مولانا مدۃ العمر تنگ دست ہی رہے۔ عموماً قرض لے کر گزر بسر کرتے۔ قرض اس قسم کے عقیدت مندوں سے لیتے جو قطعاً غیر سیاسی ہوتے، قرضہ لوٹانے کا جو وعدہ کرتے اس سے ایک آدھ دن

ادھر اُدھر نہ ہوتے۔ ایک پنجابی کلکتے میں دودھ کا بیوپار کرتا تھا اس سے بھی تعلق خاطر تھا۔ کئی دفعہ اس سے قرض لیتے لیکن قرضے کی فرمائش کے ساتھ ہی اگلی تاریخوں کا چیک بھیج دیتے۔ لاہور میں ایک نوجوان ثناء اللہ ایک بڑے سینما کے مالک اور مشہور فلمساز ہیں، ان کے والد کلکتے میں بیوپاری تھے مولانا اپنی ضرورتوں کے لئے ان سے بھی روپیہ منگواتے کبھی سو کبھی دو لیکن چیک ساتھ بھجوا دیتے۔ ان صاحب نے نیشنل بنک کا ایک چیک کیش ہی نہ کرایا وہ آٹوگراف کے طور پر کہ اس پہ نصف صدی گزر چکی ہے ان کے خاندان میں محفوظ ہے اس کے علاوہ قرض حسنہ کی معمولی معمولی رقموں کے بہت سے خطوط بھی ان کے پاس ہیں۔

ملیح آبادی لکھتے ہیں کہ "مولانا نہ صرف سیر چشم اور فیاض تھے بلکہ شجاعت و بہادری کا نمونہ تھے۔ ان میں فقر و فاقہ کا ذرہ برابر خوف نہ تھا، کتنی ہی عسرت ہو مہمانوں کی مدارات میں فرق نہ آتا اور کوئی سائل خالی ہاتھ نہ جاتا۔ قرض لیتے، بروقت ادائیگی کا انتظام نہ ہوتا تو اپنی قیمتی چیزیں فروخت کر دیتے، بسا اوقات اس طرح اشیاء بیچ کر سائلوں کی مدد کرتے۔ وہ اپنی عسرت کے زمانے میں گھر سے باہر نہیں جاتے تھے لیکن جاتے تو کلکتے میں ٹیکسی پر اور کلکتے سے باہر ریل کے فرسٹ کلاس میں سفر کرتے۔"

منشی عبدالقیوم خطاط مراد آباد کے تھے انہوں نے ترجمان القرآن کی خطاطی کی۔ روزنامہ "الجمعیت" دہلی کے آزاد نمبر میں مولانا کے ساتھ اپنے ڈیڑھ سالہ قیام پر لکھتے ہیں کہ وہ مولانا کے ساتھ اکتوبر ۱۹۳۴ء سے مارچ ۱۹۳۶ء تک رہے۔ ان کے الفاظ ہیں کہ:

"مولانا جس کوٹھی میں رہ رہے تھے اس کا ماہانہ کرایہ دو سو روپے تھا، بالائی منزل میں خود رہتے زیریں منزل ایک ترک عمری صاحب کو ساٹھ روپے ماہانہ کرایہ پر دے رکھی تھی، جہاں ان کی ایک کشمیری بیوی اور دو جوان لڑکیاں رہتی تھیں ان سے جو کرایہ ماہانہ وصول ہوتا وہ ذاتی ضرورتوں میں کام آجاتا۔ مالک کو مدت سے کرایہ ادا نہیں کر رہے تھے۔ قرض کا بار گراں اور بڑی ہی عسرت کا دور تھا۔ خوراک کا سامان آٹا، دال، چاول، گھی، تیل اور مسالے روزانہ ایک دکان سے قرض آتا۔ ہر ماہ اس کا حساب ہوتا۔ ایک بنگالی معتقد کبھی کبھی اپنے گاؤں سے چھوٹی چھوٹی زندہ مچھلیاں لے آتا، کوٹھی میں ایک مختصر سا حوض تھا وہ مچھلیاں اس میں چھوڑ دی جاتیں، پھر دو تین روز پکالی

جاتی تھیں، اسی طرح ایک اور معتقد کبھی بکرے کا گوشت دے جاتا اور کبھی مرغی کا اور اس طرح گوشت پکتا تھا اندر کوئی خادمہ نہ تھی باہر صرف ایک بنگالی خادم سید علی نامی مامور تھا جو بازار سے معمولی سودا سلف لاتا، اس کے علاوہ وہ صبحدم چائے کے پانی کو جوش دے کر اوپر بھیج دیتا یا دال چاول تیار کرتا تھا۔ کچھ عرصے بعد مولانا کی خوش دامن کے توسط سے ایک بہاری بیوہ آگئیں اور وہ باورچی خانے میں کھانا تیار کر لیتیں۔ کھانا نہایت معمولی تھا۔ ترکاری میں عموماً تیل استعمال ہوتا، اپنے لیے مولانا خود چائے تیار کرتے تھے۔

مولانا کے متوسلین میں ایک بیگم، ان کی چھوٹی بہن، خوشدامن اور ابو نصر کے بیٹے نور الدین تھے۔ اس کے علاوہ مولانا کی بڑی ہمشیرہ ایک علیحدہ مکان میں رہتی تھیں لیکن ان کے کفیل بھی مولانا ہی تھے۔

مولانا کے پرائیویٹ سیکرٹری محمد اجمل خاں "اردو ادب" علی گڑھ کے ابوالکلام نمبر میں آپ کی گھریلو زندگی کے زیر عنوان لکھتے ہیں کہ:

۱۔ مولانا صبح کاذب کے وقت اٹھتے اور اپنی چائے خود بناتے تھے۔ انہیں مطلقاً پسند نہ تھا کہ ملازم کو صبح کاذب کی چائے کے لیے تکلیف دیں۔

۲۔ مصری سگریٹ اور چائے کے فنجان ان کے مرغوبات میں سے تھے۔

۳۔ صبح اٹھ کے دو نیم برشت انڈے ایک دو ٹوسٹ اور دودھ کی چائے پی کر کام میں لگ جاتے تھے۔

۴۔ وزارت میں آنے سے پہلے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے دن بہت سادہ کھانا کھاتے۔ کلکتے سے باہر سفر میں ہوتے تو مختلف مصروفیتوں میں چائے کی پیالی اور چند نمکین بسکٹ کافی تھے۔

۵۔ وزارت کے دنوں میں دوپہر کا کھانا مچھلی کے دو تلے ہوئے ٹکڑے، خشکہ، قورمہ، دال ترکاری تھا۔ ان دنوں روٹی نہیں کھاتے تھے۔ البتہ رات کے کھانے میں کبھی کبھار روٹی اور چوزے کا سالن کھا لیتے، ادھر سہ پہر کو چائے کے ہمراہ بھرے ہوئے سموسے

ضرور کھاتے قیلولہ ضرور فرماتے۔

- پھلوں سے کوئی رغبت نہ تھی، آخری عمر میں نارنگی کا عرق یا کسی پھل کی دو چار قاشیں سہ پہر کے ناشتے میں کھا لیتے تھے۔

جہاں تک چائے کا تعلق ہے مولانا کی چائے نوشی کا ذوق "غبارِ خاطر" میں وہائٹ جیسمین (سفید چنبیلی) کے تذکرے سے مثالی ہوگیا۔ مولانا اپنی چائے خود ہی تیار کرتے اور قید خانے میں بھی اس کا التزام رکھتے تھے۔

۱۹۵۶ء میں راقم الحروف دہلی گیا تو مولانا نے سہ پہر کے کھانے پر یاد فرمایا۔ کچھ اور لوگ بھی شرکت کے لئے مدعو تھے۔ وہ کھانا میزبان سے کم درجے کا تھا۔ مٹر چاول، ارہر کی دال، چھوٹے چھوٹے پھلکے اور قورمہ لیکن بوٹیاں انگلی کی پوروں کے برابر تھیں۔ اضافہ بس اتنا تھا کہ طعام میں انڈے کا حلوہ بھی تھا۔ مولانا نے تین چار چمچ چاول، آدھا پھلکا اور تھوڑا سا سالن کھایا۔ لیکن طعام کی سادگی پر طعام کی رنگینی اس طرح غالب تھی کہ دل و دماغ سیر ہو رہے تھے۔

پوشاک

مولانا خوش پوش انسان تھے۔ امام الہند کہلا کر بھی ان میں علماء کی یبوست سی نہ تھی، ان کا لباس شرفاء کا مشرقی لباس تھا۔ اس بارے میں کسی کے مقلد نہ تھے، والد کی زندگی میں مشائخ کا لباس پہنتے تھے۔ ہوش سنبھالا تو ترکی کا یورپین لباس شروع کیا، عمامہ کی جگہ اونچی کالی ٹوپی، بہت اونچا سخت کالر، قمیص کے سخت کف، کھلے گلے کا سیاہ ٹرکش کوٹ، سفید پتلون اور پاؤں میں بوٹ۔ "الہلال" کے ابتدائی دور تک ہلکا عمامہ باندھتے رہے اور عبا و قبا کی جگہ شیروانی۔ کانگرس میں کھدر پہننا شروع کیا تو ابتداً کھدر اور گرمی سے دانے نکل آئے۔ عرصے تک بیمار رہے، پھر عادی ہوگئے۔ کھدر کی قمیص، تنگ پاجامہ، چست شیروانی مستقل لباس ہوگئے۔ کوئی خاص تقریب ہو تو جبہ بھی کاندھوں پر ڈال لیتے تھے۔ بعض دفعہ شانوں پہ شال رکھتے۔ کچھ دنوں ترکی ٹوپی استعمال کی۔ پھر کلپاک پہنا۔ آخر اونچی دیوار کی سیاہ قراقلی کو خاص کرلیا۔ نہایت جامہ زیب تھے۔ جبے پوری گرگابی پہنتے۔ یا سلیم شاہی جوتی، اور شو پہن لیتے، مذہبی تقریبوں میں عمامہ باندھتے۔ زمانہ وزارت میں یورپ کا سفر کیا تو یورپین شوز کے بہت سے جوڑے ساتھ لے گئے اور وہاں پہنا کرتے تھے۔ ایک دفعہ سخت گرمی میں قراقلی پہن کے بیٹھے تھے پنڈت نہرو نے کہا "مولانا اتنی گرمی اور اتنی گرم ٹوپی کیا دوآتشہ ہے؟" کہنے لگے "میرے

بھائی محض وضع کی پابندی ہے۔"

انتقال کر گئے تو پتہ چلا کہ شیروانیوں ہی میں نہیں، قمیضوں اور پاجاموں میں بھی پیوند لگے ہوتے ہیں۔ ان کی بعض تصویروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداً ٹوپیوں کی وضع قطع تبدیل کرتے رہے۔ کبھی مصری، کبھی ترکی، کبھی عراقی، آخر میں شیروانی مستقل ہو گئی۔ شروع میں عینک لگاتے تھے۔ پھر سیاہ چشمہ چڑھالیا۔ گویا آنکھیں ڈھانپ لی تھیں۔

عبادت

مولانا صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے لیکن اس باب میں ان کا مزاج علما کی رسمی عادت سے مختلف تھا وہ صوم و صلوٰۃ کو خدا اور انسان کا معاملہ سمجھتے اور اس سلسلے میں عوام کی سند کے قائل نہ تھے۔ ان کے نزدیک اسلام محض نماز، روزہ اور زکوٰۃ و حج ہی کا نام نہیں تھا بلکہ جہاد فی سبیل اللہ بھی اسلام تھا۔ فرماتے:

"ہندوستان میں مشائخ کے خانقاہی سلسلوں کی بدولت صوم و صلوٰۃ کی رسمی پابندی اسلام کی اساس ہو گئی اور حجرہ نشینی و دم کشی "اہل اللہ" ہونے کی نشانی بن گئی۔ حالانکہ قرآن، نماز روزہ کے علاوہ باطل کے خلاف جہاد و غزا کا اعلان اور عدل و قسط کا فرمان بھی ہے۔ ہمارے مشائخ مرض سے سمجھوتہ کر کے اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ وہ تندرست ہیں وہ مسجدوں کی آزادی سے اس مغالطے میں ہیں کہ اسلام کو اقتدار حاصل ہے۔"

مولانا کو اپنے اللہ سے جو واسطہ تھا وہ ان کے آخری الفاظ سے ظاہر ہے: "اچھا بھائی خدا حافظ۔"

اوّل اوّل رانچی میں نظر بند ہوئے تو وہاں انجمن اسلامیہ کی بنا ڈالی اور اس کی نگرانی میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ اس کی عمارت کے لئے کلکتے کے دوستوں کو لکھا اور اس کے کارپردازوں کو گراں قدر عطیات دلوائے۔ اسی زمانے میں وہاں حنفی و وہابی کا جھگڑا چل رہا تھا۔ اس کو دفع کرایا۔ عام مسلمان حد درجہ غریب تھے ان میں کچھ لوگ دیسی شراب بیچ کر متمول کہلاتے تھے۔ انھیں اس کاروبار سے توبہ کرائی، اور دوسرے کام کاج میں لگایا۔ ان کی آمد سے پہلے رانچی کے اس علاقے میں دین کے فرائض کا اتا پتا نہ تھا۔ مولانا نے سال بھر ہی میں ساری آبادی کو صوم و صلوٰۃ کی راہ پر لگا دیا اور وہ صحیح العقیدہ مسلمان ہو گئے۔

نظر بندی ختم ہو گئی تو کلکتے میں مدرسہ اسلامیہ قائم کیا۔ اس مدرسے کا افتتاح ۱۳ دسمبر ۱۹۲۰ء کو ہوا۔ مولانا حسین احمد مدنی صدر مدرس مقرر کئے گئے۔ ان دنوں آپ مولانا مدنیؒ کے اقتدار میں نماز پڑھتے

تھے۔ جو لوگ آپ کے ساتھ جیل میں رہے ہیں، ان کی روایت ہے کہ مولانا نماز پابندی سے پڑھتے۔ البتہ ریاست پر راضی نہ ہوتے تھے اور نہ کسی کو عبوساً قمطریرا قسم کے ملاؤں کی طرح نماز پڑھنے کے لئے تنگ کرتے تھے۔

سید محمد الیاس کٹھوری نے "الجمعیت" دہلی کے آزاد نمبر میں مولانا کے "مذہبی رجحانات کی جھلک" کے زیر عنوان لکھا:

۱۔ مولانا اسلام کی پابندی میں انضباط اوقات کا پورا لحاظ کرتے تھے۔

۲۔ سوبھاش چندر بوس کے زیر صدارت کانگریس کا اجلاس دہلی میں ہو رہا تھا، مولانا نے مجھے بلا کر ہدایت کی کہ "جب نماز کے لئے جماعت تیار ہو تو مجھے مطلع کر دو۔ چنانچہ کتنے ہی اہم مسائل ہوتے مولانا نماز کے وقت اجلاس چھوڑ چھاڑ کے فرض ادا کرنے اُٹھ جاتے تھے۔

۳۔ مولانا کو قرآن پاک سے کس قدر عشق تھا اس کا ایک واقعہ میرا مشاہدہ ہے آپ ۱۹۵۱ء میں دیوبند تشریف لے گئے، مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ اور قاری محمد طیب وغیرہ ساتھ تھے۔ ایک طرف کمرے میں کوئی طالب علم قرأت کر رہا تھا۔ آپ چھڑی پر ہاتھ رکھ کر اس طرف کھڑے ہو گئے، آنکھیں تر ہو گئیں۔ رکوع ختم ہو گیا تو قاری وغیرہ نے احتراماً اٹھنا چاہا روک دیا۔ فرمایا، دوبارہ پڑھئے۔ کافی دیر سنتے رہے اور لوٹنے لگے تو ایک دفعہ پھر قرأت سنی۔ آخر تک آنکھوں میں آنسو تھے۔"

مولانا کی وفات کے بعد عبدالماجد دریا آبادی نے ان کے خلاف کئی شوشے چھوڑے اور چٹکیاں لیں۔ ایک فرضی خط صدق جدید میں چھاپا کہ "آجکل" دہلی کے "آزاد نمبر" میں مولانا کی زندگی کے ہر پہلو پر مضامین لکھے گئے ہیں، لیکن کسی مضمون سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اتنے بڑے علامہ دہر کی نماز کا حال کیا تھا؟

یہ محض ایک زہر تھا "آجکل دہلی" حکومت ہند کا ماہنامہ، ایڈیٹر پنڈت بالمکند عرش، وہ معارف نہ تھا۔ فرقان نہ تھا۔ برہان نہ تھا۔ بھارتی حکومت کے ماہنامے سے مولانا کی نماز کا حال معلوم کرنا محض ایک شوخی تھی۔ ملک نصر اللہ خان عزیز کبھی "مدینہ" بجنور کے ایڈیٹر رہے۔ اور پاکستان بننے سے پہلے جماعت

اسلامی میں شامل ہوگئے۔ انہوں نے اس خط کی اشاعت پر روزنامہ "تسنیم" لاہور میں ایک مضمون لکھا کہ وہ مدینہ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے زیر دفعہ ۱۲۴ الف گونڈہ جیل میں سوا سال قید گزار رہے تھے کہ مولانا آزاد بھی میرٹھ جیل سے منتقل ہو کر وہاں آگئے اور ہم اکثر باجماعت نماز انہی کے اقتدا میں پڑھتے تھے، ملک صاحب لکھتے ہیں:

"میں ایک دفعہ کھلتے گیا تو میں نے مولانا سے عرض کیا، میرا گمان ہے کہ آپ بعض اوقات نماز میں ناغہ کر جاتے ہیں۔"

مولانا نے فرمایا:

"میرے بھائی آپ کا گمان غلط ہے، میرا اعتقاد اس حدیث پر ہے کہ ترک نماز منجملہ کفر ہے۔ البتہ قید میں رمضان کے روزے قضا کرتا ہوں تو بعد میں جب موقع ملتا ہے ان کی قضا دے لیا کرتا ہوں۔"

ملک صاحب مزید لکھتے ہیں کہ:

"مولانا نماز بڑے خشوع و خضوع سے پڑھتے تھے، ان کا چہرہ شدت تاثر سے سرخ ہو جاتا تھا۔ ملک کی تقسیم کے وقت آل انڈیا کانگرس کا دہلی میں کنونشن ہو رہا تھا تو مولانا نماز کے لیے مسند صدارت سے اٹھ کر اپنے خیمے میں چلے جاتے تھے۔ جیل خانہ میں دسمبر اور جنوری کا مہینہ ہوتا لیکن فجر کی نماز کے لیے سخت ٹھنڈے پانی سے وضو کرتے۔"

راقم الحروف ان کی رحلت پر دہلی پہنچا، کوٹھی کا عجیب عالم تھا، ان کا بوڑھا گن مین جو ہندو تھا اور اگلے روز ریٹائر ہو رہا تھا، ایک عجیب سکتے میں کھڑا تھا، میں نے مولانا سے متعلق اس سے بعض سوال کیے، کہنے لگا۔

"صاحب میں کل ریٹائر ہو رہا تھا، مولانا آج ریٹائر ہو گئے۔ چالیس سال برطانوی ایگزیکٹو کونسلروں اور آزادی کے بعد قومی وزیروں کے ساتھ گزارے ہیں، لیکن مولانا بے مثال تھے۔ اس قسم کے آدمی روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ عید کی نماز جامع مسجد میں پڑھتے تو میں ان کے پیچھے صف میں کھڑا ہو جاتا۔ گن مین کی یہی ڈیوٹی ہے۔ سلام کے لیے منہ پھیرتے تو مجھے دیکھ کر مسکراتے۔ فرماتے ہاں میاں خدا ہی کو یاد

کرتا ہے۔ اس نئی دہلی میں اسمبلی ہال کے بائیں بازو پر مسجد ہے، مولانا اکثر نماز پڑھنے وہاں جاتے۔ میں ساتھ رہتا ہجوم زیادہ ہوتا تو میں بھی نماز پڑھتا۔ مولانا حسب معمول مسکراتے کہتے سنگھیوں نے دیکھ لیا تو فساد کھڑا کر دیں گے۔ کہ مولانا نے اپنا سرکاری گن مین بھی مسلمان کر لیا ہے۔ میں انہی کا بول عرض کرتا، حضور خدا ہی کو یاد کرتا ہے۔"

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے صوم و صلوٰۃ کی پابندی سے متعلق لاہور کے ایک اخبار کا تذکرہ کیا، کہ اس کا پورا قبیلہ صوم و صلوٰۃ کا باغی ہے۔ لیکن اس نے پچھلے دنوں آپ کے خلاف اپنی ایک نظم میں نماز نہ پڑھنے کا طعن کسا تھا، مولانا مسکرائے، فرمایا:

"شاہ صاحب، جب تک انھیں میری سیاست سے اختلاف ہے اس وقت تک میرا اسلام ان کے ہاں مشکوک ہے، اور اگر میں ان کی سیاست کا ہو جاؤں تو پھر اسلام سے میرا لہو و لعب بھی عین اسلام ہوگا، انہیں اسلام کی آڑ میں اپنی سیاست سے دلچسپی ہے۔"

فقر و استغنا

"اک فقر سکھاتا ہے آداب خود آگاہی"۔ مولانا اس مصرع کا صحیح مظہر تھے۔ دوسرا پہلو کہ "اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار شہنشاہی"۔ مولانا حقیقتاً اسی شہنشاہی و فقیری کا مجموعہ تھے۔ ان میں شہنشاہی اور فقر دونو کا شکوہ تھا لیکن برعظیم کے خانقاہی سلسلے کو ہندوستانی مسلمانوں کے لئے زہر ہلاہل سمجھتے۔ فرماتے کہ ہندوستان میں اسلام اہل اللہ کی معرفت پھیلا اور بزرگانِ طریقت کے مختلف سلسلے اسلام کی معنوی طاقت تھے۔ لیکن جب اکابر رجال اُٹھ گئے اور ان کی آخری آرام گاہیں بڑے بڑے روضے بن گئیں تو ان کی اولاد و اخلاف نے شریعت کو پس پشت ڈال کر طریقت کی دوکانیں قائم کر لیں، فرماتے:

"میرا خاندان خود فقراء اور مشائخ کا خاندان تھا، لیکن جہاں تک تصوف کا تعلق ہے قرن اوّل کے اسلام میں اس کا وجود ہی نہیں، عربی فکر میں عجمی پیوند لگا ہے۔ یہ ایک فلسفہ ہے، دین نہیں۔ اور یوں بھی خانقاہی سلسلوں کا جو رنگ ڈھنگ اب ہے اور دعوت و ارشاد کی مسندیں جس طریق پر قائم ہیں وہ تمام تر مسلمانوں کے ذہنی انحطاط کی پیداوار ہے۔"

فرمایا:

"فقر کسب حلال سے پیدا ہوتا ہے۔ اور ایمان کسب حلال کے بغیر ممکن نہیں۔ مریدین کے نذرانوں پر شاہی ٹھاٹھ ضرور قائم ہو سکتا ہے۔ لیکن فقر کا استغنا کبھی پیدا نہیں ہوتا"

فرمایا:

"علم استدلال پیدا کرتا اور فراست کو جلا دیتا ہے، مگر فقر و استغنا سے وجدان کو بال و پر ملتے اور زندگی پر رونق ہوتی ہے۔ لیکن محض فقر و استغنا، بغیر علم و نظر ایک ایسا درخت ہے جس میں پھول اور پھل نہیں لگتے۔ امام مالک فرماتے تھے "جو شخص صوفی ہوا اور فقیہہ نہ ہوا وہ گمراہ ہوا اور جو فقیہہ ہوا اور صوفی نہ ہوا وہ فاسق رہا اور جس نے ان دونوں کو جمع کیا وہ محقق ہو گیا"

مولانا نے کہا:

"الہلال' دو سال کے بعد خود میرے دماغ کا ماضی ہو گیا۔ میں نے ہندوستانی مسلمانوں کے عمرانی تجزیوں سے ایک رائے قائم کر لی کہ انہیں برطانوی غلامی کے عہد میں اصلاح کے لئے چھڑنا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا ہے۔

مسلمان اتنی گدیوں کے سامنے سربسجدہ ہیں اور ان کی خود سپردگی کا یہ عالم ہے کہ ان کے مشائخ نے ذہنی طور پر انہیں مغلوب کر دیا ہے"

مولانا نے اس ضمن میں علماء و مشائخ کا عمومی تجزیہ کرتے ہوئے فرمایا: 'جن لوگوں نے اپنے مریدین کی ذہنی فضا اس طرح بنا دی ہے کہ مسلمان اپنے مجہول النسب حال سے نکلنے کو تیار نہیں وہ ماضی سے بے پناہ عقیدت رکھتے ہیں لیکن مستقبل کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر کے ہاتھ پر ہاتھ دھرے کبھی تماشا ہوتے اور کبھی تماشائی بن جاتے ہیں'

فرمایا:

"میں نے مسلمانوں کو جگانا چاہا اور ان کی آنکھیں کھل گئیں، لیکن پھر شاید اس لئے ناراض ہو گئے کہ میں نے انھیں جگایا کیوں ہے؟ فقر و استغنا یہ نہیں کہ خانقاہ بنا کر درویش کہلائیں یا شیخ ہو جائیں اور مریدوں پر ظاہر کریں کہ وہ علائق دنیا سے بے نیاز ہیں،

اس دنیا کو بدلنا، اس کے علائق سے لڑنا اور اوامر و نواہی کو اس کی مثبت و منفی خواہش بنا دینا بھی فقر و استغنا ہے؛

مولانا سے جب کبھی کسی عنوان سے گفتگو ہوتی راقم اپنے روزنامچے میں بالتفصیل درج کر لیا کرتا۔ اب وہ تمام یادداشتیں ایک مفید ماخذ ہیں۔ کئی عنوانوں کی رعایت سے بعض سوانحی حالات کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ مولانا ایک ایسے خاندان کے نونہال اور ایک ایسے والد کے لخت جگر تھے جو بنگال و بمبئی میں لاکھوں مرید رکھتا تھا۔ والد کی وفات پر یہ گدی مولانا کو منتقل ہو رہی تھی لیکن انہوں نے اس بوجھ کو اٹھانے سے انکار کیا۔ نتیجۃً لاکھوں روپے مفت آمدنی سے دستبردار ہو گئے اور فقر و فاقہ اختیار کیا۔

۲۔ مولانا کی مالی حالت عمر کا ایک بڑا حصہ اچھی نہ رہی، وہ چاہتے تو صرف بمبئی کی جائیداد بیچ کر خاصی رقم لے سکتے تھے، لیکن انہوں نے اس جائیداد کا پیچھا تک نہ کیا۔ ان کی وہ جائیداد غالباً بہنوں نے لے لی۔

۳۔ والد کا انتقال ۱۹۰۸ء میں ہوا پھر چار سال والد کے پس انداز سے گزر بسر کرتے رہے، اس دوران میں بعض قیمتی اشیاء فروخت کر کے گزارا کیا۔ پھر ۱۹۱۲ء میں "الہلال" نکالا۔

۴۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۶ء تک ہفتہ وار الہلال اور البلاغ پریس معاش کا ذریعہ تھے۔ البلاغ پریس کی بعض مشینیں بیچ کر جو روپیہ ملا اس سے ایک عرصہ گزر کی۔ لیکن سہیل عظیم آبادی نے اپنے مضمون "مولانا آزاد" میں انکشاف کیا ہے کہ مشینوں کی فروخت سے جو روپیہ حاصل ہوا اس کی ایک بڑی رقم سے مولانا نے رانچی میں قائم کردہ مدرسے کی دوسری منزل بنوا دی تھی۔

۵۔ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۰ء تک رانچی میں نظربند رہے۔ حکومت نے نظربندی کا الاؤنس دے رکھا تھا، ادھر کچھ کتابوں کی فروخت یا پریس کی آمدنی سے گزارہ ہوتا تھا۔

۶۔ ۱۹۲۰ء میں رہا ہوئے، گاندھی جی سے ملاقات ہوئی اور جلد ہی ملکی سیاست کے سربرآوردہ راہنما ہو گئے۔ پہلی دفعہ تحریک عدم تعاون میں دو سال قید ہوئے۔ "قول فیصل" اسی مقدمہ کا معرکۃ آراء بیان ہے۔

۷۔ ۱۹۲۳ء میں رہائی کے بعد انڈین نیشنل کانگرس کے نیشنل اجلاس منعقدہ دھلی کے صدر منتخب ہوئے۔ اس وقت گزر بسر کا ذریعہ البلاغ پریس تھا، یا بعض چھوٹی موٹی کتابیں تھیں۔

۸ - ۱۹۲۳ء کے اواخر سے لے کر ۱۹۲۷ء کے آغاز تک اونے پونے بسر کی۔ پھر البلاغ (دورِ ثانی) نکالا۔ لیکن مالی بحران کے باعث چھ ماہ بعد بند کرنا پڑا۔ اسی دوران میں تین سال کا عرصہ اس طرح گزرا کہ باقی پریس بیچ کر چند بھینسیں اور گائیں خریدیں اور ایک پنجابی دوست کے حوالے کر دیں۔ وہ دودھ کا تاجر تھا، اس طرح روزمرہ کے اخراجات پورے کیے جاتے۔ اس روایت کو انہی بزرگ نے خود راقم الحروف سے بیان کیا تھا۔

۹ - ۱۹۳۰ء میں کانگرس کی قائمقام صدر کی حیثیت میں بحیثیت صدر گرفتار ہوئے، دو سال قید ہوئی۔ ۱۹۳۲ء میں رہا ہوئے۔

۱۰ - ۱۹۳۱ء میں ترجمان القرآن جلد اول کی فروخت سے تھوڑی بہت آمدنی ہوئی۔ پھر ۱۹۳۶ء میں دوسری جلد کی اشاعت ہوئی لیکن عسرت نے ساتھ نہ چھوڑا اور اس کی سب سے بڑی شہادت ترجمان القرآن کے کاتب منشی عبدالقیوم کا بیان ہے۔

۱۱ - ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۸ء تک یوں توں گزر بسر کی اور یہ امام الہند کا حال تھا۔ بلکہ وہی معاملہ تھا جو علامہ اقبالؒ کے لئے معیشت کے اضطراب نے پیدا کر رکھا تھا۔ عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کے یہ دونو عبقری افلاس کے اس عالم میں تھے۔

۱۲ - ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۶ء تک سیاسی کشمکش کے سال تھے۔ ابتداً انفرادی ستیہ گرہ میں قید ہوئے پھر ۱۹۴۲ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک احمد نگر کے قلعہ میں نظربند رہے۔ ۱۹۴۶ء میں "غبارِ خاطر" چھپی پہلا ایڈیشن حالی پبلشنگ ہاؤس نے چھاپا۔ غالباً دس ہزار روپے میں حاصل کیا۔ دوسرا ایڈیشن نوابزادہ نصر اللہ خان، مسٹر پربودھ چندر اور راقم نے مکتبہ آزاد کے زیر اہتمام شائع کیا۔ اس ایڈیشن کی رائیلٹی کے پچیس ہزار روپے پیشگی ادا کئے۔ ۱۹۴۷ء سے اپنی رحلت ۱۹۵۸ء تک ہندوستان کی مرکزی حکومت میں وزیر تعلیم رہے اپنی تنخواہ کا تین چوتھائی غریب الحال طلبہ اور بے سہارا بیواؤں کو وظائف میں دیتے باقی ایک چوتھائی میں کوٹھی کے اخراجات پورا کرتے۔

۱۳ - الہلال (دورِ اول) میں بعض تعلقداروں اور دو ایک والیان ریاست نے امداد دینا چاہی لیکن دو ٹوک انکار کیا۔ اس سلسلہ میں جو مقالات لکھے وہ فقر و استغنا کے شہ پارے ہیں۔

۱۴ - مولانا کے عقیدت مندوں میں بعض بڑے بڑے روسا کی ایک صنعت کار اور بہت

سے تاجر بھی سمجھے۔ لیکن کسی فرد یا جماعت کا احسان مند ہونا گوارا نہ کرتے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ ابتدائی دور میں حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری ان کی مالی مدد کرتے تھے لیکن ان کا فقرِ غیور کسی حالت میں بھی کسی دوست کے آگے ہاتھ پھیلانے کا روادار نہ تھا۔ حکیم اجمل خان اندر خانہ اِدھر اُدھر سے پوچھتے کہ ان کی گزر بسر کیونکر ہوتی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو "میری کہانی" میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے بعض ہمہ وقتی کارکنوں کو احساس کمتری سے نجات دلانے کے لیے کانگرس سے سیکرٹری شپ کا ماہانہ الاونس قبول کر لیا تھا۔ لیکن مولانا نہ تو کسی نزدیک دور کی تقریب میں شمول کے اخراجات لیتے اور نہ کانگرس فنڈ میں سے پھوٹی کوڑی کو ہاتھ لگاتے تھے اور یہی ان کا فقرِ غیور تھا!

ذکاوتِ حس

مولانا کی تحریروں میں الہلال سے غبارِ خاطر تک، ایک چیز نمایاں نظر آتی ہے اور وہ ان کی ناسازیٔ طبع ہے۔ معلوم ہوتا ہے گویا تمام عمر علالت میں گزاری۔ مولانا کی آخری علالت کا چرچا اور وزارتی مشن سے مذاکرات کا زمانہ تھا۔ ڈاکٹر بدھان چندرائے کانگرس ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ انہوں نے میڈیکل بورڈ کے ہمراہ مولانا کا معائنہ کیا تو بعض صحافیوں نے ان سے سوال کیا "مولانا کی بیماری کیا ہے؟" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "جو دنیا کی شدید الاحساس شخصیتوں کو ہوتی ہے۔ مولانا زمانے کو اپنے ڈھب پر نہ پا کر حالات کی برہمی اور واقعات کی خرابی کے باعث ذکاوتِ حس کے مریض ہیں"۔

مولانا میں نہ تو زمانے سے مصالحت کرنے کی عادت تھی نہ حالات کے آگے سپر انداز ہوتے۔ اور نہ مخالفت کے طوفانوں سے مرعوب۔ ان کے اعصاب کی سب سے بڑی بیماری کا نام یہی تھا کہ زمانے سے سمجھوتہ نہیں کر سکتے تھے۔

وہ خوراک، پوشاک، رہن سہن، بول چال، لکھا پڑھی، اٹھک بیٹھک، بات چیت، غرض صبح و شام کے ہر دائرے میں نفاست پسند تھے۔ کوئی بات ان کی مرضی کے خلاف یا سوچ سے مختلف ہوتی تو ان کے اعصاب میں خلل آ جاتا۔ وہ کسی حالت میں بھی کوئی سی آہ کرنا، کسی پر غصہ نکالنا یا کھلے بندوں گلہ کرنا گوارا نہ کرتے وہ ہر قیامت اپنے دل پر گزار لیتے، البتہ جہاں ایک مرتبہ اعتماد ہل جاتا پھر وہاں کبھی بھروسہ نہ کرتے۔ ان کے اس چلن کی سزا کئی لوگوں نے بھگتی لیکن شدید الاحساس ہونے کے باوجود رہی۔

سے بڑی گالی کھا کر بھی جواب دینا ایک طرف رہا اُف تک نہ کرتے اور خود کسی کو جلوت کیا خلوت میں بھی برا نہ کہتے۔ کسی کے متعلق اعتماد میں دراڑ آگئی تو اس کی قربت سے کنی کتراتے اور چُپ ہو جاتے۔ مولانا محمد علی سے کھپا ڈ ہو گیا تو ان کے وار سہتے رہے اپنی طرف سے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو پنجاب میں اکالی سیاست سے متمتع ہوتے تھے۔ اس کا طول و عرض یہ تھا کہ وہ اکالیوں کی مدد سے صوبہ کانگریس کے صدر ہوتے یا عالی قسم کے ہندو کانگرسیوں کا ساتھ دیتے۔ مولانا اس کو ناپسند کرتے، پنڈت جواہر لال نہرو کیمبرج میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو کے ہم جماعت رہے تھے لیکن مولانا نے ڈاکٹر صاحب کے لیے پہلے آل انڈیا کانگرس پھر حکومت ہند کے دروازے بند کر دیئے۔ مولانا کی نفاست کا یہ حال تھا کہ لوگ انھیں گلاب کی پنکھڑیوں کا انسان کہتے اور ریشم کا گچھا قرار دیتے تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے ایک دفعہ مولانا کی نازک مزاجی پر تبصرہ کرتے ہوئے خوب فقرہ کہا تھا کہ آپ کے تلوے میں انسانی سر کا بال آجائے تو پاؤں میں موچ آجائے گی۔ پھر ہفتوں لیٹے رہیں گے کہ بیمار ہیں۔ انھیں سب سے زیادہ عزیز تخلیہ تھا اور سب سے زیادہ پریشان بھیڑ سے ہوتے۔ وہ عادتاً علاقائی طبیعت کے آدمی نہ تھے ان کا موقف تھا ؎

فراغتے وکتابے وگوشۂ چمنے

تذکرے میں اپنی سوانح عمری کے چند صفحات جس بلاغت سے لکھے ہیں اس کا ہر فقرہ بجائے خود ایک کتاب ہے اور ان چند صفحات کو عالمی ادب کے شہ پاروں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اپنی جوانی کے بارے میں لکھا ہے کہ "اس کے دامن کا ہر قطرہ نچوڑا ہے"۔ حیرت ہوتی ہے کہ مولانا عمر بھر شدید قسم کی اختیاری تنہائیوں کے باوصف عنفوان شباب کے بینا بازار میں کب اور کہاں ٹہلتے رہے اور تب ان کے احساسات و انفعالات کا حدود اربعہ کیا تھا؟

عقل معاش

شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور نے مولانا غلام رسول مہر کی وساطت سے ترجمان القرآن جلد اوّل خرید کی تھی۔ وہ تمام خطوط جو اس سلسلے میں مولانا مہر کو لکھے "نقش آزاد" کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ ان کے متن اور مولانا مہر کی تشریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کاروباری مزاج بالکل نہیں رکھتے تھے۔ شیخ مبارک علی نے راقم سے خود بیان کیا کہ مولانا اس باب میں سادہ دل اور سادہ مزاج تھے۔ اگر براہ راست اپنے قلم کو معاش کا ذریعہ بناتے تو عسرت کے طویل دن نہ کاٹتے اور

نہ ناشروں کے ہتھے چڑھتے۔ ترجمان القرآن سے بیش بہا رائلٹی حاصل کرتے، غبار خاطر سے ایک لاکھ روپیہ پیدا کرتے۔ انھیں خوشحال رکھنے کے لیے ان کا دارالاشاعت اور البلاغ پریس کافی تھا، سال بھر میں ایک کتاب بھی ان کے قلم سے نکلتی تو وہ تجوری ثابت ہوتی، لیکن سیاست کی بے پناہ مشغولیتوں اور تنہائی کی بے عنوان لذتوں نے حصول معاش سے انہیں بے جوڑ کر دیا تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ روپیہ کیونکر پیدا کیا جاتا اور کیونکر سنبھالا جاتا ہے۔ وہ اس میدان ہی کے نہیں تھے۔ جانے کیا موضوع تھا فرمایا:

"روپیہ صرف بنئے پیدا کر سکتے ہیں، فن اور روپیہ، علم اور زر، فکر اور سونا اکابر مشرق میں شاذ ہی اکٹھا ہوتے ہیں۔"

خودداری و غیرت مندی

مولانا آزاد ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی کے ساتھ کانگرس میں شامل ہوئے اور آخر تک کانگرس ہی میں رہے۔ مسلمانوں نے تحریک پاکستان کے زمانے میں بدسلوکی کی انتہا کر دی۔ ان کے خلاف اس قسم کی باتیں کیں کہ اخلاق و شرافت دونوں نے سر پیٹ لیا، لیکن مولانا اس طرح کے جذبات کی طغیانی میں بہنے کے عادی نہ تھے، مولانا چاہتے تو ان کے لیے روپیہ پیسے کی کمی نہ تھی، لیکن خودداری کا یہ حال تھا کہ وزارتی مشن کے زمانے میں جب کانگرسی و لیگی زعماء کا مرکز دہلی تھا، اور گاندھی جی، سردار پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور بعض دوسرے راہنما سیٹھ برلا کے مہمان تھے، مولانا حسب معمول آصف علی کے ہاں مقیم تھے۔ کئی دفعہ برلا نے اپنے ہاں لے جانے پر اصرار کیا لیکن مولانا آمادہ نہ ہوئے۔ سفر میں ہوتے تو عموماً ہوٹلوں میں ٹھہرتے یا پھر جن کانگرسی زعماء سے تعلق خاطر ہوتا ان کے ہاں قیام کرتے۔ مثلاً بمبئی میں بھولا بھائی ڈیسائی کا مکان تھا۔ احمد آباد میں سیٹھ جمن لال بجاج کا دولت کدہ اور الہ آباد میں پنڈت موتی لال کا سوراج بھون تھا۔ اکثر ہندو، مسلمان اور پارسی ان کے قدموں میں دولت کا ڈھیر لگا سکتے تھے۔ لیکن انہیں یہ کسی حال میں گوارا نہ تھا۔ کوئی دس سال وزارت میں رہے، وفات پائی تو جو کپڑے تھے ان میں پیوند تھے اور بنک بیلنس صرف چند سو روپے تھا۔

مولانا محمد علی جوہر ہندوستانی مسلمانوں کے مایہ ناز راہنما تھے آخر عمر میں ذیابیطس کے ہاتھوں مرض الموت کا شکار ہو گئے۔ ان کے جیب و داماں علاج معالجے کے متحمل نہ تھے۔ ہندوستان کے

مسلمان امراء کو معلوم تھا لیکن اس آڑے وقت میں مہاراجہ الور نے آمادہ کیا کہ علاج کے لئے یورپ جائیں وہ سفر و قیام اور علاج معالجہ کے ذمہ دار ہوں گے۔ یہ تھا ایک ہندو مہاراجہ کا اخلاق اس شخص کے ساتھ جو کانگرس چھوڑ چکا اور اب صرف مسلمانوں کی باتیں کرتا اور اسلام سے بے پناہ شیفتگی رکھتا تھا۔ مولانا آزاد مہاراجوں کی دولت سے متمتع ہو سکتے تھے وہ چاہتے تو دولت کے انبار ان کے قدموں میں تھے۔ لیکن ان کی غیرت مندی اور خودداری کا یہ حال تھا کہ اس کوچے ہی سے نا آشنا تھے نظام دکن کو آزادیٔ ہند کے فوراً بعد کشمکش کے آغاز ہی میں مشورہ دیا کہ ریاست کو ہندوستان سے لڑنا مناسب نہیں۔ اولاً حیدر آباد کا ہندوستان کے مقابلے میں ٹھہرنا ناممکن ہے۔ ثانیاً تصادم کا نتیجہ ہلاکت ہوگی۔ ثالثاً سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ رابعاً نظام اپنی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کا ایک ٹرسٹ بنا دیں جو ہندوستان میں مسلمانوں کے تعلیمی استحکام و بقا اور اعانت و احیاء کا باعث ہو۔ اس طرح نہ صرف ان کی بے کراں دولت بچ جائے گی بلکہ مسلمانوں کو بھی تحفظ حاصل ہوگا۔ خامساً۔ اس سارے قضیہ کا حل یہ ہے کہ ہندوستان سے کی بنیاد پر تیس برس کے لیے پیکٹ کر لیا جائے۔ پھر تاریخ خود فیصلہ کرے گی کہ حیدر آباد اور ہندوستان کس طرح رہ سکتے ہیں۔

نظام کے نمائندوں نے خندہ استہزا بلند کیا اور کہا :

"مولانا آپ مایوسی کی باتیں کرتے ہیں۔ ہم انشاء اللہ ہفتہ عشرہ میں دہلی کے لال قلعہ پر قابض ہوں گے اور وہاں ہمارا جھنڈا لہرائے گا۔"

مولانا نے غور سے ان کے چہروں کو دیکھا اور کہا : "بہت خوب، میں کامیابی کے لیے دعاگو ہوں۔"

حیدر آباد کا سقوط ہو گیا تو مولانا مسلمانوں کی بربادی کے احوال سن کر وہاں پہنچے تو لوگ خونریزی کے مرتکب ہو رہے تھے۔ انہیں روکا، مسلمانوں کی ڈھارس بندھائی، مسلمان عورتیں کنوؤں میں چھلانگیں لگا کر مر رہی تھیں، انہیں باز رکھا۔ نظام نے کھانے پر مدعو کیا۔ جو صاحب دعوت نامہ لے کر آیا اس سے کاغذ لے کر پشت پر لکھ دیا۔

"جس شخص کے سوءِ فہم اور نظر کج کی بدولت مسلمانوں کا لہو اس طرح بہا ہے، میرے لیے اس کے دسترخوان پر آنا ممکن ہی نہیں۔ انسانوں کے خون سے ہاتھ رنگ کر مجھے دسترخوان پر مدعو کرنا ابلہانہ جسارت ہے۔"

طریق گفت گو

مولانا گفت گو کے عصری فرمانروا تھے۔ ہندوستان بھر میں ان سے بڑا گفتگو طراز نہ تھا۔ زبان ان کی لونڈی، بیان ان کا پیش کار اور علم ان کا مصاحب تھا۔ ان کے سامنے بڑے بڑوں کا شعلہ گفتار کجلا جاتا۔ وہ کمزور گفت گو سن ہی نہ سکتے تھے کسی نے بات کی انہوں نے جھول محسوس کیا فوراً رشتہ سخن کاٹ کے فرماتے، میرے بھائی تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں اور جس کی بات ہوتی وہ حسرت وحیرت سے دیکھتا اور سوچتا کاش نطق کا یہ اعجاز مجھ میں ہوتا۔

ہندوستان کا کوئی مسلمان، ہندو، پارسی یا سکھ راہنما ان کے پایہ کا گفتگو طراز نہ تھا۔ سب ان سے مرعوب ہوتے اور ان کے سحر میں بہہ جاتے تھے، اجمل خان لکھتے ہیں:

"جی چاہتا تھا صبح سے شام تک ان کی شیریں گفتار اور نمکینیٔ ادا سے ذائقہ سماعت حاصل کرتے رہو۔"

(اردو ادب صفحہ نمبر ۲۷ آزاد نمبر)

ملیح آبادی نے ذکر آزاد میں لکھا ہے:

"مولانا سچ مچ از حد زندہ دل آدمی تھے، طبیعت میں مزاح کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا تھا۔ زیادہ سے زیادہ سنجیدہ اور خشک سے خشک مباحث و معاملات کے لیے بھی ان کا ذہن ویسا ہی حاضر تھا جیسا مزاح و مذاق کے لیے، ایک ہی وقت میں مزاح بھی کر سکتے تھے اور سنجیدہ گفت گو بھی بلکہ ان کی سنجیدہ گفتگو میں بھی ظرافت کی لطیف چاشنی رہا کرتی تھی۔"

لیکن ان کا مزاح، پھکڑ، ابتذال اور طعن نہ تھا۔ وہ لطائف کے حدود میں رہتے اور نہایت شستہ و رفتہ مذاق کرتے۔

وزارتی مشن کے زمانے میں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ دہلی میں تھے ان کی تقاریر سے فسادات کا ابتدائی دور رک گیا اور یہ کوئی معمولی چیز نہ تھی۔ ملک فیروز خان نون نے دہلی میں کہا تھا کہ پاکستان نہ بنا تو ہم چنگیز خان و ہلاکو خان بن جائیں گے۔ شاہ جیؒ نے وہیں ایک بڑے جلسے میں سخت نکتہ چینی کی اور فرمایا:

"فیروز خان کو شاید اپنے نام کی مناسبت سے چنگیز خان اور ہلاکو خان کے مسلمان ہونے

کا گمان ہوا ہے"۔
اگلے روز شاہ جیؒ مولانا سے ملے تو مولانا نے ایک موضوع اٹھا کر کئی موضوع پیدا کئے ہے

دعا دے مجھے اے زمین سخن
کہ میں نے تجھے آسماں کر دیا

مولانا گفتگو کرتے تو الفاظ سلک مروارید ہوتے یا رنگا رنگ پھولوں کا سبد، اور تمام اجزا طبق نسخے کی طرح ہوتے۔ شاہ جیؒ نے کہا:

"سنا آپ تقریر میں گالی دینے لگے ہو"۔

شاہ جی نے لاحول پڑھا اور کہا "حضرت آپ سے کس نے کہا؟ جس نے الہلال پڑھا ہو وہ گالی دے سکتا ہے؟"

مولاناؒ۔ "کوئی ذکر کر رہا تھا کان میں بھنک پڑی تعجب ہوا"۔

شاہ جیؒ "آپ نے اعتبار کر لیا؟"

مولانا۔ "اعتبار کا سوال نہیں، معاً تحریک خلافت کا زمانہ یاد آگیا۔ کوئی چوبیس پچیس برس پہلے آپ نے لاہور میں ہیر وارث شاہ کے چند اشعار سنائے تھے۔ قافیہ تھا جل، چل، ٹل وغیرہ۔ خیال آیا جو شخص اس قسم کے بیہودہ شعر یاد کر سکتا ہے وہ شاید غصے میں گالی بک گیا ہو"

شاہ جی کھلکھلا کر ہنس پڑے ہم لوٹ پوٹ ہو گئے، مولانا کی زبان سے پنجابی الفاظ اس طرح نکل رہے تھے گویا قاقم پر سنگ ریزے لڑھک رہے ہیں۔

پروفیسر آل احمد سرور نے اردو ادب کے آزاد نمبر میں ایک تاثر کے عنوان سے لکھا تھا۔

"ساہتیہ اکاڈمی کے اجلاس کی صدارت مولانا ہی فرماتے تھے، میں نے سال کی بہترین غزلوں اور نظموں کا انتخاب منظوری کے لیے پیش کیا اور انعام کے لیے اختر الایمان کی سفارش کی تو ہنس کے فرمایا۔" ان کا نام ہی غلط ہے۔ نظم کیسے اچھی ہوگی"

مولانا کسی چیزوں پر ٹوکتے اور ان سے روکتے تھے مگر اسلوب کلام بے ضرر ہوتا ان کے لہجے میں کوئی آزار نہ تھا۔

تکیہ کلام

ملیح آبادی نے ذکرِ آزاد میں لکھا ہے۔
"مولانا جب کسی کو بنانا چاہتے یا اس سے پیچھا چھڑانا چاہتے تو اکثر میرے بھائی کہہ کر باتیں کرتے تھے۔ یار لوگوں نے اس کو اپنے لئے اعزاز جان لیا تھا۔ لیکن بولتے چالتے یہ جملہ ان کا تکیہ کلام بن گیا اور آخر عمر تک زبان پر چڑھا رہا۔"
ممکن ہے ابتداً میرے بھائی سے یہی مقصود ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا جب کسی رفیق، معتقد، عزیز، ہمسفر، دوست اور ملاقاتی سے بات چیت کرتے تو میرے بھائی ان کا تکیہ کلام ہوتا اور وہ مخاطب سے اسی طرح کلام کرتے تھے۔

معاملات میں صفائی

معاملات میں صفائی رکھنا فرض سمجھتے۔ اس باب میں سخت متشدد تھے۔ ہر بات ناپ تول کے کرتے۔ جو کام کرتے رکھ رکھاؤ سے کرتے اور جو قدم اٹھاتے، سینت سینت کے اٹھاتے۔ وہ نہ تو افراط و تفریط پسند کرتے اور نہ جوش و غضب کے آدمی تھے۔ وہ زبان کر کے پھرنے والے نہ تھے، لین دین میں سچے تھے۔ جس سے قرض لیتے اس کو تاریخ مقررہ کا چیک بھجوا دیتے۔ بصورت دیگر جب تک قرض ادا نہ کر لیتے مضطرب رہتے، معلوم ہوتا انہیں کوئی داخلی بے چینی ہے۔

ہمارے دوست خواجہ صدیق الحسن دگوجرانوالہ کے نوجوان لیڈر، امرتسر کے مہاجر ہیں۔ ان کے والد کلکتے میں سٹال مرچنٹی کرتے اور کشمیری چادروں کے تاجر تھے۔ وہ بیمار ہو کر امرتسر آگئے اور قضاء الٰہی سے انتقال کر گئے۔ خواجہ صدیق الحسن نے راقم سے ساہیوال سنٹرل جیل میں بیان کیا کہ ہم لوگ شروع ہی سے لیگ میں تھے۔ والد کی وفات کے دو تین ماہ بعد اچانک مولانا ابوالکلام آزادؒ کا خط ملا کہ آپ کے والد کی وفات کا سن پا کر افسوس ہوا، اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کریں، بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ وہ یہاں تھے تو ان سے ڈیڑھ سو روپیہ قرض حسنہ لیا تھا وہ رقم اس خط کے ساتھ منی آرڈر کر رہا ہوں۔ وصول فرمالیں۔ والسلام"۔

خواجہ صاحب کہتے ہیں اگلے روز منی آرڈر مل گیا۔

مولانا رحلت کر گئے تو کسی کے مقروض نہیں تھے۔ لیکن بہت سے طلبہ اور بہت سی بیوائیں ان کے جنازے میں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ معلوم ہوا کہ مولانا انھیں ہر ماہ کی پانچ تاریخ

کو اپنی تنخواہ میں سے امدادی وظائف دیا کرتے تھے۔

اعتقاد و مسلک

مولانا پر اعتقاد و مسلک کے چار دور گزرے۔

۱۔ وہ پیدائشی پیرزادہ تھے اور جو اسلام انھیں ورثے میں ملا وہ محض رسم و تقلید کا مذہب تھا۔

۲۔ اس تقلیدی ورسمی مذہب کے خلاف ابتدائی عمر میں شک اور اضطراب کی خلش پیدا ہوئی جس نے انکار اور دہریت کی طرف ڈال دیا اور سرسید مرحوم کے افکار نے دل و دماغ کا احاطہ کر لیا۔

۳۔ اس دماغی سفر نے ایک تیسری کروٹ لی اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مذہب کی راہ عقل و ادراک سے نہیں بلکہ خالص اور بے میل جذبات ہی سے طے کی جاسکتی ہے۔

۴۔ وہ جدید و قدیم کے مطالعے سے اس حقیقت کو پہنچے کہ قرآن تمام گمشدہ سچائیوں کا احیاء اور صداقت ربانی کا آخری صحیفہ ہے۔ اس کی تعلیمات معاشرہ انسانی کی فلاح و نجات کیلئے قطعی ہیں اور وہ تمام انسانوں کو ایک خدا کی چوکھٹ پر لانے کی دعوت ہے۔ فرماتے حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ معاشرۂ انسانی کے لیے حجت قاطع اور ہدایت اکمل ہے۔ ملیح آبادی نے ذکر آزاد میں لکھا ہے کہ "مولانا مذہباً سلف صالحین کے مسلک پر استوار تھے۔ اور عقائد میں مسلک سلف سے تجاوز گوارا نہ تھا، لیکن عمل میں بڑے رواداز تھے۔ وہ مذہب میں خشونت، یبوست، تنگ دلی، تنگ نظری، ظاہر پرستی اور ہر قسم کے ذہنی آزار کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ فرمایا:

> "میں اعتقاد توحید و رسالت اور عمل صالحہ کو نجات کے لیے کافی سمجھتا ہوں۔ اس کے سوا مجھے اور کچھ معلوم نہیں، قرآن کریم مسلمانوں کا حقیقی امام ہے۔ وکُلَّ شَیْءٍ احْصَیْنٰہُ فِیْ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ۔"
> (الہلال جلد ۴ نمبر ۱ صفحہ ۲۴)

مولانا کے دل میں ہر دینی وجود کے لیے احترام تھا۔ کسی طرف سے کسی مذہبی دنگل میں کبھی شریک نہ ہوتے لیکن جن شخصیتوں نے اثبات حق کے لئے مصیبتیں جھیلیں اور تاریخ میں دعوت و عزیمت کا سفر کیا ان کے سوانح و افکار شروع سے آخر تک ان کی شخصیت پر چھائے رہے۔ مثلاً امام احمد

بن حنبلؒ اور امام ابن تیمیہؒ ان کے قافلہ جہد و فکر کے راہنما تھے۔

ہندوستان میں امام ولی اللہؒ اور ان کے خاندان سے ایک گونہ تعلق تھا۔ غرض ہر وہ شخصیت جس نے دین حق اور امت کے لیے اپنے دور کے استبداد کا مقابلہ کیا، اس سے ان کے فکر و عمل کا ذہنی رابطہ تھا۔ اکثر لوگ ان سے بعض فقہی مسائل اور شرعی امور کے علاوہ مروجہ رسوم کی مذہبی چھاپ کے مقامی رنگ و روغن پر سوال کرتے۔ مولانا فقہی و علمی سوالوں کا جواب تو ضرور مرحمت فرماتے لیکن جس سوال میں فتنہ چھپا ہوتا، اس کا جواب نہ دیتے۔ کوئی خاص عقیدت مند اصرار کرتا تو لکھوا دیتے۔ مقامی علما سے رجوع کریں۔ فرمایا:

"جو رسوم و زوائد عوام کے غلط ہی عقائد میں داخل ہو گئے ہیں ان کی اصلاح کا یہ طریقہ نہیں کہ ہم عوام کے جذبات کو مشتعل کریں۔ اس سے اصلاح نہیں ہو سکتی بلکہ اور نئی اجتماعی مفرتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ چاہیے کہ نہایت صبر و تحمل سے کام لیا جائے، جذبات کو بلا ضرورت ٹھیس نہ لگے، اشتعال انگیز صورت نہ ہو، حریفانہ نزاع کی شکل حتی الامکان پیدا نہ کی جائے۔ بیان میں سختی و گرمی نہ ہونی چاہیے۔ تعین و تسمید کے ساتھ رد و طعن بالکل نہ کی جائے۔ عملاً ایسی فضا پیدا کرنی چاہیے اور ایسے وسائل اختیار کرنے چاہئیں کہ خود بخود ان اعمال کی شگفتگی و رونق و محبوبیت ماند پڑ جائے، اور ان میں کشش و دلربائی باقی نہ رہے۔"

(آزاد کی کہانی صفحہ ۲۹۲)

مولانا اصل عقائد میں کوئی پیچیدگی نہ پاتے تھے، فرماتے:

"ایک معمولی شد بد کا مسلمان بھی قرآن و سیرت کے مطالعے سے اصل اسلام کی تہ کو پہنچ سکتا ہے۔ ساری خرابی مسلمانوں نے عمل میں پیدا کر لی ہے۔ عمل صالح سے دستبردار ہو کر انسانی معاشرے میں اصلاح و انقلاب کے دروازے بند کر دیئے ہیں اور اس کے ذمہ دار اکثر علماء و مشائخ ہیں۔"

راست گفتاری

مولانا سے طلبہ کی ایک جماعت نے سوال کیا۔

"مولانا، آدمی بڑا کیونکر بنتا ہے؟"

فوراً جواب دیا:

"چند عالمگیر سچائیاں ہیں جنہیں اختیار کرنے سے آدمی بڑا بن جاتا ہے۔"

گاندھی جی سے تعلقات کی استواری کا ذکر آیا تو کہنے لگے،

"مجھے جو چیز ان کی پسند آئی وہ ستیہ (سچائی) ہے۔"

بعض تاریخی شخصیتوں کی راست گفتاری کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

"جو شخص سچائی سے محروم ہو وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا، راست گفتاری اور راستبازی خدا کی غیر مترقبہ نعمت ہیں۔ جو سچ بولتا ہے وہ خدا کی بارگاہ میں سرخرو ہوتا اور اس کا دل ہمیشہ مطمئن رہتا ہے۔ سچائی پیغمبروں کا شعار ہے، اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کو اس سے بہرہ مند کرتا ہے جو اس کے خوف سے اپنے دل کو روشن رکھتے اور اس کے ذکر سے زبان کا جادو جگاتے ہیں۔"

فرمایا:

"قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے بار بار جھوٹے پر لعنت کی ہے اور کسی کے لیے لعنت نہیں۔ عالمی تجربہ بھی یہی ہے کہ جھوٹ ہمیشہ حسرتوں اور شکستوں کا شکار ہوتا اور ذہنی ویرانیوں کو جنم دیتا ہے۔

وہ لوگ جو حکومتوں کے قہر و غضب کا شکار رہے اور جنہیں عوام کالانعام نے اپنے سب و شتم کا نشانہ بنایا اگر راست باز اور راست گفتار نہ ہوتے تو ان کی زندگیاں اجیرن ہو جاتیں۔ اور وہ طبعی موت سے بہت پہلے مر جاتے، سچائی ایک طاقت ہے جو کسی لشکر سے مسخر نہیں ہوتی اور اس کے لیے کسی دور میں کوئی زوال نہیں ہے۔"

نفاست پسندی

مولانا کا مذاق ہر معاملے میں نفیس تھا، ہر چیز نفاست سے رکھتے اور نفاست سے چاہتے تھے، اپنا علمی اور سیاسی سفر بھی نفیس لوگوں کے ساتھ شروع کیا۔ ان کا رہنا سہنا، کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، بولنا چالنا، لکھنا پڑھنا، غرض سفر حیات کا ہر قدم نفیس تھا۔ ایسی کسی چیز کا تصور ہی نہ کر سکتے تھے جو قبیح یا مکروہ ہو۔ مذاق کی نفاست کا یہ حال تھا کہ "الہلال" کے ابتدائی

دور میں تو معاصرین سے ادبی نوک جھونک کرتے رہے۔ لیکن ناگوار الفاظ سے قلم و زبان کبھی آلودہ نہ کئے، اس کے بعد اس روش ہی سے دستبردار ہو گئے۔ وہ کسی کی ہتک یا ہجو کا تصور ہی نہ کر سکتے تھے۔ ان پر تحریک خلافت کے بعد حاسدوں نے بہت سے رکیک حملے کئے لیکن کبھی رسید تک نہ دی مسلم لیگ کا شباب ان کے لیے قیامت ہو گیا۔ قائد اعظم نے شو بوائے کہا، ملک میں ہنگامہ سا ہو گیا۔ وقائع نگاروں نے چاہا مولانا جواب دیں لیکن مسکرا کے ٹال گئے بعض رفقاء نے کہا "جناح کو اس گالی کا جواب ضرور ملنا چاہیئے"۔ فرمایا:

"چھوڑیئے، مسٹر جناح نے اس سے اپنی عزت میں کوئی اضافہ نہیں کیا ہے"۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ سے ہم کلام تھے اور موضوع خطابت تھا، فرمایا:

"ایک روشن دل و دماغ کا آدمی اپنی زبان پر کبھی غیر شائستہ الفاظ نہیں لاتا۔ وہ الفاظ جن میں کھردرا پن ہو اور مقصود کسی کی اہانت یا تضحیک ہو ان سے طبیعت کی نفاست مجروح ہوتی اور سماعت کا حسن مغموم ہوتا ہے"۔

سبھاش چندر بوس نے مہاتما گاندھی سے لڑائی کے بعد جو گرما گرم بیان دیئے ان میں مولانا کو ازراہ تعریض مغل اعظم کہا، مولانا مغل اعظم نہ تھے۔ لیکن ان میں مغلوں کا شکوہ، عباسیوں کا طمطراق عبیدیوں کا تفکر اور علویوں کا تقدس ضرور تھا، ادبی عناصر ربعہ تھے جن سے ان کی نفاست پسندی کا ہیولیٰ تیار ہوا تھا۔

سادگی

مولانا زرق برق طبیعت کے انسان نہ تھے۔ لیکن آن بان کی شخصیت ضرور تھے۔ ان کا باس اجلا لیکن سادہ تھا تمام عمر کرائے کے بنگلے میں گزاری۔ وزارتی بنگلے میں وفات پائی۔ کوئی ذاتی مکان یا ذاتی جائیداد نہ تھی، لیکن بعض چیزوں کے انتخاب میں "گراں قیمت" تھے۔ مثلاً دوستوں کا انتخاب۔ کانگرس میں ان کے جگری دوست موتی لال نہرو، سی آر داس اور بھولا بھائی ڈیسائی تھے۔ "غبارِ خاطر" کے خطوط نواب صدر یار جنگ شیروانی رئیس حبیب گنج پور کو لکھے، کتابوں کے معاملے میں رؤسا کی طرح شاہ خرچ تھے، جب مالی آسودگی ہوتی تو مصری اور ترکی سگریٹ پیتے اور مسلسل پیتے۔ اس کے علاوہ ورنہ ہر چیز میں سادگی اور کفایت رکھتے، کھانا تو بالکل ہی سادہ تھا جو ملا کھا لیتے کسی ملازم سے کبھی باز پرس نہ کی۔

مولانا نے "غبار خاطر" میں اپنے ذاتی ملازم عبداللہ کا ذکر انتہائی شفقت سے کیا ہے۔ وہ کسی مرید کا لڑکا تھا۔ ملیح آبادی نے "ذکرِ آزاد" میں لکھا ہے۔

میں نے مولانا سے دریافت کیا "یہاں دہلی میں باورچی خانے کا خرچہ کیا ہے"؟

فرمایا: "یہی بارہ تیرہ سو"

دوپہر کا کھانا چھوڑ چکے تھے، دعوتوں کا معاملہ الگ تھا اور کھانے والے دو تین ہی تھے۔

عرض کیا: "گھی کہاں سے آتا ہے"؟

فرمایا: "گھی نہیں ڈالڈا آتا ہے"۔

ملیح آبادی لکھتے ہیں: "یہ سنا تو میں بوکھلا اٹھا، معلوم ہوا عبداللہ ہر روز ایک مرغی کی قیمت لیتا لیکن ایک مرغی کی یخنی مولانا کو تین روز پلاتا ہے۔ وہ دونو ہاتھوں سے مولانا کو لوٹ رہا تھا، اس سے پہلے کہ ملیح آبادی مولانا کو شکایت کرتے عبداللہ بیمار پڑ گیا اور جھٹ پٹ مر گیا۔ ملیح آبادی رقم طراز ہیں:

> "میں نے مولانا سے تعزیت کی، تو ان کی آنکھوں میں آنسو بھر رہے تھے۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ مولانا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پہلی دفعہ بیگم کی وفات اور دوسری دفعہ عبداللہ کی موت پر کہ ان کی خدمت میں بچپنے سے جوان ہوا تھا"۔

معلوم ہوا عبداللہ نے اپنے گاؤں ضلع گونڈہ میں جائیداد خرید رکھی ہے اور مرنے کے بعد اس کا بھاری بینک بیلنس نکلا تھا۔

رحمدلی

مولانا خلقتاً رحم دل تھے۔ اس رحم دلی ہی نے انہیں والد کی گدی کا باغی کیا تھا، اکثر غریب الحال لوگوں کی مدد کرتے اور تنگ دستی کے زمانے میں بھی کسی سائل کو مایوس نہ کرتے تھے۔ بسا اوقات اپنی قیمتی اشیاء فروخت کرکے یا قرض لے کر محتاجوں کی اعانت فرماتے تھے۔ ان کا دل اتنا گداز تھا کہ کلکتے کے فسادات پر ان کی آنکھوں میں آنسو ہی آنسو تھے۔ جب دھلی لٹی اور مسلمانوں کے لیے اس کے کوچہ و بازار شعلہ زار ہو گئے تو پرانی دھلی کے علاقے میں مارے مارے پھرتے، مسلمانوں کو پکڑ پکڑ کے سہارا دیتے، ان کا حوصلہ بندھاتے اور آیات قرآنی سنا کر ان کے حوصلوں کو بلند کرتے تھے۔ اپنی کوٹھی کو بعض ایسے خاندانوں کے لیے پناہ گزین کیمپ بنا دیا جو دھلی کے رؤسا میں سے تھے، جنہوں نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور پاکستان جانے کے لیے پرتول رہے تھے۔

مولانا نے اسی زمانے میں مولانا عبدالحق (بابائے اردو) کو پناہ دی۔ سید سلیمان ندوی پاکستان آ

رہے تھے تو بھارتی کسٹم کے افسروں نے تلاشی لے کر بعض چیزیں روک لیں۔ سید صاحب لوٹ کر مولانا کے ہاں گئے اور چھٹکارا حاصل کیا۔

مولانا کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اپنے بڑے سے بڑے دشمن کی افتاد میں سراپا شفقت ہوجاتے اور کسی سے انتقام لینے کے عادی نہ تھے۔

شب و روز

مولانا کی ابتدائی عمر میں شب و روز کا تصور ضرور ہوگا لیکن وہ اس قسم کے احباب رکھتے تھے جن میں صبح و شام کی صحبتوں کا تصور تھا۔ لیکن سیاست میں قدم رکھا، جب تحریک خلافت کی نیو اٹھائی بلکہ اس سے پہلے رانچی کی نظر بندی کا آغاز ہوا تو شب و روز کا تفریحی اور مجلسی تصور عنقا ہو گیا۔ رفتہ رفتہ ان کی زندگی روزانہ صحبتوں کے تسلسل سے محروم ہو گئی اور وہ نوشتۂ خوند کی تنہائیوں کے ہو کے رہ گئے۔

مولاناؒ کے متعلق روایتیں اور حکایتیں سننے سنانے والے تو بہت سے مل جاتے تھے، لیکن کوئی شخص ایسا نہ ملا جو آنکھوں دیکھا حال بیان کرتا۔ خود ذاتی معتمد ان کے شب و روز بیان کرنے سے قاصر تھے، ان کی محفل آرائیاں وقتی ہو کے رہ گئیں۔ کبھی کبھار مختلف گوشوں سے لوگ آتے اکثر اپنے علم و فن میں منفرد ہوتے، ان سے مکالمت فرماتے تو گلفشانی گفتار سبحان اللہ کہ علم و نظر اور فکر و خیال کی اسی رفعت کا نام ابوالکلام تھا۔

رات بعجلت سو جاتے، صبح کاذب سے پہلے اٹھتے، چائے پیتے، غسل کرتے، نماز پڑھتے، پھر چائے پیتے اور دن بھر طے شدہ کام کرتے۔ کسی چیز سے پرہیز تھا تو وہ ملاقاتی تھے۔ لازماً وہ شخص خوش قسمت ہوتا جو تنگ و دو کے بعد ملاقات کر پاتا۔ چاہتے تو بیسیوں کتابیں لکھ جاتے لیکن تذکرہ، ترجمان القرآن (دو جلد)، اور غبار خاطر کل تین کتابیں ہیں اور ان تینوں میں کئی کئی برس کا فاصلہ ہے۔ وزارت کا زمانہ خالی گزر گیا، وزارتی امور کے علاوہ صرف ایک مصروفیت تھی اور وہ یورپ کی تاریخ، سیاست، فلسفہ، مذہب اور بعض دوسرے مباحث پر فرانسیسی و انگریزی کی نو مطبوعہ کتابوں کی خرید اور ان کا مطالعہ تھا اور مطالعہ تھا کہ دس برس کی عمر سے ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔

عیب بینی و عیب گوئی سے نفرت

عیب بینی، عیب چینی اور عیب گوئی سے اس درجہ متنفر تھے کہ اس طبیعت کے راویوں سے

کنّی کتراتے اور انھیں ٹوک دیتے تھے۔ فرماتے روح، نگاہ اور زبان کی اس بیماری کے مہلک ہونے میں شک ہی نہیں، صرف وہی لوگ اس پر راضی ہوتے یا اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، جن کی عقلوں کو زنگ لگی ہو۔ اس عیب بینی یا عیب چینی کی بدولت اتنے بگاڑ پیدا ہوئے ہیں کہ ایک ایسی عمارت جو اخلاص فی العمل سے استوار تھی، نہ صرف منہدم ہوگئی بلکہ مکینوں میں تو تکار کا الاؤ بھڑک اُٹھا۔ دین بازار عکاظ ہوگیا، سیاست میں ایسی دھما چوکڑی مچی کہ منافقت آرٹ ہوگئی۔ عیب کیا ہیں، انسان کے اعمال کی کجرویاں۔ ہم اگر ان کجرویوں کو روک یا ٹوک نہیں سکتے تو ان کی نشر و اشاعت سے کیا چاہتے ہیں؟ یہی ایک دوسرے کو بدظن کرتے اور باہمد گر لسانی معصیت کے مرتکب ہوتے ہیں۔

فرمایا: میں نے لوگوں کے عیب چننے کے بجائے ہمیشہ ان کی خوبیاں تلاش کی ہیں۔ جو لذت حُسن تلاش کرنے میں ہے وہ کسی اور چیز میں نہیں، محاسن کی ڈھونڈھ ہی سے آدمی اپنے محاسن کو بڑھا اور چمکا سکتا ہے۔

مدح وقدح سے پرہیز

مولاناؔ انا کی اس منزل میں تھے کہ مدح سرائی سے اجتناب کرتے ان کے قلم نے کسی ہمعصر شخصیت کی تعریف وستائش نہیں کی غالباً اس باب میں الفاظ کی سخاوت کے عادی نہ تھے۔ کسی شخصیت کا اعتراف کرتے تو نہایت نپے تلے الفاظ میں، کوئی ہمعصر رحلت کر جاتا تو چند محتاط الفاظ میں تعزیت کرتے۔ علامہ شبلی کے بارے میں بہت کچھ لکھ سکتے تھے کہ ان کا وجود ایک ادارہ اور ایک عہد تھا اور ان سے کسی حد تک متمتع بھی ہوئے تھے، سید سلیمان ندوی کی حیات شبلی کے آٹھ سو چھتیس صفحات ہیں، مولانا اگر شبلی پر دس صفحے لکھ دیتے تو بے نظیر ہوتے اور فی الجملہ ان کی سیرت کا خلاصہ ہوتا۔ دار المصنفین اعظم گڑھ کے بعض اہل قلم اسی باعث آپ سے کھچاؤ رکھتے۔ سید سلیمان ندوی کی ناراضی کا آغاز حیات شبلی سے متعلق آپ کے سکوت سے ہوا تھا۔ "الہلال" میں صرف سی۔ آر۔ داس کی سیاسی تعزیت کی، اس کے علاوہ کسی ہمعصر کے بارے میں کبھی کچھ نہیں لکھا۔

قدح کے بالکل قائل ہی نہ تھے، الہلال کے ابتدائی دور میں مسلم لیگ اور علی گڑھ کے بعض راہنماؤں پر "افکار و حوادث" لکھے اور چٹکیاں لیں۔ مولانا محمد علی آپ کے سیاسی حریف تھے ان سے بھی

دو چار دفعہ مطایباتی چھیڑ چھاڑ کی لیکن قلم کی ان ابتدائی جحتوں کے سوا طعن و طنز کی ہر ادبی حجت سے ہاتھ اٹھا لیا اور قدح کے بارے میں رائے بنالی کہ قلم و زبان کا روگ ہے اور کوئی سا روگ لگا کر انسان عمدہ زندگی نہیں گزار سکتا۔ مولانا ظفر علی خان کی شاعری پر تحسین کرتے لیکن فرماتے کہ ہجو گوئی ان کے چڑ و قلم کی ابکائیاں ہیں وہ ہجو نہیں کرتے لڑائی باندھتے ہیں۔

احوال مطالعہ گاندھی جی سے ملاقات ہوئی تو راقم نے مولانا آزاد سے متعلق بعض سوال کیے، گاندھی جی نے فرمایا:

"پنڈت جواہر لال نہرو سیاست میں اور مولانا ابوالکلامؒ تاریخ میں میرے اُستاد ہیں، جو کچھ سیاسی دنیا میں ہو رہا ہے جواہر لال سے پوچھتا ہوں اور جو کچھ عالمی تاریخ کا ماضی و حال ہے مولانا آزادؒ سے ان کی محیر العقول معلومات اور عالمانہ تجزیہ ہم سب کو حیرت میں ڈالی دیتا ہے۔"

مولانا آزادؒ عالمی تاریخ میں گاندھی جی کے اُستاد تھے یا نہیں؟ لیکن گاندھی جی کا یہ اعتراف اپنے پس منظر میں مولانا کی عظیم ذہانت اور ان کے بے پایاں علم کا اقرار تھا۔

اگلے روز راقم اور مولوی عزیز الرحمٰن لدھیانوی، سردار پٹیل اور بابو راجندر پرشاد سے برلا ہاؤس میں ملے، مولانا آزادؒ کا ذکر آیا تو عزیز نے ان سے کہا کہ مولانا فلاں مسئلہ سے متعلق سیاسی زبان میں جواب نہیں دیتے شاعری کی زبان بولتے ہیں۔ سردار پٹیل مسکرائے اور کہا:

"اسی کا نام تو ابوالکلام ہے، صرف سیاست دان ہوتے تو جواب دینے سے انکار کر سکتے تھے لیکن وہ کسی صورت میں گلفشانیٔ گفتار ہاتھ سے نہیں دیتے۔"

بابو راجندر پرشاد خود فارسی اور اردو کے جید عالم تھے، ہم نے یہی سوال اُن سے کیا۔ مسکرائے اور کہنے لگے:

"اس عظیم ذہانت اور بے مثال برجستہ گوئی کا نام ابوالکلامؒ ہے۔ مولانا کا دماغ سینکڑوں دماغوں کا نچوڑ ہے، قدرت نے انھیں ڈھال کے وہ سانچہ ہی توڑ دیا ہے جس میں اس مرتبے کے انسان ڈھلتے تھے، مولانا انسانی قامت میں ہندوستان کا سب سے بڑا کتب خانہ ہیں۔"

ہم نے ان ریمارکس کا ذکر سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ سے کیا، تو فرمایا:

"مولانا مسلمانوں کے عہدِ گم گشتہ کی ذہانت و فراست کا مجسمہ اور دہلی ولی اللہ کے

علم و نظر کا مرقع ہیں۔ وہ آیت ربانی ہیں، فی الجملہ وہ مسلمانوں کے گمشدہ اقبال کی نزرت جہرت تصویر ہیں"۔

مولانا بلاشبہ مطالعہ، مشاہدہ اور تجزیہ کا معدن تھے۔ ان کی زندگی ان سہ گونہ عناصر سے تیار ہوئی۔ وہ کہتے ہیں حرف شناسی کے آغاز سے لے کر ڈھلی ہیں حیاتِ مستعار کی آخری ہچکی تک مشاہدہ و تجربہ کے مطالعاتی انسان تھے۔

مولانا کا بیان تھا کہ:

"یسر و عسر جو حالت بھی رہی میں نے کتابوں کی خریداری سے کبھی بخل نہیں کیا۔ میرا واحد شوق کتابوں کا حصول تھا اور اس کے وجوہ تھے۔ میں نے کتابوں کی فضا میں آنکھ کھولی۔ ابھی لڑکپن کے حدود میں داخل نہ ہوا تھا کہ مطالعے کی چاٹ لگ چکی تھی۔ اپنی استعداد سے بڑھی ہوئی کتابیں پڑھتا۔ ہمارا گھر حافظہ کی ایک عظیم کان اور کتابوں کا نگر تھا۔ والد کتابوں کے شیدائی تھے، بڑے بھائی نوجوان عمر میں رحلت کر گئے، لیکن ان کی غذا بھی کتابیں ہی تھیں۔ بہنوں کے لیے کتابیں زیور تھیں، ہیں کتابوں کے معاملے میں اس طرح تھا گویا میرا خمیر ہی ان سے اٹھا ہے، مجھے کتاب کے بغیر اپنا وجود ادھورا محسوس ہوتا۔ والد مرحوم کا واحد شوق کتابوں کا حصول اور ان کا مطالعہ تھا اور اس کی انتہا یہ تھی کہ دنیا کے مرغوبات میں کوئی چیز انہیں اس درجہ مضطرب نہ کرتی جتنا وہ ایک کتاب کے لیے مضطرب ہوتے تھے وہ عاریت کے بجائے ذاتی کتاب سے خوش ہوتے اور ان کا سب سے بڑا مصرف کتابوں کی خریداری تھا۔ حجاز، عراق، مصر، شام اور قسطنطنیہ کے تمام بڑے کتب خانے ان کی نظر سے گزر چکے تھے۔ وہ کتابوں کے عشق ہی میں سال سال دو دو سال ان ملکوں میں رہتے تھے۔ ان کے شوق کا یہ عالم تھا کہ غیر ملکی لائبریریوں سے دو سو کتابوں کی نقلیں لائے تھے۔ اس کے علاوہ ہر سفر میں کتابوں کے دس پندرہ صندوق ہوتے۔ اس وقت مختلف عرب ملکوں میں جتنی شہرہ آفاق کتابیں موجود تھیں انہیں نقل کروا لیا تھا۔ میں نے ان سب کو اپنے حافظہ میں اتار لیا لیکن ان کی وفات کے بعد جب صدمہ ٹھہر گیا اور دیکھا تو کتابوں کے صندوق خالی تھے۔

معلوم نہ ہو سکا کتابیں کہاں گئیں اور کون لے گیا۔ ہم نے فرض کر لیا کہ تلف ہو گئی ہیں۔

میرا حال یہ تھا کہ دس برس کی عمر میں ناشتے کے جو پیسے ملتے ان کو جمع کرتا اور ان سے کتابیں خریدتا تھا۔ اس وقت اُردو پڑھنا اگرچہ ایک تعلیمی بدچلنی خیال کی جاتی تھی لیکن میں اُردو کی طرف بگٹٹ جا رہا تھا۔ دن کو درسی مطالعہ کرتا رات کو ایک دو بجے تک خرید کی ہوئی کتابیں پڑھتا۔ میرا مطالعہ جوانی سے بہت پہلے جوان ہو گیا تھا۔ میرے شوق کا یہ عالم تھا کہ ہر مطبوعہ ورق پڑھ ڈالتا۔ سر سید کی کتابوں کا شوق بے پناہ ہو گیا تو سب کتابیں خرید لیں اور پڑھ ڈالیں۔ حال یہ تھا کہ ہر مضمون کی کتاب شریکِ مطالعہ تھی۔ میں کتاب پڑھتا نہیں ہضم کرتا تھا، عربی پڑھی تو اس کا سارا ذخیرہ ہضم کر لیا۔ فارسی پڑھی تو اس میں ڈوب گیا۔ اب اردو کی راہ کھلی تو ایسی چیٹک لگی کہ اسی کا ہو گیا۔ سب کچھ پڑھ ڈالا۔ مولانا حالی، مولانا محمد حسین آزاد، مولانا شبلی، مولانا شرر اور مولوی نذیر احمد کے قلم سے جو نکلا میں ان سے کما حقہٗ آشنا ہوتا رہا۔ اس مطالعہ ہی نے مجھے علوم جدیدہ کا شوق ڈالا اور میں ڈھونڈ ڈھونڈ کے کتابیں پڑھتا رہا۔ میں نے ابتداءً اخبارات کی ایڈیٹری اس لئے قبول کی کہ ان کی وساطت سے عربی کے رسائل آتے تھے۔ میں نے بعض کتب خانے خرید کئے اور والد کے مریدوں نے اس زمانے میں میرے شوق کا ساتھ دیا۔ میں ان کا شکرگزار ہوں۔ پھر ایک خاصا کتب خانہ میں نے بعض رسائل میں اُجرت مضامین لکھ کر خرید کیا۔ میرے مطالعہ کا ایک ڈھنگ یہ بھی تھا کہ میں کتابوں پر نوٹ لکھتا، پھر ان سے میرے غور و فکر کو پرواز ملتی اور میں آسانی کے ساتھ دماغی سفر کر سکتا تھا میرا مطالعہ صرف کتابوں تک محدود نہ تھا۔ میں نے وقت کی علمی ہستیوں سے جن کا وجود ایک ادارہ و تحریک تھا کما حقہٗ استفادہ کیا، مثلاً مولانا شبلی ایک ادارہ و تحریک تھے اور ان کا کتب خانہ بھی بجائے خود منفرد و یگانہ تھا اور اس زمانے میں اس سے محروم رہنا بدقسمتی تھا۔

عیسائی مشنریوں سے مناظرے و مباحثے کیے تو اس کے نتائج مجموعی لحاظ سے مسلمانوں کے حق میں رہے لیکن

جو فائدہ مجھے پہنچا وہ یہ تھا کہ آریہ سماج کی معرفت، ہندو دھرم، اور ادھر ان مشنریوں کی معرفت، عیسائیت جزو کل سے آگاہ ہو گیا۔ یہ بھی ایک مطالعہ تھا۔

رچرڈ بال دمشق کا ایک مسیحی پادری تھا۔ وہ یورپ کے مدرسہ الٰہیات کا سند یافتہ اور اپنے علم میں بے نظیر تھا۔ اُس سے دوستی ہو گئی۔ اس دوستی کی بدولت قدیم و جدید مسیحی عقائد کے مدارس، اور بائبل سے متعلق مختلف مشرب کے مبصرین کا حال معلوم ہُوا۔ اس طرح عیسائیت کا پُورا علم ہو گیا۔ میری جستجو کا یہ عالم تھا کہ مرزا غلام احمد کو دیکھنے قادیان گیا وہاں اُن سے اور اُن کے حواریوں سے ملا۔ ایک دو سوال کئے جو اُن کے لئے ناگوار تھے، مجھے احساس ہو گیا کہ دُور کا ڈھول ہے اور اس کے پس منظر میں دین نہیں کوئی دوسری چیز ہے۔ فوراً ہی لوٹ آیا۔

> "الہلال" نکالا تو قدامت کا ذخیرہ کتب بکمال و تمام دیکھ چکا تھا اور ساتھ ساتھ زبان و علم کی جدید کروٹوں سے آگاہ ہو رہا تھا۔ میں نے ہندوستان کا سارا لٹریچر پڑھ لیا تھا۔ عربی، فارسی اور اردو میں مذہب، تاریخ، فلسفہ، الٰہیات، شاعری، منطق، طب، علم الہیئت، غرض کہ ہر فن پر جتنی نافع و جامع کتابیں تھیں وہ سب میرے مطالعے میں آ چکی تھیں۔ اب میں خود ایک کتب خانہ تھا۔ میں نے مطالعے کی منزلیں اس طرح طے کی تھیں کہ علم کو پہلے خاموشی سے دیکھا پھر توجہ سے سنا پھر حفظ کیا، پھر اس کی اشاعت کی اور یہ قول فضل بن عیاض کا ہے کہ "میرا سارا اثاثہ وہ کتابیں ہیں جو میں نے نصف صدی میں جمع کی ہیں"۔ جب تک میں انگریزی اور فرانسیسی سے نابلد تھا، میرے مطالعے میں عربی فارسی اور اردو کی کتابیں تھیں لیکن ۱۹۲۷ء کے بعد سے صرف انگریزی اور فرانسیسی ہی دیکھتا ہوں۔ ان کے علم کا لحظہ بہ لحظہ تغیر کسی دوسری زبان کے ادب کو دیکھنے کی فرصت ہی نہیں دیتا۔ ہماری زبانوں کے مصنف اپنے قاریوں سے انصاف نہیں کرتے وہ انہیں مرعوب کرنا چاہتے ہیں لیکن انگریزی اور فرانسیسی زبان کے اہل قلم اپنی اختیاری اور تاریخی غلطیوں کے باوجود قارئین کو معلومات دیتے اور ایشیائی زبانوں کی طرح دماغوں کا شکار نہیں کرتے۔ ہر اچھی چیز مطالعے کی ہے۔ الٰہیات، مذہبیات، عمرانیات، تاریخ، فلسفہ ادبیات، سیاسیات اور جدید سائنسی علوم سے متعلق جو کتاب بھی یورپ میں چھپتی ہے،

انتظام کر رکھا ہے کہ ناشر اس کی پہلی کاپی مجھے بھیج دیتے ہیں اور میں اس کے مطالعے سے جلد فارغ ہو جاتا ہوں۔ ایشیا، یورپ کے مادی غلبے سے بسرعت نکل جائیگا اصل سوال یہ ہے کہ اس کے ذہنی غلبہ سے کیونکر نکلا جائے۔ اور وہ کونسی شکل ہے کہ ہم اس کی علمی قیادت کو چیلنج کر سکیں۔"

مولانا کی مطالعاتی وسعت ناپید اکنار تھی۔ مثلاً اسد اللہ خان میرٹھی نے "الجمعیت" دہلی کے "آزاد نمبر" میں لکھا تھا کہ:

"ان کے مطالعے کی بوقلمونیوں کے پھیلاؤ کا حال یہ تھا کہ انقلاب فرانس سے متعلق کسی نے سوال کیا تو اس کا جواب اس طرح دیا گویا خود انقلاب فرانس کے بانی ہیں۔ ایک صاحب نے پتنگ بازی کی تاریخ پوچھی تو اس طرح تفصیلات بیان کیں کہ ہر شخص مبہوت ہو گیا۔۔۔۔ ایک ہندو نوجوان کشن چندر ایم اے ہمارے ساتھ قید خانے میں فلاسفر کے نام سے موسوم تھا، اس نے مولانا کو صرف مولوی سمجھا اور ان کے علم سے متعلق متذبذب تھا۔ ایک دن میرٹھ کالج سے یورپی فلسفے کی تازہ ترین کتاب منگوائی اور دو چار ساتھیوں کے ساتھ صلاح کر کے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے ان سے کہا کہ فلسفے پر لندن سے تازہ کتاب آئی ہے لیکن اس کے مندرجات اتنے دقیق اور پیچیدہ ہیں کہ سمجھ میں نہیں آرہے۔ براہ کرم ان کے سمجھنے میں مدد فرمائیں۔ مولانا نے کہا میرے پاس چھوڑ دو میں اسے کل کسی وقت دیکھ کر بتاؤں گا کہ اس میں کیا لکھا ہے۔۔۔۔ اگلے روز وہ نوجوان مولانا کے پاس گئے مولانا نے دریافت کیا تمہاری سمجھ میں کیا چیز نہیں آئی؟ انہوں نے کہا ہم تو اس میں سے کچھ نہیں سمجھے۔ مولانا نے پہلے اس کے ابتدائی مطالب بیان کئے پھر ساری کتاب کی حقیقت بتا دی اور ساتھ ہی ساتھ نشاندہی کر دی کہ مصنف نے فلاں فلاں جگہ ٹھوکر کھائی ہے۔ وہ نوجوان جو فلسفے میں کسی کو پٹھے پر ہاتھ دھرنے نہیں دیتا تھا، دنگ رہ گیا۔ ہر کسی سے کہتا تھا کہ مولانا کا دماغ قدرت کا معجزہ ہے۔"

نیاز فتح پوری نے ان کی اس عظمت ہی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

"ان کی زندگی ایک خاص سانچے میں ڈھل کر وہ نہ ہوجاتی جو ہمارے سامنے آئی تو وہ خدا جانے کیا کیا ہوسکتے تھے۔ وہ اگر عربی شاعری کی طرف توجہ کرتے تو متنبی و بدیع الزماں ہوتے۔ اگر محض دینی و مذہبی فلاح اپنا شعار بنا لیتے تو اس عہد کے ابن تیمیہؒ ہوتے، اگر محض علوم حکمیہ کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیتے تو ابن رُشد اور ابن طفیل سے کم درجے کے متکلم و فیلسوف نہ ہوتے۔ اگر وہ فارسی شعر و ادب کی طرف متوجہ ہوتے تو عرفی و نظیری کی صف میں انہیں جگہ ملتی۔ اگر وہ تصوف و اصلاح اخلاق کی طرف مائل ہوتے تو غزالی اور رازی سے کم نہ ہوتے اور اگر مسلک اعتزال اختیار کرتے تو دوسرے واصل بن عطا ہوتے۔"

اسی مضمون میں نیاز لکھتے ہیں کہ:

"ایک بار حکماء اسلام کے سلسلے میں ابن طفیل کا ذکر آگیا تو مولاناؒ نے اس کی مشہور کتاب حی بن یقظان کی پوری داستان ایک نشست میں اس طرح سنادی گویا وہ اس کے حافظ تھے۔"

اور یہ سب مطالعے کے کرامات تھے۔

فرمایا: "اس وقت میری عمر ۶۸ برس ہے، آٹھ سال نکال دیں ساٹھ سال کے دن شمار کریں تو ۲۱۹۰۰ ہوتے ہیں۔ اب اس میں قید و بند کے دن بھی ہیں، علالت کا زمانہ بھی اور ادھر اُدھر کی مشغولیتوں کے ایام بھی، میرا خیال ہے کہ میں نے عمر کے اس موڑ تک پندرہ ہزار کتابیں ضرور دیکھی اور پڑھی ہیں۔ اور بہت کم کتابیں اس قابل ہوتی ہیں کہ انہیں الف تا ی پڑھا جائے۔ اکثر کتابیں اپنے چند صفحات ہی میں جاسوسی کر دیتی ہیں کہ ان میں کیا ہے؟"

خلوت پسندی

• تنہائی خواہ کسی حالت میں آئے اور کسی شکل میں۔ میرے دل کا دروازہ ہمیشہ کھلا پائے گی۔

• ابتدا ہی سے طبیعت کی افتاد کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ خلوت کا خواہاں اور جلوت سے گریزاں رہتا تھا۔

• لوگ لڑکپن کا زمانہ کھیل کود میں بسر کرتے ہیں، مگر بارہ تیرہ برس کی عمر میں میرا یہ حال تھا کہ کتاب

لے کر کسی گوشے میں جا بیٹھتا اور کوشش کرتا کہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہوں۔

- لوگ اگر میری طرف سے رُخ پھیرتے ہیں تو بجائے اس کے کہ دل گلہ مند ہو اور زیادہ منت گزار ہونے لگتا ہے۔

- میں نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈا تھا، سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈ نکالا۔

- جب کبھی قید خانے میں سنا کرتا ہوں کہ فلاں قیدی کو قید تنہائی کی سزا دی گئی ہے تو حیران رہ جاتا ہوں کہ تنہائی کی حالت آدمی کے لیے سزا کیسے ہو سکتی ہے؟ اگر دنیا اس کو سزا سمجھتی ہے تو کاش ایسی سزائیں عمر بھر کے لیے حاصل کی جاسکیں"۔

(غبار خاطر مکتوب ۲۹ اگست ۱۹۴۲ء)

مولانا کی خلوت پسندی ضرب المثل تھی، ان سے ملنا فی الواقعہ بہت مشکل تھا، مولانا غلام رسول مہر کو پاکستان سے بلوایا کہ فلاں مسئلے پر آکر مل جائیں۔ وہ گئے اور ان کے مہمان ہوئے۔ ہفتہ گزر گیا لیکن گھر بلا کر ملاقات مفقود، قاضی عبد الغفار بھی وہیں ٹھہرے تھے۔ مولانا مہر نے ان سے کہا کہ مجھے واپس جانا ہے، ہفتہ ہو گیا ہے اور مل نہیں رہے، انہوں نے کہا خود مجھے یہاں پندرہ دن ہو گئے ہیں اور ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی۔ اجمل خان سے کہا تو اس نے ایک عجیب قصہ سنایا کہ گئی بہن بارہ روز سے آئی ہوئی ہیں۔ کل صبح پائیں باغ میں انہیں دیکھا تو کہا، آپا؟ آپ کب سے آئی ہیں؟

مولانا مہر نے بتایا دسویں دن ملاقات ہوئی تو فرمایا اس مسئلے کو کسی اور صحبت پر اُٹھا رکھتے ہیں، اور میں اگلے روز اجازت لے کر خالی خولی آگیا۔

مولانا ملاقاتوں کے عادی ہی نہ تھے۔ وہ اپنی خلوت کو جلوت اور اپنی تنہائی کو انجمن سمجھتے تھے۔

ذاتی احباب

مولانا کا زمانہ تعلیم دوستوں سے خالی رہا۔ والد انتہائی سخت گیر تھے۔ ان کے نزدیک بچوں کے لیے گھر سے باہر کی آب و ہوا مضر تھی۔ کسی کھیل کود یا سیر و تفریح کا تصور ہی نہ تھا۔ سبھی کچھ گھر کی چار دیواری میں تھا۔ مولانا کا بیان ہے کہ وہ گھر کی چوکھٹ

سے باہر قدم نہ رکھ سکتے تھے۔ صرف جمعہ کے دن والد کی معیت میں جامع مسجد جاتے یا ان کے خادم خاص حافظ ولی اللہ کے ہمراہ سال میں صرف دو دفعہ شہر جا سکتے تھے۔ اس حالت میں کسی دوست کے پیدا ہونے یا کسی کے دوست بننے کا سوال ہی نہ تھا۔

جب قلم کا سفر شروع کیا اور خطابت کے میدان میں قدم رکھا تو دوستوں کا ایک مختصر حلقہ پیدا ہو گیا۔ لیکن سیاست کے خارزار میں داخل ہوتے ہی ختم ہو گیا۔ طبیعتاً کم آمیز تھے۔ اسی کے بعد دوستانہ روابط لفظ "متروک" ہو گئے۔ حتیٰ کہ عمر کے نصفِ ثانی میں غیر سیاسی احباب کی نجی صحبتیں عنقا ہو چکی تھیں۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی روایت کے مطابق ابتدائی عہد میں شفاء الملک حکیم سید محمد صادق لکھنوی، خان بہادر رضا علی وحشت، آغا حشر کاشمیری، موبد زادہ آغا جلال الدین، ڈپٹی نجم الدین اور قاضی نور الاسلام مولانا کے نجی دوست تھے۔ شفاء الملک حکیم محمد صادق لکھنوی مٹیا محل کے شاہی معالج حکیم سید محمد قاسم علی لکھنوی کے فرزند، نواب حیدر یار جنگ طباطبائی کے داماد اور کلکتہ کے نامور طبیب تھے۔ خلیق، بردبار، متواضع، خوددار، خوش مزاج، وضعدار اور روشن خیال۔ خان بہادر رضا علی وحشت کلکتہ کے نغز گو شاعر اور مشہور اساتذہ سخن میں سے تھے۔ آغا حشر، مولانا کی دوستانہ ٹکڑی کے ابتدائی رکن تھے۔ ابو نصر اور مولانا سے مل کر عیسائی مشنریوں سے مناظرہ کرتے رہے۔ آغا صاحب ملیح آبادی سے ملے تو کہنے لگے۔

"ابو الکلام لڑکپن میں بھی ابو الکلام تھے۔ ہماری خوب چھنتی تھی۔ میں نے ان سے بڑھ کر ذہین آدمی دیکھا ہی نہیں۔ آغا جلال الدین، سید جمال الدین افغانی کے رفقاء میں سے تھے اور کلکتہ میں حبل المتین نکالتے تھے۔ اس اخبار کا انقلاب ایران میں بڑا ہاتھ تھا۔ آخر عمر میں نابینا ہو گئے۔ فارسی اور عربی کے بے پناہ لسان تھے۔ ڈپٹی نجم الدین اسی برس کے تھے اور مولانا کے ان احباب میں سب سے معمر تھے۔ سید جمال الدین افغانی کی محبت سے متاثر ہو کر ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور اس کے بعد قومی تحریکوں میں حصہ لیتے رہے۔ ان ڈپٹی صاحب ہی کے بھتیجے قطب الدین الہلال کے منیجر رہے۔ اس زمانہ میں گریجویٹ تھے۔ ان کا بیاہ سلطان ٹیپو شہید کے خاندان میں ہوا تھا۔ قاضی نور الاسلام کی مولانا سے دوستی کا ایک ہی سبب تھا کہ وہ اشعار

کے برمحل استعمال میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ انہیں حفظ شعر میں یہ خصوصیت حاصل تھی کہ جب تک چاہتے شعر میں گفت گو جاری رکھتے۔ مولانا مضمون کی رعایت سے مناسب حال شعر پوچھتے اور وہ برمحل بتا دیتے۔ پھر جب مولانا عملی سیاست میں داخل ہوئے تو ان کا حلقہ احباب یکسر بدل گیا۔ جو لوگ ان کے ہم سفر تھے، انہی میں سے نجی دوست بنتے چلے گئے۔ ابتداً حکیم اجمل خان، اور سی۔ آر۔ داس، پھر پنڈت موتی لال نہرو اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری، پھر پنڈت جواہر لال نہرو اور بھولا بھائی ڈیسائی، نیاز مندوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ ملک کے نامور سیاسی رہنما، معروف اہل قلم، بلند پایہ خطبار اور جید علما ان میں شامل تھے۔ بعض اہل قلم کے سیاسی عقائد ان سے مختلف تھے۔ لیکن شخصی طور پر عقیدت رکھتے۔ مولانا ان سے اخلاص برتتے اور التفات کرتے تھے۔ مثلاً غلام رسول مہر کی ذہنی وجاہت پر اعتماد کرتے، عبدالمجید سالک کو خوشدلی سے ملتے، ان کے ادبی چٹکلوں سے محظوظ ہوتے، مولانا عبدالقادر قصوری سے تعلق خاطر رکھتے ان کے فرزند محی الدین قصوری کو عزیز سمجھتے۔ آصف علی پر بھروسہ کرتے اور عبدالرزاق کو اپنا ہی سمجھتے تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی (نواب صدر یار جنگ) سے ان کی ذاتی دوستی اور اس کے عمق کا انکشاف اس وقت ہوا جب غبار خاطر منظر عام پر آئی اور لوگوں کو معلوم ہوا کہ مولانا کے صدیق اکرم بھی ہیں جنہیں سیاست کے روزمرہ سے شائبہ بھر تعلق نہیں۔ اور نہ اس سفر کے مختلف راستوں میں کہیں ان کے قدموں کی کوئی سی چھاپ ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی ۵ جنوری ۱۸۶۷ء کو صبح کے وقت اپنے آبائی قلعہ بھیکن پور میں پیدا ہوئے۔ والد نے بیٹے کے نام پر حبیب گنج بسایا اور ان کے لیے ایک گڑھی بسائی۔ میر عثمان علی خاں نے دکن بلا کر صدر الصدور ی کے علاوہ نواب صدر یار جنگ کا خطاب عطا کیا۔ وہاں تیرہ برس تک مذہبی امور کے ناظم کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر سبکدوش ہو کر الندوہ میں علامہ شبلی کے ساتھ شریک ادارت ہوئے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبہ دینیات کے اعزازی صدر رہے۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے مستقل صدر اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جنرل سیکرٹری ہوئے۔ کئی ایک علمی و ادبی کانفرنسوں کی صدارت

کی اور جامع و مانع صدارتی خطبات پڑھے جن کا ادبی و علمی دنیا میں ہمیشہ چرچا رہا۔ کئی ایک کتابوں کے مصنف تھے۔ مولانا آزاد سے پہلی ملاقات ۱۹۰۵ء میں ہوئی جب کہ آپ کی عمر ۳۹ برس اور مولانا ۱۷ برس کے تھے۔ ۱۹۵۰ء میں آپ نے وفات پائی۔

ایک صحبت میں کسی دوست کا گلہ کیا جا رہا تھا۔ فرمایا:

”اس طرح گلہ کرنے سے انسان اپنی شکست کو نمایاں کرتا ہے۔ دوستوں کے انتخاب میں احتیاط کرو۔ بھیڑ جمع نہ کرو، ہر شخص دوستی کا اہل نہیں ہوتا۔ لیکن دوست نہ ہو تو زندگی اجاڑ محسوس ہوتی ہے۔ جس طرح زندہ رہنے کے لیے سانس لینا ضروری ہے اسی طرح دوست سفرِ حیات کا لازمہ ہیں۔“

بذلہ سنجی

بعض دوستانہ صحبتوں میں بذلہ سنجی کا جوہر مطایبات کی حد تک ضرور کھلتا تھا۔ عرب شعراء کی حاضر جوابیاں، عرب حکماء کی دقیقہ سنجیاں اور عرب کنیزوں کی برجستہ گوئیاں ان کے حافظے میں ڈھیر تھیں، اپنی نکتہ رس طبیعت سے انہیں اور نکھار دیتے۔ کئی مسئلوں میں ان کے جواب اختصارِ کلمات کی رعایت سے خوب ہوتے اور بعض سیاسی سنگیوں کو مطایبات سے ٹال جاتے۔ اس ذخیرہ کو ایک علیحدہ کتاب میں جمع کیا جا سکتا ہے۔ بذلہ سنجی سے متعلق ان کی رائے تھی کہ ”سمع اور ظرافت میں وہی رشتہ ہے جو حُسن اور نزاکت میں ہے۔“

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کسی قدر بے تکلف تھے۔ ادب ملحوظ رکھتے لیکن جو پوچھنا یا کہنا ہو اس سے رکتے نہیں تھے، مولانا سے کہنے لگے:

”حضرت یہ دھلی والے ایک دو کے سوا کسی کو دھلی کا سارٹیفکیٹ نہیں دیتے۔ ان کے نزدیک جو لوگ اب دھلوی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ گمشدہ دھلی کی منہدم عمارتوں کے روڑے ہیں۔ ان کے نزدیک اب ڈیڑھ پونے دو خاندان ہی دھلوی ہیں۔ باقی سب ساڑھستی کے زمانے میں ادھر اُدھر سے آئے تھے، ڈپٹی نذیر احمد کو دہلوی نہیں مانتے۔ حسن نظامی کے بارے میں ماتھے پہ شکن ڈال لیتے ہیں، محمد حسین آزاد میں بھی مین میخ نکالتے ہیں اور حالی تو خیر پانی پت ہی کے تھے۔“

مولانا مسکرائے فرمایا:

"مولوی صاحب چھوڑیئے۔ آپ کیا بے مزہ کہانی لے بیٹھے ہیں۔ یہ سب خوش فکروں کی چونچلیں ہیں جانے کن حسرتوں کو یاد کر کے طعن و طنز کے آنگن میں انگڑائیاں لیتے ہیں۔"

مولانا حبیب الرحمٰن بات قطع کرتے ہوئے بولے:

"حضرت، وہ تو آپ کو بھی دھلوی نہیں مانتے۔"

فرمایا:

"مولوی صاحب وہ ٹھیک کہتے ہیں جس دھلی کو وہ یاد کرتے ہیں یا جس دھلی سے کبھی ان کا ناطہ تھا۔ اس دھلی کا اب تانا ہی تانا ہے بانا غائب ہو چکا ہے۔

آپ لوگ اردو کے رنگروٹ، دو قلعہ معلی کے سلاطین، نہ ان کی یا ان کے متوسلین کی، جو کر خنداروں کے ساتھ کھیلا نہیں، یا جس نے میر قربان علی کی داستان گوئی کا حظ نہیں اٹھایا، مٹھو بھٹیارا کے ہاں اوجھڑی نہیں کھائی۔ پوسیری اور چھٹنکی پراٹھا نہیں چکھا، گھمن کبابی کے ہاں پھیرا نہیں ڈالا۔ ملن نائی سے کھونٹیوں میں پانی نہیں اتروایا، چہرہ آئینہ نہیں کیا، مرزا چپاتی کے بلبلوں کی پالیاں نہیں دیکھیں، گنجے نہاری والے کے ساتھ ڈنڑ نہیں پیلے، میر ٹوٹرو سے کنکوا نہیں لڑایا مرزا فخرو سے جوشاندہ نہیں لیا، استاد تان توڑ سے ڈھولک نہیں سنی اور نہ کبھی فلاں مغنیہ اور فلاں رقاصہ کا فن دیکھا ہے وہ بھلا اپنے دھلوی ہونے کا ثبوت کیونکر لا سکتا ہے؟ اور اس کے دھلوی ہونے کی سند کہاں سے دی جا سکتی ہے؟"

مولانا کی بذلہ سنجی یا حسِ تفنن اسی ڈھب کی تھی کہ بعض سوالوں کو اس انداز کے جملوں کی مسکراہٹوں کے حوالے کر دیتے تھے۔

عملۂ "الہلال" سے سلوک

"الہلال" کے عملے میں فضل الدین مولانا کے سیکرٹری اور پریس کے نگران تھے۔ "الہلال" ہفتہ وار کے منیجر قطب الدین، ڈپٹی نجم الدین کے بھتیجے اور ایک مستعد گریجویٹ تھے۔ ان کے علاوہ پریس اور دفتر کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے۔ "الہلال" کے دورِ اوّل میں سید سلیمان ندوی، مولانا عبد اللہ انصاری، مولانا حامد علی صدیقی، مولانا عبد الوحید کانپوری

اور مولانا عبدالسلام ندوی ادارۂ تحریر میں رہے۔ ایک اور صاحب مرزا احمد عسکری انگریزی معلومات کی حد تک ادارہ تحریر کے معاون تھے ــــــ دوسرا دور ۱۹۲۷ء میں عبدالرزاق ملیح آبادی کا تھا۔ "الہلال" دورِ اوّل کی بندش کے بعد ۳۱ سال تک کسی نے کچھ نہ کہا۔ پاکستان بنا اور سید سلیمان ندوی ہندوستان سے پاکستان آگئے۔ معلوم ہوا مولانا سے ناراض ہیں۔ اس کا ذکر ایک علیحدہ فصل میں ہے۔ ان کے سوا اور کسی رکن ادارہ نے نہ کبھی مولانا کو متہم کیا اور نہ کبھی اُن سے متعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ اشارۃً یا کنایۃً کوئی گلہ شکوہ کیا۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے یہاں تک لکھا تھا کہ جس کسی نے مولانا ابوالکلامؒ کے طرزِ نگارش کی نقل کرنا چاہی وہ مسیلمہ کذاب ہو کر رہ گیا۔ عبدالرزاق ملیح آبادی مولانا کے ساتھ ۳۹ سال رہے۔ وہ "عیب وثواب" دونوں سے واقف تھے اور حق گوئی سے رکتے بھی نہیں تھے۔ "ذکر آزاد" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں،

"مولانا سے میری رفاقت کی عمر ۳۹ سال ہے۔ وہ ایک ہمہ گیر شخصیت تھے۔ محرم اسرار دین تھے۔ مفسر قرآن تھے، محدث تھے، فقیہہ تھے، فلسفی تھے، مورخ تھے، ادیب تھے، خطیب تھے، انشا پرداز تھے، اخبار نویس تھے، سیاسی مدبر تھے، قومی لیڈر تھے، مجاہد حریت تھے ؏

ہے رنگ لالہ وگل ونسریں جدا جدا

سب حیثیتیں ایسی تھیں کہ ہر حیثیت پر ریسرچ ہوگی، کتابیں لکھی جائیں گی، توفیق ایزدی شامل حال ہوئی تو خود راقم نے بھی پیش نظر اس سلسلہ میں قلم کا پورا سفر ہے۔"

افسوس ملیح آبادی مولانا کے بعد ایک دو سال ہی میں چٹ پٹ ہو گئے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کے ہاتھوں مولانا کو زندگی میں بڑے بڑے دکھ سہنا پڑے۔"

ادھر جن بزرگان عظام کو مولانا سے شکایتیں پیدا ہوئیں، سید سلیمان ندوی ان کا تمہ تھے۔ ان کی شکایت سرائی کا اور چھور بہتان یا غیب تھا، وہ غالباً اس گمان میں تھے کہ فلاں شیخ سے بیعت ہونے کے بعد انہیں قربت الٰہی کا اعتماد حاصل ہوگیا ہے اور مولانا چونکہ ان کے شیخؒ سے بے نیاز ہیں، لہٰذا گردن زدنی ہیں۔ ورنہ سلیمان سمیت عملہ "الہلال" میں کبھی کسی نے یہ نہیں کہا، کہ مولانا کے ذمے ان کے واجبات ہیں یا مشاہرہ کی رقم بقایا رہ گئی ہے۔

مولانا کا عملہ سے وہی سلوک تھا جو بھائیوں کا آپس میں ہوتا ہے، اور ایک کنبے کے لوگ باہم دگر

میل جول رکھتے ہیں۔

سفر کی عادت

مولانا خلوت پسندی کی عادت راسخہ کے باوجود سفری مزاج رکھتے اور سیر فی الارض کے دلدادہ تھے۔ ابتدائی دور میں کہ ابھی سیاست میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ وہ ہندوستان کے ہر اس شہر میں گھومے پھرے اور ٹھہرے جہاں اجتماعی علمی تحریک یا کوئی اس طرز کا ادارہ تھا، اس وقت کلکتہ، بمبئی، لکھنؤ، دہلی اور انجمن حمایت اسلام بنی تو لاہور مسلمانوں کے تہذیبی مرکز تھے، مولانا نے ان شہروں کا سفر اپنا معمول بنا لیا تھا۔ الہلال کے زمانے میں بھی یہی شعار رہا، موسم گرما ہوتا تو مسوری دار جیلنگ یا کسی دوسرے صحت افزا مقام پر چلے جاتے۔ ۱۹۰۷ء میں بلاد اسلامیہ کا سفر کیا۔ عراق و مصر گئے پھر پیرس تک پہنچ کر واپس آگئے۔ جب تک ملکی سیاست آزادی کے دروازے تک نہ پہنچی اور ہندوستان آزاد نہیں ہو گیا۔ وہ کم آمیزی اور خلوت پسندی کے باوجود سیاحت تو نہیں لیکن سفر میں ضرور رہے، سارا ہندوستان ان کی جولاں گاہ تھا، اپنے زمانہ وزارت میں یورپ کے سفر کو گئے۔ راستے میں ترکی ٹھہرے، وہاں کئی مجلسوں کو خطاب کیا۔

فرمایا:

"میں نے آدھا علم سفر سے حاصل کیا ہے۔ مطالعہ کی تنہائیوں نے مجھے ذہنی بالیدگی بخشی لیکن سفر کے مشاہدوں نے میری نگاہ کو وسعت دی جو لوگ سفر نہیں کرتے وہ بسم اللہ کے گنبد میں رہتے ہیں۔ سفر انسان کو قوموں کی سرگزشت اور ملکوں کی تاریخ کا بالواسطہ علم بخشتا ہے، جس طرح سائنس کے معملوں میں حقائق اشیاء کا ادراک ہوتا ہے اسی طرح سفر سے صفات انسانی کی حقیقتوں کا علم ہوتا اور مختلف اقوام کے امزجہ و طبائع کا پتہ چلتا ہے"

موسموں سے لگاؤ

مولانا کو جاڑے کا موسم حد درجہ عزیز تھا۔ وہ سردی پر جان دیتے تھے۔ ان کے لیے کتابوں کی صحبت، سگریٹ کے کش، خلوت کا سرور، چائے کی پیالی اور جاڑے کی ٹھنڈک مشترکہ حیاتین تھے۔ غبار خاطر کے خط محررہ ، جنوری ۱۹۴۳ء میں لکھتے ہیں۔

"اوائل عمر سے میری طبیعت کا عجیب حال ہے۔ گرمی کتنی ہی معتدل ہو مگر مجھے جلد

پریشان کردیتی ہے۔ ہمیشہ سرد موسم کا خواستگار رہتا ہوں۔ موسم کی خنکی میرے لیے زندگی کا اصلی سرمایہ ہے، سردی میں جس قدر بھی زیادتی ہو موسم کا حسن اور زندگی کا عیش ہے۔ میرے تخیل میں عیش زندگی کا سب سے بہتر تصور کیا ہو سکتا ہے؟ جاڑے کا موسم ہو اور جاڑہ بھی قریب قریب درجہ انجماد کا۔ رات کا وقت ہو، آتش دان میں اُونچے اُونچے شعلے بھڑک رہے ہوں اور میں کمرے کی ساری مسندیں چھوڑ کر اس کے قریب بیٹھا ہوں اور پڑھنے یا لکھنے میں مشغول ہوں، بارہا ایسا ہوا کہ اس خیال سے کہ سردی کا زیادہ سے زیادہ احساس پیدا کروں۔ جنوری کی راتوں میں آسمان کے نیچے بیٹھ کر صبح کی چاے پیتا رہا اور اپنے آپ کو اسی دھوکے میں ڈالتا رہا کہ آج سردی خوب پڑ رہی ہے، لوگ گرمیوں میں پہاڑ جاتے ہیں کہ وہاں گرمیوں کا موسم بسر کریں۔ میں نے کئی بار جاڑوں میں پہاڑوں کی راہ لی کہ وہاں جانے کا اصلی موسم یہی ہے۔"

"غبار خاطر" کے ایک دوسرے خط میں لکھا ہے کہ:

سخت سردی میں اکہری شال لے کر کھلی فضا میں سونے سے جو اہتزاز پیدا ہوتا ہے اس کا مزہ ہی دوسرا ہے، ان لمحوں کی لذت کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔"

سفارشوں سے احتراز

مولانا کاروباری سفارشوں سے ہمیشہ محترز و متنفر رہے۔ ایسی سفارش کرنا وہ مستحقین کی حق تلفی سمجھتے اور سفارش ماننا اپنے فرائض میں خیانت گردانتے تھے۔

اپنے بہنوئی واجد علی خاں کی اس خواہش کو کہ وہ کلکتہ کارپوریشن کے چیف انجینئر کو افسر بننا چاہتے ہیں، جس سختی سے مولانا نے مسترد کیا اُس کا ذکر ہمشیرگان کے تذکرہ میں آ چکا ہے۔

ایک دوسرا واقعہ راقم کا آنکھوں دیکھا ہے۔ لاہور میں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے ایک معتقد کارخانہ دار تھے۔ انہیں لوہے کی ضرورت تھی اور لوہا ان دنوں مرکزی حکومت کے پرمٹ سے ملتا تھا۔ وہ شاہ جی کو اُٹھا کر اور شاہ جی راقم کو لے کر دہلی گئے، وہاں بن بلائے مولانا کے ہاں پہنچے۔ مولانا نے ملنے سے انکار کر دیا۔ شاہ جی کو اپنے تعلق خاطر پر اعتماد تھا۔ اصرار کیا مولانا

انکار کر چکے تھے۔ شاہ جیؒ نہ ٹلے تو مولانا اندر سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آگئے ان کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ شاہ جیؒ کی بات سنی تو آگ بگولہ ہوگئے فرمایا :

"۱۹۳۷ء سے مسلمان صوبوں کی کانگرسی وزارتوں اور ہندو صوبوں کے مسلمان وزیروں کا انچارج ہوں ان کا محاسبہ ضرور کیا ہے لیکن ان سے سفارش کبھی نہیں کی۔ آپ نے میرے بارے میں غلط اندازہ کیا ہے اور اس کے بعد جھٹ سے اندر لوٹ گئے۔"

شاہ جیؒ کے ساتھ مولانا کا سلوک فی الواقعہ غلط تھا، مولانا اگر بے نیاز تھے تو شاہ جیؒ بھی غیرت مند تھے، مولانا کے متعلق انہیں اپنے ذہنی اعتماد کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ بہر کیف مولانا آزاد اس قسم کی سفارشوں کے معاملے میں آخری عمر تک بے لحاظ تھے۔

مناظرہ سے اجتناب

مولانا نے اوائل عمر میں اپنے بڑے بھائی ابو نصر اور آغا حشر کاشمیری کے ساتھ مل کر آریہ سماجیوں اور عیسائی مشنریوں سے زوردار مناظرے کئے لیکن پھر ان سے ہاتھ اٹھا لیا ان کا خیال تھا کہ فریقین میلہ رچا لیتے ہیں۔ لیکن فائدہ کسی کو نہیں پہنچتا، نہ مذہب کو نہ جماعت کو، نہ ملک کو، اور نہ ملت کو، عرب حکماء میں کسی کا قول بیان کیا کہ مناظرہ غلطی کا جام ہے۔ اس سے یقین گھٹتا اور اضطراب بڑھتا ہے۔ لوگ تماشائی ہو جاتے ہیں، مناظرہ کیا ہے؟ چرب زبانی ہے، انسان ایک دوسرے کے معتقدات سے متعلق ادب کے حدود پھاند جاتا ہے، جو لوگ اس کے رسیا ہوتے وہ عموماً عمل کی تھاہ سے محروم ہوتے ہیں۔ مناظرے سے سکوت بہتر ہے۔

سیاسی میدان میں وارد ہوئے تو مناظرہ و مباحثہ سے بالطبع متنفر رہے کبھی کسی نکتہ چیں، حرف گیر، عیب گو اور افسانہ طراز کا جواب نہ دیا۔ جو لوگ ذاتیات میں ملوث ہوتے انہیں منہ نہ لگاتے، بعض دوستوں نے عرض کیا "فلاں اخبار آج کل آپ کا مرید ہے اور پچھلے بیس سال کی مخالفت سے ہاتھ اٹھا کر مدح سرائی کر رہا ہے۔" فرمایا: اس کے ایڈیٹروں کو پڑھ چکا ہوں۔ اب اخبار کو پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ جو لوگ کسی مقصد کے لیے زندگی بسر کرتے وہ تحسین و تنقید سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ وہ اس پر غور ہی نہیں کرتے کہ دنیا ان کے متعلق کیا سوچ رہی ہے۔ وہ خود اپنے متعلق سوچتے اور

اور اپنے قدموں کی نگرانی کرتے ہیں۔ مناظرہ علم کا اسراف اور مباحث کی تبذیر ہے۔ اگر اپنے فیصلوں کی سچائی پر یقین ہے تو اس کی پرواہ نہ کرو کہ دنیا تمہارے ارادوں کو شک کی نظر سے دیکھتی ہے۔ وہ لوگ بھی ہیں جن کے تصور میں تو کائنات اس کے خالق کی سب سے پہلی اور سب سے آخری غلطی ہے اور یہی ان کا سوءِ فہم ہے۔

پابندیٔ اوقات

مولانا سے ان کے بعض معاصروں کی خفگی کا باعث ان کا استغنا تھا۔ وہ خلوت کے انسان تھے۔ کسی کے ہاں جاتے نہ بلاتے اپنی انا میں اس درجہ گم سم تھے کہ بعض لوگ جو ابتدائی زندگی میں ان کے ہم سفر اور "الہلال" کے شروع میں ہم قلم تھے، اسی باعث آخر تک بگڑے رہے اور بگاڑ ہی میں رحلت کر گئے۔ لیکن مولانا اس قسم کی ناراضی کو ذہن کی مرگی کا نام دیتے اور لاعلاج گردانتے تھے۔

پابندیٔ اوقات کا یہ حال تھا کہ ملیح آبادی کی روایت کے مطابق ایک دن پانچ بجے شام گاندھی جی آ گئے مولانا کو خبر کی تو جیسے بیٹھے تھے ٹس سے مس نہ ہوئے، فرمایا: "اس وقت ملنے سے معذور ہوں کل صبح نو بجے تشریف لائیں"۔ گاندھی جی بھی مہاتما تھے ہشاش بشاش لوٹ گئے اور اگلے دن نو بجے صبح تشریف لائے۔

دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر "ریاست" کا مضمون "چٹان" میں چھپ چکا ہے کہ وہ مولانا سے طے شدہ وقت کے مطابق مل رہے تھے، اجمل خان آئے اور کہا پرائم منسٹر ہاؤس سے فون آیا ہے کہ پنڈت جی ملنے آ رہے ہیں۔ جواب دیا، بول دو کہ اس وقت کوئی عزیز بیٹھا ہے وہ نہ آئیں۔ اجمل خان جا کر اُلٹے پاؤں آ گئے اور کہا، پنڈت جی روانہ ہو چکے ہیں اور راستے میں چند منٹ پنڈت گوبند بلبھ پنت کے ہاں ٹھہریں گے۔ فرمایا وہاں فون کر دو کہ اب سے ڈیڑھ گھنٹے بعد تشریف لائیں۔"

غرض اوقات کی پابندی مولانا کے معمولات کا لازمہ تھی۔ وہ چھوٹے سے چھوٹے معمول کو بھی کسی بڑی سے بڑی مداخلت پر قربان کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے، ان کا معمول تھا کہ رات جلد ہی سو جاتے۔

ہندوستان آزاد ہوا تو پندرہ اگست کو رات بارہ بجے ہندوستانی پارلیمنٹ (لوک سبھا)

میں جشن عام تھا۔ چودھری خلیق الزمان بھی حلف اُٹھا کر ترنگا پرچم کو سلام کر رہے تھے، اگر کوئی غیر حاضر تھا تو وہ صرف ابوالکلام تھے جنہوں نے برطانوی نمائندوں سے مذاکرات کے بعد یہ دن فتح کیا تھا۔

پنڈت نہرو نے دوستوں سے بیان کیا کہ مولانا اس رات سوئے بھی نہیں۔ ان کی آنکھوں سے نیند کھو چکی تھی۔ وہ اضطراب کی حالت میں کروٹ لے رہے تھے کہ ہندوستان میں انسان قتل ہو رہا تھا۔ جنہیں اس روز سب سے زیادہ خوش ہونا چاہیئے تھا وہ اس رات سب سے زیادہ ملول تھے۔

قلم و زبان کا فرق

مولانا کی تحریر ان کی تقریر اور ان کی تقریر ان کی تحریر ہوتی، وہ گفتگو کرتے تو معلوم ہوتا کتاب کے ورق اُلٹ رہے ہیں، ان کی تقریر مربوط و مرتب تھی۔ قلمی نسخوں کے اجزا کی طرح ایک ایک لفظ ناپ تول سے ہوتا، مولانا آزاد کی کہانی ان کی زبانی سے اندازہ کر لیں۔ ملیح آبادی نے شروع میں لکھا ہے کہ:

"مولانا بولتے جاتے اور میں لکھے جاتا، ہر روز یہی طریق تھا۔ جہاں چھوڑ دیتے، اگلے دن یہ معلوم کئے بغیر کہاں چھوڑا تھا اگلا حصہ لکھوانا شروع کر دیتے۔ اس طرح جو کچھ لکھا وہ تمام تر ان کے بول ہیں، ہو بہو، من وعن الف تا یٰ۔"

جس طرح لکھتے اسی طرح بولتے تھے، پُر شکوہ الفاظ، پُر ہیبت فقرے، قرآن کی آیات اور برجستہ اشعار۔ پھر وقت کے ساتھ جیسے جیسے قلم بدلتا رہا ویسے ویسے زبان میں تغیر آتا رہا۔ ابتدائی مشکل گوئی تحریروں میں بالکل عنقا ہو گئی۔ اب سہل و سادہ زبان میں جادو جگاتے اور آسان و سبک زبان میں قلم چلاتے، قلم و زبان کی اس ہم آہنگی کے باوجود نئے اور پرانے اسلوب کی ہیئت میں کوئی فرق نہ آیا۔ اصل سحر ان کے لب و لہجہ اور زبان و بیان میں تھا یا ان حجازی الفاظ و مطالب کی روانی و طغیانی میں تھا۔ جو تحریکِ خلافت کے دنوں میں لشکر و سپاہ کی طرح اُن کی زبان و قلم سے نکلتے تھے۔

معاصروں سے تعلق

معاصروں سے تعلقات میں رکھ رکھاؤ تھا۔ کانگریس ہائی کمانڈ سے باہر ان کے دوستانہ روابط سے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے۔ بس پہلی دفعہ "غبارِ خاطر" سے معلوم ہوا کہ مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی ان کے صدیق مکرم ہیں، خلافت کے زمانے میں علی برادران، حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خان وغیرہ معاصروں میں سرِفہرست تھے، پھر آصف علی سے علاقہ تھا۔ لیکن متقدمین میں حکیم اجمل خانؒ اور ڈاکٹر انصاریؒ کے سوا باقی سب

ان سے کٹ گئے اور وہ خود بھی ان سے الگ تھلگ ہی رہے، حتیٰ کہ ایک ایک واصل بحق ہو گیا۔

مولانا محمد علی قیادت میں ان کے حریف تھے، لیکن محمد علی عوام میں تھے اور ابوالکلام عوام کیا خواص سے بھی الگ رہے۔ مولانا شوکت علیؒ مولانا محمد علیؒ کے بڑے بھائی تھے۔ مولانا آزادؒ نے ان کے متعلق کہا تھا کہ شوکت علی اور ظفر علی خان کسی تحریک کا قلعہ دنوں میں اُٹھا سکتے ہیں لیکن قلعہ تیار ہو جائے تو انہیں نکال دو، ورنہ یکایک ڈھانا شروع کر دیں گے۔ حسرت موہانی کے متعلق مولانا کا خیال تھا کہ سیاست کے نہیں شرافت کے انسان ہیں۔

مولانا آزادیِ ہندوستان کی حد تک گاندھی جی کے ہم خیال تھے، ہم مذاق نہیں۔ راجندر پرشاد یا آچاریہ کرپلانی کے نزدیک گاندھی ازم جدید ہندوستان کا دھرم تھا اور وہ اسی میں بھارت کی شکتی اور باسیوں کی مکتی دیکھتے تھے۔ لیکن مولانا آزاد گاندھی جی کو ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی طاقت اور ہندو دھرم کی سچائی گر دانتے تھے۔ سی آر داس کو سچا ہندوستانی، موتی لال نہرو کو نڈر انسان اور جواہر لال کو جذباتی دوست کہتے تھے۔ ان کے دل میں ان کے لیے بڑا اخلاص تھا۔ آصف علی کو شریکِ فکر سمجھتے اور عبدالغفار خان کو شریکِ سفر۔ جن رفقاء سے اختلاف تھا ان کے متعلق مفتی کلمہ کہنا متانت و شرافت کی اہانت خیال کرتے۔ سردار پٹیل ان سے اور وہ سردار پٹیل سے ذہنی فاصلہ رکھتے تھے۔ لیکن ان کے بارے میں کبھی پہلو دار بات نہ کرتے۔ سردار پٹیل کے اُلٹے سیدھے کلمات معلوم ہوتے تو طرح دے جاتے، فرماتے ہر انسان ایک مزاج رکھتا ہے۔ سردار پٹیل اپنی خصوصیت کو بدلنے سے معذور ہیں۔ مولانا عمر بھر دامن کی ہوا دے کر سیاست کا چولہا دھکاتے رہے۔ البتہ ادب کے میدان میں ان کا کوئی حریف نہ تھا جو تھے وہ خوشہ چین ہی تھے۔

کس طرح لکھتے تھے

ملیح آبادی لکھتے ہیں، مولانا کو لکھتے دیکھ کر عجیب حظ حاصل ہوتا۔ ان کے ہونٹوں پر ایک خفیف سا دلفریب تبسم کھلتا اور انگلیوں میں ناچتا ہوا قلم کاغذ کے میدان میں بے روک دوڑا کرتا۔ لکھتے وقت چہرہ ہی نہیں پورا سراپا دیکھنے کے لائق ہوتا، حسن مجسم بن جاتے تھے۔ شاید اپنی تحریر سے خود بھی لطف اٹھاتے تھے، لیکن لکھ چکتے تو اتنے چاؤ سے سنواری ہوئی تحریر پہ بے رحمی سے ٹوٹ پڑتے۔ سطروں پر سطریں کٹتی چلی جا رہی ہیں، لفظوں کا قتل عام ہو رہا ہے پھر نظر ثانی کی گئی تو پہلی نظر ثانی سے بھی طبیعت غیر مطمئن ہا

اب پھر چھری چلنے اور قیمہ بنانے لگتی۔ مسودہ ایسا کٹا پھٹا ہوتا کہ بارہا خود انہی سے رجوع کرنا پڑتا پھر وہ نقل کر چکتا تو دوسرے دن یہ نقل بھی قیمہ ہو جاتی۔ مولانا تحریر میں ایک ایک لفظ چُن چُن کر اور تول تول کر بٹھاتے تھے۔ محمد حسین آزاد بھی اسی رنگ ڈھنگ کے انسان تھے کہ الفاظ کی کتر بیونت آخر تک جاری رکھتے، ایک لفظ بے محل ہو جائے تو سارا طلسم ٹوٹ جائے۔

مولانا نے ادب، سیاست، مذہب، تاریخ، فلسفہ کے تمام میدانوں میں جولانیاں کی ہیں اور ہر میدان کو سر کرکے رہے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ایسا ہمہ گیر انشاپرداز اس ملک میں پیدا نہیں ہوا۔

(ذکرِ آزاد صفحہ ۱۴۲ تا ۱۴۴)

"اور لکھنے میں وقت کی پابندی کے قائل ہی نہ تھے، اس قید سے ہمیشہ آزاد رہے۔ ترجمان القرآن جلد سوم اسی کی نذر ہوگئی، کہ لکھیں گے تو کتنا لکھیں گے، فرمادیتے "پرچے میں دو صفحے میرے لیے خالی رکھیے"۔ اخبار جمعہ کے دن نکلتا اور ایک ہی کاتب سے کام لیا جاتا تھا، اب منگل کے بعد بدھ ہے، پرزوں پر پرزے بھیج رہا ہوں کہ مضمون دیجئے، تو جواب آتا ہے، مولوی صاحب بے فکر رہیے بھیج رہا ہوں۔ لیجیے جمعرات بھی آگئی، میرے تقاضے جاری ہیں مگر ادھر سے وہی ایک جواب۔ بس بھیج رہا ہوں۔ صبح سے دوپہر، دوپہر سے سہ پہر، آخر شام ہوگئی، اب مولانا کی طرف سے پرزہ آرہا ہے۔ پیچش نے ہلکان کر ڈالا ہے کیسے لکھتا؟ اور یا دو صفحوں کی جگہ چار صفحے کا مضمون آرہا ہے۔ ہم رات بھر جاگ کر کسی نہ کسی طرح مضمون کی مہم کو سر کرتے کہ دو کی جگہ چار صفحے آئے ہیں لیکن آٹھ بجے رات ایک اور سلپ چلی آرہی ہے کہ مضمون میں فلاں پیراگراف بدل دیا جائے اور اب اس طرح لکھا جائے۔ ایک بالکل نئی عبارت، اس سے مطلب ہی نہیں کہ یہ عبارت پہلی عبارت کے برابر ہے، کم ہے یا زیادہ کئی دفعہ پتھر پر کانٹ چھانٹ کی جاتی تھی کہ مولانا کے لکھنے کا شیوہ یہی تھا۔"

(ذکرِ آزاد صفحہ ۱۰۸)

مولانا تحریر میں سحر پھونکنے اور جادو جگانے کے عادی تھے۔ "قدرت نے خود اپنے

ہاتھ سے ذہانت وفطانت کا ایک سانچہ تیار کیا اور صرف ابوالکلام کو ڈھال کے یہ سانچہ توڑ ڈالا۔"

(تذکرہ آزاد صفحہ ۳۸۰)

مولانا فونٹین پین سے لکھتے اور کاغذ میں کوئی خصوصیت نہ برتتے تھے۔"غبارِ خاطر" کا مسودہ قلعہ احمد نگر کی یادگار ہے۔ آخری طویل خط جو موسیقی کے متعلق ہے، راقم کے پاس ہے۔ فل سکیپ سائز، لکیر دار، ایک طرف چند صفحات پر انگریزی لکھی ہوئی، دوسری طرف خط کا مسودہ، کانٹ چھانٹ کچھ زیادہ نہیں لیکن قلم کی کاٹ موجود ہے۔

مولانا چونکہ سحر خیزی کے عادی تھے اس لیے صبح اُٹھ کر لکھتے یا ناشتے کے بعد دس گیارہ بجے تک قلم اٹھاتے تو پھر رکتا نہیں تھا خرامِ یار کی طرح گل کرتے، لکھتے کہاں موتی پروتے تھے۔ رات کو سیاسی خط وکتابت کے مسودے تیار کرتے خطوط طویل یا مختصر، علمی یا ادبی، سیاسی یا شخصی، ارتجالاً لکھتے پھر طبیعت رکتی نہ تھی بس چٹ پٹ لکھ ڈالتے تھے۔

ذاتیات سے پرہیز

مولانا ذکی الحس، شدید الاحساس اور نازک مزاج انسان تھے، اگر عمر کے ابتدائی اٹھارہ بیس سال ان کے لیے شوخ تھے تو اس کے بعد تمام زندگی یکساں رہے کہ ان کا وجود سراپا متانت تھا، بات چیت کی محفلوں میں شگفتہ ہوتے یا قرطاس وقلم کی صحبتوں میں، فرمایا: الہلال کے ابتدائی دور میں بعض محرکات ایسے تھے کہ بعض اداروں کے معاملے میں قلم ذرا شوخ رہا لیکن پھر محسوس کیا کہ یہ راہ غلط ہے تو اس سے ہاتھ اُٹھا لیا۔

ہر دور میں لوگوں نے رکیک سے رکیک حملے کیے اور جو منہ میں آیا کہہ ڈالا، لیکن آپ نے ذاتیات کے مباحث اپنے قلم زبان کے لیے شجر ممنوعہ ٹھہرا لیے۔ اور ان سے عمر بھر لیے نیاز رہے۔ کسی کو رسید ہی نہ دی۔

ملیح آبادی نے ذکرِ آزاد میں ۴ نومبر ۱۹۳۸ء کا ایک خط نقل کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب علی برادران سے تعلقات منقطع تھے اور وہ ان پر کہیں نہ کہیں ایک آدھ جملہ کس دیتے تھے، اس خط میں لکھتے ہیں۔

"بعض اشخاص نے مجھ سے کہا ہے کہ اپنے کسی مضمون میں آپ نے شوکت علی صاحب

کو بہت برا لکھا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے آپ کی کوئی تحریر اس قسم کی نہ نکلی ہوگی۔ بہرحال اس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ شخصاً کسی کی برائی نہ کی جائے اور جو کچھ لکھا جائے اعتدال سے باہر نہ ہو۔

مسلم لیگ نے مولانا کے خلاف جو طوفان کھڑا کیا وہ گالی گفتار کی انتہا پر تھا۔ نیاز مند قدرتاً بھی برہم تھے۔ ترجمان احرار و روزنامہ آزاد بھی جواباً طعن و طنز کی زبان استعمال کرنے لگے۔
مولانا کو پتہ چلا تو راقم کو بلا بھیجا، احقر دہلی پہنچا، فرمایا:

"زندگی نہ بھڑک اٹھنے کا نام ہے نہ بجھ جانے کا بلکہ سلگتے رہنا ہی زندگی کا نام ہے۔ معاملہ سخن گسترانہ ہو تو ٹھیک ہے۔ لیکن برائی کا جواب برائی نہیں۔ لیگ کی اپنی زبان ہے اور وہ ہماری زبان نہ ہونی چاہیئے۔ اگر سب وشتم ہی زبان ہے تو پھر قومی اخلاق کا خدا حافظ ہے۔ اس سے کوئی عمدہ فصل تیار نہ ہوگی۔ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہنے دو۔ انہیں شاید حق پہنچتا ہے۔ لیکن اپنی زبان کو آلودہ دشنام نہ کرو۔ کبھی سخت وسنگلاخ الفاظ سے قومی معاملات حل نہیں ہوتے۔ میں جانتا ہوں آپ لوگوں کو مجھ سے اخلاص ہے لیکن اخلاص و ارادت کی راہیں دوسری ہیں۔ طیش و غصہ نہیں، جن لوگوں کو جذبات نے اندھا کر دیا ہے۔ جو دماغ کے بجائے پیٹ سے سوچ رہے ہیں اور دل کی جگہ زبان سے محسوس کر رہے ہیں انہیں ایک دن اس کا شدید احساس ہوگا اور تب وہ اپنے ہی تجربوں سے تاریخی سبق حاصل کر لیں گے۔ بہرحال یہ بات حلق سے نیچے نہیں اترتی ہے کہ آپ لوگ برہنہ دماغوں اور آوارہ زبانوں کے سامنے بازار میں ڈنٹر پیلیں۔"

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو راقم کی موجودگی میں کہا "شاہ جی خطابت آپ کو عطیہ الٰہی ہے اور جو چیز عطیہ الٰہی ہو اس میں درشتی نہ ہونی چاہیئے، جو لوگ حریف بذلہ نہیں ان کے ذکر سے اجتناب ہی بہتر ہے۔ طعن و طنز کمزور انسانوں کی بیمار زبانوں کا ہذیان ہیں۔ آپ ماشاء اللہ خطابت کے سمندروں سے موتی نکال لاتے ہیں آپ کو ان چھوٹی موٹی ندیوں سے کیا نسبت؟ جو صرف سنگ ریزے اگاتی اور ریت پھانکتی ہیں۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی سے ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں کسی مسئلے پر کچھ کہہ رہے تھے تو مولانا مظہر علی اظہر کی اس تقریر سے پریشان ہو گئے جس میں انہوں نے قائد اعظمؒ کو کافر اعظم کہا اور ان کے نکاح کا قصہ چھیڑا تھا، فرمایا:

"یہ سیاسی لڑائی نہیں۔ ایک ایسی مبتذل بات ہے جو الفاظ کی رعایت سے کٹھی سے ہے۔ تین دفعہ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا پھر فرمایا، مولوی صاحب آپ بازی ہار گئے ہیں۔"

فرمایا:

"جو لوگ قومی اخلاق کے مبادیات نہیں جانتے وہی اس قسم کی ذاتیات کو زبان دیتے ہیں۔"

صبر و تحمل

مولانا نے ترجمان القرآن میں صبر کے جو معانی بیان کئے ہیں اس کی ہو بہو تصویر تھے۔ ان کا وجود فی الواقعہ صبر جمیل کا پیکر تھا، اور تحمل (قوت برداشت) کا حال یہ تھا کہ پہاڑوں کی طرح ژالہ باری سے بے نیاز اپنی جگہ کھڑے رہتے۔ ان میں شکوہ پہاڑوں کا اور تحمل زمینوں کا تھا اور سمندروں کی طرح گہرے تھے۔ ان کی پشت میں خنجر بھونکے گئے مسلمانوں نے اپنی نفرت کی واحد آماجگاہ بنا لیا، لیکن زبانوں کی آوارگی پر اُف تک نہ کی۔ فرماتے ان کی عقلوں کو طاعون چاٹ گئی اور ان کے اخلاق کو سرطان ہو گیا ہے، جب حقیقت کا سورج ابھرے گا اور حقائق کھل کے سامنے آئیں گے تو انہیں خود بخود معلوم ہو گا کہ سراب کا شکار ہیں۔ ان کے خلاف کسی نے کیا نہیں کہا؟ حتیٰ کہ جو شبلی تھے انہوں نے بھی تحریک پاکستان کے دنوں میں پتھر اور پھول مارے، لیکن قائد اعظم یا شیخ الاسلام جس نے جو کہا سب کچھ سنا، ہر وار سہا فرمایا تو بس اتنا کہ "آندھیوں میں گرد اڑتی اور طوفانوں میں پانی اچھلتا ہے۔" علی گڑھ کے طلبہ نے ۱۹۴۶ء میں اسٹیشن پر ان سے جو وحشیانہ سلوک کیا، پھر سری نگر میں لیگ کے منچلوں نے ان کے خلاف جو طوفان اٹھایا وہ سب ایک شہدہ پن تھا۔ ملک کی سیاسی جدوجہد میں ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔ ملک تقسیم ہو گیا تو پروفیسر رشید احمد صدیقی کے الفاظ ہیں، مولانا آزاد سر سید ثانی تھے کہ یونیورسٹی کو ہندوستان کی قیامت صغریٰ کے فرقہ وارانہ الاؤ سے نکالا، اور اس کا وجود بچا لیا اور یہ سب ان کے

صبر و تحمل کی کرامات تھیں۔

اپنے بارے میں سکوت

مولانا اپنے بارے میں مہر بلب ہی رہے۔ کوئی سوانح نگاری کے لیے مساعی ہوتا تو خوبصورت الفاظ میں ٹال دیتے۔ گو باتوں باتوں میں بسا اوقات سوانح عمری کے کئی ورق کھل جاتے لیکن اس غرض سے کچھ حاصل کرنا مشکل تھا۔ قاضی عبدالغفار کا ادب میں ایک منفرد مقام تھا۔ مولانا سے ان کے خاص روابط تھے وہ کئی ماہ کی یکجائی کے باوجود مولانا سے سوانح حاصل نہ کر پائے۔ ان کی کتاب ابوالکلام آزاد محض ایک ادبی مطالعہ ہے۔ مولانا مہر خود تن آسان تھے۔ مولانا کے سوانح لکھنے کا ارادہ کیا۔ مولانا نے طلب فرمایا وہ لاہور سے دہلی گئے۔ وہاں ہفتہ عشرہ ٹھہرے لیکن بے نتیجہ اقرار کا حظ اٹھا کر خالی خولی آ گئے۔

راقم نے سوانح عمری کے ضمن میں عرض کیا کہ بعض سوالات دریافت طلب ہیں۔ جواب مرحمت فرمائیں تو معلومات کی بعض تشنگیاں رفع ہو جائیں گی۔ فرمایا ٹھیک ہے لیکن ان دنوں ملکی مسائل کی وجہ سے دماغ کی مصروفیتیں بہت بڑھ گئی ہیں۔ اگلی دفعہ اس پر غور کر لیں گے اور وہ اگلی دفعہ نہ آئی۔ یہ معاملہ ہمیں سے نہ تھا ملک بھر کے نامور اہل قلم حاضر ہوتے اور وہ سب کو خراج دے جاتے کھلا انکار نہ کرتے لیکن نتیجہ کھلا انکار ہوتا تھا۔

اس گریز و اعراض کے باوجود ان کے سوانح و افکار کے نناوے فیصد ماخذ موجود ہیں۔ ملیح آبادی نے ابوالکلام کی کہانی خود ان کی زبانی لکھ کر ایک قیمتی یادداشت مہیا کی ہے۔ لیکن دیباچے میں لکھا ہے کہ مولانا کو کبھی مسودہ یاد آ جاتا اور وہ نظر ثانی کے لیے مانگ لیتے تو پھر ہمیشہ کے لیے غتر بود ہو جاتا۔ کچھ ایسا ہی قصہ تذکرہ کے دیباچے میں فضل الدین نے لکھا تھا۔ تذکرہ میں سب کے حالات لکھے ہیں لیکن اپنے بارے میں صرف شاعری کی ہے۔ تاہم ان کے سوانح حالات کے لیے "ہماری آزادی" اور "غبارِ خاطر" بہت بڑی بنیادی دستاویز ہیں۔

اس کے علاوہ ان کی رحلت کے بعد بعض رسائل کے "ابوالکلام نمبر" ہیں۔ کئی ایک اہل قلم کے رشحات کا مجموعہ مرتبہ ہمایوں کبیر ہے۔ پھر ان کے خطبات، خطوط اور الہلال و البلاغ کے فائل ہیں کہ ان سب میں انہیں ڈھونڈھا جا سکتا ہے۔

لیکن سوانحی خطوط کی اس فراوانی کے باوجود بعض سوالات کا جواب ملنا مشکل ہے۔ ایک جواہر لال کے سوا کہ وہ خود ایک عظمت کا نام تھا اور کسی بھی کانگرسی زعیم نے اپنے اس عظیم ساتھی پر قلم نہیں اٹھایا کانگرس کی مجلس عاملہ کے مکالمات موجود ہوں تو ان کے سیاسی تدبر کی وہ جھلکیاں بھی سامنے آجائیں جو شاید ان کے مسلمان ہونے کی وجہ سے مرتب نہیں ہو سکی ہیں۔ اور نہ بھارتی حکومت کے محکمہ مطبوعات ہی نے اس آخری ہندوستانی مسلمان کے افکار و سوانح کی ضرورت محسوس کی ہے۔

راقم کے عرض کرنے پر فرمایا:

"عظیم سوانح عمریاں عوام کی تربیت کرتی ہیں ایک پر عظمت سوانح عمری آئندہ نسلوں کے دور دراز کے پر پیچ سفر کو سہل اور آسان کر دیتی ہے۔ گو ہر انسان خود تجربہ کرنا چاہتا اور دوسروں کے تجربے سے فائدہ نہیں اٹھاتا لیکن کئی ایک سوانح عمریوں میں اس قدر خصوصیت ضرور ہوتی ہے کہ دماغوں کو بالا کرتیں اور دلوں کو حوصلہ دیتی ہیں ہر سوانح عمری انفرادی سطح پر اجتماعی تجربے کی سرگزشت ہوتی ہے۔"

عرض کیا، اپنے سوانح خود لکھیے، ہندوستان کو تاریخ ملے گی اردو طاقت ور ہو گی فرمایا:

"ہندوستان سے اردو کی طاقت تقسیم کے اشہب پر سوار ہو کر پاکستان چلی گئی ہے۔ رہا تاریخ کا سوال تو اب یہ چیز دوسروں کے لیے چھوڑ دینا ہی بہتر ہے۔"

موسیقی کا شوق

"غبارِ خاطر" کے آخری خط محررہ ۱۵ر جون ۱۹۴۳ء میں رقم طراز ہیں:

"مجھے فنِ موسیقی کے مطالعہ اور مشق کا بھی شوق رہ چکا ہے۔ اور اس کا اشتغال کئی سال تک جاری رہا تھا۔ ابتدا اس کی یوں ہوئی کہ ۱۹۰۵ء میں جب تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا اور طلبہ کو پڑھانے میں مشغول تھا تو کتابوں کا شوق مجھے اکثر ایک کتب فروش خدا بخش کے یہاں لے جایا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے فقیر اللہ خان سیف کی "راگ درپن" کا ایک نہایت خوش خط اور مصور نسخہ دکھایا اور کہا کہ یہ کتاب فنِ موسیقی میں ہے، میں نے وہ کتاب لے لی۔ جب تک موسیقی کی مصطلحات پر عبور نہ ہو اور کسی ماہر فن سے اس کی مبادیات سمجھ نہ لی جائیں کتاب کا مطلب سمجھنا مشکل تھا۔ اب جو یہ رکاوٹ پیش آئی تو طبیعت کو سخت الجھن

ہوئی، خیال ہوا کسی واقف کار سے مدد لینی چاہیئے۔ بسیتا خان نامی ایک شخص والد مرحوم کا مرید تھا اور ان سے بیعت کے بعد اس پیشے سے تائب ہو گیا تھا۔ میں نے اس کو راضی کیا اور وہ قدرے تذبذب کے بعد بہت خوش ہوا کہ مرشد زادے کی توجہ اس کی طرف مبذول ہوئی ہے۔ ہفتے میں تین دن مقرر کیے، پھر ہر روز سہ پہر کے وقت اس کے مکان پر جانے لگا اور دو تین گھنٹے موسیقی کے علم و عمل کا شغلہ جاری رہتا۔ بسیتا خان نے تعلیم کا صرف ایک ہی ڈھنگ رٹا ہوا تھا جو اس فن کے استادوں کا عام طریقہ ہے۔ بہر حال موسیقی کے آلات میں زیادہ تر توجہ ستار پر ہوئی اور بہت دیر تک انگلیاں اس سے آشنا رہیں۔

اس وقت میری عمر سترہ برس سے زیادہ نہ ہوگی۔ اب جو اس کوچے میں قدم رکھا تو جہاں تک راہ مل سکی قدم بڑھائے جانے میں کوتاہی نہ کی۔ ستار کی مشق چار پانچ سال تک جاری رہی۔ بین سے بھی انگلیاں ناآشنا نہیں رہیں لیکن زیادہ دل بستگی اس سے نہ ہو سکی۔ حُسن آواز میں ہو یا چہرے میں، تاج محل میں ہو یا نشاط باغ میں، حُسن ہے اور حُسن اپنا فطری مطالبہ رکھتا ہے —— میں ہر چیز کے بغیر خوش رہ سکتا ہوں لیکن موسیقی کے بغیر نہیں۔ آواز خوش میرے لیے زندگی کا سہارا، دماغی کاوشوں کا مداوا اور جسم و دل کی ساری بیماریوں کا علاج ہے ؎

روئے نکو معالجۂ عمر کوتاہ است

ایں نسخہ از بیاض مسیحا نوشتہ ایم

مجھے اگر آپ زندگی کی رہی سہی راحتوں سے محروم کرنا چاہتے ہیں تو صرف اس ایک چیز سے محروم کر دیجیے آپ کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

جس زمانے میں موسیقی کا اشتغال جاری تھا۔ طبیعت کی خود رفتگی اور محویت کے بعض ناقابل فراموش احوال پیش آئے جو اگرچہ خود گزر گئے لیکن ہمیشہ کے لیے دامن زندگی پر اپنا رنگ چھوڑ گئے۔ اسی زمانے کا ایک واقعہ ہے کہ آگرہ کے سفر کا اتفاق ہوا، اپریل کا مہینہ تھا اور چاندنی کی ڈھلتی ہوئی راتیں تھیں۔ جب رات کی پچھلی پہر شروع ہوتے

کو ہوتی تو چاند پردہ شب ہٹا کر یکایک جھانکنے لگتا۔ میں نے خاص طور پر کوشش کر کے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ رات کو ستارے کر تاج محل چلا جاتا اور اس کی چھت پر جمنا کے رخ بیٹھ جاتا پھر جونہی چاندنی پھیلنے لگتی ستار پر کوئی گیت چھیڑ دیتا اور اس میں محو ہو جاتا۔ کیا کہوں اور کس طرح کہوں کہ فریب تخیل کے کیسے کیسے جلوے انہی آنکھوں کے آگے گزر چکے ہیں ؎

گدائے میکدہ ام، لیک وقت مستی بیں
کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

رات کا سناٹا، ستاروں کی چھاؤں، ڈھلتی ہوئی چاندنی اور اپریل کی بھیگی ہوئی رات، چاروں طرف "تاج" کے مینارے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ برجیاں دم بخود بیٹھی تھیں، بیچ میں چاندنی سے دھلا ہوا مرمریں گنبد اپنی کرسی پر بے حس و حرکت متمکن تھا۔ نیچے جمنا کی روپہلی جدولیں بل کھا کھا کر دوڑ رہی تھیں اور اوپر ستاروں کی ان گنت نگاہیں حیرت کے عالم میں تک رہی تھیں۔ نور و ظلمت کی اس ملی جلی فضا میں اچانک پردہ ہائے ستار سے نالہ ہائے بے حرف اٹھتے اور ہوا کی لہروں پر بے روک تیرنے لگتے آسمان سے تارے چھڑ رہے تھے اور میری انگلی کے زخموں سے نغمے ؎

زخمہ بر تار رگ جان می زنم
کس چہ داند تا چہ دستان می زنم

کچھ دیر تک فضا تھمی رہتی گویا کان لگا کر خاموشی سے سُن رہی ہے پھر آہستہ آہستہ ہر تماشائی حرکت میں آنے لگتا، چاند بڑھنے لگتا یہاں تک کہ سر پہ آ کھڑا ہوتا، ستارے دیدے پھاڑ پھاڑ کر تکنے لگتے درختوں کی ٹہنیاں کیفیت میں آ کر جھومنے لگتیں، رات کے سیاہ پردوں کے اندر سے عناصر کی سرگوشیاں صاف صاف سنائی دیتیں۔ بارہا "تاج" کی برجیاں اپنی جگہ سے ہل گئیں اور کتنے ہی مرتبہ ایسا ہوا کہ منارے اپنے کاندھوں کو جنبش سے نہ روک سکے۔ آپ باور کریں یا نہ کریں مگر یہ واقعہ ہے کہ اس عالم میں بارہا میں نے برجیوں سے باتیں کی ہیں اور جب کبھی

"تاج" کے گنبد خاموش کی طرف نظر اٹھائی ہے تو اس کے لبوں کو ہلتا ہوا پایا ہے۔"

تو مپندار کہ ایں قصہ زخود می گویم
گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

مرحوم مرزا محمد ہادی سے لکھنؤ میں شناسائی ہوئی۔ وہ موسیقی میں کافی دخل رکھتے تھے اور اس کے علم و فن کی راہوں سے آشنا تھے۔ ان سے اپنی معلومات کی تکمیل میں مدد ملی۔" مولانا الفاظ کے اس نگارخانے کی آڑ میں لکھتے ہیں۔

"مرزا محمد ہادی مرحوم کے مکان میں شاہدان نغمہ پرداز سے صحبتیں گرم رہتی تھیں اور بعض استادان فن سے بھی مذاکرہ جاری رہتا تھا۔"

حجاز و مصر کی موسیقی کے تذکرے میں ام کلثوم سے متعلق لکھا ہے کہ "جس شخص نے اس کی آواز نہیں سنی وہ موجودہ عربی موسیقی کی دل آویزیوں کا کچھ اندازہ نہیں کر سکتا۔" اس بحث ہی میں انیسویں صدی میں یورپ کے فن موسیقی اور جرمنی کے باکمالان فن کا ذکر کیا ہے۔

ہندوستانی اور یونانی موسیقی سے عربوں کی آشنائیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خود عربوں کی موسیقی کچھ نہ تھی اور جتنی کچھ عمارت بھی انہوں نے اٹھائی تھی اس کا تمام تر مواد ایران کی ساسانی موسیقی کے کھنڈروں سے حاصل کیا گیا۔ ہندوستانی موسیقی کے احوال میں فرماتے ہیں کہ ہندوستانی موسیقی دراصل ہندوستانی مسلمانوں کی موسیقی کا نام ہے اور فارسی موسیقی غیر ملکی موسیقی سمجھی جاتی تھی۔ امیر خسرو مجتہد فن تھے۔ چنانچہ سازگری ایمن اور خیال امیر خسرو کی مجتہدانہ اختراعات ہیں۔ ترانہ اور موصلہ بھی مسلمانوں ہی کی ایجادات ہیں۔ مسلمان بادشاہوں سے پہلے مسلمان صوفیوں نے موسیقی کی سرپرستی کی۔ ملتان، اجودھن، گور اور دلی کی خانقاہوں میں وقت کے بڑے بڑے ... حاضر ہوتے۔ تغلق اور خلجی کے درباروں میں بھی ہندوستانی موسیقی نے قدردانی پائی۔ لیکن جس شاہی خاندان نے ہندوستانی موسیقی سے بحیثیت ایک فن کے اعتنا کیا وہ غالباً جونپور کا شرقی خاندان تھا۔ اس زمانے میں دکن اور مالوہ موسیقی کے علم و عمل کا محور تھے۔ ابراہیم عادل شاہ اس اقلیم کا جگت گرو تھا۔ اس کے شوق موسیقی نے بیجاپور کے گھر گھر میں وجد و سماع کا چراغ روشن کر دیا تھا۔ اکبر کی قدرشناسی کو ... فضل نے تذکرہ کیا ہے۔ جہانگیر نے اپنی تزک میں فنون لطیفہ سے اپنے استغراق کی پوری کہانی

لکھی ہے۔ اس کے دربار میں جس پائے کے شاعر، مصور اور گویے تھے پھر کسی دربار میں اتنے باکمالوں کا اجتماع نہ ہوا۔

المختصر مولانا کا "غبارِ خاطر" میں یہ آخری خط ہندوستان میں مسلمانوں کے فنِ موسیقی پر اجمال کے ساتھ ایک جامع مقالہ ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ وہ علم و ادب ہی کے امام نہیں فنِ موسیقی کے بھی امام تھے۔ اور ابتداءً ان کے لیل و نہار بہ قول غالب جنت نگاہ و فردوس گوش کے سانچوں میں ڈھلے ہوئے تھے۔

مریدوں کا حلقہ

مولانا پیری مریدی کے روایتی سلسلوں سے بیزار ہو چکے تھے۔ انہیں خود اپنے گھر میں اس کا تجربہ ہوا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان میں اسلام کے تلپٹ ہونے کا باعث خانقاہی مزاج بھی ہے جس نے ہندو معاشرے کی آب و ہوا کے تابع سنگی بتوں سے ہٹ کر خود اپنے بت گھڑ لیے ہیں۔

چونکہ مولانا کے دینی تبحر، شخصی عظمت اور سیاسی بصیرت نے لاکھوں لوگوں کو اپنی ارادت میں منسلک کر لیا تھا، لہٰذا وہ انھیں مرشد و پیشوا گردانتے اور عقیدتاً ان کے گرد جمع ہوتے تھے۔ ان کے والد کا کلکتے میں باقاعدہ مزار ہے۔ پہلی برسی پر مریدوں نے عرس کرنا چاہا اور مولانا پر زور دیا کہ آبائی گدی سنبھالیں لیکن بہ قول ملیح آبادی مولانا نے اس پورے معاملے کی مذمت کی اور اعلان کر دیا۔ جس کا جی چاہے میری رضامندی کے خلاف عرس کا بندوبست کرے، ناخود میں شریک نہیں ہوں گا اور یہی کیا۔ والد کے عقائد و افکار سے ان کے عقائد و افکار کلیۃً مختلف ہو گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ والد کی تصنیفات و تالیفات کی طباعت و اشاعت تک گوارا نہ کی اور وہ الماریوں ہی میں دم پخت ہو گئیں۔

والد کے مرید زیارت و قدم بوسی کے لیے برابر آتے لیکن ملنے سے انکار کر دیتے۔ آخر ان کے شدید اصرار پر ہفتہ میں ایک دن مقرر کر دیا کہ مرید جمع ہوتے۔ ایک کمرے میں دری کا فرش بچھ جاتا، سامنے کرسی ہوتی اس پر بیٹھ کر گھنٹہ بھر مجلس کرتے یہ ایک رسمی چیز تھی مسلسل نہ تھی، مریدوں سے ہدیہ لینا یا روپیہ اینٹھنا، ان کی سادگی اور غریبی سے خطرناک قسم کا مذاق سمجھتے تھے۔ والد قادری شیخ تھے۔ انہوں نے بیعت کی اجازت دی تھی۔ بعض غالی عقیدت مند مجبور کرتے تو بیعت لیتے لیکن ان

سے صرف پابندیٔ شریعت کا حلف اٹھواتے تھے۔

مخالفوں سے سلوک

فرمایا۔ وہ لوگ جنہیں قدرت محاسن و محامد سے نوازتی ہے ان کے مخالف ضرور ہوتے ہیں لیکن ایسے حریف لائق اعتنا نہیں ہوتے۔ انہیں جواب دینے سے جواب نہ دینا ہی بہتر ہے۔ آدمی مخالفوں سے الجھ کر کچھ پاتا نہیں کھوتا ہے۔ لڑائی افراد سے نہیں نظریات سے ہونی چاہیے۔ جو اصولوں کے بجائے آدمیوں سے لڑتے ہیں وہ اپنے افکار و مساعی کو خود گزند پہنچاتے ہیں۔ فرمایا۔ مخالفوں سے ذاتیات کی جنگ میں ہجو ملیح یا ہجو قبیح مزہ تو دیتی ہے۔ مگر یہ ایک ایسا نشہ ہے جیسا بعض لوگ بھنگ پی کر سرور حاصل کرتے، افیون کھا کر سرشار ہوتے اور شیشۂ شراب اٹھا کر ماورائے کائنات چلے جاتے ہیں۔ ادھر نشہ اترتا تو ابکائیاں آنے لگتی ہیں پھر وہ دن سرعت سے آتا ہے جب محسوس ہوتا ہے کہ صحت کی دیوار گر چکی ہے اور اعضا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔

مسلمانوں کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ نسخۂ شفا ہے۔ دشمنوں سے جو سلوک ہونا چاہیے وہ سب حضورؐ کے اسوۂ حسنہ میں ہے اس کے بعد کسی مدرسے سے سبق لینے کی ضرورت نہیں۔ ان کا اتباع ہی اس مرض کا علاج ہے۔

میں نے اپنے حریفوں سے اعتنا ہی نہیں کیا لوگ دین کی مسند پر بیٹھ کر شاتہ خائی کرتے ہیں۔ سیاست تو دنیوی چیز ہے اور اس کی مثال میکدے کی سی ہے کہ جام ہی نہیں ٹکراتے عمامے بھی اچھلتے ہیں۔ مخالفوں کو جواب دینے کا مطلب ہے کہ ہم نے انہیں تسلیم کر لیا اور یہ عشق مقصد کی نفی ہے۔

طبیعت کی ہمہ گیری

مولانا ایک ہمہ گیر طبیعت کے مالک تھے۔ علماء میں امام الہند، ادیبوں میں یگانۂ روزگار، شاعروں میں ناصر سخن، مدبروں میں سرخیل، مفکروں میں عبقری، راہنماؤں میں سب سے آگے اور سیاست والوں میں منفرد۔ دوسری کوئی اتنی جامع شخصیت نہ تھی جس بڑے بڑے انسان تھے اور سب اپنے اپنے فن و فضا میں سربرآوردہ تھے، لیکن بیک وقت کسی شخصیت میں اتنی خوبیاں جمع نہ ہوتی تھیں۔

کئی دفعہ علماء کے مجمعوں کی صدارت کی اور وہ آپ کے سامنے اس طرح ہوتے گویا سب سے

بڑی دینی آواز کے حلقۂ درس میں ہیں۔ ۱۹۲۰ء میں مجلس خلافت مسلمانوں کی سب سے بڑی نمائندہ سیاسی تنظیم تھی، اس کی صدارت فرمائی۔ انڈین نیشنل کانگرس ہندوستان کی یورپی ذہانت اور سیاسی فطانت کا سب سے بڑا ادارہ تھا، اس کے ۱۹۲۳ء میں صدر ہوئے تو اس سے پہلے یا بعد اتنی کم عمر میں کوئی دوسرا صدر نہ ہوا تھا۔ پھر جب ہندوستان آزاد ہو رہا تھا تو برطانوی نمائندوں سے بات چیت میں قومی ہندوستان کے ترجمان تھے۔

ایک سیاسی ملاقات میں علی گڑھ کے بعض طلبہ نے کہا۔

”آج کے حالات میں مسلمان آپ کو اپنا ترجمان نہیں کہہ سکتے۔“

فرمایا: ”عزیزانِ محترم، میں نے کب دعویٰ کیا کہ مسلمانوں کا ترجمان ہوں، میں جو کچھ کہتا ہوں اس خیال سے کہتا ہوں کہ اسلام کا ترجمان ہوں۔ میرے خیالات مسلمانوں کی نہیں اسلام کی آواز ہیں۔“

ادیبوں اور شاعروں میں ان کا جو مقام تھا اس کا اندازہ اس سے کر لیجیے کہ اہل قلم کی تمام شاخوں کے ارکان ان کی علمی بے پناہی اور ادبی کج کلاہی کو مجری عرض کرتے ہیں۔

زندانی زندگی

قلعہ احمد نگر سے ۱۱ اگست ۱۹۴۲ء کے خط میں صدیق مکرم کو لکھتے ہیں:

”قید و بند کی زندگی کا یہ چھٹا تجربہ ہے۔ پہلا تجربہ ۱۹۱۶ء میں پیش آیا جب مسلسل چار برس تک قید و بند میں رہا۔ ان دنوں مولانا رانچی میں نظر بند تھے، پھر ۱۹۲۱ء، ۱۹۳۱ء، ۱۹۳۲ء اور ۱۹۴۰ء میں یکے بعد دیگرے یہی منزل پیش آتی رہی اور اب پھر اسی منزل سے قافلہ باد پیمائے عمر گزر رہا ہے۔ پچھلی پانچ گرفتاریوں کی اگر مجموعی مدت شمار کی جائے تو سات برس آٹھ مہینے سے زیادہ نہیں ہوگی۔ عمر کے ترپن برس جو گزر چکے ہیں، ان سے یہ مدت وضع کرتا ہوں تو ساتویں حصے کے برابر پڑتی ہے۔ گویا زندگی کے ہر سات دن میں ایک دن قید خانہ کے اندر گزرا۔ توراۃ کے احکام عشرہ میں ایک حکم سبت کے لیے بھی تھا، یعنی ہفتے کا ساتواں دن تعطیل کا مقدس دن سمجھا جائے۔ مسیحیت اور اسلام نے بھی یہ تعطیل قائم رکھی، سو ہمارے حصے میں بھی سبت کا دن آیا مگر ہماری تعطیلیں اس طرح بسر ہوئیں گویا خواجہ شیراز کے

دستورالعمل پر کاربند رہے

نہ گویمت کہ ہمہ سال مے پرستی کن

سہ ماہ مے خورد نہ ماہ پارسائی باشش"

قلعہ احمد نگر سے رہا ہوئے تو مجموعی قید میں دو سال گیارہ مہینے کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اس طرح قید کی مدت دس برس سات ماہ ہو گئی اور سبت کی تعطیل کا معاملہ ہاتھ سے نکل گیا۔ انتقال کے وقت عمر ۶۹ سال ۳ ماہ ۲۱ دن تھی۔ اس میں سے دس سال سات ماہ قید و بند میں گزرے، باقی ۵۸ سال ۸ مہینے ۱۴ دن قید و بند کی دیواروں سے باہر رہے۔ فرماتے ہیں:

نالہ از بہر رہائی نہ کند مرغ اسیر

خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

پہلی دفعہ ۲۷ برس کی عمر میں ۷ اپریل ۱۹۱۶ء کو قانون دفاع ہند کے تحت بنگال بدر کیے گئے اور رانچی سے باہر مورہ بادی میں نظر بند رہے۔ اس نظر بندی میں تذکرہ لکھا، بعض دوسری کتابیں بھی تالیف کیں۔ لیکن ان کے متعلق آج تک معلوم نہ ہو سکا کہاں غائب ہو گئیں۔ غالباً مولانا کی طبیعت ان کی اشاعت سے متفق نہ ہو سکی۔ ترجمان القرآن کے بعض مقامات بھی اس نظر بندی میں مدوّن کیے۔ جن جیلوں میں رہے ان میں علی پور جیل کلکتہ، نینی سنٹرل جیل الٰہ آباد، میرٹھ ڈسٹرکٹ جیل، گونڈا ڈسٹرکٹ جیل، مراد آباد سنٹرل جیل اور دہلی ڈسٹرکٹ جیل کے علاوہ احمد نگر کا قلعہ بھی تھا۔ ترجمان القرآن کی دوسری جلد میرٹھ ڈسٹرکٹ جیل میں لکھی۔ "غبار خاطر" قلعہ احمد نگر کی یادگار ہے۔

مولانا کے ساتھ جو لوگ قید و بند کے مختلف مرحلوں میں رہے وہ اپنی اسارتی رفاقت کا تذکرہ بھی ایک مضامین میں کر چکے ہیں۔ مثلاً پنڈت جواہر لال نہرو لکھتے ہیں کہ "ہم ان کی فقید المثال علمیت سے مرعوب تھے"۔ آصف علی کے لیے ان کا علم طور سینا تھا۔ مولانا اسد اللہ خاں میرٹھی ان کے ساتھ ڈسٹرکٹ جیل میرٹھ میں رہے۔ انہوں نے اپنے مضمون میں لکھا کہ مولانا کی شخصیت سے جیل خانے میں استبداد پر خوف طاری رہتا اور کوئی سپرنٹنڈنٹ کسی سلسلے میں کبھی چون چرا نہ کر سکتا تھا۔ ڈاکٹر سید محمود نے مولانا کی موت پر ایک مضمون لکھا کہ پس دیوار زنداں وہ اسوہ یوسفی کا صحیح نمونہ تھے۔ مرحوم حافظ علی بہادر خاں بھی قید خانے میں ساتھ رہے ایک مضمون میں اپنی ہم صحبتی کے تاثرات بیان کرتے ہوئے

لکھا کہ "مولانا خبریں منگوانے اور خبریں بھجوانے میں جیل خانے کے ضابطوں سے بے نیاز تھے۔" چونکہ ہر لحاظ سے تنہا تھے اس لیے اندر بھی کوشش کر کے تنہا ہی رہتے۔ جیل خانے کا موسم حسب حال نہیں ہوتا لیکن مولانا کے لیے ہر موسم گوارا تھا۔ کبھی کبھار دوستوں کے مذاق میں حصہ ضرور لیتے۔ جیسا کہ ملیح آبادی نے "ذکرِ آزاد" میں لکھا ہے لیکن دن کا بڑا حصہ قرطاس وقلم اور جرائد و کتب ہی میں گزارتے۔ "غبارِ خاطر" میں بھی اپنی اس تنہائی پسندی کا ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں:

"ابتدا میں اس کا عادی نہ تھا لیکن رانچی کی نظر بندی سے میری طبیعت ہمیشہ کے لیے اس سانچے میں ایسی ڈھلی کہ اب وہ سانچہ ٹوٹ سکتا ہے لچک نہیں کھا سکتا۔"

غرض مولانا ہندوستان میں ان علمائے حق کا مثالی وجود تھے جو مختلف ادوار میں عصری استبداد سے پنجہ آزما رہے اور جن کی عزیمت کا تذکرہ مسلمانوں کی اجتماعی تاریخ کا روشن باب ہے۔

بے مثال حافظہ

حافظہ فقید المثال تھا۔ جس عمر میں جو پڑھا وہ حافظے میں تھا ان کا دماغ انسائیکلوپیڈیا تھا۔ ہر چیز اس طرح یاد تھی کہ فلاں کتاب کے فلاں صفحے پر بائیں یا دائیں طرف اتنی سطریں چھوڑ کر درج ہے اور کتاب کب پڑھی تھی، چالیس یا پینتالیس سال پہلے۔ "غبارِ خاطر" انہی یادداشتوں کا ایک مرقع ہے۔ ایک قلعہ احمد نگر ہی کے ذکر میں کیا کچھ نہیں لکھا۔ یہاں تک کہ تب قلعہ دار کون تھا۔

موسیقی سے متعلق آخری خط حافظے کا شہ پارہ ہے۔ انہیں واقعات کے سنین تک یاد تھے۔ ایک زمانے میں ایچ جی ویلز کی عالمی تاریخ کا بڑا چرچا تھا۔ مولانا فی نفسہٖ ایک عالمی تاریخ اور اس کا تجزیہ و تدوین تھے۔ ان کا دماغ دین وفقہ، آثار وسیرت، ادب وشعر، تاریخ وفلسفہ اور سیاست ومعیشت کے خزائن کا خزانہ تھا، قدرت نے جدید وقدیم علوم کے باب میں ہندوستان کو فی زمانہ اتنا بڑا آدمی نہیں دیا۔ گاندھی جی انہیں تاریخ میں اپنا استاد کہتے، پنڈت جی شہ دماغوں کا نچوڑ، ڈاکٹر رادھا کرشن ہندوستان کے عظیم فلسفی تھے، مولانا نے ان کی کتاب فلسفہ کا دیباچہ لکھا۔ مولانا کی وفات پر ان کا تاثر یہ تھا کہ علم کا سہاگ جاتا رہا۔

ڈاکٹر حسین نے ان کے حافظے کے متعلق کہا تھا کہ مولانا کا حافظہ فی الواقعہ حافظہ سے کچھ ماوری تھا۔ وہ حافظے کی مدد سے نہیں غیب کی مدد سے بولتے تھے اور ان کے سامنے ہر کوئی گنگ ہوتا تھا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے ٹھیک کہا ہے کہ وہ اس صدی کے سقراط تھے، انہیں مسلمانوں کے ہاتھوں زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ اور وہ پی کر رھگزرا سے عالم بقا ہو گئے۔"

حریفوں کی تحسین راقم پچھلے دنوں اخبار روزنامچہ دیکھ رہا تھا تو بعض نجی محفلوں میں حریف شخصیتوں سے متعلق مولانا کے کلمات نظر پڑے۔ مثلاً ایک سوال پر قائداعظم سے متعلق جون ۱۹۴۷ء میں فرمایا:

"تاریخ کا انتظار کرو۔ اصل فیصلہ اس کے ہاتھ میں ہے کہ ہندوستان مسلمانوں کے مسئلے کا حل "تقسیم" صحیح تھا یا غلط؟ لیکن مسٹر جناح نے ردِ عمل کا شکار ہو کر یہ راہ اختیار کی ہے ورنہ وہ اکل کھرے ہندوستانی اور سچے سیاست دان تھے۔ بہر حال ان کی اس خصوصیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں کی عصبیت کو فولاد کر دیا ہے۔"

سردار پٹیل کا ذکر آیا کہ آپ سے متعلق وہ صاف نہیں ہیں۔ مسکراتے فرمایا:

"وہ اپنے ہی ذوق کے انسان ہیں۔"

کسی نے عبدالماجد دریاآبادی کے متعلق کہا کہ نجی محفلوں میں آپ کے متعلق الم غلم باتیں کرتے ہیں۔ فرمایا:

"ان کے مزاج میں دو چیزیں ہیں، ایک لکھنؤ کے زمانۂ انحطاط کی غُرغُر ہے۔ دوسرے علامہ شبلی کے صدیق العزیز (ابوالکلام) سے ناراض ہیں کہ علامہ اس سے کچھ زیادہ ہی التفات برتتے تھے۔ عبدالماجد کی عیب جوئی مرحوم مٹیا محل کے آخری دور کا فن ہے۔"

کسی نے کہا نواب اسماعیل میرٹھی نے خلاں روایت کی ہے اور وہ روایت آپ کے خلاف ایک قسم کا طعن تھا۔ فرمایا:

"اسمٰعیل، شیفتہ کے پوتے ہیں اور شیفتہ کو غالب سے تلمذ تھا۔ وہ اس شرف کے باوجود کبھی کبھار غزل میں ٹھوکر کھا جاتے تھے۔ اسمٰعیل کا دل آئینہ ہے اس میں کبھی کبھار غبار آ ہی جاتا ہے۔"

چودھری خلیق الزمان کا ذکر چھڑا تو فرمایا:

"کسی کی غلطیاں یاد نہ کیا کرو، ہمیشہ اس کی خوبیاں سامنے رکھو، چودھری صاحب سیاست کی بھول چوک ہیں۔"

کسی نے بیان کیا، لاہور موچی دروازہ میں کل لیگ کا جلسہ عام تھا۔ خان لیاقت علی خاں نے خطاب کیا اور آپ کو ننگی گالیاں دی ہیں۔

فرمایا: "آپ کا خیال ہے انہیں ڈھکی ہوئی گالیاں دینی چاہیئے تھیں۔ آخر سیاست کی اس برہمی میں جب فضا میں چاروں طرف نیزے تنتنے ہوں آپ ان سے کیا توقع رکھتے ہیں؟"

ہم اُٹھ کے آرہے تھے، کسی نے کہا، خان عبدالقیوم خان کانگرس سے مستعفی ہوکر لیگ میں چلے گئے ہیں۔

فرمایا: "انہیں بہت پہلے چلے جانا چاہیئے تھا۔ وہ کوئی مستقل مزاج انسان نہیں۔ مدت سے اقتدار چاہ رہے تھے۔ اب جو صورت حال قائم ہوگی تو سرحد میں لیگ کے سرخیل ہوں گے۔ پاکستان بنا تو سرحد کو ایک پیچ در پیچ پرابلم بنا دیں گے۔ ان کے متعلق گورنمنٹ آف انڈیا کے خلوتیان راز کی معرفت کانگرس کو ایک عجیب و غریب کہانی ہاتھ لگی وہ انھیں سردار پٹیل کے حلقے سے مل گئی۔ انہیں معلوم ہو گیا کہ اب کے وہ مرکزی اسمبلی کے ٹکٹ سے محروم ہو رہے ہیں اور ان کے خلاف ہائی کمان کے پاس کوئی استغاثہ دائر ہو چکا ہے ایکا ایکی کروٹ لی اور لیگ میں چلے گئے۔"

فرمایا: "اپنے مخالفوں کی تحسین کیا کرو کہ یہ ان کے لیے سب سے بڑی سزا ہے۔"

شاعری سے موانست شاعری سے خاص موانست رکھتے تھے۔ اپنے ادبی سفر کا آغاز ہی شعر گوئی سے کیا تھا۔ شاعروں میں التزاماً جاتے، گلدستوں میں چھپتے اور اساتذہ سخن سے واسطہ رکھتے، لیکن پھر پندرہ سولہ برس کی عمر میں شاعری کا پنڈ چھوڑ دیا۔ شاعری کا ذوق غایت درجہ شستہ و رفتہ تھا۔ عربی، فارسی اور اردو کے ہزاروں اشعار حفظ تھے۔ انہیں تحریر و تقریر میں برجستہ استعمال کرتے، معلوم ہوتا شعر اس مضمون ہی کے لیے تھا۔ شاعروں سے متعلق گفتگو کر کے بہت خوش ہوتے، ان سے متعلق نقد و بحث کرتے، ان کی فنی خوبیوں

اور فنی غلطیوں کا جائزہ لیتے۔ عیب بتاتے تو خوبی کے ساتھ، ان کے مطالعاتی شعرا عربی وفارسی کے متقدمین تھے۔ عربی شاعری کے متعلق ان کا خیال تھا کہ شاعری کی ماں ہے، لیکن اب بانجھ ہو چکی ہے۔ فارسی شعرا میں سے متقدمین کی ایک بڑی جماعت کے معترف تھے۔ لیکن اس زمانے کی فارسی شاعری کو پارس کے ادبی کھنڈروں کی گرد کہتے۔ اردو شاعری میں غزل کے شیدائی تھے۔ درد، میر، غالب، اکبر، شبلی، اقبال، حسرت، فانی اور اصغر سے متعلق بولتے تو سماں باندھتے۔ یوں ولی دکنی سے لے کر اختر الایمان تک کو جانتے اور پہچانتے تھے۔

شاعری پر گفتگو کرتے وقت دماغ دل اور زبان تینوں معراج پر ہوتے۔ حیرت ہوتی کہ ایک عظیم سیاست دان مخاطب ہے لیکن ہم میر کی صحبت میں بیٹھے ہیں، انشا سے ہمکلام ہیں اور غالب کے ہمراہ بادہ شبینہ کی لذت اٹھا رہے ہیں۔

سوال وجواب کی ایک صحبت میں عرض کیا۔

س۔ مولانا! کس قدر اشعار حفظ ہوں گے؟

ج۔ حافظے کی چیزیں گنتی کی نہیں ہوتیں، اشعار قلم وزبان کی بزم و رزم میں خود بخود چلے آتے ہیں۔

س۔ علامہ اقبال کی شاعری کا ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی سرگزشت میں کتنا حصہ ہے؟

ج۔ کسی بھی دوسرے شاعر نے ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی تاریخ میں اس قدر اثرات نہیں چھوڑے ہیں۔

س۔ غالب کا مقام کیا تھا؟

ج۔ شاعری کے ابوالآبا تھے۔

س۔ حالی؟

ج۔ دل گداختہ لے کر آئے تھے اور ہر کہیں اپنی ہی سیرت کی شرافت ڈھونڈھتے تھے۔

س۔ محمد حسین آزاد؟

ج۔ گو شاعری کے چمنستان میں گلگشت کی ہے۔ لیکن ان کا اصل میدان انشا پردازی تھا۔ جہاں وہ نمک کو نبات اور کنکر کو موتی بنا دیتے ہیں۔

س ۔ علامہ شبلی ؟

ج ۔ ان کی شاعری میں شہنائی کا لہجہ اور تلوار کا نغمہ تھا۔

س ۔ اکبر الہ آبادی ؟

ج ۔ خندہ و گریہ کا آمیختہ تھے۔

س ۔ ظفر علی خاں ؟

ج ۔ تلوار اس تیزی سے چلاتے تھے کہ بسا اوقات دھار کند ہو جاتی لیکن تلوار کے دھنی تھے۔

س ۔ حسرت موہانی ؟

ج ۔ غزل میں رند، صحافت میں زاہد اور سیاست میں سرخود نہادہ برکفت قسم کے مسلمان تھے۔

فرمایا: شاعری دل کی محبوبہ ہے اس کی صحبت میں انسان اپنے صدموں کو بھول جاتا ہے۔

رفیقۂ حیات

مولانا خیر الدین کے جان نثار مریدوں میں ایک صاحب مولوی آفتاب الدین تھے، تمام عمر سروے آفس کلکتہ میں ملازم رہے۔ ملیح آبادی لکھتے ہیں کہ فرشتہ صفت انسان تھے، ان کا ایک بیٹا بدر الدین اور پانچ بچیاں تھیں۔ جن میں سے ایک بچی ابو النصر آہ کے ساتھ بیاہی گئی۔ سب سے چھوٹی مولانا کی اہلیہ زلیخا بیگم تھیں۔ وہ پیدا ہوئیں تو والد نے مرشد کے آغوش میں ڈال دی۔ مولانا خیر الدین بچی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ زلیخا نام رکھا۔ پھر اس بچی ہی کا چھ سال کی عمر میں مولانا ابوالکلام آزاد سے جب وہ بارہ سال کے تھے، نکاح کر دیا (بروایت حمیدہ سلطان)، مولانا کی ہمشیرہ آرزو بیگم کی روایت کے مطابق مولانا کی شادی بارہ تیرہ برس کی عمر میں ۹ سالہ زلیخا بیگم سے ہوئی اور وہ اتنی سی بات پر رو دیتے کہ انھیں زنانخانے میں لے جایا جا رہا تھا۔ مولانا کے سسرال ساتھ ہی رہتے تھے، اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مولانا نے سیاسی زندگی میں قدم رکھا تو قید و بند کے مختلف مرحلوں اور رہنمائی کی مختلف مصروفیتوں کے باعث گھر خالی رہتا۔ اس غیر حاضری میں ان لوگوں ہی سے گھر کی چہل پہل قائم رہتی۔ مولانا آفتاب الدین کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا تھا۔ وہ بغداد کے ایک ممتاز خاندان سے تھے۔ مولانا کے سالے بدر الدین ایک ہونہار نوجوان تھے۔ "الہلال" میں غالباً پریس کے انچارج تھے۔ ایکا ایکی بیمار ہو گئے۔ مولانا نے کلکتہ کے علاوہ مسوری، رانچی اور دہلی سے علاج کرایا لیکن افاقہ نہ ہوا اور جواں مرگ ہو گئے۔ ان کی آزاد ہند کے

ملیح آبادی نمبر میں ایک سفر کی تصویر ہے۔ معلوم ہوتا ہے انتہائی خوش شکل اور قد آور نوجوان تھے۔

مولوی آفتاب الدین ذکر آزاد از ملیح آبادی کی روایت کے مطابق بازار سے سامان خورد و نوش لاتے اور اس بارے میں اُن کے کچھ خاص اصول تھے جن سے بال برابر ہٹنا بھی انہیں گوارا نہ تھا۔ جو ترکاری ایک دن لے آتے پھر لگاتار وہی آتی۔ ملیح آبادی کہتے ایک ہی ترکاری کیوں؟ وہ بڑی معصومیت سے فرماتے، "فصل کی چیز ہے"۔

مولانا بالی گنج سرکلر روڈ کے مکان میں منتقل ہوئے تو احاطہ کے اندر ایک بڑا چمن تھا۔ ملیح آبادی نے مولوی صاحب سے کہہ دیا کہ چمن کے ایک حصہ میں ترکاری بوئی جا سکتی ہے۔ مولوی صاحب نے اسی دن گوبھی کاشت کر دی۔ پک کر تیار ہوئی تو پھر مسلسل پکتی رہی۔ ملیح آبادی چیخ اٹھا کہ حضرت اس غلیظ ترکاری سے نجات دیجئے۔ فرمایا" فصل کی چیز ہے"۔ مونگ کی دال شروع کی تو دو وقت مونگ کی دال پکنے لگی۔ کوئی ناک بھوں چڑھاتا تو فرماتے، بہت مفید ہے۔ ہر روز کیلے لاتے اور کچے ہوتے۔ مولانا آزاد کیلا اٹھا کر خاموشی سے رکھ دیتے۔ ملیح آبادی نے مولوی صاحب سے کہا "آپ پکے کیلے کیوں نہیں لاتے؟ فرماتے پکے کیلے جلد بگڑ جاتے ہیں۔ ان کا یہی شعار تھا اور مولانا کچھ کہتے نہیں تھے۔ جو سامنے آتا کھاتے اور اللہ کا شکر بجا لاتے۔

مولانا چونکہ خود فقر و فاقہ کے انسان تھے اور معاشی اعتبار سے کشادہ دست نہ تھے۔ اس لیے عمر کا ایک بڑا حصہ اس طرح بسر کیا کہ دستر خوان کے لذائذ سے بے نیاز رہے۔ زلیخا بیگم نے عسرت کے اسی حال ہی میں زندگی گزاری اور مولانا کے دورِ اقتدار سے کہیں پہلے ان کے ایام قید میں رحلت کر گئیں۔ مولانا گھر میں ہوتے تو صبح و شام خدمت کرتیں۔ مولانا کے لیے کھانا تیار کرتیں، خود کھلاتیں۔ اور کھانا کیا تھا دو چمچے ابلے ہوئے چاول، تھوڑی سی دال کبھی گوشت کبھی سبزی اور دہی۔ مولانا کے ہاں نوکر نہیں تھا۔ ایک آدھ نوکر اندرون خانہ سے باہر رہتا اور بازار سے سودا سلف لاتا۔ کبھی کبھار باورچی رکھ لیتے لیکن حالات کا عجز ٹکنے نہ دیتا۔ جن دنوں مولانا تفسیر لکھ رہے تھے، معمول یہ تھا کہ دو بجے رات کو اٹھ بیٹھتے۔ لکھنا شروع کرتے۔ موسم گرم ہوتا تو زلیخا پنکھا جھلتی۔ کئی دفعہ رتجگا سے نرگسی آنکھوں میں سرخ ڈورے پیدا ہوتے۔ ایک دفعہ حمیدہ سلطان کی والدہ نے پوچھا۔ بھاوج آنکھیں گلابی ہو رہی ہیں، جواب دیا۔ رات بھر مولانا کو پنکھا جھلتی رہی ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا

ہے کہ وہ جاگیں، محنت کریں، تفسیر لکھیں اور میں آرام سے سوتی رہوں۔

مولانا کے دل میں زلیخا بیگم کے لیے بے انتہا محبت اور بے پناہ احترام تھا۔ ایک عقیدت مند کی شادی پر اپنے خطہ ۵ جنوری ۱۹۴۲ء میں لکھتے ہیں کہ ازدواجی زندگی تین چیزیں پیدا کرتی ہے سکون مودت، رحمت۔ سکون عربی میں ٹھہراؤ اور جماؤ کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان کی طبیعت میں ایسا ٹھہراؤ اور جماؤ پیدا ہو جائے کہ زندگی کی بے چینیاں اور پریشانیاں اسے ہلا نہ سکیں۔

"مودت" سے مقصود محبت ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ازدواجی زندگی کی تمام تر بنیاد محبت پر ہے۔ اور محبت کا یہ رشتہ اس وقت تک پائیدار رہتا ہے۔ جب تک رحمت کا سورج شوہر اور بیوی کے دلوں پر چمکتا رہے یعنی شوہر اور بیوی اس طرح محبت کریں کہ ایک دوسرے کی غلطیاں اور خطائیں بخش دینے اور باہمدگر کوتاہیاں نظر انداز کر دینے کے لیے اپنے دلوں کو تیار رکھیں۔ گویا ازدواجی زندگی میں رحمت خود غرضانہ محبت کو فیاضانہ محبت کی شکل دینے کا نام ہے۔ آزاد اور زلیخا اسی سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ تمام زندگی ایک مصفا تصویر کی طرح بسر کی اور آخرت کے سفر کو روانہ ہو گئے۔

زلیخا کی رحلت

زلیخا بیگم نے اپنی تمام زندگی ایک آئیڈیل بیوی کی طرح گزاری۔ مولانا کے فقر و فاقہ میں شریک رہیں۔ اور خوشحالی کا دور شاذ ہی دیکھا۔ مولانا گھر میں نہ ہوتے، فون آتے تو ریسیور نہ اٹھاتیں۔ ان کے لیے سب سے بڑا قلق مولانا کے پے بہ پے مصائب تھے، مولانا قید و بند میں ہوتے تو ان کے دل کا درد بڑھتا۔ لیکن دم درکشو بہ بند ہو کر زندگی گزارتیں۔ مولانا اگست ۱۹۴۲ء میں قید کیے گئے تو زمانہ نازک تھا۔ دوسری جنگ عظیم کی وسعتیں رنگون تک پہنچ چکی تھیں اور کلکتہ پر کسی وقت جاپانی حملہ کا شدید خطرہ موجود تھا۔ ادھر کانگریسی زعماء کے متعلق کئی ایک خبریں گشت کر رہی تھیں۔ کہ انہیں جنوبی افریقہ لے جا کر نظر بند کیا گیا ہے۔ بعض ان کے توپ دم کیے جانے کی خبریں اڑاتے تھے۔ زلیخا کے لیے یہ تمام خبریں پریشانی کا موجب تھیں۔ پچھلے دو سال سے دق کا مرض متعاقب تھا۔ ان خبروں نے ایسا پریشان کیا کہ آہ نارسیدہ اور نالہ غیر کشیدہ ہو کر رہ گئیں۔ بیماری نے چت کر دیا۔ دوا چھوٹ گئی، غذا برائے نام رہ گئی۔ وضعداری کا یہ حال تھا کہ ہاتھ تنگ تھا۔ لیکن کسی کو شبہ تک نہ ہونے دیا کہ دوا و غذا کی مقدرت نہیں۔ اپنے

ڈاکٹروں سے ایک ہی بات کہتیں کہ خدا کے لیے ایک مرتبہ مولانا دکھا دو۔ اس اذیت و کرب میں ۹ اپریل ۱۹۴۳ء کو پیمانۂ عمر لبریز ہوگیا۔ اور مولانا کی یاد ساتھ لیے کہ ہمیشہ کے لیے ابد کی نیند سو گئیں۔

ملیح آبادی لکھتے ہیں۔

"جس روز ان کا انتقال ہو رہا تھا، مجھے یاد کیا۔ میں نے کبھی اجنبی نگاہوں سے بھی صورت نہ دیکھی تھی۔ پس و پیش کیا۔ اصرار بڑھا تو حاضر ہوگیا۔ فی الواقعہ آخری وقت تھا میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ کہنے لگیں "آپ میرے بھائی ہیں۔ میں آپ کی ہمیشہ شکرگزار رہی ہوں۔ مولانا کا دیدار ممکن نہیں۔ مولانا سے کہنا کہ آپ ہی کے نام پر مر رہی ہوں مگر میرے چلے جانے کا غم نہ کرنا۔" ہاتھ لرز رہا تھا۔ کہنے لگیں ــــ مولانا کے لیے تو میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ ہچکی آئی اور رخصت ہوگئیں۔"

مولانا قلعہ احمد نگر میں تھے۔ مولانا نے غبار خاطر کے خط محررہ ۱۱ اپریل ۱۹۴۳ء میں اپنی طبیعت کے ضبط و انقباض کا جن الفاظ میں ذکر کیا۔ اپنی ظاہرداریوں کا جس طرح ماتم کیا اور زلیخا کی یاد کو جس درد سے اٹھایا ہے۔ اس پر سنگدل سے سنگدل آدمی کی آنکھوں میں نمی آجاتی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں ــــ

"۳ اگست کو جب میں بمبئی کے لیے روانہ ہونے لگا تو وہ حسب معمول دروازے تک خدا حافظ کہنے کے لیے آئی۔ میں نے کہا کہ اگر کوئی نیا واقعہ پیش آگیا تو ۱۳ اگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اس نے "خدا حافظ" کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ لیکن اگر وہ کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ جو اس کے چہرے کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں لیکن چہرہ اشکبار تھا۔

خود را بحیلہ پیش تو خاموش کردہ ام

گذشتہ ۲۵ برس کے اندر کتنے ہی سفر آئے اور کتنی ہی گرفتاریاں ہوئیں لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اسے کبھی نہ دیکھا تھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس کی طبیعت پر غالب آگئی تھی۔ میں نے اس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورت حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لیے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا۔ وہ اس لیے کہہ رہی تھی کہ خود

سفر کرنے والی تھی"۔

حکومت کی قساوت قلبی ظاہر تھی کہ اس نے مولانا کو بیوی کی تیمارداری ہی سے محروم نہ رکھا بلکہ انہیں جنازے میں شرکت کے لیے بھی رہا نہ کیا۔ مولانا کو اطلاع بھی اخبارات سے ہوئی کہ ان کی رفیقۂ حیات ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئی ہیں۔ تمام ملک میں رنج و اندوہ کا اظہار کیا گیا حتی کہ ۸ اپریل ۱۹۴۳ء کو کلکتہ میں صوبائی مسلم لیگ کا ایک تعزیتی جلسہ محترم عبدالرحمن صدیقی کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ سید حسین شہید سہروردی علامہ راغب احسن، مولانا ابوالہاشم اور لیگ کے دوسرے زعما نے جلسے سے خطاب کیا۔ مولانا ۱۹۴۵ء میں رہا ہوتے تو کلکتہ پہنچ کر ایرپورٹ سے سیدھا زلیخا کے مزار پر گئے۔ ۳۶ سال کی رفاقت مٹی کا ایک ڈھیر تھا اور اس کوہ استقامت انسان کا حال یہ تھا کہ ہاتھ فاتحہ کے لیے اٹھے ہوئے تھے چہرہ اشکبار تھا اور آنکھوں سے بوندا باندی ہو رہی تھی۔

مولانا کی وفات

مولانا آزادؒ محض سیاست دان ہوتے تو ممکن تھا حالات سے سمجھوتہ کر لیتے لیکن شدید احساسات کے انسان تھے۔ اپنے دور کے سب سے بڑے ادیب، ایک عبقری خطیب، ایک عظیم مفکر اور عالم متبحر۔ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو اپنے لیے سوچتے ہیں۔ وہ ان کے مستقبل پر سوچتے تھے۔ انہیں غلام ہندوستان نے پیدا کیا اور آزاد ہندوستان کے لیے جی رہے تھے۔ ایک عمر آزادی کی جدوجہد میں بسر کی اور جب ہندوستان آزاد ہوا تو اس کا نقشہ ان کی منشا کے مطابق نہ تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے سامنے خون کا ایک سمندر ہے اور اس کے کنارے پر کھڑے ہیں۔ ان کا دل بیگانوں سے کہیں زیادہ یگانوں کے چرکوں سے مجروح تھا۔ انہیں مسلمانوں نے سالہا سال اپنی زبان درازیوں سے زخم لگائے اور وہ ان تمام حادثوں کو اپنے دل پر گزارتے رہے۔ المختصر آزادی کے بعد یہی سانحے دس سال کی مسافت میں ان کے لیے جان لیوا ہو گئے۔ ۱۹ فروری ۱۹۵۸ء کو آل انڈیا ریڈیو نے خبر دی کہ مولانا آزاد علیل ہو گئے ہیں۔ اس رات کابینہ سے فارغ ہو کر آئے تو بشاش تھے۔ کسی مرض کا شائبہ نہ تھا۔ حسب معمول صبح سویرے اٹھے اور غسل خانے میں گئے۔ یکا یک فالج نے حملہ کیا اور اس کا شکار ہو گئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور رادھا کرشنن فوراً پہنچے۔ ڈاکٹروں کی ڈار لگ گئی۔ مولانا بے ہوشی کے عالم میں تھے۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ ۴۸ گھنٹے گزرنے کے بعد وہ رائے دے سکیں گے کہ مولانا خطرے سے باہر ہیں یا خطرے میں ہیں۔ ادھر

آل انڈیا ریڈیو کے اعلانات نے برعظیم میں تشویش پیدا کردی۔ اور یہ تاثر عام ہوگیا کہ مولانا کی حالت خطرے سے خالی نہیں ہے۔ ہر کوئی ریڈیو پر کان لگائے بیٹھا اور مضطرب تھا۔ مولانا کے بنگلہ میں ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریہ ہند، پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم، مرکزی کابینہ کے ارکان، بعض صوبائی حکومتوں کے اعلیٰ اور اکابر علماء کے علاوہ ہزارہا انسان جمع ہوگئے۔ سبھی پریشان تھے۔ ۲۱ فروری کو رات کا خدشہ یقینی ہوگیا کسی کے حواس قائم نہ تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو رفقا سمیت اشکبار چہرے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ہر کوئی حزن وملال کی تصویر تھا۔ ہندوستان بھر کی مختلف شخصیتیں آچکی تھیں جب شام ہوئی تو ہر امید ٹوٹ گئی۔ عشاء کے وقت سے قرآن خوانی شروع ہوگئی۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی مولانا محمد میاں، مفتی عتیق الرحمٰن، سید حبیب الحسن، مولانا شاہد فاخری اور بیسیوں علماء، حفاظ کلام الٰہی میں مشغول تھے۔ آخر ایک بجے شب سورہ یٰسین کی تلاوت شروع ہوگئی اور ۲۲ فروری کو سوا دو بجے شب مولانا کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس وقت بھی سینکڑوں لوگ اضطراب میں کھڑے تھے، جونہی رحلت کا اعلان ہوا تمام سناٹا چیخ پکار سے بھر آگیا۔ دن چڑھے لگ بھگ دو لاکھ انسان کوٹھی سے باہر جمع ہوگئے۔ تمام ہندوستان میں سرکاری وغیر سرکاری عمارتوں کے پرچم سرنگوں کردیئے گئے۔ ملک کے بڑے بڑے شہروں میں ہڑتال ہوگئی۔ دہلی میں ہو کا عالم تھا حتیٰ کہ بنکوں نے بھی چھٹی کردی۔ ایک ہی شخص تھا جس کیلئے سب کی آنکھ میں آنسو تھے۔ بالفاظ دیگر مولانا تاریخ انسانی کے تنہا مسلمان تھے جن کے ماتم میں کعبہ و بت خانہ ایک ساتھ سینہ کوب تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو موت کی خبر سنتے ہی دس منٹ میں پہنچ گئے۔ اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ انہیں یاد آگیا کہ مولانا نے آج ہی صبح انہیں "خدا حافظ" کہا تھا۔ ڈاکٹروں نے ۲۱ کی صبح کو ان کے جسم کی موت کا اعلان کردیا۔ اور حیران تھے کہ جسم کی موت کے بعد ان کا دماغ کیونکر ۲۴ گھنٹے زندہ رہا۔ ڈاکٹر بدھان چندر رائے (وزیر اعلیٰ بنگال) نے آکسیجن دینا چاہا تو مولانا نے آخری سہارا لے کر آنکھیں کھولیں فرمایا: "ڈاکٹر صاحب اب اللہ پر چھوڑیئے" اس سے پہلے معالجین کے آکسیجن گیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "مجھے اس پنجرہ میں کیوں قید کر رکھا ہے؟ اب معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔" میجر جنرل شاہنواز راوی تھے کہ تینوں دن بے ہوش رہے۔ بس چند منٹ کے لیے ہوش میں آتے۔ کبھی کبھار ہونٹ جنبش کرتے تو ہم کان لگاتے کہ شاید کچھ

کہنا چاہتے ہیں۔ معلوم ہوتا کہ آیات قرآنی کا ورد کر رہے ہیں۔ پنڈت نہرو کے دو منٹ بعد ڈاکٹر راجندر پرشاد آ گئے۔ ان کی آنکھوں میں بھی آنسو ہی آنسو تھے۔ آن واحد میں ہندوستانی کابینہ کے شہ دماغ پہنچ گئے۔ ہر ایک کا چہرہ آنسوؤں کی پھوار سے تر تھا اور اِدھر اُدھر ہچکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ مسز مہابیر تیاگی سراپا درد تھے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے آبدیدہ آواز میں کہا" ہندوستان کا آخری مسلمان اُٹھ گیا۔ وہ علم کے شہنشاہ تھے۔" کرشنا مینن سکتے میں تھے۔ پنڈت پنت یاس کے عالم میں تھے۔ مرارجی ڈیسائی بے حال تھے۔ لال بہادر شاستری بلک رہے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے حواس معطل تھے۔ مولانا قاری طیب غم سے نڈھال تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن کی حالت دگرگوں تھی۔ ادھر زنانہ میں مولانا کی بہن آرزو بیگم تڑپ رہی تھیں ؎

اب کوئی آرزو نہیں باقی

ان کے اردگرد اندرا گاندھی، بیگم ارونا آصف علی اور سینکڑوں دوسری عورتیں جمع تھیں۔ اندرا کہہ رہی تھیں ہندوستان کا نور بجھ گیا اور ارونا رو رہی تھیں۔ ہم ایک عظمت سے محروم ہو گئے۔

پنڈت نہرو کا خیال تھا کہ مولانا تمام عمر عوام سے کھچے رہے۔ ان کے جنازہ میں عوام کے بجائے خواص کی بھیڑ ہو گی۔ لیکن جنازہ اٹھا تو کنگ ایڈورڈ روڈ کے بنگلہ نمبر ۴ سے باہر دو لاکھ سے زائد عوام کھڑے تھے۔ اور جب جنازہ انڈیا گیٹ اور ہارڈنگ برج سے ہوتا ہوا دریا گنج کے علاقہ میں پہنچا تو پانچ لاکھ افراد ہو چکے تھے۔ صبح چار بجے میت کو غسل دیا گیا اور کفنا کر نو بجے صبح کوٹھی کے پورٹیکو میں پلنگ پر ڈال دیا گیا۔ سب سے پہلے صدر جمہوریہ نے پھول چڑھائے۔ پھر وزیر اعظم نے اس کے بعد غیر ملکی سفراء نے۔ کئی ہزار برقعہ پوش عورتیں مولانا کی میت کو دیکھتے ہی ڈھائیں مار مار کر رونے لگیں۔ ان کے ہونٹوں پر ایک ہی بول تھا۔" مولانا آپ بھی چلے گئے، ہمیں کس کے سپرد کیا ہے؟ ہندو دیویاں اور کنیائیں مولانا کی نعش کو ہاتھ باندھ کر پرنام کرتی رہیں۔ ایک عجیب عالم تھا۔ چاروں طرف غم و اندوہ اور رنج و گریہ کی لہریں پھیلی ہوئی تھیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو کی بے چینی کا یہ حال تھا کہ ایک رضاکار کی طرح عوام کے ہجوم میں گھس جاتے اور انہیں بے ضبط ہجوم کرنے سے روکتے۔ پنڈت جی نے مین وسیار سکیورٹی افسروں کو دیکھا تو ان سے پوچھا۔

"آپ کون ہیں؟"

"سکیورٹی افسر"

"کیوں؟"

"آپ کی حفاظت کے لیے۔"

"کیسی حفاظت، موت تو اپنے وقت پر آکے رہتی ہے۔ بچا سکتے ہو تو مولانا کو بچا لیتے؟"

منشی پریودھ چندر راوی تھے کہ پنڈت جی نے یہ کہا اور بلک بلک کر رونے لگے۔ ان کے سکیورٹی افسر بھی اشک بار ہوگئے۔ ٹھیک پون بجے میت اٹھائی گئی۔ پہلا کندھا عرب ملکوں کے سفرا نے دیا۔ جب کلمہ شہادت کی صداؤں میں جنازہ اٹھا تو عربی سفرا بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ جونہی بنگلہ سے باہر کھلی توپ پر جنازہ رکھا گیا تو کہرام مچ گیا، معلوم ہوتا تھا پورا ہندوستان رو رہا ہے۔ مولانا کی بہن نے کوٹھی کی چھت سے کہا۔

"اچھا بھائی خدا حافظ"

پنڈت پنت نے ڈاکٹر راجندر پرشاد کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔ "مولانا ایسے لوگ پھر کبھی پیدا نہ ہوں گے۔ اور ہم تو کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔"

مولانا کی چارپائی کو کوٹھی کے دروازہ تک کندھوں پر لایا گیا۔ کفن کھدر کا تھا۔ جسم ہندوستان کے قومی جھنڈے میں لپٹا ہوا تھا۔ اس پر کشمیری شال پڑا تھا اور جنازہ پر تیج دہلی کی روایت کے مطابق غلافِ کعبہ ڈالا گیا تھا۔

پنڈت نہرو، مسٹر ڈھیبر صدر کانگرس، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، جنرل شاہ نواز، پروفیسر ہمایوں کبیر، بخشی غلام محمد اور مولانا کے ایک عزیز جنازہ گاڑی میں سوار تھے۔ ان کے پیچھے دوسری گاڑی میں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد اور ڈاکٹر رادھا کرشنن نائب صدر کا موٹر تھا۔ ان کے بعد کاروں کی ایک لمبی قطار تھی جس میں مرکزی وزرا، صوبائی وزرائے اعلیٰ اکثر گورنر اور غیر ملکی سفرا بیٹھے تھے۔ ہندوستان کی فوج کے تینوں چیفس جنازے کے دائیں بائیں تھے۔ تمام راستہ پھولوں کی موسلا دھار بارش ہوتی رہی۔ دریا گنج سے جامع مسجد تک ایک میل کا راستہ پھولوں سے اٹ گیا۔ جب لاش لحد تک پہنچی تو ایک طرف علما و حفاظ قرآن مجید پڑھ رہے تھے۔ دوسری

طرف اکابر و فضلا سر جھکائے کھڑے تھے۔ اس وقت میت کو بری فوج کے ایک ہزار نوجوانوں، ہوائی جہاز کے تین سو جانبازوں اور بحری فوج کے پانچ سو بہادروں نے اپنے عسکری بانکپن کے ساتھ آخری سلام کیا۔ مولانا احمد سعید دہلوی صدر جمعیت العلمائے ہند نے دو بج کر پچاس منٹ پر نمازہ جنازہ پڑھائی۔ پھر لحد میں اتارا۔ کوئی تابوت نہ تھا۔ ایک یادگار جسم سفید کفن میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ جب قبر کو مٹی دی گئی تو پنڈت جواہر لال نے گلاب چھڑکا اور اس طرح روئے کہ ساری فضا اشکبار ہو گئی۔ تمام لوگ رو رہے تھے اور آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔ مولانا کے مزار کا حدود اربعہ "بود ماند" کے تحت درج ہے۔ مختصر یہ کہ جامع مسجد اور لال قلعہ کے درمیان پارک میں دفن کیے گئے۔ مزار کھلا ہے۔ اس کے اوپر سنگی گنبد کا طرہ ہے اور چاروں طرف پانی کی جدولیں اور سبزے کی روشیں ہیں۔

راقم جنازہ میں شرکت کے لیے اسی روز دہلی پہنچا۔ مولانا کو دفنا کر ہم ان کی کوٹھی میں گئے تو دیر بعد پنڈت جواہر لال آ گئے۔ اور سیدھا مولانا کے کمرے میں چلے گئے پھر پھولوں کی اس روش پر گئے جہاں مولانا ٹہلا کرتے تھے۔ ایک گچھے سے سوال کیا۔

"کیا مولانا کی موت کے بعد بھی مسکرا دو گے؟"

راقم آگے بڑھ کر آداب بجا لایا۔ کہنے لگے۔

"شورش دیر آ گئے۔ مولانا سے ملے؟"

راقم کی چیخیں نکل گئیں۔ مولانا ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکے تھے اور ملاقات صبح محشر تک موقوف ہو چکی تھی۔

سیاست میں داخلہ

"ہماری آزادی" کے پہلے باب (بہ عنوان پہلی جلد کا خلاصہ) میں مولانا نے ۱۹۳۵ء سے پہلے کے سوانح و افکار کو جلد اوّل پر اٹھا رکھا اور چار جگہ جلد اوّل کا ذکر کیا ہے فرماتے ہیں:

۱۔ میں اپنے ذہنی انقلابوں کا مفصل ذکر اپنی سوانح عمری کی پہلی جلد میں کروں گا۔

۲۔ بنگال کے انقلابیوں (دہشت پسندوں) سے تعلقات کی تفصیلات بھی پہلی جلد ہی میں بیان کی جائیں گی۔

۳۔ سوراجیہ پارٹی نے تمام قانون ساز اداروں میں اکثریت حاصل کر کے چار نکاتی محاذ پر جو نتائج پیدا کئے اور ان کا ہندوستان کے سیاسی مستقبل پر جو اثر پڑا وہ تمام حالات سوانح عمری کی پہلی جلد میں درج ہوں گے۔

۴۔ لارڈ ولنگڈن ۱۹۳۲ء میں وائسرائے ہو کر آئے تو انہوں نے تمام کانگرس کے خلاف سخت کارروائی کی۔ مولانا لکھتے ہیں کہ "میں دہلی میں تھا ایک سال سے زیادہ عرصہ مجھے دہلی ہی میں زیر حراست رکھا گیا۔ اس زمانے میں کئی ایسے واقعے ہوئے جو ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے لیے بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ ان کی تفصیل کے لیے بھی سوانح عمری کی جلد اوّل کا انتظار کرنا ہوگا۔"

پروفیسر ہمایوں کبیر نے دیباچے میں ۱۹۴۸ء کے بعد کے واقعات سے متعلق تیسری جلد کا ذکر کیا ہے۔ اگر "ہماری آزادی" دوسری جلد ہے تو مولانا کی وفات کے بعد کتاب اس ایک جلد ہی میں

ختم ہو گئی۔

مولانا نے نومبر ۱۹۵۷ء میں "ہماری آزادی" پر نظر ثانی کی۔ ان کا ارادہ تھا کہ نومبر ۱۹۵۸ء میں ان کی سترویں سالگرہ کے موقع پر کتاب شائع ہو لیکن یہ جلد بھی ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی۔ وہ ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو خالق حقیقی سے جا ملے اور اس طرح پہلی اور تیسری دونوں جلدیں مولانا کے ساتھ رحلت کر گئیں۔

مولانا فرماتے ہیں:

۱۔ "لارڈ کرزن نے ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگالہ کا فیصلہ کیا تو ایک زبردست سیاسی و انقلابی جوش پیدا اور کارفرما ہوا۔ سری آربندو گھوش بڑودہ سے کلکتے آ گئے تاکہ اس شہر کو اپنی جدوجہد کا مرکز بنائیں۔ ان کا اخبار کرم یوگن "قومی بیداری کا نشان اور غیر ملکی حکومت کے خلاف جنگ کا جھنڈا بن کر لہرانے لگا۔ ان سے میری دو تین موقعوں پر ملاقات ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انقلابی سیاست کے لیے میرے دل میں ایک کشش پیدا ہو گئی اور میں ان کے ایک گروپ میں شامل ہو گیا۔

۲۔ "سری شیام سندر چکرورتی اس دور کے انقلابیوں (ٹیررسٹوں) میں بڑا مرتبہ رکھتے تھے۔ ان کی وساطت سے میں اور انقلابیوں سے ملا۔ وہ انقلابی مسلمانوں سے بدظن تھے، اور اپنے رفقاء متوسط طبقے کے ہندوؤں ہی سے چنا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کی تحریک آزادی میں برطانوی حکومت نے مسلمانوں کو اپنے لیے آلہ کار بنا رکھا ہے اور وہ اس کے اشارے پر چلتے ہیں۔ مشرقی بنگال کا گورنر ویلم فیلڈ ملر علانیہ کہتا تھا کہ حکومت مسلمانوں کی جماعت کو ایسی نظر سے دیکھتی ہے جیسے کوئی شوہر اپنے حرم کی محبوب بیوی کو۔ انقلابیوں کی مسلمانوں سے نفرت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ان کی پکڑ دھکڑ کے لیے حکومت نے پولیس کے خفیہ محکمے میں یوپی کے مسلمانوں کو لا کر رکھا تھا۔ مولانا لکھتے ہیں کہ شام سندر چکرورتی اور ان کے انقلابی رفقاء کو شروع میں میرے اوپر بھروسہ نہ تھا، مجھے اپنی خاص محفلوں سے الگ رکھا، لیکن جب میں نے جلد ہی ان کا اعتماد حاصل کر لیا تو وہ مجھ پر

بھروسہ کرنے لگے۔ اس وقت تک ان کی سرگرمیاں بنگال اور بہار تک محدود تھیں۔ اور بہار اس وقت صوبہ بنگال کا حصہ تھا۔ میں نے انہیں انقلابی جماعت کو وسعت دینے پر آمادہ کر لیا اور دو برس کے اندر اندر شمالی ہندوستان کے کئی بڑے شہر دلی اور بمبئی میں انقلابیوں کی خفیہ انجمنیں بن گئیں"۔

(ہماری آزادی، پہلا باب)

ملیح آبادی "ذکرِ آزاد" میں لکھتے ہیں کہ:

"شروع شروع میں مولانا تشدد پسند انقلابیوں کے ساتھ تھے، اور ہندوستان میں مسلح بغاوت کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف بنگال کے انقلابیوں کے ساتھ تعلقات استوار تھے۔ دوسری طرف سرحد کے قبائل میں ان کے آدمی کام کر رہے تھے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن مرحوم اور مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم سے بھی رشتہ مضبوط تھا۔ جب میں ان کی رفاقت (۱۹۲۰ء) میں آیا تو اس وقت تک مولانا مسلح بغاوت ہی کے قائل تھے۔ ایک دفعہ خود مجھے ایک جگہ بھیجا اور میں دو درجن پستول لے آیا۔ جو انہوں نے کسی اور کے ہاتھ کہیں بھیج دیئے تھے"۔

(ذکرِ آزاد صفحہ ۲۷۲)

مولانا آزادؒ کی سولہویں برسی پر ہندوستان کے محافظ خانے (نیشنل آرکائیوز آف انڈیا) نے کابل میں قائم ہونے والی عارضی ہندوستانی حکومت اور مولانا آزادؒ کے زیرِ عنوان ایک دستاویزی تحقیق ترتیب دی۔ جو تمام تر برطانوی انٹیلی جینس بیورو کی رپورٹوں پر مشتمل تھی۔ ان رپورٹوں کا ماحصل یہ تھا کہ:

"پہلی جنگِ عظیم کے دوران ۱۹۱۵ء کے وسط میں ہندوستان کی جو وقتی حکومت کابل میں قائم ہوئی اس کا منصوبہ مولانا آزادؒ نے تیار کیا تھا۔ انہی کی ہدایت پر مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور دوسرے لوگ کابل گئے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ بھی آپ ہی کے مشورہ سے حجاز چلے گئے تھے۔ اس رپورٹ کا نگارندہ برطانوی انٹیلی جینس بیورو کا ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ڈیویان تھا۔ اس نے ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۶ء کو مذکورہ رپورٹ تیار

کی۔ مسٹر ڈیویان کی ایک دوسری رپورٹ کے مطابق صوبہ سرحد سے آزاد قبائل کے بعض سرداروں کی درخواست پر مولانا نے ایک بم ساز بنگالی اور ایک ڈاکٹر کو وہاں بھجوایا۔ اُن کے علاوہ طلبہ کی ایک جماعت کابل روانہ کی۔ اسی رپورٹ کے مطابق خود مولانا آزادؔ کابل کا عزم کر رہے تھے کہ حکومت نے انہیں پکڑ کے رانچی میں نظر بند کر دیا اور اس طرح یہ رشتہ منقطع ہو گیا۔

ایک دفعہ چند مسلمان نوجوانوں نے مولانا سے سوال کیا:

"مولانا۔ یہ ہندو لڑکیاں اور لڑکے بلا کھٹکے انگریز افسروں پر گولی چلا دیتے ہیں آخر ان میں یہ حوصلہ اور بے باکی کیسے پیدا ہوتی ہے؟ مولانا مسکرائے اور کہا "عزیزو ایمان کسی منڈی میں فروخت ہوتا تو میں آپ کو ضرور اس کا پتہ بتا دیتا۔"

راقم دوسری جنگِ عظیم کے دوران سنٹرل جیل منٹگمری میں ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت سات برس قید کاٹ رہا تھا وہاں مختلف صوبوں سے بعض انقلابی آتے جاتے۔ انہیں اپنے صوبوں سے دور دراز کی جیلوں میں بھی مستقلاً نہیں رکھا جاتا تھا ایک دو ماہ بعد ایک سے دوسری جگہ بھیج دیا جاتا۔ سال یاد نہیں آ رہا غالباً ۱۹۴۰ء کی دوسری سہ ماہی کا ذکر ہے کہ ۲۶، ۲۷ برس کا ایک بنگالی نوجوان نظر بند ہو کے آیا، معلوم ہوا کلکتہ سے اسلحہ لینے آیا تھا۔ مولانا آزادؔ نے اپنے ایک معتقد کے نام ایک خط اس مضمون کا دیا تھا کہ حامل ہذا اپنے کسی کام کے لیے لاہور آ رہا ہے اس کے ہاتھ وہ پانچوں کتابیں بھجوا دیں جن کا آپ نے دہلی میں وعدہ کیا تھا۔ نوجوان نے بتایا کہ تیسرے روز پشاور سے پانچوں ریوالور آ رہے تھے کہ وہ اگلے ہی دن پکڑا گیا۔ کوئی دو مہینے لاہور کے شاہی قلعہ میں رہا۔ پوچھ گچھ ہوتی رہی گو تفتیشی عملہ حد درجہ ظالم تھا لیکن وہ لوگ کچھ حاصل نہ کر پائے اور تھا بھی کچھ نہیں وہ ناکام ہو گئے تو نظر بند کر دیا۔ راقم نے اس سے کہا کہ "مولانا کانگرس کے صدر ہیں اور کانگرس سختی سے عدم تشدد پر کاربند ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ مولانا اسلحہ کے حصول میں آپ کی مدد کے لیے تیار ہو گئے"؟ نوجوان نے بتایا یہ صحیح ہے کہ ہم لوگ کانگرس سے متفق نہیں اور نہ کانگرس کی لیڈرشپ ہمارے حسبِ حال ہے۔ سبھاش چندر بوس سے کانگرس نے جو سلوک کیا اس سے ہم بنگالی بے حد کبیدہ خاطر ہیں۔ لیکن اس نزاع کے باوجود مولانا آزادؔ نے اپنے احترام سے ہمارے دل خالی

نہیں ہونے دیتے۔ کوئی دقت ہو تو ہم کامل اعتماد کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتے اور وہ ہمارے اقدام سے متفق ہوں یا نہ ہوں لیکن ہمارے جذبے کی حوصلہ افزائی ضرور کرتے ہیں ہمارے بینک سے مولانا کے تعلقات اتنے بھرپور ہیں کہ وہ ان کی خواہش مسترد نہیں کرتے۔ نہ جانے مولانا سے انہوں نے کس طرح خط لیا۔ بہرحال میں یہ خط لے کر یہاں آیا اور پنجاب پولیس کی بھینٹ ہو گیا۔

۱۹۰۷ء کے اواخر یا ۱۹۰۹ء کے آغاز میں مولانا ہندوستان سے باہر مصر، شام اور ترکی کے سفر پر گئے، ترکی سے فرانس پہنچے۔ لندن جانے کا ارادہ تھا کہ والد کی بیماری کا سن کر پیرس ہی سے لوٹ گئے۔ مولانا کا بیان ہے کہ:

"جب میں عراق گیا تو وہاں چند عراقی انقلابیوں سے ملاقات ہوئی نامور ہیں مصطفیٰ کامل پاشا کے پیروؤں سے کچھ تعلقات پیدا ہوئے۔ ان کے علاوہ میں ینگ ٹرکس کے گروپ سے بھی ملا۔ انہوں نے قاہرہ میں اپنا مرکز قائم کر رکھا اور ایک ہفتہ وار اخبار شائع کرتے تھے۔ جب میں ترکی گیا تو ینگ ٹرکس تحریک کے چند لیڈروں سے دوستی ہو گئی۔ ہندوستان واپس آنے کے کئی سال بعد تک ان سے خط و کتابت جاری رہی۔ عرب اور ترک انقلابیوں سے تعلقات ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے سیاسی عقائد راسخ ہو گئے۔ ان انقلابیوں کو اس پر حیرت ہوتی تھی کہ ہندوستانی مسلمان قومی مطالبوں کی طرف سے بے اعتنائی اور سرد مہری برتتے یا ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہندوستانی مسلمانوں کو آزادی کی جنگ میں ہراولوں اور رہبروں کا کام کرنا چاہیے تھا۔ نہ کہ انگریزوں کے پیرا بن کر رہ جانا۔ مجھے اور بھی زیادہ یقین ہو گیا کہ مسلمانوں کو ملک کی آزادی کی مہم میں شرکت و معاونت کرنا چاہیے۔ اور اس کی تدبیر کرنا چاہیے کہ برطانوی حکومت اپنی اغراض کے لیے انہیں ناجائز طور پر استعمال نہ کر سکے۔ مجھے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ہندوستانی مسلمانوں میں ایک نئی تحریک شروع کی جائے اور میں نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان واپس جا کر زیادہ انہماک کے ساتھ سیاسی جدوجہد کروں گا۔" (ہماری آزادی پہلا باب)

مولانا فرماتے ہیں کہ:

"ہندوستان واپس آکر میں کچھ دنوں غور کرتا رہا کہ مجھے کیا طریق اختیار کرنا چاہیے اور کیا پروگرام بنانا چاہیے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اپنی موافقت کے لیے رائے عامہ پیدا کرنا چاہیے اور اس کے لیے ایک اخبار جاری کرنا ضروری تھا۔ "الہلال" اسی غور و فکر کا نتیجہ تھا۔"

(ہماری آزادی)

ادھر پہلی جنگ عظیم ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو ختم ہوئی۔ ادھر مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ انہیں بڑی مشکلوں سے وفاداری کے سانچے میں ڈھالا گیا اور اس میں تقریباً پچپن برس صرف ہوئے تھے۔

حکیم محمد اجمل خان نے ندوہ کے سالانہ اجلاس کے صدارتی خطبے (۱۹۱۰ء) میں بیان کیا کہ:

"ابتدائے اسلام سے غدر ۱۸۵۷ء تک جس قدر تکفیر کے فتوے لکھے گئے۔ اگر انہیں ایک جلد میں جمع کیا جائے تو ہرگز اس جلد کی ضخامت اس جلد کے برابر نہ اٹھے گی جو ۱۸۵۷ء سے لے کر آج تک کفر کے فتووں کو جمع کیا جائے تو مدون ہو۔"

(حیات اجمل صفحہ ۸۰)

انگریزی اقتدار نے ان فتووں کی بنیاد اٹھا کر کما حقہ فائدہ اٹھایا۔ شیعہ سنّی مسئلہ مستقلاً باہمی فساد کا موجب ہوگیا۔ مقلد و غیر مقلد میں چھڑ گئی۔ جو فرقے اقلیت میں تھے یا حکومت کے فرستادہ تھے وہ انگریزی سرکار کی پناہ لے کر مسلمانوں میں تفریق کا باعث ہوئے۔ ان کے لیے انگریزی حکومت نعمت غیر مترقبہ تھی۔ رفتہ رفتہ یہ مرض متعدی ہوگیا۔ یوپی کے تعلقدار پنجاب کے زمیندار، سرحد کے خوانین، سندھ کے وڈیرے اور بلوچستان کے تمندار، انگریزوں کے دست و بازو ہو گئے۔ ان کے علاوہ علی گڑھ کا سیاسی مذاق جو انگریز پرنسپلوں کی بدولت پروان چڑھا، انگریزی سرکار کا معاون ہو گیا۔ آغا خان برطانیہ کے وفادار تھے۔ مولانا احمد رضا خان نے عقائد کی آڑ میں دیوبند کی پچھاڑ کی۔ ان کی جماعت نے ہر اس تحریک کے خلاف فتوے صادر کیے جو انگریزوں کے خلاف عدم تعاون یا ترک موالات وغیرہ کی شکل میں اٹھی۔ مرزا غلام احمد نے نبوت کا عمامہ باندھ کر جہاد منسوخ کر ڈالا۔ ان کے علاوہ اکثر مشائخ اور پیروں نے اپنے علم و عمل اور قول و فعل کی پوری کائنات انگریزوں کی جھولی میں ڈال دی اور انہی کے ہو گئے۔ انگریزوں کی اسی خواہش کا کرشمہ چکڑالوی فرقہ تھا۔

مسلمان ہندوستان میں فاتح کی حیثیت سے آئے اور کئی راست باز زبانیں مختلف لشکروں کے ساتھ آتی رہیں اور بعض علوم رتبت مشائخ مختلف وقتوں میں وارد ہوئے۔ ان کی بدولت ہندوستان میں اسلام پھیلا، لیکن ایک خاص دور کے بعد مسلمانوں ہی کے ہاتھوں اسلام کو ضعف پہنچا۔ جب مسلمان حکمران تھے تو اس ضعف کا سبب فرمانروا تھے۔ جب مسلمان انگریزی حکومت کی رعیت ہو گئے تو اس کا موجب وہ سیاست دان تھے جن کے قول و فعل کا اُور چھور انگریزوں کے سینے تھا ان کے ساتھ ہی بعض علماء و مشائخ کی ایک بڑی جماعت کا طرز عمل یہ تھا کہ وہ ہر مرحلہ میں انگریزوں کی خوشنودی کو ملحوظ رکھتی۔ ان لوگوں نے نہ صرف دین و تصوف میں قلم لگایا بلکہ کروڑوں بندگانِ خدا کی عقلوں کو اس طرح شکار کیا کہ ان سے اجتماعی زندگی کا شعور ہی مفقود ہو گیا۔ جب فرمانروائی کے آخری دور میں مسلمان برعظیم میں سرعت کے ساتھ گرتی ہوئی دیوار تھے تو اس زمانے میں پہلی اجتماعی اسلامی تحریک، سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی سیادت میں جماعت مجاہدین (مئی ۱۸۳۱ء) کی تحریک تھی اس تحریک کے سامنے دو حریف تھے۔ اولاً سکھ، ثانیاً انگریز، یہ ایک صحیح عمل تھا کہ مجاہدین اسی راستے سے ہندوستان کی طرف قدم بڑھانا چاہتے تھے۔ جس راستے سے مغل فاتحین آئے تھے لیکن اس تحریک کو بعض خانوں اور ملکوں کی غداری نے ہلاک کر ڈالا فی الجملہ سرحد کے خانوں اور پنجاب کے طرقوں نے سکھوں کے ساتھ مل کر اسلام کی اس تڑپ کو فنا کیا۔

دوسری بغاوت: انگریزی استعمار کے خلاف ۱۸۵۷ء میں ہوئی۔ انگریزوں نے اس بغاوت سے جو سلوک کیا، وہ ان کا استبدادی حق تھا۔ لیکن اس تباہی کے مسئول قلعہ معلیٰ کے غدار اور پنجابی مسلمانوں کے گھڑ توانے اور اس قماش کے دوسرے قبیلے تھے۔

تیسری تحریک: علماء صادق پور کی انفرادی عنوان سے اجتماعی کوششیں تھیں جو انگریزی حکومت کے وحشیانہ استبداد کی نذر ہو گئیں۔ ان مقدمات کے مخبر اور سرکاری گواہ سب کے سب مسلمان تھے۔

چوتھی تحریک، پہلی جنگ عظیم کے دوران (۱۹۱۴ء) میں حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی کے ارشد تلامذہ نے بیرون ملک جا کر مرتب و منظم کی۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ ان کے سربراہ تھے۔ ان کے علاوہ حاجی ترنگ زئی (آخندی)، مولانا سیف الرحمٰن قندھاری، مولانا منصور صمدی، مولانا عزیز گل کاکا خیل، مولانا احمد اللہ پانی پتی، مولانا ظہور محمد سہارنپوری، شیخ عبدالرحیم

سندھیؒ، مولانا غلام محمد دین پوری، مولانا تاج محمود امروٹی، مولانا فضل ربی پشاوری، مولانا محمد اکبر یاغستانی، مولانا فضل محمود پشاوری، خان عبدالغفار خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا محمد احمد چکوالی اس تحریک کے دست و بازو تھے۔ اس تحریک کو بھی برطانوی سلطنت کے مسلمان پٹھوؤں نے غرق کیا۔ اس کی تفصیلات مختلف کتابوں سے معلوم کی جا سکتی ہیں، مختصر یہ کہ سی آئی ڈی کے مسلمان اہل کاروں نے حرمین شریفین تک حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے ارشد تلامذہ کا تعاقب کیا ان کے خدمت گار ہو گئے۔ اور اس طرح تمام راز حاصل کر کے انگریزی حکومت کے حوالے کیے، مولوی محمد علی قصوری نے سر عبدالقیوم کی معرفت معافی لے کر حکومت کو بہت سے راز دے ڈالے۔ میاں عبدالباری کو سر محمد شفیع نے حکومت سے چھٹکارا دلوا کر ان سے تمام تفصیلات حاصل کر لیں، خان بہادر حق نواز نے شیخ عبدالحق سے ریشمی خطوط حاصل کیے۔ خان بہادر مبارک علی شیخ الہند سے چپک گیا۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کا بھائی مظہر علی تھانوی سنٹرل انٹیلی جنس میں تھا اس نے حضرت شیخ الہند کے ساتھیوں پر مولانا حسین احمد مدنیؒ کے الفاظ میں نہایت وحشیانہ مظالم کیے۔ اس کے ساتھ بابائے اردو مولوی عبدالحق کا بھائی تصدق حسین بالپوڑی بھی سی آئی ڈی سے منسلک تھا، اس نے بھی استبداد کا چولہا بھڑکایا۔ مولانا مدنیؒ لکھتے ہیں کہ ان دونوں کا افسر اعلیٰ ایک انگریز مسٹر سین تھا لیکن اس میں انسانیت کا مادہ تھا۔ اور یہ دونوں اس سے یکسر خالی تھے۔

غرض تحریک خلافت سے پیشتر پہلی جنگ عظیم کے دوران میں حضرت شیخ الہند، مولانا آزادؒ کے مشورہ سے ملکی آزادی کی جس تحریک کا عزم رکھتے تھے اور اس کے لیے متذکرہ نقشہ بنایا تھا وہ تحریک اپنوں کی غداری اور مسلمانوں کی جاسوسی سے ناکام ہو گئی۔

حضرت شیخ الہندؒ کی اس تحریک میں مولانا آزادؒ نے کہاں تک ہاتھ بٹایا۔ اس بارے میں ضروری تفصیلات نہ تو حضرت شیخ الہند کے مختلف تذکروں سے معلوم ہوتی ہیں اور نہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے۔ مولانا آزادؒ سے متعلق حضرت شیخ الہند کا مشہور قول ہے کہ "ہم اپنی راہ بھول چکے تھے۔ ابوالکلامؒ نے وہ راہ دکھائی ہے"۔ لیکن اس فقرے کا تعلق ریشمی رومال کی تحریک سے نہیں۔ بلکہ "الہلال" کی اس دعوت سے ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ

... ذہنی استعمار کے خلاف ایک اجتماعی بیداری کا ظہور تھا۔ الغرض مولانا ان مساعی کے ساتھ ذہنی طور وابستہ رہے جو ہندوستان سے باہر اور ہندوستان کے اندر غیر ملکی غلامی کے خلاف نشوونما حاصل کر رہی تھیں۔ مولانا نے ان تحریکوں کو اجتماعی فکر دے کر نہ صرف ایک نموئی تحریک کی بنا ڈالی بلکہ قومی جدوجہد کا سیاسی ذوق پیدا کیا۔ جس زمانے میں "الہلال" "کامریڈ" اور "زمیندار" جاری ہوئے وہ زمانہ ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی سفر کا عوامی آغاز تھا۔ اس سے پہلے مسلمانوں میں برطانوی استیلا کی مزاحمت کے لیے نہ تو کوئی عوامی تحریک تھی اور نہ اس کے [illegible]ہ کا ہمہ گیر ذہن تھا۔ کبھی ایک راست باز علماء کا استعمار دشمن ذہن روشن ضرور تھا۔ لیکن اپنے حلقے سے باہر عوامی تحریک کی خصوصیت نہیں رکھتا تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے ایک خفیہ تنظیم بنائی اس کے ارکان ملک سے باہر بھی ضرور بھجوا دیے۔ مگر عوام میں اس سے متعلق کوئی سیاسی فضا نہ تھی۔ ادھر بڑے بڑے علماء و مشائخ سے حضرت شیخ الہندؒ مایوس تھے۔ انہوں نے اپنی تحریک کے لیے اپنے شاگردوں کو منتخب و مامور کیا۔ ان لوگوں نے پامردی کا ایک ریکارڈ قائم کیا۔ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر ہندوستان سے باہر چلے گئے۔ لیکن تحریک دو مصیبتوں کا شکار ہوئی۔ ایک تو شرکاء میں سے دو چار نے انگریزوں کے ہتھے چڑھ کر راز دے ڈالے۔ دوسرے سی آئی ڈی کے بعض لوگ شامل تحریک ہو گئے۔ جن کی وجہ سے پورا نقشہ برباد ہو گیا۔ خان بہادر رب نواز خان نے ایک نومسلم عبدالحق سے ریشمی خطوط حاصل کر کے سر مائیکل اوڈوائر کو دیے اور ان پٹھانوں کی غداری کا ایک بازار گرم ہو گیا۔ نتیجۃً تحریک بیٹھ گئی اور ارکان ماخوذ و منتشر اور مقید و نظر بند ہو گئے۔ دیوبند کے علاوہ تحریک کے پانچ مرکز تھے۔

(۱) دین پور شریف (سندھ)، (۲) امروٹ شریف (سندھ)، (۳) کراچی کھڈہ (سندھ)، (۴) [illegible] (۵) چکوال، پنجاب۔

غرض یہ تحریک اس زمانے میں بے بال و پر رہی تھی جب الہلالؒ نے سفر شروع کیا، اور مولانا آزاد رانچی میں نظر بند کیے گئے۔ تحریک کی خصوصیت ایک خفیہ انقلابی تحریک کی تھی لیکن پہلی جنگ عظیم کے اختتام تک کمزور پڑ گئی۔ اور ملک تشدد کی انقلابی سوچ سے عدم تشدد (تحریک عدم تعاون) کی سیاسی نہج پر آ گیا۔

"الہلال"، "کامریڈ" اور "زمیندار" تین مختلف المزاج جریدے تھے۔ ان کے مضامین بھی مختلف تھے لیکن ان کا ذہن اور نظر یکساں تھے۔ کامریڈ نے انگریزی دانوں سے خطاب کیا۔ "زمیندار" نے عوام کا ولولہ بیدار کیا۔ "الہلال" اس جماعت سے ہم کلام ہوا جس نے ہندوستان کے عوامی سفر کی سیاسی لیڈر شپ کا نصف پیدا کیا۔ اس زمانے کی لیڈر شپ کے اعضاء و ارکان اپنے سوانح و افکار میں تسلیم کرتے ہیں کہ ان میں سیاسی حرارت "الہلال" نے پیدا کی اور مولانا آزاد کی شعلہ نوائیوں کے باعث وہ اس وادی میں آئے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ مولانا آزاد تحریک خلافت سے پہلے لیڈر نہیں۔ "الہلال" کے ایڈیٹر تھے تب ان کا نام بطور ایک ایڈیٹر کے تھا۔ ان کی شہرت ایک قائد کے اعتبار سے اس وقت نمودار ہوئی۔ جب وہ نظر بند کئے گئے۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں رہا ہوئے تو سیاست کی وادی میں قدم رکھا اور صف اوّل کے رہنما ہو گئے۔

تحریک خلافت سے پہلے سیاسی جدوجہد میں ہندو مسلم اتحاد کا تصور واضح نہ تھا۔ ایک مخلوط زمانہ تھا۔ بعض اقلیتی صوبوں کے مسلمان بالخصوص صوبہ بمبئی کے نامور مسلمان انڈین نیشنل کانگرس کے کسی اجلاس کی صدارت کرتے اور اکا دکا مجلس عاملہ کے ممبر ہوتے تھے مگر جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں تھے وہاں سیاسی اعتبار سے نہ صرف مشترکہ جدوجہد کا تصور ناپید تھا بلکہ ہندو مسلم اتحاد بگاڑ کی طرف تھا۔ یو۔ پی مسلمانوں کا اقلیتی صوبہ تھا لیکن علی گڑھ کے اثرات نے مسلمانوں کے الگ ہونے کی باگ ڈور اس کے سپرد کر رکھی تھی۔ اور اسی کا ذہن ہندوستانی مسلمانوں کا ذہن بن رہا تھا بنگال میں ابتداً مسلمانوں نے برطانوی حکومت کے خلاف سخت جدوجہد کی لیکن وہ تنظیم نہ تھی ایک جوش تھا، طاقت نہ تھی ایک ذہن تھا۔ نتیجۃً جدوجہد کچلی گئی۔

لارڈ کرزن نے بنگال کو تقسیم کیا، تو اس سے ایک نئی چیز پیدا ہوئی مسلمانوں نے تقسیم پر صاد کیا ہندوؤں نے انکار کیا، اس طرح ایک ایسی تحریک پیدا ہو گئی کہ مسلمان حکومت کے ساتھ تھے اور ہندو حکومت کے خلاف تھے۔ کہ ہندوؤں میں تقسیم بنگالہ کے خلاف ایک لہر دوڑ گئی۔ ایک طرف سیاسی مظاہرے شروع ہو گئے۔ دوسری طرف دہشت پسندوں نے ہلا ڈالا آخر حکومت سپر انداز ہو گئی۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو تقسیم بنگال کا اعلان ہوا تھا۔ لیکن دسمبر ۱۹۱۱ء میں شہنشاہ جارج پنجم نے دہلی کے جشن

تاجپوشی میں تقسیم بنگالہ کو منسوخ کر دیا، کلکتے کے بجائے دھلی دارالحکومت قرار دیا۔ ۱۹۱۲ء میں بہار کو الگ صوبہ بنایا گیا، آسام اور اڑیسہ بھی الگ ہو گئے، غرض ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۱ء تک ایک ایسا زمانہ تھا کہ مسلمان سیاسی اعتبار سے وفاداری کا سفر کر رہے تھے۔ ہندوستانی قومیت کا تصور نہ صرف ڈانواڈول تھا، بلکہ بڑی حد تک متزلزل ہو چکا تھا۔

نواب سلیم اللہ خان کی تحریک پر مسلم لیگ کی بنا ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکہ میں رکھی گئی اس کا ذکر آ چکا ہے کہ محرک نواب وقار الملک اجلاس کے پہلے صدر تھے نصب العین تجویز کیا گیا کہ:

۱۔ برطانوی حکومت سے متعلق مسلمانوں کے دل میں وفادارانہ خیالات کو ترقی دی جائے اور گورنمنٹ کے کسی اقدام سے مسلمانوں کو غلط فہمی ہو تو رفع کی جائے۔

۲۔ دوسرے فرقوں سے متعلق معاندانہ خیالات پیدا ہوں تو ان کا سدباب کیا جائے۔

۳۔ مسلمانوں کے سیاسی حقوق و فوائد گورنمنٹ کی خدمت میں مودبانہ طریق سے پیش کئے جائیں۔ نواب وقار الملک سیکرٹری اور نواب محسن الملک جوائنٹ سیکرٹری منتخب کئے گئے۔

اسی سال دسمبر ۱۹۰۶ء میں ہندو مہاسبھا لاہور میں قائم ہوئی۔ لیگ کا دوسرا اجلاس دسمبر ۱۹۰۷ء میں کراچی ہوا۔ پھر ۱۸ مارچ ۱۹۰۸ء کو نواب محمد مزمل اللہ خان کی کوٹھی میں مسٹر شرف الدین بار ایٹ لاء کے زیر صدارت ایک خصوصی اجلاس ہوا لیکن کچھ عرصہ بعد مسٹر شرف الدین مستعفی ہو گئے۔ پھر ایک سال کے اندر اندر پنجاب میں دو لیگیں بن گئیں۔ ایک کے صدر سر محمد شفیع اور دوسری کے صدر سر میاں فضل حسین تھے۔ نواب وقار الملک نے ایک کی سیکرٹری شپ سے استعفیٰ دے دیا تو میجر سید حسن سیکرٹری اور حاجی محمد موسیٰ خان جوائنٹ سیکرٹری مقرر کئے گئے۔ دسمبر ۱۹۰۸ء میں سالانہ اجلاس سر علی امام کے زیر صدارت امرتسر میں منعقد ہوا۔ اس میں تقسیم بنگالہ کی توثیق کی گئی، تیسرا اجلاس جنوری ۱۹۱۰ء میں بصدارت سر آغا خان دھلی میں منعقد ہوا۔ مولوی عزیز مرزا لیگ کے سیکرٹری منتخب کئے گئے۔

اس وقت تک مسلم لیگ کا دفتر علی گڑھ میں تھا لیکن ۱۹۰۹ء میں کالج کے ٹرسٹیوں اور صوبے کے لیفٹیننٹ گورنر میں اختلاف رائے ہو گیا تو صوبائی گورنر نے سر آغا خان سے کہہ کر جنوری ۱۹۱۰ء میں

مسلم لیگ کا دفتر علی گڑھ سے لکھنو منتقل کرا دیا۔ اختلاف یہ تھا کہ نواب محسن الملک انگریز پرنسپل کی بالادستی کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اور اس ریزولیوشن کے خلاف تھے جو ہندی زبان کو رائج کرنے کے لیے لیفٹیننٹ گورنر نے پاس کیا تھا۔

دسمبر ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگالہ کی منسوخی کے اعلان سے مسلم لیگ کی لیڈرشپ جس کا مزاج خانہ زاد تھا مسلمانوں میں سیاسی طور پر ختم ہو گئی نواب سلیم اللہ خان (ڈھاکہ) نے ۳ مارچ ۱۹۱۲ء کو مسلم لیگ کے اجلاس کلکتہ میں صدارتی خطبہ دیتے ہوئے کہا۔

"مسلمانوں کی وفاداری کو ٹھکرا کر حکومت نے تقسیم بنگالہ منسوخ کی اور ہندو قوم کی شورش و مقاطعہ کے سامنے سپر انداز ہو گئی ہم سے حکومت نے قطعاً مشورہ نہیں کیا لیکن ہم نے بوجہ وفاداری کے ضبط کیا۔" (تلخیص)

نواب صاحب نے اعلان کیا کہ وہ آئندہ سیاسی زندگی میں حصہ نہیں لیں گے۔ اور اس کے چند ماہ بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ نواب وقار الملک نے کہا کہ اس طرح حکومت نے گویا مسلمانوں کی مردہ لاشوں سے ایک توپ خانہ گزارا ہے۔ ادھر تقسیم کی منسوخی پر ڈھاکہ یونیورسٹی کا اعلان و قیام مسلمانوں کی دلجوئی کے لیے اقدام و ارمغان تھا۔ فروری ۱۹۱۲ء میں مولوی عزیز مرزا رحلت کر گئے تو ان کی جگہ سر وزیر حسین جنرل سیکرٹری بنائے گئے۔ اس زمانے میں علی گڑھ کے ٹرسٹیوں اور سرکاری مصلحتوں کے مابین ٹکراؤ ہو گیا۔ نواب وقار الملک نے ۱۲ مئی ۱۹۱۲ء کو لکھا کہ:

"جس قسم کی یونیورسٹی گورنمنٹ ہمیں دے رہی ہے اسے دور ہی سے سلام۔"

اکتوبر ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان چھڑ گئی۔ تو علی گڑھ کے طلبہ نے تقلیل غذا شروع کی۔ اس طرح جو کچھ بچتا طلبہ وہ رقم بلقان بھیج دیتے۔ سر جیمس مسٹن گورنر یوپی علی گڑھ آئے اور طلبہ کو نصیحت کی کہ وہ اس طرح اپنی صحت تباہ نہ کریں۔ اپنی توجہ تعلیم پر رکھیں۔

مولانا شوکت علی نے اسی سال انجمن خدام کعبہ قائم کی۔ مولانا محمد علی کامریڈ کو کلکتے سے دہلی لے آئے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری نومبر ۱۹۱۲ء میں اپنا طبی مشن لے کر ترکی گئے، اور وہاں چند ماہ رہے ۳ اگست ۱۹۱۳ء کو کانپور کی مچھلی بازار مسجد کانپور کا واقعہ پیش آیا تو اس حادثہ میں ہندوؤں نے مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ لیکن اس کے فوراً بعد

ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین پہلا فساد اجودھیا میں ہوا۔ وہاں گورنمنٹ کے حکم سے گائے کی قربانی بند کی گئی۔ ادھر مسلمانوں کی متبادل لیڈرشپ جس کا مزاج حکومت کے خلاف ہو، ابھی پیدا نہ ہوئی تھی اُدھر آوازیں موجود تھیں۔ لیکن ان کے وجود ابھی ڈھلے نہیں تھے۔ علامہ شبلی نعمانی ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ کالج میں پروفیسر ہوئے۔ مسٹر بیک پرنسپل تھے۔ علامہ نے ان کے پندرہ سالہ دور کو خود دیکھا تھا وہ سرسید کی وفات کے بعد علی گڑھ چھوڑ کر لکھنؤ گئے اور ندوۃ العلماء میں جدید و قدیم کا امتزاج پیدا کرنے کے لیے ناظم بن گئے۔ چونکہ علی گڑھ رہ کر آپ نے مسلم سیاست کے سرکاری پس منظر کو اچھی طرح بھانپ لیا تھا، اور مسلم لیگ کے رجعتی ضمیر کی اس غایت سے واقف ہو چکے تھے کہ مسلمانوں کی سیاست علی گڑھ کے انگریز پرنسپل وضع کرتے ہیں اس لیے آپ نے مسلم لیگ کے خلاف خامہ فرسائی شروع کی، اس دور میں وہ نظمیں تو زبان زدِ عوام تھیں جو آپ نے "الہلال" وغیرہ کے صفحات میں لکھیں۔ اور اب آپ کے مجموعہ کلام میں آ چکی ہیں۔ لیکن آپ نے مسلم گزٹ لکھنؤ میں ایک سلسلہ مضمون شروع کیا، جو مسلم لیگ پر ایک واشگاف تنقید تھا، علامہ نے لکھا: (بہ تلخیص)

۱۔ لیگ کا سنگ اولین شملہ ڈیپوٹیشن تھا۔ اور اب یا آئندہ جو کچھ اس کا نظام ترکیبی قرار پائے۔ ڈیپوٹیشن کی روح اس میں موجود رہے گی۔

۲۔ جو ملکی حقوق ہندوؤں نے انچاس سالہ جدوجہد سے حاصل کیے ہیں لیگ ان میں مسلمانوں کا حصہ متعین کرانا چاہتی اور ہندوؤں کے خلاف غوغا پیدا کر کے سرکار سے وابستہ رہنا چاہتی ہے۔

۳۔ شملہ ڈیپوٹیشن سب سے بڑا تماشا تھا، جو قومی اسٹیج پر کیا گیا۔

مسٹر آرچ بولڈ علی گڑھ کے پرنسپل تھے۔ انہوں نے وائسرائے کے سیکرٹریٹ شملہ سے "پخت و پز" کر کے شملہ ڈیپوٹیشن کی نیو اٹھائی۔ نواب محسن الملک کے نام ۱۵ اگست ۱۹۰۶ء کو خط لکھا کہ وہ مسلمانوں کا ایک وفد ترتیب دیں جو وائسرائے سے ملاقات کے لیے عرضداشت کرے۔ اس عرضداشت پر ملک و عرض کے مسلمانوں کے مسلمان نمائندوں کے دستخط ہوں۔

وائسرائے کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے وفد ایک ایڈریس تیار کرے جس میں وفاداری کا اظہار ہو اور حکومت کی طے شدہ پالیسی پر اظہار استحسان، طریقہ انتخاب جاری کرنے پر مسلم اقلیت کا نقصان بتایا جائے اور مذہبی عقائد کی بنا پر نامزدگی کا مطالبہ کیا جائے۔ اس ایڈریس میں یہ بھی کہا جائے کہ ہندوستان جیسے ملک میں زمینداروں کی رائے کو فوقیت دینا انسب ہے۔ المختصر طریقہ انتخاب کے بجائے نامزدگی پر زور دیا جائے۔ سر آرچ بالڈ نے مزید کہا کہ وہ ایڈریس خود تیار کریں گے کیونکہ عمدہ الفاظ میں استدعا کرنے کے فن سے وہ بخوبی واقف ہیں۔

سر آغا خان وفد کے لیڈر قرار پائے، وہ انگریزی استعمار کے لیے بہترین سیاست دان تھے۔ انہوں نے ایک سال قبل نائن ٹینتھ سینچری میں ایک مضمون لکھا تھا کہ ہندوستان کی بے قاعدہ ریاستی فوج کو علیحدہ کر کے ایک باقاعدہ مرتب فوج رکھی جائے جس کے اخراجات ریاستوں کے ذمہ ہوں۔ لیکن نظم گورنمنٹ انڈیا کے ہاتھ میں ہو اور اس کی تکمیل کے لیے لارڈ کچنر کمانڈر انچیف کی مدت ملازمت میں توسیع کی جائے لارڈ کچنر وہی انگریز تھا جس نے مہدی سوڈانی کی لاش قبر سے نکلوا کر اس پر بیت زنی کی اور ہڈیاں سمندر میں بہا دی تھیں۔

وائسرائے نے ایڈریس کے جواب میں مسلمانوں کی سیاسی خدمات کا اعتراف کیا اور میونسپلٹیوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں اور قانون ساز کونسلوں میں مذہب کی بنا پر ان کا حق انتخاب تسلیم کیا۔ گویا یہ ایک ڈرامہ تھا جو خود تجویز کر کے اس طرح کھیلا گیا۔

ادھر وفد کی اس باریابی پر "لندن ٹائمز" نے یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو مسلمانوں کی دانشمندی کے زیر عنوان طویل مقالہ لکھا۔ لطیفہ یہ تھا کہ اسی دن وفد وائسرائے سے ملا۔ اور یہ چیز اخبارات میں پہلی دفعہ آئی تھی کہ ہندوستان کئی اقوام کا ملک ہے۔ ۲ اکتوبر کو "ٹائمز آف لندن" نے ایک دوسرا مقالہ شائع کیا جس میں بنگال کے شورش پسندوں کی تضحیک اور مسلمانوں کی وفاداری پر تحسین کی۔ ویسٹرن پریس برسٹل نے بھی ۲ اکتوبر کے شمارے میں مسلمانوں کے متعلق لکھا کہ وہ انگریزوں کی اطاعت کریں گے لیکن ہندو ہرگز اطاعت نہیں کرے گا۔" یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی حکمران سیاست کو پلٹا۔ سر ولیم ہنٹر کے الفاظ میں مسلمان ۱۸۷۱ء تک ہندوستان میں دبائے گئے اور ان پر ہندوؤں کو غالب کیا گیا۔ مسلمانوں نے ۱۸۸۶ء تک تعلیمی امور کو ملحوظ

مگر پھر ۱۸۹۸ء میں جب سرسید وفات پا گئے تو مسلمانوں نے سیاست سے صرف اتنی دلچسپی لی کہ کانگرس کی مخالفت کرتے رہے۔ مگر بعض مسلمان اس سے متفق نہ تھے لیکن وہ قلیل تھے۔ مثلاً نواب سید احمد رئیس مدراس ابتدا سے کانگرس کے ساتھ تھے اور ۱۹۱۳ء میں کراچی کانگرس کے سالانہ اجلاس کے صدر ہوئے، انہوں نے شملہ ڈیپوٹیشن کے ایڈریس پر دستخط کرنے سے انکار کیا۔ حالانکہ اس زمانے میں وہ شملے ہی میں تھے۔

کانگرس ۱۸۸۵ء میں قائم ہوئی ۱۹۱۹ء میں اس کی لیڈرشپ گاندھی جی کو منتقل ہوئی۔ مثلاً چونتیس برس میں تین مسلمان اس کے صدر رہ چکے تھے (۱) بدرالدین طیب جی (مدراس ۱۸۸۷ء) (۲) نواب سید محمد بہادر (کراچی ۱۹۱۳ء)، (۳) سید حسن امام (بمبئی ۱۹۱۸ء)

مسٹر اے او ہیوم نے ۱۸۸۵ء میں کانگرس کی بنیاد اٹھائی کہ اس طرح وہ ہندوستان کے سیاسی ذہن سے مطلع رہنا چاہتے تھے ورنہ جہاں تک ہندوستان کی سیاسی بیداری کا تعلق تھا، بنگال، مدراس اور بمبئی میں سیاسی انجمنیں قائم ہو چکی تھیں اور قومی مطالبات کی آوازیں گونجی تھیں۔ فی الجملہ ۱۸۸۵ء سے ۱۹۱۸ء تک قومی مطالبات کا کافی زور رہا تھا۔ لارڈ کرزن کی پالیسی نے قومی تحریک میں شدت پیدا کیا، بنگال کی تقسیم نے جلسوں، جلوسوں، مظاہروں اور ہڑتالوں کی ایسی بنا ڈالی کہ حکومت پریشان ہو گئی۔ بنگال دہشت پسندوں کا مرکز ہو گیا۔ پنجاب میں سردار اجیت سنگھ اور لالہ لاجپت نے سیاسی ٹکراؤ کا آغاز کیا اور دونوں جلاوطن کر دیئے گئے۔ دادا بھائی نارو جی نے انہی دنوں کانگرس کے صدارتی خطبے میں سوراجیہ کا لفظ ایجاد کیا۔ جس سے انگریز چوکنا ہو گئے ادھر تقسیم بنگال کے مسئلے میں گورنمنٹ کالجوں اور سکولوں کا بائیکاٹ کیا گیا۔ صرف مشرقی بنگال ہی میں چوبیس ۲۴ کے لگ بھگ نیشنل اسکول قائم کیے گئے۔

مسٹر بپن چندر پال نے ۱۹۰۳-۴ء میں اخبار "نیو انڈیا" نکال کر بنگال کو ایک نیا مزاج دیا۔ تب ہندوستان میں سیاسی آزادی کی بنیاد اٹھانے اور اس کا شعلہ بھڑکانے والے اخبار ہی تھے۔ ان کی ہی آبیاری کا نتیجہ ۱۹۲۱ء کی تحریک لاتعاون کا جوش و خروش تھا۔ ۱۹۰۷ء میں بدیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریک شروع ہوئی۔ پنجاب، اندھرا، سی پی، بنگال اور مہاراشٹر میں نیشنل یونیورسٹیاں قائم کرنے کی مہم چلی۔ سوامی وویکانند کے بھائی بھوپندر ناتھ دت نے "یوگانتر" نامی اخبار نکالا، جس

نے انگریزی حکومت پر کھلم کھلا تنقید کی۔ اس جرم میں اس کو طویل المیعاد سزا دی گئی۔ آربندو گھوش کو "بندے ماترم" کے جرم میں پکڑ لیا۔ بال گنگا دھر تلک ۳ر جولائی ۱۹۰۸ء کو گرفتار کئے گئے اور چھ سال کی سزا دی گئی۔ لیکن سرکار نے از خود اپیل کر کے تین سال کر دی۔ ان کے علاوہ بے شمار اشخاص پکڑے گئے۔ تمام تفصیلات سیتا رامیہ پٹا بھائی کی "تواریخ کانگرس" میں درج ہیں۔ المختصر پہلی جنگ عظیم سے بہت پہلے ملک میں انگریزی حکومت کے خلاف تحریک سر اٹھا چکی تھی اور اس کے مظاہر معمولی نہ تھے۔ اس بیداری کا مرکز ان دنوں کلکتہ تھا، مولانا آزادؒ کلکتے ہی کے شہری تھے۔ ان کا لڑکپن یہاں جوان ہوا ادھر انقلابیوں سے ان کے تعلقات قائم ہو چکے تھے۔

۱۹۰۸ء کی ابتدائی سہ ماہی میں مصر اور ترکی کے نوجوانوں سے مل کے آئے تو ان کا نقطہ نگاہ ہندوستان کے مسلمان راہنماؤں سے مختلف ہو چکا تھا۔ کلکتہ صحافتی جدوجہد کا مرکز تھا کئی اخبار اور ان کے ایڈیٹر قلم کی آزادی کے جرم میں سزا پا چکے تھے، مولانا کے سامنے اس جدوجہد کے نتائج تھے اور تقسیم بنگال کے سیاسی اتار چڑھاؤ کا پورا پورا نقشہ بھی تھا۔ ادھر سر سید کی تعلیمی مساعی کے سیاسی افکار نے مسلمانوں کو انگریزوں کے تابع کر دیا۔ ادھر ہندوستان کی غلامی نے دنیائے اسلام کو معرض خطر میں اس طرح ڈالا کہ اس کا وجود گور کنارے تھا۔ مولانا ابھی نو عمر واعظ ہی تھے کہ اپنے وعظوں میں دنیائے اسلام کے تاراج ہونے کی نشاندہی کرتے۔ انہیں کامل اندازہ تھا کہ مسلمانوں کے زوال کا آغاز ہو چکا ہے۔ انہوں نے سب سے زیادہ ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی موت کا صدمہ کیا اور وہ اس سے بیحد پریشان تھے وہ دیکھ رہے تھے کہ انگریز، اینگلو انڈین اور ہندو صحافی قلم کی جوت جگا کر ملک میں ایک نئی روح پھونک رہے ہیں، لیکن ان کے اثرات ہندو عوام کے لیے ہیں۔ اور مسلمان سر سید کی بدولت جمود و رجعت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ مولانا نے اس جمود و رجعت کو توڑنے کے لیے جون ۱۹۱۲ء میں "الہلال" جاری کیا۔ اور جمود و رجعت کی لیڈر شپ کو ہلا ڈالا۔ "الہلال" قرآن و اسلام کی زبان میں خطاب کرتا اور ان مسائل پر ہاتھ رکھتا جو مسلمانوں کو سرکاری سحر سے نکال سکتے تھے، جنگ بلقان کا محاذ برطانوی استعمار کے خلاف عوامی نفرت کو مستحکم کرنے کا بالواسطہ ذریعہ تھا۔ مولانا نے اس مسئلے کو دفان کر دیا۔

کانپور میں مچھلی بازار کی مسجد کے انہدام سے مسلمانوں میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ اس پر حکومت

نے گولی چلا کر ناراضی کی ایک زبردست لہر اٹھا دی، ایک تحریک پیدا ہوگئی، مولانا نے "الہلال" میں اس مسئلے پر تحریکی ولولہ پیدا کیا، آخر لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند نے کلکتے پہنچ کر صوبائی حکومت کے فیصلے پر خط تنسیخ کھینچا۔ مولانا نے اس مسئلہ پر جو تقریریں کیں وہ خطابت کے شہ پارے تھے۔ اور جو مضامین لکھے وہ قلم کے انگارے تھے، سید سلیمان ندوی نے لکھا تھا کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اس تحریک کو ملک بھر میں اس طرح گونجا دیا کہ حکومت کو سپر انداز ہونا پڑا۔

گو تحریک خلافت کے بعد کانپور فرقہ واریت کا مرکز رہا اور اکثر فرقہ وارانہ فسادات وہاں ہوتے رہے۔ حتیٰ کہ ۱۹۳۲ء میں گنیش شنکر ودیارتھی ایسا سچا نیشنلسٹ بھی ان کی بھینٹ ہوگیا، لیکن کانپور کی مسجد کے مسئلے میں ہندو مسلمانوں کے تائیدی تھے اور تحریک کا انداز ایسا تھا کہ مسلمانوں کے ذہن سے برطانوی استعمار خارج ہو رہا تھا۔

ہندوستان میں ۱۹۲۷ء تک برطانوی استعمار کے خلاف جدوجہد کا مذاق پیدا کرنے کے لیے مذہب اور اس کے متعلقات ایک اہم عنصر تھے اور قومی لیڈر شپ عوام کی عصبیتوں کو ابھارنے کے لیے ان سے فائدہ اٹھاتی تھی۔ لوکمانیہ تلک نے مہاراشٹر میں سیواجی مرہٹہ کے نام پر جلسوں اور جلوسوں کا آغاز کیا اور پہلی دفعہ اس سلسلے ہی میں گرفتار ہو کر قید ہوئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے مذہبی ہندو نہ ہونے کے باوجود جنوری ۱۹۲۷ء میں پنڈت مالویہ کی سیادت میں گنگا جمنا کے سنگم پر اشنان کیا، اس سال حکومت نے گنگا کی دھار بدلنے کے خطرے سے نہانے پر قدغن لگا دی تھی پنڈت مالویہ نے اس کو دھرم میں مداخلت قرار دیا اور دو سو آدمی لے کر ستیہ گرہ کیا، پنڈت نہرو کو کوناڈا کانگریس سے واپس آ رہے تھے کہ وہ بھی شامل ہوگئے۔ پولیس نے محاصرہ کیا لیکن ستیہ گرہ کامیاب رہا اور اشنان ہوگیا۔

ان دنوں مسلم لیگ واضح طور پر سرکار کی آلۂ کار تھی۔ مسٹر جناح نے پہلی دفعہ ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ کی صدارت کی، ان کی آمد سے پہلے لیگ سرکاری خواہشات کے تابع تھی، انگریزوں کی خواہش کے مطابق اس کے قول و عمل کا سانچہ تیار ہوتا۔ مولانا نے لیگ کے اس ذہن کو ہدف بنایا، "افکار و حوادث" کا کالم "الہلال" کی ایجاد تھا، اس کالم کو مولانا خود لکھتے اور غالباً طنزیات و خطابیات پر ان کا پہلا و آخری موضوع تھا، اس کے بعد مولانا نے کسی جماعت یا فرد پر کبھی طنز نہ کی۔

"الہلال" کا ابتدائی دور مارچ ۱۹۱۶ء میں ختم ہو گیا۔ لیکن لیگ مولانا کے قلم اور علامہ شبلی کے رشحات سے اتنی مجروح ہوئی کہ مسٹر محمد علی جناح کو صدر بنا کر دسمبر ۱۹۱۶ء کے اجلاس میں سنبھالا لیا۔ مسٹر جناح اس زمانے میں ہندو مسلم اتحاد کے سفیر تھے، انہی کی بدولت کانگرس اور لیگ میں سمجھوتہ ہوا۔ جس کے مطابق ہندوؤں اور مسلمانوں کے حقوق کا تعین کیا گیا، واضح رہے کہ سید نبی اللہ ۱۹۱۰ء میں لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ ناگپور کے صدر تھے۔ انہوں نے حکومت پر پہلی دفعہ تنقید کی اور ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا تھا۔ لکھنؤ کے سالانہ اجلاس میں وہ صدر استقبالیہ تھے۔ اور یہ گویا لیگ کے خود راستے ہونے کی طرف پہلا قدم تھا۔ اس کے بعد ۱۹۲۲ء تک لیگ صاحب الرائے لوگوں کے ہاتھ میں رہی۔ لیکن ۱۹۲۴ء میں سر رضا علی صدر ہوئے تو پھر اس کی صدارت ۱۹۳۵ء تک سروں اور خان بہادروں ہی کے پاس رہی۔ حسرت ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کا اجلاس علامہ اقبال کی صدارت میں ہوا، جس میں انہوں نے ہندوستان کی تقسیم کا تخیل پیش کیا۔

"الہلال" کے دور اوّل میں علامہ اقبال بھی اس کے محبوں میں سے تھے، تا ہم سے "الہلال" کے لیے خریدار پیدا کیے۔ اور کئی دفعہ اپنی منظومات بھیجیں، اس زمانے میں مسلمانوں کا تعلیمی تناسب نہایت حقیر تھا اور بڑے سے بڑے پرچے بھی چند درجن یا چند سو چھپتے تھے لیکن "الہلال" کی اشاعت سال کے اندر اندر چھبیس ہزار فی ہفتہ ہو گئی، تب اردو صحافت میں اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ حکومت نے "الہلال" کی تحریروں سے گھبرا کر دو ہزار کی ضمانت طلب کی لیکن "الہلال" رکا نہیں، کچھ دنوں بعد دو ہزار ضبط کر کے مزید دس ہزار طلب کیا گیا۔ لیکن یہ بھی جلد ہی ضبط کر لیا۔ ۱۹۱۵ء میں الہلال پریس بھی ضبط ہو گیا۔ اس کے پانچ ماہ بعد "البلاغ" کے نام سے دوسرا پرچہ نکالا، لیکن حکومت کو اندازہ ہو گیا کہ اس طرح "الہلال" اور "صاحب الہلال" کی آواز کو دبانا مشکل ہے، اس نے مولانا کو ڈیفنس آف انڈیا ریگولیشنز کے تحت ۳۰ مارچ ۱۹۱۶ء کو ہفتہ بھر کی مہلت دے کر کلکتہ چھوڑ دینے کا حکم دیا، ادھر پنجاب، دہلی، یوپی اور بمبئی کی حکومتوں نے بھی اسی قانون کے تحت اپنے صوبوں میں ان کا داخلہ بند کر دیا۔ مولانا ۴ر اپریل کو رانچی چلے گئے اور وہاں مورآبادی گاؤں میں قیام کیا، لیکن حکومت نے چھ ماہ بعد مولانا کو وہیں نظر بند کر دیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ حکومت مولانا کی پُراسرار ملاقاتوں سے خائف تھی۔ اس کا خیال تھا کہ مولانا جنگ کے اس زمانے میں ان عناصر کے مددگار ہیں جو برطانوی حکومت کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔

آخر ۳۱ دسمبر ۱۹۱۹ء کو شاہ انگلستان کے اعلان پر مولانا کی نظر بندی ملک کے دوسرے نظر بندوں قیدیوں کے ساتھ ختم ہوگئی، اور وہ یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو رہا ہو گئے۔ مہاتما گاندھی سے مولانا کی پہلی ملاقات جنوری ۱۹۲۰ء میں ہوئی۔ گاندھی جی جنوبی افریقہ سے واپس آکر ملکی سیاست میں داخل ہو گئے اور چمپارن کے کسانوں میں کام کر رہے تھے۔ انہی کے سلسلے میں وہ رانچی گئے تو مولانا آزادؒ سے ملنا چاہا لیکن حکومت بہار نے اجازت نہ دی۔ مولانا رہا ہو کر دہلی پہنچے وہاں گاندھی جی سے ملے۔

ادھر رولٹ بل نے ملک میں ہیجان پیدا کر رکھا تھا۔ اور جلیانوالہ باغ امرتسر میں جنرل ڈائر کی بے تحاشا فائرنگ سے سارا ملک اشتعال و غضب کی حالت میں تھا ادھر جنگ کے خاتمے نے مسلمانوں کو بھڑکا دیا۔ اتحادیوں نے ترکی سلطنت کا تیا پانچہ کر ڈالا۔ خلافت عثمانیہ تاراج ہوگئی۔ یہ سب کچھ سیاسی نقطہ نظر سے ایک حادثاتی طوفان تھا۔ گاندھی جی مسلمانوں کے ہم خیال تھے اور انہیں ساتھ لے کر ترک موالات کی تحریک اٹھانا چاہتے تھے ـــــ ادھر جنگ کے آخری دنوں میں مس رینی بینٹ کی ہوم رول لیگ کا عروج تھا۔ ادھر گاندھی جی نے احمد آباد کے مزدوروں کی اعانت کی اور ۱۹ جنوری ۱۹۱۹ء کو رولٹ ایکٹ کے متعلق اعلان کیا کہ وہ ستیہ گرہ سے اس کا مقابلہ کریں گے۔ ۳۰ مارچ ۱۹۱۹ء کو ہڑتال کا اعلان کیا گیا پھر ۶ اپریل پر ملتوی کر دیا۔ اس روز ہڑتال ہوئی، دہلی میں گولی چلی، پانچ آدمی ہلاک اور بیسیوں زخمی ہوئے۔ امرتسر میں ۱۰ اپریل کو ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال گرفتار کر لئے گئے۔ لوگوں نے احتجاجی جلوس نکالا، حکام نے گولی چلائی جس سے دو آدمی شہید اور بہت سے زخمی ہو گئے۔ ہجوم مشتعل ہو گیا اس اشتعال میں نیشنل بنک کو آگ لگا دی، اور اس کے سفید فام منیجر کو قتل کر دیا۔ مزید پانچ انگریز قتل کئے گئے، بنک کے علاوہ ریلوے گودام اور شیڈ وغیرہ کو آگ لگا دی گئی۔ گوجرانوالہ اور قصور میں بھی ہنگامہ ہوا۔ قصور کا اسٹیشن جلا دیا گیا۔ گوجرانوالہ کا ایک پل نذر آتش کیا گیا ٹرین روک لی گئی۔ لاہور میں بھی گولی چلی، کلکتے سے بھی ایسی ہی خبریں آئیں۔ لاہور اور امرتسر میں ۱۵ اپریل کو مارشل لاء لگا دیا گیا، جلیانوالہ باغ میں ۱۳ اپریل کو جنرل ڈائر نے ایک سو ہندوستانی اور پچاس انگریز سپاہی لے کر جلیانوالہ باغ میں بیس ہزار لوگوں پر بے تحاشا گولی چلائی۔ سولہ سو راؤنڈ ختم ہو گئے۔ سرکاری رپورٹ کے مطابق چار سو آدمی ہلاک اور ہزار دو ہزار کے درمیان زخمی ہوئے۔ ان زخمیوں کے لیے پانی بند کر دیا گیا اور وہ جلیانوالہ باغ کی چار دیواری میں رات بھر تڑپتے رہے۔ پھر لوگوں کو

پیٹ کے بل رینگنے پر مجبور کیا گیا۔ دو سو اٹھانوے آدمیوں کو مارشل لا کے تحت گرفتار کیا، دو سو اٹھارہ کو سزائے قید دی گئی۔ اکاون کو پھانسی۔ چھیالیس کو عمر قید، دو کو دس دس سال اور گیارہ کو مختلف المیعاد سزا ملی۔ ایک سو دو افراد کو سول افسران نے مارشل لا کے تحت قید کیا۔ لوگوں کو سر عام بید لگوائے گئے۔ اور رنڈیوں کو نظارے کے لیے لایا گیا۔

گاندھی جی کو امرتسر آنے سے روک دیا۔ وہ پنجاب کے حدود ہی میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کی جگہ پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت مدن موہن مالویہ وغیرہ نے امرتسر آکر تحقیقات کی اور وہ تمام مظالم قلمبند کیے جو اہل شہر پر گزر چکے تھے۔

اس صورت حال نے ملک کو انگاروں پر لوٹا دیا تھا اور لوگ انگریزی حکومت سے ٹکرا جانے کو تیار تھے۔ مزید برآں مسلمانوں میں اشتعال تھا لیکن ابھی کانگریس لیڈرشپ کے ہاتھ میں تھے۔ مولانا آزادؒ اور مولانا محمد علی وغیرہ کے نظر بندی سے رہا ہوتے ہی ان میں ایک نئی روح پیدا ہو گئی۔ اور رجعتی لیڈرشپ خارج ہو گئی۔ گاندھی جی نے ۲۵ جنوری کو دہلی میں جلسہ عام کیا، جس میں لوکمانیہ تلک اور دوسرے کانگریسی زعماء نے خلافت سے متعلق مسلمانوں کے نقطہ نظر کی تائید کی۔ ادھر مسلمان اکابر کا ایک وفد ترکی کے مسئلے میں وائسرائے سے مل کر ناکام ہو چکا تھا۔ آخر کار ایک مشترکہ اجلاس میں گاندھی جی نے عدم تعاون کا پروگرام پیش کیا۔ اس اجلاس میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، حکیم محمد اجمل خان اور مولانا آزادؒ شریک تھے۔ حکیم اجمل خان نے کہا کہ :

"وہ اس پر غور کرنے کی مہلت چاہتے ہیں"

مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے کہا کہ :

"وہ مراقبہ کیے بغیر تائید نہیں کر سکتے خدا کی طرف سے اشارہ ملنے پر وہ رائے دے سکتے ہیں"

مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نے کہا کہ :

"فی الحال وہ مولانا عبدالباری کے فیصلے کا انتظار کریں گے"

گاندھی جی نے مولانا آزادؒ سے پوچھا تو مولانا نے بلا تامل جواب دیا کہ :

"مجھے آپ سے کامل اتفاق ہے۔ یہی ایک اسلحہ ہے جس سے ہم برطانوی استعمار کا مقابلہ کر سکتے اور اپنے مقاصد کے مددگار ہو سکتے ہیں۔ ترکی کی مدد بھی اسی طرح ہو سکتی ہے"

چند ہفتے بعد میرٹھ میں خلافت کانفرنس ہوئی، تو گاندھی جی نے پہلی دفعہ "عدم تعاون" کا پروگرام پیش کیا۔ مولانا آزاد نے قرارداد کی تائید کی۔ ستمبر ۱۹۲۰ء کو اس پروگرام پر غور کرنے کے لیے کانگرس کا ایک خاص اجلاس کلکتے میں منعقد ہوا، لالہ لاجپت رائے صدر تھے۔ گاندھی جی نے اپنا پروگرام پیش کیا اور کہا کہ سوراجیہ اور خلافت کے مسائل اسی طرح حل ہو سکتے ہیں۔" لالہ لاجپت رائے اور سی آر داس نے اتفاق نہ کیا، بپن چندر پال نے بھی اختلاف کیا۔ لیکن عدم تعاون کی تحریک کا ریزولیوشن بہت بڑی اکثریت سے منظور ہو گیا۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ اجلاس کے مندوبین میں مسلمان شاید پہلی اور آخری دفعہ اکثریت میں تھے اور مذکورہ قرارداد انہی کے ووٹوں سے پاس ہوئی۔ عدم تعاون کا ریزولیوشن مولانا کے ذہن سے نکلا تھا اور وہ اس کے مؤید تھے۔ اس تجویز کے پاس ہوتے ہی گاندھی جی نے ملک کے طول و عرض کا دورہ شروع کیا۔ مولانا اس سفر میں ان کے ساتھ رہے اور ملک کو ترک موالات کے لیے تیار کیا، اس کے تھوڑا عرصہ بعد مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور مولانا عبدالباری وغیرہم بھی متفق ہو گئے۔ ادھر لالہ لاجپت رائے اور سی آر داس بھی آملے اور سارا ملک تحریک ترک موالات سے گونج اٹھا۔

مولانا فرماتے تھے کہ "مہاتما جی کا پروگرام اصلاً "ٹالسٹائی" سے ماخوذ تھا، لیکن وہ "الہلال" میں عرصہ پہلے قریب قریب وہی لکھ چکے تھے جو گاندھی جی نے پیش کیا اور ملک نے جدوجہد کے لیے قبول کیا۔

خلافت کمیٹی نومبر ۱۹۱۹ء کے تیسرے ہفتے میں قائم کی گئی اس کا پہلا اجلاس دسمبر ۱۹۱۹ء میں بمقام امرتسر منعقد ہوا۔ مولانا شوکت علی پہلے صدر تھے، جلیانوالہ باغ کے حادثے نے امرتسر کو عوامی جوش و خروش کا مرکز بنا دیا، کانگرس، مسلم لیگ اور جمعیت العلماء ہند کے سالانہ اجلاس بھی انہی دنوں امرتسر میں منعقد ہوئے۔ کانگرس کے صدر پنڈت موتی لال نہرو، مسلم لیگ کے صدر حکیم محمد اجمل خاں اور جمعیۃ العلماء ہند کے صدر مولانا عبدالباری فرنگی محلی تھے، خلافت کانفرنس کا دوسرا اجلاس ۱۵ فروری ۱۹۲۰ء کو غلام احمد بھوری کے زیر صدارت بمبئی میں منعقد ہوا۔ جس میں انگلستان بھجوانے کے لیے ایک وفد تجویز کیا گیا اس وفد کے ارکان مولانا محمد علی، سید سلیمان ندوی، مسٹر سید حسن، مسٹر حسن محمد حیات تھے، اس وفد نے ۲ مارچ کو مسٹر فشر نائب وزیر ہند کے سامنے اپنے مطالبات پیش کیے۔ مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم تھے۔ وفد ان سے بھی ملا۔ لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

ترک موالات کی تحریک پر بعض ہندو حلقے اس لیے جزبز ہو رہے تھے۔ کہ خلافت کا مسئلہ خارجی

اور اسلامی ہے۔ مولانا نے ان کی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا کہ اس مسئلے نے مسلمانوں میں برطانوی استعمار کے خلاف داخلی طور پہ بال و پر پیدا کئے ہیں۔ اور سوال ایک غصب و جبر کے خلاف حق و انصاف کی معاونت کا ہے۔ مولانا محمد علی نے مدراس میں تقریر کرتے ہوئے کہہ دیا کہ افغانستان، ہندوستان پر حملہ کرے تو اس ملک کے مسلمان افغانستان کا ساتھ دیں گے۔

انگریزوں نے ہندوؤں کو بھڑکانے کے لیے ان کلمات کو استعمال کرنا شروع کیا۔ مولانا آزادؒ نے شرعی مسئلہ پیش کیا کہ ہندوستان آزاد ہو اور ایک ایسی گورنمنٹ قائم ہو جس میں دیگر قوموں کی طرح مسلمانوں کو بھی آزادی حاصل ہو تو اس صورت میں اسلام کا حکم یہ ہے کہ مسلمان اپنے وطن کو حملہ آوروں سے بچائیں۔ اگرچہ حملہ آور مسلمان اور خود خلیفہ کی فوج ہی کیوں نہ ہو۔

مولانا کی اس توضیح سے بدگمانی صاف ہو گئی۔ مولانا محمد علی نے اصل میں یہ فقرہ انگریزی حکومت کے خلاف کہا تھا کہ تم ہماری آزادی غصب کئے بیٹھے ہو، افغانستان نے چڑھائی کی تو ہم اپنی غلامی کے خلاف اس کا ساتھ دیں گے۔ چونکہ افغانستان مسلمان ملک تھا اور مولانا نے صرف مسلمانوں کا ذکر کیا تھا اس لیے انگریزوں نے چاہا کہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے بدگمان کریں۔ مولانا سے منسوب الفاظ برطانوی بیربھر کی شوخی تھے۔ انگریزوں کے ساختہ پرداختہ علماء و مشائخ نے ترک موالات کی تحریک پہ اعتراض کئے کہ ترک فساد فی الارض کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اور ایسا کوئی جہاد شروع نہیں کیا جا سکتا جس کی کامیابی حتمی نہ ہو۔ مرزا غلام احمد کی امت تو خیر کاسہ لیسی کی پیداوار تھی۔ مسلمانوں کے بعض اقلیتی فرقوں نے بھی یہی کہا۔ قائد اعظم خلافت کی انسٹی ٹیوشن ہی کو نہیں مانتے تھے وہ ترکِ موالات کے پروگرام پر کانگرس سے الگ ہو گئے۔ لیکن پشتینی انگریز پرستوں کے علاوہ مولانا احمد رضا خان بریلوی نے ترک موالات کے خلاف قرآن و سنت کو اساس بنا کر فتویٰ دیا۔ ان حضرات کا پس منظر تو معلوم تھا، لیکن مولانا اشرف علی تھانوی جو دیوبند ہی کی سربرآوردہ شخصیت تھے۔ اس تحریک کے خلاف قرآن و سنت سے جواز پیدا کرنے لگے۔ ان کے بھائی مظہر علی تھانوی سی آئی ڈی کے ظالم ترین افسر تھے۔ انہوں نے شیخ الہند کے رفقاء پر انگریزوں کی وفاداری کے شوق میں انتہائی ظلم کئے تھے، مولانا تھانوی کو بھائی کے ان مظالم سے متعلق قرآن و سنت میں کوئی حکم نہ ملا، لیکن ترک موالات کی تغلیط کے بارے میں انشراح ہو گیا۔ یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے اس طرز عمل نے عمر کے آخری

دور تک ان کے گرد اس قسم کے مریدوں اور ارادت مندوں کی بھیڑ جمع کئے رکھی۔ جو برطانوی حکومت کی موچھ کا بال اور اس کے آلۂ کار تھے۔ حتیٰ کہ ان کے حلقہ نشینوں میں سی آئی ڈی کے اہل کار خاصی تعداد میں تھے۔ ان کے خلفاء میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جو ہندو کے حریف لیکن انگریز کے حلیف تھے۔ مولانا آزادؒ نے قرآن وسنت کی اس تحریف کا قرآن وسنت کے واضح احکام سے سدباب کیا۔ جس سے ان لوگوں کی مخالفت ادھوری رہ گئی۔

بریلی میں جمعیت العلمائے ہند کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا گیا۔ مولانا آزاد صدر تھے۔ لیکن مولانا احمد رضا خان ترک موالات سے متعلق اجلاس کی راہ میں مزاحم ہوئے۔ ان کے معتقد زیادہ تر قصاب تھے، چھروں سے مسلح ہو کر کانفرنس الٹ دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ بعض مقتدرین نے مولانا آزادؒ سے کہا کہ بریلی میں کانفرنس نہ کریں کہیں اور کریں، وہاں خون خرابہ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ مولانا نہ مانے۔ کانفرنس ہوئی تو رضا خانی خنجر برداروں نے اجلاس کو نرغے میں لے لیا۔ سامعین وحاضرین میں ان کی نمایاں اکثریت تھی۔ مولانا احمد رضا خان کے صاحبزادے مولوی حامد رضا خان اور ان کے نامور خطیب مولانا سید سلیمان اشرف بھی ہم مسلک علماء کے ساتھ ڈائس پر فروکش تھے۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ذکرِ آزادؒ میں لکھتے ہیں کہ:

"مولانا کے ساتھ وہ خود کانفرنس میں شریک تھے، مولانا سید سلیمان اشرف نے اپنی فصیح وبلیغ اور جامع وطویل تقریر سے کانفرنس کو ہلا ڈالا، معلوم ہوتا تھا اور کچھ کہنا ممکن نہیں رہا۔ لیکن مولانا آزادؒ جوابی تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو خطابت کی معراج سے مجمع مبہوت ہو گیا۔ ان کی طلاقتِ لسانی ایک ایسا معجزہ تھی کہ انسان تو انسان مظاہر قدرت بھی مسحور ہو گئے۔ مولانا نے تقریر ختم کی تو سید سلیمان اشرف نے اٹھ کر اعلان کیا کہ "مولانا آزاد نے ہمیں مطمئن کر دیا ہے۔ اب ہم تحریکِ خلافت کے مخالف نہیں رہے"۔ مولوی حامد رضا خان نے اعلان کیا کہ سب غلط فہمیاں دور ہو چکی ہیں اور اب ہم بھی سب کے ساتھ ہیں"۔

۱۶ مارچ ۱۹۲۰ء کو اتحادیوں نے استنبول میں اپنی فوجیں اتار کر قوم پرست ترکوں کے مکانات پر حملہ کیا اور ان کے گھروں میں گھس گھس کر انہیں مارا، رؤف بے کو مالٹا بھیج دیا۔ جہاں انجمن اتحاد وہ

ترقی کے بہت سے ممبر قید تھے۔ شہر میں مارشل لا ر لگا دیا۔ اور اعلان کیا کہ جو شخص قوم پرست لوگوں کو پناہ دے گا، اسے سزائے موت دی جائے گی۔ سلطان ترکی نے ایک عدالت قائم کر کے مصطفیٰ کمال، علی فواد، ڈاکٹر عدنان اور خالدہ ادیب خانم وغیرہ کے لیے سزائے موت کا حکم صادر کیا۔ شیخ الاسلام نے فتویٰ جاری کیا کہ جو شخص ان میں سے کسی ایک کو قتل کرے گا وہ یقینی طور پر جنت کا مستحق ہوگا۔ مصطفیٰ کمال انگورہ پہنچ گئے اور وہاں ۲۳ ؍اپریل ۱۹۲۰ء کو گریٹ نیشنل اسمبلی کے نام سے حکومت قائم کر لی۔

وائسرائے ہند نے ۱۵ ؍مئی ۱۹۲۰ء کے ایک بیان میں کہا کہ "ترکی کا فیصلہ ان کی مرضی کے خلاف ہوا ہے جس کا انہیں افسوس ہے۔ لیکن وہ بے بس ہیں"۔ ادھر اسی زمانے میں جلیانوالہ باغ کی فائرنگ سے متعلق ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوئی۔ چونکہ رپورٹ ہندوستانیوں کے خلاف تھی اس لیے تمام ملک میں برہمی پیدا ہو گئی۔ ۳۰ ؍مئی ۱۹۲۰ء کو بنارس میں کانگرس نے فیصلہ کیا کہ حکومت سے ترکِ موالات کی جائے۔ یکم اور دو جون کو ہندوؤں اور مسلمانوں کا الہ آباد میں ایک مشترکہ جلسہ ہوا جس میں ترکِ موالات کو باقاعدہ منظور کیا گیا۔ ملک کے مقتدر رہنماؤں کی ایک کمیٹی قائم کی گئی۔ جس کے سپرد ترکِ موالات کی تحریک کی گئی۔ اس کمیٹی کے ارکان تھے مہاتما گاندھی۔ مولانا ابوالکلام آزادؔ، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا حسرت موہانی اور حاجی احمد صدیق (کھتری) بمبئی۔

۱۸ ؍جولائی ۱۹۲۰ء کو لکھنؤ میں ایک زبردست جلسہ ہوا ادھر اسی مہینے ہجرت کی تحریک شروع ہوئی، سرحد کے علاقے کچی گڑھی میں ایک مہاجر حبیب اللہ خان گوروں کی پٹائی سے رحلت کر گیا، لیکن گورا کورٹ مارشل میں بری کر دیا گیا۔ یکم اگست کو عام ہڑتال کی گئی۔ مہاتما گاندھی ترکِ موالات کی تحریک کے لیڈر قرار پائے۔ انہوں نے حکومت کو اپنے تمام تمغے واپس کر دیئے، سلطان وحید الدین نے سوائے کانفرنس منعقدہ ۱۰ ؍اگست کا فیصلہ منظور کر لیا۔ جس کے مطابق تھریس کا بڑا حصہ اور سمرنا یونان کو دے دیئے گئے۔ اس کے علاوہ استنبول اور بعض دوسری بندرگاہیں اتحادیوں کو دے کر آرمینیا کا علاقہ وسیع کر دیا گیا، ترکی کے لیے صرف پندرہ ہزار فوج باقی رکھنے پر صاد کیا گیا۔ لیکن انگورہ کی قومی حکومت نے اس فیصلے کو ٹھکرا دیا۔ یونانی فوج کا مقابلہ کیا اور شکست فاش دی، ادھر ۲ ؍جنوری ۱۹۲۱ء کو ناگپور میں خلافت کانفرنس کا اجلاس ہوا تمام مسلمان زعماء موجود تھے۔ کانگرس اور مسلم لیگ کے اجلاس بھی وہیں ہوئے۔ پنجاب کے مشہور لیڈر پنڈت رام بھجدت نے تحریک پیش کی کہ جب تک خلافت کا مسئلہ طے نہ ہو، شرائط

کی مخالفت کی جائے نیز اعلان کیا کہ ہندو مسئلہ خلافت میں مسلمانوں کے ساتھ ہیں۔ ڈاکٹر راج کمار چکرورتی (ڈھاکہ) نے اس کی تائید کی۔

۲۶ دسمبر ۱۹۲۱ء کو الہ آباد میں حکیم اجمل خان کے زیر صدارت خلافت کانفرنس منعقد ہوئی مسلم لیگ اور کانگرس کے اجلاس بھی یہیں ہوئے ان میں سول نافرمانی جاری کرنے کی تجاویز پاس کی گئیں۔ ادھر اگست ۱۹۲۲ء میں مصطفےٰ کمال نے یونانیوں پر حملہ کر کے اپنے ملک سے نکال دیا اور اس صورتِ حال پر یورپ کی طاقتوں نے لوزان کانفرنس طلب کی، لیکن اس میں شرکت کے لیے حکومت استنبول اور حکومت انگورہ دونوں کو مدعو کیا۔ اس شرارت کے مضمرات کو مصطفےٰ کمال اور ان کے رفقاء بھانپ گئے۔ انہوں نے یکم نومبر ۱۹۲۲ء کو نیشنل اسمبلی کا اجلاس بلوایا اور خلافت و سلطنت کو الگ الگ کر دیا۔ اس فیصلے پر سلطان وحید الدین نے بھاگ کر اتحادیوں کے جہاز میں پناہ لی۔ عبدالمجید آفندی کو خلیفہ بنایا گیا۔ لوزان کانفرنس (۲۰ نومبر ۱۹۲۲ء) میں ترک فاتحانہ انداز میں شریک ہوئے۔ پہلی دفعہ لوزان کانفرنس ناکام ہوئی لیکن جولائی ۱۹۲۳ء میں ترکوں سے مصالحت ہو گئی تو ۲۵ جولائی ۱۹۲۳ء کو ہندوستان میں ترکی سے صلح کا جشن منایا گیا۔

مصطفےٰ کمال نے انگورہ میں حکومت بناتے ہی خلافت کا منصب ختم کر دیا۔ شیخ الاسلام کا عہدہ اڑا دیا۔ برعظیم کے مسلمانوں کو اس انفساخ پر پریشانی ہوئی، انہوں نے ایک وفد ترکی بھیجنے کے لیے تیار کیا لیکن حکومت ہند نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر مولانا محمد علی کے زیر صدارت ۱۹ مارچ ۱۹۲۴ء کو کلکتے میں خلافت کانفرنس منعقد ہوئی جس میں خلافت کے خاتمے پر اظہار افسوس کے علاوہ جزیرۂ عرب کی آزادی کا مطالبہ اور شریف مکہ سے اظہار نفرت کیا گیا۔

۱۹۲۵ء کا اجلاس ۲۴ دسمبر کو مولانا ابوالکلام آزادؔ کے زیر صدارت کانپور میں منعقد ہوا، مہاتما گاندھی بھی شریک ہوئے۔ مولانا حسرت موہانی صدر استقبالیہ تھے انہوں نے اپنے خطبے میں ابن سعود کی مذمت کے علاوہ شاہ حجاز کو خلافت دینے کا اظہار کیا لیکن اگلے اجلاس میں مولانا محمد علی نے تجویز پیش کر کے مولانا حسرت موہانی کا خطبہ کارروائی میں سے حذف کرا دیا۔ اس کے برعکس سلطان ابن سعود کے داخلۂ حجاز پر اظہار مسرت اور شریف مکہ کے اخراج پر اظہار اطمینان کیا گیا۔

مولانا آزادؔ نے اپنے صدارتی خطبے میں جدید ترکی کے ظہور، مصر کی سیاسی حرکت، مشرق میں یورپ

کے ظالمانہ استعمار عراق، شام اور فلسطین میں انگریزی فرانسیسی حکم برداری، عثمانی خلافت کے اختتام، ترکی سے خاندان عثمانی کے اخراج، شمالی افریقہ میں امیر محمد بن عبدالکریم کی پے در پے فتح مندیوں، حجاز کے ناگہانی اور فوری تغیرات، شریف مکہ کی خودساختہ عمارت کے انہدام، ابن سعود کے داخلہ حجاز، جزیرۃ العرب کی سیاسی صورت حال، شام میں قومی حرکت کی طاقتور نمود، خاندان قاچاریہ کے خاتمے، پہلوی شہنشاہیت کے قیام اور بعض دوسرے سیاسی، ملکی، قومی اور بین الاقوامی مسائل پر روشنی ڈالی، فرمایا کہ:

"ہمارے لیے زندگی اور سرگرمی کی اصل جگہ خود اپنی سرزمین اور اپنا وطن ہے، اس بات پر افسوس کیا کہ ایک چھوٹی سی مدت میں ہمارا ملک قدم اٹھا کر صرف تھک ہی نہیں گیا بلکہ واپسی کے لیے پیچھے دیکھ رہا ہے۔ ادھر مذہبی منافرت جماعتی تعصب، فرقہ وارانہ تنگدلی، اور محکومانہ ذہنیت کے تمام مفاسد ہماری راہ بدستور روکے کھڑے ہیں"

مولانا نے ہندوستان کے مسلمان فوجیوں کے ہاتھ ترکی کی بربادی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا:

"ہندوستان کے بدقسمت مسلمان اب اس کے لیے تیار نہ ہوں گے کہ برطانوی شہنشاہیت کے لیے ان ترکوں کے سینوں پر گولیاں چلائیں جو اپنے قومی و وطنی حق کی حفاظت کے لیے دفاع پر مجبور ہوتے ہیں"

مولانا نے استعمار کے ہاتھوں موصل و دمشق کی بربادی کا ذکر کرتے ہوئے جنوبی افریقہ کے ایشیاٹک بل کو ہندوستان کی غلامانہ زندگی کے نتائج پر محمول کیا اور کہا کہ:

"طاقت نے کمزوری اور غفلت کے ساتھ کب انصاف کیا ہے کہ آج کرے گی ہر انصاف جس کا مطالبہ کمزوری کرے رحم ہے"

مزید فرمایا کہ:

"شریف مکہ کا وجود اسلام اور عرب کے لیے موجودہ عہد کی سب سے بڑی مصیبت تھا۔ وہ اپنا آخری لمحہ حیات بھی ظلم و استبداد کے بغیر بسر نہ کر سکا"

ایران میں قاچاری شاہیت کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا:

"کہ یہ انقلاب کیسا شاندار اور مکمل ہوتا اگر ایک نئی شہنشاہیت کے آشانہ کی جگہ ہم ایران کی جمہوریت کا اعلان سنتے، ابن سعود کے داخلہ حجاز پر اظہار مسرت کیا کہ شریف مکہ ختم

ہو گیا۔"

مولانا نے خطبے کے آخر میں فرمایا کہ خلافت کمیٹی جس وقت قائم ہوئی تو اس کے پیشِ نظر دو مقصد تھے۔

۱۔ مسئلہ خلافت کے لیے ملک میں عام جدوجہد کرنا۔

۲۔ مسلمانوں میں ملکی آزادی کے لیے خصوصیت کے ساتھ سرگرمی پیدا کرنا۔

مولانا نے فرمایا کہ آخری مقصد کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ مسلمانوں کے قدم اس راہ میں بہت پیچھے تھے۔ مولانا نے خطبے کے اس حصے میں ہندوستان کی آزادی کے حصول اور اس کے لیے جدوجہد پر زور دیا اور کہا کہ مسلمانوں کو حق ہے کہ ہندوؤں سے منصفانہ طرزِ عمل کا مطالبہ کریں اور پوری قوت سے کریں۔ لیکن یہ غلط ہوگا کہ وہ ہندوؤں کے طرزِ عمل سے روٹھ کر اجنبی حکومت کی آڑ پکڑ لیں۔ مسلمانوں کے لیے ہندوستان ان کا ملک اور اس کی آزادی ان کا نصب العین ہے۔ مولانا نے خطبے کے آخر میں اس پر زور دیا کہ عالمی اور ملکی سیاست جو کروٹ لے چکی ہے اس کے پیشِ نظر فی الوقت ہمیں عوام کو "نوشت وخواند" کے تعمیری کام میں لگانا چاہیے۔ مولانا نے مجوزہ موتمر حجاز پر صاد کیا اور عوام کی تعلیمی تربیت کے لیے چار نکاتی پروگرام پیش کیا۔ جس میں نائٹ اسکولوں کا قیام، مسجدوں سے مدرسوں کا کام لینا ماہانہ تربیتی نصاب جو مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی اصلاح و ترقی پر مشتمل ہو قرات خانوں (ریڈنگ رومز) کی تاسیس اور خطبات جمعہ میں اصلاح و ترقی کی دعوت بھی شامل تھے۔

یہ ذکر آ چکا ہے کہ مولانا ۳۱ دسمبر ۱۹۱۹ء کو رہا ہوئے۔ یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو کلکتے پہنچے، پھر باہمی مذاکرات اور قومی مجالس میں شرکت کے لیے صبح و شام سفر کیا۔ اس کے دو مہینے بعد ان کی صدارت میں ۲۸ فروری ۱۹۲۰ء کو مجلسِ خلافت بنگال کی پراونشل کانفرنس ہوئی۔ اس کا صدارتی خطبہ "جزیرۃ العرب" اور "مسئلہ خلافت" ایک جامع و مانع دستاویز تھا۔ مسئلے کا ہر پہلو بیان کیا اور کوئی مبحث تشنہ نہ رہا۔ فی الجملہ اس موضوع پر سارا خطبہ ایک ایسی کتاب تھی کہ اردو یا کسی دوسری زبان میں اس سے بہتر کتاب نہ ہوگی یہ سب سے بڑا خطبہ تھا۔ جو آج تک کسی قومی یا سیاسی مجلس میں پڑھا گیا۔ اس کی حیثیت ایک مستقل تصنیف کی ہے۔

مولانا نے پہلی مرتبہ ۱۹۲۰ء میں آل انڈیا خلافت کانفرنس ناگپور کی صدارت فرمائی۔ یہ خلافت

کانفرنس کا دوسرا اجلاس تھا، پہلا اجلاس ۱۹۱۹ء میں مولانا شوکت علی کے زیر صدارت امرتسر میں ہوا، مولانا آزاد اس وقت رانچی میں نظر بند تھے۔

جمعیۃ العلماء ہند کا اجلاس اوّل ۱۹۱۹ء میں مولانا عبدالباری کے زیر صدارت امرتسر میں دوسرا اجلاس ۱۹۲۰ء، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے زیر صدارت دھلی میں اور تیسرا اجلاس ۱۸ نومبر ۱۹۲۱ء کو مولانا آزادؒ کے زیر صدارت لاہور میں۔ اس اجلاس میں مولانا نے دو خطبات دیئے۔ ایک تحریری ایک تقریری۔ تحریری خطبے میں مولانا نے علماء کو ان کے فضائل ومکارم اور فرائض ومراتب سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ:

"دنیا میں علم ویقین صرف وحی الہی اور علوم واعمال نبوت ہیں اس کے سوا علم ویقین کا اس سمار نیا کے نیچے وجود نہیں اس کے ماسوی جو کچھ اور جس قدر بھی ہے، قرآن پکار پکار کر کہتا ہے کہ ظن ہے، تخمین ہے، قیاس ہے، اٹکل ہے، تخرص ہے اور تکعب بالریب ہے، ظلمت ہے، ظلمات لعضا فوق بعض ہے"۔

مولانا نے جہاد وعمل اور آزمائش وابتلا کے متعلق قرآن حکیم کی مختلف آیتوں کا حوالہ دیتے ہوئے تین مختلف مذاہب اصلاح کا ذکر کیا۔ جو ان دنوں ہندوستان، مصر، ترکی، ایران، ٹیونس، بلاد ترکستان وقفقاز میں نشو ونما پا رہے تھے۔ پہلا مذہب اصلاح امرنجی سے موسوم تھا، ہندوستان میں سرسید اور ان کے جانشین، ٹرکی میں سلطان محمود خان اور اس کے وزراء، مصر میں محمد علی پاشا اور ٹیونس میں خیرالدین و بیرم تونسی اس کے داعی تھے، دوسرا اصلاح سیاسی کا مذہب تھا، اس کو مسلمانوں کے سیاسی زوال اور عمومی اختلال کا حددرجہ استغراق تھا۔ اس کے سب سے بڑے داعی سید جمال الدین افغانی اور ٹرکی میں سید مدحت پاشا ابوالاحرار تھے۔

تیسرا مذہب، اصلاح دینی وسیاسی سے موسوم تھا، ہندوستان میں الہلال اس کا داعی تھا، اس کا مطمع نظر مسلمانوں کو بدعات وتوہمات سے نکال کے قرآن وسنت کے تابع کرنا اور ان کے گمشدہ اقتدار کو واپس لانا تھا، ترکستان اور بلاد روسیہ میں شیخ صدرالدین، مصر میں شیخ محمد عبدہ، شام میں شیخ عبدالرحمن کواکبی اور شیخ کمال الدین قاسمی اس مسلک اصلاح کے داعی تھے۔

مولانا نے فرمایا: جمعیت العلماء ہند الہلال کی بے روک صداؤں کا یوسف مقصود ہے:۔

علمائے حق کی راست بازی کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے ان علماء امت کا ذکر کیا جو قرن اوّل سے حق و صداقت کے پشتیبان تھے فرمایا:

"ہمارے لیے راہ عمل "تجدید و احیاء" ہے نہ کہ تاسیس و اختراع"۔

تقریری خطبے میں مولانا نے عوام کے جذبات کو جھنجوڑتے ہوئے انہیں قرن اوّل کے غزوات کی مثالیں اٹھا دینے کا سبق دیا، صوبائی مجلس خلافت آگرہ (۲۵ اکتوبر ۱۹۲۱ء) کے خطبہ صدارت میں مسلمانوں کے جذبات کو چھیڑتے ہوئے آگرہ کے تاریخی آثار کا اس طرح تذکرہ کیا کہ خطابت اپنی معراج پر تھی۔ مولانا نے تحریک خلافت کے متعلق فرمایا کہ،

"اس نے ایک طاقتور ہنگامے کے ساتھ کل ہندوستان کے ایک ایسے مسئلے کو زندہ کر دیا جو چالیس سال کی کوشش سے ہندوستان کو نہ ملا تھا اور وہ مسئلہ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ ہے جس سے ہندوستان کا چراغ روشن ہو گیا"۔

فرمایا:

"میں ہی تھا جس نے سب سے پہلے فروری ۱۹۲۰ء میں ترک موالات کی بنیاد اٹھائی اور اس سب کمیٹی کا تین میں سے ایک ممبر میں تھا جس نے دھلی میں ترک موالات کا فیصلہ کیا۔ اس کا لائحہ عمل مرتب کیا، میرے علاوہ ایک ممبر مہاتما گاندھی تھے دوسرے حکیم اجمل خان"۔

مولانا کانگرس کے سب سے کم عمر صدر رہے، انہوں نے پہلی دفعہ ۱۵ دسمبر ۱۹۲۳ء کو دھلی کے اسپیشل اجلاس کی صدارت کی، یہ اجلاس کانگرس لیڈر شپ کے دو گروہوں کو جوڑنے کے لیے تھا۔ ایک گروہ کونسلوں کے حق میں اور دوسرا اس کے خلاف تھا مولانا نے انہیں اکٹھا کیا اور اختلاف کے بجائے تعاون کا راستہ پیدا کیا۔ یہ کوئی معمولی چیز نہ تھی۔ مولانا نے کانگرس کو انتشار سے بچایا اور دونو گروہوں کے نقطہ ہائے نگاہ میں ہم آہنگی پیدا کر کے باہمی تصادم ختم کیا۔

مولانا کا یہ خطبہ ایک فلسفی مدبر کا ادبی زبان میں خطاب ہے۔ مولانا نے مسئلہ خلافت کے پس منظر میں ملک کی نشاۃ ثانیہ اور اس کے ملی وجود کی بقاء و استحکام پر اظہار خیال کرتے ہوئے کھلے لفظوں میں بیان کیا کہ سوراج کے ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا۔ لیکن ہندو مسلم اتحاد جاتا رہا تو

عالم انسانیت کا نقصان ہوگا۔

مولانا نے اس زمانے میں ملک کے طول و عرض کا دورہ کیا۔ پشاور سے کلکتے تک اور دہلی سے مدراس تک ہر جگہ ہزارہا انسانوں سے خطاب کرتے رہے۔ آل انڈیا خلافت کانفرنس کی دو دفعہ صدارت کی اور کئی ایک صوبائی کانفرنسوں کی صدارت فرمائی۔ ناگپور کا خطبہ صدارت دستیاب نہیں ہوسکا۔ مولانا نے ایک ایسا ذہن پیدا کیا جو پہلے مفقود یا محدود تھا۔ جہاں تک عوام کا تعلق ہے ملک بھر میں قومی راہنماؤں کی ایک ڈار پیدا ہوگئی اور اس ڈار کے پیدا کرنے میں ابوالکلام سرفہرست تھے۔

مولانا کی بالغ نظری اور مستقبل اندیشی کا حال یہ تھا کہ انہوں نے ۲۷ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو کلکتے کے ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

> یورپ کی مسیحی طاقتیں مشرقی مسئلے کے نام پہ اسلام کے قوائے سیاسیہ کو ختم کرنا چاہتی ہیں اور جو ممالک اسلام کے زیرنگیں ہیں انہیں ملی بھگت سے آپس میں بانٹ لینے کی متمنی ہیں۔"

پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی تو یہی ہوا کہ خلافت عثمانیہ پارہ پارہ ہوگئی اور مسلمان ریاستیں اپنی علیحدگی سے برطانیہ، فرانس اور اٹلی کے تصرف، حکمرداری اور انتداب میں آگئیں۔ ان حالات میں تحریک خلافت نے ہندوستان کو جو کچھ دیا وہ یہ تھا کہ:

۱۔ ہندوستان میں احساس آزادی، اجتماعی طور پر بیدار ہوگیا اور ملک غیر ملکی غلامی سے گلوخلاصی حاصل کرنے کے لیے متحد ہوگیا۔ انگریزوں کو بھی احساس ہوگیا کہ ہندوستان نے اپنی منزل کی طرف قدم اٹھا لئے ہیں اور اب ان کی سیاسی تحریک کا رکنا ممکن نہیں۔

۲۔ ملک کی پرانی لیڈرشپ ختم ہوگئی، اس کی جگہ نئی لیڈرشپ کا آغاز ہوا۔

۳۔ مسلمانوں کی ذہنی سرزمین میں برطانوی وفاداری کا جو بیج بویا گیا تھا اس کی جگہ مسلمانوں میں برطانوی غلامی سے تنفر کے جذبات پیدا ہوگئے اور انگریز دوست لیڈرشپ کے بجائے استعمار دشمن لیڈرشپ نمایاں ہوگئی۔

۴۔ ۱۸۵۷ء کے بعد یہ ایک نئے ہندوستان کا آغاز تھا۔

۵۔ مسلمان برطانوی استعمار کی عالمی سیاست سے واقف ہوگئے۔

۶- ہندوؤں کی وطنی سیاست کا مزاج انقلابی ہو چکا تھا، لیکن مسلمانوں کی معاشی درماندگی اور عمرانی پسماندگی کے باعث رجعتی لیڈر شپ نے ان پر جو اپنا اثر و رسوخ اور تسلط و اقتدار قائم کر رکھا تھا وہ تحریک خلافت کی بدولت ختم ہو گیا۔

۷- تحریک خلافت کا مسلمانوں کو انعام یہ تھا کہ ان میں پا مرد راہنماؤں کے علاوہ جواں مرد کارکنوں کی جماعت پیدا ہو گئی، جس نے برطانوی استعمار سے آنکھیں چار کرنے کی رسم ڈال دی، اس سے پہلے مسلمانوں کی لیڈر شپ ان لوگوں کے ہاتھ میں تھی جو "بزدل" یا "بد دل" تھے۔

۸- یہ خصوصیت تحریک خلافت کو حاصل ہوئی کہ اس نے حکومت سے لڑائی میں ترک موالات کا ہتھیار ایجاد کیا اور رضا کارانہ قید و بند کی بنیاد رکھی۔

۹- اس تحریک کی بدولت ادب و شعر کا مزاج یکسر بدل گیا اور سیاست و خطابت کے مذاق میں سرتاپا تبدیلی آگئی۔

۱۰- اس تحریک سے پہلے انگریزی خواندہ اور انگریزی ناخواندہ دو مختلف راستوں پر تھے، تحریک خلافت نے اس مغایرت کو مٹا کر یکجائی پیدا کی۔

ملیح آبادی نے مولانا آزاد کی زبانی جو کہانی املا کی ہے اس میں مذہب کی خاندانی گرفت سے ...کی ذہنی بغاوت کا حال تو لکھا ہے اور یہ بھی درج کیا ہے کہ ان کی دماغی فضا سر سید کے افکار کی تحویل ...ئی تھی۔ پھر وہ کس طرح پلٹے اور کیونکر دین کی راہ پر آئے۔ اس کتاب میں نہیں اور نہ "ہماری آزادی" ...ہے البتہ "ترجمان القرآن" کے مقدمہ میں چند اشارات ہیں کہ ان پر الحاد کا زمانہ بھی گزرا تھا۔

المختصر "الہلال" کی دعوت ابتداً وہی تھی جو آج مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا نصب العین ہے الا ان مباحث کے جو زمان و مکان کے علاوہ تصوراتی و نظریاتی لحاظ سے مختلف ہیں۔ "الہلال" کے ابتدائی ...میں مولانا آزاد نے مسلم لیگ کو بُری طرح رگیدا، لیکن تب وہ کانگرس کے ترجمان نہیں تھے۔

وہ ہندو مسلم اتحاد سے انکار نہیں کرتے تھے لیکن مسلمانوں کی انفرادیت کو قائم رکھنے کے متمنی و داعی تھے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کا ملی وجود ہی ان کی بقا کا ضامن تھا۔

عبدالرزاق ملیح آبادی "ذکر آزاد" کے صفحہ ۴۴ پر لکھتے ہیں کہ:

"مولانا مسلمانوں کو مذہب کی راہ منظم کرنا چاہتے تھے۔ ان کی اسکیم کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمانوں

کا ایک امام ہو، اور امام کی طاعت کو وہ اپنا دینی فرض سمجھیں مسلمانوں میں یہ دعوت مقبول ہوسکتی ہے اگر قرآن وحدیث سے انہیں بتادیا جائے کہ امام کے بغیر ان کی زندگی غیر اسلامی ہے اور ان کی موت جاہلیت پر ہوگی، جب مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد امام کو مان لے تو امام ہندوؤں سے معاہدہ کر کے انگریزوں پر جہاد کا اعلان کر دے۔"

ملیح آبادی لکھتے ہیں کہ ان کے نزدیک مولانا ابوالکلام ہی اس امامت کے اہل تھے مولانا نے اس غرض سے ملیح آبادی کو بیعت کے لیے مجاز ٹھہرایا۔ اور الفاظ بیعت کا مسودہ بھی لکھ دیا، ان کے سپرد یوپی کا صوبہ کیا۔ حضرت شیخ الہند مالٹا کی نظر بندی سے چھوٹ کر انہی دنوں لکھنؤ پہنچے۔ ملیح آبادی کو معلوم ہوا کہ فرنگی محل والے حضرت شیخ الہند کو مولانا عبدالباری کی امامت پر راضی کر رہے ہیں تو حضرت شیخ الہند سے تخلیہ میں ملاقات کی اور کہا کہ بعض لوگ امامت کے سلسلہ میں آپ کا نام لے رہے ہیں آپ اس کے اہل بھی ہیں۔ حضرت شیخ مسکرائے اور فرمایا کہ،

"میں تو ایک لمحے کے لیے بھی اس کا تصور نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کا امام بنوں" ملیح آبادی نے کہا "کچھ لوگ مولانا عبدالباری کا نام لے رہے ہیں"۔ شیخ نے فرمایا مولانا عبدالباری کے بہترین آدمی ہونے میں شبہ نہیں، مگر اس بیعت کی ذمہ داریاں کچھ اور ہی ہیں۔ ملیح آبادی نے کہا مولانا ابوالکلام آزادؒ کے بارے میں کیا رائے ہے؟ فرمایا میرا انتخاب بھی یہی ہے۔ اس وقت مولانا ابوالکلام کے سوا کوئی شخص امام الہند نہیں ہوسکتا، وہ ان اوصاف کا مجموعہ ہیں جو ہندوستان کے امام میں ہونا ضروری ہیں۔"

ملیح آبادی لکھتے ہیں کہ میں نے حضرت شیخ کے بعد مولانا عبدالباری سے بات چیت کی وہ کہنے لگے۔

"مولانا آزاد کے سوا کسی اور کا نام امامت کے لیے لینا قوم سے غداری ہے۔ میں پہلا آدمی ہوں جو مولانا آزادؒ کے ہاتھ پر بیعت کرے گا۔"

ملیح آبادی لکھتے ہیں کہ میں اس جواب سے مطمئن نہ ہوا، مجھے معلوم تھا کہ مولانا آزادؒ سے بڑی چشمک ہے گو ظاہری محبت وخلوص کی کمی نہیں۔ میں نے ان سے تحریر چاہی تو انہوں نے لکھ دیا ملیح آبادی نے "ذکر آزاد" کے صفحہ ۳۷ پر وہ تحریر نقل کی ہے۔ ابھی یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ مولانا آزادؒ نے ملیح آبادی

کرنا لیکن سردست اس قصے کو تہ کیجیے اور کام کیے جائیے"۔

مولانا کو پنجاب، سندھ اور بنگال پر مقابلۃً زیادہ اعتماد تھا کہ وہاں امامت کا سانچہ تیار ہو چکا تھا۔ اس زمانے میں دیوبند، مراد آباد، ندوہ، اور فرنگی محل علماء کی تیاری اور تکمیل کے مراکز تھے لیکن ان کے ذہن میں مسلمانوں کی امامت کا حقدار وہ تھا جو ان سے اسنادِ فضیلت لے چکا ہو، مولانا ان مراکز کی بادشاہی اور دین میں اجارہ داری کے تعصبات سے آگاہ تھے، زمانہ بھی ۱۹۲۰ء کا تھا جب مسلمانوں کی سیادت کروٹ لے کر نئے ہاتھوں میں آ رہی تھی، ملیح آبادی نے مولانا کو اس سلسلے میں علماء کی سازشوں سے مطلع کیا، تو آپ نے ۲۲ جولائی ۱۹۲۰ء کو انہیں ایک خط میں لکھا کہ:

"حسرت سے بمبئی میں ملاقات ہوئی تھی وہ رائے و فکر کے آدمی نہیں ہیں۔ ان کا اصل جوہر استقامت عمل ہے جو کچھ آپ نے لکھا پڑھ کر سخت قلق ہوا۔ افسوس بہتر سے بہتر نیکی کو بھی یہ لوگ بلا آمیزش بدی کے نہیں انجام دے سکتے۔ ان لوگوں میں ایک شخص بھی نہیں جو اس مسئلے کی اہمیت و حقیقت اور منصب و سیاست کے فرائض و مہمات اور پھر موجودہ حالات کی بنا پر مشکلات و صعوبات راہ کا نکتہ شناس ہو۔"

ملیح آبادی نے صفحہ ۴۴ پر لکھا ہے کہ مولانا آزاد نے امامت کا مسئلہ اپنے ذہن سے نکال دیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ تحریک کے زمانے میں اس خاص دینی مسئلے سے مسلمانوں میں خلفشار یا تصادم کے خواہاں نہ تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ فرنگی محل اور دیوبند اپنی فضیلت کے مفروضہ پر ان کے طرفدار نہیں بلکہ مخالف ہیں۔ مولانا محمد علی مرحوم بہ قول ملیح آبادی مولانا آزاد کی امامت ہی کے نہیں بلکہ ذات کے بھی سخت مخالف تھے اور معاملہ شخصی رقابت کا تھا۔

مولانا آزاد نے امامت کے مسئلے سے رُخ پھیر کر مدرسہ عالیہ کلکتہ (سرکاری) کے مقابلے میں مدرسہ اسلامیہ قائم کیا، ۱۳ دسمبر ۱۹۲۰ء کو افتتاح ہوا۔ مولانا نے استقبالیہ خطبے میں کہا:

"علم خدا کی ایک پاک امانت ہے اور اس کو صرف اس لیے ڈھونڈنا چاہیے کہ وہ علم ہے اس حکومت نے علم کو علم کے لیے نہیں معیشت کے لیے ذریعہ بنا دیا ہے۔"

مولانا کو اس زمانے میں علماء کے مختلف دبستانوں کا تلخ سے تلخ تجربہ ہوا کہ وہ اپنے سلسلوں کے طائفے بنا کے بیٹھے اور اپنے سے باہر کسی کو فضیلت دینے کے سوال پر ان کے علم و تقویٰ راضی

ہی نہیں ہوتے، مسلمانوں کے متعلق مولانا نے محسوس کیا کہ ابھی ان میں سیاسی سفر کی اہلیت کا فقدان ہے اور اس کے وجوہ ہیں۔ ایک بڑا سبب یہ ہے کہ وہ مختلف مسالک کے خانوں میں اس طرح بٹے ہوئے ہیں کہ انہیں اسلام کی وحدت سے کہیں زیادہ مسالک کا بٹوارہ عزیز ہے، اور مشارب کی اس تقسیم پر وہ اسلام کی ملی وحدت کو بھی تیاگ دیتے ہیں۔

مولانا کے محسوسات کو ان کے سے جامع الفاظ میں پیش کرنا مشکل ہے۔ لیکن مولانا نے تحریک خلافت کے دنوں میں اپنے مطالعاتی تجربوں سے جہاں مسلمانوں کے جوش و عمل کا اندازہ کیا تھا وہاں لازماً وہ اس نقطۂ نگاہ تک پہنچ چکے تھے۔

۱۔ ہندوستان کے مسلمان مختلف صوبوں میں بٹی ہوئی طاقت ہیں، ان پر جدا جدا مسالک اور جدا جدا اشخاص مختلف المعنیٰ اثر رکھتے ہیں۔

۲۔ مسلمانوں کی ذہنی درماندگی اور عمرانی پسماندگی اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ ان میں سیاسی جدوجہد کی اجتماعی طاقت کا پیدا ہونا کہ سارا ملک ہمقدم و ہمسفر ہو، ناممکن تھا۔ ہر صوبے اور علاقے کے مسلمان جداگانہ مفادات رکھتے تھے۔

۳۔ ملک کی آزادی ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ناممکن تھی اور برطانوی استعمار ان دونوں کے اختلاف و تصادم ہی سے اپنی عمر دراز کر سکتا تھا۔

۴۔ مسلمان تنہا نہ تو اس ملک پر اقتدار پا سکتے تھے اور نہ الگ رہ کر اپنے قومی وجود کو تحفظ دے سکتے تھے۔

۵۔ اب دنیا جس فکری سانچے میں ڈھل رہی تھی وہ قدامت کے سانچوں سے مختلف تھا، سوال یہ تھا کہ عصری تحریکوں کا مقابلہ کرنے کے لیے قومی جدوجہد کی ذہنی چھاپ کیا ہو؟ کیونکہ ہندوستان سید احمد شہیدؒ اور علمائے صادق پور کے فکر و نظر کی تحریک سے ایک صدی آگے نکل چکا تھا اور تمام دنیا کے سیاسی دھارے مختلف ہو گئے تھے۔

۶۔ ہندوستان میں سیاسی مقاصد کے لیے کسی مذہبی تحریک کی سیاسی کامیابی مختلف مذاہب کی موجودگی میں ناممکن تھی۔ ہندوستان کئی مذاہب اور کئی مسالک کا وطن تھا۔ یہاں ایک مذہبی تحریک کا دوسرے مذاہب کے پیروکاروں سے ٹکراؤ ناگزیر تھا اور یہ ہندوستان کی آزادی کے راستے کی بہت

بڑی روک تھی۔

۷۔ جس خلافت کے لیے ہندوستانی مسلمانوں نے عظیم جدوجہد کی، اس کو مصطفےٰ کمال کے ردِ عمل نے اپنے ہاتھوں معدوم کر دیا گو استعمار ہی کی کارفرمائی کا نتیجہ تھا۔ لیکن عرب کئی ریاستوں میں تقسیم ہو کر خلافت سے ہاتھ اٹھا چکے تھے۔ مولانا نے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اس خارجی سیاست کے بجائے داخلی سیاست کو اولیت دی کہ ہندوستان کی آزادی پر افریشیائی ممالک کی آزادی کا انحصار ہے اور ہندوستان کی آزادی کا صحیح نقشہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد ہی سے اُبھر سکتا ہے۔

۸۔ مولانا نے "ہماری آزادی" کے آخری مبحث میں لکھا ہے۔

"تاریخ شاہد ہے کہ شروع کے چالیس برسوں یا زیادہ سے زیادہ پہلی صدی کو چھوڑ کر اسلام کبھی سارے مسلمان ممالک کو صرف مذہب کی بنا پر متحد نہیں کر سکا۔"

مولانا کے سیاسی افکار اسی نقطۂ نگاہ کو محیط تھے اور وہ تحریک خلافت کے داخلی و خارجی شواہد و نظائر میں اس کا تجربہ کر چکے تھے۔

تحریک خلافت کے بعد ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات کا جو لاوا پھوٹا اور شدھی و سنگٹھن کی تحریکوں نے جو رنگ اختیار کیا وہ ایک خوفناک منظر تھا، مولانا اس سے دل برداشتہ ہو کر قرطاس و قلم کی صحبتوں میں لوٹ گئے۔ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۸ء تک وہ کانگریس کی مجلس عاملہ کے رکن تو رہے لیکن کسی میدان میں تگ و تاز نہ کی۔ ۱۹۲۷ء میں اُلہلال دوبارہ جاری کیا، جو چھ ماہ بعد بند ہو گیا۔ ۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن سے متعلق ان کا مسلک بھی وہی تھا جو ہندوستان کے حریت پسندوں کا تھا لیکن وہ عوام میں نہیں سے کہ مقاطعانی مظاہروں میں شریک ہوتے اور ہنگامے رچاتے۔ ۱۹۲۹ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس پنڈت جواہر لال نہرو کے زیر صدارت لاہور میں منعقد ہوا اور کانگریس نے مکمل آزادی کا ریزولیوشن پاس کیا۔ مولانا اس میں شریک ہوئے مگر ملک کی فرقہ وارانہ کشیدگی سے انتہائی بددل تھے، مولانا محمد علی وغیرہ کانگریس چھوڑ کے جا چکے تھے۔ ادھر رجعتی لیڈر شپ نے مسلمانوں کو بالواسطہ و بلاواسطہ متاثر کرنا شروع کیا اور ایک حد تک متاثر کر لیا۔ اس دوران میں فرقہ وارانہ مناقشت طے کرنے کے لیے قبل ازیں کئی اتحاد کانفرنسیں ہوئیں، ایک کانفرنس کا نتیجہ نہرو رپورٹ تھی، لیکن اکارت گئی۔ ملک میں مسلمانوں کی خلافتی لیڈر شپ جس میں پہلے ہی رقابتی چشمک تھی ایک دوسرے کے مدِ مقابل دو سیاسی مسلکوں میں بٹ گئی اور ٹکراؤ کھلم کھلا ہو گیا۔ ادھر ہندو مسلم

مسئلہ موجود تھا لیکن نہرو رپورٹ کے مرحلہ میں مسلمان سیادت کی تقسیم کا باعث ابوالکلام و محمد علی کا شخصی ٹکراؤ بھی تھا۔ مولانا محمد علی نے کانگرس سے علیحدگی اختیار کی تو وہ لوگ جو انگریزوں کی خوشنودی کے لیے جی رہے تھے۔ مولانا محمد علی کے گرد جمع ہو کر فرقہ واریت کا ستون ہو گئے۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے ترجمان ہیں، مولانا آزاد نے اس ٹکراؤ میں فی نفسہ حصہ نہ لیا، اور وہ سب کچھ چپ چاپ سہتے رہے جو ان کے حریف ان سے متعلق سیاستہً یا تعریضاً کہتے۔ مولانا نے ان دنوں یا اس کے بعد سیاسی اتار چڑھاؤ کے مختلف مرحلوں میں بلکہ تحریک پاکستان کے زمانہ قہر و غضب میں بھی کسی کے خلاف کبھی درشت کلمہ نہیں کہا اور نہ بری زبان استعمال کی، وہ تمام حادثوں کو اپنے دل پر گزارتے رہے۔

ملک میں دہشت پسند تحریک کا سر آغاز تھا۔ ادھر سائمن کمیشن کی آمد پر لاہور کے احتجاجی جلوس میں لالہ لاجپت رائے پولیس کی لاٹھیوں سے اس قدر زخمی ہوئے تھے کہ ان کا دیہانت ہوگیا۔ اس پر دہشت پسندوں نے ملک کو ہلا ڈالا۔ پنجاب و دہلی میں بموں کا پھٹنا روزمرہ ہوگیا اور افسروں پر گولی چلنے کے واقعات عام ہوگئے۔ نتیجۃً بھگت سنگھ، دت، راج گرو، سکھ دیو اور ان کے ساتھیوں کا نام ملک میں گونجنے لگا۔ ادھر دہشت پسندی کا یہ عالم تھا کہ بعض شہروں میں بیک وقت بم پھٹے۔ اسی زمانے میں مولانا کی تنہائیوں کا شہ پارہ ترجمان القرآن (جلد اول) شائع ہوا۔

لاہور کانگرس تک سوراج پارٹی کا بول بالا رہا۔ اکثر قانون ساز اسمبلیوں میں اس کو طاقت حاصل ہوئی اور وہ پارلیمانی محاذ پر سرگرم رہی۔ برطانوی حکومت کو معلوم ہو گیا کہ اس کا ڈھانچہ ٹوٹ چکا یا ٹوٹ رہا ہے۔ سردار وٹھل بھائی پٹیل مرکزی اسمبلی کے پریذیڈنٹ ہوئے انہوں نے حکومت کو اس قدر پریشان کیا کہ قومی آزادی کا مسئلہ حقیقت کبریٰ ہو گیا اور انگریز ہندوستان سے بات چیت کرنے پر مجبور تھے۔ لاہور کانگرس میں نہرو رپورٹ ختم کر دی گئی، کانگرس نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان کا موقف مکمل آزادی ہے، حکومت نے تسلیم نہ کیا تو ایک سال بعد کانگرس عوامی تحریک شروع کر دے گی۔

۱۹۳۰ء میں تحریک شروع کی گئی۔ کانگرس نے نمکین ستیہ گرہ شروع کیا۔ گاندھی جی نے ڈانڈی مارچ کیا، جگہ جگہ نمک سازی کی گئی کوئی چار ماہ کے اندر جیل بھر گئے۔ گاندھی ارون میثاق کے وقت ستر ہزار کے لگ بھگ سیاسی قیدی تھے۔ جن میں چوبیس ہزار مسلمان تھے، صوبہ سرحد میں قصہ خوانی بازار کا خونچکاں حادثہ ہوا۔

گورہ فوج نے کئی سو خدائی خدمت گاروں کو بھون ڈالا، کانگرس کے ساتھ خدائی خدمت گار، احرار اور جمعیت العلماء کے زعماء و ارکان بھی تھے۔ انہوں نے بھی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ کانگرس خلاف قانون جماعت قرار دے دی گئی تو ایک کے بعد دوسرا صدر اور اس کی نامزد ورکنگ کمیٹی کے ارکان پکڑے جاتے رہے۔ مولانا آزاد بھی صدر منتخب کیے گئے اور وہ بھی پکڑے گئے۔ انہوں نے اپنا جانشین ڈاکٹر انصاری کو مقرر کیا۔ ڈاکٹر صاحب تحریک میں حصہ لینے پر آمادہ نہ تھے۔ مولانا نے انہیں راضی کیا اور وہ تیار ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی قید کا زمانہ سپیشل جیل گجرات میں گزارا۔

مولانا کو میرٹھ کی ایک تقریر کے جرم میں پکڑا گیا اور وہ تقریباً ڈیڑھ سال قید رہے، سپرو اور جیکر کی مساعی سے گاندھی اِرون میثاق ہوا تو مولانا بھی مجلس عاملہ کے ساتھ رہا ہو گئے۔ اسی میثاق کا نتیجہ تھا کہ مہاتما گاندھی گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے۔ لیکن گفت و شنید لاحاصل رہی، اس دوران میں لارڈ اِرون چلے گئے اور ان کی جگہ لارڈ ولنگڈن وائسرائے ہو کر آئے وہ ایک سخت گیر انسان تھے اور ایک زمانے میں بمبئی کے گورنر رہے تھے، تب ان کے خلاف بمبئی کے شہریوں نے جو مظاہرہ کیا محمد علی جناح اس کے قائد تھے اور بمبئی کا جناح ہال ان کی اس جرأت اور تدبر ہی کا اعتراف تھا۔

لارڈ ولنگڈن وائسرائے ہو کر آئے تو جناح نے ہندوستان چھوڑ دیا اور لندن چلے گئے۔ لارڈ ولنگڈن سخت گیر تھا، اس نے گاندھی جی کو لندن سے واپسی پر جیل میں ڈال دیا اور کئی کانگرسی راہنما پکڑے گئے، مولانا آزاد کو بھی دہلی میں ایک سال سے زیادہ عرصہ قید رکھا گیا۔

یہ زمانہ عجیب و غریب تھا، مولانا محمد علی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے اور لندن ہی میں رحلت کر گئے، مسٹر جناح ملک سے باہر تھے۔ انہیں گول میز کانفرنس میں صرف اس لیے مدعو کیا گیا کہ وہ انگریزوں کی سی بات نہیں کہہ سکتے تھے ان کا ضمیر اپنا تھا۔ ڈاکٹر انصاری کو انگریزوں کی ملی بھگت کے باعث سرکاری مسلمانوں نے شامل نہ ہونے دیا وہ انگریزوں کی شہ پر اڑے رہے کہ انصاری کو مسلمانوں کی نمائندگی کا حق ہی نہیں پہنچتا۔ ادھر مسلمانوں کی صورت حال یہ تھی کہ احرار جدا گانہ انتخاب کی حمایت میں کانگرس سے الگ ہو گئے اور پنجاب میں ایک ابھرتی ہوئی طاقت تھے، ان کی بدولت تحریک کشمیر پیدا ہوئی اور تقریباً بیس ہزار مسلمان قید ہوئے کئی نوجوان کشمیر کے سرحدی مورچوں پر شہید ہوئے۔

ادھر ۱۹۳۵ء تک حالات نے کئی پانسے پلٹے، خان عبدالغفار خان سالہا سال صوبہ سرحد سے

باہر رہے ان کے لیے اپنے صوبے میں داخلہ ممنوع تھا۔ مولانا محمد علی کی وفات کے بعد مسلمانوں کے اکثریتی صوبوں کا حال یہ تھا کہ بنگال میں مسلمانوں کی رجعتی لیڈر شپ کا صوبائی اسمبلی کے یورپی ممبروں سے گٹھ جوڑ تھا، سرحد میں خان عبدالغفار خان عوام کی اکثریت کے محبوب تھے، لیکن صاحبزادہ عبدالقیوم اور خان بہادر قلی خان جیسے پشتینی وفادار حکومت کے ہاتھ کی چھڑی اور جیب کی گھڑی تھے۔ سندھ سرکاری وڈیروں کے ہاتھ میں تھا اور عوام ان کی جاگیر تھے۔ بلوچستان استعمار کا سیاسی معسکر تھا اور عوام تمنداروں کے مویشی تھے۔ پنجاب سیاسی مسائل میں سہ گونہ تھا، ہندو، مسلمان اور سکھ آپس میں متحارب تھے۔ مسلمانوں کا مقدر انگریزوں کے نسلاً بعد نسلٍ وفاداروں کے ہاتھ میں تھا۔

سکندر حیات، فیروز خان نون، خضر حیات وغیرہ تو پیدائشی خانہ زاد تھے ان کے علاوہ پنجاب کے مسلمان پالٹیکس میں سرکاری اہل کار اور سی آئی ڈی کے افسر مداخلت کرتے اور کئی رہنماؤں کی سیاسی مہار تھامتے تھے، غرض ہندوستان کے اقلیتی صوبے بالخصوص یوپی اور بمبئی مسلمانوں کی فرقہ واریت کا سرچشمہ تھے اور اکثریتی صوبے ہندوؤں سے کٹا چھنی کا مرکز تھے۔ اور اس کٹا چھنی ہی سے وہ ذہن اُبھر کے پختہ ہو رہا تھا جو تقسیم اور اس کے نتائج سے ناواقف تھا۔

مولانا اس وقت کے بکھیڑوں سے الگ تھلگ ترجمان القرآن کے ترجمے اور تفسیر میں منہمک تھے، ۱۹۳۲ء میں انہوں نے ترجمان القرآن جلد دوم مکمل کی۔ پھر جب ۱۹۳۵ء میں صوبجاتی خود مختاری سے متعلق قانون حکومت ہند پاس ہوا تو ہندوستان میں ایک نئی سیاسی ہلچل شروع ہوئی۔ گاندھی جی نے مرن برت رکھ کر اچھوتوں سے متعلق قانون کی تفریق ختم کرائی۔ سکھوں نے پنجاب میں مسلمانوں کی برائے نام اکثریت کو مسلمان راج کا نام دے کر شور مچانا شروع کیا وہ کانگرس سے ہمنوائی کی توقع رکھتے تھے لیکن کانگرس کی مجلس عاملہ نے صاد نہ کیا اور یہ ممکن بھی نہ تھا۔

سکھوں کا خیال تھا کہ وہ کانگرس کو رام کر سکتے ہیں، کیونکہ ان کی اور ہندوؤں کی چھاپ یکساں ہے۔ دوسرے مسلمان من حیث الجماعت کانگرس سے باہر ہیں اور وہ کانگرس کے ساتھ ہیں لیکن مولانا آزاد نے اس عصبیتی ذہن پر پانی پھیر دیا۔ اکالی کانگرس سے الگ ہی تھے اور الگ ہو گئے۔ انتخاب میں کانگرس کا مقابلہ کیا اور یہ واقعہ ہے کہ سکھ لیڈر جو کانگرس میں تھے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق تھا وہ شرومنی اکالی دل سے مختلف ذہن نہ رکھتے تھے، انہوں نے خلوت و جلوت میں بیان کیا کہ :

"مولانا آزادؒ ان کے راستے کی سب سے بڑی روک ہیں وہ نہ تو ان کو پنپنے دیتے ہیں اور نہ ان کی آواز کانگرس ہائی کمان میں رسا ہوتی ہے۔"

مولانا کانگرس ہائی کمان میں مسلمان صوبوں کے انچارج تھے۔ لیکن پنجاب میں سنگھٹن اور اکالی کچھ اس طرح متحد تھے کہ صوبائی کانگرس کے کرتا دھرتا تھے وہ نہ تو اپنے ذہن کی چھاپ ترک کرتے اور نہ مسلمانوں کے معاملے میں صاف دل تھے۔ ہمیشہ اس مسلمان ہی کو صوبہ کانگرس کی صدارت دیتے جو مولانا سے موافق نہ ہوتا مثلاً ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا کے شخصاً مخالف تھے۔ میاں افتخار الدین اشتمالی تھے مگر ان کی طبیعت میں سیاسی تلون تھا۔ ادھر چند سال پہلے جب ملک کی تقسیم ناگزیر ہو چکی تھی اور ہندوستان کا مستقبل طے کرنے کے لیے ۱۹۴۶ء کے انتخابات ہو رہے تھے تو ان عناصر نے یہ جانتے ہوئے کہ سردار پٹیل اور مولانا آزادؒ میں سیاسی مغایرت چلی آ رہی ہے، مولانا کے خلاف سردار سے گٹھ جوڑ کیا اور ان کی متابعت سے بالا ہونا چاہا۔ لیکن ان کا چراغ اسی طرح بجھا بجھا رہا۔ ادھر میاں افتخار الدین نے پھریری لے کر مسلم لیگ کی راہ لی، ادھر مولانا کے سامنے شدائد کا انبار تھا لیکن یہ سب کچھ ان کے لیے عارضی تھا۔ ان کی محرومی یہ تھی کہ وہ اپنے دماغ سے باہر جھانکتے ہی نہیں تھے اور اس کا دبدبہ یہ تھا کہ ان کی بے داغ سیرت سے ہائی کمان بھی مرعوب تھا۔

وہ عوام کے نہیں تاریخ کے انسان تھے۔ وہ سیاست دان نہیں مدبّر تھے۔ اور ایک مدبّر سیاستدان کس طرح اپنی ذات یا اپنے مستقبل پر نہیں سوچتا بلکہ اس کے سامنے ملک اور انسان ہوتے ہیں۔

سیاست کا جوار بھاٹا

دوسری گول میز کانفرنس (۱۹۳۲ء) جس میں مہاتما گاندھی انڈین نیشنل کانگرس کے واحد نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے فرقہ وارانہ مفاہمت کے مسئلہ میں صرف اس چھوٹی سی بات پر ناکام ہو گئی کہ بنگال اور پنجاب کے مسلمان اکثریت میں ہونے کے باوجود صوبائی مقننہ میں صرف ایک ایک نشست زیادہ مانگتے تھے اور اس کے عوض مشترکہ انتخاب قبول کرنے کو تیار تھے لیکن راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے ہندو اور سکھ نمائندوں نے تسلیم نہ کیا۔ نتیجۃً بات کچھ سے کچھ ہو گئی۔ مہاتما گاندھی نے اعتراف کیا کہ "میں فرقہ وارانہ مسئلے کا حل ڈھونڈھنے میں بری طرح ناکام رہا ہوں۔" مسٹر ریمزے میکڈانلڈ وزیر اعظم انگلستان نے اگست ۱۹۳۲ء میں کمیونل ایوارڈ کا اعلان کیا تو مہاتما گاندھی نے ۲۰ ستمبر ۱۹۳۲ء کو ایوارڈ کے اس پہلو پر مرن برت رکھا کہ ہندوؤں اور اچھوتوں (جنھیں وہ ہری جن کہتے تھے) کو علیحدہ حقوق دے کر دو مختلف قوموں میں تقسیم کر دیا ہے۔ نتیجۃً ۲۵ ستمبر ۱۹۳۲ء کو حکومت سپر انداز ہو گئی کمیونل ایوارڈ میں ترمیم کی گئی اور مارچ ۱۹۳۳ء میں قرطاس ابیض شائع کیا گیا۔ اس میں وفاق ہند کی تجویزیں درج تھیں ان تجویزوں پر غور کرنے کے لیے برطانوی پارلیمنٹ نے ایک چیدہ کمیٹی بنائی جس کے صدر لارڈ لینلتھگو تھے۔ اس کی رپورٹ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو پیش کی گئی۔ اسی کا نتیجہ ۱۹۳۵ء کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ تھا جس کے تحت صوبجاتی خود مختاری کا آغاز ہوا اور مرکز کے لیے ایک ایسی ایک وفاقی حکومت تجویز کی گئی جس میں صوبائی حکومتوں کے علاوہ ریاستوں کی رضامندی پر ان کے شمول کا نقشہ بنایا گیا۔ دراصل چار ساڑھے چار سال کا یہ عرصہ ایک لحاظ سے آئینی جدوجہد اور اس کے ردّ و قبول کا دَور تھا۔

۱۹۳۵ء کا ایکٹ فی الواقعہ کوئی آزادی کی دستاویز نہ تھا۔ لیکن بہر حال وہ ہندوستان کو اختیارات

منتقل کرنے کی طرف ایک قدم ضرور تھا۔ اور منزلِ مقصود کے دستوری سفر کا ایک پڑاؤ تھا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ ایسٹ انڈیا کمپنی سے لے کر شاہ انگلستان کی فرمانروائی کے مختلف ادوار سے ہو سکتا ہے۔ ملکہ الزبتھ نے ۱۶۰۱ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان میں تجارت کرنے کی سند دی تھی، لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار بہت عرصہ بعد شروع ہوا۔ اس نے راجاؤں اور نوابوں کی اندرونی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر عمل و دخل شروع کیا۔ اس کی ابتدائی شکل یہ تھی کہ مدراس، بمبئی اور بنگال میں صوبجاتی حکومتیں قائم کی گئیں۔ اور یہ حکومتیں اپنے ادوار میں لیڈن ہال سٹریٹ لندن کی مرکزی اور با اختیار جماعت کے سامنے جوابدہ تھیں۔ ۱۷۷۳ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ریگولیٹنگ ایکٹ کے نام سے ہندوستان کے لیے ایک قانون بنایا جس کی رُو سے ہر پریسیڈنسی کو جداگانہ حکومت مل گئی۔ مگر بنگال پریسیڈنسی کو مدراس اور بمبئی پر قدرے آئینی فوقیت دی گئی۔ گورنر بنگال کو گورنر جنرل کہا گیا۔ اس کے بعد پچاس سال تک گورنر جنرل کے اقتدار و اختیار میں اضافہ ہوتا رہا، لیکن جہاں تک مدراس اور بمبئی کی حکومتوں کا تعلق تھا ان کے اندرونی معاملات میں بنگال مداخلت نہ کر سکتا تھا، لیکن ریگولیٹنگ ایکٹ کا منشا بہرحال مرکزی حکومت کا استحکام و انضباط تھا۔ ۱۸۳۳ء میں اسی قسم کا ایک اور قانون وضع ہوا۔ جس سے مرکزیت کو مزید تقویت حاصل ہوئی، مدراس اور بمبئی کی حکومتوں سے قانون سازی کا اختیار لے لیا گیا اور بنگال کا گورنر تمام ہندوستان کا گورنر جنرل با اختیار کونسل ہو گیا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ آزادی کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار سلب ہو گیا اور زمام سلطنت شاہ انگلستان کو منتقل ہو گئی، پارلیمنٹ نے ہندوستان کی حکومت چلانے کے لیے وزیر ہند کا تقرر کیا، جس کی امداد کے لیے دس سے لے کر چودہ باتنخواہ ارکان کی انڈیا کونسل بنائی گئی۔ ۱۸۶۱ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے انڈین کونسلز ایکٹ پاس کیا جس کی رو سے بمبئی، بنگال، مدراس، یوپی، پنجاب اور سرحد میں قانون سازی کے لیے کونسلیں قائم کی گئیں۔ لیکن گورنر جنرل کو تمام ملک میں ہمہ گیر اختیارات حاصل رہے۔ لارڈ کرزن گورنر جنرل ہوئے تو ان کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ تمام اختیارات مرکز کے پاس رہیں۔ لارڈ منٹو آئے تو انہوں نے بعض صوبائی اختیارات کی نیو رکھنا چاہی۔ اس غرض سے اصلاحات کے لیے شاہی کمیشن مقرر ہوا۔ اس نے ہندوستان کے سفر و مطالعہ کے بعد ۱۹۰۸ء میں رپورٹ پیش کی۔ ماحصل یہ تھا کہ مرکزی حکومت کے اختیارات میں کوئی نئی ترمیم کیے بغیر صوبوں کو بعض امور میں خود اختیار بنا دیا جائے۔ ۱۹۰۹ء کا انڈین کونسلز ایکٹ انہی سفارشات

کا نتیجہ تھا اور اسی کا نام "منٹو مارلے ریفارمز" تھا۔ اور لارڈ منٹو سبکدوش ہو گئے تو لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل ہو کے آئے انہوں نے اگست ۱۹۱۱ء میں ملک معظم کی حکومت کو تیار کیا کہ صوبوں کی تقسیم جدید ہو اور دارالحکومت کلکتے کے بجائے دھلی قرار دیا جائے، چنانچہ تقسیم بنگال منسوخ کی گئی صوبہ بہار و اڑیسہ قائم ہوا۔ دھلی دارالحکومت قرار پایا۔

برطانیہ کے مشہور سیاستدان مسٹر مانٹگو نے ۱۹۱۷ء میں دارالعوام میں ہندوستان کو بتدریج ذمہ دار حکومت سونپنے کے سلسلے میں مثبت خیالات کا اظہار کیا۔ ۱۹۱۸ء میں مونٹ فورڈ رپورٹ شائع ہوئی تو اس میں صوبوں کے لیے دو عملی کی سفارش کی گئی۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ اسی رپورٹ کی بنا پر تیار ہوا اس کی رو سے صوبوں کو جزوی خود اختیاری مل گئی۔ محفوظ امور گورنر اور اس کی کونسل کے زیر اختیار رہے لیکن تفویض شدہ امور گورنر اور اس کے مقرر کردہ وزرا کو دے دیئے گئے۔ ان وزرا کا تقرر صوبجاتی مجالس قانون ساز میں سے تھا، ۱۹۱۹ء کے ایکٹ میں ایک دفعہ یہ تھی کہ دس برس بعد ایک کمیشن کے ذریعے موجودہ اصلاحات کے حسن و قبح کی تحقیقات کر کے آئندہ کے دستوری نقشے پر سفارشات حاصل کی جائیں۔ سائمن کمیشن (۱۹۲۷ء) اسی دفعہ کا نتیجہ تھا۔

کمیشن نے دو مرتبہ ہندوستان کا دورہ کیا۔ پہلا دورہ فروری ۱۹۲۸ء سے لے کر اپریل ۱۹۲۸ء تک، دوسرا اکتوبر ۱۹۲۸ء سے لے کر اپریل ۱۹۲۹ء تک۔ مئی ۱۹۳۰ء میں کمیشن نے برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کی جس میں وفاقی ہند کے قیام پر زور دیا گیا۔ اس رپورٹ کا نتیجہ گول میز کانفرنس کا انعقاد تھا۔ جہاں تک ہندوستان کے نمائندوں کا تعلق تھا گول میز کانفرنس کے مذاکرات باہمی مفاہمت سے محروم رہے۔ لیکن اسی کا نتیجہ یا حاصل برطانوی حکومت کا کمیونل ایوارڈ تھا۔ جو ۱۹۳۵ء کے ایکٹ یعنی صوبجاتی خود مختاری اور مرکزی وفاق کی آئینی دستاویز کا چہرہ نما تھا۔

پہلی گول میز کانفرنس ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو منعقد ہوئی اس میں کل چھیاسی ڈیلی گیٹ شامل ہوئے۔ جن میں سولہ ہندوستانی ریاستوں، ستاون برطانوی ہندوستان اور تیرہ انگلستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کے نمائندے تھے۔ ادھر اگست ۱۹۳۰ء میں حکومت مسٹر جیکار اور سر تیج بہادر سپرو کی معرفت مہاتما گاندھی اور کانگرسی زعماء سے یرودا جیل میں بات چیت کر رہی تھی، ابتداً گفتگو ناکام ہو گئی لیکن ۲۱ جنوری ۱۹۳۱ء کو مہاتما گاندھی اور ان کے بیس رفقا یکایک رہا کر دیئے گئے۔ ۲۶ جنوری ۱۹۳۱ء کو "گاندھی ارون" میثاق ہو گیا۔ ۱۴ اگست

۱۹۳۰ء کو کانگرس نے گول میز کانفرنس میں عدم شمولیت کا فیصلہ کیا۔ لیکن سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جیکار کی درمیان داری کے باعث مہاتما جی ۲۹ اگست کو گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے راضی ہو کر انگلستان چلے گئے۔ مگر کانفرنس ہندو مسلم مسئلے میں کسی مفاہمت کے بغیر ختم ہو گئی، مہاتما گاندھی ۲۸ دسمبر ۱۹۳۱ء کو واپس بمبئی پہنچے تو ملک میں لارڈ ولنگڈن نے آرڈی ننسوں کا تشدد برپا کر رکھا تھا۔ یوپی میں تمام آرڈی ننس راج تھا۔ سرحد میں سرخپوشوں پر گولیاں چلا کر بربریت کا دور دورہ تھا اور ان کے بڑے بڑے رہنما جیلوں میں تھے، اُدھر بنگال میں بھی آرڈی نینسوں کی حکمرانی تھی۔ غرض پورا ملک جابرانہ قوانین کی بند میں تھا۔ ۱۹۳۲ء کے آغاز میں انڈین نیشنل کانگرس اور اس سے ملحقہ جماعتیں خلاف قانون قرار دے دی گئیں۔ پھر ۱۲ جون ۱۹۳۴ء کو پابندی ہٹائی گئی۔ لیکن صوبہ سرحد کی سرخپوش تنظیم، بنگال کانگرس اور ہندوستانی سیوادل پر پابندیاں بدستور عائد رہیں، بعض صوبوں میں کانگرس کی عمارتوں پر حکومت نے قبضہ کر رکھا تھا۔ ان عمارتوں کو بدستور اپنے قبضے میں رکھا اور ۱۹۳۵ء کے وسط تک واپس نہ کیا۔

ڈاکٹر سیتا رامیہ پٹا بھائی نے تاریخ کانگرس میں لکھا ہے کہ ۳۴-۱۹۳۲ء میں حکومت کے ہاتھوں سب سے زیادہ نقصان صوبہ سرحد کو برداشت کرنا پڑا۔ خان عبدالغفار خان مسلسل نظر بند رہے [illegible] ۱۹۳۴ء میں کانگرس نے سول نافرمانی کا التوا کیا اس کے تھوڑے دنوں بعد خان عبدالغفار خان رہا کر دیے گئے، لیکن وہ صوبہ سرحد میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ ۱۹۳۵ء کانگرس کی عمر کا پچاسواں سال تھا۔ نتیجۃً ۱۹۳۴ء میں سول نافرمانی کا تسلسل ماند پڑ گیا تھا اور اسی کا نتیجہ تحریک کا التوا تھا۔ لیکن ملک کے ہاتھوں سے برطانوی حکومت نکل چکی تھی۔ اس زمانے ہی میں مولانا سال بھر سے زائد عرصہ جیل میں رہے۔ [illegible] ہائی کمان رہا ہوا تو رہا ہوئے اسی دور میں انہوں نے ترجمان القرآن پر توجہ کی اور اس کی دوسری جلد لکھتے رہے۔ فی الجملہ ۱۹۳۶ء تک ان کی مشغولیت کا بڑا حصہ ترجمان القرآن کی تسوید میں صرف ہوا۔ وہ کانگرس ہائی کمان کا ممبر ہونے کے باعث اس کے مختلف جلسوں میں شریک ہوتے اور اپنی رائے دیتے لیکن عوام سے روابط کا سلسلہ ایسا منقطع کیا کہ خطابت ہی سے دستکش رہے۔ انہیں عوام میں لانا سخت مشکل تھا۔ ترجمان القرآن جلد دوم کا ابتدائیہ موتی نگر کانگرس کیمپ لکھنؤ میں ۱۳ اپریل ۱۹۳۶ء کا لکھا ہوا ہے۔ ظاہر ہے ترجمان القرآن کی دونوں جلدیں تحریک خلافت کے بعد زیر قلم آئیں اور ان کا زمانہ تصنیف شاید ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۰ء کا درمیانی عرصہ ہے۔

۱۹۳۷ء میں صوبجاتی خود مختاری کے انتخابات ہوئے تو کانگرس کو پانچ بڑے صوبوں میں کامل اکثریت حاصل ہوئی اور چار صوبوں میں وہ سب سے بڑی واحد پارٹی تھی۔ البتہ پنجاب اور سندھ میں ہندوؤں کی حد تک تو نمائندگی کا تناسب نمایاں تھا۔ لیکن مجموعاً ان دو صوبوں میں وہ کوئی طاقت نہ تھی۔ اسی طرح بنگال میں بھی اس کی تعداد وزارت سازی کے مطابق نہ تھی، لیکن کانگرس کی اس جیت نے ملکی سیاست کا پانسہ پلٹا۔ ملک کی حد تک کانگرس اور انگریز دو عظیم طاقتیں تھیں۔ انگریز حکمران تھا، اور کانگرس ملکی آزادی کی بے پناہ عوامی تحریک۔ انتخابی نتائج نے پنجاب، سرحد اور بنگال میں مسلم لیگ کی غیر اہم کامیابی کے باوجود ایک ایسا نقشہ پیدا کیا کہ مسلم لیگ پٹنہ کے اجلاس میں ایک ایسی طاقت بن گئی کہ سردار سکندر حیات اور مولوی فضل الحق نے قائداعظم کی سیاسی بیعت کر لی۔ سرحد میں تو خیر کانگرس کی واضح اکثریت کے باعث ڈاکٹر خان صاحب کی حکومت تھی۔ انھوں نے تحریک پاکستان کے شباب (۱۹۴۶ء) میں بھی اکثریت حاصل کی۔ اور انھیں پاکستان بن جانے کے بعد قائداعظمؒ نے خصوصی اختیارات سے برخاست کیا۔ مگر سندھ میں لیگ ابتداً اقتدار سے محروم رہی۔ وہاں خان بہادر اللہ بخش کولیشن بنا کے صوبے کے وزیراعظم ہوئے مگر انگریزوں سے ملی بھگت کر کے خان بہادر کھوڑو نے (۱۹ء) میں گولی سے مروا دیا اور مسلم لیگ وزارت کا راستہ صاف کیا۔

اگر یو۔پی میں کانگرس کامل اکثریت حاصل نہ کرتی اور اس کا اتحاد نواب اسماعیل میرٹھی وچودھری خلیق الزماں کی معرفت مسلم لیگ سے ہو جاتا تو ممکن تھا برِ عظیم کی آزادی کا سورج کسی اور عنوان سے طلوع ہوتا، لیکن ۱۹۳۷ء میں پنڈت جواہر لال نہرو کی بدولت معاملہ الٹ ہو گیا مولانا آزاد وزارت سازی کے لیے لکھنؤ گئے تو ان کی نواب محمد اسمٰعیل میرٹھی اور چودھری خلیق الزماں سے بات چیت ہوئی۔ وہ دونو تیار تھے کہ کانگرس کے پروگرام کی پوری پوری حمایت کریں گے اور ان کا مکمل تعاون حاصل ہوگا۔ مولانا آزاد نے ہماری آزادی میں لکھا ہے کہ "نواب صاحب اور چودھری صاحب کو قدرتاً امید تھی کہ لیگ نئی حکومت میں شریک کی جائے گی اور یہ دونو لیگ کے نمائندہ وزیر ہوں گے۔" مگر پرشوتم داس ٹنڈن سنگھٹنی ذہنیت کے نیشنلسٹ تھے۔ انھوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو متاثر کیا۔ پنڈت جی نے چودھری خلیق الزماں اور نواب اسمٰعیل میرٹھی کو لکھا کہ دونو میں سے ایک کو وزارت میں لیا جا سکتا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ صورتِ حال کچھ ایسی تھی کہ ان دو میں سے ایک نہ تو وزارت میں شامل ہو سکتا تھا اور نہ صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مفید تھا۔ نتیجۃً دونو نے معذرت کر دی اور یہ وہ دن تھا کہ تاریخ ملکی تقسیم کی طرف مڑ گئی۔ ان انتخابات میں نتائج کے اعتبار

ــ نے دو اقلیتی صوبوں، بمبئی اور یو۔ پی میں نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔ ورنہ جن صوبوں کا نام پاکستان ــوں انتخابی اعتبار سے اس کی نمائندگی کا مسئلہ ہی ناقابل اعتنا رہا۔ بنگال میں صوبائی گورنر لیگ کی وزارت ــ بنا تھا۔ لیکن کرشک پرجا پارٹی کی کامیابی نے کھیل بگاڑ دیا۔ یو۔ پی میں لیگ کی کامیابی کا ایک بہت سبب ــ علمائے ہند کا تعاون تھا۔ جمعیۃ کا خیال تھا کہ لیگ آئندہ کانگرس سے تعاون کرے گی اور وزارت میں ــتراک عمل ہو گا۔ مگر صورت حالات پلٹا کھا گئی۔ انگریز کانگرس کی کامیابی سے سیاسۃ بدحواس تھے۔

ــتے ملکی سیاست کا ایک نیا سانچہ بنانے کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کی تفریق اس طرح چلی کی کہ ــ معتمد مسلمانوں کو لیگ میں بھیجوا دیا۔ چنانچہ مسلم لیگ پٹنہ کا اجلاس ۱۹۳۸ء مسلمانوں کی اسی اجتماعی طاقت کا ــ تھا۔ اسی اجلاس میں لاہور کے فیروز الدین احمد نے پہلی دفعہ قائداعظم زندہ باد کا نعرہ لگایا اور یہی ان کا لقب ــ

ــ مولانا آزاد کانگرس ہائی کمانڈ پر کس حد تک اثر انداز ہوتے اس کا اعتراف خود گاندھی جی نے کیا تھا۔ ــ دنوں وزارتی مشن دہلی میں تھا۔ ہم کچھ دوست مہاتما جی سے ملے تو انہوں نے مولانا سے متعلق ــتے ہوئے کہا کہ وہ تاریخ کے بہت بڑے عالم ہیں اور میں تاریخی معلومات انہی سے حاصل کرتا ہوں ــت کی چھاپ کانگرس کے فیصلوں پر بہت گہری ہوتی ہے اکثر بنیادی قراردادیں ان کے قلم سے تیار ــ وہ اردو میں لکھتے جواہر لال انگریزی کرتے ہیں۔

مولانا کی وفات پر پنڈت جواہر لال نے پبلک جلسے میں جو تقریر کی اس میں بیان کیا تھا کہ:

ان کے اٹھ جانے سے ایک بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ جب کبھی ہم مشکلوں سے ــ دوچار ہوتے تو ان سے مشورہ لینے کے لیے حاضر ہوتے اور وہ ہماری ذہنی اعانت ــتے تھے۔ ان کی محیر العقول ذہانت پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل میں ہمارے لیے راہنما ــ ہوتی۔ وہ محض قادر الکلام ہی نہیں بلکہ ایک شدہ ماغ شخصیت تھے۔ فی الجملہ عطیۂ قدرت ــتھے۔ ہم نے ملک کو جس قومی جدوجہد کے لیے تیار کیا اس کے تدبر و استقلال کی جرات ــتھے۔"

ــان عبدالغفار خان حکومت پاکستان کی طویل نظربندی گزار کے رہا ہوئے تو راقم کے ہاں مہمان ــ سے کانگرس ہائی کمانڈ کے متعلق مختلف باتیں ہوئیں، ایک دن مولانا کا ذکر کرتے ہوئے

فرمایا کہ:

"کانگرس ہائی کمانڈ، گاندھی جی کی عظمت۔ جواہر لال کی شجاعت اور مولانا آزاد کی ذہانت کا نام تھا۔ وہ کانگرس کو مباحث کے نتائج تک پہنچنے میں مدد دیتے اور قراردادوں کے الفاظ انتخاب کرتے تھے، کئی دفعہ پنڈت جواہر لال نہرو کے انگریزی الفاظ تبدیل کرتے تو حیرت ہوتی کہ انہیں انگریزی الفاظ و معانی پر اتنی دستگاہ ہے:

غرض مولانا ہندوستان کے بہت بڑے عبقری تھے، لیکن ان کی عبقریت کا اعتراف معاصرت و معاندت کی نذر ہو گیا مثلاً":

۱۔ تحریک خلافت کے زمانے میں "تحریک لاتعاون" کے محرک اور "تحریک ترک موالات" کے موید تھے اس بارے میں طبقہ علماء کو قرآن و سنت سے شرعی بنیادیں مہیا کیں، حضرت شیخ الہند جیسے نابغہ اسلام اور اشجع عصر نے اس کا اعتراف کیا۔ مگر مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کی جذباتی طبیعت کو ان سے لگاوٹ تھی۔ ادھر علی گڑھ اپنے ایک عظیم فرزند کی پشت پناہ تھا۔ ادھر یو پی کا مزاج اپنے ایک سپوت کو تیاگ کر مولانا کا ساتھ دینے سے قاصر تھا۔ اُدھر خود علماء اندرخانہ مولانا سے اپنی روایتی انا کے باعث کھنچاؤ رکھتے تھے۔ فرنگی محل انہیں کیونکر مانتا، کہ وہاں مولانا عبدالباری مرشد و امام تھے اور مولانا محمد علی ان سے بیعت تھے۔ دیوبند کا حال بھی یہی تھا کہ بظاہر مولانا کا احترام کرتا لیکن اندرخانہ ان کے سر پہ اپنے ہاں کی دستار فضیلت نہ دیکھ کر کھنچاؤ رکھتا، المختصر یو پی کی سیاسی طبیعت کا میلان تھا کہ اپنے صوبے سے باہر کی عبقریت کو شاذ ہی تسلیم کرے اور یہ اُس کی افتاد طبع کا اقتضا تھا۔ اُدھر کانگرس کی لیڈر شپ میں بھی یہی رجحان غالب تھا۔

مولانا آزاد علم کی اُن بلندیوں پہ تھے کہ ان کے لیے سبھی کچھ ان کا دماغ تھا۔ وہ جلوت کے بجائے خلوت کے انسان تھے۔ معاصرت کی دیواریں پھاندنا ان کے مذاق ہی میں نہ تھا۔ وہ عوام میں گھلنے کے خلاف تھے۔ ان میں حب ذات کا مادہ بالکل نہ تھا۔ اتنے کم آمیز تھے کہ حصول آزادی کے آخری دور میں مسلمانوں نے ان کی قائدانہ آبرو کو سخت نقصان پہنچایا۔ ادھر تحریک پاکستان نے تو ہوا کا رُخ پھیر دیا۔ اُدھر احرار راہنما عقیدت کے باوجود دامن کشاں تھے۔ اُن سے جمعیۃ علماء ہند کو ارادت ضرور تھی۔ ان کے نزدیک شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی علیہ الرحمۃ ہی تھے۔

پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو اور چند دوسرے ہندو نیشنلسٹوں کے دل میں

بڑی جگہ تھی اور وہ ان کے احترام کو ملحوظ رکھتے لیکن مولانا بہرحال ہندو نہیں تھے کہ ہندو عوام کی عقیدت کے مندر یا ہیرو ورشپ کے شوالہ میں ان کی مورتی رکھتے اور ان کی عبقریت زبان زد عوام ہوتی۔ پھر مسلمانوں کی ناراضی نے مولانا کو اس درجہ نہتا کر دیا تھا کہ سردار پٹیل جیسے ہندو راہنما ان سے شدید عداوت رکھتے اور ان کی رایوں سے ٹکراتے تھے۔ پنجاب کا سکھ ان سے ناراض تھا کہ وہ ہائی کمانڈ میں ان کی دال گلنے نہیں دیتے۔ سبھاش چندر بوش انقلابی لیڈر تھے۔ آزاد ہند فوج ان کا شہ پارہ تھی۔ کانگرس سے الگ ہو گئے تو ان کی ناراضی کا شدید لہجہ مولانا کے خلاف تھا۔ وہ اپنے بیانوں میں مولانا کو مغل اعظم کہتے۔ ان کے نزدیک کانگرس کے میدان میں ان کا شہ مات کھانا مولانا کی وجہ سے تھا۔

مولانا کانگرس کے کھلے اجلاسوں میں کم ہی تقریر کرتے۔ لیکن جب کبھی کانگرس کے لیے کوئی اندرونی مشکل، بحران یا آزمائش پیدا ہوتی تو مندوبین کو قائل معقول کرنے کے لیے مولانا خطاب کرتے۔ مثلاً کانگرس سوشلسٹ پارٹی نے انڈین نیشنل کانگرس کو اپنے تصرف میں لینا چاہا تو مولانا کا تدبر مزاحم ہو گیا۔ اور کانگرس سوشلسٹ پارٹی رہ گئی۔ کمیونسٹوں کو ان کے فہم سے ہمیشہ شکست ہوئی۔ اور وہ کانگرس میں نقب لگاتے سے رہ گئے۔ گاندھی جی کے خلاف اندرخانہ بغاوت پیدا ہوتی تو اس کے روکنے میں اکثر مولانا ہی کی فراست ہوتی۔ کسی مسئلے میں کانگرس کا اجتماعی خیال مولانا کی رایوں سے مختلف ہوتا تو جن خطرات یا اندیشات کی نشاندہی مولانا کرتے آخری نتیجہ ان کے مطابق ہوتا۔ آزادی کے بعد کانگرس پر ایک سخت موڑ آگیا۔ اس کا شیرازہ ٹوٹنے لگا، لیکن مولانا کانگرس کی ناؤ کو فتح مندی کے ساتھ کنارے پر لے گئے۔ اکثر ملکی و غیر ملکی اخبار مولانا کی خطابت پر عش عش کر اٹھے۔ کانگرس کا اجلاس جلیانوالہ باغ امرتسر میں تھا۔ روزنامہ سٹیٹسمین نے لکھا:

> "مولانا آزاد نے تقریر کی تو عوام پر جادو ہو گیا، وہ نقش کالحجر ہو گئے اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک مبہوت ہو کر بیٹھے رہے۔
> مولانا بہ وجوہ مسلمانوں کی بیدردی اور ہندوؤں کی سرد مہری کا شکار رہے۔ مسلمان انہیں سیاسی مسلمان دیکھنا چاہتے تھے اور ہندوؤں کے نزدیک وہ سراپا مسلمان تھے۔ ان کا وجود صرف ان کی عبقریت تھا۔"

تحریک پاکستان کے آخری ساڑھے چھ سال میں مسلمانوں کا جوش و غضب ان کے خلاف

آتشکدہ ہوگیا. خود علمار نے اس الاؤ کا تماشا کیا۔ اکثر علمائے کرام اور فضلائے عظام جو اپنے تیئں تقویٰ وعلم کا سرچشمہ خیال کرتے تھے۔ مولانا کے خلاف عوام وخواص کی یادہ گوئی اور لیگی صحافت کی ژاژ خائی کے مزے لیتے رہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پاکستان کی ایک چوتھائی صدی ہی میں وہ خود بھی سب دشتم کا شکار ہوگئے اور نئی پود ان کے احترام سے خالی ہوگئی۔

۲۔ شاہ برطانیہ کے ولی عہد ۱۹۲۱ء میں اصلاحات کا افتتاح کرنے ہندوستان وارد ہوئے تو کانگرس نے ان کے استقبال کی تقریبات وغیرہ کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا۔ جس سے حکومت ہند بڑی مشکل میں پڑگئی۔ ولی عہد کے ہندوستان میں استقبال وقیام کا آخری مقام کلکتہ تھا۔ وائسرائے چاہتا تھا کہ وہاں استقبال عظیم ہو۔ لیکن مسٹر سی آر داس اور مولانا آزاد نے ایسی فضا پیدا کی تھی کہ بائیکاٹ مکمل تھا۔ مولانا آزاد اور سی آر داس علی پور جیل میں تھے۔ پنڈت مدن موہن مالویہ کوشاں تھے کہ حکومت اور کانگرس میں سمجھوتہ ہوجائے وہ دہلی میں وائسرائے سے مل کر علی پور جیل میں مسٹر داس اور مولانا سے ملے اور ان سے کہا کہ ہم اگر کلکتے میں ولی عہد کا بائیکاٹ نہ کریں تو حکومت کانگرس سے کوئی معاملہ کرلے گی، ان کی تجویز تھی، ہندوستان کے سیاسی مستقبل کو طے کرنے کے لیے ایک گول میز کانفرنس بلائی جائے، مولانا اور داس باہمی مشورے کے بعد گول میز کانفرنس کی تجویز پر راضی ہوگئے لیکن یہ شرط لگائی کہ گول میز کانفرنس سے پہلے تمام کانگرسی راہنما رہا کیے جائیں۔ مالویہ جی سے کہا کہ وہ گاندھی جی سے مل کر ان کی رضامندی حاصل کریں۔ گاندھی جی اس وقت قید میں نہیں تھے، وائسرائے راضی ہوگیا۔ لیکن اس غرض سے مسٹر داس اور مولانا نے جو بیان تیار کیا مالویہ جی وہ بیان لے کر گاندھی جی کے پاس بمبئی گئے، انہوں نے منظور نہ کیا۔ انہیں اصرار تھا کہ پہلے تمام سیاسی لیڈر بالخصوص علی برادران رہا کیے جائیں پھر گول میز کانفرنس کی تجویز پر غور ہو۔ اس آمدورفت اور بات چیت میں ولی عہد کا سفر ختم ہوگیا۔ کلکتے میں مقاطعہ جوش پر رہا۔ ولی عہد چلے گئے تو وائسرائے نے گفتگو ہی ختم کردی۔ اب گاندھی جی نے بمبئی میں سنکرن نائر کے زیر صدارت گول میز کانفرنس بلوانے کا ذکر کیا تو وائسرائے نے رسید ہی نہ دی۔ ناگہاں چورہ چوری کے حادثے پر گاندھی جی نے تحریک موقوف کردی۔ اس کا سیاسی حلقوں میں شدید ردعمل ہوا اور سارے ملک میں شکست کی فضا پیدا ہوگئی۔ حکومت نے اس فضا کو غنیمت سمجھ گاندھی جی کو پکڑ لیا انہیں چھ برس قید کی سزا دی۔ نتیجۃً عدم تعاون کی تحریک دم توڑ کر ختم ہوگئی۔

مسٹر داس نے محسوس کیا کہ اب ۱۹۲۴ء میں قانون ساز مجلسوں پر قبضہ کر کے سیاسی نصب العین

کے حصول کا ذریعہ بنانا چاہیے وہ گیا کانگریس د ۱۹ء) کے لگ بھگ رہا ہوئے انہیں استقبالیہ کمیٹی نے صدر منتخب کیا۔ پنڈت موتی لال نہرو، مسٹر وٹھل بھائی پٹیل اور حکیم اجمل خان نے ان کی تجویز سے اتفاق کیا۔ لیکن راج گوپال آچاریہ، مسٹر ولبھ بھائی پٹیل اور بابو راجندر پرشاد متفق نہ ہوئے۔ ان کا استدلال تھا کہ حکومت اس سے یہ نتیجہ نکالے گی کہ گاندھی جی کی قیادت سے انحراف کیا گیا ہے۔ کیونکہ گاندھی جی ۱۹۲۱ء میں کونسلوں کے بائیکاٹ کا فیصلہ کرا چکے ہیں۔ اب ان کی غیر حاضری میں اس فیصلے کا استرداد ان پر عدم اعتماد کے مصداق ہوگا۔ جب مسٹر داس کی تجویز کانگریس کے اجلاس میں رہ گئی تو وہ صدارت سے مستعفی ہو گئے اور کانگریس چینجرز اور نو چینجرز کے دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ آپس میں تھکا فضیحتی ہونے لگی جس سے ایک شدید انتشار پیدا ہو گیا۔ کوئی چھ ماہ بعد مولانا قید سے رہا ہوئے تو انتشار شباب پر تھا۔ دونو فریق میں ساتھ ملانے کے خواہاں تھے۔ اور دونو کو ان پر اعتماد تھا، حالات خراب ہونے لگے تو مولانا کو کانگریس کے سپیشل اجلاس دھلی کا صدر منتخب کیا گیا، مولانا کی فراست نے اتحاد کی نیو اٹھا دی۔ فیصلہ ہو گیا کہ دونو فریق آزادی کے ساتھ اپنے پروگرام پر عمل کر سکیں گے۔ چینجرز نے سوراج پارٹی قائم کی اور نو چینجرز نے تعمیری کام شروع کیا۔ انتخاب میں سوراج پارٹی جیت گئی۔ مسٹر وٹھل بھائی پٹیل سنٹرل اسمبلی کے پریذیڈنٹ منتخب ہوئے۔ ان کا صدارتی زمانہ ایوان کی جگر داری کا دور تھا، ملک میں آزادی کی ایک لہر پیدا ہو گئی۔ سوراج پارٹی نے مہاتما جی کی رہائی کا ریزولیوشن پیش کیا، حکومت نے ریزولیوشن منظور ہونے سے قبل ہی انہیں رہا کر دیا۔

مولانا نے اپنے سوانح "ہماری آزادی" میں مسٹر سی آر داس کی حب الوطنی کو بے حد سراہا ہے اور ۱۹۲۰ء کے ایک مقالے میں بھی ان کے تدبر کی تحسین کی ہے۔ مولانا کا خیال تھا کہ وہ زندہ رہتے تو ملک کا سیاسی مقدر مختلف ہوتا۔ ان کی رحلت کے بعد ان کے پیرووں نے ان کے خیالات کی اس طرح تنقیص کی۔ تعصبات سے مسلمانوں کو نہ صرف کانگریس سے بدظن کر دیا بلکہ ملک کی تقسیم کا ذہنی آغاز ہو گیا۔

پنڈت موتی لال نہرو نے انہی دنوں بیان دیا تھا کہ "مولانا آزاد ۱۹۲۳ء میں آڑے نہ آتے تو کانگریس ضعف میں شکار ہوتی۔ اور یہ ملک کا نقصان ہوتا۔"

مولانا ۱۹۲۳ء میں کانگریس کے سب سے کم عمر صدر تھے۔ اور جواہر لال ۱۹۲۹ء میں نوجوان صدر گئے گئے لیکن وہ مولانا سے دو سال بڑی عمر میں صدر ہوئے۔ مولانا کے ساتھ دولت کا گھمنڈ نہ تھا، وہ فقر و استغنا

کے انسان تھے۔ ان کی صدارت کا سبب ان کا علم اور ان کا فہم تھا۔

۳۔ کانگرس ۱۹۳۵ء کی آئینی اصلاحات کے تحت صوبجاتی خودمختاری کے انتخابات میں حصہ لینے کے لیے تیار نہ تھی اس کا خیال تھا کہ انتخابی وزارتوں کے باوجود اختیارات گورنروں ہی کے ہاتھ میں رہیں گے۔ گورنر وسیع الاختیار ہونے کے باعث جب چاہے گا وزارتوں یا اسمبلیوں کو توڑ دے گا۔ ادھر مرکز کا نقشہ بھی ایک کمزور وفاق کا تھا جس میں والیان ریاست کا پلہ بہت بھاری رکھا گیا۔ اور ان سے یہی توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ خلقتہً ملک کے برطانوی حاکموں کا ساتھ دیں گے، کانگرس کا نصب العین ہندوستان کی مکمل آزادی تھا، اس کے نزدیک صوبجاتی خودمختاری ایک کھڑاگ تھا۔ چنانچہ کانگرس کی عاملہ کے بیشتر ارکان صوبجاتی انتخابات میں حصہ لینے کے خلاف تھے۔ مولانا آزاد کی رائے تھی کہ انتخابات کا بائیکاٹ کرنا غلط ہوگا۔ اس طرح وہ لوگ منتخب ہوکر ہندوستانی قوم کے نمائندے بن بیٹھیں گے جو حقیقی نمائندہ نہیں ہوں گے۔ اس کے علاوہ مولانا کا خیال تھا کہ انتخابات عوام کی سیاسی تعلیم اور بنیادی مسائل سے آگاہی کے لیے ایک بے مثل ذریعہ ہیں۔ بالآخر مولانا نے عاملہ کو موافق کرلیا اور وہ انتخابات میں حصہ لینے کے لیے تیار ہوگئی۔ اتنی بڑی کامیابی کے بعد کانگرس کے رہنماؤں میں وزارتیں بنانے پر اختلاف تھا۔ جو لوگ انتخابات ہی میں حصہ لینے کے خلاف تھے۔ ان کا نقطہ نگاہ تھا کہ صوبجاتی خودمختاری ڈھکوسلا ہے۔ گورنروں کے خاص اختیارات وزارتوں کی خرابی و رسوائی کا باعث ہوں گے، وزارتیں نہ بنانا بہتر ہے۔ مولانا کی رائے تھی کہ صوبجاتی حکومتوں کو جو اختیارات دیئے گئے ہیں ان سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ جب گورنروں سے تصادم ہو تو اس وقت مناسب قدم اٹھایا جاسکتا ہے۔ اس ٹکراؤ سے عوام میں کانگرس کی طاقت بڑھے گی۔

گورنروں نے کانگرس کے اس تذبذب و تامل کو وزارت سازی کے مسئلے میں حتمی گردان کر ان پارٹیوں کو دعوت دی جن کی کانگرس کے بعد اسمبلی میں اکثریت تھی ان لوگوں نے وزارتیں بنالیں جن کانگرس کے ہاتھوں شکست خوردہ عناصر نے سنبھالا لیا، اور اپنی اڑانوں کے لیے پر پرزے جمع کیے۔ وائسرائے نے کانگرس کے زعماء سے جو بات چیت کی اس میں گورنروں کی مداخلت کا معاملہ صاف کردیا کہ کانگرسی رہنماؤں کے تمام خدشے محض سوچ کی گرہیں ہیں۔ اس سے کانگرس کی عاملہ میں عہدے قبول کرنے کا رجحان پیدا ہوگیا۔ اس دوران میں کانگرس عہدے قبول کرنے کے خلاف ایک فضا پیدا کرچ

تھی، پنڈت جواہر لال نہرو صدر تھے۔ وہ عہدوں کے خلاف قطعی طور پر بیان دے چکے تھے اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے ورکنگ کمیٹی کا اجلاس واردھا میں ہوا تو اس بارے میں سب پس و پیش کر رہے تھے، مولانا نے عہدے قبول کر لینے کے نقطہ نگاہ کی تحریک کی ایک طویل بحث کے بعد گاندھی جی نے مولانا سے اتفاق کیا تو عاملہ رضامند ہو گئی۔

ہائی کمانڈ نے ایک پارلیمنٹری بورڈ بنایا جو کانگرسی وزارتوں کی نگرانی کے علاوہ انہیں عمومی ہدایتیں دینے کا مجاز و مسئول تھا، مولانا آزاد، سردار پٹیل اور ڈاکٹر راجندر پرشاد ممبر نامزد کئے گئے، اس بورڈ نے تقسیم کار کی بنگال، بہار، یوپی، پنجاب، سندھ اور سرحد کے پارلیمانی معاملات مولانا کے سپرد کئے گئے اور وہ ان کے انچارج ہوئے۔ ابھی وزارتوں کا بننا ہی تھا کہ کانگرس کے خلاف ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔

مسلم لیگ نے کانگرس کے خلاف استحصالی اقتدار کا پروپیگنڈہ شروع کیا۔ تمام ملک میں الزامات لگائے گئے کہ فلاں فلاں صوبے میں کانگرسی وزارتیں مسلمانوں سے فلاں فلاں ناانصافی کر چکی ہیں اور ان میں فلاں فلاں تشدد ہو رہا ہے۔

لیگ نے اسی غرض سے کئی ایک تحقیقاتی کمیٹیاں بنائیں۔ ان کمیٹیوں نے اپنی رپورٹیں مرتب کیں۔ یہ ایک سیاسی جنگ تھی، لیگ کانگرس کو مسلمانوں سے تمام و کمال محروم کرنا چاہتی تھی اور وہ اس باب میں روز بروز کامیاب ہوتی گئی۔ کانگرس وزارتوں نے لیگ کے تمام الزامات کا جواب دیا، مختلف کتابچے شائع کئے۔ اگر کوئی واقعہ کسی وزیر کے فساد نیت سے ہوا تھا تو اس وزیر کو سزا دی گئی۔ ایک آدھ وزیر کو ننگ کیا گیا لیکن بعض الزامات معمولی نوعیت کے برائے وزن بیت تھے۔

کانگرس کے جوابی کتابچے جو مختلف صوبوں کی وزارتوں نے شائع کئے ان میں یوپی وزارت کے کتابچوں کی پیشانی پر بسم اللہ الرحمن لکھا ہوتا اور وہ نہایت شستہ اردو میں تھے۔ لیکن لیگ سیاسی جدوجہد کے میدان میں تھی اس کے نزدیک ہر صفائی مجرمانہ تھی وہ لوگ جو انگریزوں کے ہاتھوں قومی و فردی ذلت سہنے کے عادی تھے کانگرس وزارتوں کے خلاف ڈھونڈ ڈھونڈ کر جرم تلاش کرتے اور ان کی صفائی کو بھی جرم ہی کا حصہ قرار دے کر مسلمانوں کو بھڑکاتے تھے، یہ ایک سیاسی عمل تھا ظاہر ہے کہ جنگ اور سیاست میں ہر قسم کے حربے کام آتے ہیں، لیگ نے یہی کیا، جو لوگ انگریزوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے روزمرہ قتل پر چوں نہیں کرتے تھے بلکہ اسلامی سلطنت کی بربادی پر برطانوی حکمرانوں کے لیے سپاسنامے لے کر حاضر

ہوئے تھے، وہ انفرادی واقعات کو رنگ دے کر کانگرس کے خلاف اچھالتے رہے، یہی ذہن ہندوستان کی تقسیم کے بعد شکایتی صوبوں میں مسلمانوں کی ایک بڑی تباہی کا باعث ہوا، حتیٰ کہ ان کا وجود شل ہو گیا اور ان کے لیے نظر بظاہر تین راستے رہ گئے۔

۱۔ بھاگ کر پاکستان چلے جائیں جو سب کے لیے ناممکن تھا۔

۲۔ ارتداد قبول کر لیں جو ان کے لیے زندہ قتل تھا۔

۳۔ ہندوستان میں مدۃ العمر اس طرح رہیں جس طرح ایک اپاہج دوسروں کے رحم و کرم پر رہتا ہے۔

مولانا نے "ہماری آزادی" میں لکھا ہے کہ "لیگ کے الزامات بالکل بے بنیاد تھے اور یہی رائے وائسرائے کے علاوہ صوبوں کے گورنروں کی تھی، اگر ان میں حقیقت کا شائبہ ہوتا تو وہ تدارک کرتے ورنہ عدم تدارک کی صورت میں مستعفی ہو جاتے لیکن یہ زمانہ ہندوستانی سیاست کے لیے بعض نئے سانچوں کی ڈھلائی کا تھا۔ انگریزوں پر واضح ہو رہا تھا کہ ہندوستان میں ان کے اقتدار کی عمر کا آخری زمانہ ہے۔ کانگرس کو اپنی طاقت کے عظیم ہونے کا یقین ہو چکا تھا اور لیگ ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندہ سیاسی طاقت کا ظہور تھا۔

خوبصورت لوگوں کی سرزمین

دوسری جنگِ عظیم کے دوران

دوسری جنگ عظیم ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو شروع ہوئی۔ آغاز اچانک نہیں تھا، آثار موجود تھے اور کسی وقت بھی جنگ چھڑ جانے کا امکان تھا۔ ہٹلر کا فاشزم معاہدہ ورسائی کا ردِ عمل تھا۔ جنگ اس وقت یقینی ہو گئی جب آسٹریا جرمنی میں شامل ہوا، اور ہٹلر نے سوڈیٹن لینڈ کا مطالبہ شروع کیا، مسٹر چیمبرلین برطانیہ کے وزیراعظم تھے۔ انہوں نے میونخ کا سفر کیا۔ برطانیہ اور جرمنی میں سمجھوتہ ہو گیا، لیکن جنگ نہ ٹلی۔ چیکوسلاواکیہ کا ایک حصہ جنگ کے بغیر ہی جرمنی نے سنبھال لیا۔ جنگ چھڑ گئی تو جرمنی نے پولینڈ پر ہاتھ صاف کیا۔ ادھر روس نے بھی اس کے نصف مشرقی حصے پر قبضہ کر لیا۔

ہندوستان سیاسی دوراہے پر تھا، حکومت نے جنگ کے یقینی خدشات کو ملحوظ رکھتے ہوئے آرمی ایکٹ پاس کر دیا تھا کہ امورِ جنگ کی مخالفت مستوجبِ سزا ہے۔ پھر جنگ ناگزیر ہو گئی اور وزیراعظم برطانیہ نے اعلانِ جنگ کیا۔ وائسرائے نے بھی شرکتِ جنگ کا اعلان کر دیا کہ ہندوستان برطانیہ کے ساتھ ہے۔ صوبوں کی حکومتوں سے پوچھنا تو ایک طرف رہا سنٹرل اسمبلی جو ۱۹۳۵ء کے آئینی سفر سے پہلے کی یادگار تھی اس سے بھی استفسار نہ کیا گیا۔ ڈیفنس آف انڈیا رولز فوراً نافذ کیے گئے۔ وائسرائے نے پہلے ہندوستان کو شریکِ جنگ کیا۔ پھر مرکزی اسمبلی سے رسماً رجوع کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ہندوستان کا عوامی یا قومی فیصلہ نہ تھا۔ ملک معظم کے نائب اور سلطنت برطانیہ کے نمائندہ نے اس کا فیصلہ کیا اور سارے ملک کو جنگ میں دھکیل دیا۔ ملک کی چھوٹی بڑی سیاسی جماعتوں میں سے کسی نے جنگ میں شمول کا اعلان نہ کیا اور نہ برطانوی سرکار کی ہندوستانی گورنمنٹ نے اعلان سے پیشتر ان سے پوچھا۔ چونکہ ہندوستان غلام تھا لہٰذا وائسرائے اس کو جنگ میں جھونک دینے کا مجاز تھا۔

مارچ ۱۹۳۹ء میں یعنی چھ ماہ پہلے کانگرس نے تری پورہ کے اجلاس میں برطانیہ کی خارجہ پالیسی پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے معاہدہ میونخ کے علاوہ برطانوی اطالوی معاہدے اور ہسپانیہ کے باغیوں کی حکومت کو تسلیم کرنے کی صورتِ حال کو جمہوریت سے غداری، لگاتار عہد شکنی اور اجتماعی تحفظ کے نظام کی بیخ کنی قرار دیا اور بین الاقوامی فساد کے نشوونما پانے کا مسئول ٹھہرایا تھا۔

جنگِ یورپ ابھی سروں پہ منڈلا ہی رہی تھی تو یورپ وامریکہ کی بعض انجمنوں کے افراد گاندھی جی کی بین الاقوامی شخصیت سے اپیلیں کر رہے تھے کہ وہ جنگ کو رکوانے کے لیے کوئی تدبیر کریں۔ گاندھی جی بقول "آزاد" ان دنوں شدید ذہنی بحران سے گذر رہے تھے ان کا اندرونی کرب بڑھ رہا تھا، ان کی رائے تھی کہ ہونے والی جنگ میں ہندوستان کو کسی حالت میں بھی شریک نہ ہونا چاہیئے خواہ شرکت کرنے سے ہندوستان کو آزادی ملتی ہو۔ مولانا آزاد کا خیال تھا کہ یورپ دو حصوں میں بٹ گیا ہے، ایک نازی ازم اور فاشزم کا بلاک ہے دوسرا جمہوری طاقتوں کا نمائندہ ہے۔ ہندوستان کو جمہوری طاقتوں کا ساتھ دینا چاہیئے۔ بشرطیکہ ہندوستان آزاد ہو، البتہ غلامی کی زنجیریں پہن کر ہندوستان جمہوریت کے لیے نہیں لڑ سکتا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کو بحیثیت مجموعی مولانا سے اتفاق تھا اور وہ گاندھی جی کے جنگ بند کرنے کے نظریے سے متفق نہ تھے۔ کانگرس نے اعلانِ جنگ کے آٹھ روز بعد ۱۰ ستمبر کو واردھا میں اجلاس کیا۔ وائسرائے کے اعلان جنگ کو ہندوستانی رائے عامہ کی تحقیر گردانتے ہوئے اس کے استرداد کا اعلان کیا، اور مرکزی قانون ساز اسمبلی کے کانگرسی ممبروں کو ہدایت کی کہ وہ سنٹرل اسمبلی کے آئندہ سیشن میں شریک نہ ہوں کانگرس کی عاملہ نے اپنی قرارداد میں برطانوی عزائم کو مدبرانہ الفاظ میں جھٹلاتے ہوئے فاشزم اور امپیریلزم دونوں کو آڑے ہاتھوں لیا قومی آزادی کو انسانیت کی مشترکہ میراث قرار دیتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ اس صورت ہی میں جنگ کے متعلق فیصلہ کر سکتی ہے کہ ہندوستان کی آزادی کو تسلیم کر لیا جائے اور وہ (ہندوستان) ایک آزاد قوم کی حیثیت سے جمہوریت کش طاقتوں سے برسرِ پیکار ہو۔

یہ دور ہندوستان ہی کے لیے نہیں تمام دنیا کے لیے نازک تھا۔ کانگرس ایک زبردست معرکے کے موڑ پر تھی۔ ہندوستان جنگ میں شریک ہو یا اپنی آزادی کے لیے جدوجہد کرے۔ یہی دو چیزیں اس کے سامنے تھیں، سوال تھا کہ اس کا فیصلہ کن دور میں، کانگرس کا صدر کون ہو، کانگرس کی نگاہ انتخاب مولانا پر تھی پہلے سال مولانا اس خواہش کو رد کر چکے تھے اب مرحلہ نازک بھی تھا اور سنگین بھی۔ گاندھی جی نے بھی

دوستوں نے اصرار کیا کہ وہ صدارت قبول کریں۔ چنانچہ مولانا راضی ہو گئے۔ مسٹر ایم این رائے مقابلے میں تھے جو معمولی سے ووٹ حاصل کر کے رہ گئے۔ مولانا نے رام گڑھ کانگرس کے سالانہ اجلاس کی صدارت فرمائی اور جو خطبہ پڑھا اس میں جنگ سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا، وہی کانگرس کی اس قرارداد کی اساس تھے جو اس اجلاس میں منظور کی گئی۔ مختصراً یہ کہ ہندوستان اس صورت ہی میں شریک جنگ ہو سکتا ہے کہ اس کو آزادی دی جائے اور ملک برطانوی استیلا و استحصال سے کاملاً آزاد ہو۔ ادھر کانگرس ہائی کمانڈ کے حکم پر ستمبر ۱۹۳۹ء میں کانگرس کی صوبائی وزارتوں نے استعفیٰ دے دیا۔

مولانا کی صدارت سے پہلے سبھاش چندر بوس سے گاندھی جی کا تنازعہ اس طرح ختم ہوا تھا کہ سبھاش صدارت سے مستعفی ہو گئے ان کی جگہ راجندر پرشاد صدر بنائے گئے لیکن فضا کی تلخی کے باعث جواہر لال ورکنگ کمیٹی میں شامل نہ ہوئے۔ مولانا نے انہیں راضی کیا تو شامل ہو گئے۔

مولانا ہندوستان کی آزادی کے حصول پر اتحادیوں کے ساتھ جنگ میں شامل ہونے کو تیار تھے لیکن گاندھی جی کاملاً اہنسا (عدم تشدد) کے داعی تھے۔ وہ کسی حالت میں بھی جنگ نہیں چاہتے تھے۔ مولانا کا نقطہ نگاہ تھا کہ عدم تشدد مصلحت کی بات ہے عقیدے کی نہیں، گاندھی جی نے عقیدہ بنا لیا تھا۔ مولانا لکھتے ہیں کہ:

> "جواہر لال نہرو، سردار پٹیل، راجگوپال آچاریہ اور خان عبدالغفار خاں بحث کی ابتدائی منزلوں میں ان کے ہم خیال تھے لیکن راجندر پرشاد، اچاریہ کرپلانی اور شری شنکر راؤ دیو گاندھی جی کے مرید تھے۔"

جولائی ۱۹۴۰ء میں کانگرس کی مجلس عاملہ نے اپنے اجلاس منعقدہ پونا میں مولانا کے خیالات کی تائید کی۔ قرارداد کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستان کی جنگ آزادی کی بنیاد تو عدم تشدد پر ہے، لیکن فاشزم اور نازیت کی جنگ میں ہندوستان اپنی کامل آزادی کے بعد ہی جمہوری طاقتوں کا ساتھ دے سکتا ہے۔

سردار پٹیل نے پونا میں جنگ کے سوال پر مولانا کی ہمنوائی کی لیکن پھر ایک مہینے کے اندر اندر اپنی رائے بدل لی اور گاندھی کے ہم خیال ہو گئے کہ وہ ہر حالت میں اہنسا کے طرفدار ہیں۔ جولائی ۱۹۴۰ء میں راجندر پرشاد اور بعض دوسرے ممبروں نے مولانا کو خط لکھا کہ

جنگ کے بارے میں انہیں گاندھی جی کے خیالات سے اتفاق ہی نہیں عقیدت بھی ہے

اور وہ چاہتے ہیں کہ کانگرس ان کی پیروی کرتی رہے، لیکن چونکہ صدر (مولانا) کو ان سے اختلاف ہے اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ ورکنگ کمیٹی کے ممبر نہ رہیں۔"

اس خط پر جواہر لال نہرو، راجگوپال آچاریہ، آصف علی اور سید محمود کے سوا تمام ممبروں کے دستخط تھے۔ مولانا لکھتے ہیں۔ انہیں سخت تکلیف ہوئی کہ خان عبدالغفار خان جو ان کے مخلص و معتمد ہم خیالوں میں تھے، گاندھی جی کے موافق ہو گئے۔ مولانا نے اس خط کو ان دنوں خفیہ رکھا اور ساتھیوں کو لکھا کہ برطانوی حکومت ہندوستان کی آزادی کو تسلیم نہیں کرے گی اور جنگ میں ہماری شرکت کا سوال محض ایک علمی مسئلہ رہے گا۔ مولانا کے ان دلائل سے وہ ساتھی راضی ہو گئے اس طرح استعفیٰ کا بحران ٹل گیا۔

وائسرائے نے اگست ۱۹۴۰ء میں مولانا کو دعوت دی کہ وہ ان سے ملیں تاکہ ایگزیکٹو کونسل کے ارکان و اختیارات بڑھا دیئے جائیں اور اس طرح کانگرس حکومت میں شریک ہو جائے۔ مولانا نے انکار کر دیا۔ بعض ساتھیوں کا خیال تھا کہ مولانا مل لیتے تو مفید تھا، لیکن مولانا نے ملاقات کو نہ صرف بے معنی سمجھا بلکہ جواب اس غزل تھا۔ گاندھی جی نے جنگ کے شروع میں وائسرائے کو ملاقات کے لیے لکھا تو اس نے انکار کیا تھا۔ مولانا کے انکار پر اخبارات نے سرخی جمائی کہ مولانا کی نہ (NO) وائسرائے کی اس نہ (NO) کا جواب ہے۔" گاندھی جی نے مولانا کے نام ایک خط میں اس نہ (NO) کی تائید و تحسین کی۔

حکومت و کانگرس کی کھینچا تانی غیر مختتم تھی برطانوی سرکار کی منشا رکانگرس کے نزدیک قومی آزادی کی حمیت کے خلاف تھی، اور برطانوی سرکار کا ہندوستان کو آزاد کرنا۔ اس کے مفادات کی نفی تھا نتیجتہً کانگرس نے انفرادی ستیہ گرہ کا فیصلہ کیا۔ مولانا برطانوی سرکار کے خلاف زیادہ وسیع و شدید تحریک چلانے کے متمنی تھے۔ لیکن گاندھی جی انفرادی ستیہ گرہ سے آگے بڑھتے نہیں تھے۔ چنانچہ گاندھی جی کے آشرم کے ایک درویش ونوبا بھاوے پہلے ستیہ گرہی نامزد کیے گئے۔ دوسرے پنڈت جواہر لال نہرو۔ اس طرح ہندوستان میں ایک علامتی تحریک پیدا ہو گئی، مولانا پنجاب سے لوٹ رہے تھے کہ الہ آباد ریلوے اسٹیشن پر گرفتار کر لیے گئے۔ انہیں دو برس کی سزا دے کر نینی جیل میں رکھا گیا۔ جنگ اس تیزی سے الٹ پلٹ رہی تھی کہ اتحادیوں کو شکستوں پر شکستیں ہو رہی تھیں، ادھر ان دو واقعات نے دنیا کو ہلا دیا اور جنگ خونخوار عفریت ہو گئی جون ۱۹۴۱ء میں جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا۔ دوسرا اس کے چھ مہینے بعد جاپان نے پرل ہاربر (امریکہ) میں جنگ

چھیڑ دی، اس طرح تمام دنیا عالمگیر جنگ کی لپیٹ میں آگئی، جاپان نے چند ہفتوں ہی میں ملایا اور سنگاپور کو فتح کرلیا، پھر برما پر قبضہ کیا، اس سے آگے ہندوستان تھا، خلیج بنگالہ میں جاپانی جہاز پھرنے لگے تھوڑے ہی دنوں میں ان کا انڈیمان اور نکوبار پر قبضہ ہوگیا۔ امریکہ شروع سے برطانیہ پر زور دے رہا تھا کہ ہندوستان سے سمجھوتہ کرے اب اس نے زیادہ دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ ہندوستان سے مسئلہ طے کیا جائے۔ چنانچہ ہونا یہ تھا برطانیہ کو مفاہمت کی خواہش پیدا ہوئی۔ چرچل برطانوی قدامت پسند تھا اس نے دوسری گول میز کانفرنس کے دنوں میں گاندھی جی کے لنگوٹ سمیت بکنگھم پیلس (شاہی محل) میں داخل ہونے پر احتجاج کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

"وہ برداشت نہیں کر سکتا کہ ایک ننگ دھڑنگ فقیر برطانوی سلطنت کی شاہانہ عظمت کے خلاف آداب شاہی کو سترد کرتا ہوا بکنگھم پیلس میں داخل ہو۔ یہ اس عظیم فرماں روا کی توہین ہے جس کی سلطنت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا ہے۔"

صدر روزویلٹ نے اس چرچل کو جھکا دیا کہ اس کی حکومت ہندوستان سے بات چیت کرے چنانچہ دسمبر ۱۹۴۱ء میں مولانا آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو ایک ایک رہا کر دیئے گئے۔ گاندھی جی باردولی میں تھے مولانا نے ورکنگ کمیٹی کا اجلاس وہاں طلب کیا مولانا لکھتے ہیں کہ:

"گاندھی جی سے ملتے ہی مجھے احساس ہوا کہ ہم دونوں پہلے سے بھی زیادہ ایک دوسرے سے دور ہوگئے ہیں، پہلے ہمارے درمیان اصول کا اختلاف تھا، اب حالات کا جائزہ لے کر بنیادی طور پر ہم مختلف نتیجے نکال رہے تھے۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ برطانوی حکومت ہندوستان کو آزاد کرنے پر تیار ہوگئی ہے، میں سمجھتا تھا کہ برطانوی حکومت یہ تو چاہتی ہے کہ ہم اس سے تعاون کریں۔ لیکن وہ اب بھی ہندوستان کو آزاد کرنے کے لیے تیار نہیں۔ جنگ کے دوران برطانوی حکومت زیادہ سے زیادہ یہ کرے گی کہ ایک نئی ایگزیکٹو کونسل بنائے جس کے اختیارات زیادہ ہوں اور کانگرس کو اس میں کافی نمائندگی دے۔"

مولانا نے اپنی رہائی کے تھوڑا عرصہ بعد ایک پریس کانفرنس میں غیر ملکی اخبار نویسوں کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ:

"جنگ کے متعلق کانگرس کی پالیسی عقیدے کی نہیں، اگر جاپان ہندوستان پر حملہ کرے تو ہر ہندوستانی کو ہاتھ میں تلوار لے کر ملک کا تحفظ کرنا چاہیئے۔ لیکن یہ ہم اسی صورت میں کر سکتے ہیں کہ وہ زنجیریں کھول دی جائیں جن میں ہمارے ہاتھ پاؤں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس پابہ زنجیری کے ساتھ ہم کیسے لڑ سکتے ہیں؟"

لندن کے "ٹائمز" اور "ڈیلی نیوز" نے اس پریس کانفرنس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

"معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی جی اور کانگرس کے لیڈروں کے درمیان اختلافات ہیے۔"

گاندھی جی نے باردولی کے اجلاس میں اسی تبصرہ کا ذکر کیا۔ ادھر ۲۶ جنوری ۱۹۴۱ء کو سبھاش چندر بوس ہندوستان سے فرار کر گئے، مارچ ۱۹۴۲ء میں برلن ریڈیو سے ان کی تقریر نشر ہوئی تو معاملہ صاف ہو گیا کہ وہ کہاں ہیں اور کس محاذ پر ہیں۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ اتحادی کامیاب نہیں ہوں گے اور فتح جرمنی و جاپان کی ہوگی۔ ان دنوں چین کے سربراہ جنرل چیانگ کائی شیک تھے وہ بھی انگریزوں پر زور دے رہے تھے کہ ہندوستان سے سمجھوتہ کریں، جاپان کے پرل ہاربر پر حملے سے یہ اصرار اور بڑھ گیا۔ ادھر اس حملے سے خود چینی حکومت کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔

جواہر لال نہرو جنگ سے کچھ پہلے جنوبی چین گئے اور چیانگ کائی شیک کے مہمان ہوئے تھے، جنرل نے جنگ کے دوران مولانا کو خط لکھا کہ انہیں ہندوستان کی فکر ہے اور وہ اس کے عوام کی تمناؤں اور حوصلوں سے ہمدردی رکھتے ہیں، مولانا نے جواب دیا کہ وہ ہندوستان آئیں اور وائسرائے کے علاوہ کانگرس کے رہنما سے ملاقات کر کے اندازہ لگائیں کہ مفاہمت کی تدبیر کیا ہو سکتی ہے، چیانگ کائی شیک فروری ۱۹۴۲ء کو دہلی پہنچے وہ چینی کے سوا اور کوئی زبان نہیں جانتے تھے، مولانا لکھتے ہیں کہ وہ اور جواہر لال نہرو ان سے ملے تو زبان کی دقت کے باعث ان سے گفتگو سست اور کسی قدر رسمی ہو گئی لیکن مادام چیانگ کائی شیک کی وجہ سے کہ وہ انگریزی جانتی تھیں، بات چیت میں سہولت ہو گئی، چیانگ سے گاندھی جی کی ملاقات بھی تو وہ چیانگ کو متفق نہ کر سکے۔

آخر چیانگ، مولانا اور پنڈت سے مطالعاتی تاثر لے کر روانہ ہو گئے، انہوں نے مراجعت سے پہلے ایک بیان میں برطانیہ سے اپیل کی کہ جس قدر جلد ممکن ہو وہ ہندوستان کو سیاسی اختیارات سونپ دے کہ ان حالات میں جمہوریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہندوستان کی آزادی کا اعتراف و اعلان

خروری ہے۔

روز ویلٹ اور چیانگ کائی شیک کے اصرار اور دباؤ کا نتیجہ تھا کہ چرچل نے سر کرپس کو ہندوستان سے مصالحت کی گفتگو پر مامور کیا۔ اس کا اعلان ۱۱ مارچ کی شام کو ۸ بجے بی بی سی سے ہوا، اخبار نویسوں نے فوراً ہی مولانا سے ردِ عمل دریافت کیا تو مولانا نے کہا کہ:

"میں اس وقت کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ جب تک صحیح تفصیلات معلوم نہ ہوں، البتہ ایک پرانے دوست کی حیثیت سے میں ان کا خیر مقدم کروں گا۔"

مولانا واردھا ہی میں تھے کہ وائسرائے کا تار ملا، مولانا نے دعوت قبول کر لی، کرپس نے کانگرس کے علاوہ لیگ کے لیڈروں کو بھی مدعو کیا۔ اس کے علاوہ والیان ریاست کے نمائندوں ہندو مہا سبھا اور خان بہادر اللہ بخش کو بھی دعوت دی گئی۔ مولانا کی کرپس سے پہلی ملاقات ۲۴ مارچ ۱۹۴۲ء کو ہوئی۔ سر کرپس نے اپنی تجاویز کا خاکہ مولانا کو دیا اور دریافت کیا کہ جنگ سے متعلق گاندھی جی کے خیالات ڈھکے چھپے نہیں وہ تو کسی حالت میں بھی جنگ میں شریک نہیں ہونا چاہتے۔ آپ کے (مولانا) خیالات کی اساس پر سمجھوتہ ہو سکتا ہے گویا گاندھی جی کا اختلاف مساعی جنگ میں مانع نہیں ہوگا۔ مولانا نے ان سے کہا گاندھی جی کانگرس میں قدر و عزت کا مرتبہ ہیں۔ ہم ان کے خیالات کا انتہائی لحاظ کرتے ہیں۔ لیکن ہندوستان آزاد ہو گیا تو سارا ملک دل و جان سے جنگ کے کاموں میں مدد کرے گا، اور عوام لازمی خدمت کے لیے تیار ہوں گے۔

اس گفتگو کے نتیجے میں سر سٹیفورڈ کرپس نے ایک یادداشت تیار کی جو جانبین کی بات چیت کا خلاصہ اور برطانوی حکومت و ہندوستانی قوم سے متعلق مفاہمت کی تجویزوں پر مشتمل تھی۔ ان کی تجویز تھی کہ:

۱۔ برطانوی حکومت فوراً اعلان کرے کہ لڑائی بند ہوتے ہی ہندوستان کو آزاد قرار دے دیا جائیگا۔

۲۔ ہندوستان کو فیصلہ کرنے کا اختیار ہوگا کہ وہ برطانوی کامن ویلتھ میں شامل رہے یا نہیں۔

۳۔ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل جنگ کے دوران دوبارہ مرتب کی جائے گی۔ اس کے ارکان کو وزیروں کا مرتبہ حاصل ہوگا اور وائسرائے کی حیثیت ایک دستوری ہیڈ کی ہوگی اس طرح اختیار عملاً منتقل کر دیا جائے گا لیکن اسے قانوناً منتقل کرنے کی کارروائی لڑائی ختم ہونے کے بعد ہوگی۔

مولانا نے سر کرپس سے واضح الفاظ میں یقین حاصل کیا کہ وائسرائے کی حیثیت انگلستان کے بادشاہ کی طرح دستوری ہیڈ کی ہوگی اور ایگزیکٹو کونسل کو برطانوی کابینہ کے سے اختیارات حاصل ہوں گے۔

مولانا نے پوچھا "کہ اس تنظیم میں انڈیا آفس کی حیثیت کیا ہوگی ؟"
کرپس نے جواب دیا :

"یہ ایک تفصیل طلب معاملہ ہے جس پر انہوں نے اب تک غور نہیں کیا البتہ اس بارے میں کانگرس کے خیالات کا پورا لحاظ رکھا جائے گا ، پھر قدرے سوچ کر کہا انڈیا آفس قائم رہے گا اور وزیر ہند بھی رہے گا ۔ مگر اس کی حیثیت وہی ہوگی جو دوسری ڈومی نینوں کے وزیر نو آبادیات کی ہوتی ہے ۔"

ان تجاویز پر غور کرنے کے لیے کانگرس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ۲۹ مارچ ۱۹۴۲ء کو شروع ہو کر ۱۱ اپریل تک جاری رہا ، گاندھی جی ان تجاویز کو قبول کرنے کے خلاف تھے ۔ اور اس کا سبب جنگ سے ان کی نفرت تھی ۔ جواہر لال کا رجحان ان تجویزوں کو منظور کرنے کی طرف تھا ۔ راج گوپال آچاریہ بھی تجاویز پر صاد کر رہے تھے ۔ دوسرے ممبر مجلس عاملہ میں تو ضرور تھے لیکن ان کی رائے مولانا کے الفاظ میں پختہ نہ تھی وہ صرف گاندھی جی کی طرف دیکھتے رہتے ۔ مولانا نے مجلس عاملہ کا دو روزہ اجلاس ختم ہوتے ہی یکم اپریل ۱۹۴۲ء کو کرپس سے دوبارہ ملاقات کی ، مولانا لکھتے ہیں ۔

"انہوں نے محسوس کیا کہ سر کرپس کے بنیادی نقطہ نگاہ میں تبدیلی آ چکی ہے اب ان کے جوابات پہلے سے مختلف ہیں ۔ ایگزیکٹو کونسل کے بارے میں ان کا جواب پیچیدہ یا مبہم تھا ۔"

مولانا نے انہی دنوں ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ :

"کرپس آئے تو اپنے ساتھ خوشگوار وعدے لائے تھے اور وہ تاریخی بصیرت کے انسان معلوم ہوتے تھے ۔ لیکن جب ورکنگ کمیٹی کے استفسارات کی دریافت کے سلسلے میں ان سے دوبارہ ملا تو وہ ایک بدلے ہوئے انسان تھے ۔ میں حیران تھا کہ انسان تو وہی ہے لیکن زبان دوسری ہو گئی ہے ۔"

مولانا نے اس کے وجوہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"میری ان سے پہلی اور دوسری ملاقات کے درمیان جو وقفہ ہوا اس میں حکومت ہند کے افسران اعلیٰ نے انہیں معکوس طور پر متاثر کیا ۔ وائسرائے اور ان کے متعلقین نے انہیں محصور رکھا ۔ اس طرح لندن اور دہلی کے درمیان تبادلہ خیال نے ان کی سوچ کا رُخ پھیر دیا ۔"

کرپس خود سوشلسٹ خیال کے تھے اور مشہور سوشلسٹ لیڈر یوسف مہر علی سے ان کے دوستانہ مراسم تھے، راقم لاہور سنٹرل جیل میں تھا تو یوسف مہر علی بھی وہیں قید تھے، کرپس نے ہندوستان پہنچ کر انہیں اپنے خط میں لکھا کہ "میں اس قوم کا ایک فرد ہوں جو میری قانونی رائے لینے کے لیے مجھے ہزاروں پونڈ دیتی ہے۔ لیکن سیاسی رائے مفت دیتا ہوں تو قبول نہیں کرتی" کرپس روس میں انگلستان کے سفیر رہے اور سوئیٹ کو اتحادیوں سے قریب لانے میں انہی کی سوجھ بوجھ کو دخل تھا۔ ہٹلر اور سٹالن میں عام روایتوں کے مطابق کھنچاؤ کی ذہنی فضا استوار کرنے میں وہ کامیاب رہے تھے۔ روس اور جرمنی کی جنگ کے واقعات اس کی تصدیق کرتے تھے کہ انگریزوں کے لیے روس میں ان کی سفارت برطانوی ڈپلومیسی کا نقطۂ کمال تھا اور اشتراکی راہنما ان پر اعتماد کرنے لگے تھے چرچل نے اسی غرض سے ان کو ہندوستان بھیجا تھا۔ کہ شاید وہ ہندوستان کے لیڈروں کو شیشے میں اتار لیں گے۔ پھر ہندوستان کی آزادی کے متعلق امریکہ کا دباؤ نہ رہے گا، لیکن مولانا ان کی گفتگو کے چکر میں نہ آئے اور ریاضی کی طرح بات چیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ سر کرپس کو گفتگو کے محاذ پر ناکامی ہوئی اور وہ چند دنوں ہی میں اپنی توضیحات سے پھر گئے، مولانا نے ۲ را پریل کی ملاقات کے بعد ورکنگ کمیٹی کو بتایا کہ :

۱۔ برطانوی حکومت جنگ کے دوران میں ہندوستان کو اختیارات منتقل کرنے کے لیے تیار نہیں۔

۲۔ وہ کونسل کو کابینہ نہیں گورنر جنرل کی کونسل ہی رکھنا چاہتی ہے۔

۳۔ وائسرائے کونسل کے فیصلوں کو اپنے صوابدید پر رکھنا چاہتا ہے اور نہ دورانِ جنگ اس سے دستبردار ہونے کو تیار ہے۔

۴۔ آخری اختیار وائسرائے ہی اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے۔

۵۔ ہندوستان کی آزادی کے مسئلے پر برطانوی حکومت ایک نئے زاویے سے غور کر سکتی ہے لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ لڑائی بند ہونے کے فوراً بعد ہندوستان کو آزاد کیا جائے گا۔

۶۔ جنگ کے بعد چرچل وزارت کی جگہ کسی دوسری وزارت نے لی تو یہ طے کرنا مشکل ہے کہ وہ کیا تدبیر اختیار کرتی ہے۔

۷۔ کرپس کی تجاویز منظور کرنے کے بعد یہ بات معلق رہے گی کہ برطانوی حکومت نے ہندوستان کے مستقبل کے متعلق کسی بات کا صاف صاف یقین دلایا ہے۔

مولانا نے ۹ اپریل کو کرپس سے ایک اور ملاقات کی اور ۱۰ اپریل کو ورکنگ کمیٹی کا اجلاس کیا۔ کانگرس نے افسوس کے ساتھ کرپس کی تجاویز کو نامنظور کر دیا۔ کرپس نے جواہر لال کو ڈھب پر لانا چاہا۔ وہ چاہتا تھا کہ جواہر لال جمہوریتوں کی بقا کے نام پر آل انڈیا ریڈیو سے براڈ کاسٹ کریں۔ جواہر لال مان گئے کیونکہ وہ نظریاتی انسان تھے اور فاشزم کے ہاتھوں تاخت و تاراج سے ناخوش تھے۔ مولانا نے اس براڈ کاسٹ کو برطانوی ڈپلومیسی کا ہتھکنڈہ سمجھتے ہوئے پنڈت جی کو منع کیا۔ پہلے تو پنڈت جی حجت کرتے رہے پھر مان گئے۔ مولانا نے انہیں راضی کر لیا کہ وہ نہ تو کوئی بیان دیں گے اور نہ براڈ کاسٹ کریں گے۔ معاملہ صرف اتنا تھا کہ پنڈت جی مسائل کو ہمیشہ بین الاقوامی نقطۂ نگاہ سے دیکھتے اور ان کا زاویہ نظر عموماً قومی سے زیادہ بین الاقوامی ہوتا۔ وہ کرپس کی تجاویز کے مطابق برطانیہ سے تعاون کرنے کے لیے تیار تھے اور اس میں جاپان کے چین پر حملے کا ردِ عمل بھی تھا۔

جواہر لال اس وقت دنیا کی تباہی اور ہندوستان کی غلامی سے افسردہ خاطر تھے۔ اور چاہتے تھے کہ جمہوریتیں کے شانہ بشانہ لڑیں، لیکن مولانا انہیں عاجلانہ فیصلوں سے روک گئے اور وہ قدرے رد و کد کے بعد مان جاتے تھے۔

راجگوپال آچاریہ بھی کرپس کی تجاویز مان لینے کے حق میں تھے، انہوں نے محسوس کیا کہ مسلم لیگ کے مطالبہ تقسیم ملک کی وجہ سے ہندوستان کی آزادی گڈمڈ ہو رہی ہے تو انہوں نے مدراس کی کانگرس لیجسلیچر پارٹی میں اس مطلب کا ریزولیوشن پیش کر دیا کہ علیحدگی کا جو مطالبہ مسلم لیگ کر رہی ہے اسے منظور کر لیا جائے یہ فیصلہ راجگوپال آچاریہ نے از خود کیا اور کسی بھی ساتھی کو اعتماد میں نہ لیا۔ مولانا نے اس کا نوٹس لیا اور آچاریہ سے کہا کہ اس طرح ورکنگ کمیٹی وحدت فکر سے محروم ہو کر تضادات کی نذر ہو جائے گی۔ آچاریہ ۳۰ اپریل ۱۹۴۲ء کو کانگرس کی عاملہ سے مستعفی ہو گئے، کرپس مشن سے دو تین چیزیں آشکارا ہوئیں کہ:

۱۔ ہندوستان کی آزادی کے متعلق بین الاقوامی جمہوریت کا دباؤ موجود ہے لیکن چرچل ہندوستان کو آزادی دینے سے گریز و فرار کرتے ہیں۔

۲۔ کانگرس کی مجلس عاملہ میں جنگ سے متعلق سہ گونہ نظریات ہیں، ایک ذہن کے راہنما گاندھی جی ہیں اور وہ سرے سے جنگ میں شمول ہی کا مخالف ہے، دوسرے ذہن کے نمائندہ جواہر لال ہیں اور وہ عالمی جمہوریت کی ویرانی کے صدمے کی تاب نہ لا کر جنگ میں شامل ہونا چاہتا ہے۔ تیسرے

ذہن کے نمائندے مولانا آزاد ہیں اور مولانا ہندوستان کی آزادی کو اساس بنا کر شریک جنگ ہونا چاہتے ہیں۔

۳۔ کرپس مشن نے مسلم لیگ کی واحد نمائندگی کے موقف کو اس طرح بالا کیا کہ ہندو مسلم مسئلہ شدید سے شدید ہو گیا اور واضح ہو گیا کہ مسلم لیگ کو نظر انداز کر کے ہندوستان کی آزادی کا سوال طے نہیں کیا جا سکتا۔

کرپس مشن کے ناکام ہونے سے ہندوستان کی سیاسی فضا میں مایوسی اور غصہ پیدا ہو گیا۔ اس شدید ردعمل اور سنگین صورت حال پر غور کرنے کے لیے ۲۷ اپریل سے یکم مئی تک الہ آباد میں مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا۔ اس کے علاوہ ۲۹ اپریل سے ۲ مئی تک مجلس عاملہ کا اجلاس ہوتا رہا۔ مولانا نے کرپس مشن کے مذاکرات اور اس کے نتائج پر سیر حاصل خطاب کیا اور جو خطرات اس وقت ہندوستان کو درپیش تھے، ان پر مکمل روشنی ڈالی۔ مجلس عاملہ نے فیصلے کی توثیق کی اور فیصلہ کیا کہ کانگریس آزادی کی جدوجہد جاری رکھنے کے لیے مزید کارروائی کرنے کی مجاز ہے۔

مولانا لکھتے ہیں کہ:

"میں الہ آباد سے کلکتے واپس آگیا تو صورت حالات یہ تھی کہ عوام کو انگریزوں کی شکست فاش کا یقین سا تھا اور بعض حلقے جاپانیوں کی فتح پر خوش تھے، وہ یہ سوچتے ہی نہیں تھے کہ جاپان کے ہندوستان کو فتح کر لینے کا نتیجہ کیا ہو گا۔"

گاندھی جی ابتداً جنگ کے دوران کسی تحریک کو شروع کرنے کے خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ تحریک شروع ہوئی تو اس سے تشدد پیدا ہو جائے گا۔

مولانا لکھتے ہیں کہ:

"میں انفرادی ستیہ گرہ یا شخصی سول نافرمانی پر انہیں بڑی مشکل سے راضی کر سکا تھا لیکن اب ان کا ذہن ایک منظم عوامی تحریک کی طرف جا رہا تھا۔ اب وہ آغاز جنگ کی پوزیشن سے بہت آگے جا چکے تھے۔"

جاپان کے متعلق قیاس تھا کہ بنگال پر قابض ہونے کی کوشش کرے گا اور اس کا حملہ ڈائمنڈ ہاربر سے کلکتے کی طرف ہو گا، ادھر حکومت نے کلکتے کو اس کے حال پہ چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا اور سرکاری

عہدیداروں کو ہدایات دیں کہ اس صورت میں کلکتہ، ہوڑہ اور چوبیس پرگنہ کس طرح خالی کریں اور کن راستوں سے جائیں۔ دریائے پدما کو مقابلے کا پہلا محاذ اور آسن سول درانچی کے درمیان دوسرا محاذ تجویز کیا گیا، آخری محاذ الہ آباد تھا، اس طرح پسپائی ہو تو شہروں کو برباد کر دینے کے علاوہ صنعتوں اور کارخانوں کو اڑا دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ جمشید پور کو خاکستر کر دینے کے پلان سے پورا علاقہ ہراساں تھا۔

مولانا نے گاندھی جی سے جاپان کے حملے کے خوفناک خطرے کا ذکر کیا لیکن گاندھی جی کا خیال تھا کہ جاپانی فوجیں ہندوستان میں آئیں تو وہ ہماری نہیں انگریزوں کی دشمن ہوں گی، انگریز اس وقت چلے گئے تو جاپانیوں کے ہندوستان پر حملے کرنے کی کوئی وجہ نہ رہے گی، سردار پٹیل بھی گاندھی جی کے ہم رائے تھے۔ اپنے طور پر مولانا نے جاپانی حملے کی مدافعت کے لیے کلکتے کے مختلف وارڈوں میں رضاکاروں کے جتھے بھرتی کیے اور منظم کرائے کہ ہر صورت میں وہ جاپانی فوج سے ٹکرا کر اپنی حکومت کی داغ بیل ڈالیں۔

جولائی کے پہلے ہفتے میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس واردھا میں ہوا۔ مولانا ۵ جولائی کو وہاں پہنچے تو گاندھی جی نے ان سے "ہندوستان چھوڑدو" کی تحریک کا ذکر کیا کہ وہ ان خطوط پر سوچ چکے ہیں۔

مولانا لکھتے ہیں کہ:

"میں اس خیال کو اپنے تصورات میں آسانی سے کھپا نہ سکا ایک عجیب سی مشکل کا سامنا تھا، جنگ شروع ہوئی تو انگریزوں کی منظم مخالفت کے حق میں تھا، لیکن گاندھی جی متفق نہ تھے۔ اب جاپانی فوج ہندوستان کی سرحد تک آپہنچی تھی اور برما ان کے قبضے میں تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس حالت میں انگریز ہماری تحریک کو کسی حال میں بھی پنپنے نہ دے گا۔ گاندھی جی خوش امید تھے کہ وہ (انگریز) تحریک کے خلاف کوئی اقدام نہ کریں گے، پہلے ستیہ گرہ میں رضاکارانہ گرفتاری لائحہ عمل تھی۔ اب گاندھی جی کا خیال تھا کہ دو بدو مقابلہ کیا جائے اور حکم اسی حالت میں مانا جاتے جب مجبور کر دیا جائے۔"

جواہر لال کو مولانا سے اتفاق تھا لیکن سردار پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور آچاریہ کرپلانی کے متعلق مولانا رقم طراز ہیں کہ:

"انہیں ٹھیک معلوم ہی نہ تھا کہ لڑائی کیا ہے؟ اور کس لیے ہے وہ شاذ و نادر ہی معاملوں کو اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے تھے، ان کی عادت تھی کہ اپنی رائے کو بہر حال

گاندھی جی کے تابع کریں، ان لوگوں کے ساتھ بحث کرنا فضول تھا ان کی ایک ہی دلیل تھی کہ ہمیں گاندھی جی پر بھروسہ کرنا چاہیے اور بس۔"

مولانا لکھتے ہیں کہ:

"میں نے گاندھی جی سے کاملاً اختلاف کیا اس سے پہلے ایسا اختلاف کبھی نہ ہوا تھا، ہم ایک دوسرے سے ذہنی طور پر اتنی دور ہوگئے کہ باہمی تعاون نہیں ہوسکتا تھا۔"

گاندھی جی نے انہیں (مولانا) لکھا کہ:

"خیالات کے اس بعد میں انہیں (مولانا) صدارت سے مستعفی اور ورکنگ کمیٹی سے الگ ہوجانا چاہیے۔"

جواہر لال کے لیے بھی گاندھی جی نے یہی تجویز کیا۔ مولانا نے جواہر لال کو بلوایا، اتفاق سے سردار پٹیل بھی آگئے۔ گاندھی جی کا خط دیکھا تو سردار پٹیل کو بہت صدمہ ہوا۔ اس وقت گاندھی جی کے پاس گئے اور ان کے اس خط پر سخت احتجاج کیا۔ ان سے کہا کہ وہ استعفیٰ کے ردِ عمل سے شاید واقف نہیں، گاندھی جی نے صبح ۷ بجے خط لکھا لیکن مولانا کو بارہ بجے دن بلا کر خط واپس لے لیا، اور کہا کہ خط جلدی میں لکھا گیا تھا، اب مزید غور کرنے کے بعد وہ اپنا خط واپس لینا چاہتے ہیں۔ گاندھی جی نے ورکنگ کمیٹی میں کہا کہ گنہگار نادم ہوکر مولانا کے پاس آگیا ہے۔ ۱۴ جولائی کو ورکنگ کمیٹی نے بے تشدد کھلی بغاوت کا ریزولیوشن پاس کیا جو ہندوستان چھوڑدو کے نام سے منسوب ہوگیا۔ اس غرض سے ۷ اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں آخری فیصلے کے لیے مجلس عامہ کا اجلاس طلب کیا گیا۔ اُدھر اس قرارداد سے ملک کے طول و عرض میں ایک انقلابی ہیجان پیدا ہوگیا۔ ملک کے انقلابی عناصر اور انتہا پسند کانگرسی مدت سے قید و بند میں تھے، اس قرارداد کے پس منظر اور پیش منظر میں عوام کا اجتماعی ولولہ تھا۔ ادھر معلوم تھا کہ ملک کے طول و عرض میں ایک طوفان کروٹ لے رہا اور کانگرس سے حکومت کا ٹکراؤ ناگزیر ہوگیا ہے۔ ایک برطانوی امیر البحر کی بیٹی مس سلیڈ جو گاندھی جی سے متاثر ہوکر ہندوستانی طریقِ زندگی میں ڈھل گئی اور گاندھی بھگت کہلاتی تھیں اور اب ان کا نام میرا بہن تھا، گاندھی جی کے سیکرٹری مہادیو ڈیسائی کے ایما پر وائسرائے سے ملنے دہلی گئیں، لیکن وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری نے اس سے کہا چونکہ گاندھی جی بغاوت کی باتیں کرتے ہیں لہٰذا ان سے وائسرائے کو ملنا منظور نہیں، اور نہ حکومت جنگ کے زمانے میں کسی طرح کی بغاوت برداشت

کر سکتی ہے، مس سلیڈ یہ جواب لے کر واردھا آ گئیں۔ مہادیو ڈیسائی نے ان سے گفتگو کا ادھورا مفہوم لے کر کے بیان جاری کیا کہ یہ صحیح نہیں ہے کہ مہاتما جی نے برطانیہ کے خلاف کھلی بے تشدد بغاوت کا فیصلہ کیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ:

"بے تشدد انقلاب کی اصطلاح پنڈت جواہر لال کی ایجاد تھی گاندھی جی نے اس اصطلاح کو نہ صرف قبول کیا بلکہ اس کی باتیں کرنے لگے تھے۔"

مولانا نے مختلف کانگرسی لیڈروں کو عند الملاقات ہدایت کی کہ گاندھی جی اور دوسرے کانگرسی راہنما اگر گرفتار کیے جائیں تو عوام کو تشدد و عدم تشدد کا اختیار ہے اور اگر انہیں گرفتار نہ کیا جائے تو گاندھی جی کی ہدایات پر سختی سے عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔

مولانا کے نزدیک بنگال، بہار، یوپی، سی پی، بمبئی اور دہلی تحریک کے لیے پوری طرح تیار تھے آسام چونکہ جنگی سرگرمیوں کا مرکز تھا اور فوجی افسروں اور سپاہیوں سے بھرا پڑا تھا، لہذا وہاں کسی عملی اقدام کا سوال ہی نہ تھا۔

مولانا نے اپنی سیاسی بصیرت کے باعث ۲۸ جولائی کو گاندھی جی کے نام خط لکھا کہ حکومت ان کی تحریک کا مقابلہ کرنے کے لیے کمربستہ ہے، لیکن گاندھی جی نے اتفاق نہ کیا۔ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ۵ اگست کو ہوا جس میں ۷ اگست کا ریزولیوشن تیار کیا گیا۔ مولانا نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سامنے وہ ریزولیوشن پیش کیا تو کمیونسٹوں کے سوا کہ وہ روس کی وجہ سے جنگ کو عوامی جنگ کہنے لگے تھے، تمام کمیٹی نے صاد کیا۔ گاندھی جی نے بھی خطاب کیا۔ غرض دو روز کی بحث و گفتگو کے بعد ۸ اگست کو رات ۱۰ بجے قرارداد منظور ہو گئی۔

مولانا بھولا بھائی ڈیسائی کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے، ڈیسائی نے ان سے کہا کہ انہیں ایسا خوفناک خبر دے گئے ہیں کہ علی الصباح تمام کانگرسی رہنما پکڑے جائیں گے۔ حکومت نے تمام رہنماؤں کو جنوبی افریقہ بھجوانے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن پھر کسی وجہ سے فیصلہ کٹ گیا۔ مولانا حسب معمول صبح چار بجے اٹھے اور پریزیڈنٹ روزویلٹ کو "ہندوستان چھوڑ دو" کی قرارداد بھجوانے کے لیے خط لکھنا شروع کیا سر درد کی وجہ سے اسپرین لے کر سو گئے۔ ادھر تھوڑی ہی دیر میں بھولا بھائی ڈیسائی کے بیٹے دھیرو بھائی ڈیسائی نے آ جگایا کہ بمبئی کا ڈپٹی کمشنر برآمدہ میں گرفتاری کے وارنٹ لے کر انتظار کر رہا ہے۔ مولانا نے غسل کیا، کپڑے بدلے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری اجمل خان کو ہدایات دیں اور ڈپٹی کمشنر کے ساتھ چلے گئے۔ وکٹوریا ٹرمینس

پہنچ کر معلوم ہوا کہ سپیشل گاڑی تیار ہے اور دوسرے لیڈر بھی گرفتار کر کے لائے جا چکے ہیں۔ گاندھی جی بھی اسی گاڑی میں سوار تھے۔ مسز نائیڈو گاندھی جی کے ساتھ تھیں۔ گاندھی جی اس وقت بہت ہی افسردہ تھے انہیں اس اچانک گرفتاری کا یقین نہ تھا۔ لیکن انگریز یہ سبھی کر گزرے تھے، گاندھی کے ساتھ ان کی اہلیہ کستور ابائی ایک ذاتی سیکرٹری اور سروجنی نائیڈو کو آغاخان کے محل واقع پونا میں رکھا گیا اور باقی لیڈر قلعہ احمد نگر میں نظر بند کیے گئے۔ احمد نگر کے قلعہ میں دس ممبر تھے، مولانا، نہرو، پٹیل، آصف علی، ڈاکٹر راؤ دیو، گووند بلبھ پنت، پٹا بھائی سیتا رامیہ، ڈاکٹر سید محمود، آچاریہ کرپلانی اور ڈاکٹر پر فلا گھوش، قلعہ کا انتظام فوج کے سپرد تھا البتہ جیلر پونا سے آیا تھا۔

مولانا نے "غبارِ خاطر" میں اس قید کے حالات لکھے ہیں اور بعض واقعات کی جزئیات بھی درج کی ہیں۔ قلعہ بدترین قسم کی تنہائی تھا، بیرونی دنیا کو معلوم ہی نہ تھا کہ ان کے لیڈر کہاں ہیں، خط و کتابت ممنوع اور اخبارات وغیرہ موقوف تھے۔ مولانا نے وائسرائے سے احتجاج کیا تو ستمبر کے آغاز میں گھر والوں کو ایک خط لکھنے اور اخبار پڑھنے کی اجازت دی گئی، گاندھی جی نے اکیس دن کا برت رکھا۔ حکومت نے تہیہ کر لیا کہ وہ ان کی موت کا سامنا کرے گی لیکن قدرت نے انہیں بچا لیا۔ اس دوران میں مولانا کو دو صدمات سہنا پڑے، پہلا ان کی اہلیہ زلیخا بیگم کے انتقال کا جانکاہ صدمہ تھا لیکن مولانا نے دل و دماغ پر گزار لیا پھر تیسرے مہینے مولانا کی بہن آبرو بیگم بھوپال میں رحلت کر گئیں۔

ادھر ۱۹۴۴ء کے آغاز میں جنگ کا پانسہ پلٹ چکا اور اتحادیوں کی فتح کے دن قریب لا رہا تھا۔ وائسرائے کو اب گاندھی جی سے کوئی خطرہ نہ رہا اس لئے ڈاکٹروں کی اس رپورٹ پر کہ گاندھی جی بھوک ہڑتال سے صحت کھو چکے اور موت کے راستے پر ہیں، ان کی وفات کی ذمہ داری سے بچنے کے لیے انہیں لکا یک رہا کر دیا، گاندھی جی چند مہینے زیر علاج رہے پھر سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کیا اور اعلان کیا کہ برطانوی حکومت نے ہندوستان کی آزادی کا اعلان کیا تو کانگرس اس سے تعاون کرے گی۔ لیکن اب برطانیہ کو اپنی کامیابی کا یقین تھا اس نے گاندھی جی کی پیشکش سے بے اعتنائی برتی۔ حکومت نے ۱۹۴۴ء کے نصف آخر میں قلعہ احمد نگر کے اسیر راہنماؤں کو اپنے اپنے صوبوں کی مختلف جیلوں میں بھجوا دیا۔

مولانا کو بنکورا بھیج کر ایک دو منزلہ بنگلے میں رکھا گیا وہ قلعہ احمد نگر میں گئے تو ان کا وزن ۱۷۰ پونڈ تھا لیکن ساڑھے تین سال کی نظر بندی میں ان کا وزن ٹوٹ کر ۱۳۰ پونڈ رہ گیا حتیٰ کہ اشتہا بھی ختم ہو گئی۔

لارڈ ویول نے جون ۱۹۴۵ء کی ایک شام کو کانگریس کے صدر اور ارکان عاملہ کی رہائی کا اعلان کیا اور بتایا کہ برطانوی حکومت ہندوستان کے مسئلے سے متعلق شملہ کانفرنس منعقد کر رہی ہے۔

مولانا اس اعلان کے اگلے روز   کو رہا کر دیے گئے اور ریل گاڑی سے کلکتے پہنچے

اسٹیشن پر انسانوں کا سمندر استقبال کے لیے موجیں مار رہا تھا، وہ اسٹیشن سے سیدھے اپنی اہلیہ کی لحد پر گئے وہاں پھول چڑھائے فاتحہ پڑھی اور گھر میں آگئے کہ مکان اہلیہ سے خالی ہو چکا تھا۔

خوبصورت لوگوں کی سرزمین

تفہیم سے تقسیم تک

یورپ میں جنگ تقریباً اپریل ۱۹۴۵ء ہی میں ختم ہو گئی، لیکن ایشیا اسی طرح تپ رہا تھا، اور جاپان ابھی تک کسی نقصان سے دوچار نہ ہوا تھا۔ امریکہ کے لیے جاپان کی شکست جرمنی کی شکست سے زیادہ اہم تھی۔ مارشل سٹالن سے روزویلٹ نے وعدہ لیا تھا کہ یورپ کی جنگ ختم ہوتے ہی روس جاپان پر حملہ کر دے گا۔ انڈونیشیا، سنگاپور، اور برما ابھی تک جاپان کے قبضے میں تھے۔ امریکہ سمجھتا تھا کہ ہندوستان کی مدد کے بغیر ان علاقوں کو جاپان کی تحویل سے نکالنا مشکل ہے۔ وہ بار بار برطانیہ پر زور دے رہا تھا کہ ہندوستان سے اس کی مفاہمت ہی ایشیائی محاذ کی فتح آسان کر سکتی ہے۔ لارڈ ویول مئی ۱۹۴۵ء میں لندن گئے وہاں ہندوستان کے مسئلے پر بات چیت کی، واپس آکر جون میں کانگرس کی جماعت عاملہ کو رہا کر دیا۔ ادھر امریکہ کے صحافی اور فوجی کلکتے میں مقیم تھے۔ ان دنوں کلکتہ ایشیا میں امریکی فوج کا ایک بڑا مرکز تھا۔ امریکی صحافیوں نے مولانا سے ان کی رہائی کے فوراً بعد ملاقات کی اور اپنے اضطراب کے پس منظر میں جنگ سے متعلق سوال کیے۔ مولانا نے وہی جواب دیا جو شروع سے ان کا موقف تھا کہ وہ جمہوریتوں سے اشتراک کے خواہاں ہیں لیکن اپنی غلامی کے ہوتے ہوئے کیا مدد کر سکتے ہیں؟ مولانا سے جو گفتگو ہوئی اس پر ایک امریکی وقائع نگار نے اپنے روزنامہ کو لکھا کہ مولانا سچے دل سے مشرقی انسان ہیں لیکن اصلاً یورپی دماغ کے عظیم سیاست دان ہیں انھیں سیاست کی کاٹ پر قدرت حاصل ہے۔

کرنل ایمری وزیر ہند نے ۱۴ جون ۱۹۴۵ء کو دارالعوام میں بیان دیا کہ ہندوستان کو ایک آزاد قوم کی حیثیت سے جنگ کے بارے میں طے کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ لارڈ ویول نے مولانا کو تار دیا کہ

وہ ۲۵ رجون کو شملہ کانفرنس میں شریک ہوں۔ کانفرنس ہندوستان کے سیاسی مسئلے پر کوئی حل تلاش کرنے کے لیے ہو رہی ہے۔ مولانا نے بمبئی میں کانگرس کا اجلاس طلب کیا۔ اجلاس نے مولانا کو بات چیت کا مجاز ٹھہرایا۔ مولانا نے کانفرنس سے پہلے لارڈ ویول سے ملاقات کی اور ان سے تجویزیں معلوم کیں، مولانا چاہتے تھے کہ قلعہ احمد نگر میں ان کی لارڈ ویول سے جو خط و کتابت ہوئی تھی وہ شائع کریں لیکن لارڈ ویول نے مولانا سے خواہش کی کہ وہ ابھی رک جائیں۔ پھر وہ خط و کتابت کبھی شائع نہ ہوئی اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ اس کا مضمون کیا تھا۔ مولانا لارڈ ویول سے بے حد متاثر ہوئے۔ انہوں نے ہماری آزادی میں ان کی دو تین جگہ تعریف کی ہے۔ لارڈ ویول بھی مولانا سے غایت درجہ متاثر تھے، انہوں نے اسی رات ایک سرکاری دعوت میں مولانا کے فہم و تدبر کی تعریف کی اور ان کی فراست کو سراہا تھا۔

ورکنگ کمیٹی نے گاندھی جی کی موجودگی میں مولانا اور ویول کی ملاقات پر غور کیا اور اب یہ سوال مطلقاً نہ چھیڑا کہ جنگ میں شرکت کا مطلب ہو گا کہ اس نے عدم تشدد کے اصول کو تیاگ دیا ہے۔

وائسرائے نے انڈین نیشنل کانگرس کے علاوہ مسلم لیگ کے صدر، شیڈول کاسٹ اور سکھوں کے نمائندوں کو بھی مدعو کیا۔ اس کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی شریک ہوئے، جن میں صوبائی حکومتوں کے وزراء اعظم بھی تھے۔ صرف ہندو مہاسبھا کو اس سے مستثنیٰ رکھا گیا، جب سیاسی جماعتوں میں باہمی گفتگو کی تجویز آئی تو لیگ سے بات چیت کے لیے پنڈت گوبند بلبھ پنت نامزد کیے گئے، لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ مولانا لکھتے ہیں کہ شملہ کانفرنس انگریزوں کی وجہ سے نہیں فرقہ داری نمائندگی کے سوال پر ناکام ہوئی قائداعظم نے اصرار کیا کہ کانگرس صرف ہندوؤں ہی کو نامزد کر سکتی ہے مولانا نے ویول سے کہا کہ ہم اپنے کوٹے میں سے جسے چاہیں نامزد کریں مسٹر جناح اپنے کوٹے کے ذمہ دار ہیں، ہمارے ارکان پر انہیں اعتراض کا حق نہیں پہنچتا۔ مولانا کے نزدیک پانچ کانگرسی ارکان میں ایک وہ خود، ایک سردار پٹیل، ایک جواہر لال، ایک پارسی اور ایک عیسائی تھا۔ گویا پانچ میں سے دو ہندو تھے، لیکن مسٹر جناح کو مسلمان نمائندے کے تقرر پر اعتراض تھا۔

لارڈ ویول نے جو فہرست تیار کی اس میں کانگرس اور لیگ کے علاوہ ایک سکھوں کا اور دو شیڈول کاسٹ کے نمائندے تھے چوتھا نمائندہ ملک خضر حیات تھا۔ اس لحاظ سے چودہ کی ایگزیکٹو کونسل میں سات ممبر مسلمان ہوتے مگر مسٹر جناح نے اتفاق نہ کیا۔ انہیں مسلمانوں کی واحد نمائندگی کے دعوے پر مسلمان ممبروں

کو خود نامزد کرنے پر اصرار تھا۔ کانفرنس ناکام ہو گئی تو بظاہر ایک تعطل پیدا ہو گیا۔ مولانا بحالی صحت کے لیے کشمیر چلے گئے۔ جولائی اور اگست کے مہینے وہیں رہے۔

اُدھر انگلستان میں چرچل کی کنزرویٹو پارٹی کو انتخابات میں شکست ہوئی اور اس کی جگہ لیبر پارٹی آگئی۔ مسٹر اٹیلی وزیر اعظم ہوئے۔ مولانا نے انہیں، ہندوستان کا مسئلہ حل کرنے کی خواہش پر مبارکباد کا تار دیا۔ انہوں نے مولانا کو لکھا کہ وہ عنقریب اس بارے میں قدم اٹھا رہے ہیں اور اس سال جاڑے کے دنوں میں جنرل انتخابات کرا رہے ہیں۔ مولانا نے لارڈ ویول کو لکھا کہ اب سیاسی قیدی رہا کر دیے جائیں۔ ویول نے چند ایک کے سوا سب کو چھوڑ دیا، جو قیدی رکھے گئے ان کے متعلق حکومت کو یقین تھا کہ ان کا طرزِ عمل مسلح بغاوت کا ہے۔ مثلاً جے پرکاش نارائن وغیرہ۔ لیکن مولانا نے لارڈ ویول سے مل کر انہیں بھی رہا کرا دیا۔ ورکنگ کمیٹی میں شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد انتخابات میں حصہ لینے پر اختلاف تھا اور بعض تحریک شروع کرنے کے حق میں تھے، یعنی انتخابات کا بائیکاٹ چاہ رہے تھے۔ لیکن مولانا نے ورکنگ کمیٹی کو انتخابات کی اہمیت جتا کر راضی کر لیا۔ اس کے بعد اور اسی کے نتیجہ میں ہندوستان کی آزادی ہے۔ بنگال پنجاب اور سندھ کے سوا کانگرس کو تمام صوبوں میں قطعی اکثریت حاصل ہو گئی۔ بنگال میں لیگ سب سے بڑی پارٹی تھی، اس نے تقریباً آدھی نشستوں پر قبضہ کر لیا۔ پنجاب میں بھی مسلمانوں کی نشستوں میں تین چار کے سوا سب لیگ کے قبضے میں آگئیں۔ سندھ میں بھی لیگ ہی کا پلڑا بھاری رہا۔ مولانا نے وزارت سازی کے سلسلے میں چاہا کہ مسلم لیگ سے تعاون کی راہ پیدا کی جائے، خواہ وہ اکثریت میں ہے یا اقلیت میں۔ مولانا نے بنگال، آسام اور پنجاب میں لیگ کے صوبائی زعماء سے بات چیت کی اور وہ راضی تھے بالخصوص بہار اور آسام میں ذہنی طور پر تیار ہو چکے تھے۔ پنجاب میں بھی لیگ کے راہنما مولانا سے دو دفعہ فلیٹی ہوٹل میں جہاں مولانا مقیم تھے ملاقی ہوئے۔ مولانا نے کوالیشن کی پیشکش کی۔ لیکن قائد اعظم نے ہر جگہ روک دیا کہ کانگرس سے تعاون کرنا لیگ کے مسلک سے خارج ہے۔ چنانچہ اشتراک رہ گیا۔

ملک خضر حیات اور کانگرس پارٹی میں تعاون ہو گیا اور کوالیشن بن گئی۔ مولانا لکھتے ہیں کہ اس کوالیشن پر جواہر لال کے بعض دوستوں اور عزیزوں نے انہیں میرے خلاف کرنا چاہا کہ میں نے مسلم لیگ کے بجائے یونینسٹ پارٹی سے کوالیشن بنا کر کانگرس کے انقلابی کردار کی نفی کی ہے۔ اس سلسلے میں کمیونسٹ پیش پیش تھے، وہ روس پر حملے کے دن سے لیگ کے ساتھ مل کر عوام میں جلسے کرتے تھے، ان کا مطمحِ نظر تھا کہ لیگ

اور کانگرس کے اتحاد ہی سے ہندوستان جفا کی جنگ میں زیادہ سے زیادہ مفید ہوسکتا ہے۔ انہوں نے پنڈت جی کے کان میں بہت کچھ ڈالا۔ پنڈت جی کے ان دوستوں، عزیزوں اور اشتراکیوں کو مولانا سے متعلق بعض اخبارات کی اس روش پر بھی اعتراض تھا کہ ہر کوئی ان کے تدبر کو خراج ادا کر رہا اور ان کی شخصیت کے عظیم ہونے کا معترف ہے اس طرح پنڈت جی ثانوی ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ پنڈت جی کا ذاتی اخبار "ہیرلڈ لکھنؤ" بھی مولانا ہی کی شخصیت کے محاسن کو اچھال رہا ہے۔ پنڈت جی نے ورکنگ کمیٹی میں پنجاب کولیشن پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور مختلف امور میں مولانا کی مخالفت کی لیکن گاندھی جی نے شدت سے مولانا کی تائید کی لیکن اگلی ہی صبح پنڈت جی مولانا کی قیام گاہ پر گئے اور اپنے رویے پر نظر ثانی کا اظہار کیا کہ صورت حال اب ان کے علم میں آگئی ہے۔ مولانا اور پنڈت اختلافات کی اس عارضی لہر کے بعد ہم راستے ہو گئے اور اس طرح ایک غلط فہمی رفع ہو گئی۔

ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ فوج میں بھی سرایت کر چکا تھا، آزاد ہند فوج ملک سے باہر بنی تھی، لیکن نہرو نے ان کی رہائی کے سوال کو اٹھا کر اور دھلی کے لال قلعہ میں ان کا مقدمہ لڑ کے سارے ملک کو انگریزی غلامی سے ذہنی طور پر برانگیختہ کر دیا تھا۔ کراچی اور بمبئی سے بحری بیڑے میں نسلی امتیاز کی خبریں آ رہی تھیں، تمام ملازموں کی ایک بڑی اکثریت میں ہیجان و اشتعال تھا۔ اردنا آصف علی ان کی حمایتی ہو کر مولانا سے ملیں، مولانا نے انہیں سمجھایا کہ اس مرحلے میں کوئی تحریک یا تصادم ملک کے مسئلہ آزادی کی راہ میں حارج ہو گا، سردار پٹیل نے بھی مولانا سے مشورہ کیا۔ مولانا نے انہیں بھی یہی کہا، ہندوستان میں فوج کے کمانڈر انچیف جنرل آکن لیک تھے۔ مولانا نے ان سے ملاقات کی اور تسلیم کرا لیا کہ نسلی امتیاز اور دوسری شکایتوں کو دور کیا جائے گا، اور کسی کو اس سلسلہ میں، کہ اس نے احتجاج کیا ہے، کوئی سزا نہ دی جائے گی۔ مولانا نے جنرل سے کہا کہ ان لوگوں کے ساتھ کوئی غلط سلوک ہوا تو کانگرس ان کے مقدمات کو ہاتھ میں لے گی، جنرل نے مولانا کو ان کے حسب خواہش یقین دلایا اور اس طرح ایک قضیہ طے ہو گیا۔

آزاد ہند فوج سے متعلق مولانا نے ایک بیان میں اعلان کیا کہ حکومت ہند نے اس طرح ہزارہا نوجوان قید میں ڈال رکھے ہیں۔ کانگرس ان کا مقدمہ لڑنے اور ان کی رہائی کے لیے جدوجہد کا فیصلہ کر چکی ہے۔ پنڈت جواہر لال نے اس مسئلے کو ملک گیر زبردست عوامی تحریک بنا دیا۔

ملک کی آزادی لازم ہو چکی تھی اور ایک نیا ہندوستان وجود میں آ رہا تھا لارڈ پتھک لارنس نے ۷ اپریل ۱۹۴۶ء کو پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ برطانوی حکومت ہندوستان کی آزادی کے سوال پر گفت و شنید کیلئے

ایک کیبنٹ مشن بھیج رہی ہے۔ لارڈ پیتھک لارنس وزیر ہند، تجارتی بورڈ کے صدر سر کرپس اور محکمہ بحر کے پہلے لارڈ اے وی الیگزینڈر اس کے ارکان ہوں گے۔

۱۵ مارچ ۱۹۴۶ء کو مسٹر ایٹلی وزیر اعظم انگلستان نے ہاؤس آف کامنز میں ایک یادگار تاریخی بیان دیا جو ہندوستان کی آزادی کو تسلیم کر لینے کا اعلان اور پچھلی غلطیوں کو بھول جانے کی اپیل تھا، ۲۳ مارچ کو کیبنٹ مشن ہندوستان پہنچا مولانا ۲ اپریل ۱۹۴۶ء کو دھلی پہنچے، مولانا کے الفاظ ہیں:

"اس وقت سب سے اہم مسئلہ ہندوستان اور برطانیہ کا سیاسی اختلاف نہیں بلکہ فرقہ داری مسئلہ تھا، اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مسلمان ایک جماعت کی حیثیت سے اپنے مستقبل کے بارے میں بہت ہی فکر مند تھے، میں اس مسئلے پر مسلسل غور کرتا رہا اور اس کی وجہ سے بہت فکرمند تھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہندوستان کے حالات کو دیکھتے ہوئے یہاں کا دستور وفاقی ہونا چاہیئے اور اس کو اس طرح وضع کرنا چاہیئے کہ صوبوں کو زیادہ سے زیادہ امور میں خود مختاری حاصل ہو، دفاع، رسل و رسائل اور امور خارجہ مرکز کے پاس ہوں۔ اس کے علاوہ معاملات کی ایک ایسی فہرست ہونی چاہیئے کہ صوبائی حکومتیں چاہیں تو مرکز کے سپرد کر سکیں۔"

مولانا ۶ اپریل کو کیبنٹ مشن سے ملے، تو اپنے اس نظریہ کا خاکہ پیش کیا، لارڈ پیتھک نے ان سے کہا کہ آپ نے فرقہ وار مسئلے کا ایک نیا حل پیش کیا ہے سر کرپس دیر تک تبادلہ افکار کرتے رہے۔ آخر وہ بھی وحدانی کے بجائے وفاقی لائحہ عمل سے متفق ہو گئے۔ ۱۲ اپریل کو ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا، کئی ارکان نے جن میں گاندھی جی بھی شامل تھے، اس اسکیم پر مولانا سے جرح و قدح کی اور آخر کار قائل ہو گئے، گاندھی جی نے صاد کیا اور مبارک باد پیش کی، سردار پٹیل نے کرنسی وغیرہ کا سوال اٹھایا تو گاندھی جی نے انہیں مطمئن کر دیا کہ اس کا مرکز ہی کے پاس ہونا ضروری ہے اور وہ مرکز کی ایک اساسی ضرورت ہے۔

مشن سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا اور کئی دن تک رہا پھر ایک وقفہ کے لیے مشن کشمیر چلا گیا وہاں سے ۲۴ اپریل کو دھلی واپس آیا اور مذاکرات شروع کیے۔ مولانا سے بہت سی ملاقاتیں کیں پھر کانگرس اور لیگ سے کہا گیا کہ وہ گفتگو کو آگے بڑھانے کے لیے اپنے نمائندے نامزد کریں، مولانا نے سردار پٹیل اور جواہر لال کو ساتھی منتخب کیا۔ گاندھی جی کو مشن نے از خود مدعو کیا۔ ۲ مئی کو شملے میں گفتگو شروع ہوئی جو ۱۲ مئی تک

جاری رہی۔ کچھ باضابطہ اور کئی بے ضابطہ میٹنگیں ہوئیں۔ آخر طویل مذاکرات کے بعد تجاویز کا ایک نقشہ تیار ہوا۔ مسٹر ایٹلی نے ۱۶ مئی کو دارالعوام میں اس کا اعلان کیا۔ مولانا نے ابتدائی ملاقات میں جن تجاویز کا خاکہ دیا تھا فی الجملہ وزارتی پلان بڑی حد تک اسی کے مطابق تھا۔

شیخ عبداللہ نے انہی دنوں "کشمیر چھوڑ دو" کا اعلان کر دیا۔ مہاراجہ نے انہیں اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا۔ جواہر لال نہرو نے صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے کشمیر کا عزم کیا تو مہاراجہ کی حکومت نے حدود کشمیر میں داخل ہونے سے روکا۔ وہ ڈٹ گئے انہیں گرفتار کر لیا۔ ہندوستان میں ہلچل مچ گئی۔ لارڈ ویول کی وساطت سے مولانا نے پنڈت نہرو سے اس ڈاک بنگلے میں رابطہ پیدا کیا جہاں گرفتاری کے بعد رکھے گئے تھے۔ مولانا نے ان سے کہا کہ موجودہ حالات میں ان کا کشمیر میں رُکا رہنا مناسب نہیں وہ بحیثیت صدر مسئلہ کشمیر کو ہاتھ میں لیں گے اور شیخ عبداللہ کو مع ساتھیوں کے رہا کرانے کے لیے کاروائی شروع کریں گے۔ جواہر لال پہلے تو راضی نہ ہوتے لیکن کچھ رد و کد کے بعد مولانا کی یقین دہانی پر مان گئے۔ وائسرائے نے سپیشل طیارہ بھیجا اور وہ دہلی واپس آ گئے۔

المقصد کانگرس نے انٹرم حکومت میں شمول کی تجویز تو نامنظور کی، لیکن وزارتی پلان کو منظور کر لیا۔ لیگ نے بھی صاد کیا۔ اور اس طرح کانگرس اور لیگ۔۔ دونوں نے پلان قبول کر لیا۔ پلان کا لب لباب یہ تھا کہ:

۱۔ برطانوی ہند اور ریاستوں کی ایک یونین ہو گی جس کے ہاتھ میں امور خارجہ، دفاع اور رسل و رسائل کے محکمے ہوں گے۔ ان امور کے واسطے روپیہ حاصل کرنے کا یونین کو اختیار ہو گا۔ جہاں تک دفاع کا تعلق ہے، سارا ہندوستان ایک متصور ہو گا اور یونین جس حصے کو چاہیے گی ملکی دفاع کے لیے استعمال کرے گی۔ تمام فوج یونین کے ماتحت ہو گی، امور خارجہ میں بھی ہندوستان ایک ہی متصور ہو گا۔ رسل و رسائل کے تمام ذرائع مرکز کے تابع ہوں گے۔

۲۔ یونین کی ایک مجلس قانون ساز اور مجلس عاملہ ہو گی۔ جو برطانوی ہند اور ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل ہو گی اور مرکز ہی کے سامنے جواب دہ ہو گی۔

۳۔ جو امور ہندوستانی یونین کے سپرد کئے جائیں گے ان کے علاوہ دوسرے تمام معاملات صوبوں کے اختیار میں ہوں گے جن میں مالیتی اختیارات بھی شامل ہیں۔

۴ - ان امور کے سوا جو یونین کے اختیار میں ہوں گے تمام اختیارات ریاستوں کے ہاتھ میں ہونگے۔

۵ - صوبوں کو گروہ بندی کا اختیار ہوگا۔ جو اپنی الگ مجلس مقننہ اور مجلس منتظمہ رکھ سکیں گے ہر گروہ کو یہ حق ہوگا کہ وہ طے کر دے کہ کتنے صوبجاتی اختیارات مشترک کر لیے جائیں۔

۶ - یونین اور گروہ کے دستور میں ایک شرط یہ بھی ہوگی کہ کوئی ایک صوبہ اگر یونین یا گروہ کے آئین پر نظر ثانی کرانا چاہے تو اپنی اسمبلی کی اکثریت پر اس طرح کی تجویز پاس کر کے نظر ثانی کرا سکے گا۔

۷ - دستور ساز اسمبلی ۳۸۵ ارکان کی ہوگی جن میں ۲۱۰ ہندو ۷۸ مسلمان ۴ سکھ اور ۹۳ دیسی ریاستوں کے نمائندے ہوں گے۔ ان کے علاوہ ایک دہلی ایک اجمیر ایک مارواڑ ایک بلوچستان اور ایک کورگ کا نمائندہ بھی ہوگا۔ گویا ہر دس لاکھ کے پیچھے ایک نمائندہ ہوگا۔ سرحد سے کوئی ہندو نمائندہ اور اڑیسہ سے کوئی مسلمان نمائندہ نہیں ہوگا کہ وہاں ہندو اور مسلمان قلیل التعداد ہیں۔ تمام نمائندے یکجا ہو کر اپنا صدر چنیں گے۔ چند بنیادی اور شہری حقوق کا تعین کر کے تمام ارکان تین گروپوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔

۱ - اے گروپ میں ۱۶۷ ہندو اور ۲۰ مسلمان ہوں گے، یہ گروپ یوپی، بہار، سی پی، اڑیسہ، بمبئی اور مدراس کے نمائندوں پر مشتمل ہوگا۔

۲ - بی گروپ میں ۲۲ مسلمان، ۹ ہندو، ۴ سکھ، کل ۳۵ ارکان ہوں گے۔ اور یہ پنجاب، سرحد اور سندھ پر مشتمل ہوگا۔ اس میں بنگال و آسام کے صوبے ہوں گے۔

۳ - سی گروپ ۳۶ مسلمان، ۳۴ ہندو یعنی کل ۷۰ ارکان کا ہوگا، تین نمائندے دہلی، اجمیر اور کورگ کے اے گروپ میں اور بلوچستان کا نمائندہ بی گروپ میں شامل ہوگا۔

ہر گروپ اپنے صوبوں کی آئین سازی کا مجاز ہوگا ریاستوں کے ۹۳ ارکان ہوں گے جو ریاستوں کا دستور وضع کریں گے۔ ان نمائندوں کے سپرد پہلا کام آل انڈیا یونین کا دستور بنانا تھا اس کے بعد پھر اپنے اپنے صوبوں کا گروپ اور دستور تیار کرنا۔ اگر کسی گروپ کی اکثریت یہ فیصلہ کرتی کہ گروپ نہ بنے تو گروپ نہ بنتا۔ دستور کا طے کرنا دستور ساز اسمبلی کے اختیار میں تھا کہ وہ ملک کے لیے کس قسم کا دستور چاہتی ہے۔ دستور ساز اسمبلی کے لیے صرف ایک شرط تھی کہ وہ محولہ بالا نکات کی پابند ہوگی۔ اس پلان میں کانگرس کے موافق نکات حسب ذیل تھے کہ:

۱۔ کانگرس کا مطالبہ کامل آزادی تسلیم کر لیا گیا۔
۲۔ سارے ہندوستان کے لیے ایک دستور ساز اسمبلی مان لی گئی۔
۳۔ ہندوستان کی وحدت برقرار رہی اور ایک مرکز بھی باقی رہا۔
۴۔ دستور ساز اسمبلی میں نمائندگی آبادی کے لحاظ سے رکھی گئی۔
۵۔ ہندوستان کی اساس ایک قوم پر رکھی گئی اور ہندو مسلم، سکھ تین فرقے مانے گئے۔

اور کانگرس کے خلاف نکات یہ تھے کہ:

۱۔ مرکز کمزور رکھا گیا۔
۲۔ صوبوں کو پلان کے مطابق علیحدہ علیحدہ گروہ بنانے کی اجازت دی گئی، ہندوستان میں مذہباً تین خانے ہو گئے۔
۳۔ اقلیتوں کو حق دیا گیا کہ کوئی فرقہ وارانہ مسئلہ اس فرقے کی اکثریت کے خلاف ہو تو وہ انڈین یونین میں پیش نہیں کیا جا سکے گا۔

مسلم لیگ کے موافق نکات حسب ذیل تھے۔

۱۔ صوبوں کی گروہ بندی کر دی گئی اور بی سی گروپوں میں مسلمانوں کی اکثریت کو ملحوظ رکھا گیا۔ جو عملاً مسلمانوں کی عملداری میں ہوتے ان میں قطع و برید نہ ہوتی۔ بنگال میں آسام شامل تھا جو ہندو اکثریت کا صوبہ تھا لیکن ان دونوں کو ملا کر اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ فوج، امور خارجہ اور مواصلات کے سوا ہر بات میں صوبے خود مختار کیے گئے۔
۲۔ گروپوں میں صوبوں کی شرکت اختیاری نہیں بلکہ لازمی قرار دی گئی وہ چاہیں بھی تو ابتداً علیحدہ نہیں ہو سکتے تھے۔
۳۔ بی اور سی (عملاً مسلمان گروپ) اپنے اپنے حلقے کے لیے جس قسم کا آئین چاہیں بنا سکتے تھے۔
۴۔ یہ شرط کہ کسی فرقے کی اکثریت کے بغیر کوئی فرقہ وار سوال یا قانون انڈین یونین یا دستور ساز اسمبلی میں پیش نہ ہو سکے گا، مسلمانوں کے ہاتھ میں ایک زبردست حربہ اور بالفاظِ دیگر ان کے تحفظ کا ایک وثیقہ تھا۔
۵۔ صوبوں کو یہ حق دے دیا گیا کہ دس سال بعد وہ دستور پر نظر ثانی کرا سکتے اور ہندوستان سے علیحدہ

ہونے کی تحریک پیش کر سکتے تھے۔ بالفاظ دیگر دس سال بعد کاملاً علیحدگی ہو سکتی تھی اور یہی پاکستان تھا۔

مسلم لیگ کے خلاف نکات ذیل تھے۔

۱۔ مسلمانوں کے علیحدہ قوم ہونے کا نظریہ تصور تسلیم نہ کیا گیا۔

۲۔ دو دستور ساز اسمبلیاں نہ بنائی گئیں۔

۳۔ ملک تقسیم ہونے سے محفوظ رہا۔

۴۔ کوئی سا صوبہ جس صوبے سے چاہے الگ ہو سکتا تھا، مسلم لیگ کو مرکز میں نہ مساوی نمائندگی دی گئی نہ ایک تہائی بلکہ ۲۵ فیصد سے بھی کم یعنی ۳۸۵ کے ایوان میں صرف ۷۹ مسلمان تھے ۲۱ فیصد۔ ممکن تھا نمائندگی کے بعض خلا پر ہو جاتے اور بعض دوسری قباحتیں جو بعد میں تقسیم ملک کی نئی اسکیم کے باعث قتل انسانی کے ایک طویل و وسیع ہنگامے پر منتج ہوئیں کبھی پیدا ہی نہ ہوتیں۔ اگر کانگرس اور لیگ کے زعماء باہم دگر مذاکرات سے دوستانہ فضا میں کوئی حل تلاش کرتے۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اس کا انگریز ذمہ دار تھا اصل ذمہ دار وہ راہنما تھے جو آپس میں صف آرا تھے۔ لیکن انگریزوں کے ایوار ڈ پر تکیہ کئے بیٹھے تھے۔

وزارتی پلان کی تصدیق کے لیے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا اجلاس ۷ جولائی کو بمبئی میں طلب کیا گیا۔ ۶ جولائی کو ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا، چونکہ اشتراکی خیال کے لوگ پلان کی شدید مخالفت کر رہے تھے۔ اس لیے پلان کی منظوری سے متعلق ورکنگ کمیٹی کی قرارداد مولانا کے حوالے کی گئی، سوشلسٹوں نے اجلاس میں شدومد سے مخالفت کی۔ مولانا نے جوابی تقریر کی اور یہ اسی کا سحر تھا کہ محدود سے چند اشتراکیوں کے سوا قرارداد بھاری اکثریت سے پاس ہو گئی۔

لارڈ پیتھک لارنس اور سر کرپس نے مولانا کو لندن سے مبارکباد کے تار دیئے کہ ان کی ذہانت و فراست سے پلان پر آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے صاد کیا ہے لیکن مشہور مصرع ہے کہ ع

ما و رچہ خیالیم و فلک در چہ خیال

پنڈت جواہر لال نہرو نے ۱۰ جنوری ۱۹۴۷ء کو کلکتے میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ

"کانگرس دستور ساز اسمبلی میں اپنے تئیں معاہدوں کا پابند نہ سمجھے گی جس قسم کے حالات پیدا ہوں گے ان کے مطابق آزادانہ فیصلہ کرے گی۔"

پریس والوں نے کہا:

"تو گویا کیبنٹ مشن پلان میں ترمیم کی جا سکتی ہے۔"

جواہر لال نے کہا:

"ہم نے صرف دستور ساز اسمبلی میں شرکت کا معاہدہ کیا ہے۔ باقی ہم کیبنٹ مشن پلان میں تبدیلی اور کمی بیشی کرنے کے مجاز ہیں۔"

مولانا لکھتے ہیں:

"جواہر لال کا یہ بیان غلط تھا ہم نے تسلیم کر لیا تھا کہ مرکزی حکومت وفاقی ہو گی۔ صرف تین محکمے مرکز کے ماتحت ہوں گے۔ یہ صحیح نہ تھا کہ کانگرس اپنی مرضی کے مطابق کیبنٹ مشن پلان میں جو ترمیم چاہتی کر سکتی تھی۔ وہ دوسری جماعتوں کی رضامندی کے بغیر کوئی تبدیلی کی مجاز نہ تھی۔"

قائد اعظمؒ نے پنڈت جی کی ان تصریحات پر فوراً ہی ایک بیان میں اعلان کیا کہ جواہر لال کی اس توضیح سے صورت حال بدل گئی ہے۔ چنانچہ ۲۷ جولائی کو لیگ نے بمبئی میں ایک اجلاس منعقد کیا جس میں پنڈت جواہر لال کے اس بیان کو زیر بحث لا کر وزارتی پلان سے متعلق لیگ کی منظوری منسوخ کر دی پاکستان کے مطالبے کا اعادہ کیا اور حصول پاکستان کے لیے ڈائریکٹ ایکشن کی تجویز منظور کی۔ مولانا پنڈت جی کے اس بیان سے سخت پریشان ہوئے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے مذاکرات کا حاصل اکارت جا رہا ہے تو ۸ اگست کو کانگرس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بلوایا اور وزارتی پلان کی توثیق کا ورکنگ کمیٹی سے دوبارہ اعلان کرایا اور لیگ سے استرداد واپس لینے کی خواہش کی۔ قائد اعظمؒ نے کانگرس کی توثیقی قرارداد کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ ان کا بیان تھا کہ "کانگرس انگریز کی موجودگی میں اس قدر جلد رائے تبدیل کرتی ہے تو انگریز کے چلے جانے پر اس کا طرز عمل کیا نہیں ہو گا۔ وہ اس وقت بھی اپنی پالیسی اور پلان میں حسب منشا تبدیلی لا سکتی ہے۔"

ادھر ۱۲ اگست کو وائسرائے نے پنڈت جواہر لال نہرو کو انٹرم گورنمنٹ بنانے کی دعوت دی، ۱۵ اگست کو

کانگرس نے دعوت پر صاد کیا، پنڈت جی نے قائد اعظم کو دعوت شمول دی۔ انہوں نے انکار کیا۔ پنڈت جی قائد اعظم کے مکان پر گئے لیکن وہ راضی نہ ہوئے۔ گو لیگ نے ڈائریکٹ ایکشن کا مطلب واضح نہ کیا تھا۔ لیکن بنگال کی مسلم لیگ نے دس دن کی تعطیل عام کا اعلان کیا۔ ابھی کانگرس نے انٹرم گورنمنٹ قائم نہ کی تھی کہ بنگال میں ہندو مسلم فسادات کا لاوا پھوٹا اور جو پہلا دن صوبائی گورنمنٹ نے چھٹی کا مقرر کیا تھا عین اس روز کلکتے میں خون، قتل اور آگ کا طوفان امڈ آیا۔ سینکڑوں جانیں ضائع ہوئیں، ہزاروں زخمی ہوئے اور کروڑوں کی جائیداد برباد کی گئی۔ سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کا ہوا۔ انہیں پکڑ پکڑ کے آگ کے الاؤ میں جلایا گیا۔

ایک تاریخی سرگزشت میں قیاسات پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ مسلم لیگ نے پاکستان کے متعلق اپنے مطالبے کا اعادہ کیا تو اس کے پس منظر میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس سے قائد اعظم کو یقین ہو چکا تھا کہ پاکستان پر اصرار کیا گیا تو بن کر رہے گا۔ راقم نے اس زمانے میں بعض شریک راز ذمہ دار حلقوں سے کئی ثقہ باتیں سنی تھیں، جو لوگ تاریخ بنا رہے تھے جب تک وہ خود زبان و قلم پر نہ لائیں کچھ کہنا مشکل تھا۔

مولانا ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۶ء تک سات سال کانگرس کے صدر رہے اور آئندہ صدر رہنے کے متعلق کئی صوبوں کی رائے سے اتفاق نہ کرتے ہوئے انہوں نے ۲۶ اپریل ۱۹۴۶ء کو پنڈت جواہر لال کا نام صدارت کے لیے تجویز کیا اور وہ کانگرس کے صدر ہو گئے۔ انہی کے شرف بیان ہی کی آڑ لے کر لیگ نے وزارتی پلان کو مسترد کیا تھا۔ مولانا نے اپنے سوانح میں افسوس کیا ہے کہ انہیں صدارت سے الگ نہ ہونا چاہیے تھا، لیکن صدارت سے کنارہ کیا تو بظاہر اس کے وجوہ تھے مثلاً:

۱۔ مولانا سات برس سے کانگرس کی صدارت پر فائز تھے۔

۲۔ انہوں نے وزارتی مشن سے ہندوستان کی آزادی کے مسئلے پر گفتگو کی، لیکن شاید ان کے تحت الشعور میں یہ خدشہ تھا کہ مسلمانوں کی واحد نمائندگی سے متعلق مسلم لیگ کے اصرار کی سیاسی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ کانگرس کی صدارت پنڈت جواہر لال کو منتقل ہو تو بہتر ہے۔ مسٹر جناح کی سیاسی زبان میں جواہر لال ہندو تھے۔

۳۔ مسٹر جناح مولانا سے بات ہی نہ کرتے تھے۔

۴۔ ان کی سیادت کو مسلم لیگ کے اجتماعی غیظ نے عوامی اعتبار سے بے حد صدمہ پہنچایا تھا کہ مسلمانوں میں

ان کی آواز اکثریتی اعتبار سے کمزور تھی اور ہندوؤں کے نزدیک وہ بہرحال مسلمان تھے۔

۵۔ وزارتی مشن تو اپنا منصوبہ ایک پلان کی شکل میں دے کر جا چکا تھا۔ لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی آمد کے بعد مولانا کی صدارت شاید اس کے لیے موزوں نہ تھی۔

۶۔ کانگرس کی عمومی فضا کو ذہنی اعتبار سے مسلم لیگ نے ایک ایسی راہ پر ڈال دیا تھا کہ بہت سے نیشنلسٹ ہندو بھی اکثریتی اعتبار سے سوچ کے فرقہ وارانہ دائرے میں چلے گئے تھے اور ورکنگ کمیٹی کے بیشتر ارکان اسی رُخ پر طوعاً یا کرہاً غور کرنے لگے تھے۔

۷۔ سردار پٹیل کا تردید ... مولانا کے خلاف سازشی طائفہ تھا۔

۸۔ مسلمانوں کے خدشات کا ازالہ کرنے کے لیے مولانا ورکنگ کمیٹی میں بعض تجاویز کے محرک تھے کہ مسلمانوں کا اعتماد ان سے بحال ہو سکتا ہے وہ تجاویز کانگرس کی مجلس عاملہ کے نزدیک ناقابل قبول تھیں۔ اس باب میں اکا دکا ارکان ہی مولانا کے حامی تھے۔ واقعی امر یہ ہے کہ مولانا نے دستوری نقشے میں مسلمانوں کے لیے تحفظات کا جو منصوبہ تیار کیا اس پر گاندھی جی نے مولانا سے کہا تھا کہ اس سے پاکستان مان لینا بہتر ہے۔ مولانا نے اپنی توضیحات پیش کیں۔ تو گاندھی جی نے ان سے کہا کہ آپ کا ذہن یہی ہے تو آپ کی جگہ لیگ میں ہے آپ کانگرس سے مستعفی ہو کر لیگ میں چلے جائیں۔"

ادھر لیگ نے اس ایک سال میں مولانا سے وہ برتاؤ کیا کہ اخلاق و شرافت الف ننگا پھرنے لگے۔ مولانا سے ہندو ذہن اجتماعی طور پر مذہب کے فاصلے پر تھا اور لیگ نے مسلمانوں کو ان سے اس قدر برگشتہ کر دیا تھا کہ مولانا ان کے نزدیک سیاستہً متروک و مغضوب ہو چکے تھے۔

انٹرم گورنمنٹ قائم ہوئی تو مولانا کی تجویز پر ایک پارسی نمائندہ بھی لیا گیا لیکن اس کا انتخاب سردار پٹیل پر چھوڑ دیا گیا۔ انہوں نے اپنے بیٹے کا ایک دوست ایچ۔ سی۔ کھابھا تجویز کیا لیکن وہ انتخاب غلط ثابت ہوا۔ اس کو چند دن بعد کابینہ سے الگ کر دیا گیا۔ اس کی جگہ ایک دوسرے پارسی ڈاکٹر جان متھائی کو منتخب کیا گیا جو کانگرسی تو قطعاً نہ تھا لیکن اس عہدے کے لیے موزوں تھا۔ مولانا پر زور دیا گیا کہ انٹرم گورنمنٹ میں آجائیں لیکن گاندھی جی کے اصرار اور پنڈت جی کی استدعا کے باوجود وہ تیار نہ ہوئے اپنی جگہ آصف علی کو بھجوا دیا۔

مسلم لیگ ابتداً شامل نہ ہوئی اس کو غصہ بھی تھا اور مایوسی بھی، علاوہ بریں ملک بھر میں تلخی اور بے چینی تھی۔ آخر لارڈ ویول کی تحریک پر ۱۵ اکتوبر کو مسلم لیگ انٹرم گورنمنٹ میں شامل ہوگئی۔ مولانا نے بیان جاری کیا کہ مسلم لیگ کے تمام وہ اندیشے جنہیں حق بجانب کہا جا سکتا ہے۔ کیبنٹ مشن کی تجاویز سے دور ہو جاتے ہیں۔ مگر مولانا کی آواز لیگ کے نزدیک قابلِ اعتنا ہی نہ تھی۔

قائداعظمؒ نے انٹرم گورنمنٹ میں نواب اسمٰعیل میرٹھی اور خواجہ ناظم الدین کو شامل نہ کیا۔ مولانا کے نزدیک اس کا سبب یہ ہر دو کا خود رائے ہونا اور ان کے سیاسی فہم کی پختگی تھا، اور جوگندر ناتھ منڈل کا انتخاب لیگ کے اس دعوے کی نفی تھا کہ وہ مسلمانوں کی نمائندہ ہے وہ ایک شیڈول کاسٹ کی نمائندہ کیونکر ہوئی؟ مولانا لکھتے ہیں کہ:

”رفیع احمد قدوائی کی تجویز پر مالیات کا محکمہ لیگ کو دینے پر غور کیا گیا تو سردار پٹیل نے اس تجویز کو غنیمت سمجھا اور اس کی پُرزور تائید کی۔ کیونکہ سردار وزارت داخلہ اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔ ان سے کہا گیا کہ مالیات لیگ کے حوالے کی گئی تو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا مسٹر پٹیل کا جواب تھا کہ لیگ اس محکمہ کو سنبھال نہیں سکے گی اس لیے وہ اسے منظور نہیں کرے گی۔ چودھری محمد علی جو مالیات کے شعبے میں تھے انہوں نے قائداعظم کو مشورہ دیا کہ مالیات کا محکمہ قبول کر لیں۔ یہ ایک بڑی اور بنیادی چیز ہے۔“

مولانا لکھتے ہیں کہ:

”مسٹر لیاقت علی کے پس منظر میں چودھری محمد علی نے وزارت مالیات کی میچان سے کانگریس کو ایسا زچ کیا کہ کانگریس نے محسوس کر لیا کہ مالیات دے کر اس نے بہت سخت غلطی کی ہے۔

لیگ اور کانگریس میں جو جھگڑا تھا وہ مالیات کا شعبہ دے کر تلخ ہو گیا۔ سردار پٹیل کو معلوم ہو گیا کہ اس شعبے کی منظوری کے بغیر وہ ایک چپڑاسی بھی نہیں رکھ سکتے۔ لیاقت علی ان کی تجاویز پر قلم پھیر دیتے یا ان کو اس طرح سے کر دیتے کہ صورت ہی بدل جاتی، دفاع کا محکمہ لیگ اور کانگریس کی نزاع کے باعث بلدیو سنگھ کو دیا گیا۔ اس طرح کے چھوٹے چھوٹے واقعات آویزش بڑھاتے رہے، انگریزی فوجیں وزیرستانی علاقے پر بمباری کر رہی تھیں، جواہر لال نے آرڈر دے کر روک دیا اور خان بھائیوں کی دعوت پر ذاتی مشاہدے کیلئے سرحد گئے، بعض دوستوں نے حالات کے فرقہ وارانہ ہیجان کو محسوس کرتے ہوئے روکنا چاہا، وائسرائے نے

بھی یہی مشورہ دیا لیکن پنڈت جی نہ مانے۔ پشاور پہنچے تو لیگ کے جم غفیر نے سیاہ جھنڈیوں سے استقبال کیا اور سخت مزاحمت کی۔ قبائلی علاقے میں گئے جہاں انگریزی فوج کی بمباری رکوائی تھی اور انگریز اس علاقے کو ہمیشہ اپنی جنگی مشقوں کے لیے استعمال کرتا تھا تو وہاں سرکاری ملکوں نے راستوں میں پتھراؤ کرایا۔ یہ واقعات معمولی نہ تھے۔ ظاہر ہے کہ اس سے ہندو ذہن مشتعل ہوتا تھا۔ وزیرستان پہلی جنگ عظیم سے انگریزوں کی جنگی مشقوں کا میدان تھا۔ جب بارود کی طبعی عمر ختم ہونے لگتی تو اس علاقے میں آزمائشی تجربے کیے جاتے۔ مسٹر چرچل پہلے انگریزی فوج میں بھرتی ہوئے تو جنگ کی مشقوں کے لیے اسی علاقے میں آئے تھے۔

لارڈ ویول ان ملکوں اور افسروں کو سزا دینے کے حق میں تھے جو اس مظاہرے و مجاہرے کے منتظم تھے لیکن پنڈت نہرو نے معاف کر دیا۔ اور کہا کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں۔

لیگ اور کانگرس کی آویزش کے تیز ہونے اور وزارتی پلان کے مسترد کیے جانے پر مسٹر اٹیلی نے لارڈ ویول کے علاوہ جانبین کے نمائندوں کو لندن بلوایا۔ پنڈت نہرو تو لندن جانے پر آمادہ نہ تھے لیکن لارڈ ویول نے مولانا سے درخواست کی اور مولانا نے پنڈت جی کو راضی کر لیا۔ چنانچہ کانگرس کی طرف سے پنڈت جی، سکھوں کی طرف سے بلدیو سنگھ اور لیگ کی طرف سے قائد اعظمؒ و لیاقت علی لندن گئے۔ ۳ سے ۶ دسمبر تک گفتگو ہوئی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ مسئلہ گروپوں کا تھا۔ مسٹر گوپی ناتھ باردولائی چیف منسٹر آسام بنگال سے الحاق کے خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہم شروع ہی سے الگ ہو سکتے ہیں۔ مسٹر جناح کہتے تھے کہ آئین سازی کے بعد علیحدگی ہو سکتی ہے۔ یہی اختلاف لندن کے مذاکرات میں بھی زیر بحث رہا۔ مولاناؒ لکھتے ہیں کہ:

"اس بارے میں مسٹر جناح کے دعوی میں خاصی صحت تھی۔ ۶ دسمبر کو وزارتی مشن نے لیگ کے موقف کو درست قرار دیا لیکن لیگ و کانگرس کے اختلافات جوں کے توں ہی رہے۔"

۹ دسمبر ۱۹۴۶ء کو مجلس دستور ساز اسمبلی کی صدارت کا سوال پیدا ہوا۔ جواہر لال اور سردار پٹیل نے مولانا پر زور دیا کہ وہ صدر بن جائیں لیکن مولانا راضی نہ ہوئے۔ بابو راجندر پرشاد کو صدر بنایا گیا۔ اب گاندھی جی نے اصرار کیا اور جواہر لال بھی مصر ہوئے کہ مولانا وزارت میں شریک ہوں۔ چنانچہ مولانا محکمہ تعلیم کے وزیر ہو کر شامل ہو گئے۔

مولانا لکھتے ہیں کہ:

"لیگ اور کانگرس کا اختلاف بڑھتا ہی جا رہا تھا اور لیگ کے اکان قدم قدم پر رکاوٹیں پیدا کر رہے تھے۔"

لیاقت علی کا بجٹ بظاہر کانگرس کے ان معاشی نظریات کے حق میں تھا جن کا اظہار پنڈت جواہر لال نہرو مختلف اوقات میں کرتے رہے تھے لیکن اصلاً اس سے کانگرس کو زچ کرنا مقصود تھا، سردار پٹیل اور راجگوپال آچاریہ بجٹ کے سخت خلاف تھے۔ وہ چاہتے تو اسی وقت تعطل پیدا ہو سکتا تھا لیکن مولانا نے ساتھیوں کو سمجھایا کہ بجٹ کانگرس کی اعلان کردہ پالیسی سے قریب ہے ہمیں اصول نہ توڑنا چاہئیں۔ بلکہ بجٹ کا شق وار جائزہ لینا چاہیئے۔

دونوں پارٹیوں کے اختلاف فرقہ وار فسادات نے اس حد تک نمایاں کر دیئے تھے کہ سول وار نہیں تو سول وار کی فضا موجود تھی۔ مسٹر ایٹلی وزیر اعظم انگلستان چاہ رہے تھے کہ ہندوستان کی آزادی کی تاریخ مقرر کی جائے۔ ممکن ہے اس طرح جانبین کو ہوش آجائے، مگر لارڈ ویول پہلے فسادات کی فضا ختم کرنے اور جانبین میں مفاہمت کے خواہاں تھے، اختلاف اس حد تک پہنچا کہ لارڈ ویول نے وائسرائیلٹی سے استعفیٰ دے دیا۔ مولانا لکھتے ہیں کہ:

"انگریز چاہتا تو اور دس سال تک حکومت کر سکتا تھا۔"

سردار عبدالرب نشتر نے بھی راقم سے کہا تھا کہ ہم چاہتے تھے انگریز ابھی ٹھہر جائے۔ مگر وہ رخصت ہونے کی ٹھان چکا تھا اور کسی طرح بھی ٹھہرنے کے لیے راضی نہ تھا۔

لارڈ ویول مسٹر ایٹلی سے اختلاف کی بنا پر استعفیٰ دے کر جا رہے تھے۔ تو مولانا نے ایک بیان میں ہندوستان سے متعلق ان کی خدمات پر اظہار تحسین کیا، اور مبارکباد دی کہ ان کی مساعی سے برعظیم اپنی منزل تک پہنچ چکا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ "پنڈت نہرو اور ان کے بعض ساتھی لارڈ ویول کو پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن میں نے ان سے متعلق بیان دینا اپنا فرض سمجھا۔" ویول نے کابینہ کی صدارت کرتے ہوئے مندرجہ ذیل کلمات کہے کہ:

"میں ایک بہت ہی مشکل وقت میں وائسرائے بنا تھا، میں نے اپنی ذمہ داری کو پورا کرنے کی امکانی کوشش کی، اب ایسی صورت پیدا ہو گئی ہے کہ مجھے مستعفی ہونا پڑا ہے تاریخ بتلائے گی کہ اس مسئلے پر میرا استعفیٰ دینا صحیح تھا یا نہیں۔ بہرحال میری آپ سے درخواست

ہے کہ عجلت میں کوئی فیصلہ نہ کریں۔ آپ لوگوں نے میرے ساتھ جو تعاون کیا، میں شکر گزار ہوں۔"

اتنا کہا اپنے کاغذات سنبھالے اور اٹھ کر چلے گئے پھر دوسرے ہی دن دہلی سے روانہ ہوگئے۔

ان کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا تقرر ہوا۔ وہ شاہی خاندان کے فرد تھے اور انگریزی فوج میں امیرالبحر۔ مسٹر ایٹلی نے انہیں ۳۰ جون تک اختیارات منتقل کر دینے کی ہدایات دے کر روانہ کیا۔ وہ ۲۲ مارچ کو دہلی پہنچے اور ۲۳ مارچ کو اپنے عہدے کا چارج لیا۔

مولانا نے ان سے کئی ملاقاتیں کیں اور زور دیا کہ وہ کانگرس اور لیگ کے مناقشے کو ختم کرانے کے لیے سمجھوتے کی نیو اٹھائیں۔ مولانا چاہتے تھے کہ ماؤنٹ بیٹن مفاہمت کی راہ نکالیں، لیکن جواہر لال اور سردار پٹیل متفق نہ ہو سکے، ادھر ملک کے حالات خرابی کی انتہا پر تھے، حکومت کا نقشہ بھی مخدوش ہو چکا تھا۔ ہندوستانی افسر فرقہ وارانہ ذہن میں بٹ چکے اور کام نہیں کرتے تھے۔ بلکہ خرابی کا باعث ہو رہے تھے۔ انگریز افسروں کا ویسے ہی جی نہیں لگ رہا تھا وہ جانتے تھے کہ جا رہے ہیں لہٰذا ان میں کوئی بھی دلچسپی نہ رہی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم کی نیو اٹھائی۔ انہوں نے سب سے پہلے سردار پٹیل کو تقسیم پہ تیار کیا اور وہ بعجلت قائل ہو گئے کہ پاکستان کو دو ٹکڑے دے کر وہ ایک عظیم ہندوستان کے مالک ہو جائیں گے۔ پنڈت جواہر لال بھی ایک آدھ دن میں تقسیم پر راضی ہو گئے۔ انہیں ہموار کرنے میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے علاوہ لیڈی ماؤنٹ بیٹن اور سردار پٹیل کا ہاتھ تھا، ان کے علاوہ کرشنا مینن ان کے مشیر تھے۔ مولانا کے نزدیک مینن غلط مشورے دیتے تھے۔

مولانا تقسیم کو ہولناک خیال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک تقسیم ہندوستان کا زیاں تھا اور مسلمانوں کے مسئلے کا حل بھی نہ تھا کہ پاکستان نہ تو سارے ہندوستان کے مسلمانوں کا گھر ہو سکتا تھا، نہ مسلم لیگ نے اپنے جارحانہ پالیٹکس کی بدولت ان سب سے ووٹ لیے تھے، اور نہ پاکستان و ہندوستان بٹوارے کے بعد آپس میں دوست ہو سکتے تھے۔ مولانا کے نزدیک اصل مسئلہ فرقہ داری نہیں معاشی تھا اور اختلافات جماعتوں کے درمیان نہیں طبیعتوں کے درمیان تھے۔ مولانا نے اپنے ساتھیوں پر زور دیا کہ اس کا آخری نتیجہ مفید نہ ہوگا، نفرت بالآخر باہمی جنگ کا سرآغاز ہوگی۔ جو چیز نفرت پر بن رہی ہو اس کے متعلق کوئی مثبت رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انجام کیا ہوگا، دونوں کے مابین

ہمیشہ ذہنی لڑائی رہے گی لیکن سردار پٹیل تقسیم پر تُل چکے تھے اور علی الاعلان کہنے لگے تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک ساتھ رکھنا ناممکن ہو چکا ہے۔ جواہر لال تقسیم نہیں چاہتے تھے لیکن ان کے نزدیک بھی اب کوئی دوسرا حل نہ تھا۔

مولانا لکھتے ہیں کہ:

"میں تقسیم کے ہمیشہ خلاف تھا کیونکہ میرے خیال میں مسلمانوں کے لیے اس میں ہر اعتبار سے خسارہ تھا بلکہ ان کا وجود خطرے میں پڑتا تھا اور بیس پچیس سال کے اندر اندر تقسیم کے مرجھا جانے کا امکان تھا۔"

مولانا نے گاندھی جی سے رجوع کیا انہوں نے مولانا سے کہا کہ "تقسیم میری لاش پر ہوگی اور کانگرس میری لاش ہی پہ تقسیم کر سکتی ہے۔" اسی دن اور اس کے بعد مزید دو روز گاندھی جی لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملے، پھر سردار پٹیل سے ملاقات کی، ہوا کیا؟ ہوا یہ کہ گاندھی جی بھی تقسیم پر راضی ہو گئے۔ اس دوران میں تقسیم کو روکنے کے لیے مولانا نے کئی تجویزیں سوچیں، لیکن ماؤنٹ بیٹن مقتدر تھا، مولانا بے بس تھے۔ کانگرس تقسیم کے مسئلے میں اس کی ہمنوا ہو چکی تھی، نہرو اور پٹیل کے بعد کسی اور شخصیت کے ردو قبول کا سوال ہی نہ تھا۔ لیگ کا مطالبہ ہی تقسیم تھا۔ اور وہ مولانا سے بات چیت کے لیے تیار نہ تھی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم سے متعلق اس طرح کا خاکہ تیار کیا جس میں پنجاب اور بنگال بھی تقسیم کیے گئے۔ مولانا نے ان سے مل کر تقسیم کو روکنے پر زور دیا، اور وزارتی پلان کو بہترین حل قرار دیتے ہوئے دلائل بیان کیے، ماؤنٹ بیٹن نے بظاہر مولانا سے اتفاق کیا لیکن اندرون خانہ وہ تقسیم کا پلان لے کر اس کی توثیق کے لیے ۱۸ مئی کو لندن گیا اور ۳۰ مئی کو دہلی آ گیا۔ اس نے ۲ جون کو کانگرس اور لیگ کے نمائندوں سے گفتگو کی اور ۳ جون کو اپنے پلان کا اعلان کر دیا۔ اس پلان سے ہندوستان ہی نہیں پاکستان بھی تقسیم ہو گیا۔ اس میں برطانوی سلطنت کی ایک خاص حکمت عملی تھی وہ برِ عظیم میں اپنے معاشی و صنعتی تحفظات چاہتی تھی اور وہ اس طرح اسے حاصل ہو جاتے تھے۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی نے ۳ جون کو اس پلان پر غور کرنے کے لیے اجلاس طلب کیا جس میں صوبہ سرحد کے مسئلے پر غور کیا گیا کہ عمر بھر کی مشترکہ جدوجہد کو تیاگ کر صوبے کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ گاندھی جی کی ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کے بعد خان عبد الغفار خان قائد اعظم سے ملے لیکن پاکستان بن جانے کے بعد ان سے خان وزارت اور خدائی خدمت گاروں سے جو سلوک ہوا وہ

اظہر من الشمس ہے۔

اس تقسیم پر ۱۴ جون ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے صاد کیا۔ مولانا نے تقسیم کو ایک سیاسی حادثے سے تعبیر کیا، اور اپنی تنقیدی تقریر میں کہا۔

"پانی پر چھڑی رکھ دینے سے ایسا معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے لیکن پانی جوں کا توں رہتا ہے اور چھڑی کے ہٹتے ہی ظاہری تقسیم غائب ہو جاتی ہے۔"

سردار پٹیل نے مولانا کی تقریر پر نقد و نظر کرتے ہوئے ان کے بنیادی نکات سے اختلاف کیا اور تردید میں کہا کہ ملک کے موجودہ حالات میں مسائل کا صرف یہی ایک صحیح اور مفید حل ہے۔ سردار پٹیل دیکھ رہے تھے کہ ان کے ہاتھ میں ایک عظیم ہندوستان آ رہا ہے آخر ۲۹ ممبروں نے تجویز کے حق میں اور پندرہ نے تقسیم کے خلاف ووٹ دیا اور اس طرح تجویز منظور ہو گئی۔ کہا گیا کہ دونوں ملکوں کی اقلیتیں ایک دوسرے کے لیے ضمانت نامہ ہوں گی، انہیں بعض سیاست دانوں نے یرغمال قرار دیا، لیکن مغربی پاکستان سے تمام ہندو نکال دیئے گئے اور مشرقی پاکستان میں ایک بڑی تعداد رہ گئی۔ ان کا ذہن گھات میں رہا۔ جنرل یحییٰ خان کی ہدایت پر مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کی فوج کا ایکشن بلاشبہ ایک دردناک سانحہ تھا، نتیجۃً مشرقی پاکستان ختم ہو گیا۔

غرض ۱۹۴۶ء میں اس ذہنی فضا کا بدیہی ردِ عمل ۱۹۴۶ء کے وہ ہولناک فسادات تھے جو ہمہ گیر ہوتے گئے۔ کلکتے میں مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا، تو نواکھالی ہندوؤں کے لیے میدانِ حشر ہو گیا، اس کا ردِ عمل بہار میں ہوا۔ راقم نے مولانا کے حسبِ ارشاد بہار کے فسادات میں متاثرین کے لیے ڈیڑھ ماہ تک خدمات انجام دیں اور خطرناک سے خطرناک علاقوں میں جا کر مسلمانوں کو نکلوایا۔ ان کی بے شمار آبروؤں کو برآمد کیا۔ فساد کیا؟ قیامتِ صغریٰ کا نقشہ تھا، مسلمان جوانوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا، بوڑھوں کو روندا گیا، جوان عورتیں اٹھا کر اچھوتوں میں بانٹ دی گئیں۔ مکانات جلا دیئے گئے، بچے اور بچیوں کو مسجدوں کی دیواروں پر کیلوں سے ٹھونک دیا گیا۔ تقریباً ہر مکان کے اندر ایک کنواں تھا، جس میں عورتوں کی لاشوں کے ڈھیر تھے ستم یہ کہ اس فساد کو خود کانگرس کے سنگھٹنی راہنماؤں نے منظم کیا۔ مثلاً مسٹر انوگرا نارائن وزیر مالیات بہار اس کے منتظم تھے، وہ غالی قسم کے ہندو، انتہائی فرقہ پرست اور صوبے کے وزیر اعظم سر کرشن سنہا کے حریف تھے، سنہا ایک سچا نیشنلسٹ تھا۔ لیکن انوگرا سنہا کو پچھاڑ کر خود وزیر اعلیٰ ہونا چاہتا تھا۔ افسوسناک پہلو

یہ تھا کہ بابو راجندر پرشاد نے اس ہولناک فساد سے اغماض کیا۔ جے پرکاش نارائن طرح دے گئے۔ ماسہا نے قبل از وقت مولانا کو مطلع کر دیا۔ ان دنوں ہم دہلی ہی میں تھے۔ مولانا نے شیخ حسام الدین اور راقم کو بلوایا اور بہار میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلے جانے کی تیاری سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ نواکھالی کا ردِ عمل بہار میں ہوگا۔ اس کا منصوبہ بن چکا ہے۔ ایک۔ تو نواکھالی میں جو کچھ ہوا اس کی مذمت کرو، دوسرے اعلان کر دو کہ آپ ایک بڑا دستہ لے کر نواکھالی کے مظلوموں کی مدد کے لیے جا رہے ہو۔ اور فوراً چلے جاؤ۔ شیخ صاحب نے حامی بھر لی۔ مجھے مولانا نے ایک ضروری کام کے لیے لاہور بھجوا دیا۔ شیخ صاحب کسی وجہ سے نہ جا سکے، مولانا کا خیال تھا کہ اس طرح شاید وہ گاندھی جی کو بہار کے متوقع فساد سے مطلع کر کے ایک آدھ دن میں پٹنہ یا گیا بھجوا دیں گے لیکن شیخ صاحب کا بیان یا اعلان نہ آسکا، تو لحظہ بہ لحظہ بدلتی ہوئی صورت حالات خراب سے خراب ہو گئی۔ بہار میں مسلمانوں کا خون گنگا کا پانی ہو گیا، انسان مولی گاجر کی طرح کاٹ دیئے گئے، مولانا اڑ کر وہاں پہنچے اور کئی متاثرہ مقامات پر گئے۔ شر پسند عصبیتوں کا ذہن مسلمانوں کے خون کی بو اور عورتوں کے اغوا کا تماشا دیکھ سکتا اور دیکھ رہا تھا۔ مگر اسے مولانا آزاد یا کسی بھی نیشنلسٹ مسلمان کی اعانت گوارا نہ تھی۔ بہار کے لیگی زعما پرلے درجے کے تنگ دل اور بزدل تھے لیکن مسلمان ان کا شکار ہو کر بھی ان کی داغدار سیرتوں پر بھروسہ کرتے اور وہ ان کو استعمال کر رہے تھے۔

ملک خضر حیات ٹوانہ نے مارچ ۱۹۴۷ء میں استعفیٰ دیا تو پنجاب میں فساد شروع ہو گیا۔ گیانی کرتار سنگھ نے ماسٹر تارا سنگھ کے ہمراہ اسمبلی ہال کے باہر کرپان لہراتے ہوئے اعلان کیا کہ پاکستان قائم نہ ہوگا۔ لاوا پھوٹا تو امرتسر میں ڈھیروں خون سے انسانی جسموں کی چتائیں روشن ہو گئیں۔ سکھوں اور سنگھٹنیوں کے حملے وحشیانہ تھے کہ وہ عورتوں پر ہاتھ اٹھاتے اور انہیں اڑا لے جاتے تھے۔ ادھر مسلمانوں میں بھی بہت سے وحشی تھے۔ جانبین کی عقلیں ماؤف ہو چکی تھیں۔ دوشیزائیں بتوں کی طرح فروخت ہو رہی تھیں۔ ان کا جرم یہ تھا کہ وہ ہندو، مسلمان، یا سکھ تھیں۔ چرس خانے اور چانڈو خانے محفوظ تھے باقی سب ایک دوسرے کے اشتعال وا[illegible] زد میں تھا۔ راولپنڈی کے سورماؤں نے کہوٹہ میں ماسٹر تارا سنگھ کی بوڑھی والدہ کو وحشیانہ طور پر چیر دیا۔ گڑھ مکتیشر کے علاقے میں مسلمانوں کے ساتھ یہی ہوا۔ پورا ملک اغوا، خون، قتل، آگ اور وحشت کا نگر تھا۔

ان حالات میں ۱۴ اگست کو پاکستان قائم ہو گیا اور ۱۵ اگست کو ہندوستان آزاد ہوا لیکن دونوں

طرف انسانوں کا لہو بہتا رہا اور انخلا کا سیلاب بیکراں ہو گیا۔ مسٹر ریڈ کلف کو سرحدوں کا تصفیہ کرنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ لیکن اس نے سیاسی فیصلہ کیا۔ گورداسپور کا ضلع مسلمانوں کی اکثریت کے باوجود ہندوستان کی نذر کیا، جہاں تک تقسیم ملک کے مرکزی اثاثہ کا تعلق تھا۔ اکثر مشکلیں آسان ہو گئیں۔ لیکن دشواریوں کا ایک انبار تھا، ہندوستان کو تین چوتھائی اور پاکستان کو ایک چوتھائی فوج ملی۔ ملازموں کے متعلق مولانا کا خیال تھا کہ ان کی فرقہ وار تقسیم خطرناک ہوگی انہوں نے ماؤنٹ بیٹن سے ذکر کیا وہ راضی ہو گئے۔ مسلمانوں کو حق دیا گیا کہ وہ مستقل یا عارضی طور پر جہاں چاہیں رہ سکتے ہیں لیکن لیگ کو اصرار تھا کہ مسلمان ملازم پاکستان چلیں۔ کچھ گنے چنے مسلمان ہندوستان میں رہے لیکن ان میں سے بھی کئی ایک چند ماہ بعد پاکستان آ گئے۔ اس طرح ہندوستان مسلمان ملازموں سے تقریباً خالی ہو گیا جو عمومی لحاظ سے ہندوستانی مسلمانوں کا قہر جانکنی تھا۔

ہندوستان نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو گورنر جنرل نامزد کیا اور اب وہ محض ایک آئینی سربراہ تھا لیکن پاکستان نے اس کے الٹ قائد اعظمؒ کو گورنر جنرل بنایا، جو طے شدہ فیصلے کے خلاف تھا، نتیجۃً مسلمانوں کو ابتداءً سخت قسم کی دشواریوں اور مشکلوں میں سے گزرنا پڑا۔ خون کا طوفان ٹھاٹھیں مارتا رہا۔ وہ ریل گاڑیاں جو مسافروں کو ایک ڈومینین سے دوسری ڈومینین میں لا رہی تھیں، موت کا شکنجہ بن گئیں۔ ان کے مسافروں کو مختلف اسٹیشنوں پر اتار کر موت کی نیند سلا دیا گیا۔ مسلم لیگی عوام اس صورتحال سے نابلد تھے۔ ان کے نزدیک پاکستان یہ نہیں تھا لیکن اب وہ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ایک مخلوق انہیں موت کے گھاٹ اتار رہی ہے۔ سب سے زیادہ خوفناک طرز عمل جانبین کی پولیس اور فوج کا تھا کہ وہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتروانا اپنا فرض سمجھتیں اور بزعم خویش ثواب کما رہی تھیں۔ باؤنڈری کمیشن کا ایک عسکری دستہ امرتسر کے ایک ہوٹل میں داد عیش دیتا رہا۔

سردار پٹیل نے آئی این اے کے میجر جنرل موہن سنگھ کو مسلمانوں سے نمٹنے کے لیے فرقہ وارانہ تنظیم کا سربراہ بنا دیا۔ اس نے اپنے ہندو اور سکھ رضاکار [illegible] ملا کر مسلمانوں کے قتل عام کی بنا ڈالی اور مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ مولانا آزاد کی تجویز و تحریک پر پنڈت جواہر لال نے بعض معروف شہروں میں جنوبی ہندوستان سے فوج طلب کر لی۔ اس کا ذہن تقسیمی اثرات سے محفوظ تھا۔ اس نے بہت جلد امن قائم کر لیا اور اس طرح ایک خونیں طوفان نکل گیا۔

ادھر دہلی کی حالت یہ تھی کہ کوئی مسلمان اس یقین کے ساتھ رات کو سو نہیں سکتا تھا کہ دوسرے دن وہ زندہ اٹھے گا۔ مولانا نے جامع مسجد میں انہی دنوں مسلمانوں سے عظیم خطاب کیا۔ انہیں جھنجوڑا اور جگایا کہ انہوں نے اپنی پستی ہمت کا نام تقدیر رکھ دیا ہے۔ مولانا نے ان کی شریانوں میں لہو دوڑایا اور ان کی پژمردگی کو شگفتہ کرنے کے لیے کہا کہ:

"یہی وہ جمنا ہے جہاں تاریخ کی صبح طلوع ہونے سے پہلے تم نے پڑاؤ کیا تھا اور صبح کی اذانیں دی تھیں۔"

مولانا نے مختلف محلوں کا چکر لگایا اور جو لوگ سراسیمہ ہو کر جاگ رہے تھے انہیں سنبھالا دیا۔ یہ تمام واقعات مولانا نے گاندھی جی سے بیان کیے اور بتایا کہ مسلمانوں کی زندگی اجیرن ہو چکی ہے۔ گاندھی جی نے واقعات سنے تو "مرن برت" کا فیصلہ کیا اور مولانا سے کہا کہ اس صورت میں گاندھی کے لیے زمین کا پیٹ اس کی پیٹھ سے بہتر ہے۔

گاندھی جی کو ذرہ ذرہ کا علم تھا۔ اصل نوعیت یہ تھی کہ انتظامیہ فرقہ واریت میں ڈوبی ہوئی تھی قتل عام اس کا چسکہ تھا۔ سردار پٹیل اس صورت حال سے اغماض کر رہے تھے۔ ان کے نزدیک اس قسم کے واقعات اکا دکا اور جوابی نوعیت کے تھے، جواہر لال نہرو اس ہولناک قساوت قلبی سے کبیدہ خاطر تھے لیکن سردار پٹیل اپنی سی کہے اور کیے جا رہے تھے۔ اس ہمہ گیر خرابی سے دل برداشتہ ہو کر مسلمانوں کو پرانے قلعوں اور مختلف مزارات میں رکھا گیا۔ آخر کار گاندھی جی نے ۱۲ جنوری ۱۹۴۸ء کو "مرن برت" شروع کیا۔ سردار پٹیل ناراض ہو کر بمبئی چلے گئے، کہ گاندھی جی ان کی حکومت کو بدنام کر رہے ہیں، برت حقیقتہً سردار پٹیل ہی کی وزارت کے خلاف احتجاج تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کابینہ سے کہہ چکے تھے کہ فوج کے ہندو سپاہی اور افسر مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کو قتل کرنے میں شریک ہونا چاہتے تھے لیکن برطانوی افسروں نے بڑی مشکل سے روکا ہے۔ فسادات اس قدر خوفناک اور لرزہ خیز تھے کہ پورا ملک ان کی آگ میں جل رہا تھا اور ملک بھر میں کوئی علاقہ ایسا نہ رہا تھا جو ان کی لپیٹ میں نہ ہو۔

ہندوستان کی آزادی ۱۵ اگست کی شب کو بارہ بجے شروع ہوئی، ایک عظیم جشن منایا گیا، لیکن مولانا اس میں مطلقاً شریک نہ ہوئے، چودھری خلیق الزمان نے "ترنگا" کو سلام کیا اور ہندوستان سے وفاداری کا حلف اٹھایا مگر اس کے چند دن بعد فرار ہو کر پاکستان آ گئے۔

مولانا آزادی کی اس رات کو سخت غمگین تھے۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ ان کے خوابوں کی دنیا اُجڑ چکی ہے ادھر مسلمانوں کی بدقسمتی اور بزدلی شباب پر تھی، مولانا دیکھ رہے تھے کہ بعض مسلمان زعماء سردار پٹیل کی چوکھٹ کا طواف کر رہے ہیں۔ ان کا لہو کھولتا تھا لیکن دل پہ ایک داغ تھا۔ نواب اسمٰعیل میرٹھی اور چودھری خلیق الزمان مولانا کے پاس گئے کہ وہ جامع مسجد کے پاس اردو باغ میں سردار پٹیل کو سپاسنامہ دینا چاہتے اور اس طرح مسلمانوں کو تحفظ دلوانے کی فکر میں ہیں۔ مولانا نے ان سے کہا کہ اس طرح قومی حمیت مجروح ہوگی، ملی انا حمیت ہی سے باقی رہتی ہے، فسادات ناگزیر ہیں یہ سب ردِ عمل ہے لیکن یہ بادل بہت جلد چھٹ جائیں گے۔ آپ حوصلہ قائم رکھیں کسی کے سامنے جھکنے کی ضرورت نہیں اور نہ الحاح وزاری کام آسکتی ہے۔ پتھروں میں جونک لگانے سے کچھ نہیں ملے گا۔

مسلمان متعلقہ عہد کے پرانے کھنڈروں میں پڑے تھے یا بعض شہید ہو چکے تھے [illegible] رہ جانے بیٹھے تھے مولانا نے کئی سو خاندانوں کو اپنی کوٹھی میں جگہ دی؛ اور ان میں وہی لوگ زیادہ تھے جو دہلی میں مسلم لیگ کا دست و بازو تھے، لیکن اب نتائج نے انہیں بے بس کر دیا تھا۔

گاندھی جی کا مرن برت سردار پٹیل کے لیے سوہانِ روح ہو گیا لیکن اس [illegible] سے دہلی کی مسموم فضا میں تبدیلی آنے لگی، سردار پٹیل گاندھی جی کی تالیف سے تھے لیکن اب گاندھی جی سے نالاں تھے۔ وہ ساتھیوں سے بھی کہتے کہ مہاتما جی نے برت رکھ کر انہیں ملعون و بدنام کیا ہے اور اس طرح ہندوؤں کا منہ کالا ہو رہا ہے گاندھی جی کے پاس پورا دہلی امڈ آیا کہ فسادات روک دینے کے لیے ان کے عقیدت مند سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار ہیں برت ترک کر دیں گاندھی جی نہ مانے ان کی شرط تھی پہلے فسادات ختم ہوں اور مسلمانوں کے تحفظ کی ضمانت دی جائے تب وہ بھوک ہڑتال ترک کریں گے آخر گاندھی جی نے شرائط ذیل منوا کر برت ختم کیا۔

۱۔ ہندو اور سکھ مسلمانوں پر حملہ کرنا فوراً بند کر دیں اور انہیں یقین دلائیں کہ آئندہ سب بھائیوں کی طرح ساتھ ساتھ رہیں گے۔

۲۔ ہندو اور سکھ ہر طرح کوشش کریں کہ ایک مسلمان بھی جان و مال کے ڈر سے ہندوستان نہ چھوڑے۔

۳۔ چلتی گاڑیوں میں مسلمانوں پہ جو حملے کئے جا رہے ہیں وہ فوراً بند کئے جائیں اور ہندوؤں اور

سکھوں کو جو اس طرح کے حملوں میں شرکت کر رہے ہیں روکا جائے۔

۷۔ جو مسلمان نظام الدین اولیاءؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور حضرت ناصر الدین چراغ دھلویؒ کی درگاہوں کے آس پاس رہتے اور خوف کی وجہ سے اپنے مکانات چھوڑ کر چلے گئے ہیں انہیں واپس لا کر ان کے مکانوں میں آباد کیا جائے۔

۸۔ خواجہ بختیار کاکیؒ کی درگاہ کو جو نقصان پہنچا ہے حکومت اس کی مرمت کرانے پر آمادہ تھی لیکن گاندھی جی کو اصرار تھا کہ ہندو اور سکھ اپنے گناہ کا کفارہ سمجھ کر اس کی مرمت خود کرائیں۔

دھلی کے پچپن سربرآوردہ لیڈروں نے گاندھی جی کو ان شرائط کی تکمیل کا یقین دلایا، گاندھی جی کی ... جوس کا گلاس لائیں، گاندھی جی نے مولانا کی طرف اشارہ کیا، مولانا نے گلاس گاندھی جی کے ہونٹوں سے ... برت توڑ دیا۔

اس سے پہلے مولانا ایک بہت بڑے جلسے میں مہاتما جی کی برت شکنی سے متعلق عوام سے اپنی شرائط منوا چکے تھے اور گاندھی جی کو یقین دلایا تھا کہ لوگوں کی ذہنیت میں تبدیلی آگئی ہے۔

گاندھی جی مسلمانوں کی بحالی کے لیے جس شد و مد سے کوشاں تھے اور دھلی کے مسلمانوں کی خاطر برت رکھ کر جو معرکہ سر کیا تھا اس سے ہندو سنگٹھن اور راشٹریہ سویم سنگھ کے ارکان بدظن تھے، مہاتما جی کے خلاف ملک کے مختلف حصوں میں پراپیگنڈہ کیا جا رہا تھا کہ وہ اب بھی مسلمانوں کی طرفداری کرتے ہیں۔ مہاتما جی روز چھ بجے شام کھلی پرارتھنا کرتے، جس میں ویدوں کے اشلوک، گیتا کے شبد اور انجیل کے علاوہ قرآن پاک کی تلاوت کرتے، ہندوؤں کو ناگوار تھا کہ اپنی پرارتھنا میں گاندھی جی کلام پاک پڑھیں، کسی نے پرارتھنا کے جلسہ عام میں بم پھینکا جس سے ایک آدمی زخمی ہوا، لیکن بعض شقی القلب مہاتما کے تعاقب میں تھے، چنانچہ نتھو رام گوڈسے نام کے ایک مرہٹہ نوجوان نے ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو انہیں گولی مار دی، وہ اس وقت پرارتھنا ہی کے شبد پڑھ رہے تھے، ادھر گولی ان کے سینے میں پیوست ہوئی۔ ادھر انہوں نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے، نمسکار کیا اور رام رام کہتے ہوئے جان شیریں جان آفریں کے حوالے کر گئے، یہ ہندوستان کے بیٹوں کا اس عظیم انسان کے ساتھ سلوک تھا جس نے ہندوستان کی آزادی حاصل کی اور کسی غرض کے بغیر ڈیڑھ سو سال کی ایک غلام قوم کو آزادی سے بہرہ اندوز کیا، سردار پٹیل کے خلاف غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی کہ وہ گاندھی جی کی حفاظت سے قاصر رہے ہیں، جب اس قسم کی اطلاعات موجود تھیں کہ مہاتما جی کے جان لیوا

سازش کر رہے ہیں تو ملک کے وزیر داخلہ کی حیثیت سے مہاتما جی کی نگہداشت سردار پٹیل کا فرض تھا۔ انہوں نے غفلت کی۔ سردار پٹیل نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں صفائی پیش کرتے ہوئے کہا کہ لوگ کانگریس کے دشمن ہیں وہ ان باتوں کو پھیلا رہے ہیں، لیکن سردار پٹیل کے دل پر اس حادثے کا رد عمل اختلاج کی شکل میں تھا اور وہ دو سال کے اندر اندر رحلت کر گئے۔

مولانا کی عظمت کا احساس ابھر رہا تھا، لیکن وہ علم کی ان بلندیوں پر تھے کہ ان سے نیچے اترنا ان کے لیے ناممکن تھا وہ ان شخصیتوں میں سے تھے جو صدیوں بعد پیدا ہوتیں اور حالات کی افتاد میں عوام کی دستگیری کرتی ہیں۔ وہ عوام سے ہمکلام ہوتے لیکن کلام اپنا بولتے۔ ظاہر ہے کہ ایک عبقری یا نابغہ عوام سے ان کی سطح پر ہمکلام نہیں ہو سکتا۔ وہ عوام سے واقف ضرور ہوتا ہے لیکن عوام کی زبان بولنا یا عوام سے ان کے لہجے میں مخاطب ہونا اس کے لیے ممکن نہیں۔

مولانا آزاد عوام سے ذہنی گلی ڈنڈا کھیلنے کے خلاف تھے، وہ ایک صحت مند سیاست سے جاندار نتائج اسی صورت میں پیدا کر سکتے تھے کہ عوام نظم و ضبط اور ایمان و اعتقاد میں ڈھلے ہوں۔ انہیں مسلمانوں سے متعلق شکوہ تھا کہ وہ آندھی کی طرح اٹھتے، بادل کی طرح چھا جاتے اور غبار کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ انہیں مسلمانوں سے متعلق عمومی شکایت تھی کہ وہ تاریخ و تجزیہ کے انسان نہیں، افتاد و ہنگامہ کی مخلوق ہیں اور ہیجان پر جیتے ہیں۔ مولانا کو مسلمانوں کے ماضی سے گہرا لگاؤ تھا۔ فرماتے تھے کہ اسی ماضی ہی نے ان کی صفوں میں شجاعت و علم کی نادرہ روزگار شخصیتیں پیدا کی ہیں۔ ان کے خیال میں مسلمانوں کا زوال خارجی نہیں داخلی تھا۔ اگر مسلمان اسلام کی اخلاقی قدروں سے محبت کرتے اور محض جذبات کے غل غپاڑے سے پرہیز کرتے تو ان کا زوال ٹل سکتا تھا۔ لیکن انہوں نے ذہنی زوال سے اپنے سیاسی زوال کو پیدا کیا اور اسلامی معاشرے کے قرآنی احکام سے روگردانی کی وہ سیاسی استحکام سے ہاتھ اٹھا کر تہذیبی بحران کے ہو گئے تو ظاہر ہے کہ ان کا ملی وجود قومی خصائص سے محروم ہو گیا، یہ کہنا مشکل ہے کہ ایک قوم کب زوال کے زینے پر قدم رکھتی ہے اور اس کا انحطاط کب شروع ہوتا ہے۔ جب زوال و انحطاط شروع ہوتے اور قوم و ملک اس کی زد میں آ جاتے ہیں تو یکایک زوال و ادبار کا احساس ہوتا اور قوم کو اس کے عوارض کا شکار ہونے کی خبر ملتی ہے۔

ہندوستانی مسلمان بادشاہتوں کی پیداوار تھے۔ انہی کے زمانے میں اسلام قبول کیا لیکن

گیا جو نا مشائخ کا مرہون تھا، بادشاہوں نے ہندوستانی معاشرے کو مسلمان بنانے کی طرف توجہ نہ کی، ہندوستان میں مسلمانوں کے سب سے بڑے شہنشاہ اکبر اعظم نے اسلام میں ہندوستانی معاشرے سے ڈر کھائے اور اپنے ہاں ہندو دھرم کی بعض ایسی رسمیں داخل کیں کہ اصل اسلام داغدار ہو گیا، جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ان میں ایک طبقہ ان چھوٹی ذاتوں کا تھا، جو ہندوؤں کے عمرانی ومعاشی سلوک سے بیزار تھے اور ان کے لیے ہندو سوسائٹی میں عزت کا کوئی مقام نہ تھا، ان کے مسلمان ہونے سے انہیں اسلامی معاشرے میں برابر کا درجہ مل گیا مگر اسلام سے ان کی غالب تعداد نابلد رہی۔ ان لوگوں نے ظاہری طور پر اسلام قبول کر لیا لیکن دینی طور پر اسلام سے بے بہرہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی زبردست اکثریت کے باوجود عوام میں اسلام ایک ذہنی عصبیت کا نام رہا، اور لوگ سیاسی طور پر مسلمان رہے، وہ مسلمان ہو گئے، لیکن ان لوگوں کے مقابلے میں جو مسلمان نہ تھے۔ الغرض کئی طبقات میں بٹے ہوئے مسلمان رونما ہوئے۔ ان میں سیاسی وحدت گاہے گاہے ابھرتی لیکن دینی وحدت ہمیشہ مفقود رہی۔ ہندوستان انگریزوں کے قبضے میں آگیا تو ہندوستان کا مسلمان زبردست مزاحمت کے باوجود کوئی قومی تحریک پیدا کرنے سے قاصر رہا۔ عوام کو اپنے مسلمان ہونے کا شدید احساس تھا اور وہ نصاریٰ کے غلبے میں تھا لیکن مغلیہ سلطنت کے زوال نے حکومت کو اتنے حصوں میں بانٹ رکھا تھا کہ نہ صرف وحدت کی طاقت مفقود تھی بلکہ وہ ایک دوسرے سے متصادم ومتحارب تھے۔ انگریزوں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور جب انگریزوں کا اقتدار ہندوستان بھر میں مضبوط ہو گیا تو مسلمانوں کی بندر بانٹ ایک دوسرے کے سامنے آگئی۔ شیعوں نے امام غائب کے انتظار میں برطانوی سلطنت پر صاد کیا مسلمانوں کے ضعیف الاعتقاد لوگ مشائخ کی معرفت جہاد سے دستبردار ہو گئے۔ اہل حدیث نے کسی قدر ہمت دکھائی لیکن انہیں جلد ہی ملک کے دوسرے فرقوں کا طعن وتبری سہنا پڑا۔ حنفی العقیدہ مسلمان کئی حصوں میں بٹ کے مختلف گدیوں کے ہو گئے۔ چکڑالوی فرقہ ایجاد ہو گیا۔ مرزا غلام احمد نے استعماری نبوت کی نیو اٹھا کر نظریہ جہاد منسوخ کر ڈالا۔ یہ سب ایک ایسا سانحہ تھا کہ مسلمان قوم جو ہندوستان میں اپنے اقتدار کی تلاش میں تھی اپنے حزبی عقائد کی تو تکار میں اٹک گئی۔

تحریک خلافت میں ایک ولولہ جہاد ضرور تھا اور مسلمانوں میں سیاسی وحدت کے برگ وبار اُگ آئے تھے، لیکن تحریک کے ختم ہوتے ہی مسلمانوں کی وحدت باہمی انتشار کا شکار ہو گئی اور وہ لوگ جو

اس تحریک کے راہنما تھے ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ آناً فاناً وہ اتحاد ہی ختم ہو گیا جو راہنماؤں کی صف میں تھا، جو لوگ متروک ہو چکے تھے یا جنہیں سرکار نے اس غرض سے مامور کیا تھا وہ اس انتشار کو ہوا دیتے رہے، ہوا یہ کہ تحریک خلافت کے سربرآوردہ راہنما حسد و رقابت اور غبار نفس کا شکار ہو کر تقسیم ہو گئے۔

اس وقت مسلمانوں کے راہنما مولانا ابوالکلامؒ، مولانا محمد علیؒ ان کے بھائی شوکت علیؒ، مولانا آزاد سبحانی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خانؒ وغیرہ تھے، ان کے علاوہ کچھ اور نوجوان بھی تھے جو آگے چل کر صفِ اول کے لیڈر ہو گئے، مگر لکھنؤ اور علی گڑھ نے مولانا آزادؒ اور مولانا محمد علیؒ کے فاصلے بڑھا دیئے۔ دونوں میں ذہنی کھچاؤ تھا اور اس کی وجہ مولانا آزادؒ کا استغنا تھا، مولانا آزاد سبحانی جذبات کے انسان تھے۔ مولانا حسرت موہانی شاعرانہ مزاج کے تھے۔ مولانا ظفر علی خانؒ سیاسی جوڑ توڑ کے آدمی نہیں تھے وہ جذبات پر جینے اور بارودی طبیعت کے انسان تھے۔ حقیقتہً ان سب میں کوئی بھی آزادؒ کا ہم پلہ نہ تھا۔ لیکن آزادؒ ذہن کے بادشاہ تھے اور عوام سے ربط بڑھاتے ہوئے ہچکچاتے تھے انہیں صرف علم و نگاہ اور سوچ بچار پر بھروسہ تھا۔ تاریخ کے مطالعے نے ان میں ایک ایسے مدبر کا ملکہ پیدا کر دیا تھا جو مستقبل کے تیوروں کو ان واقعات میں پہچان لیتا ہے۔ المختصر عبقریت کی ان خصوصی روایات کے باعث اپنے معاصروں کی انسانی سرشت کا شکار تھے اور وہ انہیں بالا دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔

مولانا آزاد گاندھی وادی نہ تھے، وہ کانگرس میں رہ کر مہاتما جی سے اختلاف کرتے رہے۔ ہماری تاریخ میں اس کی نظیریں موجود ہیں۔ سوراج پارٹی سے لے کر تقسیم ہندستان تک (۱۹۲۳ء تا ۱۹۴۷ء) مولانا نے بعض بڑے بڑے مسائل میں گاندھی جی سے اختلاف کیا اور کانگرس میں گاندھی جی سے اختلاف کرنا معمولی نہ تھا۔ سبھاش چندر بوس اسی دور سے پنڈ چھوڑ گئے۔ ان کی کھچا کھچی ترش و تلخ ہو گئی۔ گاندھی جی اپنے حریفوں کو رام کرنا یا ختم کرنا چاہتے تھے۔ انہی کی وجہ سے پنڈت مدن موہن مالویہ کانگرس سے نکل گئے۔ پنڈت موتی لال نہرو سہل انسان نہ تھے۔ لیکن ان کے بیٹے جواہر لال کو ۱۹۲۹ء میں اپنی جگہ صدر بنا کر ان کا دل موہ لیا۔

مولانا غیر معمولی عبقری تھے۔ خود مہاتما جی ان کے علم و نظر سے مستفید ہوتے۔ عجب نہ تھا کہ مولانا اختلاف رائے کی پاداش میں الگ کیے جاتے یا الگ ہو جاتے لیکن ایک تو مولانا کے اختلاف کا انداز بھی

سو وہ فریقِ متحارب نہ تھے دوسرے کانگریس اس پوزیشن میں نہ تھی کہ مولانا الگ ہوں، تیسرے مولانا کے سیاسی مشورے کانگریس کے لیے غایت درجہ بصیرت افروز تھے لیکن مولانا سے سردار پٹیل، آچاریہ کرپلانی، آپ نہرو جی اور بعض دوسرے راہنما شاذ ہی متفق ہوتے۔ کئی دفعہ خان عبدالغفار خان نے عدم تشدد کے سوال پر مولانا سے اختلاف کیا کیونکہ مولانا عدم تشدد کو عقیدہ یا اصول نہیں مانتے تھے۔

آچاریہ کرپلانی نے ۱۹۴۸ء میں "گاندھی ازم" کے زیر عنوان ایک کتاب لکھی کہ گاندھی فلاسفی کانگریس کے لیے دھرم کا درجہ رکھتی ہے۔ جو شخص اس پر یقین نہیں رکھتا وہ کانگریس میں رہ نہیں سکتا۔ مولانا نے اس کی تغلیط کی کہ کانگریس کوئی مذہبی جماعت نہیں، ایک سیاسی جماعت ہے اور ہندوستان کی آزادی کے لیے مختلف مذاہب کے پیرؤوں سے مل جل کر جدوجہد کر رہی ہے۔ آچاریہ کرپلانی کی اس کتاب پر ملک میں خوب لے دے ہوئی۔ نتیجۃً کرپلانی کو اپنی کتاب واپس لینا پڑی اور لکھا کہ:

"وہ کوئی نیا دھرم پیدا نہیں کر رہے تھے ان کے سامنے کانگریس کا نصب العین تھا کہ اس کا حصول گاندھی جی کی تکنیک ہی سے ہو سکتا ہے۔"

مولانا کے خلاف لیگ تو خیر آگ بگولہ تھی وہ مسلمان بھی مولانا کے بارے میں کم ہی رغبت رکھتے جو ان سے مختلف دوائر میں متفق نہ تھے۔ مثلاً نیشنلسٹ مسلمان جو ضرورت سے زیادہ نیشنلسٹ ہو کر صرف ہندوستانی کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ سوشلسٹ یا کمیونسٹ مسلمان جنہیں مذہب سے تنفر تھا۔ جمعیۃ العلماء اسلام کے نزدیک مولانا آزاد محض بطلِ حریت تھے مگر شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی تھے۔ احرار مولانا کے عقیدت مند تھے کہ احرار کی بنا مولانا نے ڈالی تھی، لیکن مولانا کے مشوروں پر مطلقاً عمل نہ کرتے۔ خدائی خدمتگار مولانا کے فریفتہ تھے لیکن مولانا کی سیاست کے تابع نہ تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن مولانا پر ہچکچے جاتے۔ لیکن سردار پٹیل سے بھی رسم و راہ رکھتے تھے۔ مولانا داؤد غزنوی پنجاب کے واحد مسلمان تھے جو مشترکہ نشست پر منتخب ہوئے تھے۔ لیکن منتخب ہو کر لیگ میں چلے گئے۔ مولانا کا حریف گروپ جو کانگریس میں ان کے خلاف صف بستہ تھا۔ اس واقعہ سے دیدہ دلیر ہو گیا اور مولانا کو طعن دیتا تھا۔

مسلمانوں کا جو حال تھا وہ ڈھکا چھپا نہیں۔ احرار میں ہم لوگ مولانا کی مدافعت کرتے اور مخالفوں کو گالی گفتار سے روکتے تھے، لیکن مسلمان آگ بگولہ تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے الفاظ میں اُردو زبان کی ایسی کوئی گالی نہ تھی جو اردو زبان کے اس سب سے بڑے خطیب و ادیب کو نہ دی گئی ہو۔ اکثر مسلمان اخبارو

نے مولانا کو گالی دینا اپنا شعار بنا لیا تھا اور عوام کی حالت یہ تھی کہ وہ ان کے معاملے میں اخلاق باختگی کی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ ستم کی انتہا تھی کہ لیگ کا بڑے سے بڑا لیڈر بھی اس حمام میں ننگا تھا۔ مولانا کلکتے جا رہے تھے کہ علی گڑھ کے ریلوے اسٹیشن پر یونیورسٹی کے طلبہ نے گاڑی روک کر ان سے بدتمیزی کی۔ اس قسم کے شرمناک واقعات سے تمام ملک لرز اٹھا۔ کسی لیڈر نے اس واقعے پر اظہار تاسف نہ کیا۔ لیکن آزادی کے بعد علی گڑھ کی بیخ کنی کا منصوبہ زیر غور آیا تو پروفیسر رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں "مولانا ہی کی شخصیت نے سرسید کی اس یادگار کو بچایا، وہ علی گڑھ کے عالم نزع میں دوسرے سرسید تھے۔"

مولانا کے ساتھ ان دنوں مسلم لیگ میں جو سلوک ہوا وہ بہیمانہ تھا، یار لوگوں نے عین دریا ان کی ناؤ ڈبونے کا فیصلہ کیا، لیکن مولانا ہر چرکہ اور ہر صدمہ سہہ جاتے تھے۔ ہندوستان آزاد ہو گیا تو مولانا نے لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم کانفرنس طلب کی۔ اس میں مختلف عناصر کے واویلا کا جائزہ لے کر اپنی تقریر میں مسلمانوں کو حوصلہ و کردار کی تلقین کی۔ ان سے کہا کہ وہ ہمت نہ ہاریں۔ جو غلط ہے اس کا مٹ جانا لازم ہے۔ اس چھت کے نیچے انہیں مسلمان بن کر ہی رہنا ہے۔ سردار پٹیل نے مولانا کی اس تقریر پر اعتراض کیا کہ انہوں نے مسئلہ کشمیر پر کوئی بات نہیں کی اور نہ اس کانفرنس کے مندوبین نے مسئلہ کشمیر سے متعلق ہندوستان کی پوزیشن پر صاد کیا۔ مولانا نے سردار پٹیل کے اعتراض کا جواب ہی نہ دیا۔

مولانا نے دارالمصنفین اعظم گڑھ اور بعض دوسرے اسلامی اداروں کو عطیات دلوائے اور بیشتر اہل قلم کے ماہانہ وظیفے لگوائے۔ کہ ہندوستان کی تحریک آزادی میں ان کا قلم حصہ دار رہا ہے۔ لیکن قلم و علم کے خاندان اور ادب و دین کے قبیلہ میں کئی بزرگوار ایسے بھی تھے جو مولانا کے متعلق عوامی سب و شتم پر چپ رہے۔ ان کے نزدیک مولانا ہندوستانی مسلمانوں کے عتاب کا شکار تھے اور ان کے خیال میں شاید عوامی سب و شتم مباح تھا۔ وہ اس لب و لہجہ کو ٹوکتے اور مداہنت نہ کرتے تو ممکن تھا بے قابو زبانیں بگٹٹ نہ ہوتیں اور یہی اختلاف قومی اخلاق کی تباہی پر منتج نہ ہوتا، لیکن عوامی احتجاج کے نام پر سب کچھ گوارا کیا گیا۔ نتیجہ معلوم کہ:

۱۔ علماء کی عزت نئی پود میں متروک ہو گئی۔

۲۔ جو لوگ بزعم خویش اسلام کی عظمتوں کے نمائندے تھے وہ بدیر یا بسویر عوامی سب و شتم کا شکار ہوئے۔ حتیٰ کہ پاکستان میں انہیں نشانہ تضحیک بنایا گیا۔

۳۔ عوام کے دل دینی عصبیت سے خالی ہو گئے۔

۴۔ علماء کا احترام ماضی کی ایک روایت ہو کر رہ گیا۔

۵۔ لوگوں میں اللہ و رسولؐ پر فدا ہونے کا جذبہ ٹھنڈا پڑ گیا۔

۶۔ مذہب ایک نجی عقیدہ ہو گیا۔

مولانا تقسیم کے بعد پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کوئی سا ٹکراؤ دیکھنا نہیں چاہتے تھے لیکن لیگ کا ذہن ان سے متعلق کھلتا ہی نہیں تھا۔ حسین شہید سہروردی تقسیم کے بعد ہندوستان میں رہ گئے تھے۔ کچھ عرصہ بعد قائداعظمؒ کے نام گاندھی جی کا پیغام لے کر آئے۔ تو مولانا کا پیغام بھی تھا کہ اب دونوں ملک اپنی خود مختار بنیادوں پر کیونکہ ایک دوسرے کے لیے مفید ہو سکتے ہیں۔ لیکن قائداعظمؒ مولانا آزادؒ سے ہندوستان و پاکستان کے متعلق کوئی سی گفتگو کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ایک روایت کے مطابق مولاناؒ نے حالات کی برہمی کا اندازہ کر کے خان لیاقت علی خان کو ایک طویل خط لکھا کہ دونوں ملکوں کے متنازعہ امور باہمی تفہیم و تدبر سے طے ہو سکتے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں چند تجویزیں تحریر کیں۔ لیکن خان لیاقت علی خان نے خط کی رسید تک نہ دی۔ مولانا لاہور سے واپسی پر جب ایک دن کے لیے کراچی میں ٹھہرے، میٹروپول ہوٹل میں قیام کیا۔ اور قائداعظمؒ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لیے تشریف لے گئے لیکن لیگ کی لیڈر شپ کا انقباض دور نہ ہوا۔ ملک غلام محمد کے زمانہ میں محمد علی بوگرہ وزیراعظم پاکستان کی حیثیت سے دہلی گئے تو مولانا نے ان کے اعزاز میں عشائیہ دیا۔ اس میں ہندوستان کے صدر، وزیراعظم اور ارکان کابینہ کے علاوہ مختلف ملکوں کے سفراء بھی شریک تھے۔ مسٹر بوگرہ نے کسی منفی یا مثبت جذبے کے تحت مولانا سے استفسار کیا۔

"مولانا اب پاکستان کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟"

مولانا مسکرائے، اور کہا:

"پاکستان ایک سیاسی تجربہ ہے، اسے کامیاب کیجئے۔"

اور اسی کا نام ابوالکلامؒ تھا کہ ان کا ہر کلمہ جامع الکلمات ہوتا۔ ان کے چند الفاظ بہت سی کتابوں کا نچوڑ ہوتے کوئی فقرہ ادھورا نہ ہوتا، اور نہ کسی خیال میں کوئی تشنگی ہوتی۔ ہر بات ابہام و اہمال سے صاف ستھری ہوتی۔ گمان ہوتا کہ ہر جملہ مبسوط و مکمل ہے۔

وزارتِ تعلیم

مولانا ۱۵ جنوری ۱۹۴۷ء سے لے کر ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء تک ہندوستانی حکومت میں وزیر تعلیم رہے۔ ابتداً صوبہ سرحد کی اسمبلی نے انہیں [illegible] اسمبلی کا [illegible]

منتخب کیا تھا۔ پھر ۱۹۵۱ء میں ہندوستانی پارلیمنٹ میں کانگریس پارٹی کے ڈپٹی لیڈر منتخب کیے گئے اور اپنی وفات تک وزیر تعلیم کے علاوہ ڈپٹی لیڈر رہے۔ آزادی کے بعد ۱۹۵۲ء میں عام انتخابات ہوئے تو رامپور سے منتخب ہوئے اور اس انتخاب میں صرف ایک دفعہ انتخابی سفر کیا۔ اور ایک ہی تقریر کی۔ کے بعد ۱۹۵۷ء میں دوبارہ جنرل انتخابات ہوئے تو گڑگاؤں سے منتخب ہوئے۔ لیکن اپنے حلقۂ انتخاب کا دورہ بھی نہ کیا۔ ۱۹۵۵ء میں دو ماہ کے لیے یورپ اور مغربی ایشیا کے خیر سگالی دورہ پر گئے اور بعض ممالک میں مختلف انجمنوں کی دعوت پر کئی تقریریں کیں۔

برِ عظیم کی تقسیم کے بعد بہت سے سنگین مسائل پیدا ہوئے۔ سب سے بڑا مسئلہ مسلمانوں کے وجود کا تھا۔ ہندوستان میں فرقہ واریت کا عفریت سر کہیں پھنکار رہا تھا۔ اور مسلمانوں کے قومی تشخص کی بہت سی چیزیں معرضِ خطر میں پڑ چکی تھیں۔ آپ نے مہاتما جی کو بنگال کے حالات سے مطلع کیا تو وہ خود مطالعہ کے لیے خود وہاں چلے گئے۔ مسٹر حسین شہید سہروردی کو ساتھ رکھا اور صبح و شام کی مساعی سے حالات کے آتش فشاں کو ٹھنڈا کیا۔ مولانا حیدرآباد دکن کے مسئلے کو بھی خوش اسلوبی سے حل کرنے کے خواہاں تھے۔ انہوں نے میر لائق علی وغیرہ کو اس سلسلہ میں بعض اشکال سے مطلع کیا لیکن رضاکاروں کے ذہنی سیلاب سے نتیجہ وہی نکلا جس کا مولانا کو اندیشہ تھا۔ ادھر ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک قیامت صغریٰ برپا ہو چکی تھی۔ مولانا کا بنگلہ ان حالات میں مجروحین سیاست کے لیے دارالامان تھا۔ لیکن فضا میں اس قدر اشتعال تھا کہ ملک کے حالات مولانا کی خواہش کے خلاف پیدا ہو رہے تھے۔ اور یہ سب کچھ ان کے لیے ایک جانگداز المیے کی حیثیت رکھتا تھا۔ ہماری آزادی میں مولانا نے تقسیم شدہ ہندوستان کے زیرِ عنوان ان تمام مصائب و نوائب بیان کیے ہیں جو ہندوستان کے دارالحکومت دہلی میں مسلمانوں کی زندگی کے سلسلے میں پیش آ رہے تھے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ دلی میں مسلمان دن دہاڑے مارے جا رہے تھے۔ لیکن سردار پٹیل کے لیے اس میں کوئی سانحہ یا صدمہ نہ تھا جب پنڈت جواہر لال نے ان کو اس قتلِ عام پر متوجہ کیا تو وہ اُلٹا خفا ہو گئے کہ پنڈت جی اپنی ہی حکومت پر اعتراض کر رہے ہیں۔ اور جب یہ معاملہ گاندھی جی تک پہنچا تو سردار نے اس امر کے باوجود کہ وہ گاندھی جی کے رفیق تھے اور ملکی میں انہیں گاندھی جی ہی نے بالا بلند کیا تھا۔ نہ صرف مہاتما جی سے انحراف کیا بلکہ ان کے خلاف ہو گئے کہ وہ گویا ان سے ایک غلط کام لینا چاہتے ہیں۔ گاندھی جی نے سردار پٹیل کی اس روش کو بُری طرح محسوس کیا اور ۱۲ جنوری ۱۹۴۸ء کو اپنے برت کا آغاز کر دیا۔ اس کا تذکرہ پچھلے باب میں ہو چکا ہے۔ مولانا کے الفاظ

میں مہاتما جی کا یہ برت سردار پٹیل کے رویہ کے خلاف ایک احتجاج تھا۔

مولانا اصل میں ایک علمی و تعلیمی انسان تھے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ جدید و قدیم علم کی ہر شاہراہ سے بخوبی واقف تھے۔ انہیں معلوم تھا علم کیا ہے؟ تعلیم کیا ہے اور آج دنیا کی علمی و تعلیمی ضرورتیں کیا ہیں؟ اس سے بڑھ کر ان کی عظمت پر کیا شہادت ہو سکتی ہے کہ ہندوستان کے ماہرین تعلیم نے ان کی موت پر جن خیالات کا اظہار کیا وہ ایک دانشور سیاست دان کی علمی بصیرت کے لیے بہت بڑا خراج تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے جامعہ ملیہ کی فضا سے باہر ہندوستان کے صدر کی حیثیت میں وفات پائی لیکن بنیادی طور پر وہ ایک عظیم ماہر تعلیم تھے۔ ان کے تعلیمی خطبات سے ان کے علم کی گہرائیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا کی وفات پر تعزیتی تقریر کرتے ہوئے انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا وہ انہی کے قلم سے آجکل کے ابوالکلام نمبر میں شایع ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ:

"مولانا ایک ہمہ گیر شخصیت تھے۔ میں نے اپنی زندگی کی پہلی بتی مولانا کے دیئے ہی سے جلائی تھی۔ کبھی کبھی ان سے ملتا تھا تو ان سے روشنی اور گرمی پاتا تھا۔ انہوں نے آخر دم تک علم کو نہیں چھوڑا۔"

خواجہ غلام السیدین ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے عالمگیر شہرت کے مالک تھے۔ مولانا نے آپ کو مرکزی حکومت میں وزارت تعلیمات کے سیکرٹری کا عہدہ تفویض کیا۔ اور آپ مولانا کی وفات تک ان کے ساتھ رہے۔ آپ نے علامہ اقبال کے فلسفہ تعلیم پر سب سے پہلے ایک جامع کتاب تحریر کی۔ آپ کو شخصیات کے مطالعہ میں کمال حاصل تھا۔ آپ نے بڑے آدمیوں کے سیاسی فکر و نظر کی اختلافی راہوں سے کبھی سروکار نہ رکھا اور نہ اپنے قلم کو ان سے آلودہ کیا۔ ہمیشہ ان کے بنیادی محاسن کو ملحوظ رکھتے۔ انہی کی بنیاد پر تصویر کشی کی۔ اقبال و ابوالکلام کے دو مختلف راستے تھے ان پر قلم اٹھایا تو ان کمالات کی عکاسی و نقاشی کی جن سے ان کا وجود عبارت تھا۔ مولانا آزاد کے تعلیمی فلسفے پر کئی ایک مضمون لکھے۔ حکومت کشمیر نے مئی ۱۹۵۸ء میں آزاد سیمینار منعقد کیا۔ تو آپ نے مولانا کے تعلیمی فلسفہ پر ایک پُر مغز مقالہ پڑھا۔ اس کے علاوہ آپ نے مولانا آزاد کی تعلیمی مساعی پر بڑودہ یونیورسٹی میں انگریزی زبان میں دو تحریری لیکچر دیئے۔ جن میں مولانا کے علم و نظر کی سرگزشت بیان کی۔ خواجہ صاحب نے سری نگر کے مقالہ میں بیان کیا کہ "ماہر تعلیم کا لفظ دو معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک تو وہ لوگ جو تعلیم کے اصولوں اور نظریوں کا باقاعدہ

مطالعہ کرتے اور سکولوں اور کالجوں میں ان کا عملی تجربہ کرتے ہیں۔ ان کو تعلیم کا فنی ماہر سمجھا جا سکتا ہے۔ دوسرے وہ لوگ جن کو قدرت نے ایک خلاق فکر دیا ہو۔ جو فلسفہ، مذہب، سیاست میں گہری نظر رکھتے اور جانتے ہیں کہ دنیا میں انسان کا کیا مقام ہے۔ یہ لوگ زندگی کو نئی قدروں اور نئی معنوں سے روشناس کرتے ہیں۔ ان کے ذہن میں زندگی کی ایک حسین اور واضح تصویر ہوتی ہے۔ ماضی کی بنیادوں پر قائم حال کے تقاضوں سے آشنا اور مستقبل کی طرف نگران، جس میں ان کا تخیل دلکش رنگ بھرتا ہے۔ مولانا آزاد کا شمار انہیں عصر آفریں معلّموں میں تھا۔"

خواجہ صاحب نے یونیسکو سمپوزیم میں مولانا کی تقریر بعنوان مشرق و مغرب میں انسان کا تصور اور اس کا تعلیمی فلسفہ کے سلسلہ میں لکھا کہ مولانا کے تعلیمی فلسفہ کا بنیادی خیال یہ تھا کہ مشرق و مغرب کے نقطۂ نظر میں میل پیدا کیا جائے تاکہ انسان سائنس کا صحیح استعمال کر سکے۔ اور اس کے لیے ان مقصدوں کو حاصل کر سکے جو اس کی فطرت کے بہترین تقاضوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ سائنس ایک طاقت ہے جو بذاتِ خود غیر جانبدار ہے۔"

خواجہ صاحب نے اسی مقالے میں لکھا کہ "مولانا نے جس خوبصورتی کے ساتھ اپنی فکر کا نقش تعلیم و تربیت کے ہر پہلو پر ثبت کیا۔ اس کا اندازہ محض تعلیمی رپورٹوں اور اعداد و شمار کو دیکھ کر نہیں ہوتا بلکہ یہ سوچ کر ہوتا ہے کہ اس نازک دور میں وقت کے سخت موڑ پر ان کی راہنمائی کی دولت نصیب نہ ہوتی تو ہماری تعلیم و ثقافت کا تصور کس قدر مسخ اور مختلف ہوتا۔ مولانا نے بالغوں کی تعلیم کے تصور میں وسعت پیدا کی۔ اس میں رنگ بھرا۔ مشرقی علم و ادب میں ریسرچ کو فروغ دیا۔ فنون لطیفہ کی ترقی و ترویج کے لیے اکیڈمیاں قائم کیں۔ سائنس کی اصطلاحیں بنانے کا کام بڑے پیمانے پر شروع کیا۔ زبانوں کے جھگڑوں کو بڑی دانشمندی سے سنبھالا۔ یونیورسٹیوں کی آزادی کا تحفظ کیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبہ کو جو ماضی کی سیاست کے باعث افسردگی و پریشانی کے دور سے گزر رہے تھے۔ ہمت، خودداری، خدمت اور امید کا پیام دیا۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی اس زمانہ میں علی گڑھ کی ادبی روح تھے۔ آپ نے ۴ اپریل ۱۹۵۹ء کو راقم کے نام ایک خط لکھا جو سات برس بعد ۵ فروری ۱۹۶۵ء کو چٹان کے ابوالکلام نمبر میں شائع ہوا۔ آپ نے لکھا کہ "مولانا کو الہلال و البلاغ کے زمانہ میں علی گڑھ یونیورسٹی سے اختلاف تھا اور وہ شرمناک سلوک بھی سب کو معلوم تھا جو علی گڑھ ریلوے سٹیشن پر مرحوم کی شان میں یہی طلبہ سے سرزد ہوا تھا۔ لیکن تقسیم ملک،

کے بعد جب علی گڑھ طرح طرح کے حوادث کی زد میں آیا تو مرحوم نے اپنی بے پایاں، شریفانہ اور مدبرانہ صلاحیتوں کو ہر موقع پر بروئے کار لاکر اس ادارے کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔ جس کی آئندہ نسلوں کو تو کیا موجودہ نسل کے شاید خال خال افراد کو خبر ہو۔ مرحوم اتنے بڑے تھے کہ وہ انتقام لینے میں اپنی توہین سمجھتے تھے۔ بڑے آدمی کی یہ بہت بڑی پہچان ہے۔"

مولانا کی تعلیمی بصیرت اور علمی وجاہت پر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے دو مقالے تحریر کیے اگرچہ رادھا کرشنن ہندوستان کے صدر ہوئے لیکن اصلاً ایک عالمی شہرت کے مصنف اور نامور فلسفی عالم تھے۔ انہوں نے مولانا کی وفات پر کہا کہ مولانا جدید و قدیم کی علمی ذہانتوں کا سنگم تھے۔

ڈاکٹر جے۔ سی۔ گھوش کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور ہندوستان میں کئی ایک سائنسی اور ٹکنالوجی اداروں کے ڈائریکٹر تھے۔ ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے ان کا بڑا نام تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرتبہ ہمایوں کبیر میں بعنوان تعلیمی رہنما انہوں نے ایک جامع مقالہ لکھا۔ اور اس امر پر روشنی ڈالی کہ مولانا تعلیمی راہنما کی حیثیت سے کس بلند منصب پر فائز تھے۔ اور ان کی دماغی رفعتیں فی الواقعہ دنیائے علم کے لیے معجزہ قدرت تھیں۔ ان کے علاوہ پروفیسر مجیب وائس چانسلر جامعہ ملیہ دہلی، ڈاکٹر سید عبد اللطیف حیدر آباد دکن، پروفیسر محمد حبیب صدر شعبہ تاریخ علی گڑھ یونیورسٹی، ڈاکٹر سید عابد حسین، پروفیسر آصف اے۔ اے فیضی وائس چانسلر جموں و کشمیر یونیورسٹی، پروفیسر طٰہٰ حسین، ڈاکٹر سید محی الدین زور اور ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی اور بہت سے ماہرین تعلیم نے مختلف الموضوع مقالوں میں مولانا کی ہمہ گیر ذہانت پر قلم اٹھایا۔ برعظیم کے سیاسی راہنماؤں میں یہ شرف صرف مولانا ہی کو حاصل ہوا کہ ان کی رحلت سیاست و علم دونوں کے لیے صدمہ عظیم تھی۔ اگر سیاسی فضا ان کے تجربے سے خالی ہوگئی تو علم بھی ان کی خردمندی سے محروم ہوگیا۔ ان کی عالمانہ بصیرت پر مصر کے وزیر معارف شیخ احمد البخاری اور ایران کے مشہور نگار آقائے سعید نفیسی کے مقالات اعتراف و خراج کی ایک اہم دستاویز ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ عرب و فارس کے علم و دانش کی نگاہ میں مولانا کس قدر محبوب و محترم تھے۔ آقائے سعید نفیسی کے نزدیک مولانا مشرق و مغرب میں عالمگیر شہرت کے عظیم علمی اکابر میں سرفہرست تھے۔ انہیں مل کر ہر آدمی ایک ذہنی افتخار و مسرت محسوس کرتا تھا۔ سید اشفاق حسین مولانا کی وفات تک وزارت تعلیم میں ڈپٹی سیکرٹری تھے۔ انہوں نے "الجمعیۃ" دہلی کے ابوالکلام نمبر میں مولانا سے متعلق ایک مضمون میں لکھا کہ "ان کی شخصیت کا مجھ پر جو پہلا اثر پڑا وہ ان کی حیرت ناک ذہانت، فراست

اور تدبر تھا۔ انہیں حکومت کے کاموں اور طریقوں سے کبھی کوئی واسطہ نہیں رہا تھا لیکن مسند وزارت پر فروکش ہوتے ہی معلوم ہوا کہ انہوں نے ان کاموں اور راہوں میں عمر گزاری ہے۔ ہر معاملہ کی تہ کو پہنچ جاتے اور پوری تفصیلات پر حاوی ہوکر فیصلہ کر دیتے۔ مولانا کی جس خوبی کا مجھ پر سب سے زیادہ اثر پڑا وہ ان کی بے لاگ دیانتداری تھی۔ ان کے دل و دماغ میں صداقت ہی صداقت کی روشنی تھی۔ وہ ہر لحاظ سے انسانیت کا فخر تھے۔"

حکومت ہند کی وزارت اطلاعات و نشریات نے جنوری ۱۹۵۶ء میں مولانا آزاد کی تقاریر (۱۹۴۷ء۔۱۹۵۵ء) کا انگریزی مجموعہ ۲۳×۳۶ / ۸ سائز کے ۳۲۱ صفحات میں شائع کیا۔ یہ کل ۴۵ تقریریں ہیں۔ جو آپ نے وزیر تعلیم کی حیثیت میں مختلف تقریبوں میں کیں اور تعلیمات کا شاید ہی کوئی موضوع ہو جو اس مجموعہ میں نہ ہو۔ اس مجموعہ کے بعض ادھورے تراجم کیے گئے لیکن وہ ترجمے معیاری نہ تھے۔ البتہ محمد وارث کامل (سابق جائنٹ ایڈیٹر مدینہ بجنور و اسسٹنٹ ایڈیٹر چٹان لاہور) نے ایک تہائی تقاریر کا ترجمہ کیا جو صحت لفظی و صحت معنوی کے اعتبار سے قابل اعتماد تھا لیکن پبلشروں کی عدم توجہی نے اس ترجمہ کو بھی اغلاط کا پلندہ بنا دیا۔

مولانا نے تعلیم کو ترقی دینے کے مسئلہ پر مختلف پیرایوں میں اظہار خیال کیا اور فرمایا کہ تعلیم بالغاں ایک سماجی ضرورت اور تعلیم اطفال ایک بنیادی ضرورت ہے۔ آپ نے قومی سیرت اور تعلیم کے موضوع پر بصیرت افروز تقریریں کیں۔ ان کے علاوہ آزادی اور تعلیم، مذہب اور آزادی، ثانوی تعلیم، ثقافت و تہذیب، مطالعہ تاریخ، آثار قدیمہ، علی گڑھ اور ہندوستانی قومیت، تعلیم اور نوجوان، ادب اور قومیت۔ یونیسکو کا کردار، تعلیم اور ٹیکنالوجی، مشرق و مغرب میں آدمی کا تصور، عوام اور آرٹ، یونیورسٹیوں کا معیار تعلیم، فطرت اور انسان، مشرق اور یونیسکو، زندگی اور ادب، مغربی تعلیم کے اثرات، سرسید کی تعلیمی خدمات، علم مقصد اور وسیلہ، یونیسکو کا نصب العین، زبان کا مسئلہ، جنگ آزادی کی نئی تاریخ، اور امن کا دفاع کے موضوع پر تخلیقی خیالات کا اظہار کیا۔ ان تقاریر کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک شخص جس نے زندگی کا غالب حصہ سیاست کے خارزار میں بسر کیا۔ وہ علم و ادب اور ثقافت و تہذیب کے مسائل پر کس قدر تخلیقی نگاہ رکھتا تھا۔ غالباً یہی وصف تھا جس نے مولانا کو علمی ہندوستان کی عبقریت کا نمائندہ بنا دیا، اور ثابت ہو گیا کہ وہ اپنے زمانے میں برعظیم کی شہ دماغ شخصیت تھے۔

مولانا نے ۲۱ فروری ۱۹۴۷ء کو لکھنؤ میں عربی فارسی نصاب تعلیم کی اصلاحی کمیٹی کے اجلاس

کی صدارت کرتے ہوئے جو تقریر کی وہ اپنے موضوع کے اعتبار سے ان کی مجتہدانہ بصیرت کا شہ پارہ ہے۔ اس تقریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا عربی سے والہانہ اخلاص رکھتے اور اس کی ترقی و احیاء کے لیے ان کا دل ایک تڑپ سے معمور تھا۔ مولانا ۸ جنوری ۱۹۵۱ء کو دارالعلوم دیوبند میں تشریف لے گئے اور وہاں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہارا علم مقصد ہے، وسیلہ نہیں، مسلمانوں نے علم کو علم کے لیے سیکھا اور اس کا حصول فرض ہے جو علم تم حاصل کر رہے ہو، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ آسمان کے نیچے اس سے اونچا عزت کا اور کوئی مقام نہیں۔

مولانا کے دل و دماغ کو مذہب سے سچا لگاؤ تھا۔ آپ لادینی نظامِ تعلیم کو معاشرہ انسانی کے لیے مہلک و مضر خیال کرتے تھے۔ آپ نے آزادی کے فوراً بعد دہلی میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے اس مسئلہ پر شرح و بسط سے روشنی ڈالی۔ اور ہر اس تصورِ تعلیم کو غلط قرار دیا جو یورپ کے بعض ممالک کی تقلید میں خدا کی نفی پر قائم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ "خود یورپ اپنے اس دماغی خسران کی تلافی کر رہا ہے۔ اور اس نے دوسری جنگِ عظیم کے بعد اپنے لادینی تجربوں سے سبق لے کر خدا کی طرف پلٹا کھایا ہے۔ مولانا کے نزدیک علم اور مذہب کی باہم نزاع علم اور مذہب کی نزاع نہیں۔ مدعیانِ علم کی نامکاریوں اور مدعیانِ مذہب کی ظاہر پرستیوں اور قواعد سازیوں کی ہے۔ حقیقی علم اور حقیقی مذہب اگرچہ چلتے ہیں الگ الگ راستوں سے مگر بالآخر پہنچ جاتے ہیں ایک منزل پر۔ مولانا فرماتے تھے: شک کا دروازہ کھولتا ہے پھر اسے بند نہیں کر سکتا۔ سائنس ثبوت دیتا ہے عقیدہ نہیں۔ لیکن مذہب عقیدہ دیتا ہے اور اس میں ثبوت کا وجدانی استحکام ہوتا ہے۔ مولانا کے نزدیک انسانیت کا عرفان آخر مذہب تھا۔ قرار لے یہی ایک دیوار ہے جس سے ایک دکھی ہوئی پیٹھ ٹیک لگا سکتی ہے۔

الغرض مولانا جدید و قدیم علمی رفعتوں کے مابین ایک واسطہ تھے۔ ان میں نہ تو مدعیانِ مذہب کا جمود و انحطاط تھا اور نہ خام کارانِ علم کی کج نظری و ژولیدہ فکری۔ مولانا جدید و قدیم علمی تصورات کا چشمہ صافی تھے۔

اسلام اور پاکستان

مولانا سے ملنا بہت مشکل تھا۔ کئی بڑے بڑے لوگ ہفتوں ملاقات کے لیے کوشاں ہوتے اور مایوس چلے جاتے، کچھ باریاب ہوتے تو زیادہ سے زیادہ آدھ پون گھنٹہ۔ سبب یہ تھا کہ مولانا:

۱۔ شروع دن سے کم آمیز تھے۔ ان کے لیے ملاقاتیوں کا ہجوم پریشانی کا باعث ہوتا۔ اکثر لوگ اس قسم کی باتیں کرتے جو انتہائی سطحی ہوتیں یا بے معنی و بے مقصد اور وہ ان سے طبعاً بیزار تھے۔

۲۔ کئی لوگ ذاتیات کا پلندہ لے کر آتے۔ مولانا ان چیزوں سے پرہیز کرتے۔ وہ شخصی عیب بینی یا عیب گوئی کو سخت ناپسند کرتے۔ حتیٰ کہ اپنے بدترین حریفوں کے متعلق بھی نازیبا الفاظ سنتے نہیں تھے۔

ایک دن شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین انصاری اور راقم الحروف صبح سویرے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مشہور سوشلسٹ نوجوان منشی احمد دین بھی آگئے۔ انہوں نے گفتگو میں قائداعظم کے متعلق ایک ایسا فقرہ کہہ دیا، جو فروتر تھا۔ قائداعظم نے مولانا سے متعلق سال پہلے ایک درشت کلمہ کہا تھا، اس سے عقیدتمندوں میں ہیجان تھا۔ مولانا نے منشی صاحب کی زبان سے فروتر کلمہ سنا تو فرمایا:

"ناروا الفاظ بولنے سے آدمی بڑا نہیں ہو جاتا۔ اپنی زبان آلودہ نہ کیجئے۔ اس قسم کے الفاظ حلق سے نیچے نہیں اترتے۔"

مولانا کی طبیعت کلمہ کی درشتی سے بوجھل ہوگئی اور وہ اٹھ کر اندر چلے گئے۔

مولانا علی گڑھ سے گزر رہے تھے کہ علی گڑھ کے طلبہ نے ریلوے پلیٹ فارم پر گھیر لیا اور سخت اہانت کی۔ ظاہر ہے کہ بدتمیزی کا بدترین مظاہرہ تھا۔ اس سے مولانا کے عقیدت مندوں کو سخت ٹھیس لگی جب

علی گڑھ کے طلبہ الیکشن کے زمانے میں پنجاب آئے تو انہوں نے مختلف شہروں میں مولانا کے خلاف سبّ وشتم کی عریاں بوچھاڑ کی۔ راقم سے قصور میں مڈبھیڑ ہوگئی۔ ان کی پٹائی ہوگئی تو اس پٹائی کا ملک بھر میں چرچا ہوا۔ مولاناؒ نے راقم کو دہلی سے تار بھیجا کہ فوراً پہنچو۔ راقم پہنچا تو فرمایا:

”قصور میں کیا ہوا ہے؟“

راقم نے طلبہ کی زبان درازی کا ذکر کیا اور کہا کہ احرار عقیدت مندوں نے علی گڑھ کی بدتمیزی کا بدلہ لیا ہے۔ مولاناؒ کا چہرہ سرخ ہوگیا، فرمایا:

”ہلکی بات ہے۔ اپنے ہی بچوں کی پٹائی سے فائدہ کیا؟ ان سے ایک غلطی ہوگئی وہ جذبات سے بے بس تھے آپ بھی وہی کرو، تو فرق کیا ہے؟ کوئی آدمی پٹائی یا ہاتھا پائی کرنے سے بالا نہیں ہوتا اور نہ اس طرح کسی کو جیت سکتا ہے۔ آج ان کی عقلیں بھڑکی ہوئی ہیں، کل وہ تجربے سے محسوس کریں گے کہ ان کے جذبات مشتعل کیے گئے تھے اور ان کی عقلیں غلط راہ پر ڈال دی گئی تھیں۔ بہر حال میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ ان چیزوں سے پرہیز کرو خواہ وہ گالی دیں خواہ اس سے بھی آگے قدم اُٹھائیں لیکن آپ انہیں تشدد سے زچ نہ کرو وقت ان کے لیے خود معلم ثابت ہوگا۔“

۳۔ وزارتی مشن کا زمانہ تھا اور ہم دہلی میں تھے۔ مولانا سے ملاقات اور بھی مشکل تھی۔ وہ دن بھر مذاکرات میں مشغول رہتے۔ رات کا ایک حصہ ورکنگ کمیٹی یا کانگریس کے زعماء سے گفت گو میں صرف ہوتا۔ ایک روز فرمایا کہ ”نماز فجر سے پہلے یا نماز فجر کے وقت چلے آیا کرو۔“

میں عشرہ سے زیادہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ ان سے شبانہ روز کے سیاسی حالات اور ملک کا سیاسی مزاج بیان کرتا وہ میرے بیان یا سوال کے جواب میں جو کچھ فرماتے وہ واپس آکر لکھ لیتا اور محفوظ کرتا رہا یہ کہنا مشکل ہے کہ الفاظ تمام تر انہی کے ہیں لیکن راقم کو اپنے حافظے پر ہمیشہ اعتماد رہا ہے مفہوم انہی کا ہے اور الفاظ بھی قریب قریب انہی کے ہیں کوئی سہو یا تسامح ہو تو اس کی مسئولیت بہر حال راقم پر ہے۔ راقم نے عرض کیا:

’ہندو مسلم منافرات اس حد تک پھیل چکے ہیں کہ جانبین میں مفاہمت کی دوسری تمام راہیں ناپید ہو کر پاکستان ناگزیر ہو چکا ہے۔“

فرمایا:

"ہندو مسلم مناقشات کا حل پاکستان ہوتا تو میں خود اس کی حمایت کرتا، ہندوؤں کا ذہن بھی اسی طرف پلٹ رہا ہے، ایک طرف آدھا پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان، دوسری طرف آدھا بنگال دے کر انہیں اگر سارا ہندوستان مل جائے تو ایک بہت بڑی سلطنت سیاسی حقوق کے ہر قدغن و رخنے سے محفوظ ہو جاتی ہے۔ اس طرح ہندوستان ایشیا میں چین کے بعد لیگی اصطلاح کے مطابق ایک بڑی ہندو ریاست ہوگا، کسی حد تک عملاً بھی اور بڑی حد تک مزاجاً بھی یہ کوئی ارادی چیز نہ ہوگی بلکہ اس کے معاشرے کا خاصہ ہوگا۔ آپ ایک ایسے معاشرے کو جس کی آبادی نوے فی صد ہندو ہو کسی اور سانچے میں کیونکر ڈھال سکتے ہیں جب کہ زمانہ قبل از تاریخ سے وہ اسی سانچے میں ڈھلی ہو اور اس کی سب سے بڑی عصبیت ہو۔ وہ چیز جس نے اس معاشرے میں اسلام کی داغ بیل ڈالی اور اس کی آبادیوں میں سے اپنی ایک طاقتور اقلیت پیدا کی، اس تقسیمی سیاست کی پُرزور نفرت کے باعث وہ چیز ہی رک گئی ہے۔ اب ہندوؤں اور مسلمانوں کی سیاسی منافرت نے اشاعت اسلام کے دروازے اس طرح بند کر دیئے ہیں کہ ان کے کھلنے کا سوال ہی نہیں رہا۔ گویا اس سیاست نے مذہب کی دعوت ختم کر دی ہے۔ مسلمان قرآن کی طرف نہیں لوٹ رہے۔ اگر وہ قرآن و سیرت کے مسلمان ہوتے اور اسلام کی آڑ میں خود ساختہ سیاسی عصبیتوں کو استعمال نہ کرتے تو اسلام ہندوستان میں رکتا نہیں، بڑھتا اور پھیلتا۔ اورنگ زیب کے وقت میں ہم مسلمان ہندوستان میں غالباً سوا دو کروڑ تھے کچھ زیادہ یا اس سے کچھ کم۔ مغلیہ سلطنت ختم ہوئی، انگریز کا غلبہ ہوا تو مسلمان آج کا ۲۵ فیصد تھے۔ غرض تحریک خلافت کے آغاز تک مسلمان بڑھتے ہی رہے۔ لوگوں نے اسلام قبول کیا، افزائش نسل ہوئی۔ اگر ہندو مسلم منافرت سیاسی مسلمانوں کے لب و لہجہ سے تند و تلخ نہ ہوتی اور سرکاری مسلمان انگریزوں کی سیاست کو پروان چڑھانے کے لیے ہندو مسلم نزاع کو وسیع و متحارب نہ کرتے تو عجب نہ تھا کہ مسلمانوں کی تعداد موجودہ تعداد سے ڈیوڑھی ہوتی۔ ہم نے سیاسی نزاع پیدا کر کے تبلیغ اسلام کے دروازے اس طرح بند کیے گویا اسلام اشاعت کے لیے نہیں، سیاست کے لیے ہے۔ اُدھر انگریزوں

کے ہتھے چڑھ کر کہ وہ مسلمانوں کی آبادی میں وسعت نہ چاہتے تھے ہم نے اسلام کو ایک محصور مذہب بنا دیا پھر یہودیوں، پارسیوں بلکہ ہندوؤں کی طرح ہم ایک موروثی ملت ہو گئے۔ کہ یہودی پارسی اور ہندو بنتے نہیں پیدا ہوتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں نے دعوت اسلام کو منجمد کر دیا پھر خود کئی فرقوں میں بٹ گئے۔ بعض فرقے استعماری پیداوار تھے ان سب میں حرکت و عمل کی جگہ جمود و تعطل پیدا ہو گیا اور وہ ذہناً اسلام سے محرومی کی زندگی میں داخل ہو گئے۔ ان کا وجود جہاد سے تھا۔ لیکن یہی چیز ان کے وجود سے خارج ہو گئی۔ اب وہ بدعات و سیئات کا شکار ہیں وہ مسلمان ضرور ہیں لیکن ایک تو اپنے خود ساختہ عقائد کے جنگل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ دوسرے دین کے نہیں سیاست کے مسلمان ہیں۔ انہیں قرآنی دین نہیں سیاسی دین پسند ہے۔

پاکستان ایک سیاسی موقف ہے اس سے قطع نظر کہ پاکستان ہندوستانی مسلمانوں کے مسئلے کا حل ہے کہ نہیں؟ اس کا مطالبہ اسلام کے نام پر کیا جا رہا ہے۔ سوال ہے کہ اسلام نے کہاں اور کب دین کے نام پر جغرافیائی تقسیم کا مطالبہ کیا اور کفر و اسلام کی بستیاں بسائی ہیں۔ کیا یہ تقسیم قرآن میں ہے کہ حدیث میں؟ صحابہ نے کسی مرحلے میں اس کی نوا اٹھائی؟ فقہائے اسلام میں سے کس نے خدا کی زمین کو کفر و اسلام میں بانٹا؟ اگر اسلام میں کفر و اسلام کے اصول پر زمین کی تقسیم ہوتی تو اسلام ہمہ گیر ہوتا؟ مسلمانوں کو اتنی وسعت ہوتی؟ خود ہندوستان میں اسلام داخل ہوتا اور یہ مسلمان جو آج مسلمان ہونے کی بنا پر پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں ان کے اجداد مسلمان ہوتے؟

جغرافیائی تقسیم صرف لیگ کی اختراع ہے۔ وہ اس کو سیاسی موقف قرار دے تو اس طرح بحث و نظر کا جواز ہو سکتا ہے، لیکن قرآناً یا اسلاماً جغرافیائی تقسیم کا جواز کہیں نہیں اور کوئی نہیں؟ مسلمان اسلام کی اشاعت کے لیے ہیں؟ یا سیاست کی اساس پر کفر و اسلام کی جغرافیائی تقسیم کیلئے، پاکستان کے مطالبے نے مسلمانوں کو اسلاماً کیا فائدہ پہنچایا۔ اب تک کچھ نہیں؟ پاکستان بن گیا تو اسلام کو کیا فائدہ پہنچے گا، اس کا انحصار اس علاقے کی سیادت پر ہے کہ اسے کس سرشت کی لیڈر شپ ملتی ہے۔ ہم جس ذہنی بحران سے گزر رہے ہیں۔ دنیائے اسلام کی جو

حالت ہے اور مغربی ابتلاء نے جس طرح عالمی اذہان پر قبضہ کر رکھا ہے اس کے پیش نظر مسلم لیگ کی لیڈرشپ کے آب و گل سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان اس طرح تقسیم ہوا تو پاکستان میں اسلام نہیں رہے گا اور ہندوستان میں مسلمان نہیں ہوگا یہ ایک سیاسی اندازہ ہے، جو ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ لیکن پاکستان میں اولاً مذہبی تصادم پیدا کیے جائیں گے، ثانیاً وہاں اس قسم کے لوگ مسند اقتدار پر فروکش ہوں گے جن سے دین کو سخت دھچکا لگے گا۔ عجب نہیں کہ نئی پود پر اس کا رد عمل ہو اور وہ عصری تحریکوں کے لادین فلسفے کی ہو جائے۔ ہندوستان کے ہندو دولوں میں مذہب سے جو لگاؤ یا دین سے جو شغف مسلمانوں کو ہے وہ پاکستان کے مسلمان صدیوں میں نہیں، پاکستان میں علماء کی مزاحمت کے باوجود دین کی حالت کمزور رہے گی حتیٰ کہ پاکستان کی شکل بدل جائے گی۔"

راقم نے عرض کیا،

"بعض علماء بھی تو قائد اعظم کے ساتھ ہیں۔"

فرمایا:

علماء اکبر اعظم کے ساتھ بھی تھے، اس کی خاطر انہوں نے دین اکبری ایجاد کیا تھا۔ اس شخصی بحث کو چھوڑ دو، اسلام کی پوری تاریخ ان علماء سے بھری پڑی ہے جن کی بدولت اسلام ہر دور میں سسکیاں لیتا رہا۔ راست باز زبانیں چند ہی ہوتی ہیں۔ پچھلے تیرہ سو برس کی تاریخ میں کتنے علماء ہیں جنہیں تاریخ نے توقیر کے خزانے میں جگہ دی ہے؟ احمد بن حنبلؒ تو ایک ہی تھا اور ابن تیمیہؒ بھی واحد ہی تھے۔ ہندوستان میں شاہ ولی اللہؒ اور ان کا خاندان ہی زندہ رہا، باقی سب محو ہو گئے۔ الا ماشاء اللہ۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی حق گوئی پائندہ ہے لیکن جن لوگوں نے شکایتوں کے انبار لگا کر انہیں گوالیار کے قلعہ میں ڈلوایا تھا وہ بھی علماء تھے، اب کہاں ہیں؟ ان کے لیے کسی زبان پر کلمہ احترام ہے؟

راقم نے عرض کیا:

"مولانا! پاکستان اگر سیاسۃً قائم ہو جائے تو اس میں عیب کیا ہے؟ اسلام کا نام تو مسلمانوں کی ملّی وحدت کو محفوظ رکھنے کے لیے بولا جا رہا ہے۔"

فرمایا:

"آپ اسلام کا نام ایک ایسی چیز کے لیے بول رہے ہیں جو اسلام ہی کی رو سے درست نہیں۔ جنگ جمل میں قرآن نیزے پر لٹکائے گئے وہ درست تھے؟ کربلا میں اہل بیت شہید کیے گئے ان کے قاتل مسلمان تھے۔ کیا وہ حضورؐ کی حلقہ بگوشی کے دعویدار نہ تھے۔ حجاج مسلمان تھا اس نے بیت اللہ پر پتھراؤ کیا، کیا اس کا فعل صحیح تھا؟ کسی بھی مقصد باطل کے لیے کوئی سا کارِ حق درست نہیں ہوتا۔ پاکستان مسلمانوں کے لیے سیاستاً درست ہوتا تو میں اس کی حمایت کرتا لیکن خارجی اور داخلی کسی اعتبار سے بھی اس کے مضمرات مسلمانوں کے لیے خوشگوار نہیں۔ میں اپنی رائے پر اصرار نہیں کرتا، لیکن میں جو دیکھ رہا ہوں اس سے پھرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ لوگ طاقت کی مانتے ہیں یا تجربے کی۔ جب تک مسلمان پاکستان کے تجربے سے نہیں گزریں گے۔ ان کے لیے پاکستان کے بارے میں کوئی دوسری بات جو اس کی نفی پر ہو، قابل قبول نہ ہوگی وہ آج دن کو رات کہہ سکتے ہیں لیکن پاکستان سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔ ایک بات ہو سکتی ہے کہ سرکاری طاقت پاکستان بنانے سے انکار کر دے اور وہ اس کے پلان پر راضی ہو جائیں، یا خود مسٹر جناح ان کے ذہن کو پھیر دیں اور سمجھوتے کی جو صورت سامنے آئے اس پر صاد کر دیں۔

ہندوستان تقسیم ہوا، جیسا کہ مجھے ورکنگ کمیٹی کے بعض رفقاء کی ذہنی روش سے محسوس ہو رہا ہے تو ہندوستان ہی کا بٹوارہ نہ ہوگا، پاکستان بھی بٹے گا۔ تقسیم آبادی کے اعتبار سے ہوگی، ان میں قدرتی حد بندی کیا ہوگی؟ کوئی دریا کوئی پہاڑ، کوئی صحرا؟ کچھ نہیں۔ ایک لکیر کھینچ جائے گی۔ کب تک؟ کچھ کہنا مشکل ہے۔ لیکن جو چیز نفرت پر ہوگی وہ نفرت پر قائم رہے گی اور نفرت ان کے مابین ایک مستقل خطرہ ہوگی، اس صورت میں کسی بڑی تبدیلی، تغیر یا کاٹ کے بغیر پاکستان اور ہندوستان کبھی دوست نہ ہوں گے۔ دونوں کے دل میں تقسیم کی فصیل ہوگی۔ تو سارے ہندوستان کے مسلمانوں کو سنبھالنا پاکستان کے لیے مشکل ہے کہ اس کی زمین اس کی متحمل ہی نہیں ہو سکتی لیکن مغربی پاکستان میں ہندوؤں کا ٹھہرنا ممکن نہ ہوگا وہ نکالے جائیں گے یا خود چلے جائیں گے، ان دونوں صورتوں میں ہندوستانی مسلمانوں

کی نگاہ پاکستان پر ہوگی پھر اس حالت میں ہندوستانی مسلمانوں کے لیے تین راستے ہونگے۔

۱۔ وہ لٹ لٹا یا پٹ پٹا کر پاکستان چلے جائیں۔ لیکن پاکستان کتنے مسلمانوں کو جگہ دے گا۔

۲۔ وہ ہندوستان میں اکثریت کے بلوائی ہاتھوں سے قتل ہوتے رہیں۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ایک طویل مدت تک قہر و غضب کی قتل گاہ سے گزرے گی تا آنکہ تقسیمی تلخیوں کی وارث پود عمر طبیعی گزار کر ختم ہو جائے۔

۳۔ مسلمانوں کی ایک تعداد جو معاشی ابتری، سیاسی درماندگی اور علاقائی غارت گری کا شکار ہو، وہ اسلام چھوڑ کر مرتد ہو جائے۔

وہ مسلمان جو لیگ کے حلقوں میں نمایاں ہیں پاکستان چلے جائیں گے۔ وہاں معاشی مسلمان صنعت و تجارت کو ہاتھ میں لے کر پاکستان کی معاشیات کے اجارہ دار ہو جائیں گے لیکن ہندوستان میں تین کروڑ کے لگ بھگ مسلمان رہ جائیں گے، لیگ کے پاس ان کے مستقبل کی ضمانت کیا ہے؟ کیا محض کاغذی معاہدہ ان کے لیے کافی ہوگا؟ ان کے لیے وہ حالت تو اور خطرناک ہوگی جو ہندوؤں اور سکھوں کے مغربی پاکستان سے نکل آنے کے بعد ہندوستان میں پیدا ہوگی۔ پاکستان کئی ابتلاؤں کا شکار ہوگا۔ سب سے بڑا خطرہ جو محسوس ہوتا ہے وہ اندرخانہ عالمی طاقتوں کا اس پر کنٹرول ہوگا۔ اور ہمہ قسم تغیرات کے ساتھ اس کنٹرول میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ ہندوستان کو بھی اس سے اتفاق ہوگا کیونکہ وہ پاکستان کو اپنے لیے خطرہ گردان کر عالمی طاقتوں سے سیاسی جوڑ توڑ کرے گا۔ لیکن پاکستان کا خطرہ شدید اور نقصان عظیم ہوگا۔ ابھی تک مسٹر جناح نے شاید اس پر غور نہیں کیا کہ بنگال اپنے سے باہر کی لیڈر شپ کو کسی نہ کسی مرحلے میں مسترد کر دیتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں مسٹر اے کے فضل الحق نے مسٹر جناح سے بغاوت کی، اور لیگ سے نکال دیے گئے۔ مسٹر حسین شہید سہروردی بھی مسٹر جناح کے متعلق چنداں خوش رائے نہیں، لیگ کو چھوڑو، کانگرس ہی کی پوری تاریخ پر نظر ڈالو۔ سبھاش چندر بوس کی آخری بغاوت سب کے سامنے ہے۔ گاندھی جی ان کی صدارت سے مطمئن نہ تھے۔ انہوں نے راج کوٹ میں مرن برت رکھ کر سارے ملک کو اپنی طرف پھیر لیا، سبھاش بوس لڑ کر کانگرس سے الگ ہو گئے۔ بنگال کی آب و ہوا کا

خاصہ ہے کہ وہ بیرونی لیڈر شپ سے نفرت کرتا اور اپنی لَے پر قائم رہتا ہے۔ اور جب اس کے حقوق و مفادات مجروح ہوں تو بہر نوعی بغاوت کے لیے تیار ہوتا ہے۔ مسٹر جناح یا لیاقت علی تک تو مشرقی پاکستان کا اطمینان ڈانواڈول نہیں ہوگا کہ پاکستان کی تازگی ان کے اتحاد کا باعث ہوگی۔ لیکن ان کے بعد مشرقی پاکستان میں اس قسم کے آثار کا پھوٹنا یقینی ہے جو مغربی پاکستان سے اس کی بدظنی اور آخر کار علیحدگی کا موجب ہوں گے۔ مجھے شبہ ہے کہ مشرقی پاکستان زیادہ دیر مغربی پاکستان کے ساتھ رہ سکے گا۔ دونوں حصوں میں مسلمان کہلانے کے سوا کوئی چیز مشترک نہیں، لیکن مسلمان کہلانا کبھی مسلمان ریاستوں کے دائمی اتحاد کا باعث نہیں ہوا ـــــ عرب دنیا ہمارے سامنے ہے وہاں ایک نہیں کئی چیزیں مشترک ہیں، عقائد میں یکرنگی ہے، تہذیب یکساں ہے، ثقافت ایک ہے۔ زبان واحد ہے۔ حتیٰ کہ جغرافیائی حدود تک مشترک ہیں۔ لیکن ان میں سیاسی وحدت نہیں ان کے نظام ہائے حکومت مختلف ہیں اور اندر خانہ ایک دوسرے سے تصادم کی فضا موجود ہے، مشرقی پاکستان کی زبان، رہن سہن، تہذیب، ثقافت اور بعض دوسری چیزیں مغربی پاکستان سے قطعی مختلف ہیں، پاکستان کا تخلیقی شعلہ سرد پڑتے ہی ان تضادات کا ابھرنا ایک بدیہی امر ہے۔ پھر عالمی طاقتوں کے مفادات کا ٹکراؤ ان کی علیحدگی کا متحرک ہو سکتا ہے۔

خدانخواستہ مشرقی پاکستان الگ ہوگیا تو مغربی پاکستان تضادات و تصادمات کا مجموعہ بن جائیگا، پنجابی، سندھی، سرحدی اور بلوچی اختلافات و سوالات پیدا کیے گئے تو پاکستان ذہنی انتشار اور عالمی مفاد کی آماجگاہ بن جائے گا۔ آج جو نسل پاکستان بنائے گی ممکن ہے اس کے اٹھتے ہی صوبائی عصبیتوں کا سوال ابھرے اور عالمی طاقتیں پاکستان کی مختلف الفکر لیڈر شپ کو ہاتھ میں لے کر ایک ایسا کھیل رچائیں کہ مغربی پاکستان بلقانی ریاستوں یا عرب ریاستوں کی طرح کئی ایک ریاستوں میں بٹ جائے، تب یہ سوال ممکن ہے، بعض ذہنوں میں پیدا ہو کہ ہم نے پایا کیا اور کھویا کیا؟

ایک دوسرا سوال جو برعظیم کی تقسیم سے وابستہ ہے وہ افریشیائی ملکوں میں عالمی طاقتوں کی

مداخلت کا مسئلہ ہے۔ افریشیائی ممالک زیادہ تر مسلمان ریاستوں ہی کا مجموعہ ہیں ان کے لیے ایک ہندوستان ہی زیادہ سے زیادہ مفید ہو سکتا ہے۔ لیکن پاکستان کا ہندوستان سے اور ہندوستان کا پاکستان سے ٹکراؤ، نہ صرف ہندوستانی عوام کو مسلمانوں سے بدظن کر دے گا بلکہ مسلمان ریاستوں کے ابتلا میں بھی ہمدردی و اعانت کے وہ جذبات پیدا نہ ہوں گے جو مشترکہ ہندوستان میں پیدا ہو سکتے ہیں۔

اصل سوال دین کا نہیں، معاش کا ہے۔ مسلمان امرا نے اپنی معاشی کمتری اور اقتصادی فروتری کے خوف و انحطاط کو دو قومی نظریہ کی شکل دے کر فرقہ وار مسائل کو اس انتہا تک پہنچا دیا ہے۔ اب انہیں ایک... ہندوستان میں اپنے معاشی اقتدار کے لیے کوئی جگہ نظر نہیں آئی وہ ایک اسلامی ریاست میں بلا شرکت غیرے معاشیات کے واحد مالک ہوں گے۔ لیکن کب تک مسلمانوں کو نظریاتی تحریص میں مبتلا رکھ سکیں گے۔ یہ غور طلب سوال ہے پاکستان کے سر پر کئی چیزیں سوار ہوں گی۔ مثلاً:

۱۔ ریاست والوں کی ویرانی پر مسلمان ملکوں کی طرح فوجی انقلاب کے خطرے۔

۲۔ غیر ملکی قرضوں کا اندھا دھند بوجھ۔

۳۔ ہمسایہ ملکوں سے جنگ کا خدشہ۔

۴۔ اندرونی تضادات کے تصادمات۔

۵۔ پاکستان کے نو دولت سرمایہ داروں اور نو ساختہ صنعت کاروں کی لوٹ۔

۶۔ اس استحصال سے طبقاتی جنگ پیدا ہونے کے امکانات۔

۷۔ اسلام سے نئی پود کا بوجوہ گریز و فرار یا بالفاظ دیگر نظریہ پاکستان کا سقوط۔

۸۔ عالمی طاقتوں کی پاکستان کے بارے میں مختلف سازشیں۔

ادھر ان حالات میں پاکستان کا استحکام مخدوش ہو گا ادھر اسلامی ملک اس قابل نہیں ہوں گے کہ پاکستان کی اس طرح مدد کر سکیں جس طرح دوسری جنگ عظیم میں اتحادی ایک دوسرے کے معاون تھے۔ غیر اسلامی ملکوں نے پاکستان کی مدد کی تو وہ ان کے [illegible] کرنے کی جس سے پاکستان میں نظریاتی اور جغرافیائی خلل کا پیدا ہونا لازمی [illegible]

راقم نے عرض کیا :

”لیکن ایک ہندوستان میں مسلمان اپنی اصل انفرادیت کیونکر قائم کر سکتے ہیں اور ان میں ایک اسلامی ریاست کے مسلمانوں کی خصوصیتیں کیونکر پیدا ہو سکتی ہیں ؟“

فرمایا :

”محض الفاظ کے سہارے حقائق کو جھٹلایا نہیں جا سکتا اور نہ سوالات کا رُخ پھیر کر جوابات میں کجی پیدا کی جا سکتی ہے۔ حقائق کو اس قسم کے سوالات یا جوابات سے توڑنا یا موڑنا غلط مبحث ہے۔ مسلمانوں کی ملی انفرادیت سے مراد کیا ہے؟ اگر انگریزوں کے عہد میں وہ ملی انفرادیت قائم رہی ہے تو آزاد ہندوستان میں جس کے حصے دار مسلمان بھی ہوں گے اس انفرادیت کا ضائع ہونا کیونکر ممکن ہے؟ مسلمان ریاستوں کے عوام کی وہ کون سی خصوصیتیں ہیں جنہیں آپ یہاں پیدا کرنا چاہتے ہیں، اصل چیز دین اور اس کے لوازم ہیں انہیں اختیار کرنے اور ان پر چلنے سے کون روک سکتا ہے؟ کیا نو کروڑ مسلمان آزادی کے بعد اس قدر بے بس ہو جائیں گے کہ دین اور اس کے لوازم ان سے چھن جائیں گے، انگریز ایک عالمی عیسائی طاقت ہونے کے باوجود ان سے اسلام چھین نہیں سکا، تو ہندوؤں میں وہ کونسی ملی قوت کشش یا سحر ہے کہ وہ مسلمانوں کو اسلام سے محروم کر دیں گے؟ یہ سوالات عموماً ان لوگوں کے پیدا کردہ ہیں جو خود انگریزی تہذیب سے مغلوب ہو کر اسلام سے دستبردار ہو چکے اور اب سیاسی طور پر ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ اجتماعی طور پر مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ مسلمان بادشاہوں نے ہندوستان میں اسلام کی خدمت کی ہوتی تو آج تین چوتھائی ہندوستان ضرور مسلمان ہوتا۔ لیکن ان بادشاہوں نے اسلام سے ظواہر کا واسطہ رکھا، وہ اسلام کے داعی نہ تھے وہ حکومت چاہتے اور حکومت کرتے تھے۔ اسلام یہاں صوفیوں کی بدولت پھیلا، مسلمانوں کا سوادِ اعظم ان اہل اللہ کا مرہون ہے۔ اسلام کی دولت انہی کی معرفت ملی ہے۔ کئی بادشاہوں نے ان کے ساتھ بہیمانہ سلوک کیا اور اپنے گرد و پیش اس قسم کے علما پیدا کئے جو اشاعتِ اسلام کی راہ میں ایک بڑی روک تھے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے اس وقت کی مہذب دنیا کو مغلوب کیا اور حجاز کے گرد و پیش نے بیسیوں ملک

کاملاً اسلام کی آغوش میں آ گئے۔ لیکن ہندوستان میں صحیح اسلام نہ آ سکا۔ مسلمان یہاں کے رسومات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اسلام کی حقیقی روح سے محروم رہ گئے۔ ایک دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلام یہاں عجم کی معرفت آیا تھا لیکن اس کے باوجود ہندوستان کی بارہ سو برس کی تہذیب پر مسلمانوں کی چھاپ لگی ہوئی ہے اور اس کا معاشرہ اسلامی نقش و نگار کا مرہون ہے، ہندوستان کے آرٹ، ہندوستان کی موسیقی، ہندوستان کے ادب، ہندوستان کی تہذیب، ہندوستان کے تمدن، ہندوستان کی ثقافت، ہندوستان کے فن تعمیر اور ہندوستان کی زبان میں نصف سے زائد حصہ اسلامیات سے فیضیاب ہے، ان کے خزانے عربی عجمی ترکستانی اور ایرانی مسلمانوں کی بود و باند اور رنگ و آہنگ سے لدے پھندے ہیں۔ آج ہندوستان کے تہذیبی شہر مثلاً لکھنؤ اور دہلی کن محاسن کا مجموعہ ہیں؟ کیا مسلمانوں کی تہذیب ان کی روح رواں نہیں؟ مسلمان ہندوستان کو اتنا کچھ دے کر بھی خطرہ محسوس کریں اور انہیں وہم ہو کہ وہ انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہونے کے فوراً بعد ہندوؤں کے غلام ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہی دعا کی جا سکتی ہے کہ مسلمانوں کو استقامت ایمان عطا ہو۔ آدمی بد دل ہو تو اس کے دل کو سنبھالا دیا جا سکتا ہے اور اس میں حرکت کے آثار واپس لائے جا سکتے ہیں لیکن آدمی بزدل ہو تو اس کے دل کو سنبھالا دینا اور اس کے حوصلے کو ثبات کی ہمت لوٹانا مشکل ہے، مسلمان اجتماعی طور پر بزدل ہو چکے ہیں۔ وہ خدا سے نہیں ڈرتے انسانوں سے ڈرتے ہیں اور اس ڈر ہی سے انہیں اپنا وجود آزاد ہندوستان میں خطروں کا صید محسوس ہوتا ہے۔

انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا تو کیا مسلمانوں کو مٹانے کی ہر بہیمیت کے باوجود مٹا سکے؟ مسلمان جبر سہتے اور بڑھتے گئے۔ ہندوستان کی مردم شماری کے مختلف ادوار کا نقشہ ان کے علم میں ہو تو مسلمان شاید محسوس کریں کہ ان کے ذہنی خطرے بے اصل ہیں وہ ہر دور میں پھیلتے رہے ہیں اور اس کی وجہ ان کے معاشرے کا سحر و کشش ہے، ہندوستان کے تین طرف اسلامی دنیا پھیلی ہوئی ہے، ہندوستان کی اکثریت مسلمانوں کو مٹا کر کیونکر پنپ سکتی ہے۔ کیا نو کروڑ مسلمانوں کو مٹانا آسان ہے؟ ہمیں یقین ہے

کہہ سکتا ہوں کہ ہماری تہذیب اور ثقافت میں ایک ایسا جادو ہے کہ شاید آئندہ پچاس سال میں ہندوستان کی سب سے بڑی آبادی مسلمان ہو۔

دنیا کو پائیدار امن کی تلاش کے علاوہ ایک فلسفۂ زندگی کی ضرورت ہے۔ اگر ہندو کارل مارکس کے پیچھے دوڑ سکتے اور فلسفۂ زندگی کی تلاش میں یورپ کے علم و دانش کو کھنگال سکتے ہیں تو اسلام سے انہیں کد نہیں، وہ اس کے سوانح سے آگاہ ہیں۔ ان کا دل اعتراف کرتا ہے کہ اسلام کسی عصبیت کا نام نہیں اور نہ استبدادی فلسفہ ہے۔ اسلام ایک عالمگیر معاشرے کی دعوت ہے ایک عالمی امن کی اساس ہے۔ ایک پروردگار کی خدائی کا اقرار ہے، اور ایک ایسے شخص کی رسالت کا اعلان ہے جو اپنی پوجا کے لیے نہیں خدا کی عبادت کے لیے نوعِ انسانی کو پکارتا رہا اور جس نے تمام معاشی و مجلسی امتیازات مٹا کر صدق، تقویٰ، دیانت اور علم کے عناصر ثلاثہ پر معاشرے کی بنیاد رکھی۔ ہم نے اپنے اعمال کی تعدیوں سے نامسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کیا ہے۔ ہم اگر اسلام کو اپنے اغراض کی سیاہی سے داغدار نہ کرتے تو مضطرب الحال دنیا اسلام کے آغوش میں ہوتی۔ پاکستان اسلام نہیں ایک سیاسی مطالبہ ہے جو ہندوستانی مسلمانوں کا مسلم لیگ کے الفاظ میں قومی نصب العین ہے۔ میرے نزدیک یہ ان مسائل کا حل نہیں جو مسلمانوں کو درپیش ہیں یا وہ کئی مسئلوں کو جنم دے گا اور جو مسائل موجود ہیں ان کا حل نہ ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ خدا نے میرے لیے تمام دنیا کو مسجد بنایا ہے اور ہم کسی حال میں بھی مسجد کی تقسیم کے مجاز نہیں۔ نو کروڑ ہندوستانی مسلمان تمام صوبوں میں اقلیتوں کی طرح منتشر ہوتے تو ان کی یکجائی کے لیے ایک دو صوبوں میں ان کے اکثریتی اتحاد کا مطالبہ کیا جا سکتا تھا، گو یہ مطالبہ بھی اسلامی نہ ہوتا۔ لیکن مسلمانوں کے عمومی تحفظ کی خاطر کسی حد تک سمجھ میں آسکتا تھا۔ لیکن موجودہ حالت یکسر مختلف ہے۔ ہندوستان کے سرحدی صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور ان سے ملحق خود مختار اسلامی ریاستیں ہیں۔ وہ کون سی طاقت ہے جو انہیں مٹا سکتی ہے یا مٹا دے گی۔ ہم تقسیم کا مطالبہ کر کے مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ کے علاوہ ساڑھے تین کروڑ مسلمانوں کو نرہ ہندو راج کے حوالے

کر رہے ہیں۔ وہ مسئلہ جو آج ہندو مسلم آویزش کی شکل میں مسلم لیگ اور کانگرس کا تنازعہ ہے کل دو ریاستوں کا تنازعہ ہو جائے گا۔ اور یہی تنازعہ عالمی استعمار کی معرفت کسی دن ان میں جنگ کا موجب ہوگا۔ رہا یہ سوال کہ پاکستان مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہے تو ہندو اس کی مخالفت کیوں کرتے ہیں؟ تو یہ سوال فی الواقعہ دلچسپ ہے۔ جنہیں آزادی کی لگن ہے اور ملک کی یک جہتی کے شیدائی ہیں وہ عالمی سامراج کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہنے کے لیے بٹوارے کی مخالفت کرتے ہیں کچھ خام دماغ اس کی مخالفت سے مسلمانوں کو پاکستان کے لیے پکا کر رہے ہیں کہ اس طرح پاکستان کو تسلیم کر کے وہ بلا شرکت غیرے ہندوستان کے مالک بننا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کو حق حاصل ہے کہ اپنے لیے آئینی تحفظات کا مطالبہ کریں۔ مثلاً ملک کا آئین وفاقی ہو اور صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری حاصل ہو اس طرح ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں رہتا۔ ان کے پاس صوبوں کے لازمی معاملات ہوں گے۔ اس کے علاوہ وہ اختیاری معاملات بھی سنبھال سکتے ہیں اور مرکز کے پاس صرف تحفظاتی امور رکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن تقسیم میں مسلمانوں کا تحفظ نہیں، ایک سیاسی آویزش کا غیر سیاسی حل ہے۔ ہندوستان کے آئندہ مسائل فرقہ داری نہیں طبقہ واری ہیں آئندہ تصادم مسلمانوں اور ہندوؤں میں نہیں سرمایہ و محنت میں ہوگا۔ کانگرس کے دوش بدوش سوشلزم اور کمیونزم کی تنظیمیں اور تحریکیں پیدا ہو چکی ہیں۔ انہیں آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمانوں کو جس ہندو سرمایہ سے ڈرایا جا رہا ہے۔ یہ تحریکیں اور تنظیمیں اس کے خلاف صف آرا ہوں گی۔ مسلمان سرمایہ داروں اور مسلمان جاگیرداروں نے ان تحریکوں کے قدرتی نتائج سے خوفزدہ ہو کر اپنے اغراض و مصالح کو اسلام کا رنگ دیا اور معاشی مسئلے کو ہندوؤں اور مسلمانوں کا مسئلہ بنا دیا ہے لیکن اس کی تنہا ذمہ داری مسلمانوں پر عائد نہیں ہوتی۔ انگریزوں نے اپنے ابتدائی دور میں اس مسئلے کو جنم دیا، پھر سرسید کی تعلیمی جدوجہد کے سیاسی ذہن نے اس کو پروان چڑھایا۔ آخر ہندوؤں کی من حیث الجماعت تنگ دلی اور کوتاہ نظری نے اس مسئلے کو تقسیم کی اس منزل تک پہنچا دیا کہ ملک کی آزادی بٹوارے کے یقینی موڑ تک آ پہنچی ہے۔ مسٹر جناح ایک

زمانے میں ہندو مسلم اتحاد کا مظہر تھے۔ اور ان کے سبب یہ لقب کانگرس کے سالانہ اجلاس میں خود سروجنی نائیڈو نے تجویز کیا تھا، وہ دادا بھائی نارو جی کے شاگرد تھے، مسلمانوں کا مشہور وفد ۱۹۰۶ء میں ترتیب پایا تو مسٹر جناح نے اس میں شامل ہونے سے انکار کیا تھا۔ یہی وفد تھا جس نے مسلم لیگ کی فرقہ وار سیاست کا آغاز کیا۔ ۱۹۱۹ء میں جائنٹ سلیکٹ کمیٹی کے روبرو ایک نیشنلسٹ مسلمان کی حیثیت سے بیان دیتے ہوئے مسٹر جناح نے مسلم مطالبات سے اتفاق نہ کیا، انہوں نے ۳ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو ٹائمز آف انڈیا میں ایک مراسلہ لکھا جس میں اس کا رد کیا کہ انڈین نیشنل کانگرس ایک ہندو جماعت ہے۔ ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۸ء میں آل پارٹیز کانفرنسیں ہوئیں تو مسٹر جناح مخلوط انتخاب کے حق میں تھے۔ ۱۹۲۵ء میں مرکزی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا "میں اول و آخر نیشنلسٹ ہوں میں اسمبلی کے ارکان سے ایک پُرزور اپیل کروں گا کہ خواہ آپ ہندو ہوں خواہ مسلمان خدا کے لیے اس ایوان میں فرقہ وارانہ مسئلوں پر بحث نہ چھیڑیے، ہم چاہتے ہیں کہ یہ اسمبلی حقیقی معنوں میں قومی پارلیمان بن جائے۔"

۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن کے بائیکاٹ میں جناح کانگرس کے ساتھ تھے۔ غرض ۱۹۳۷ء سے پہلے جناح تقسیم ہند کی طرف مائل ہی نہ تھے، وہ طلبہ کی مشترکہ انجمنوں کو پیغام دیتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد کی تلقین کرتے۔ لیکن کانگرس نے صوبجاتی خود مختاری کے بعد ہندوستان کے سات صوبوں میں اکثریت پا کر وزارتیں بنائیں تو لیگ کے نظر انداز کیے جانے پر انہیں ملال ہوا اور وہ مسلمانوں کے سیاسی انحطاط کو محسوس کرتے ہوئے مارچ ۱۹۴۰ء میں پاکستان کے مطالبے پر جم گئے۔ پاکستان فی الجملہ مسٹر جناح کے سیاسی تجربات کا ردِ عمل ہے۔ وہ میرے بارے میں جو رائے بھی قائم کریں انہیں حق پہنچتا ہے لیکن مجھے ان کی ذاتی ذہانت کے بارے میں کوئی شبہ نہیں، انہوں نے ایک سیاست دان کی حیثیت سے مسلمانوں کی عصبیت کو مضبوط کیا اور پاکستان کو اٹل بنا دیا، اب یہی چیز ان کی انا ہو گئی ہے اور وہ کسی قیمت پر یا کسی حالت میں اس انا سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔"

راقم نے عرض کیا:

"ان حالات میں مسلمانوں کا مطالبہ پاکستان سے ہٹنا یا مڑنا ممکن نہیں رہا، اور نہ انہیں کوئی سی خطابت اس کا سحر یا استدلال الٹا سکتا ہے۔"

مولانا نے فرمایا:

"عوام کے اشتعال سے لڑنا مشکل کیا ناممکن ہوتا ہے۔ لیکن ضمیر کے ارتحال کو برداشت کرنا موت ہے۔ اس وقت مسلمان چل نہیں رہے بہہ رہے ہیں بعض وجوہ کی بنا پر مسلمانوں نے دوڑنا سیکھا ہے یا بھاگنا، وہ چلنا جانتے ہی نہیں۔ جب قومیں اعتماد نفس سے محروم ہو جاتی ہیں یعنی انہیں عرفان نفس اور تعین ذات کا احساس نہیں رہتا تو پھر ان میں یاس و نسیان کا تذبذب پیدا ہوتا، اور ان کا دماغ خطرے ڈھالنے لگتا ہے تب وہ مفروضوں سے ہراساں ہوتی ہیں، قوموں کی معنوی زندگی کا انحصار تعداد پر نہیں اس کا مدار استقامت و ایمان اور سیرت و عمل پر ہے۔ انگریزی سیاست نے مسلمانوں کی ذہنی زمین میں بہت سے خوف بو دیے ہیں اور اب وہ ان سے لرزہ براندام ہیں، انہیں اپنی ذات پر اعتماد ہی نہیں رہا، چیخ رہے ہیں کہ انگریز چلا گیا تو مٹ جائیں گے، وہ انگریزوں سے کہتے ہیں جاؤ لیکن ملک تقسیم کر کے۔ اب غور کرو کہ جو خطرے ان کے جسموں کو ہیں وہ ان کی سرحدوں کو نہ ہوں گے، آخر وہ ان سرحدوں کو کہاں لے جائیں گے جو ایک دوسرے سے ملتی ہوں گی اور تقسیم کے بعد جن کے افق پر جنگ کے بادل منڈلاتے رہیں گے۔"

راقم نے دو قومی نظریہ پر عرض کیا۔

"ہندو اور مسلمان بہر حال دو مختلف قومیں ہیں اور یہ اجتماع ضدین کیونکر ہو سکتا ہے؟"

فرمایا:

"یہ ایک پامال بحث ہے، کئی سال پہلے علامہ اقبال اور مولانا مدنی کے مابین اس مسئلے پر جو بحث ہوئی تھی، میں نے بالاستیعاب دیکھی اور پڑھی ہے۔ قوم کا لفظ قرآن میں محض امت کے لیے استعمال نہیں ہوا بلکہ جماعت انسانی کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، آخر ملت، قوم اور امت کے الفاظ کی بحث چھوڑ کر تم لیا چاہتے ہیں؟ ہندوستان میں مذہبا ایک

نہیں کئی قومیں بستی ہیں ہندو ہیں مسلمان ہیں عیسائی ہیں پارسی ہیں سکھ ہیں ، مسلمانوں اور ہندوؤں میں دینی اعتبار سے بہت بڑی مغائرت ہے ، لیکن اس مغائرت کے باعث ہندوستان کی آزادی رد کی نہیں جا سکتی ، اور نہ دو قومی نظریہ وحدت ہندوستان یا ملت ہندوستان کی نفی کرتا ہے۔ سوال تو آزادی کا ہے کہ ہم ایک غیر ملکی طاقت سے کیونکہ آزاد ہوں اور آزادی ایک ایسی نعمت ہے کہ مذہباً تقسیم نہیں ہو سکتی۔ انسان کی مشترکہ میراث ہے۔ مسلمانوں کو محسوس کرنا چاہیے کہ ان کا ملی وجود ایک عالمی دعوت ہے وہ کوئی نسل نہیں جس کی علاقائی حد بندیوں میں کوئی دوسرا داخل نہیں ہو سکتا۔ اپنے مذہبی عقائد کی رنگا رنگی کے باعث مسلمان ہندوستان میں ملت واحدہ نہیں رہے ہیں ، عملاً کئی قوموں کا منتشر مجموعہ ہیں انہیں ہندوؤں سے عداوت کی اساس پر تو جمع کیا جا سکتا ہے لیکن اصل اسلام پر متحد کرنا مشکل ہے۔ اسلام کے نام پر ان کے اندر بیسیوں فرقے جاگ اٹھتے اور عقائد کی دھما چوکڑی مچ جاتی ہے۔ وہابی ، سنی ، شیعہ کے علاوہ درجنوں شاخیں ہیں۔ مثلاً ایک وہ جماعت ہے جو مغربی افکار سے پیدا ہوئی اور یورپ کے اتباع میں مذہب و سیاست کی جداگانہ ہستی کا ذہن رکھتی ہے۔ اس کے نزدیک مذہب انسان کا نجی معاملہ ہے ، پھر ہندوستان کے اسلامی فرقے یا طائفے ہیں نہیں۔ مثلاً بریلوی ہیں ، اہلحدیث ہیں ، دیوبندی ہیں ان کی مختلف شاخیں ہیں۔ ان فرقوں کے علاوہ بے شمار خانقاہی سلسلے اور مشائخ کی حلقہ بندیاں ہیں ان میں عقائد کی متحارب رنگا رنگی ہے غرض ہندوستانی مسلمانوں کے عقائد کی سرائے میں داخل ہو جاؤ ، معلوم ہوگا کہ بھڑوں کا چھتہ پھیلا ہوا ہے۔ انگریزوں کی آمد کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ باہمی تنازع کا ایک وحشت خانہ ہے۔ مشائخ و علماء کی ایک بہت بڑی جماعت نے کیا نہیں کیا ، جہاد کو منسوخ و متروک قرار دیا۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کو مجرم ٹھہرایا کہ وہ فساد فی الارض کے مجرم ہیں۔ چھوٹے چھوٹے مسئلوں کا طوفان اٹھا دیا۔ رفع یدین ، آمین بالجہر ، قبروں پر سجدہ اور اس قسم کے بیسیوں مسائل پیدا کر کے مسلمانوں کو آپس میں بھڑا دیا ، علماء کی مختلف شاخوں نے کافر سازی کی ٹکسال لگا لی ، پہلے وہ کافروں کو مسلمان بناتے تھے۔ اب مسلمانوں کو کافر بنانے لگے۔ بڑے بڑے لوگوں کو قرار

پائے۔ ان مشکلات کا اندازہ کرنا سہل نہیں۔ ہوشربا حالات سے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہی نمٹ سکتے تھے۔ انہیں بھی ابتلا و آزمائش کی ایک عمر گزارنی پڑی۔ جب عقلیں گمراہ ہو جائیں، دلوں کو تالے لگ جائیں اور طبیعتیں منجمد ہوں تو معلمین و مصلحین کے لیے انسانوں کو اس جماعت سے عہدہ برآ ہونا دشوار ہوتا ہے، آج تو مسئلہ ہی دوسرا ہے۔ ہماری قوم سیاسی تعصبات میں اتنی پختہ ہو چکی ہے کہ وہ دین پر سیاست کو ترجیح دیتی اور اپنی ضرورتوں کے انبار کو اسلام سمجھتی ہے۔ مختصر یہ دور میں قوم نے استقامت کی تصویروں کو ہمیشہ اپنے ہاتھوں میں اٹھایا، قربانی کی شمعیں گل کیں اور ایثار کے پرچم پھاڑے ہیں۔ ہم تو خیر انسان ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وقت کے انسانوں نے کیا سلوک نہیں کیا، جب اللہ کے پیغمبروں سے جماعت انسانی کی سرکشی کا حال غضب ناک رہا تو کسی اور کے لیے اس غضب سے بچاؤ کا سوال کہاں؟"

ایک دوسری ملاقات میں راقم نے عرض کیا۔

"آپ نے "الہلال" کی دینی آواز غالباً اسی لیے بند کر دی کہ مسلمانوں کا ذہنی ویرانہ اس کا متحمل نہیں ہو رہا تھا۔ یا آپ محسوس کرتے تھے کہ لق و دق صحرا میں آپ اذان دے رہے ہیں؟"

فرمایا:

"میں نے الہلال کی آواز اس لئے ترک نہیں کی کہ اس آواز کی صداقت سے مایوس ہو گیا تھا۔ اس آواز نے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جماعت میں اسلام کا ولولہ آزادی کی لگن اور عمل میں استقامت پیدا کی، خود میرے اندر ایک ایسی روح پیدا ہو گئی جو صحبت یافتگان رسالت کا امتیاز و جوہر تھا۔ میں اپنی اس آواز میں ققنس کی طرح مست ہو کر بھسم ہو گیا، "الہلال" کے مقاصد جہاں تک ان کے معنوی مضمرات کا تعلق تھا، اپنا اعجاز دکھا چکے تھے اور مسلمانوں کا ایک نیا دور انگڑائی لے رہا تھا، میرے سامنے تجربات کا ایک ڈھیر تھا، میں نے سفر میں ترتیب پیدا کی اور اس صراط مستقیم پر قدم جما دیئے جو اس ملک کی آزادی کے حصول کا صحیح راستہ تھا، میرے اعتقاد میں یہ بات داخل

ہو گئی کہ ایشیا اور افریقہ کی آزادی کا انحصار ہندوستان ہی کی آزادی پر ہے اور ہندوستان کی آزادی کا صحیح نقشہ ہندو مسلم اتحاد ہی سے بن سکتا ہے۔ یہ دونوں جماعتیں (ہندو و مسلم) جو مذہب و اعتقاد کے معاملے میں مختلف اوضاع و اطوار رکھتی ہیں۔ جب تک متحد العمل نہ ہوں گی ہندوستان کی آزادی میں الجھاؤ پیدا ہوں گے اور اس طرح ایک ایسی برائی راہ پائے گی کہ سینکڑوں خرابیاں یکے بعد دیگرے جنم لیتی رہیں گی۔

میں نے پہلی جنگ عظیم سے بہت پہلے محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان ضرور آزاد ہو گا اور اس کی آزادی کسی عنوان سے رُک نہیں سکتی، میرے سامنے مسلمانوں کے مقام کا تعین بھی تھا۔ میں ہر جہت غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ مسلمان اپنے وطنی بھائیوں کے ساتھ چلنا سیکھیں اور تاریخ کو یہ کہنے کا موقع نہ دیں کہ جب اہل وطن ہندوستان کی آزادی کے لیے سرگرم عمل تھے تو مسلمانوں نے موجوں سے لڑنے کے بجائے کناروں پر تماشا دیکھنے کی عادت ڈالی اور وہ پُرجہد کشتیوں کے ڈوبنے پر خوش ہوتے تھے۔"

راقم نے عرض کیا:

"پاکستان تو بن کے رہے گا اب سوال وجوہ کا نہیں کہ اس کی تاسیس کے محرکات کیا ہیں، سوال اس چیز کا ہے، جو قائم ہو رہی ہے اب اس حالت میں کیا ہونا چاہیے؟ بالخصوص ان مسلمانوں کا فرض کیا ہے جو قیام پاکستان کی مخالفت کرتے رہے اور کر رہے ہیں لیکن پاکستان کے علاقائی شہری ہیں؟"

فرمایا:

"اس صورت میں میری رائے یہ ہے کہ پاکستان دشمنی سے نہیں دوستی سے قائم ہو، اور جب پاکستان بن جائے تو پھر دونوں ملکوں کی باہمی دوستی ہی ان کے استحکام کی ضامن ہو سکتی ہے، جانبین میں کشیدگی رہی تو دونوں کے لیے مضر ہو گی، نہ ہندوستان کا اس میں بھلا ہے نہ پاکستان کا۔ جذبات کا غصہ ایک عارضی چیز ہے لیکن حالات کی ضرورت ایک اساسی عنصر ہے۔ پاکستان ہندوستان ایک دوسرے کے دوست بن کر نہ صرف اپنے اپنے ملک کی خوش آئند تعمیر کر سکیں گے بلکہ ان عالمی طاقتوں کے مخفی عزائم سے بھی محفوظ رہیں

گے جو دنیا کے تمام چھوٹے ملکوں اور نو آزاد ریاستوں کو اپنے تابع رکھنا چاہتی ہیں اور اسی میں ان کے مفادات ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان کی ذہنی لڑائی خواہ اس کی شکل کوئی سی ہو دونوں ملکوں کو مضطرب رکھے گی۔ ہندوستان نے پاکستان کو اتھل پتھل کرنے کا ارادہ کیا، تو اس کے لیے عالمی سطح پر بہت سے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ پاکستان نے ہندوستان سے لڑائی باندھ کے رکھی تو جس غرض سے اس نے تقسیم کرائی ہے، وہ مسئلہ ختم نہ ہوگا، بلکہ اس کی ایک خطرناک شکل پیدا ہوگی، پاکستان کا مطالبہ اگر مسلمانوں کی انفرادیت کو ایک خود مختار ریاست میں نشوونما دینے کا نام ہے تو اس غرض سے ایک بے داغ امن کی ضرورت ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کی کشاکشی سے ساڑھے تین کروڑ ہندوستانی مسلمان جو ہندوستان ہی میں رہیں گے نہ صرف موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہوں گے بلکہ خود پاکستان کے مسلمان عالمی طاقتوں کی شکار گاہ ہوں گے۔ خدانخواستہ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ چھڑ گئی تو وہ تیسری عالمگیر جنگ کا آغاز ہو کر برعظیم کے ایک نئے نقشے کا ظہور ہو سکتی ہے۔"

مولانا نے ۱۹۵۶ء میں یاد کیا۔ راقم دہلی پہنچا، وہاں ایک ہفتہ ٹھہرا۔ مولانا پاکستان کے سیاسی انتشار سے ناخوش تھے۔ مولانا:

"پاکستان کو آٹھ سال بیت چکے ہیں، اب انہیں چودھری محمد علی نے آئین تیار کیا ہے اور وہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی باہمی مفاہمتوں سے ایک کھچڑی پکی ہے۔ خدا کرے اب اس کے مطابق ہی پاکستان کا سیاسی سفر شروع ہو، ایک آئینی سانچہ بن تو گیا، آئندہ تجربوں سے اس میں اصلاح ہو سکتی ہے، لیکن پاکستان کے اندرونی حالات کا غائر مطالعہ کسی ایک اندشات کی نشاندہی کرتا ہے۔ اندیشہ ہے کہ اس آئین کے تحت پہلے انتخابات ہی نہ ہو سکیں گے۔ آئین ختم کر دیا جائے گا اُدھر پاکستان کے سیاست دان غیر تربیت یافتہ لوگ ہیں انہوں نے ملک کی عنان بیوروکریسی کے ہاتھ میں دے دی ہے۔ سکندر مرزا نہیں چاہتے کہ پاکستان میں انتخابات ہوں، وہ عمر بھر صدارت کی مسند پر رہنا چاہتے ہیں اور بیرونی مداخلت کے آلۂ کار ہیں، انہوں نے آئین توڑ کر مارشل لاء نافذ کیا، تو قطعی نتائج کے متعلق حتمی رائے دینا مشکل ہے۔ مارشل لاء نافذ کر کے وہ کب تک اقتدار میں رہ سکیں گے؟ اس بارے میں کچھ کہنا یامت

کا تعین کرنا مشکل ہے۔ لیکن جس فوج کے بل پر وہ مارشل لاء لائیں گے وہی فوج انہیں سبکدوش کر دے گی۔ ملک غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کی وزارت توڑ کر پاکستان کو غلطیوں کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ اور اب آئندہ کئی خرابیوں کے پیدا ہونے کا امکان ہے۔

سیاستدانوں کی جگہ بیوروکریسی نے لی ہے۔ ہو سکتا ہے پاکستان ایک لمبے عرصے کے لیے سیاست دانوں کے ہاتھ سے نکل کر بیوروکریسی ہی کے عسکری ہاتھوں میں چلا جائے، پھر ایک طویل عرصہ مارشل لاء کی حکومت ہو۔ اس کے بعد جو آئین وضع ہو وہ فوج کی ٹکسال میں ڈھلا ہوا ور جمہوریت کے انتخابی مزاج پر پاکستان کی عسکری چھاپ ہو، فوج کے سپہ سالاروں کی جمہوریت پاکستان کے لیے کئی آفتوں کا مجموعہ ہو گی، اور جو تجربہ بھی فوج کی معرفت اس جمہوریت کی آڑ میں کیا جائے گا وہ بدیر یا سویر ناکام ہو گا، چونکہ فوج مغربی پاکستان کی ہے اور پنجاب کے لوگ عسکری ہیں۔ اس لیے اس خطرے سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مشرقی پاکستان میں نظریہ پاکستان سے متعلق منفی تحریکیں پیدا ہو کر بالآخر اس کی علیحدگی کا باعث ہوں۔

پاکستان کو محسوس کرنا چاہیے کہ ہندوستان کی ایک سیاسی لابی کو اس کے معرض وجود میں آنے پر قلق ہے اگر مسلم لیگ کی لیڈر شپ گاندھی و نہرو کی جماعت سے مفاہمت کر لیتی تو پاکستان کئی خطروں سے محفوظ ہو جاتا۔ پنڈت جواہر لال نہرو جذباتی انسان ضرور ہیں وہ بسا اوقات ایک مسئلے پر ضدی ہو جاتے ہیں لیکن انہیں استدلال کی طاقت سے منا لینا مشکل نہیں۔ سردار پٹیل کشمیر کے مسئلے میں پاکستان کی تائید کرتے تھے، کہ پاکستان کا اس پر حق ہے اور وہ پاکستان ہی کو ملنا چاہیے، جواہر لال کو راضی کر لینا مشکل نہ تھا۔ وہ لازماً کشمیر پر ہندوستان کے قبضے سے دستبردار ہو جاتے لیکن قائداعظم کی رحلت کے بعد لیاقت علی بھی کسی نیشنلسٹ مسلمان سے گفتگو کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ مجھ سے سردار پٹیل نے بیان کیا کہ انہوں نے گورنر ہاؤس لاہور میں لیاقت علی کے اصرار و استفسار پر ان سے کہا تھا کہ وہ پاکستان کے وزیراعظم ہیں اور پنڈت جواہر لال نہرو ہندوستان کے وزیراعظم ہیں۔ دو نوں ہی مجاز و مختار ہیں کسی مسئلے کا حل مشکل نہیں۔ میں استدلال کے

طویل چکر میں پڑے بغیر ذمہ داری لیتا ہوں اور معاہدہ ابھی ہو سکتا ہے کہ پاکستان، مناودر جوناگڑھ اور حیدرآباد دکن سے دستبردار ہو جائے ہم کشمیر کو چھوڑ دیتے ہیں، وہ ریاستیں ہندوستان کے حدود میں ہیں اور کشمیر پاکستان کے حدود میں ہے۔ سردار پٹیل نے لیاقت علی کو یہ پیش کش بھی کی کہ وہ پاکستان کی ہندو اقلیت کو روکیں میں ہندوستان کی مسلم اقلیت کو روکتا ہوں اس کے بعد جو فساد برپا کرے اس کے خلاف سخت سے سخت کارروائی کی جائے۔ اس سے امن دو دن میں قائم ہو جائے گا۔ لیکن لیاقت علی نے مناودر جوناگڑھ اور حیدرآباد دکن کے بارے میں پس و پیش کیا نتیجۃً دونوں مملکتوں کے وزرائے اعظم کی پہلی کانفرنس ناکام ہو گئی، لیکن اب وہ سب چیزیں ماضی کی ہیں۔ آج پاکستان ہندوستان کے داخلی خطروں پر خوش ہوتا ہے اور ہندوستان پاکستان کے سیاسی افتراق پر بغلیں بجاتا ہے لیکن دونوں میں سے کسی مملکت کے لیے کوئی فائدہ نہیں۔ پاکستان اور ہندوستان کی بساط سیاست پر عالمی طاقتیں اپنے مہرے لے کر کھیل رہی ہیں، ان طاقتوں کی ذہنی غایت دونوں کے مابین دوستی کی نیو اٹھانا نہیں بلکہ دوستی کا نام لے کر اپنے ہتھکنڈے جمانا ہے، پاکستان ہندوستان کے خطرے سے خوف زدہ ہو کر عالمی طاقتوں کی چوکھٹ پر کھڑا ہے اور خود سپردگی میں ذرہ برابر عیب محسوس نہیں کرتا ہندوستان چونکہ سیاستہً پاکستان کا حریف ہے لہذا اس کو بھی عالمی طاقتوں کی معاونت درکار ہے دوسری جنگ عظیم کے بعد پورے ہندوستان کے دفاعی اخراجات سو کروڑ روپے تھے لیکن برعظیم کی تقسیم کے بعد ایک چوتھائی فوج پاکستان کے حصے میں چلی گئی اور تین چوتھائی ہندوستان میں چلی گئی۔ اب ہندوستان کی فوج کے اخراجات دو سو کروڑ ہیں، اور پاکستان کے اخراجات بھی کم سے کم سو کروڑ تک پہنچتے ہیں یہ وہ رقم ہے جو دونوں ملکوں کے عوام حکومت کے واجبات کی شکل میں ادا کرتے ہیں، وہ امداد اس کے علاوہ ہے جو دونوں ملکوں کو ان کے عالمی دوستوں سے ملتی اور اس کی مانگ برابر رہتی ہے یہی رقم دونوں ملک اپنی ترقی خوشحالی پر صرف کریں اور عوام پر روزمرہ کے ٹیکسوں کا بوجھ ہلکا پڑ جائے تو ہر دو ملک صحیح معنوں میں خود مختار اور آزاد ہو سکتے ہیں اور ان کے وہ خطرات بھی ٹل سکتے ہیں جو فریقین کے دلوں میں بیٹھ چکے ہیں اور دونوں مملکتیں اپنے

مسائل کا حل ایک جنگ کی شکل میں دیکھ رہی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ "جنگ" اندریں حالات پاکستان اور ہندوستان دونوں کے لیے مہلک ہے۔

ہر پاکستانی کا فرض ہے کہ وہ ہندوستان سے دوستانہ رشتہ استوار کرنے پر سوچے ابھی وہ لوگ زندہ ہیں جو ہندوستان کے مزاج کی برہمی کو ٹھیک کر سکتے ہیں۔ پاکستان ایک سیاسی تجربہ ہے، پاکستان کے ارباب حل وعقد کا فرض ہے کہ اس تجربے کو کامیاب بنائیں، ادھر ہندوستان کے ارباب بست وکشاد کو لازم ہے کہ پاکستان کو ایک حقیقت مان لیں اور تسلیم کریں کہ اب جانبین میں دوستانہ تعلقات اور اشتراک عمل ہی ان کی بقا واستحکام کا باعث ہو سکتے ہیں اگر نفرت کا شعلہ بھڑکتا رہا تو دونوں ملک عالمی طاقتوں کے مقاصد کی چتا میں بھسم ہو جائیں گے۔ یاد رہے کہ سیاست کے پہلو میں دل نہیں ہوتا کوئی سی طاقت اپنے اغراض کی خاطر تضادات سے مصافحہ و معانقہ کرتی ہے تو اس میں آخر کار خسارا ہی ہوتا ہے"۔

خوبصورت لوگوں کی سرزمین

عظیم خطیب

ایک زمانے میں خطابت علمی صحبتوں اور مذہبی مجمعوں سے خطاب کرنے کا نام تھا، اب علوم و مسائل
کے اس مغربی دور میں خطابت کئی ایک خانوں میں تقسیم ہے اور ہر خانہ اپنی جگہ مبسوط و مکمل ہے۔ فن ایک
ہی ہے لیکن پہلو کئی ہیں، خطابت اس فن کی معراج ہے، لیکن اب خطابت کا عمومی میدان پبلک
اور پالیٹیکس ہے۔ فی الجملہ خطابت نطقِ انسانی کی معراج ہے۔ مختصراً عوام
سے فن خطاب کا معجزہ! خطابت کے بعد تقریر کا فن ہے۔ ایک اچھا مقرر عوام پر
جادو کرتا ہے۔ خطیب و مقرر کے بعد واعظ ہیں، مبلغ ہیں، ذاکر ہیں اور ایک حد تک مناظر بھی اس
صنف میں آجاتے ہیں، ان سے نچلی سطح پر لسان ہیں جو الفاظ کی آتش بازی
چھوڑ کر رونق پیدا کرتے ہیں، ایک گفتگو طراز خطیب یا مقرر نہیں ہوتا لیکن
وہ ان کے فن کی روش پر ٹہلتا ضرور ہے، اسی طرح کئی لوگ باتونی ہوتے ہیں، انہیں خطیب
یا مقرر نہیں کہتے۔ مگر ان کی مثال چٹیل میدانوں میں بوندا باندی کے چھلکے کی طرح ہے۔

برعظیم کی تاریخ میں خطابت کا فن مسلمانوں کی آمد سے منسلک ہے۔ اس خطابت کی ابتدائی شکلیں
مساجد کے خطبے اور خانقاہی وعظ تھے جن کا محور قرآن و حدیث اور ان سے پیدا شدہ علوم و مسائل تھے۔

ہندوستانی مسلمان یعنی وہ مسلمان جو ہندوؤں سے مشرف بہ اسلام ہوئے اور جن کا خمیر اس مٹی
ہی سے تھا وہ زیادہ تر صحبت اولیا سے مسلمان ہوئے، اور ان کے اسلام کا سبب اہل اللہ کی نگاہ تھی
یا پھر ان کے مشرف بہ اسلام ہونے کی وجہ علماء کے وعظ تھے۔ وہ گویا علماء کی زبان سے مسلمان ہوئے

تھے۔ اس سلسلہ میں کوئی حکمی تجزیہ آسان نہیں۔ لیکن ہندوستانی عوام کے مسلمان ہونے میں خطابت و وعظ کی فتح مندیوں سے انکار ناممکن ہے۔ حضرت مجدد الفؒ ثانی سے لے کر شاہ عبدالعزیزؒ تک ان کے بعد برطانوی عملداری میں تحریک خلافت کے آغاز تک وعظ و خطابت کا ایک عظیم سلسلہ موجود ہے اور بہ قول مولانا آزادؒ گنگا و جمنا کے گرد و پیش ایسی شخصیتیں پائی جاتی تھیں کہ ان کے بیان کی حرارت سے دلوں کی سنگینی موم کی طرح پگھل جاتی۔ خود مولانا آزادؒ کے تذکرے میں ان شخصیتوں کا ذکر اشارۃً موجود ہے۔ بعض صوفیانہ تذکروں سے بھی ان کا علم ہوتا ہے۔

مولانا آزادؒ کے نانا مولانا منور الدین ہی کا واقعہ "میری کہانی" میں درج ہے وہ قلعہ معلیٰ میں وعظ کے لیے بلائے گئے۔ ایک مدت سے مغل بادشاہوں کے اور ان کے امرا و سلاطین میں "ڈولا" کا رواج تھا، ہندو راجاؤں اور رئیسوں کی بیٹیاں کسی نکاح کے بغیر قبضہ و تملیک میں لائی جاتی تھیں اور قلعہ معلیٰ میں ان کا رنواس ہوتا تھا۔

مولانا منور الدین کو معلوم ہوا کہ آج ہی بادشاہ کے لیے ڈولا آیا ہے، انھوں نے ڈولے کے خلاف وعظ کیا، تاثیر کا یہ حال تھا کہ جن درباریوں نے مولانا کو اس بارے میں کچھ کہنے سے منع کیا تھا۔ وہ مبہوت ہو گئے خود بادشاہ کی ہچکی بندھ گئی اور مجلس سے باہر آکر نیا دوشالہ مولانا کے کاندھے پر ڈال دیا اور اعلان فرمایا کہ آئندہ سے قلعہ معلیٰ میں ڈولا کی رسم بند کی جاتی ہے۔

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ خلف شاہ ولی اللہؒ اس پائے کے خطیب تھے کہ اس زمانے میں کوئی ان کے کمال کو نہیں پہنچتا تھا۔ وہ اپنے وعظوں کی سچائی سے سامعین کا شکار کرتے۔ آج وعظ کمزور پڑ چکے ہیں اور اس رتبہ کے واعظ بھی نہیں رہے۔ کچھ معروف واعظ زورِ بیان پر انحصار کرتے اور آواز کی گونج یا گرج کے علاوہ جوش گلوئی کو اپنا فن سمجھتے ہیں، لیکن جب وعظ ہی اصل خطابت تھا تو ایک واعظ محض لطیفوں کی رنگا رنگی، کہانیوں کی بوقلمونی زبان کے چٹکلوں اور بیان کے چٹخاروں سے واعظ نہیں ہوتا تھا اس کی معراج قرآن و حدیث کے علم پر تھی۔ وہ سیرت طیبہؐ و آثار صحابہؓ کے علاوہ علما و فقہا کے افکار و مباحث سے کاملاً باخبر ہوتا اور یہی وجہ تھی کہ ایک واعظ آیات قرآن کی تفسیر میں کئی کئی برس وعظ کرتا تھا۔ ایک واعظ کی بڑی خوبی اس کے مطالب کا آہنگ و ربط تھا۔ وہ مضمون کی ترتیب، تقسیم، استنباط اور استدلال کا شناور ہوتا۔ اس کو معلوم ہوتا کہ اجمال سے تفصیل اور تفصیل سے اجمال اور آخر میں اختتام

کیونکر ہوتا ہے۔

ہندوستان میں انگریز جم گئے اور برطانوی تعلیم کی راہیں نکل آئیں تو دین و مذہب کے علاوہ عمرانی وعلمی اور تہذیبی و تمدنی موضوعات پر لیکچرز کا سلسلہ چلا۔ ظاہر ہے کہ انگریزی تعلیم نے اس کی نیو رکھی، سرسید، وقارالملک، محسن الملک اور بعض دوسرے اکابر اس میدان کا ہراول تھے، ادھر علامہ شبلی خطابت میں یکتا تھے لیکن ڈپٹی نذیر احمد اپنے زمانے کے سب سے بڑے خطیب تھے۔ وہ انجمن حمایت الاسلام وغیرہ کے سالانہ اجلاس کو بہ التزام خطاب کرتے اور عموماً اپنی تقریر لکھ کے لاتے تھے۔ انہیں اپنے بیان پر اس درجہ اعتماد تھا کہ طویل خطبات میں کسی جملے کے اختتام یا کسی خیال کے موڑ پر تالیاں اور تحسین کے الفاظ لکھ دیتے تھے۔ تو ٹھیک انہی کے مطابق مجمع تحسین و تہنیت کرتا۔ غرض مسلمانوں کے ہاں خطابت معراج کو پہنچی تو وہ مدت العمر کے وعظوں کا سلسلہ تھا۔ ان وعظوں کی بدولت مسلمانوں نے منبر و محراب کے معرکوں ہی میں فتوحات حاصل نہیں کیں بلکہ جنگ و حرب کے محاذوں کو بھی سر کیا ہے۔ تحریک خلافت سے پہلے کانگرس اور لیگ کی تاسیس کے ایام ہی سے سیاسی خطابت کا آغاز ہو چکا تھا، لیکن اس کا صحیح صحیح ظہور تحریک تعاون (۱۹۱۹ء) میں ہوا، ہندوستان میں تحریک خلافت جلیانوالہ باغ اور رولٹ ایکٹ وغیرہ کا طوفان کھڑا ہو گیا تو ملک کی عوامی قیادت بھی یکسر تبدیل ہو گئی، جتنے بڑے خطیب، مقرر اور لسان اس زمانے میں پیدا ہوئے نہ اس سے پہلے پیدا ہوئے تھے اور نہ اس تحریک کے بعد۔ فی الجملہ ہندوستان کا یہ دور خطیبوں اور مقرروں کا دور تھا۔

خطابت کے تین عناصر ہیں:

پہلا، خطیب، جو اپنے فن اور شخصیت کی معرفت عوام سے خطاب کرتا ہے۔

دوسرا، خطاب جس کی ہیئت انفرادی لیکن مقصد اجتماعی ہوتا ہے۔

تیسرا، پبلک یا سامعین و حاضرین، جس سے خطیب کلام کرتا ہے۔

خطیب کی اصل خوبی اس کی شخصیت ہے۔ ہو سکتا ہے ایک خطیب، قائد نہ ہو بعض قائد خطیب نہیں ہوتے، ایک حد تک مقرر ہوتے ہیں۔ اور وہ ان کی سیادت کے باعث ان کی خطابت قائم ہوتی ہے۔ وہ اس لئے نہیں سنے جاتے کہ خطیب ہیں، وہ اس لیے سنے جاتے ہیں کہ قائد ہیں، قائد نہ ہوتے تو ان کی تقریروں میں سامعین کے لیے کوئی کشش نہ تھی۔ مثلاً ہندوستان کے سب سے بڑے لیڈر

مہاتما گاندھی تھے، ان کی سیادت کا جادو سب پر چھایا ہوا تھا۔ مگر وہ اوسط درجے کے مقرر بھی نہ تھے۔ قائد اعظم بھی کوئی خطیب نہ تھے اور نہ ان میں ایک مقرر کا رنگ و روغن تھا۔ لیکن مسلمانوں کے لیے ان کا ہر بول سحر تھا اور وہ ان پر لٹو تھے۔ پنڈت جواہر لال آزادی کے بعد ہندوستان کی روح رواں اور آزادی سے پہلے کانگرس کا سہاگ تھے۔ لیکن فن تقریر کا تیور شناس ہونے کے باوجود ان کی خطابت پر ان کی قیادت غالب تھی۔ خطابت ان کے لیے تھی وہ خطابت کے لیے نہیں تھے۔

خطابت کے فن پر جو معیاری کتابیں مغرب میں طبع ہوئی ہیں یا جن کی بنیادیں مشہور خطباء ڈیما ستھنیز (یونان) اور سسرو (روما) کی فنی روایتوں سے اٹھائی گئی ہیں۔ ان کے مطابق ایک خطیب کے بنیادی اوصاف یہ ہیں۔

۱۔ بے ریا کردار
۲۔ شخصی عظمت
۳۔ بلند نصب العین
۴۔ اخلاص فی العمل
۵۔ صداقت شعاری
۶۔ وجاہت ذاتی
۷۔ معلوماتی ذہن
۸۔ نستعلیق اشارات
۹۔ طلاقت لسانی
۱۰۔ بے عیب آواز
۱۱۔ صحیح تلفظ
۱۲۔ حاضر جوابی
۱۳۔ برجستہ گوئی
۱۴۔ موقع شناسی
۱۵۔ وحدت مقصد
۱۶۔ طبعی ہمدردی
۱۷۔ نفسیات سے آگاہی
۱۸۔ فہم سامع
۱۹۔ مہارت تامہ
۲۰۔ لگاتار مطالعہ
۲۱۔ عمیق مشاہدہ،

اور خطابت کے اجزائے ترکیبی ہیں:

۱۔ سلاست
۲۔ ذہانت
۳۔ ظرافت
۴۔ تکنیک (طریق)
۵۔ اسلوب
۶۔ آواز

۷- لہجہ ۸- اشارات

۹- استدلال ۱۰- تجربہ

۱۱- تمثیلات ۱۲- انفرادیت

ان اجزاء کا تناسب ہر تقریر کے لیے قدرے مختلف ہے۔ اس میں شخصیت اور موضوع کی مناسبت سے تھوڑی بہت کمی بیشی لازم ہے۔ لیکن ایک ایسا شخص جو محض خطیب (ORATOR) ہے اس وقت تک ابلاغ کی شخمندی حاصل نہیں کر سکتا۔ جب تک وہ ان اجزاء سے بہرہ مند نہ ہو، یا اسے ان سب میں ملکہ نہ ہو۔

الغرض خطابت ایک فن نہیں کئی فنون کا مجموعہ ہے وہ شاعری بھی ہے، انشاپردازی بھی، علم بھی ہے، ادب بھی، بذلہ بھی ہے استدلال بھی۔ مصوری بھی ہے موسیقی بھی۔ یہ کوئی معمولی چیز نہیں کہ مجمع اکائی میں بدل جائے اور ہزارہا دماغوں کا ہجوم ایک وجود کی طرح ہو کہ سمع و بصر کی وحدت قائم ہو جائے یہ اعجاز صرف خطابت ہی میں ہے۔

مولانا آزادؒ کا خطیبانہ سفر تحریک خلافت سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ تقریر کیونکر شروع کی؟ اس کی روداد انہوں نے "میری کہانی" (ملیح آبادی) میں بیان کی ہے۔ تقریر کا ملکہ تو وھبی ہی ہوتا ہے، لیکن تقریر محض ملکہ ہی نہیں تقریر نام ہے مواد کا اور مواد سب کسبی ہوتا ہے۔ جو شخص خالی الذہن ہو گا وہ تقریر کا ملکہ رکھنے کے باوجود کبھی خطیب یا مقرر نہ ہو سکے گا۔ تقریر علم چاہتی اور ہر لحظہ علم سے جوان ہوتی ہے۔ پھر تقریر محض علم ہی نہیں اس کو زبان کی ضرورت ہے اور علم و زبان کا خطاب میں ڈھلنا اوصاف بالا کے بغیر ممکن نہیں:

> "مولانا آزادؒ نے اوائل عمر ہی میں علم و مطالعہ کی وادیاں قطع کر لی تھیں، وہ موروثی خطیب تھے، ان کے والد ایک بہت بڑے واعظ تھے، مولانا عمر کی ابتدائی دور میں تھے کہ والد نے منبر و محراب پر کھڑا کر دیا اور وہ تقریر کرنے لگے۔ مولانا بیس سال کی عمر میں اکابر کے لیے موجب حیرت تھے۔ انجمن حمایت الاسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں پہلی دفعہ خطاب کیا تو مولانا الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد اور علامہ شبلی ہکا بکا ہو گئے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے کہا، تقریر خوب رٹی ہوئی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ان ریمارکس پر مولانا نے اعلان کیا کہ ڈپٹی صاحب جو عنوان تجویز فرمائیں، میں اسی اجلاس یا اگلے اجلاس میں اسی موضوع پر تقریر

کروں گا۔ ڈپٹی صاحب نے موضوع تجویز کیا، مولانا نے تقریر کی تو مجمع لوٹ پوٹ ہوگیا، علامہ شبلی نے مولانا کے انہی کمالات پر کہا تھا "تمہارا دماغ عجائب روزگار میں ہے"۔

مولاناؒ نے خطابت کے ابتدائی دور میں کہ ابھی ان کا ذہن سیاست کی طرف منتقل نہیں ہوا تھا۔ عیسائی مشنریوں سے کئی شہروں مثلاً بمبئی، احمد آباد، آگرہ وغیرہ میں مناظرے کئے، تب ان کے ساتھی ایک تو ان کے بڑے بھائی ابونصر آہ اور دوسرے آغا حشر کاشمیری تھے، اس طرح ان کے ملکہ خطابت کو جلا ملی۔ لیکن مناظروں سے جلد ہی ہاتھ اٹھالیا، اور قلم و زبان کی دوسری راہ پر آگئے، ان مناظروں نے طبیعت کا رُخ باندھ دیا اور خطابت سے کاملاً رسم و راہ ہوگئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وعظ سے کہیں زیادہ مناظرہ کا شہرہ تھا۔ اور عیسائی مشنریوں کی یلغار نے علماء و فضلا کا رُخ اپنی طرف پھیر لیا تھا۔ سید سلیمان ندویؒ نے "حیات شبلی" میں لکھا ہے کہ مولانا رحمت اللہ کرانوی اور ڈاکٹر وزیر خان (آگرہ) کا وجود ردِ عیسائیت میں تائید غیبی تھا۔ ان کے علاوہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا محمد علی بنگلوریؒ، مولانا عنایت الرسول چریاکوٹیؒ اور مولانا سید محمد علیؒ مونگیری ان معرکوں میں بلا کے شہسوار تھے۔ جہاں جہاں عیسائی انہیں دیکھتے حواس باختہ ہوجاتے اور فرار کرتے۔ ہندوستان میں عیسائی مشن کے سرخیل پادری نے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو دیکھتے ہی کہا تھا کہ اس شخص کا وجود اسلام کی صداقتوں میں سے ایک صداقت ہے۔ مولانا آزادؒ سے متعلق سید سلیمان ندویؒ نے حیات شبلی کے صفحہ ۱۰۵ پر لکھا ہے کہ:

"ندوہ کا اجلاس لکھنؤ ۱۹۱۲ء میں سید رشید رضا مصری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ سید صاحب نے ڈھائی گھنٹے تک عربی میں ایک نہایت دلآویز و فصیح تقریر فرمائی۔ سماں بندھ گیا۔ اس اجلاس میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کی قادر الکلامی کے خوب خوب مناظر سامنے آئے وہ سید رشید رضا مصری کی عربی تقریر کا خلاصہ اُردو میں سنانے کھڑے ہوتے تو بجائے خود اپنی سحر بیانی سے دلوں میں تلاطم برپا کردیتے تھے"۔

خلافت کی تحریک ۱۹۱۹ء میں شروع ہوئی۔ لیکن ۱۹۲۰ء کا زمانہ اس کے برگ و بار کا زمانہ تھا۔ جس طرح بہار کے موسم میں پھول اُگ آتے اور چمنستان لالہ و گلاب سے لد پھند جاتے ہیں۔ اسی طرح اس زمانے میں سیاسی کارکنوں، سیاسی راہنماؤں اور سیاسی خطیبوں کی ایک بڑی جماعت پیدا ہوگئی۔ سارا ملک ان سے متحرک ہوگیا۔ کوئی سی ہندوستانی قوم اس سے خالی نہ رہی، ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، پارسی، ہر جماعت میں

شخصیتیں ڈھلنے لگیں۔ فی الجملہ یہی زمانہ اردو میں جاندار سیاسی خطابت کا عہد آغاز تھا۔ مولانا آزادؒ، مولانا محمد علیؒ، مولانا ظفر علی خاںؒ، سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور مولانا احمد سعید دہلویؒ کے علاوہ خطیبوں کی ایک لین ڈوری لگ گئی۔ پھر آزادی کے ظہور (۱۴ اگست ۱۹۴۷ء) تک ان میں اضافہ ہوتا رہا۔ ہر صوبہ میں بیسیوں خطیب تھے، اور سب کو تقریر و خطابت کے فن میں کمال حاصل تھا، اردو زبان کا مزاج اگرچہ عربی و فارسی سے تھا اور ایک اعلیٰ پایہ کے خطیب کا ان دو زبانوں سے مستفید ہونا ضروری تھا کہ خطابت میں ان سے توانائی پیدا ہوتی تھی لیکن تنہا اردو نے بھی بڑے بڑے خطیب و مقرر پیدا کیے، پھر جن کے پاس انگریزی زبان اور اس کا علم تھا وہ سونے پر سہاگہ تھا۔ لالہ لاجپت رائے، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، آچاریہ نریندر دیو، ڈاکٹر محمد اشرف اس رعایت سے خاص گونج گرج کے خطیب تھے۔ احرار راہنماؤں کی پوری جماعت خطباء کی جماعت تھی، جمعیت العلماء ہند کے ابتدائی دور میں مولانا احمد سعید دہلویؒ ناظم تھے، وہ ٹکسالی اردو میں تقریر کرتے اور پورا مجمع لوٹ لیتے۔ آخری دور میں مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ ناظم تھے۔ وہ ایک بلند پایہ خطیب تھے ان کی خطابت میں سلاست و بلاغت قدم ملا کے چلتے تھے۔

لیکن جن لوگوں نے سیاسی خطابت کا آغاز کیا اور ۱۹۱۹ء میں تحریک لاتعاون کے زعماء کی حیثیت سے عوام کو فتح کیا۔ وہ صفِ اوّل کے قائد بھی تھے اور صفِ اوّل کے خطیب بھی۔ سربرآوردہ سرِ فہرست مولانا محمد علیؒ قرنِ اوّل کے حجازی شہسوار تھے، ان کا بولنا عوام کا کھولنا تھا، مولانا ظفر علی خاںؒ اشہب خطابت کو بگٹٹ لے جاتے اور باغ و راغ پھلانگتے تھے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ آغاز میں صرف خطیب تھے۔ ان کی سیادت کا چراغ ان کی خطابت کے چراغ سے مقابلۃً مدھم تھا۔ لیکن اردو زبان نے ان سے بڑا عوامی خطیب پیدا نہ کیا۔ ان میں یدِ الٰہی بانکپن تھا کہ مجمع ہائے عوام کے خیبر آنِ واحد میں سر کر لیتے تھے۔

مولانا آزادؒ میں محمد علی کی مبارزت، ظفر علی خان کی مقاومت، عطاء اللہ شاہ کی شہامت اور احمد سعید دہلوی کی نزاکت کے عناصر نہ تھے۔ لیکن وہ ہر رعایت سے اتنے جامع الصفات خطیب تھے کہ خطابت ان کے بیان کا آلہ تھی، وہ برعظیم میں فن کی رعایت سے اردو زبان کے سب سے بڑے خطیب تھے اور خطابت کے معنوی اوصاف میں کوئی ان کے ہم پلہ نہ تھا۔ وہ ایک ہی شخص تھے جن میں قیادت و خطابت کی رعایتوں سے ایک نادرہ روزگار انسان کی وہ تمام خوبیاں بیک وقت اکٹھا ہو

گئی تھیں، جن سے پورا ہندوستان آخر تک خالی رہا۔ وہ قدیم و جدید کے محاسن کا امتزاج تھے۔ سیاستدان مدبر، مفکر، راہنما، ادیب، صحافی، خطیب، مفسر اور کیا کچھ نہیں تھے۔ ہر مجلس میں منفرد و یگانہ تھے۔ ان کے محاسن اتنے عظیم تھے کہ ہر شخص ان پر فخر کرتا تھا۔ ان کے علم کی بے پناہی نے انہیں عوام سے الگ کر دیا تھا۔ وہ شمع محفل کی طرح سب سے جدا اور سب کے رفیق تھے، لیکن اپنے دماغ سے باہر نہیں جھانکتے تھے۔ انہیں چاروں طرف ایک سپاٹ میدان نظر آتا۔ اس چیز نے انہیں سیاسۃً عوام سے محروم کر دیا، اور وہ نتیجۃً عوام سے محروم ہو گئے۔ لیکن بڑے سے بڑا خطیب زبان و بیان میں ان کے قدم لیتا تھا وہ عوام میں شاذ ہی آتے تھے۔ ادھر تحریک خلافت کے بعد ان کی کم آمیزی تنہائی کی شدت تک چلی گئی۔ لیکن مسلم لیگ کے شعلہ نفس مقرر بہادر یار جنگ بھی تسلیم کرتے تھے کہ انہوں نے ابوالکلامؒ سے خطابت کے بال و پر حاصل کیے۔ ادھر سردار عبدالرب نشترؒ نے بھی مولانا کے خرمن خطابت کی خوشہ چینی کا اعتراف کیا تھا۔

اکثر خطبا و زعما مولانا کے محاسن خطابت اور محامد نگارش سے فیضیاب ہونے کا اعتراف کرتے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، قرن اول کے فقر و استغنا کی تصویر تھے۔ ہندوستان خطابت میں ان کا ثانی نہیں رکھتا تھا، خود مولانا آزادؒ نے ان سے متعلق کہا تھا کہ:

"اس باب میں قومی جدوجہد کا ہر گوشہ ان کا شکر گزار ہے۔"

مولانا اشرف علی تھانوی فرماتے تھے کہ "شاہ جی کی باتیں عطائے الٰہی ہوتی ہیں۔" ان کا خیال یہ تھا کہ گاندھی و نہرو سے بھی الغوں کے ساتھ ملتے لیکن مولانا آزادؒ سے اس طرح ملتے گویا ان کے خورد ہوتے اور ان کی بزرگی سے مرعوب ہیں۔

آزاد خطابت کی ہر ادا میں ڈھلے ہوئے تھے، زبان لونڈی، بیان خانہ زاد، فصاحت پیش کار، بلاغت خدمت گار، مطالعہ بے کراں، مشاہدہ غیر مختتم، تجربہ ہر لحظہ عربی جیب کی گھڑی، فارسی ہاتھ کی چھڑی، اردو محبوبہ، دماغ انسائیکلوپیڈیا، زبان شمع، سلاست رو، ذہانت معجزانہ، ظرافت ملیح، جیسے بلبل کی پیشانی پر سیندور کا ٹیکا، طریق ٹکنیک، ایسا کہ طبیعتیں خود بخود اس طرف کھنچتی چلی جائیں۔ اسلوب بے مثال، آواز پاٹ دار، لہجہ نستعلیق، الفاظ کا ٹانکہ ٹانکہ بولتا تھا۔ اشارات چاند پہ ہالے کی طرح، استدلال آنکھ میں بینائی کی مانند، تمثیلات ہم رکاب، انفرادیت اس حد تک کہ اس کا افصح نام ابوالکلامؒ تھا۔

افسوس کہ مولانا کی تقاریر کا کوئی مستند مجموعہ موجود نہیں۔ البتہ حکومت ہند کے پبلیکیشنز ڈویژن کے

زیر اہتمام بعض سرکاری تقریبات کی تقاریر کا انگریزی مجموعہ جنوری ۱۹۵۶ء میں چھپا تھا "چٹان" میں کوئی نصف تقاریر کا ترجمہ کیا گیا۔ ان تراجم کو بعض دوسری تقاریر کی اخباری رپورٹوں کے ساتھ ملا کر پاکستان کے بعض ناشروں نے شائع کیا۔ لیکن الفاظ و مطالب کی صحت کا بالکل خیال نہ رکھا، جس سے فاش غلطیوں میں ہر اشاعت کے ساتھ اضافہ ہوتا رہا۔

راقم دوسری جنگ عظیم کے دوران ۱۹۴۵ء میں پانچ سال کی قید گزار کر رہا ہوا تو پہلے پہل مولانا کے ان خطبات کا مجموعہ شائع کیا جو خلافت کمیٹی، جمعیۃ العلماء ہند اور انڈین نیشنل کانگرس کے سالانہ اجلاس کے صدارتی خطبات تھے۔ اس مجموعے کو بعض دوسرے اشاعتی اداروں نے بھی اڑا لیا اور مختلف افراد سے مقدمے لکھوا کر چھاپا۔ ابتدا تو اس میں صحت کو ملحوظ رکھا گیا، ملک تقسیم ہو گیا تو بے ذوق ناشروں کی بدولت ان خطبات کا حلیہ بھی مسخ ہو گیا۔ غلطیوں کی اتنی بہتات ہو گئی کہ پناہ بخدا۔

ہندوستان میں السنہ شرقیہ کے فاضل ڈاکٹر مالک رام نے بھی خطبات اپنے حواشی کے ساتھ ۱۹۷۴ء میں ساہتیہ اکیڈیمی دہلی کے زیر اہتمام شائع کئے ہیں۔ ان میں پانچ چھ دوسری تقریریں بھی ہیں۔ ادھر پاکستان میں ایک دو اداروں نے مولانا کی دو چار تقریریں جو ملکی تقسیم کے بعد دہلی کی جامع مسجد اور دیوبند کے دارالعلوم وغیرہ میں ہوئی تھیں خطبات میں شامل کر کے چھاپیں تو ان میں بھی صحت کا خیال نہ رکھا گیا۔ ایسا کوئی ادارہ موجود نہ تھا جو صحت کا التزام کرتا۔ ناشروں کے سامنے صرف پیسہ کمانے کا سوال تھا۔ غرض مولانا کی تقریروں سے غفلت ناشروں کا شعار ہو گئی ادھر ہندوستان میں کئی ایک ناشروں کا شعار یہی رہا۔ ان کا نیشنلزم، سیکولرازم یا کوئی اور ازم مولانا سے انصاف نہ کر سکا۔ اور مسلمانوں کے جو ادارے قبل از تقسیم سے معروف و معلوم تھے وہ مولانا کے معاملہ میں یکر خم تھے۔ ان کا مذاق مختلف تھا۔

مولانا کی دو چار تقریریں "الہلال" کے اوراق سے مل جاتی ہیں لیکن وہ مجموعوں میں شامل ہونے سے رہ گئیں۔ مرتبین کے سامنے "الہلال" نہ تھا۔ پھر مولانا کی تقریریں صرف اس قدر نہ تھیں جتنی جمع کر کے شائع کی گئیں۔ تقاریر کا ایک ذخیرہ تھا، اس ذخیرے کو ایڈٹ کر کے شائع کیا جاتا تو کئی جلدیں مرتب ہو سکتی تھیں۔ وہ خطابت کا شہ پارہ ہوتیں اور ان سے برعظیم کی سیاسی جدوجہد کے علاوہ بعض دوسرے احوال و وقائع معلوم ہو سکتے تھے۔

ان ناشرانہ مجموعوں میں بعض تقریبوں کی تقاریر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی شامل ہیں لیکن وہ مکمل

رپورٹیں نہیں۔ مولانا کی تقاریر مکمل لکھنا مشکل تھا، بالخصوص اس دور کی تقریریں جب مولانا مسلمانوں کے مجامع کو خطاب کرتے اور قرآن و حدیث کے حوالے دے کر اسلامی افکار کی اصطلاحیں بولتے تھے، مولانا تقریر کے دوران مضمون کی رعایت سے فارسی اشعار بھی ٹانکتے تھے۔ ان کی تقاریر کا مضمون تو نوٹ ہو جاتا تھا لیکن رپورٹر خود ان کے سحر میں ڈوب جاتا۔ اس کے لیے تقریر کا سراپا کھینچنا ناممکن تھا۔ تقریر محض مضمون نہیں ہوتی وہ آواز کے اتار چڑھاؤ اور اشارات کے رنگ و آہنگ کا نام بھی ہے۔ ابوالکلام کو رپورٹنگ میں بند کرنا مشکل تھا۔ اس کے باوجود ان مجموعوں میں خطبات کے اس قدر محاسن ضرور ہیں کہ ان کے مطالب کا تجزیہ ہو سکے اور خطابت کیا ہے؟ اس کا اندازہ ہو جائے۔

خطبات آزاد کی پہلی تقریر تو کلکتے میں کسی اسلامی انجمن کے جلسہ عام کی ہے۔ (۲۷ اکتوبر ۱۹۱۴ء) ایک آل انڈیا خلافت کانفرنس کانپور کا صدارتی خطبہ ہے (۲۹ دسمبر ۱۹۲۵ء) دوسرا پروانشل خلافت کانفرنس آگرہ کا خطبہ ہے (۲۵ اکتوبر ۱۹۲۱ء) تیسرا صوبائی مجلس خلافت بنگال کا خطبہ صدارت ہے (۲۸ فروری ۱۹۲۰ء) اور خطبات کے تاریخی مجموعوں میں سب سے بڑا خطبہ ہے خطبہ کیا، ایک جامع و مانع کتاب ہے۔ کہ اس موضوع کی تمام دینی خصوصیتیں تاریخی اسناد کے ساتھ مرتب کی ہیں۔ موضوع کی سنجیدگی کے باوجود زبان کی رنگینی شروع سے آخر تک جھلکتی ہے۔

دو خطاب جمعیت العلما ہند کی سالانہ صدارتی تقریب کے ہیں اور دونوں اجلاس لاہور کے خطبے ہیں۔ ایک تحریری دوسرا تقریری (۱۹ نومبر ۱۹۲۱ء)

دسمبر ۱۹۲۱ء میں شہادت حسین کے موضوع پر کلکتے کے مسلمانوں کو خطاب کیا۔ ایک دو مجموعوں میں یہ تقریر بھی ہے۔ دو خطبات انڈین نیشنل کانگرس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے ہیں۔ ایک دھلی کے سپیشل اجلاس کا خطبہ ہے (۱۵ دسمبر ۱۹۲۳ء) دوسرا رام گڑھ کے سالانہ اجلاس کا خطبہ ہے (مارچ ۱۹۴۰ء) مولانا کے خطبات ہر اسٹیج کی نسبت سے جامع ہیں۔ مثلاً پراونشل خلافت کانفرنس بنگال کا خطبہ صدارت مسئلہ خلافت و جزیرہ عرب پر ایک قاطع دستاویز ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام بول رہا ہے۔ قرآن چتر افگن ہے۔ حدیث اس چتر کا عصا ہے اور تاریخ ہم رکاب ہے۔ یہ خطبہ کتابی شکل میں شائع ہوا تو بہ لحاظ مضامین و مباحث ۲۶×۳۹/۸ سائز کے ۱۵۰ صفحات میں تھا اور تمہید کے علاوہ ۲۵ فصلوں میں منقسم تھا، جن میں موضوع کے جملہ مطالب کا احاطہ کیا گیا، اور ترک موالات کے جواز پر آیات قرآنی کے حوالے سے

بحث کی گئی ہے۔ خلافت کانفرنس آگرہ و کانپور کے خطبات میں ایک مسلمان سیاست دان کی روح آواز دے رہی ہے۔ اواخر ۱۹۲۱ء میں اسلام جس لق ودق صحرا میں تھا۔ جمعیت العلماء لاہور کے خطبات تحریری وتقریری، اس ابتلا کے مضطربانہ احوال ہیں اور جہاد بالسیف کی آواز ہیں۔ امام ابن تیمیہؒ کے خطبات فتنہ تاتار کی مزاحمت میں کلمۃ الحق تھے۔ مولانا کے خطبات فتنہ انگریز کے خلاف نعرہ جہاد تھے، کانگرس کے دونو خطبے ایک ایسے سیاست دان کی پکار ہیں جو ۱۹۲۳ء میں ملک کے زعماء کو باہم دست وگریباں دیکھ رہا تھا اور جس کے سامنے سقوطِ خلافت کے علاوہ ہندو مسلم اتحاد کی بربادی کا نقشہ تھا۔ ثانیاً دوسری جنگِ عظیم (۱۹۳۹ء) نے ہندوستان کی آزادی کا سوال اُبھار دیا تھا۔ اُدھر مسلمان ایک الگ قوم کی بناء پر ہندو اکثریت کے جمہوری اقتدار سے خوفزدہ تھے۔ (۱۹۴۰ء) اس آخری خطبے میں مولانا نے مسلمانوں کے شانے کو تاریخ کے ہاتھ سے جھنجھوڑتے ہوئے ان کی معنوی طاقت کو جگانا چاہا۔ اس خطبے میں ۱۹۴۰ء کے احوال و وقائع کی سیاسی چھاپ صاف صاف نظر آتی ہے۔ غرض یہ خطبہ اس دور کے تاریخی ماخذوں میں سے ایک اہم دستاویز ہے۔

ان تقاریر وخطبات میں سے چند فقروں کا انتخاب سہل نہیں۔ انتخاب ایک ایسی چیز ہے کہ اس کا انحصار ہر شخص کے انفرادی ذوق پر ہوتا ہے۔ اور خطبات کے کلمات اپنے زمانہ وعہد کی ذہنی فضا کو متاثر کرتے ہیں۔ بالفرض ایک جملہ کل تیر بہدف تھا اور آج وہی جملہ وہ تاثیر نہیں رکھتا تو ظاہر ہے کہ حالات بدل چکے ہیں اور جو تاثر پہلے پڑاؤ پر تھا وہ اگلے پڑاؤ پر متغیر ہو گیا ہے، جس طرح کئی چیزیں پرانی ہو کر اپنی تروتازگی کھو دیتی ہیں اسی طرح خطبات کے بول جو اپنے وقت میں جوان ہوتے ہیں، اپنا زمانہ گزار کر بوڑھے ہو جاتے ہیں اور ان کا تاثر ماضی کی بھینٹ ہو جاتا ہے۔ مندرجہ تحت اقتباس جو مولانا کی تقاریر وخطبات کے ذخیرہ سے ایک عمومی مطالعے میں نقل کئے ہیں نہ تو مولانا کے فن کا تدریجی مطالعہ ہیں اور نہ ان سے مولانا کے خطبات کی بکمال وتمام نمائندگی ہوتی ہے۔ البتہ ان سے مولانا کی روش خطابت کے طریق واسلوب کا پتہ ضرور چلتا ہے۔ ان سے بہتر اقتباس بھی ہو سکتے تھے لیکن جو مواد سامنے تھا، اس سے کلمات ذیل اخذ کئے ہیں۔ البتہ ایک التزام کسی حد تک ملحوظ رکھا ہے کہ حوالے تین ادوار کے ہیں۔

پہلا دور: جب مولانا صرف قرآن وحدیث کے خطیب تھے۔

دوسرا دور: جب تحریک خلافت کا سیاسی سفر شروع کیا۔

تیسرا دور: جب مولانا ہندوستان کے سیاسی کارزار میں صف اول کے راہنما تھے۔ اور ان کی زبان

ودماغ دونو سیاسی تھے۔

ان اقتباسات میں یہی ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے۔

"عزیزو! میری آواز اس آلہ جہیر الصوت کے ذریعے آپ کے اس فقید المثال اجتماع کا آویزہ گوش ہو سکتی ہے۔ مشرق و مغرب تک جاسکتی ہے، شمال و جنوب تک پہنچ سکتی ہے۔ پھر ثریا کی بلندیوں تک اُڑ سکتی ہے۔ اور ثری کی پستیوں میں اُتر سکتی ہے۔ سوال ہے تمہارے دل و دماغ کا فاصلہ کس قدر ہے، کوشش کروں کہ اپنی آواز ان تک پہنچا سکوں۔"

زندگی نہ بھڑک اُٹھنے کا نام ہے۔ نہ بجھ جانے کا۔ زندگی نام ہے سلگتے رہنے کا۔

دل جب تک لذت آشنائے درد نہ ہو برف کی ایک قاش ہے، جو پانی تو بن جاتی ہے لیکن آگ نہیں ہو سکتی۔

مسلمان کئی صدیوں سے اس حالت میں رہ رہے ہیں کہ آندھی کی طرح اُٹھتے، طوفان کی طرح چھا جاتے اور گرد کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔

عربی ضرب المثل ہے سیاست کے پہلو میں دل نہیں ہوتا۔ انسانی تجربوں کی طویل تاریخ اس کی تصدیق کرتی ہے، ادھر ہندوستان کے سیاسی تجربوں سے ایک اور بات آشکارہ ہوئی کہ سیاستدان صرف اپنے ہی مستقبل پر سوچتے ہیں۔ انہیں تاریخ کے اجتماعی عمل سے کہیں زیادہ اپنے ذوق کی انفرادی نمائش مطلوب ہوتی ہے۔

ہمارے ہاں سیاست میں بعض تنظیمیں دوڑتی ہیں یا بہتی ہیں۔ انہوں نے ابھی چلنا نہیں سیکھا جس دن چلنا سیکھ لیا ان کا سفر آسان ہو جائے گا اور منزل خود بخود سامنے آجائے گی۔

جوکھونا نہیں جانتے وہ پانے کا مزہ کیونکر لے سکتے ہیں۔ جس نے کبھی کانٹے کی چبھن نہیں دیکھی، وہ تلوار کے زخموں کی روداد کیونکر بتا سکتا ہے۔ دریا میں اُتر کر ہی تیرنا آسکتا ہے۔ تم یہ چاہو کہ پاؤں بھیگے نہ ہوں، پانی بدن کو چھوئے نہیں اور کناروں پر کھڑے کھڑے تیرنا سیکھ لو تو یہ ممکن نہیں۔ اسلام کی سربلندی کا راز ساحلوں پر کھڑے ہو کر دریاؤں کا پیچ و تاب دیکھنے میں نہیں اس کی سرفرازی کے لیے تمہیں طارق کی طرح اپنی کشتیاں جلانا ہوں گی، کچھ کھو کر ہی پا سکتے ہو۔

میں ستاروں کو الفاظ بنا سکتا ہوں اور چاندنی ان کی آواز ہو سکتی ہے اسی طرح صبا میرا لہجہ بن سکتی ہے۔ ہمالہ کی بلندی میرے خیال کا اُفق ہو سکتی اور سمندر کی تہ میرے فکر کا عمق، لیکن تمہارے قدم میرا ساتھ نہیں دیتے شاید تمہارے لغت میں فقدانِ ہمت کا نام تقدیر ہے۔

ابھی تاریخ کی صبح طلوع نہ ہوئی تھی کہ ہندوستان میں حلقہ بگوشانِ اسلام گنگا و جمنا کے کناروں پر وضو کرتے نظر آرہے تھے۔ انہی لوگوں کی بدولت اس سرزمین میں اسلام نے اپنے قدم جمائے تھے۔ پھر اس کے میدانوں میں ان شہسواروں ہی نے تاریخ کے شب و روز اجالے تھے۔ آج تم ہو کہ سیاست کی منڈی میں جنس کی طرح پڑے ہو اور تمہیں انتظار ہے کہ بڑی سے بڑی بولی کون دے سکتا ہے؟

اسلام نے جو معاشرہ تیار کیا یہ اس کا شرف تھا کہ افریقہ کا بربر اور حجاز کا بدو یک جان و دو قالب ہو گئے اور ہندوستان کا اچھوت مشرف بہ اسلام ہو کر خاک طیبہ کے سادات سے منسلک ہو گیا۔ جب تک مسلمانوں کے معاشرے میں اس خصوصیت کی آب و تاب ماند نہ ہوئی ان کے سر پہ کلاہ خسروی رہا۔ اور دنیاوی عزتوں کے بہت سے خزانے ان کے پاؤں میں ڈھیر ہوتے گئے۔ جونہی وہ اس سے دستبردار ہوئے اور انہوں نے شخصی شرف و مجد کے بت تراش لئے، ان کا معاشرہ اقوامِ عالم کے لیے عبرت کی ایک ایسی کہانی ہو گیا کہ آج دوسری کوئی داستان اس درجہ غمناک نہیں ہے۔

ہم مسلمان جہاں جہاں آباد ہیں ایک ملک سے لے کر دوسرے ملک تک حکمرانی تقسیم کے علی الرغم ملتِ واحد

ہیں، وہ زخم جو انقرہ میں کسی ترک کو لگتا ہے اس کا لہو دہلی میں ایک مسلمان کے سینے سے رستا ہے۔ اور وہ کانٹا جو مراکش میں کسی فرزند توحید کو چبھتا ہے اس کی ٹیس ہندوستان کے مسلمان کو ہوتی ہے۔

برطانیہ اور فرانس۔ جی نہیں یورپ کی تمام مسیحی طاقتوں نے ایک خاص متفقہ حکمت عملی وضع کی ہے اور اس کا نام مشرقی مسئلہ رکھا ہے۔ اس کی غایت اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسلام کے بقیہ قوائے سیاسیہ کا بتدریج خاتمہ کر دیا جائے۔ بالفاظ صاف تر یہ کہ دنیا کے جس قدر حصے اسلام کے زیر اثر باقی رہ گئے ہیں انہیں یورپ کی مسیحی حکومتیں کسی تقسیم مساوی کے ساتھ ساتھ آپس میں بانٹ لیں۔ جس شخص نے کم از کم گزشتہ دس برس کے واقعات سے آنکھیں بند نہیں کیں وہ بغیر کسی مزید بصیرت کے یورپ کے مسیحی عزائم اور استعماری مقاصد کو بخوبی دیکھ سکتا ہے۔

حق پرست بادلوں کا اندازہ ہواؤں سے کر لیتے، اور ابر پاروں سے رعد کی کڑک معلوم کر لیتے ہیں۔ جب گھٹائیں اٹھتی اور پھیلتی ہیں تو اہل نگاہ بھانپ لیتے ہیں کہ برکھا ہوگی، مینہ برسے گا، بارش موسلا دھار ہوگی یا بوندا باندی، یا بادلوں کا لشکر جرار تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کہیں دور چلا جائے گا۔

آج ۱۹۱۴ء کا آغاز ہے لیکن اس کی گھٹاؤں سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ عالمی فضا میں ژالہ باری ہوگی، یورپ کے میدانوں میں ہوگی سلطنت عثمانیہ میں بدلی، کئی چیزیں بیٹھ جائیں گی کئی غیب سے ابھر آئیں گی۔ میں دیکھ رہا ہوں، میری بصیرت مجھے کہتی ہے کہ حالات نے سلطنت عثمانیہ کے لیے معکوس فیصلے کر دیے ہیں، اور عربوں میں اندر ہی اندر ایسی آگ بھڑک رہی ہے جو انہیں ترکوں سے کاٹ دے گی اور ترک و عرب علیحدہ علیحدہ ہو جائیں گے، عربوں کو نیشنلزم کی افیون دی جا رہی ہے۔

اے اقوام یورپ! اے رہزنان قافلہ انسانیت! اے مجمع وحوش وکلاب! ظلم وعدوان تا بہ کے؟ اور خون ریزی تا چند؟ کب تک خدا کی سرزمین کو اپنے حیوانی غرور سے ناپاک رکھو گے؟ کب تک انصاف ظلم سے اور روشنی تاریکی سے مغلوب رہے گی؟ تبریز میں تمہارے ہاتھوں انسانوں کی گردنیں سولی پر ٹنگ رہی ہیں، طرابلس کی ریت پر اب تک اس جمے ہوئے خون کے ٹکڑے باقی ہیں، جو تمہاری آنکھوں کے

سامنے تمہارے ایک پیش رو نے بہایا، مراکش میں ان لاشوں کا شمار کوئی انسان نہیں کر سکتا۔ جن میں سینکڑوں کو تمہارے گھوڑوں کے سموں کی پامالیاں اور تمہارے جنگی بوٹوں کی ٹھوکریں نصیب ہوئی ہیں۔

تلوار کی صداقت کسی عہد میں ضعیف نہیں ہوتی وہ ہاتھ نہایت مقدس ہیں جن میں صلح کا سفید جھنڈا لہرا رہا ہے۔ لیکن زندہ وہی رہ سکتا ہے جس کی مٹھی میں خونچکاں تلوار کا قبضہ ہو۔

برطانوی استعمار نے ہم مسلمانوں میں ایک جماعت تیار کی ہے اور یہ لوگ وہ ہیں جو دنیوی عزت کے لیے دینی غیرت کا جوا کھیلتے ہیں، جن کے لیے ملت کا وجود ایک بازیچہ ہے ہوائے نفس آذریت ہے۔ حکام و امراء معبود ہیں، درہم و دینار قبلہ ہیں، غلامی و تعبد ان کی شریعت ہے اور قریش مکہ کے امت وساکت بتوں کی جگہ سمندر پار سے آئے ہوئے متحرک بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ جو وحی الٰہی کی جگہ شملہ کے معمار سے اترے ہوئے احکام و فرمان کو اپنی کتاب وسنت یقین کرتے ہیں۔ اور جن کے قلوب اصابع الرحمٰن کی جگہ اصابع الشیطان ہیں۔

تاریخ پلٹے کھا رہی ہے وقت کے دامن میں غضب ناک بجلیاں چھپی ہوئی ہیں اور آشیانوں پہ کوندنے کے لیے مضطرب ہیں اپنی جانوں کو ہتھیلیوں پر تیار رکھو اللہ کے قانون تمہارے لیے بدل نہیں سکتے، وہ اٹل ہیں۔ جو لوگ مقصد کے سفر میں ایمان، حق اور صبر کی راہوں سے گزرتے ہیں، ان کے قدم کسی موڑ پر ڈگمگاتے نہیں، ان کے لیے کامیابی آگے بڑھ کر اپنے چہرے سے گھونگھٹ اٹھا دیتی اور نصرت الٰہی معین ہوتی ہے۔

میں علی گڑھ سے آ رہا تھا اور آگرہ کے حدود میں تھا۔ جمنا کو دیکھا تو یکایک رنگا رنگ خیالوں میں مستغرق ہو گیا۔ ایک تصور میں ڈوب گیا۔ جمنا میں اس وقت اتنا پانی بھی نہ تھا جتنا ان پانچ سالوں میں مسلمانوں کا خون بہہ چکا ہے۔ جمنا اسی طرح بہہ رہی ہے جیسا کہ صدیوں سے بہتی آ رہی ہے لیکن سوتے خشک ہو چکے ہیں۔ ذرا دیکھو کہ اسی فضا میں ایک بہترین آواز اور اس کی زبان موجود ہے۔ اس کے پاٹ میں عبرت کے ورق

کھلے ہوئے ہیں گو ان کی زبان نہیں لیکن فصاحت کا مجسمہ ہے۔ پھر ان عمارتوں پر نگاہ ڈالو، جو آگرہ اور اس کے نواح میں تمہاری فرمانروائی کی یادگار ہیں۔ ان کی آواز سنو تاریخ پکار رہی ہے۔ ان کے کھنڈر تمہاری گزشتہ عظمت کا ماتم کر رہے ہیں۔ ان کے چہروں کا رنگ وفور گریہ سے اڑ چکا ہے۔ ادھر وہ شاہجہان کا مدفن ہے کیا اس سے بڑھ کر کوئی زبان ہو سکتی ہے؟ جو تمہارے کانوں کو مخاطب کر سکتی ہو۔ آگرہ کا چپہ چپہ تاریخ کا امانت دار اور اس کا ذرہ ذرہ عظمت رفتہ پر اشکبار ہے۔ کیا آواز موجود نہیں ؟ افسوس کہ تم نے اپنے کان بند کر رکھے ہیں اور دیکھتے ہو تو اس طرح کہ تمہارے لیئے یہ سب کچھ بے معنی ہے۔ تمہاری نیندیں معلوم ہوتا ہے صبح قیامت تک دراز ہو گئی ہیں۔ کیا میری آواز صدا بصحرا ہے؟ تم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ سوتے رہو گے اور قیامت کا صور پھنکنے تک اٹھو گے نہیں ؟ ایسا نہ ہو کہ قیامت تم پر قیامت سے پہلے گزر جائے۔

برطانوی استعمار نے خدا کی اس زمین پر مسلمانوں سے جو سلوک کیا ہے اس کے بعد یہ تو ممکن ہے کہ بچھوؤں کو ہتھیلی پر لے کر دودھ پلائیں۔ اور سانپوں سے صلح کر لیں، لیکن یہ ممکن نہیں کہ صلح وصفائی کا ہاتھ انگریزوں کی طرف بڑھائیں۔

آسمان کی تمام بجلیاں اتر آئیں اور ہمالہ کی چٹانیں اپنی صفیں کھڑی کر لیں، لیکن وہ ایک ثانیہ کے لیے بھی ایمان کو شکست نہیں دے سکتی ہیں۔ قدرت کاملہ جب کسی فرد یا جماعت کو ایمان کی طاقت بخشتی ہے تو وہ بے پناہ ہو جاتا ہے۔

میری طرف نہ دیکھو اپنے گریبان کی طرف دیکھو۔ اس کے چاک گن لو، ضرورت یہ نہیں کہ بخیہ کر لو، سُنو کہ اسلام اب بھی حجاز کے صحرا میں دیوانگی عشق کو آواز دے رہا ہے۔ اور وہ ایک بیابان جہاں تم نے اپنے قدموں کی چاپ سے لالہ زار پیدا کیئے تھے۔ تمہارے قدموں کے انتظار میں ہے۔ اب گریبان کے چاک اپنے قافلہ اتحاد اور کاروان استقامت کا پھریرا بنالو، منزل دوڑ کر تمہارے قدم لے گی۔

آج کرہ ارضی کی خشکی و تری حق وصداقت سے محروم ہو چکی ہے۔ اور خدا کی زمین پر اس کے مظلوم و درماندہ

بندوں کے لیے کوئی گوشۂ امن وعافیت باقی نہیں رہا۔ گویا زمین کی پچھلی تمام نامرادیاں لوٹ آئی ہیں اور تاریخ عالم کی ساری گذری ہوئی شقاوتیں ایک ایک کر کے پلٹ رہی ہیں، سرزمین اصحاب کہف کا جبر و طغیان، فراعنۂ مصر کا جبر و استبداد، نمارودہ کلدان کا غرور و تمرّد، اصحاب مدین کا انکار و اعراض قوم عاد کا فسق و عدوان، یہ سب کچھ بیک ظرف و زمان جمع ہو گیا ہے۔ (علما سے خطاب)

دنیا میں علم و یقین صرف وحی الٰہی اور علوم و اعمال نبوت ہیں۔ اس کے ماسوا جس قدر بھی ہے قرآن پکار پکار کے کہتا ہے کہ ظن ہے۔ تخمین ہے، قیاس ہے اٹکل ہے ظلمت ہے تحریص ہے تعصب بالرّے ہے۔

آج ایک ایسے عازم کی ضرورت ہے جو وقت اور وقت کے سر و سامان کو نہ دیکھے بلکہ وقت اپنے سارے سامانوں کے ساتھ اس کی راہ تک رہا ہو۔ مشکلیں اس کی راہ میں غبار و خاکستر بن کر اڑ جائیں اور دشواریاں اس کے جولان قدم کے نیچے خس و خاشاک بن کر پس جائیں۔ وہ وقت کا خالق و مالک ہو اور زمانہ اس کی جنبش لب پر حرکت کرے۔ اگر انسان اس طرف سے گردن موڑلیں تو وہ خدا کے فرشتوں کو بلا لے۔ اگر دنیا اس کا ساتھ نہ دے تو وہ آسمان کو اپنی رفاقت کے لیے نیچے اتار لے، اس کا علم مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہو۔ اس کا قدم منہاج نبوت پر استوار ہو، اس کے قلب پر اللہ تعالیٰ حکمت رسالت کے اسرار و غوامض، معالجہ اقوام اور طبابت عہد و ایام کے سرائر و تقاضایا اس طرح کھول دے کہ وہ صرف ایک صحیفۂ کتاب و سنت ہاتھوں میں لے کر دنیا کی ساری مشکلوں کے مقابلے اور ارواح و قلوب کی ساری بیماریوں کی شفا کا اعلان کر دے، وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

میری طرف دیکھو، میں ایک انسان تم میں موجود ہوں جو سالہا سال سے صرف ایک ہی صدائے دعوت بلند کر رہا صرف ایک ہی بات کی جانب تڑپ تڑپ کر پکار رہا اور لوٹ لوٹ کر بلا رہا ہے۔ تم نے ہمیشہ اعراض کیا، تم نے اعراض ہی نہیں کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں۔ افسوس تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو، تم میں کوئی نہیں جو میرا آشنا سا ہو۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ اس پورے ملک میں ایک بے یار و آشنا غریب الوطن ہوں۔

دنیا کے تمام تغیرات وحوادث کی طرح جماعتوں کے اعمال بھی ختم ہو جاتے یا جاری رہتے ہیں۔ بار بار پیدا نہیں ہوتے۔ البتہ اُتار چڑھاؤ رہتا ہے۔ ہم غلطی سے اتار کو خاتمہ اور چڑھاؤ کو پیدائش سے تعبیر کرنے لگتے ہیں۔ کسی قومی جد وجہد کے وقفہ کو خاتمہ سمجھ لینا ایسی غلطی ہوگی جیسے سمندر کا اتار دیکھ کر سمجھ لیں کہ وہ کل پھر نہیں چڑھے گا۔

جماعت یا تو دوڑتی ہے یا بیٹھ جاتی ہے لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ یکساں رفتار سے چلتی رہے۔ جب بھی آزمائش وابتلا کے معرکے پیش آتے ہیں، ہمیں قربانی وایثار کے الاؤ روشن کرنے کے لیے اپنا خون دینا پڑا۔ ہمارے سامنے شہادت کے میدان اٹ جاتے ہیں، لاشوں کے ڈھیر صدا دیتے ہیں۔ طوق و سلاسل کا بازار گرم ہو جاتا ہے، قیدخانوں کے پٹ کھل جاتے ہیں اور اسیران جہد حریت کی ڈار لگ جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ امتحان کی اس بازی گاہ میں ہمیں بہت کچھ کھونا پڑتا ہے، لیکن جو چیزیں عشق کی راہ میں کھوئی جائیں ان پر معناً افسوس تو ہو سکتا ہے، ہراس نہیں، کیونکہ ہراس یقین وآگہی کی موت ہے۔

دنیا کو ہمارے ارادوں کے بارے میں شک رہے ہوں مگر ہمیں اپنے فیصلوں کے بارے میں کبھی شک نہیں رہا۔ میں نے پوری احتیاط کے ساتھ اپنے دل ودماغ کی نگرانی کی ہے، میں انیس برس سے کانگرس میں ہوں اس تمام عرصے میں کانگرس کا کوئی اہم فیصلہ ایسا نہیں جس کے ترتیب دینے میں مجھے شریک رہنے کی عزت حاصل نہ رہی ہو۔ میری آنکھوں نے دیکھنے میں اور میرے دماغ نے سوچنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ حالات میرے سامنے سے گزرتے ہی نہ رہے میں ان کے اندر کھڑا رہا۔ میں نے ایک ایک حالت کا جائزہ لیا۔ میں اپنے مشاہدے کو جھٹلا نہیں سکتا، میرے لیے ممکن نہیں کہ اپنے یقین سے لڑوں یا اپنے ضمیر کی آواز کو دبا دوں، ہندوستان کے نوکروڑ مسلمانوں کے لیے صرف وہی راہ عمل ہو سکتی ہے جس کی میں نے ۱۹۱۲ء کے "الہلال" میں انھیں دعوت دی تھی۔

میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں، اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم،

اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی وہ اس راہ میں میری راہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک اور ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں، میں اس متحدہ قومیت کا ایک اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل ہوں میں اپنے اس دعویٰ سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔

ہندوستان کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی ہے اور اس کی فیاض گود نے سب کے لیے جگہ نکالی ہے، انہیں قافلوں میں آخری قافلہ ہم پیروانِ اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشانِ راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا اور ہمیشہ کے لیے بس گیا، یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملان تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ بہتے رہے۔ لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے۔ دونوں کو ایک سنگم پر مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا، جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا، اسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا، ہم اپنے ساتھ ایک ذخیرہ لائے تھے۔ اور یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالا مال تھی۔ ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کر دی اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیئے۔ ہم نے اسے اسلام کے ذخیرے کی سب سے زیادہ قیمتی شے دے دی جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیغام پہنچا دیا۔ تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعہ پر گزر چکی ہیں۔

دوسری جنگِ عظیم اپنی ہولناک خون خواریوں سمیت یورپ کے میدانوں میں پھیل چکی ہے، ایک پردہ گرتا، دوسرا اٹھتا ہے، یقین کے ساتھ یہ کہنا بڑا مشکل ہے، کل کیا ہونے والا ہے کہ کل آج کا دن اور آج کی رات گزار کر آئے گا۔ حالت یہ ہے کہ ہفتوں میں صدیاں گزرتی چلی جا رہی ہیں۔ آنکھ کی ایک جھپکی ہیں

صورتِ حالات کہیں کی کہیں پہنچ جاتی ہے، جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہمارے تصور و گمان سے بعید ہے۔ خدا سے علیم و خبیر ہی جانتا ہے کہ آئندہ ساعت اپنے ساتھ کیا لا رہی ہے؟ بلندیاں اٹھ اٹھ کر پستیاں بن رہی ہیں اور پستیاں ابھر ابھر کر بلند ہو رہی ہیں۔ مسٹر چرچل انگلستان کا وزیرِ اعظم ہونے کے بجائے کیمبرج یا آکسفورڈ یونیورسٹی میں تاریخ کا پروفیسر ہوتا تو ہندوستان کے بارے میں اس کا فیصلہ مختلف ہوتا۔ وہ نسلِ انسانی کے ہمہ گیر تجربوں سے فائدہ اٹھاتا، ضد نہ کرتا، تجزیہ کرتا، لیکن اقتدار نے ان کے ذہن کو اس حد تک ماؤف کر دیا ہے کہ اس کا مزاج طاقت کا مزاج ہو گیا ہے اور طاقت ہمیشہ تاریخی سچائیوں کو جھٹلا کر اپنی ذات کے فیصلوں پر بھروسہ کرتی ہے۔

ہندوستان اور پاکستان کی صبحِ آزادی خون میں ڈوب کر طلوع ہوئی۔ ہندو مسلم فسادات برطانوی مشن کے زمانے ہی میں شروع ہو چکے تھے۔ ابھی مشن ہندوستان میں تھا تو اکا دکا قتل ہو رہے تھے، مشن رخصت ہو گیا تو نواکھالی، بہار، گڑھ مکتیشر، امرتسر، لاہور، راولپنڈی وغیرہ میں نوعِ انسانی کا لہو ارزاں ہو گیا، بستیوں کی بستیاں صرف اختلافِ مذہب کے جرم میں تاراج کی گئیں، عورتیں اغوا ہو گئیں، جوان قتل کر دیے گئے، بچوں کو مار دیا گیا، بوڑھوں کو موت چاٹ گئی۔ بربادی اتنی بڑھ گئی تھی کہ انسان وحشی ہو چکا تھا۔ پھر جب آزادی کا دن آیا تو دونو طرف قتلِ عام تھا، دہلی جو کبھی مسلمانوں کا شہر تھا اور جہاں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے دن بھی مسلمانوں کی تاریخ چپے چپے میں بکھری ہوئی تھی، مسلمانوں کے لیے آغوشِ قبر کی طرح تنگ ہو گیا، اور جو بازار کبھی ان کی چہل پہل سے پُر رونق تھے، ان کے لیے چتا ہو گئے۔ مولانا نے ان دنوں دہلی کی جامع مسجد میں مسلمانوں کے ایک فقید المثال لیکن مجروح و مضطرب اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے ایک دلگدازانہ تقریر کی، اس تقریر کے چند اقتباس حسبِ ذیل ہیں۔

"عزیزانِ ملت ایک زمانے میں کہ اس پر لیل و نہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی ہیں میں نے تمہیں یہیں سے خطاب کیا تھا، لیکن اس وقت تمہارے چہروں پر اضمحلال کی بجائے اطمینان تھا اور تمہارے دلوں میں شک کی بجائے اعتماد تھا۔ لیکن آج تمہارے چہروں کی پریشانی اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں تو مجھے بے اختیار سالہا سال پہلے کی بھولی بسری کہانیاں یاد آ جاتی ہیں۔ میں نے تمہیں پکارا تم نے میری زبان قطع کر لی، میں نے قلم اٹھایا تم نے میرے ہاتھ قلم کر دیئے۔ میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں توڑ ڈالے۔ میں نے کروٹ لینا چاہی

تم نے میری کمر توڑ دی، تم نے غفلت و انکار کی وہ ساری سنتیں تازہ کر دیں جو رو بہ انحطاط قوموں کا مقدر ہوتی ہیں۔ نتیجہ معلوم کہ آج ان تمام خطروں نے تمہیں گھیر لیا ہے جن کا خوف تمہیں صراطِ مستقیم سے دُور لے گیا تھا۔

اب میں ایک جمود ہوں یا دُور افتادہ صدا، میں نے وطن ہی میں رہ کر غریب الوطنی کی زندگی گزاری ہے۔ میرے دامن کو تمہاری دست درازیوں سے گلہ ہے وہ خوف جو تمہارے حواس کو محیط ہے تم نے خود فراہم کیا ہے۔ یاد رکھو، اس قسم کے خوف قوموں کی حیاتِ معنوی کے لیے مرض الموت ہوتے ہیں۔

جن سہاروں پر تمہارا بھروسہ تھا وہ تمہیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے اور شاید اس لیے کہ تمہارے نزدیک فقدانِ ہمت کا نام تقدیر ہے۔ انگریز کی بساط تمہاری خواہش کے خلاف الٹ گئی اور راہنمائی کے وہ بُت جو تم نے خود تراشے تھے وہ بھی دغا دے گئے، میں اس کہانی کے اوراق اُلٹ کر تمہارے حواس کو نہ تو معطل کرنا چاہتا ہوں اور نہ مجھے ہراس کا تذکرہ چھیڑ کر تمہارے وجود کو شل کرنا ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمہاری خواہشوں کے مطابق انگڑائی نہیں لی۔ لیکن وقت کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ آزادی کی جدوجہد کے سامنے سپر انداز ہو، میں نے تمہیں ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو، شک سے ہاتھ اُٹھا لو اور بدعملی ترک کر دو۔ وہ دیکھو جامع مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی عظیم الشان تاریخ کے پُر رونق صفحات کو کہاں گم کر دیا؟ ابھی کل کی بات ہے کہ یہیں جمنا کے کناروں پر تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج یہاں رہتے ہوئے تمہیں خوف محسوس ہوتا ہے کیا بھول گئے ہو کہ دلی تمہارے ہی خون سے سینچی ہوئی ہے۔

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کر لو، جس طرح کچھ دن پہلے تمہارا جوش و خروش غلط تھا اسی طرح آج تمہارا خوف و ہراس بے جا ہے۔ مسلمان اور اشتعال یا مسلمان اور بزدلی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ وہ لوگ جو تمہیں چھوڑ کر چلے گئے انہوں نے تمہیں فرار ہونے ہی کے لیے اکٹھا کیا تھا۔ اگر تمہارے دل ان کے ساتھ رخصت نہیں ہو گئے اور بدستور تمہارے پہلو میں ہیں تو ان کو اس خدا کی جلوہ گاہ بناؤ جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک اُمّی کی معرفت فرمایا تھا

ان الذین قالوا ربنا اللّٰہ ثم استقاموا ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔

(جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو پھر ان کے لیے نہ تو کسی کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم)

عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو، یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لیے تیار نہ تھے۔ میں نے پینتیس برس پہلے ۱۹۱۲ء میں ببانگ دھل کہا تھا کہ ہندوستان کی آزادی رُک نہیں سکتی، برطانوی اقتدار کو رخت سفر باندھ کے جانا ہوگا۔ ہمارے دماغوں میں غیر ملکی غلامی کے خاتمے سے متعلق کوئی شک نہ ہونا چاہیئے۔ مسلمانوں نے پس و پیش کیا تو یہ گویا تاریخ میں ان کی بدبختی کا باب ہوگا۔ تب انہیں ہندوستان پر اپنا حق جتاتے ہوئے ظاہر میں نہ ہی باطن میں مزید خلش ہوگی۔ افسوس وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ اب پھر کہتا ہوں تاریخ کا ساتھ دو۔ ستارے ٹوٹ گئے تو کیا ہوا، رات تو چلی گئی، سورج چمک رہا ہے اس سے کرنیں مانگ لو اور ان تاریک راہوں میں بچھا دو جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہے۔

آج زلزلوں سے ڈرتے ہو۔ کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے۔ آج اندھیروں سے کانپتے ہو یاد کرو کہ تمہارا وجود ایک اجالا تھا، گھٹاؤں کا طوفان کیا ہے کہ تم نے بھیگ جانے کے ڈر سے اپنے پائنچے چڑھا لئے ہیں، وہ آخر تمہارے ہی اسلاف تھے جو سمندروں میں اُتر گئے۔ پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا۔ بجلیاں لپکیں تو ان پر مسکرا دیے۔ بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا۔ صر صر اُٹھی تو رُخ پھیر لیا۔ آندھیاں آئیں تو ان سے کہا لوٹ جاؤ۔ یہ ایمان کی جان کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے ہی گریبان کے تار بیچ رہے ہیں۔ اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے ہیں کہ جیسے اس پر کبھی ایمان نہ تھا۔

ایمان کسی منڈی سے نہیں ملتا۔ ایمان کی منڈی تمہارے ہی دل ہیں۔ انہیں ٹٹولو کہ اس جنس سے خالی تو نہیں ہوگئے۔ اس سے بڑھ کر اندوہناک تصور کیا ہو سکتا ہے کہ دھلی کے لال قلعہ میں ہم کبھی "جہاں پناہ" تھے لیکن آج جانوروں کے ڈربوں سے پناہ مانگ رہے اور قبروں کے سینے ڈھونڈ رہے ہیں۔

مولانا آزادؒ کی تقاریر از ۱۹۴۷ء - ۱۹۵۵ء کا انگریزی مجموعہ پبلیکیشنز ڈویژن گورنمنٹ آف انڈیا کا شائع کردہ ہے۔ یہ ۲۳×۳۶/۸ سائز کے ۳۳۱ صفحات میں ۵۸ تقریریں ہیں، ان تقریروں میں آزادی

کے بعد وزیر تعلیم کی حیثیت سے مولانا نے بعض تحقیقی، علمی، اور تعلیمی مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ بعض عنوانات ملاحظہ ہوں۔

۱۔ تعلیم اور قومی تعمیر
۲۔ تربیتِ اساتذہ
۳۔ تعلیم اور آزادی
۴۔ قومی تعلیم کا منصوبہ
۵۔ عمرانی تعلیم
۶۔ مختلف زبانوں میں ہندوستانی آرٹ
۷۔ ہندوستانی آرٹ اور کلچر
۸۔ ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ
۹۔ تاریخ اور تعبیرات
۱۰۔ علی گڑھ اور ہندوستانی نیشنلزم
۱۱۔ ہندوستان اور یونیسکو
۱۲۔ ہندوستان اور ایشیا
۱۳۔ آرٹ اور تعلیم
۱۴۔ دنیا اور ہندوستان
۱۵۔ ادب اور قومیت
۱۶۔ یونیسکو اور بین الاقوامیت
۱۷۔ یونیسکو کا نصب العین
۱۸۔ مشرق و مغرب میں آزادی کا تصور
۱۹۔ عوام اور آرٹ
۲۰۔ رقص، ڈرامہ اور موسیقی کا رول
۲۱۔ فطرت اور انسان
۲۲۔ مشرق اور یونیسکو
۲۳۔ ادب اور زندگی
۲۴۔ نئے ارتقا کی ضرورت
۲۵۔ آثارِ قدیمہ
۲۶۔ جنگِ آزادی کی تاریخ
۲۷۔ زبان کا مسئلہ
۲۸۔ علم مقصد اور وسیلہ
۲۹۔ مغربی تعلیم کے اثرات
۳۰۔ تعلیم اور مذہب

وزارتِ تعلیم کے باب میں ان کا ذکر آچکا ہے۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے ہر تقریر جامع و مانع ہے۔ گو اردو کے اس سب سے بڑے خطیب کی شعلہ نوائیوں کا ان تقریروں سے اندازہ نہیں ہوتا، اور ہم ان کی زبان یا اس کے سحر اور فقروں کے جلال و جمال سے بہرہ اندوز نہیں ہوتے لیکن بہرحال ایک چیز ہر تقریر میں ابھری ہوئی نظر آتی ہے وہ ہے ان کے علم کی گہرائی اور نظر کی توانائی جس سے ان کے دماغ کی پہنائی کا اندازہ ہوتا ہے اور قارئین و سامعین ان کے خیالات کی پرواز سے متمتع ہوتے ہیں۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے کہ ایک ایک جملے میں کیا کیا نہاں ہے۔

قبول عام کے لیے میں نے کبھی کسی کی پیروی نہیں کی۔

افراد کی حقیقت طرزِ تعلیم سے آشکار ہوتی ہے۔

اسلام حقِ مساوات تسلیم کرتا ہے لیکن مقدار مساوات تسلیم نہیں کرتا۔ انسان کو زندگی کی لوازم مہیا کرنا ریاست اور معاشرے کی ذمہ داری ہے۔ جب آدمی پیدا ہوا تو اس کی زندگی سوسائٹی پر فرض ہو گئی کہ یہی اسلام کے معاشرے کی اصل ہے۔

سوشلزم جس قسم کی مساوات پیش کرتا ہے وہ بالکل غیر فطری ہے۔

مسلمانوں کا اسلام کے عطا کردہ خصائص، فضائل اور فرائض سے محروم ہونا اس لیے ہے کہ انہوں نے اسلام کے احکام کی اجتماعیت کو ترک کر کے انفرادیت اختیار کر لی۔ مثلاً زکوٰۃ اجتماعی عمل تھا۔ مسلمانوں نے انفرادی فعل ٹھہرا لیا جو غلط ہے۔

جملہ نزاعات کا سرچشمہ انسان کا دماغ ہے۔

مولانا کی تقریریں جن لوگوں کے حافظے میں ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ ہر تقریر میں کوئی اچھوتا خیال، کوئی اچھوتا جملہ کوئی اچھوتی ترکیب اور کوئی اچھوتا رنگ ضرور پیدا کرتے تھے۔ جو چیز ان کی زبان کا ایک بول ہوتی وہ دوسروں کے لیے معانی کا معجزہ ہوتا کئی دن تک لوگ جھومتے ان کی بعض تقاریر کے چند جملے راقم کے ذہن میں آج تک محفوظ ہیں مثلاً جنگ کے زمانے میں لاہور کے ایک جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"جنگ عظیم بگٹٹ ہو چکی ہے۔ آخر وہ کون سی عالمی جمہوریت ہے جس کے لیے برطانیہ لڑ رہا ہے۔ ہم سیاہ کو سفید کہنے سے انکار کرتے اور استعمار کا ہاتھ بٹانے سے معذور ہیں۔ ہمارے سامنے اب ایک ہی کام ہے کہ برطانوی استبداد کے خلاف ملک میں قومی جد و جہد کا جو چولہا دھک رہا ہے۔ اس کے لیے ملک کے کونے کونے

سے ایندھن جمع کریں اور اس آگ کو بھڑکائیں جو اپنی غلامی کے خلاف سلگ رہی ہے۔

آخرت کا تصور ہی صحیح اخلاق پیدا کر سکتا ہے۔ فلسفہ یا سائنس، دونوں انسان کی بے چینی کا سدِ باب کرنے سے قاصر ہیں، صرف مذہب ہی ایک ایسی طاقت ہے جو انسانیت کی دکھتی ہوئی پیٹھ کو سہارا دے سکتی ہے۔

میری صحت گرتی ہوئی دیوار ہے، میں نے اتنی دماغی بد پرہیزیاں کی ہیں کہ تندرستی کا تصور ہی عنقا ہو گیا ہے۔ میں زمانے سے سمجھوتہ کرنے کا عادی نہیں، میری منزل اس سے بہت دور واقع ہوئی ہے، میرا معاملہ صاحبؔ کے الفاظ میں اس قدر ہے ؎

طبع بہم رساں کہ بسازی بعالمے
یا ہمتے کہ از سرِ عالم تواں گذشت

قومی بیداری عقل سے نہیں عشق سے پیدا ہوتی ہے۔ جس عقل سے یمین و یسار کا تذبذب پیدا ہو وہ کسی معرکے میں کامیاب نہیں ہوتی۔ اس کا ہر قدم شکست کی طرف جاتا ہے۔

جس قوم کی ذہنی فضا نفرت کی آب و ہوا سے تیار ہوگی اس میں ایک متمدن قوم کی آب و تاب کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔

عدالت کے کٹہرے میں

سلطان جائر کے سامنے کلمۂ حق کہنا ایک ایسی روایت ہے جس سے مسلمانوں کی پوری تاریخ بھری پڑی ہے۔ حقیقی راست باز زبانیں مسلمانوں میں گزری ہیں اتنی تاریخ کے اجالوں سے پہلے اور بعد کسی دوسری قوم میں نہیں ہوئی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد قریب قریب ۱۹۱۰ء تک جن علما کو تختۂ دار پر کھینچا گیا ان میں استقامت کی ایسی تصویریں بھی تھیں کہ عدالتوں نے ان کی سزائے موت کو صرف اس لیے عمر قید میں تبدیل کیا کہ وہ لوگ شہادت کو عزیز رکھتے تھے اور موت کی سزا سن کر ان کا وزن بڑھ گیا تھا۔ علما سے اولی الامر کے مقدمات عدالتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کلمۂ حق کہنے کی ایک ایسی نظیر تھے کہ مادر گیتی اس قسم کے انسان شاذ ہی جنتی ہے۔

تحریک خلافت (۱۹۲۰ء) نے سیاسی مقدمات کا رُخ پھیر دیا، قومی آزادی کی جدوجہد کا پانسہ پلٹا اور ایک اجتماعی تحریک مفاہمت مجہول کے روپ میں شروع ہی سے جرأت و مردانگی کی ایک نئی تاریخ اُبھری۔ آئر لینڈ، فرانس اور بعض دوسرے یورپی ملک سچائی کی ان منزلوں سے گزر چکے تھے۔ ان کے بعض سپوتوں نے استبداد کو اس کے خنجر تلے للکارا، اور سچائی کا سرعام اعلان کیا، ان ملکوں کی عدالتوں نے انہیں کڑی سے کڑی سزائیں دیں اور وہ قید و بند کی ان سنگینیوں پر آمنّا و صدقنا کہتے رہے۔

ہندوستان برطانوی سلطنت کی مفتوحہ ریاست ہوگیا تو یہاں بھی عدالتی تاریخ کی سچائیاں اسی مزاج پر آگئیں کہ زیادہ سے زیادہ جو سزا دی جا سکتی ہے بلا تأمل دے دو میں یقین دلاتا ہوں کہ سزا کا حکم سنتے ہوئے جس قدر جنبش تمہارے دل میں پیدا ہوگی اس کا عشر عشیر اضطراب بھی سزا سن کر میرے دل کو نہ ہوگا۔ (بیرو لو)۔

مولانا ظفر علی خانؒ، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابو الکلام آزادؒ مسلمانوں کی تازہ وارد لیڈرشپ کے سرخیل تھے۔ ان تینوں نے ایک نئی انقلابی صحافت کا آغاز کیا تو سارے ملک کے سیاسی روزمرہ پر چھا گئے۔ یہ بات پہلے آچکی ہے کہ پہلے زمیندار نکلا، پھر کامریڈ اس کے بعد الہلال۔ اب تحریک لاتعاون شروع ہوئی تو پہلے مولانا ظفر علی خانؒ پکڑے گئے۔ پھر مولانا محمد علیؒ، پھر مولانا ابو الکلام آزادؒ۔

مولانا ظفر علی خان ۲۵ ستمبر ۱۹۲۰ء کو پکڑے گئے اور ۲۷ ستمبر ۱۹۲۰ء کو حضرو (پنجاب) میں ان کے مقدمے کی سماعت زیر دفعہ ۱۲۴ الف اور ۱۵۳ الف شروع ہوئی۔ استغاثہ نے چودہ گواہوں کا نام پیش کیا جن میں سے دو ہندو اور بارہ مسلمان تھے۔ ہندوؤں نے مولانا کے خلاف شہادت دینے سے انکار کر دیا۔ حضرت پیر سید مہر علی شاہؒ کا نام گرامی بھی استغاثہ کے گواہوں میں رکھا گیا، لیکن حضرت نے انکار فرمایا، باقی گیارہ مسلمانوں نے ڈٹ کے شہادت دی۔ مولانا کا عدالتی بیان کلمۂ حق کی متابعت میں استعماری سیاست کے مریز و کجدار پر تبصرہ تھا۔ مسٹر ایلن مچل سپیشل مجسٹریٹ نے مولانا کو ملزم گردانتے ہوئے ۲۷ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو ۱۲۴ الف میں پانچ سال اور ۱۵۳ الف میں دو سال قید کا حکم سنایا، البتہ دونوں سزائیں ایک ساتھ کر دیں۔ مولانا محمد علی کا مقدمہ ۲۶ نومبر ۱۹۲۱ء کو شروع ہوا، انہیں کچھ دن پہلے مولانا شوکت علیؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا نثار احمدؒ، پیر غلام مجدد، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور سوامی شنکر آچاریہ کے ساتھ گرفتار کیا گیا، اور ان سب کا مقدمہ مشترکہ طور پر سیشن جج کراچی نے سماعت کیا۔

مولانا محمد علی نے عدالت کو للکارتے ہوئے ایک طویل بیان دیا اور کہا ایک ہندوستانی، ایک انسان اور ایک مسلمان کی حیثیت میں برطانوی حکومت کا ساتھ دینا اور اس کی غلامی پر رضامند ہونا ضمیر کی موت اور ایمان کی جانکنی ہے۔

مولانا حسین احمد مدنیؒ نے بیان دیتے ہوئے کہا:

"ہم برطانیہ کی رعایا کے طور پر زندہ رہنے کے لیے تیار نہیں بلکہ مسلمان کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔"

مولانا شوکت علیؒ نے عدالت سے کہا:

"اگر حکومت مسئلہ خلافت کے متعلق ہمیں مطمئن نہ کر سکی، پنجاب (جلیانوالہ باغ) کے بارے میں انصاف سے کام نہ لے گی اور کامل سوراج نہ دے گی تو میرا فرض ہے کہ بحیثیت

ہندوستانی مسلمان کے اس حکومت کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی پوری کوشش کروں۔"

پیر غلام مجدد نے اپنے بیان میں کہا کہ:

"میں نہ جیل سے ڈرتا ہوں نہ پھانسی سے، میں احکام قرآن کی متابعت میں ہر صعوبت برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ خواہ اس کی شکل کوئی سی ہو۔"

مولانا نثار احمد نے عدالت سے کہا:

"ہمارے لیے قرآن و حدیث کے سوا کوئی چیز حجت نہیں اور نہ ہم ان کے مقابلے میں کسی دوسرے قانون کی وفاداری کا حلف لے سکتے ہیں۔"

سوامی شنکر آچاریہ نے کہا:

"میں نے قرآن و اسلام کا بلاواسطہ مطالعہ نہیں کیا، جو کچھ میرے دوست کہتے ہیں مجھے ان سے کامل اتفاق ہے۔

ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے عدالت کو بیان دیتے ہوئے کہا:

"حکومت برطانیہ میری قوم اور میرے مذہب کی دشمن ہے۔ اس کو مٹا دینا میرا فرض ہے۔

اور میں نے جو کچھ اپنی تقریر میں کہا وہ میرے اس عقیدے کا لب لباب تھا۔"

مولانا محمد علی کو دو سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ ان کے دوسرے ساتھیوں کو بھی اسی مدت کے لیے قید کیا گیا، لیکن سوامی شنکر آچاریہ بری کر دیئے گئے۔ سیشن جج کے ساتھ جن اسیسروں کا تقرر ہوا تھا ان کے سربراہ مسٹر رام چند تلسی داس نے جیوری کی طرف سے کہا کہ ان کی رائے میں جملہ ملزم بے قصور ہیں اور ان پر کوئی الزام ثابت نہیں ہوتا۔ البتہ لالہ دیارام کیدومل کی رائے تھی کہ سوامی شنکر آچاریہ کے سوا باقی ملزم صرف دفعہ ۵۰۵ اور ۱۰۹ میں قصوروار ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد ۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء کی صبح کو زیر دفعہ ۱۲۴ الف گرفتار کیے گئے، چیف پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی عدالت میں ۱۳ دسمبر کو سماعت شروع ہوئی، ۴ جنوری کو مولانا نے اپنا بیان داخل کیا اور آئندہ پیشی (۹ فروری ۱۹۲۲ء) کے روز عدالت نے ایک سال قید بامشقت کا حکم سنایا، مولانا نے سزا سن کر کہا "یہ اس سے بہت کم ہے جس کا میں متوقع تھا۔"

مہاتما گاندھی مشترکہ ہندوستان کے قائد تھے۔ انہوں نے اس بیان پر کہا:

"مولانا آزاد کا عدالتی بیان ایک عظیم بیان ہے اس میں بہت بڑی ادبی خوبصورتی ہے وہ نہایت وسیع اور روانی کے ساتھ پُرجوش بھی ہے، غایت درجہ وجدان ہے اس کا لہجہ غیر متزلزل اور غیر مفاہمانہ ہے۔ لیکن سنجیدہ اور متین بھی ہے۔ پورا بیان گرانقدر ہی نہیں بہترین سیاسی تعلیم ہے اور محض عدالتی بیان ہی نہیں۔ قوم و ملک سے خطاب ہے۔" (تلخیص)

پورا متن حسب ذیل ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس سے پہلے اور اس کے بعد بڑے سے بڑا سیاسی معرکہ ہوتا رہا۔ لیکن کسی عدالت میں اتنا عظیم اور خوبصورت بیان کسی سے نبے کبھی داخل نہ کیا یہ

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

بیان میرا ارادہ نہ تھا کہ کوئی تحریری یا تقریری بیان یہاں پیش کروں یہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہمارے لیے نہ تو کسی طرح کی امید ہے، نہ طلب ہے نہ شکایت، ہے یہ ایک موڑ ہے جس سے گزرے بغیر ہم منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتے اس لیے تھوڑی دیر کے لیے اپنی مرضی کے خلاف یہاں دم لینا پڑتا ہے۔ یہ نہ ہوتی تو ہم سیدھے جیل چلے جاتے، یہی وجہ ہے کہ گذشتہ دو سال کے اندر میں نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی کہ کوئی نان کوآپریٹر کسی طرح کا بھی حصہ عدالت کی کاروائی میں لے، آل انڈیا کانگریس کمیٹی، سنٹرل خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماء ہند نے اگرچہ اس کی اجازت دے دی ہے کہ پبلک کی واقفیت کے لیے تحریری بیان دیا جاسکتا ہے لیکن ذاتی طور پر میں لوگوں کو یہی مشورہ دیتا رہا کہ خاموشی کو ترجیح ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص اس لیے بیان دیتا کہ مجرم نہیں، اگرچہ اس کا مقصد پبلک کی واقفیت ہو، تاہم وہ اشتباہ سے محفوظ نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ اپنے بچاؤ کی ایک ہلکی سی خواہش اور سماعت حق کی ایک کمزور سی توقع اس کے اندر کام کر رہی ہو حالانکہ نان کوآپریشن کی راہ بالکل قطعی اور یکسر ہے، وہ اس بارے میں اشتباہ بھی گوارا نہیں کرسکتی۔

کامل مایوسی، اس لیے کامل تبدیلی کا عزم "نان کوآپریشن" موجودہ حالت سے کامل مایوسی کا نتیجہ ہے۔ اور اسی مایوسی سے کامل تبدیلی کا عزم پیدا ہوا ہے۔ ایک شخص جب گورنمنٹ سے نان کوآپریشن کرتا ہے تو گویا اعلان کرتا ہے کہ وہ گورنمنٹ کے انصاف اور حق پسندی سے مایوس ہوچکا وہ اس کی غیر منصف طاقت کے جواز سے منکر ہے اور

اس لیے تبدیلی کا خواہش مند ہے۔ پس جس چیز سے وہ اس درجہ مایوس ہو چکا کہ تبدیلی کے سوا کوئی چارہ نہیں دیکھتا، اس سے کیونکر امید کر سکتا ہے کہ ایک منصفت اور قابل بقا طاقت کی طرح اس کے ساتھ انصاف کرے گی؟ اس اصولی حقیقت سے اگر قطع نظر کر لیا جائے۔ جب موجودہ حالت میں برات کی امید رکھنا ایک بے سود حجت سے زیادہ نہیں ہے، یہ گویا اپنی معلومات سے انکار ہو گا، گورنمنٹ کے سوا کوئی ذی حواس اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ بحالت موجودہ سرکاری عدالتوں سے انصاف کی کوئی امید نہیں ہے، اس لیے نہیں کہ وہ ایسے اشخاص سے مرکب ہیں جو انصاف کرنا پسند نہیں کرتے بلکہ اس لیے کہ ایسے نظام پر مبنی ہیں جن میں رہ کر کوئی مجسٹریٹ ان ملزموں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا، جس کے ساتھ خود گورنمنٹ انصاف کرنا پسند نہ کرتی ہو۔ میں یہاں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ "نان کوآپریشن" کا خطاب صرف گورنمنٹ، گورنمنٹ کے سسٹم اور موجودہ حکومتی اور قومی اصولوں سے ہے، افراد و اشخاص سے نہیں ہے۔

عدالت گاہ، ناانصافی کا قدیم ترین ذریعہ ہے

ہمارے اس دور کے تمام حالات کی طرح یہ حالت بھی نئی نہیں ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی حکمران طاقتوں نے آزادی اور حق کے مقابلے میں ہتھیار اٹھائے ہیں۔ تو عدالت گاہوں نے سب سے زیادہ آسان اور بے خطا ہتھیار کا کام دیا ہے۔ عدالت کا اختیار ایک طاقت ہے اور وہ انصاف اور ناانصافی دونوں کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے۔ منصف گورنمنٹ کے ہاتھ میں وہ عدل وحق کا سب سے بہتر ذریعہ ہے لیکن جابر اور مستبد حکومتوں کے لیے اس سے بڑھ کر انتقام اور ناانصافی کا کوئی آلہ بھی نہیں، تاریخ عالم کی سب سے بڑی ناانصافیاں میدان جنگ کے بعد عدالت کے ایوانوں ہی میں ہوئی ہیں، دنیا کے مقدس بانیان مذہب سے لے کر سائنس کے محققین اور مکتشفین تک کوئی پاک اور حق پسند جماعت نہیں ہے جو مجرموں کی طرح عدالت کے سامنے کھڑی نہ کی گئی ہو۔ بلاشبہ زمانے کے انقلاب سے عہد قدیم کی بہت سی برائیاں مٹ گئیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اب دنیا میں دوسری صدی عیسوی کی خوفناک رومی عدالتیں اور ازمنہ متوسط (مڈل ایجز) کی پراسرار "انکویزیشن" وجود نہیں رکھتی لیکن میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ جو جذبات ان عدالتوں میں کام کرتے تھے۔ ان سے بھی ہمارے زمانے کو نجات مل گئی ہے۔ وہ عمارتیں ضرور گرا دی گئیں۔ جن کے اندر خوفناک اسرار بند تھے۔ لیکن ان دلوں کو کون بدل سکتا ہے جو انسانی خودغرضی اور ناانصافی کے خوفناک رازوں کا دفینہ ہیں؟

ایک عجیب مگر عظیم الشان جگہ

عدالت کی ناانصافیوں کی فہرست بڑی ہی طولانی ہے۔ تاریخ آج تک اس کے ماتم سے فارغ نہ ہو سکی۔ ہم اس میں حضرت مسیح جیسے پاک انسان کو دیکھتے ہیں جو اپنے عہد کی اجنبی عدالت کے سامنے چوروں کے ساتھ کھڑے کیے گئے، ہمیں اس میں سقراط نظر آتا ہے۔ جس کو صرف اس لیے زہر کا پیالہ پینا پڑا کہ وہ اپنے ملک کا سب سے زیادہ سچا انسان تھا۔ ہم کو اس میں فلورنس کے فداکار حقیقت گلیلیو کا نام ملتا ہے، جو اپنی معلومات و مشاہدات کو اس لیے جھٹلا نہ سکا کہ وقت کی عدالت کے نزدیک ان کا اظہار جرم تھا۔ میں نے حضرت مسیح کو انسان کہا کیونکہ میرے اعتقاد میں وہ ایک مقدس انسان تھے۔ جو نیکی اور محبت کا آسمانی پیام لے کر آئے تھے لیکن کروڑوں انسانوں کے اعتقاد میں تو وہ اس سے بھی بڑھ کر ہیں؟ تاہم یہ مجرموں کا کٹہرہ عجیب مگر عظیم الشان جگہ ہے جہاں سب سے اچھے اور سب سے بڑے دونوں طرح کے آدمی کھڑے کیے جاتے ہیں؟ اتنی بڑی ہستی کے لیے بھی یہ ناموزوں جگہ نہیں، اس جگہ کی عظیم الشان اور عمیق تاریخ پر جب میں غور کرتا ہوں کہ اسی جگہ کھڑے ہونے کی عزت آج میرے حصے میں آئی ہے تو بے اختیار میری روح خدا کی حمد و شکر میں ڈوب جاتی ہے اور صرف وہی جان سکتا ہے کہ میرے دل کے سرور و نشاط کا کیا عالم ہوتا ہے؟ میں مجرموں کے کٹہرے میں محسوس کرتا ہوں کہ بادشاہوں کے لیے قابل رشک ہوں ان کو اپنی خوابگاہ میں وہ خوشی اور راحت کہاں نصیب جس سے میرے دل کا ایک ایک ریشہ معمور ہو رہا ہے؟ کاش غافل اور نفس پرست انسان اس کی ایک جھلک ہی دیکھ پائے، اگر ایسا ہوتا تو میں سچ کہتا ہوں کہ لوگ اس جگہ کے لیے دعائیں مانگتے۔

میں بیان کیوں دیتا ہوں؟

بہر حال میرا ارادہ نہ تھا کہ میں بیان دوں۔ لیکن ۹ جنوری کو جب میرا مقدمہ پیش ہوا تو میں نے دیکھا۔ گورنمنٹ مجھے سزا دلانے کے لیے نہایت عاجز اور پریشان ہو رہی ہے، حالانکہ میں ایسا شخص ہوں جس کو اس کی خواہش اور خیال کے مطابق سب سے پہلے اور سب سے زیادہ سزا ملنی چاہیئے۔ پہلے میرے خلاف دفعہ ۱۲۱ الف ضابطہ فوجداری کا دعویٰ کیا گیا تھا۔ لیکن جب اس کا ویسا ثبوت بھی بہم نہ ہو سکا جیسا آج کل اثبات جرم کے لیے کافی تصور کیا جاتا ہے تو مجبوراً وہ دفعہ واپس لے لی گئی۔ اب ۱۲۴ الف کا مقدمہ چلایا گیا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ بھی مقصد براری کے لیے کافی نہیں کیونکہ جو تقریریں ثبوت میں پیش

کی گئی ہیں وہ ان بہت سی باتوں سے بالکل خالی ہیں جو اپنی بے شمار تقریروں اور تحریروں میں ہمیشہ کہتا رہا ہوں اور جو شاید گورنمنٹ کے لیے زیادہ کارآمد ہوتیں۔ یہ دیکھ کر میری رائے بدل گئی، میں نے محسوس کیا کہ جو سبب بیان نہ دینے کا تھا وہی اب متقاضی ہے کہ خاموش نہ رہوں اور جس بات کو گورنمنٹ باوجود جاننے کے دکھلا نہیں سکتی، اسے خود کامل اقرار کے ساتھ اپنے قلم سے لکھ دوں۔ میں جانتا ہوں کہ قانونِ عدالت کی رو سے یہ میرے فرائض میں داخل نہیں ہے۔ میری جانب سے پراسیکیوشن کے لیے یہی بحث بڑی مدد ہے کہ میں نے ڈیفنس نہیں کیا، لیکن حقیقت کا قانون عدالتی قواعد کی حیلہ جوئیوں کا پابند نہیں ہے، یقیناً یہ سچائی کے خلاف ہوگا کہ ایک بات صرف اس لیے پوشیدہ رہنے دی جائے کہ مخالف اپنی عاجزی کی وجہ سے ثابت نہ کر سکا۔

اقرارِ جرم

ہندوستان کی موجودہ بیوروکریسی ایک ویسا ہی حاکمانہ اقتدار ہے جیسا کہ اقتدار ملک و قوم کی کمزوری کی وجہ سے ہمیشہ طاقتور انسان حاصل کرتے رہتے ہیں، قدرتی طور پر یہ اقتدار قومی بیداری کے نشوونما اور آزادی و انصاف کی جدوجہد کو مبغوض رکھتا ہے کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ اس کی غیر منصفانہ طاقت کا زوال ہے، اور کوئی وجود اپنا زوال پسند نہیں کر سکتا۔ اگرچہ از روئے انصاف کتنا ہی ضروری ہو۔ یہ گویا تنازع للبقا کی ایک جنگ ہوتی ہے جس میں دونوں فریق اپنے اپنے فوائد کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ قومی بیداری چاہتی ہے کہ اپنا حق حاصل کرے، قابض طاقت چاہتی ہے کہ اپنی جگہ سے نہ ہٹے، کہا جا سکتا ہے کہ پہلے فریق کی طرح آخر الذکر بھی قابلِ ملامت نہیں کیونکہ وہ بھی اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کا وجود انصاف کے خلاف واقع ہوا ہے، ہم طبیعت کی مقتضیات سے تو انکار نہیں کر سکتے، یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں نیکی کی طرح برائی بھی زندہ رہنا چاہتی ہے۔ وہ خود کتنی ہی قابلِ ملامت ہو لیکن زندگی کی خواہش قابلِ ملامت نہیں ہے، ہندوستان میں بھی یہ مقابلہ شروع ہو گیا ہے۔ اس لیے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے اگر بیوروکریسی کے نزدیک آزادی اور حق طلبی کی جدوجہد جرم ہو اور وہ ان لوگوں کو سخت سزاؤں کا مستحق خیال کرے جو انصاف کے نام سے اس کی غیر منصفانہ ہستی کے خلاف جنگ کر رہے ہیں، میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نہ صرف اس کا مجرم ہوں، بلکہ ان لوگوں میں ہوں جنہوں نے اس جرم کی اپنی قوم کے دلوں میں تخم ریزی کی ہے، اور اس کی آبیاری کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی ہے۔ میں مسلمانانِ ہند

میں پہلا شخص ہوں جس نے ۱۹۱۲ء میں اپنی قوم کو اس جرم کی عام دعوت دی اور تین سال کے اندر اس غلامانہ روش سے ان کا رُخ پھیر دیا جس میں گورنمنٹ کے پُر پیچ فریب نے مبتلا کر رکھا تھا، بس اگر گورنمنٹ مجھے اپنے خیال میں مجرم سمجھتی ہے اور اس لیے سزا دلانا چاہتی ہے تو میں پوری صاف دلی کے ساتھ تسلیم کرتا ہوں کہ یہ کوئی خلافِ توقع بات نہیں ہے جس کے لیے مجھے شکایت ہو، میں جانتا ہوں کہ گورنمنٹ فرشتے کی طرح معصوم ہونے کا دعویٰ رکھتی ہے۔ کیونکہ اس نے خطاؤں کے اقرار سے ہمیشہ انکار کیا، لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس نے مسیح ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا، پھر میں کیوں امید کروں کہ وہ اپنے مخالفوں کو پیار کرے گی وہ تو وہی کرے گی جو کر رہی ہے اور جو ہمیشہ استبداد نے آزادی کے مقابلے میں کیا ہے، پس یہ ایک قدرتی معاملہ ہے جس میں دونو فریق کے لیے شکوہ و شکایت کا کوئی موقع نہیں۔ دونو کو اپنا اپنا کام کیے جانا چاہیے۔

گورنمنٹ بنگال اور میری گرفتاری

میں یہ بھی ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا معاملہ جو کچھ تھا گورنمنٹ آف انڈیا سے تھا۔ وہ کسی خاص معین الزام کی بنا پر نہیں بلکہ موجودہ تحریک کی عام مشغولیت کی وجہ سے مجھے گرفتار کر سکتی تھی اور جیسا کہ قاعدہ ہے گرفتاری کے لیے کوئی حیلہ پیدا کر لیتی۔ چنانچہ ملک میں عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ علی برادرز سے مجھے زیادہ مہلت دی گئی۔ مگر اب زیادہ عرصے تک تغافل نہیں کیا جائے گا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ گورنمنٹ بنگال کے سامنے اس وقت میرا معاملہ نہ تھا، نہ وہ دفعہ ۱۲۴ الف کا مقدمہ چلانا چاہتی تھی۔ اس دفعہ کے ثبوت میں جو تقریریں پیش کی گئی ہیں وہ نصف سال پہلے کلکتے میں کی گئی ہیں اور گورنمنٹ نے مقدمہ کی اجازت ۲۲ دسمبر کو دی ہے، یعنی میری گرفتاری سے بارہ دن بعد اگر فی الواقع ان تقریروں میں سیڈیشن تھا تو کیوں مجھے چھ ماہ تک گرفتار نہیں کیا گیا؟ اور اب گرفتار کیا بھی تو گرفتاری کے بارہ دن بعد؟ ہر شخص ان دو واقعات سے صاف صاف سمجھ سکتا ہے کہ صورت حال کیا ہے۔ خصوصاً جب یہ تیسرا واقعہ بھی بڑھا دیا جائے کہ ابتدا میں جو دفعہ ظاہر کی گئی وہ ۱۲۴ الف نہ تھی ۱۲۱ الف ضابطہ فوجداری تھی، پچیس دن کے بعد مجھ سے کہا جاتا ہے کہ وہ واپس لے لی گئی ہے۔

گرفتاری کا اصلی باعث

حقیقت یہ ہے کہ میری گرفتاری میں اس دفعہ کو کوئی دخل نہیں یہ قطعی ہے کہ مجھے انہی حالات کے سلسلے میں گرفتار کیا گیا جو ۱۲ نومبر کے بعد

رونما ہوئے ہیں۔ اگر میں پہلی دسمبر کو کلکتے نہ آتا یا ۱۰ دسمبر سے پہلے باہر چلا جاتا جس کی جلسہ جمعیۃ العلمائے بدایوں کی وجہ سے توقع تھی۔ تو گورنمنٹ بنگال مجھ سے کوئی تعرض نہ کرتی۔ ۱۲ نومبر کے بعد دنیا کی تمام چیزوں میں سے جو چاہی جا سکتی ہیں وہ یہ چاہتی تھی کہ ۲۲ نومبر کو جب پرنس کلکتہ پہنچیں تو ہڑتال نہ ہو اور جو جابرانہ بے دقوفی ترمیم ضابطہ فوجداری ۱۹۰۸ء کے نفاذ میں ہو گئی ہے۔ وہ ایک دن کے لیے ہی قبول کر لی جائے وہ خیال کرتی تھی کہ میری اور مسٹر سی۔ آر۔ داس کی موجودگی اس میں حارج ہے۔ اس لیے کچھ عرصے کے تذبذب اور غور و فکر کے بعد ہم دونو گرفتار کر لیے گئے۔ گرفتاری بلا وارنٹ کے ہوئی تھی لیکن جب دوسرے دن ضابطہ کی نمائش پوری کرنے کے لیے مجسٹریٹ جیل میں بھیجا گیا تو مسٹر داس کی طرح میری گرفتاری کے لیے بھی زیر دفعہ ۱۰۱ الف کا عذر پیش کیا گیا۔ میں گزشتہ دو سال کے اندر بہت کم کلکتے میں رہ سکا ہوں۔ میرا تمام وقت زیادہ تر تحریک خلافت کی مرکزی مشغولیت میں صرف ہوا۔ یا ملک کے پیہم دوروں میں۔ اکثر ایسا ہوا کہ مہینے دو مہینے کے بعد چند دنوں کے لیے کلکتے آیا اور بنگال پراونشیل خلافت کمیٹی کے کاموں کی دیکھ بھال کر کے پھر باہر چلا گیا۔ وسط نومبر سے بمبئی میں سفر میں تھا۔ ۱۶ کو کلکتے سے روانہ ہوا تاکہ جمعیۃ العلمائے ہند کے سالانہ اجلاس لاہور میں شریک ہوں۔ وہاں مہاتما گاندھی کے تار سے بمبئی کی شورش کا حال معلوم ہوا اور میں بمبئی چلا گیا۔ جنوری تک میرا ارادہ واپسی کا نہ تھا۔ کیونکہ ۱۰ دسمبر کو جمعیۃ العلماء ہند کا اسپیشل اجلاس بدایوں میں تھا اس میں شرکت ضروری تھی۔ اس کے علاوہ مجھے تمام وقت انگورہ فنڈ کی فراہمی میں صرف کرنا تھا۔ لیکن یکایک گورنمنٹ بنگال کے تازہ جبر و تشدد اور ۱۸ ر کے کیونکہ کی اطلاع بمبئی میں ملی اور میرے لیے ناممکن ہو گیا کہ اس حالت میں کلکتے سے باہر رہوں، میں نے مہاتما گاندھی سے مشورہ کیا ان کی بھی یہی رائے ہوئی کہ مجھے تمام پروگرام ملتوی کر کے کلکتے چلا جانا چاہیے۔ زیادہ خیال ہمیں اس بات کا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو گورنمنٹ کا جبر و تشدد لوگوں کو بے قابو کر دے اور کوئی بات صبر و ضبط کے خلاف کر بیٹھیں علی الخصوص جب کہ سول گارڈ کے قیام کی خبریں بھی آ چکی تھیں اور اس بارے میں ہمیں کوئی غلطی نہیں ہو سکتی تھی کہ یہ نئی اسلحہ بندی کن شریفانہ اور پُرامن اغراض کے لیے وجود میں آئی ہے؟ میں پہلی دسمبر کو کلکتے پہنچا میں نے ظلم اور برداشت دونو کے انتہائی مناظر اپنے سامنے پائے، میں نے دیکھا کہ ۱۷ نومبر کی یادگار ہڑتال سے بے بس ہو کر گورنمنٹ اس آدمی کی طرح ہو گئی ہے جو جوش اور غصے میں آپے سے باہر ہو جاتے اور غیظ و غضب کی کوئی حرکت بھی اس سے بعید نہ ہو۔ ۱۹۰۸ء کے کریمنل لا امینڈمنٹ ایکٹ کے ماتحت قومی

رضاکاروں کی تمام جماعتیں مجمع خلافِ قانون (ان لافل) قرار دے دی گئی ہیں۔ پبلک اجتماعات یک قلم روک دیئے ہیں۔ قانون صرف پولیس کی مرضی کا نام ہے وہ "ان لافل" جماعت کی تفتیش اور شبہ میں جو چاہے کر سکتی ہے حتیٰ کہ راہ چلتوں کی جان و آبرو بھی محفوظ نہیں۔ گورنمنٹ نے پہلے ۱۸ نومبر کے کمیونک میں صرف سابق و موجودہ رضاکار جماعتوں کا ذکر کیا تھا۔ لیکن ۲۲ کو دوسرا کمیونک جاری کر کے تمام آئندہ جماعتیں بھی خلافِ قانون قرار دے دیں۔ اور پولیس نے بلا امتیاز ہر شخص کو جو اس کے سامنے آ گیا گرفتار کرنا شروع کر دیا، کوئی بات بھی جس سے ۲۴ کی ہڑتال رکنے کا امکان ہو، پولیس اور پولیس سے بھی زیادہ "شریف قوم" سول گارڈ کے لیے ناجائز نہیں، سول گارڈ گویا قومی رضاکاروں کا جواب ہے۔ وہ بالکل نہتے ہونے پر بھی جبر و تشدد سے ہڑتال کرا دیتے تھے یہ ریوالور سے مسلح ہونے پر بھی امن و صلح کے ذریعے ہڑتال روک دیں گے۔ اس کے مقابلے میں لوگوں نے جتنی برداشت اور استطاعت دونوں کا گویا آخری عہد کر لیا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ نا تو وہ اپنی راہ سے ہٹیں گے، نہ تشدد کا مقابلہ کریں گے، ان حالات میں میرے لیے فرض کی راہ بالکل صاف اور یکسو تھی میں نے اپنے سامنے دو حقیقتیں بے نقاب دیکھیں۔ ایک یہ کہ حکومت کی تمام طاقت کلکتے میں سمٹ آئی ہے اس لیے فتح و شکست کا پہلا فیصلہ یہیں ہو گا، دوسری یہ کہ ہم کل تک پوری آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے تھے لیکن موجودہ حالت نے بتلا دیا کہ ہماری آزادی کی مبادیات تک محفوظ نہیں ہیں۔ آزادیٔ تقریر اور آزادیٔ اجتماع انسان کے پیدائشی حقوق ہیں۔ ان کی پامالی مشہور فلاسفر ملؔ کی زبان میں انسانیت کے قتلِ عام سے کچھ ہی کم کہی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ پامالی بلا کسی جنگ کے اعلانیہ ہو رہی ہے۔ میں نے باہر کا تمام پروگرام منسوخ کر دیا اور فیصلہ کر لیا کہ اس وقت تک کلکتے ہی میں رہوں گا جب تک دو باتوں میں سے کوئی ایک بات ظہور میں نہ آ جائے یا گورنمنٹ اپنا کمیونک واپس لے لے یا مجھے گرفتار کر لے۔ گورنمنٹ نے ۱۰ دسمبر کو مجھے گرفتار کر لیا میں پورے اطمینان اور مسرت کے ساتھ جیل کی طرف روانہ ہو گیا کیونکہ میں اپنے پیچھے ایک فتح مند میدان چھوڑ رہا تھا، میرا دل خوشی سے معمور ہے کہ کلکتہ اور بنگال نے میری توقعات پوری کر دیں۔ وہ پہلے جس قدر پیچھے تھا اتنا ہی آج سب سے آگے ہے میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کامیابی کے لیے گورنمنٹ کی امداد کا ہمیں پوری طرح اعتراف کرنا چاہیئے۔ اگر وہ ۱۸ نومبر کے بعد یہ طرزِ عمل اختیار نہ کرتی تو فی الواقع ہمارے لیے آئندہ کاموں کے انتخاب میں چند در چند مشکلات تھیں۔ ہم ۲۲ کو بمبئی میں انہی مشکلات پر غور کر رہے تھے۔

دو حقیقتیں

حقیقت یہ ہے کہ ان گذشتہ ایام نے بیک وقت دو نو حقیقتیں صفحات تاریخ کے لیے مہیا کر دیں، اگر ایک طرف گورنمنٹ کے چہرے سے ادعا و نمائش کے تمام نقاب دُور ہو گئے تو دوسری طرف ملکی طاقت بھی ایک سخت آزمائش میں پڑ کر پوری طرح نمایاں ہو گئی، دنیا نے دیکھ لیا کہ اگر گورنمنٹ ہر طرح کے جبر و تشدّد میں بالکل بے حجاب اور بے لگام ہے تو ملک میں بھی صبر و برداشت کی طاقت روز افزوں نشوونما پا رہی ہے۔ جیسا کہ ہمیشہ انکار کیا گیا ہے آج بھی اس کا موقع حاصل ہے کہ انکار کر دیا جائے۔ لیکن کل تاریخ کے لیے یہ ایک نہایت ہی عبرت انگیز داستان ہو گی۔ یہ مستقبل کی راہنمائی کرے گی کہ کیونکر اخلاقی مدافعت، مادی طاقت کے جارحانہ گھمنڈ کو شکست دے سکتی ہے اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ صرف برداشت اور قربانی کے ذریعہ خونریز اسلحہ کا مقابلہ کیا جائے۔ البتہ میں نہیں جانتا کہ ان دونو فریقوں میں سے کس فریق کے اندر اس بڑے انسان کی تعلیم تلاش کی جائے جو برائی کے مقابلے میں صبر و عفو کی تعلیم لے کر آیا تھا، گورنمنٹ میں یا ملک میں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ بیوروکریسی کے حکام اس کے نام سے ناواقف نہ ہوں گے۔ اس کا نام "مسیح" تھا۔

گورنمنٹ کا فیصلہ اور شکست

فلسفہ تاریخ ہمیں بتلاتا ہے کہ نادانی اور عاقبت نااندیشی ہمیشہ زوال پذیر طاقتوں کی رفیق ہوتی ہیں۔ گورنمنٹ نے خیال کیا کہ وہ جبر و تشدد سے تحریک خلافت و سوراج کو پامال کر سکے گی اور ۲۴ کی ہڑتال رک جائے گی۔ اس نے والنٹیر کور کو خلاف قانون قرار دیا۔ اور بلا امتیاز تمام کارکن گرفتار کر لیے۔ وہ سمجھی تھی کہ والنٹیرز کی ممانعت اور کارکنوں کی گرفتاری کے بعد خلافت اور کانگرس کا نظام معطل ہو جائے گا اور اس طرح خود بخود ہڑتال رُک جائے گی لیکن بہت جلد گورنمنٹ کو معلوم ہو گیا کہ جبر و تشدد جب قومی بیداری کے مقابلے میں نمایاں ہو تو وہ کوئی مہلک چیز نہیں ہوتی، نہ تو ہڑتال رُک سکی نہ خلافت اور کانگرس کمیٹیاں معطل ہوئیں اور نہ والنٹیرز کا کام ایک دن کے لیے بھی بند ہوا، بلکہ ہماری غیر موجودگی میں یہ ساری چیزیں نہ زیادہ طاقتور اور غیر مسخر ہو گئیں۔ میں نے ۷ دسمبر کو جو پیغام ملک کے نام لکھا تھا اس میں گورنمنٹ بنگال کے لیے بھی یہ پیغام تھا کہ میری اور مسٹر سی۔ آر۔ داس کی گرفتاری کے بعد کام زیادہ طاقت اور مستعدی کے ساتھ جاری رہے گا۔ اور ۲۴ کو ہڑتال اس سے زیادہ مکمل ہو گی جس قدر ہماری موجودگی میں ہو سکتی تھی، چنانچہ ایسا ہی ہوا، گورنمنٹ خود اپنے پسند کئے ہوئے میدان میں ہار گئی۔ اب وہ اپنی شرمندگی چھپانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے اور جن لوگوں کو گرفتار کر چکی ہے انہیں کسی نہ

کسی طرح سزا دلانا چاہتی ہے۔ لیکن کوئی شکست اس لیے فتح نہیں بن سکتی کہ ہم بہت زیادہ جھنجھلا سکتے ہیں۔

دفعہ ۱۲۴ الف

غرضیکہ میری گرفتاری صریح طور پر انہی واقعات کا نتیجہ ہے اور اسی لیے دو ہفتے تک میرے خلاف دفعہ ۱۲۱-الف ضابطہ فوجداری ہی کا دعویٰ قائم رہا لیکن جب اس بارے میں کوئی سہارا نہ ملا تو میرے پریس اور مکان کی تلاشی لی گئی، تاکہ میری کوئی تحریر حاصل کرکے بنائے مقدمہ قرار دی جائے۔ جب وہاں سے بھی کوئی مواد ہاتھ نہ آیا تو مجبوراً سی۔ آئی۔ ڈی کے محفوظ ذخیرے کی طرف توجہ کی گئی۔ یہ ذخیرہ ہمیشہ اس شریفانہ کام کے لیے مستعد رہتا ہے۔ اور ضرورت کو کبھی مایوس نہیں کرتا۔ پس اس طرح بہزار زحمت دفعہ ۱۲۴-الف کا دعویٰ تیار ہو گیا۔

اجتماع ضدین

پریشانی گورنمنٹ کو خود اسی کی منافقانہ روش کی وجہ سے پیش آ رہی ہے۔ ایک طرف تو وہ چاہتی ہے کہ شخصی حکمرانوں کی طرح بے دریغ جبر و تشدد کرے، دوسری طرف چاہتی ہے کہ نمائشی قانون و عدالت کی آڑ بھی قائم رہے۔ یہ دونوں باتیں متضاد ہیں صحیح نہیں ہو سکتیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کی پریشانی و درماندگی روز بروز بڑھتی جاتی ہے، جو لوگ اس کے خیال میں سب سے زیادہ مستوجب تعزیر ہیں انہی کو سزا دلانا اس کے لیے مشکل ہو گیا ہے۔ ابھی چند مہینے گزرے ہیں کہ ہم کراچی میں گورنمنٹ کی سراسیمگی و درماندگی کا مضحکہ انگیز تماشا دیکھ رہے تھے۔ جو سرکاری استغاثہ اس دعویٰ اور اہتمام کے ساتھ شروع کیا گیا تھا۔ اس سے خود گورنمنٹ کی پسندیدہ اور انتخاب کردہ جیوری بھی اتفاق نہ کر سکی۔ لطف یہ ہے کہ یہ مشکلات گورنمنٹ کو ایسی حالت میں پیش آ رہی ہیں جب کہ وہ جانتی ہے کہ نان کو اپریشن کی جانب سے ڈیفنس نہیں کیا جائے گا اور سخت سے سخت غلط بیانی اور قانون شکنی کی عدالت میں بھی پردہ دری اور شکست کا کوئی کھٹکا نہیں ہے۔

نئی قانونی تشریحات

گورنمنٹ نے اس اطمینان سے پوری طرح کام لینے میں کوئی کوتاہی بھی نہیں کی ہے۔ نان کو اپریٹرز کے مقدمات آجکل جس طرح چکائے جا رہے ہیں۔ اس سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ "لا" اور "آرڈر" کے معنی بیوروکریٹک اصطلاح میں کیا ہیں۔ "لا" اور "آرڈر" کی طرح اب دعویٰ، ثبوت، شہادت، تشخیص، "ڈائی ڈیفی نائی" وغیرہ تمام عدالتی مصطلحات کے معانی میں بھی انقلاب لکھا گیا ہے۔ گویا نان کو اپریٹرز کو جلد سزا دے دینے کے لیے ہر طرح کی

بے قاعدگی اور قانون شکنی جائز ہے۔ حتیٰ کہ اس بات کی بھی تحقیق ضروری نہیں کہ جس انسان کے ملزم ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے، کٹہرے کا ملزم وہی آدمی ہے بھی یا نہیں؟ ابھی اسی ہفتے جو راجگان کی عدالت سے ایک شخص "عبدالرحمٰن ہاشم" کو اس پُرزور قانون اور منطقی ثبوت پر چھ ماہ کی سزا دے دی گئی ہے۔ کہ "اعظم ہاشم" نامی ایک خلافت والنٹیر دنیا میں وجود رکھتا ہے اور دونو کے نام میں لفظ "ہاشم" مشترک ہے۔ خود میرے مقدمے میں جو صریح بے ضابطگیاں کی گئی ہیں ان کا ذکر لاحاصل سمجھ کر نہیں کرنا چاہتا۔ ورنہ وہی اس حقیقت کے انکشاف کے لیے کافی تھیں۔ مثال کے طور پر صرف ایک واقعہ کا ذکر کروں گا جو بے قاعدگی اور غلط بیانی دونو کا مجموعہ ہے۔ مجھے ۱۲۱ الف ضابطہ فوجداری سے بری کر دیا گیا اور ۱۲۴ الف کے ماتحت وارنٹ حاصل کیا گیا، قاعدے کی رُو سے رہائی اور ازسرِنو گرفتاری دو نو باتیں وقوع میں آنی چاہیے تھیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ۱۲۴ الف کا کوئی وارنٹ مجھ پر تعمیل نہیں کرایا گیا، حتیٰ کہ ۲ جنوری تک مجھے اس کا علم بھی نہیں ہوا۔ لیکن میرے سامنے مسٹر گوری ڈپٹی کمشنر پولیس نے یہ حلفیہ شہادت دی ہے کہ اس نے پریسیڈنسی جیل میں مجھ پر وارنٹ سرو کیا ہے یہ سچ ہے کہ نان کوآپریٹرز کسی طرح کا ڈیفنس نہیں کرتے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ آدمی اپنے عام کپڑے اُتار ڈالے۔ اس لیے کہ شریف آدمی آنکھیں بند کر لیں گے، شریف آدمیوں نے تو سچ مچ آنکھیں بند کر لی ہیں لیکن دنیا کی آنکھیں بند نہیں ہیں۔

قانون کا ڈرامہ

فی الحقیقت "لا" اور "آرڈر" کا ایک ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے۔ جسے ہم کامیڈی اور ٹریجڈی دونو کہہ سکتے ہیں۔ وہ تماشا کی طرح مضحک بھی ہے اور مقتل کی طرح دردانگیز بھی، لیکن میں ٹریجڈی کہنا زیادہ پسند کروں گا۔ حُسنِ اتفاق سے اس کا چیف ایکٹر انگلستان کا سابق چیف جسٹس ہے۔

میری تقریریں

پراسیکوشن کی جانب سے میری دو تقریریں ثبوت میں پیش کی گئی ہیں جو میں نے پہلی اور پندرھویں جولائی کو مرزا پور پارک کے جلسے میں کی تھیں۔ اس زمانے میں گورنمنٹ بنگال نے گرفتاریوں کی طرف پہلا قدم اٹھایا تھا۔ دو چار مبلغین خلافت پر مقدمہ چلا کر سزائیں دلائی تھیں، میں اس وقت سفر سے بیمار واپس آیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ لوگوں میں بے حد جوش پھیلا ہوا ہے اور ہر طرح کے مظاہرے کے لیے لوگ بے قرار ہیں، چونکہ میرے خیال میں گرفتاریوں پر

مظاہرہ کرنا نان کوآپریشن کے اصول کے خلاف تھا۔ اس لیے میں نے ہڑتال اور جلوس یک قلم روک دیئے۔ اس پر عوام کو تکلیف ہوئی تو میں نے یہ جلسے منعقد کیے، اور لوگوں کو صبر و تحمل کی نصیحت کرتے ہوئے سمجھایا کہ نان وائیلنس اور نان کوآپریشن کے اصول میں یہ بات داخل ہے کہ گرفتاریوں پر صبر و سکون کے خلاف کوئی بات نہ کی جائے اگر فی الواقع ان گرفتاریوں کا تمہارے دل میں درد ہے تو چاہیئے کہ اصلی کام کرو، اور بیرونی کپڑا ترک کر کے دیسی گاڑھا پہن لو، استغاثہ نے جو نقل پیش کی ہے وہ نہایت ناقص، غلط اور مسخ شدہ صورت ہے، اور محض بے جوڑ بعض بعض مقامات پر بے معنی جملوں کا مجموعہ ہے۔ جیسا کہ اس کے پڑھنے سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ تاہم میں اس کے غلط اور بے ربط جملوں کو چھوڑ کر (کیونکہ اس کے اعتراف سے میرا ادبی ذوق ابا کرتا ہے) باقی وہ تمام حصہ تسلیم کر لیتا ہوں جس میں گورنمنٹ کی نسبت خیالات کا اظہار ہے یا پبلک سے گورنمنٹ کے خلاف جد و جہد کی اپیل کی گئی ہے۔ استغاثہ کی طرف سے صرف تقریریں پیش کر دی گئی ہیں۔ یہ نہیں بتایا ہے کہ ان کے کن جملوں کو وہ ثبوت میں پیش کرنا چاہتا ہے؟ یا اس کے خیال میں مائی ڈیئر برادران سے لے کر آخر تک سب ۱۲۴ الف ہے؟ میں نے بھی دریافت نہیں کیا۔ کیونکہ دونوں صورتیں میرے لیے یکساں ہیں۔ تاہم ان نقول کو دیکھتا ہوں تو استغاثہ کے خیال کے مطابق زیادہ سے زیادہ قابلِ ذکر جملے حسب ذیل ہیں۔

"ایسی گورنمنٹ ظالم ہے جو گورنمنٹ ناانصافی کے ساتھ قائم ہو۔ ایسی گورنمنٹ کو یا تو انصاف کے آگے جھکنا چاہیئے یا دنیا سے مٹا دینا چاہیئے۔"

"اگر فی الحقیقت تمہارے دلوں میں اپنے گرفتار بھائیوں کا درد ہے تو تم میں سے ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ آج سوچ لے کیا وہ اس بات کے لیے راضی ہے کہ جس جابرانہ قوت نے انہیں گرفتار کیا ہے وہ اس برِاعظم میں اسی طرح قائم رہے جس طرح ان کی گرفتاری کے وقت قائم تھی۔"

"اگر تم ملک کو آزاد کرانا چاہتے ہو تو اس کا راستہ یہ ہے کہ جن چالاک دشمنوں کے پاس خونریزی کا بے شمار سامان موجود ہے انہیں رائی برابر بھی اس کے استعمال کا موقع نہ دو۔ اور کامل امن و برداشت کے ساتھ کام کرو۔" بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جب تقریروں میں کوئی ایسی بات کہی جاتی ہے تو اس سے مقرر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اپنے بچاؤ کا سامان کرے ورنہ اس کی دلی خواہش یہ نہیں ہوتی۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو لوگ آج تمہارے لیے کام کر رہے ہیں، تم میں سے کوئی آدمی بھی یہ جاننے کے لیے تیار نہ ہوگا کہ

وہ جیل جانے سے یا نظر بند ہونے سے ڈرتے ہیں دلیں، اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ امن و سکون کے ساتھ کام کرنا چاہیے تو ان کا مطلب یہ نہیں (ہو سکتا) کہ اس ظالمانہ گورنمنٹ (کے ساتھ) وفاداری کرنی چاہتے ہیں۔ جو گورنمنٹ اور اس کی طاقت کے وفادار نہیں ہو سکے۔ اور (اس کا) تخت آج دنیا میں سب سے بڑا گناہ ہے۔ یقیناً وہ اس گورنمنٹ کے وفادار نہیں ہو سکتے۔ اس کے بعد میں نے کہا ہوگا" مگر کاپی میں نہیں ہے" وہ تو صرف اس لیے یہ کہتے ہیں کہ خود تمہاری کامیابی با امن رہنے پر موقوف ہے۔ تمہارے پاس وہ شیطانی ہتھیار نہیں ہیں جن سے یہ گورنمنٹ مسلح ہے، تمہارے پاس صرف ایمان ہے، دل ہے، قربانی کی طاقت ہے، تم انہی طاقتوں سے دراصل میں "ہتھیاروں سے" ہو گا، کام لو، اگر تم چاہو کہ اسلحہ کے ذریعے فتح کرو، تو تم نہیں کر سکتے۔ آج امن و سکون سے بڑھ کر (تمہارے لیے) کوئی چیز نہیں"

"اگر تم صرف چند گھڑیوں کے لیے گورنمنٹ کو حیران کرنا چاہتے ہو تو اس کے لیے میرے پاس بہت سے نسخے ہیں۔ اگر خدا نخواستہ میں اس گورنمنٹ کا استحکام چاہتا تو وہ نسخے بتلا دیتا لیکن میں تو ایسی جنگ چاہتا ہوں (جو) ایک ہی دن میں ختم نہ ہو جائے بلکہ فیصلے کے آخری دن تک (جاری رہے) اور جب فیصلے کی گھڑی آجائے تو پھر یا تو یہ گورنمنٹ باقی نہ رہے یا تیس کروڑ انسان، باقی نہ رہیں"

جو الفاظ بریکٹ کے اندر ہیں۔ وہ تقریر کی پیش کردہ کاپیوں میں نہیں ہیں لیکن عبارت کے بامعنی ہونے کے لیے ضروری ہیں۔ میں نے اس لیے تصحیح کر دی کہ پراسیکیوشن کو استدلال میں مدد نہ ملے، اگر اس کے مقصد کے لیے پوری تقریر کی تصحیح و تکمیل ضروری ہو تو میں اسی طرح کر دینے کے لیے تیار ہوں۔ ان کے علاوہ دو تقریروں میں لوگوں کو نان کو اپریشن کی دعوت دی ہے۔ مطالبات خلافت اور سوراج کو دہرایا ہے۔ پنجاب کے مظالم کو وحشیانہ کہا ہے، لوگوں کو بتلایا ہے کہ جو گورنمنٹ جلیانوالہ باغ امرتسر میں چند منٹوں کے اندر سینکڑوں انسانوں کو قتل کرا ڈالے اور اس کو جائز فعل بتلائے اس سے ناانصافی کی کوئی بات بھی بعید نہیں۔

اقرار

میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے نہ صرف انہیں دو موقعوں پر بلکہ گزشتہ دو سال کے اندر اپنی بے شمار تقریروں میں یہ اور اسی مطلب کے لیے اس سے زیادہ واضح اور قطعی جملے کہے ہیں ایسا کہنا میرے اعتقاد میں میرا فرض ہے۔ میں فرض کی تعمیل سے اس لیے باز نہیں رہ سکتا کہ دفعہ ۱۲۴۔ الف کا جرم قرار دیا جائے گا میں اب بھی ایسا ہی کہنا چاہتا ہوں اور جب تک بول سکتا

ہوں ایسا ہی کہتا رہوں گا۔ اگر میں ایسا نہ کہوں تو اپنے آپ کو خدا اور اس کے بندوں سے آگے بدترین گناہ کا مرتکب سمجھوں۔

موجودہ گورنمنٹ ظالم ہے

یقیناً میں نے کہا ہے "موجودہ گورنمنٹ ظالم ہے" لیکن اگر میں یہ نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟ میں نہیں جانتا کہ کیوں مجھ سے یہ توقع کی جائے کہ ایک چیز کو اس کے اصلی نام سے نہ پکاروں؟ میں سیاہ کو سفید کہنے سے انکار کرتا ہوں۔ میں کم سے کم اور نرم سے نرم لفظ جو اس بارے میں بول سکتا ہوں یہی ہے ایسی ملفوظ صداقت جو اس سے کم ہو میرے علم میں کوئی نہیں۔ میں یقیناً یہ کہتا ہوں کہ ہمارے فرض کے سامنے دو ہی راہیں ہیں کہ گورنمنٹ حق تلفی اور ناانصافی سے باز آجائے اگر باز نہیں آسکتی تو مٹادی جائے میں نہیں جانتا کہ اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ یہ تو انسانی عقائد کی اتنی پرانی سچائی ہے کہ صرف پہاڑ اور سمندر ہی اس کے ہم عصر کہے جا سکتے ہیں جو چیز بری ہے اسے یا تو درست ہونا چاہیے یا مٹ جانا چاہیئے۔ تیسری بات کیا ہو سکتی ہے عجیب کہ میں اس گورنمنٹ کی برائیوں پر یقین رکھتا ہوں تو یقیناً یہ دعا نہیں مانگ سکتا کہ درست بھی نہ ہو اور اس کی عمر بھی دراز ہو۔

میرا یہ اعتقاد کیوں ہے

میرا اور میرے کروڑوں ہم وطنوں کا ایسا اعتقاد کیوں ہے؟ اس کے وجوہ و دلائل اب اس قدر آشکارا ہو چکے ہیں کہ ہلٹن کے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے "سورج کے بعد دنیا کی ہر چیز سے زیادہ واضح اور محسوس" محسوسات کے لیے ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ انکار نہ کرو۔ تاہم میں کہنا چاہتا ہوں کہ میرا یہ اعتقاد اس کے لیے ہے کہ میں ہندوستانی ہوں۔ اس لیے ہے کہ میں مسلمان ہوں اس لیے ہے کہ میں انسان ہوں۔

شخصی اقتدار بالذات ظلم ہے

میرا اعتقاد ہے کہ آزاد رہنا ہر فرد اور قوم کا پیدائشی حق ہے۔ کوئی انسان یا انسانوں کی گھڑی ہوئی بیوروکریسی یہ حق نہیں رکھتی کہ خدا کے بندوں کو اپنا محکوم بنائے۔ محکومی اور غلامی کے لیے کیسے ہی خوشنما نام کیوں نہ رکھ لیے جائیں لیکن وہ غلامی ہی ہے اور خدا کی مرضی اور اس کے قانون کے خلاف ہے۔ پس میں موجودہ حکومت کو جائز حکومت تسلیم نہیں کرتا اور اپنا ملکی، مذہبی اور انسانی فرض سمجھتا ہوں کہ اس کی محکومی سے ملک و قوم کو نجات دلاؤں۔ "اصلاحات" اور "بتدریج توسیع اختیارات" کا مشہور مغالطہ میرے اس صاف اور قطعی اعتقاد

میں کوئی غلط فہمی پیدا نہیں کر سکتا۔ آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے اور کسی انسان کو اختیار نہیں کہ حقوق کی ادائیگی میں حد بندی اور تقسیم کرے۔ یہ کہنا کہ کسی قوم کو اس کی آزادی بتدریج ملنی چاہیے، بعینہٖ ایسی ہی ہے جیسے کہا جائے کہ مالک کو اس کی جائیداد اور قرضدار کو اس کا قرضہ ٹکڑے ٹکڑے کر کے دینا چاہیے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اگر مقروض سے ایک ہی دفعہ قرض واپس نہ مل سکے تو قرض دار کو یہی کرنا پڑے گا کہ قسط کی صورت میں وصول کرے۔ لیکن یہ ایک مجبوری کا سمجھوتہ ہوگا، اس سے یک دفعہ وصولی کا حق زائل نہیں ہو سکتا۔

"رفارم" کی نسبت میں روس کے عظیم الشان فیوتا السٹائی کے لفظوں میں کہوں گا

"اگر قیدیوں کو اپنے وارث سے اپنا جیلر منتخب کر لینے کا اختیار مل جائے تو اس سے وہ آزاد نہیں ہو جائیں گے۔ میرے لیے اس کے اچھے برے کاموں کا سوال ایک ثانوی سوال ہے۔ پہلا سوال خود اس کے وجود کا ہے۔ میں ایسے حاکمانہ اقتدار کو بہ اعتبار اس کی خلقت ہی کے ناجائز یقین کرتا ہوں۔ اگر وہ تمام ناانصافیاں ظہور میں نہ آئیں جو اس کثرت سے واقع ہو چکی ہیں۔ جب بھی میرے اعتقاد میں وہ ظلم تھا کیوں کہ اس کی ہستی ہی بجائے خود بڑی ناانصافی ہے اور اس کی برائی کے لیے اس قدر کافی ہے کہ وہ موجود ہو۔ اگر وہ اچھے کام کرے تو اس کی اچھائی تسلیم کر لی جائے گی۔ لیکن اس کا وجود ناجائز اور ناانصافی ہی رہے گا۔ اگر ایک شخص ہمارے گھر کا مالک بن کر بہت اچھے اور نیک کام انجام دے تو اس کے کاموں کی خوبی کی وجہ سے اس کا قبضہ جائز نہیں ہو سکتا۔ برائی میں کمی و لطافت کے اعتبار سے تفریق کی جا سکتی ہے لیکن نوع و قسم کے اعتبار سے اس کی ایک ہی قسم ہے یعنی اس اعتبار سے تقسیم ہو سکتی ہے کہ وہ کتنی ہے اور کیسی ہے؟ اس اعتبار سے نہیں ہو سکتی کہ وہ اچھی ہے یا بری ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زیادہ بڑی چوری اور کم بڑی چوری لیکن یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ "اچھی چوری" اور "بری چوری" پس میں بیوروکریسی کی اچھائی اور جائز ہونے کا کسی حال میں بھی تصور نہیں کر سکتا کیونکہ وہ فی نفسہ ایک ناجائز عمل ہے۔ البتہ اس کی برائی کم اور زیادہ ہو سکتی ہے۔ لیکن ہندوستان کی بیوروکریسی تو اتنا بھی نہ کر سکی کہ اپنی خلقی برائیوں ہی پر قانع رہتی جب اس کی خلقی برائی پر اس کی بے شمار عملی برائیوں کا بھی برابر اضافہ ہو رہا ہے تو پھر کیونکر اس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس کے ظلم کا اعلان نہ کیا جائے؟

اسلام اور بیوروکریسی

میں مسلمان ہوں اور بحیثیت مسلمان ہونے کے بھی میرا مذہبی فرض یہی ہے۔ اسلام کسی ایسے اقتدار کو جائز تسلیم نہیں کرتا جو شخصی ہو یا چند تنخواہ دار حاکموں کی

بیوروکریسی ہو، وہ آزادی اور جمہوریت کا ایک مکمل نظام ہے جو بنی نوع انسانی کو اس کی چھینی ہوئی آزادی واپس دلانے کے لیے آیا تھا۔ یہ آزادی، بادشاہوں، اجنبی حکومتوں، خود غرض مذہبی پیشواؤں اور سماجی کی طاقتور جماعتوں نے غصب کر رکھی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ حق "طاقت اور قبضہ" ہے لیکن اسلام نے ظاہر ہوتے ہی اعلان کیا کہ حق طاقت نہیں ہے۔ بلکہ خود حق ہے اور خدا کے سوا کسی انسان کو سزاوار نہیں کہ بندگانِ خدا کو اپنا محکوم اور غلام بنائے، اس نے امتیاز اور بالادستی کے تمام قومی اور نسلی مراتب یک قلم مٹا دیئے اور دنیا کو بتلا دیا کہ سب انسان درجے میں برابر ہیں اور سب کے حقوق مساوی ہیں، نسل، قومیت، رنگ معیار، فضیلت نہیں ہے بلکہ صرف عمل ہے اور سب سے بڑا وہی ہے جس کے کام اچھے ہوں۔ یا ایہا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔

اسلام ایک جمہوری نظام ہے

انسانی حقوق کا یہ وہ اعلان ہے جو انقلاب فرانس سے گیارہ سو برس پہلے ہوا۔ یہ صرف اعلان ہی نہ تھا بلکہ ایک عملی نظام تھا، جو مشہور مورخ گبن کے لفظوں میں "اپنی کوئی مثال نہیں رکھتا"۔ پیغمبر اسلام اور ان کے جانشینوں کی حکومت ایک مکمل جمہوریت تھی اور صرف قوم کی رائے "نیابت" اور انتخاب سے اس کی بناوٹ ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی اصطلاح میں جیسے جامع اور عمدہ الفاظ اس مقصد کے لیے موجود ہیں، شاید ہی دنیا کی کسی زبان میں پائے جائیں۔ اسلام نے "بادشاہ" کے اقتدار اور شخصیت سے انکار کیا ہے اور صرف ایک رئیس جمہوریہ (پریسیڈنٹ آف دی پبلک) کا عہدہ قرار دیا ہے لیکن اس کے لیے بھی "خلیفہ" کا لقب تجویز کیا، جس کے لغوی معنی "نیابت" کے ہیں۔ گویا اس کا اقتدار محض نیابت ہے۔ اس سے زیادہ کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ اسی طرح قرآن نے نظام حکومت کے لیے "شوریٰ" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ (وامرھم شوریٰ بینھم) چنانچہ پوری سورت اسی ہم نام سے قرآن میں موجود ہے۔ شوریٰ کے معنی باہم مشورہ کے ہیں۔ یعنی جو کام کیا جائے جماعت کی باہم رائے مشورے سے کیا جائے۔ شخصی رائے اور حکم سے نہ ہو، اس سے زیادہ صحیح نام جمہوری نظام کے لیے کیا ہو سکتا ہے۔

قومی اور مسلم بیوروکریسی بھی ظلم ہے

جب اسلام مسلمانوں کا یہ فرض قرار دیتا ہے کہ وہ ایسی اسلامی حکومت کو بھی منصفانہ تسلیم نہ کریں جو قوم کی رائے اور انتخاب سے نہ ہو، تو پھر ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لیے ایک اجنبی بیوروکریسی کیا حکم رکھتی ہے؟ اگر آج ہندوستان

میں ایک خالص اسلامی حکومت قائم ہوجائے مگر اس کا نظام بھی شخصی ہو، یا چند حاکموں کی بیورو ہو تو بہ حیثیت مسلمان ہونے کے اس وقت بھی میرا فرض یہی ہوگا کہ اس کو ظلم کہوں اور تبدیلی کا مطالبہ کروں۔ اسلام کے علمائے حق نے ہمیشہ جابر بادشاہوں کے خلاف ایسا ہی اعلان و مطالبہ کیا ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ نظام بعد کو قائم نہ رہ سکا۔ مشرقی رومی حکومت اور ایرانی شہنشاہی کے پُرشوکت افسانوں نے مسلمان حکمرانوں کو گمراہ کر دیا۔ اسلامی خلیفہ کی جگہ جو بسا اوقات پھٹے پرانے کپڑوں میں ایک عام فرد کی طرح ملبوس ہوتا تھا، انہوں نے قیصر و کسریٰ بننے کو ترجیح دی۔ تاہم تاریخ اسلام کا کوئی عہد بھی ایسے مسلمانوں سے خالی نہیں رہا ہے۔ جنہوں نے علانیہ حکامِ وقت کے استبداد و شخصیت کے خلاف احتجاج نہ کیا ہو۔ اور ان تمام تکلیفوں کو خوشی خوشی جھیل نہ لیا ہو، جو اس راہ میں پیش آئی ہیں۔

مسلمانوں کا قومی وظیفہ ایک مسلمان سے یہ توقع رکھنی کہ وہ حق کا اعلان نہ کرے اور ظلم کو ظلم نہ کہے، بالکل ایسی بات ہے جیسے یہ کہا جائے کہ وہ اسلامی زندگی سے دستبردار ہوجائے۔

اگر تم کسی آدمی سے اس مطالبے کا حق نہیں رکھتے کہ وہ اپنا مذہب چھوڑ دے تو یقیناً ایک مسلمان سے یہ مطالبہ بھی نہیں کرسکتے کہ وہ ظلم کو ظلم نہ کہے، کیونکہ دونوں باتوں کا مطلب ایک ہی ہے۔ یہ تو اسلامی زندگی کا وہ عنصر ہے جس کے الگ کر دینے کے بعد اس کی سب سے بڑی مابہ الامتیاز خصوصیت معدوم ہوجاتی ہے، اسلام نے مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد ہی اس بات پر رکھی ہے کہ وہ دنیا میں سچائی اور حقیقت کے گواہ ہیں۔ ایک گواہ کا فرض ہوتا ہے۔ جو کچھ جانتا ہے بیان کرے۔ ٹھیک اسی طرح ہر مسلمان کا بھی وظیفہ (ڈیوٹی) ہے کہ جس سچائی کا اسے علم و یقین دیا گیا ہے ہمیشہ اس کا اعلان کرتا رہے اور ادائے فرض کی راہ میں کسی آزمائش اور مصیبت سے نہ ڈرے، علی الخصوص جب ایسا ہو کہ ظلم و جبر کا دور دورہ ہوجائے اور جبر و تشدد کے ذریعے اعلانِ حق کو روکا جائے تو پھر یہ فرض اور زیادہ لازمی اور ناگزیر ہوجاتا ہے۔ کیونکہ اگر طاقت کے ڈر سے لوگوں کا چپ ہوجانا گوارا کر لیا جائے اور "دو اور دو" کو اس لیے چار نہ کہا جائے کہ ایسا کہنے سے انسانی جسم مصیبت میں مبتلا ہوجاتا ہے تو پھر سچائی اور حقیقت ہمیشہ کے لیے خطرے میں پڑ جائیں اور حق کے ابھرنے اور قائم رہنے کی کوئی راہ باقی نہ رہے۔ حقیقت کا قانون نہ تو طاقت کی تصدیق کا محتاج ہے۔ نہ اس کے لیے بدلا جاسکتا ہے کہ ہمارے جسم پر کیا گزرتی ہے؟ وہ تو حقیقت ہے اور اس وقت بھی حقیقت ہی ہے جب اس کے اظہار سے ہمارا جسم آگ کے شعلوں کے اندر جھونک دیا جائے

صرف اس لیے کہ ہمیں قید کر دیا جائے گا۔ آگ میں ٹھنڈک اور برف میں گرمی نہیں پیدا ہو سکتی۔

شہادت علی الناس

یہی وجہ ہے کہ اسلام کی کتاب شریعت (قرآن) میں مسلمانوں کو بتلایا گیا ہے کہ وہ خدا کی زمین میں "شاہد" ہیں۔ یعنی سچائی کی گواہی دینے والے ہیں۔ بہ حیثیت ایک قوم کے یہی ان کا قومی وظیفہ (نیشنل ڈیوٹی) ہے اور یہی ان کی قومی خصلت ہے (نیشنل کریکٹر) ہے جو ان کو تمام پہلی اور آئندہ قوموں میں ممتاز کرتی ہے۔ اسی طرح پیغمبر اسلام نے فرمایا "انتم شھداء اللہ فی الارض" (بخاری) تم خدا کی زمین پر خدا کی طرف سے سچائی کے گواہ ہو پس ایک مسلمان جب تک مسلمان ہے اس گواہی کے اعلان سے باز نہیں رہ سکتا۔

کتمان شہادت

اگر وہ باز رہے تو یہ قرآن کی اصطلاح میں "کتمان شہادت" ہے یعنی گواہی کو چھپانا، قرآن نے ایسا کرنے والوں کو خدا کی پھٹکار کا سزاوار بتلایا ہے اور بار بار کہا ہے کہ اسی "کتمان شہادت" کی وجہ سے دنیا کی بڑی بڑی قومیں برباد و ہلاک ہو گئیں۔ (ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات والھدیٰ من بعد ما بیناہ للناس فی الکتاب اولئک یلعنھم اللہ و یلعنھم اللاعنون۔ بقرہ)

لعن الذین کفروا من بنی اسرائیل علیٰ لسان داؤد و عیسیٰ ابن مریم ذالک بما عصوا و کانوا یعتدون

کانوا لا یتناھون عن منکر فعلوہ لبئس ما کانوا یفعلون۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

اسی لیے اسلام کے واجبات و فرائض میں ایک اہم فرض "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" ہے۔ یعنی نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا۔ قرآن نے عقیدہ توحید کے بعد جن کاموں پر سب سے زیادہ زور دیا ہے ان میں سے ایک کام یہ ہے۔ قرآن نے بتلایا ہے کہ مسلمانوں کی تمام قومی بڑائی کی بنیاد اسی کام پر ہے۔ وہ سب سے بڑی اور اچھی قوم اس لیے ہیں کہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں اگر وہ ایسا نہ کریں تو اپنی ساری بڑائی کھو دیں۔ قرآن سچے مسلمانوں کی پہچان یہ بتلاتا ہے۔

"وہ حق کے اعلان میں کسی سے نہیں ڈرتے نہ دنیا کی کوئی لالچ ان پر غالب آسکتی ہے، نہ کوئی خوف۔ وہ طمع بھی کرتے ہیں تو صرف خدا سے اور ڈرتے بھی ہیں تو صرف خدا سے"۔

پیغمبر اسلام کے بے شمار قولوں میں سے جو اس بارے میں ہیں، ایک قول یہ ہے "نیکی کا اعلان کرو، برائی کو روکو اگر ایسا نہ کرو گے تو ایسا ہو گا کہ نہایت برے لوگ تم پر حاکم ہو جائیں گے اور خدا کا عذاب تمہیں

گھیرے گا، تم دعائیں مانگو گے کہ یہ عالم ٹل جائیں مگر قبول نہ ہوں گی" (ترمذی و طبرانی عن حذیفہ و عمرو من) لیکن یہ فرض کیونکر انجام دیا جائے۔ تو اسلام نے تین مختلف حالتوں میں اس کے تین مختلف درجے بتلائے ہیں چنانچہ پیغمبرِ اسلام نے فرمایا "تم میں سے جو شخص برائی کی بات دیکھے تو چاہیے اپنے ہاتھ سے درست کر دے۔ اگر اس کی طاقت نہ پائے تو زبان سے اعلان کرے اگر اس کی بھی طاقت نہ پائے تو اپنے دل میں اس کو برا سمجھے۔ لیکن یہ آخری درجہ ایمان کی بڑی ہی کمزوری کا درجہ ہے" (مسلم) ہندوستان میں ہمیں یہ استطاعت نہیں ہے کہ اپنے ہاتھ سے گورنمنٹ کی برائیاں دور کر دیں، اس لئے ہم نے دوسرا درجہ اختیار کیا جس کی استطاعت حاصل ہے، یعنی زبان سے اس کا اعلان کرتے ہیں۔

ارکانِ اربعہ

قرآن نے مسلمانوں کی اسلامی زندگی کی بنیاد چار باتوں پر رکھی ہے اور بتلایا ہے کہ ہر طرح کی انسانی ترقی اور کامیابی انہی کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے۔ ایمان، عمل صالح، تواصی حق، تواصی صبر، تواصی حق کے معنی یہ ہیں کہ ہمیشہ حق اور سچائی کی ایک دوسرے کو وصیت کرنا۔ تواصی صبر کے معنی ہیں کہ ہر طرح کی مصیبتوں اور رکاوٹوں کو جھیل لینے کی وصیت کرنا۔ چونکہ حق کے اعلان کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مصیبتیں پیش آئیں۔ اس لیے حق کے ساتھ صبر کی وصیت بھی ضروری تھی۔ تاکہ مصیبتیں اور رکاوٹیں جھیل لینے کے بعد حق گو تیار ہو جائے۔

(العصر ان الانسان لفی خسر الا الذین آمنوا و عملوا الصالحات و تواصوا بالحق و تواصوا بالصبر)

اسلامی توحید اور امر بالمعروف

اسلام کی بنیاد عقیدۂ "توحید" پر ہے اور "توحید" کا ضد "شرک" ہے جس سے بیزاری اور نفرت ہر مسلمان کی فطرت میں داخل کی گئی ہے۔ توحید سے مقصود یہ ہے کہ خدا کو اس کی ذات اور صفات میں ایک ماننا۔ شرک کے معنی یہ ہیں کہ اس کی ذات اور صفتوں میں کسی دوسری ہستی کو شریک کرنا۔ پس سچائی کے اظہار میں بے خوفی اور بے باکی ایک مسلمان کی زندگی کا مایۂ خمیر ہے۔ توحید مسلمانوں کو سکھلاتی ہے کہ ڈرنے اور جھکنے کی سزاوار صرف خدا کی عظمت و جبروت ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں جس سے ڈرنا چاہیے۔ یا جس کے آگے جھکنا چاہیے۔ وہ یقین کرتے ہیں کہ خدا کے سوا کسی دوسری ہستی سے ڈرنا، خدا کے ساتھ اس کو شریک کرنا اور اپنے دل کے خوف و اطاعت کا حقدار ماننا ہے۔ یہ بات توحید کے ساتھ اکٹھی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اسلام تمام تر بے خوفی اور قربانی کی دعوت ہے۔ قرآن جا بجا کہتا ہے مسلمان وہ ہے جو خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرے ہر حال میں

سچی بات کہے"۔ (ولم یخش الا اللہ) پیغمبر اسلام نے فرمایا : "سب سے بہتر موت اس آدمی کی موت ہے جو کسی ظالم حکومت کے سامنے حق کا اظہار کرنے اور اس کی پاداش میں قتل کیا جائے"۔ (ابوداؤد) وہ جب کسی آدمی سے اسلام کا عہد و قرار لیتے تھے تو ایک اقرار یہ ہوتا تھا "میں ہمیشہ حق کا اعلان کروں گا خواہ کہیں ہوں اور کسی حالت میں ہوں"۔ (بخاری و مسلم) اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کی کسی قوم کی تاریخ میں حق گوئی اور حق گوئی کے لیے قربانی کی ایسی مثالیں نہیں مل سکتیں، جن سے تاریخ اسلام کا باب معمور ہے۔ اسلام کے عالموں، پیشواؤں، بزرگوں، مصنفوں کے سوانح تمام تر اسی قربانی کی سرگزشت ہیں۔ جن مسلمانوں کے مذہبی فرائض میں یہ بات داخل ہے کہ موت قبول کریں مگر حق گوئی سے باز نہ آئیں ان کے لیے دفعہ ۱۲۴ الف کا مقدمہ یقیناً کوئی بڑی ڈراونی چیز نہیں ہو سکتا جس کی زیادہ سے زیادہ سزا سات برس کی قید ہے۔

اسلام میں کوئی دفعہ ۱۲۴ نہیں

تاریخ اسلام کے دو دور ہیں۔ پہلا دور پیغمبر اسلام اور ان کے چار جانشینوں کا ہے۔ یہ دور خالص اور کامل طور پر اسلامی نظام کا تھا یعنی اسلامی جمہوریت (ری پبلک) اپنی اصلی صورت میں قائم تھی۔ ایرانی شہنشاہی اور رومی امارت کا کوئی اثر ابھی اسلامی فسادات عامہ پر نہیں پڑا تھا۔

اسلامی جمہوریت کا خلیفہ خود بھی طبقہ عوام (ڈیموکریٹ) کا ایک فرد ہوتا تھا۔ اور ایک فرد قوم کی طرح زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ دارالخلافت کے ایک خش پوش جھونپڑی میں رہتا اور چار چار پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتا۔ اسلام کے دارالخلافت میں امریکن ری پبلک کا کوئی قصر سفید (وہائٹ ہاؤس) نہ تھا۔ دوسرا دور شخصی حکمرانی اور شہنشاہی کا ہے جو خاندان بنوامیہ سے شروع ہوا۔ اس دور میں اسلامی جمہوریت درہم برہم ہو گئی، قوم کے انتخاب کی جگہ طاقت و تسلط کا دور شروع ہو گیا شاہی خاندان سے طبقہ امراء (ارسٹوکریٹ) کی بنیاد پڑی، اور اسلام کے گلیم پوش خلیفہ کی جگہ شہنشاہیت کا تاج و تخت نمودار ہو گیا تاہم مسلمانوں کی زبانیں جس طرح پہلے دور کی آزادی میں بے باک تھیں اس طرح دوسرے دور کے جبر و استبداد میں بھی بے خوف رہیں۔ میں بتلانا چاہتا ہوں کہ تعزیرات ہند کی طرح اسلامی قانون میں کوئی دفعہ ۱۲۴ الف نہیں ہے، پہلے دور کے مسلمانوں کی حق گوئی کا یہ حال تھا کہ دارالخلافت کی ایک بڑھیا عورت خلیفہ وقت سے برسرِ عام کہہ سکتی تھی اگر تم انصاف نہ کرو گے تو تکلے کی طرح تمہارے بل نکال دیں گے۔ لیکن وہ مقدمہ بغاوت

چلانے کی بجائے خدا کا شکر کرتا کہ قوم میں ایسی راست باز زبانیں موجود ہیں، عین جمعہ کے مجمع میں جب خلیفہ منبر پر خطبے کے لیے کھڑا ہوتا اور کہتا "اسمعوا واطیعوا" سنو اور اطاعت کرو تو ایک شخص کھڑا ہو جاتا اور کہتا "نہ تو سنیں گے نہ اطاعت کریں گے کیوں؟ اس لیے کہ تمہارے جسم پر جو جبہ ہے وہ تمہارے حصے کے کپڑے سے زیادہ کا بنا ہوا ہے اور یہ خیانت ہے" اس پر خلیفہ اپنے لڑکے سے گواہی دلاتا، وہ اعلان کرتا کہ میں نے اپنے حصے کا کپڑا بھی اپنے باپ کو دے دیا تھا، اس سے جبہ تیار ہوا۔ قوم کا یہ طرزِ عمل اس خلیفہ کے ساتھ تھا جس کی صولت و سطوت نے مصر اور ایران کا تخت الٹ دیا تھا۔ تاہم اسلامی حکومت میں کوئی دفعہ ۱۲۴-الف نہ تھی۔ دوسرا دور شخصی جبر و استبداد کا دور تھا جس کی پہلی ضرب آزادیٔ رائے اور آزادیٔ تقریر ہی پر پڑتی ہے لیکن اس دور میں بھی زبانوں کی بے باکی اور دلوں کی بے خوفی اسی طرح سرگرم رہی اور قید خانے کی تاریک کوٹھڑیاں تازیانوں کی ضرب اور جلاد کی تیغ بھی انہیں نہ روک سکی پیغمبرِ اسلام کے ساتھی (صحابہ کرامؓ) جب تک زندہ رہے وقت کے جابر بادشاہوں کے ظلم کا اعلان کرتے رہے اور برابر مطالبہ کرتے رہے کہ حکومت قوم کے مشورے اور انتخاب سے ہونی چاہیے۔ جو لوگ ان کے تربیت یافتہ تھے (تابعین) ان کا اعلان بھی بعینہٖ یہی رہا کہ "درست ہو جاؤ یا مٹ جاؤ" امام محمد غزالی نے (جن کو یورپ کے مورخین فلسفہ کے نام سے پہچانتے ہیں اور اب میڈم کارپلی کے ناول کے دوسرے باب نے انگریزی علم و ادب کو بھی روشناس کر دیا ہے) صرف ان صحابہ اور تابعین کا ذکر کیا ہے جو خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے زمانے تک موجود تھے اور جنہوں نے حکمرانوں کے مظالم کا اعلان کر کے ہمیشہ منصفانہ اور نیابتی گورنمنٹ کا مطالبہ کیا ہے ان کی تعداد ۲۳ سے بھی زیادہ ہے۔ ہشام بن عبدالملک نے طاؤس یمانی کو بلایا وہ آئے۔ مگر اس کا نام لے کر سلام کیا۔ "امیرالمومنین" یعنی قوم کا سردار نہ کہا جو مسلمان خلفا کا لقب تھا، ہشام نے سبب پوچھا تو کہا "قوم تیری حکومت سے راضی نہیں اس لیے تجھے ان کا امیر کہنا جھوٹ ہے" ہشام نے کہا "نصیحت کیجئے" فرمایا "خدا سے ڈر کیونکہ تیرے ظلم سے زمین بھر گئی ہے"۔۔۔۔۔ مالک بن دینار بصرے کی جامع مسجد میں اعلان کرتے "ان ظالم بادشاہوں کو خدا نے اپنے بندوں کا چرواہا بنایا تھا کہ ان کی رکھوالی کریں، پر انہوں نے بکریوں کا گوشت کھا لیا، بالوں کا کپڑا بُن کر پہن لیا اور صرف ہڈیاں چھوڑ دیں" سلمان بن عبدالملک جیسے ہیبت ناک خلیفہ سے ابوحازم کہتے "ان اٰباءک قھروا الناس بالسیف، واخذ وا الملک عنوۃ من غیر مشورۃ من المسلمین ولا رضا منھم" تیرے باپ دادوں نے تلوار کے زور سے لوگوں کو مقہور کیا

اور بلا قوم کی رائے اور انتخاب کے مالک بن بیٹھے۔ سلمان نے کہا "اب کیا کیا جائے؟" جواب دیا: "جن کا حق ہے انہیں لوٹا دے" کہا "میرے لیے دعا کیجیے"، فرمایا "خدایا اگر سلمان حق پر ہے تو اسے مہلت دے۔ لیکن اگر ظلم سے باز نہ آئے تو پھر تو ہے اور اس کی گردن"۔ سعید بن مسیب بہت بڑے تابعی تھے۔ وہ علانیہ برسر بازار احکام کے ظلم و جور کا اعلان کرتے اور کہتے "کتوں کا پیٹ بھرتے ہو اور انسانوں کو تم سے امان نہیں"۔ اس عہد کے بعد بھی مسلمان عالموں اور پیشواؤں کی حق گوئی کا یہی عالم رہا۔ منصور عباسی کے خوف و ہیبت سے گھر میں بیٹھے ہوئے لوگ کانپا کرتے تھے۔ سفیان ثوری سے ایک بار اس نے کہا "مجھ سے اپنی کوئی حاجت بیان کیجئے۔ انہوں نے جواب دیا: "اتق اللہ فقد ملأت الارض ظلما و جورا خدا سے ڈر، زمین ظلم و جور سے بھر گئی ہے"۔ جب مشہور عباسی خلیفہ ہارون الرشید تخت نشین ہوا (جس نے فرانس کے شارلیمین کو ایک عجیب گھڑی بطور تحفہ کے بھیجی تھی اور قیصر روم کو بقول گبن "اسے کتے کے بچے" کے لقب سے خط لکھا تھا) تو اس نے اپنی سفیان ثوری کو اپنے ہاتھ سے اشتیاق ملاقات کا خط لکھ کر بھیجا۔ خط میں لکھا تھا کہ میں نے تخت نشینی کی خوشی میں بے شمار مال و دولت لوگوں میں تقسیم کی ہے۔ تم بھی مجھ سے آکر ملو۔ سفیان کوفہ کی مسجد میں ایک بڑے مجمع کے اندر بیٹھے تھے کہ یہ خط پہنچا، لیکن انہوں نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا "جس چیز کو ایک ظالم کے ہاتھ نے چھوا ہے میں اسے چھونا نہیں چاہتا"۔ جب پڑھ کر سنایا گیا تو اس کی پشت پر جواب لکھوا دیا "خدا کے مغرور بندے ہارون کو جس کا ذوق ایمان سلب ہو چکا ہے معلوم ہو تو نے قوم کا مال بلا حق کے اپنی تخت نشینی کی خوشی میں لٹا دیا اور اس کا حال لکھ کر اپنے گناہ پر مجھے اور میرے ساتھیوں کو بھی گواہ ٹھہرایا۔ پس ہم سب کل کو اللہ کے آگے اس کی گواہی دیں گے۔ اسے ہارون تو نے انصاف و حق سے کنارہ کیا، تو نے پسند کیا کہ ظالم بنے اور ظالموں کو سزا دی جائے۔ تیرے حاکم بندگان خدا کو ظلم و جور سے پامال کر رہے ہیں اور تو تخت شاہی پر عیش و عشرت کر رہا ہے"۔ ہارون نے جب یہ خط پڑھا تو بے اختیار رونے لگا اور کہا۔ یہ خط ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا۔ مسلمان عالموں اور اماموں پر موقوف نہیں۔ اس عہد کا ہر عام فرد بھی اس اعلان میں بالکل بے خوف تھا۔ منصور عباسی ایک دن کعبے کا طواف کر رہا تھا۔ آواز آئی کوئی شخص دعا مانگ رہا ہے "خدایا میں تیرے آگے فریاد کرتا ہوں۔ ظلم غالب آگیا ہے اور حق اور حقداروں کے درمیان روک بن گیا ہے"۔ منصور نے اس شخص کو بلا کر پوچھا "وہ کون ہے جس کا ظلم روک بن گیا ہے؟" کہا "تیرا وجود اور تیری حکومت"۔

حجاج بن یوسف کا ظلم و ستم تاریخ اسلام کا نہایت مشہور واقعہ ہے لیکن اس کی بے پناہ تلوار بھی مسلمانوں کی حق گوئی پر غالب نہ آسکی، حطیط حبیب گرفتار ہو کر آیا تو پوچھا: "اب میرے لیے کیا کہتے ہو"۔ اس نے کہا: "تو خدا کی زمین پر سب سے بڑا دشمن ہے"۔ پوچھا خلیفہ کے لیے کیا کہتے ہو؟ کہا: "اس کا جرم تجھ سے بھی زیادہ ہے۔ تیرا ظلم تو اس کے بے شمار ظلموں میں سے ایک ظلم ہے"۔ مامون الرشید کے عہد میں ایسے مسلمان موجود تھے جو پکار پکار کر بر سر دربار کہتے:

"یا ظالم! انا ظالم ان لم اقل لک یا ظالم!

"اے ظالم میں ظالم ہوں اگر تجھے ظالم کہہ کر نہ پکاروں"۔

فتنۂ تاتار اور فتنۂ یورپ

یہ تو تاریخ اسلام کے ابتدائی اوراق ہیں، لیکن اس عہد کے بعد بھی ہر دور کا یہی حال رہا۔ مسلمانوں کے لیے موجودہ عہد کا عالمگیر فتنہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے۔ وہ ایک ایسے ہی سیلاب میں ڈوب کر اُچھل چکے ہیں، جس طرح آج پورے یورپ اور علی الخصوص انگلستان کے ظہور اور تسلط سے تمام ایشیا اور اسلامی ممالک کی آزادی کا خاتمہ ہو گیا ہے، ٹھیک اسی طرح ساتویں صدی مسیحی میں بھی تاتاریوں کے وحشیانہ تسلط سے ظہور میں آیا تھا۔ یورپ کے فتنے کا آخری نتیجہ عثمانی خلافت کی پامالی اور ایشیائے کوچک کا قتل عام ہے۔ تاتاری فتنہ کی آخری وحشت ناکی عباسی خلافت کا خاتمہ اور بغداد کا قتل عام تھا۔ تاتاری انسان نہیں تھے، درندے تھے، تاہم ہلاکو خان، ملکو خان، اباقاآن خان جیسے سفاکوں کے زمانے میں بھی وہ مسلمان موجود رہے جن کی زبانیں اعلانِ حق میں ان کی تلواروں سے بھی زیادہ تیز تھیں۔ شیخ سعدی شیرازی نے جن کی "گلستان" کا نام اس کورٹ نے بھی سنا ہو گا، ہلاکو خان کے منہ پر اسے ظالم کہا۔ شمس الدین تبازی نے ملکو خان کے دربار میں اس کی ہلاکت کی دعا مانگی، شیخ الاسلام احمد بن تیمیہؒ نے اباقاآن پر سرِ دربار لعنت بھیجی۔ تاتاریوں کے پاس بے دریغ قتل کر دینے کا قانون تھا۔ تاہم "تورہ چنگیز خانی" (قوانین چنگیز خان) میں کوئی دفعہ ۱۲۴ - الف نہ تھی۔

حجاج اور ریڈنگ

ہم مسلمانوں کا جب اپنی قومی گورنمنٹوں کے ساتھ جن کی اطاعت از روئے شرع واجب ہے ایسا سلوک رہا ہے۔ تو پھر ایک اجنبی گورنمنٹ کے کارندے ہم سے کیا امید رکھتے ہیں؟ کیا ہندوستان کی "از روئے قانون قائم شدہ" گورنمنٹ ہمارے لیے اس گورنمنٹ سے بھی زیادہ محترم ہے جو "از روئے شریعت اسلام" واجب الاطاعت ہے؟ کیا انگلستان کی بادشاہت اور

لارڈ ریڈنگ کی نیابت عبد الملک کی خلافت اور حجاج بن یوسف کی نیابت سے بھی ہمارے لیے زیادہ مقتدر ہو سکتی ہے؟ اگر ہم "اجنبی و غیر مسلم" اور "قومی و مسلم" کا عظیم الشان اور شرعی فرق بالکل نظر انداز کر دیں، جب بھی ہم سے صرف یہی امید کی جا سکتی ہے کہ جو کچھ حجاج بن یوسف اور خالد قسری کی گورنمنٹوں کے لیے کہہ چکے ہیں، وہی چیمسفورڈ اور ریڈنگ کی گورنمنٹوں کے لیے بھی کہیں۔ ہم نے ان سے کہا تھا۔ اتق اللہ فقد ملأت الارض ظلماً و جوراً۔ "خدا سے ڈرو کیونکہ تمہارے ظلم سے زمین بھر گئی ہے"، یہی ہم آج بھی کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی کمزوری اور بے بسی کی وجہ سے آج ہندوستان میں جو کچھ کر رہے ہیں وہ دراصل قومی حکمرانوں کے ظلم و جور کے لیے ہمیں بتلایا گیا تھا نہ کہ ایک اجنبی قبضہ و تصرف کے مقابلے میں۔ اگر برٹش گورنمنٹ کے ارکان اس حقیقت کو سمجھتے تو انہیں تسلیم کرنا پڑتا کہ مسلمانوں کے تسامح اور درگزر کی حد ہو گئی ہے۔ اس سے زیادہ وہ اسلام کو برطانیہ کے لیے نہیں چھوڑ سکتے، اسلام نے حکمرانوں کے ظلم کے مقابلے میں دو طرح کے طرز عمل کا حکم دیا ہے۔ کیونکہ حالتیں بھی دو مختلف ہیں: ایک ظلم اجنبی قبضہ و تسلط کا ہے۔ ایک خود مسلمان حکمرانوں کا ہے، پہلے کے لیے اسلام کا حکم ہے کہ تلوار سے مقابلہ کیا جائے۔ دوسرے کے لیے حکم ہے کہ تلوار سے مقابلہ تو نہ کیا جائے لیکن "امر بالمعروف" اور "اعلان حق" جس قدر بھی امکان میں ہو ہر مسلمان کرتا رہے۔ پہلی صورت میں دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہونا پڑے گا دوسری صورت میں ظالم حکمرانوں کے ہاتھوں طرح طرح کی اذیتیں اور سزائیں جھیلنی پڑیں گی مسلمانوں کو دونو حالتوں میں دونو طرح قربانیاں کرنی چاہئیں۔ اور دونو کا نتیجہ کامیابی و فتح مندی ہے۔ چنانچہ گزشتہ تیرہ صدیوں میں مسلمانوں نے دونو طرح کی قربانیاں کیں، اجنبیوں کے مقابلے میں سرفروشی بھی کی اور اپنوں کے مقابلے میں صبر و استقامت بھی دکھلائی۔

پہلی صورت میں جس طرح ان کی "جنگی جدوجہد" کوئی مثال نہیں رکھتی۔ اسی طرح دوسری صورت میں ان کی "شہری جدوجہد" بھی عدیم النظیر ہے۔ ہندوستان میں آج مسلمانوں نے دوسری صورت اختیار کی ہے۔ حالانکہ مقابلہ ان کا پہلی حالت سے ہے۔ ان کے لیے جنگی جدوجہد کا وقت آ گیا تھا۔ لیکن انہوں نے "شہری جدوجہد" کو اختیار کیا، انہوں نے "نان وائلنس" رہنے کا فیصلہ کر کے تسلیم کر لیا ہے۔ وہ ہتھیار سے مقابلہ نہ کریں گے۔ یعنی صرف وہی کریں گے جو انہیں مسلمان حکومتوں کے ظلم کے مقابلے میں کرنا چاہیے۔ بلاشبہ اس طرز عمل میں ہندوستان کی ایک خاص طرح کی حالت کو بھی دخل ہے۔ لیکن گورنمنٹ کو سوچنا چاہیے کہ اس سے زیادہ بدبخت مسلمان اور کیا کر سکتے ہیں؟ حد ہو گئی کہ اجنبیوں کے ظلم کے مقابلے میں وہ بات کر رہے ہیں جو انہیں اپنوں کے مقابلے

میں کرنی تھی۔

انقلاب حال

میں سچ کہتا ہوں اس کی رائی برابر بھی شکایت نہیں کہ سزا دلانے کے لیے مجھ پر مقدمہ چلایا گیا ہے، یہ بات تو بہرحال ہونی ہی تھی۔ لیکن حالات کا یہ انقلاب میرے لیے بڑا ہی دردانگیز ہے کہ ایک مسلمان سے کتمان شہادت کی توقع کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ وہ ظلم کو صرف اس وجہ سے ظلم نہ کہے کہ دفعہ ۱۲۴۔ الف کا مقدمہ چلایا جائے گا۔ مسلمانوں کو حق گوئی کا جو نمونہ ان کی تاریخ دکھلاتی ہے وہ تو یہ ہے کہ ایک جابر حکمران کے سامنے ایک بے پروا انسان کھڑا ہے اس پر الزام یہی ہے کہ اس نے حکمران کے ظلم کا اعلان کیا۔ اس کی پاداش میں اس کا ایک ایک عضو کاٹا جا رہا ہے۔ لیکن جب تک زبان نہیں کٹ جاتی وہ یہی اعلان کرتی رہتی ہے کہ حکمران ظالم ہے، یہ واقعہ خلیفہ عبد الملک کے زمانے کا ہے جس کی حکومت افریقہ سے سندھ تک پھیلی ہوئی تھی، تم دفعہ ۱۲۴۔ الف کو اس سزا کے ساتھ تول لے سکتے ہو، میں اس دردانگیز اور جانکاہ حقیقت سے انکار نہیں کرتا کہ اس انقلاب حالت کے ذمہ دار خود مسلمان ہی ہیں۔ انہوں نے اسلامی زندگی کے تمام خصائص کھو دیئے اور ان کی جگہ غلامانہ زندگی کے تمام رذائل قبول کر لیے ان کی موجودہ حالت سے بڑھ کر دنیا میں اسلام کے لیے کوئی فتنہ نہیں جب کہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو میرا دل شرمندگی کے غم سے پارہ پارہ ہو رہا ہے کہ اس ہندوستان میں وہ مسلمان بھی موجود ہیں جو اپنی ایمانی کمزوری کی وجہ سے علانیہ ظلم کی پرستش کر رہے ہیں!

یا آزادی یا موت

لیکن انسانوں کی بدعملی سے کسی تعلیم کی حقیقت نہیں جھٹلائی جا سکتی۔ اسلام کی تعلیم اس کی کتاب میں موجود ہے، وہ کسی حال میں بھی جائز نہیں رکھتی کہ آزادی کھو کر مسلمان زندگی بسر کریں، مسلمانوں کو مٹ جانا چاہیے یا آزاد رہنا چاہیے تیسری راہ اسلام میں کوئی نہیں۔ اسی لیے میں نے آج سے بارہ سال پہلے "الہلال" کے ذریعے مسلمانوں کو یاد دلایا تھا کہ آزادی کی راہ میں قربانی اور جاں فروشی ان کا قدیم اسلامی ورثہ ہے۔ ان کا اسلامی فرض یہ ہے کہ ہندوستان کی تمام جماعتوں کو اس راہ میں اپنے پیچھے چھوڑ دیں۔ میری صدائیں بیکار نہ گئیں، مسلمانوں نے اب آخری فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنے ہندو، سکھ، عیسائی یا پارسی بھائیوں کے ساتھ مل کر اپنے ملک کو غلامی سے نجات دلائیں گے۔

مسئلہ خلافت و پنجاب

میں یہاں گورنمنٹ کی ان ناانصافیوں کا افسانہ نہیں چھیڑوں گا جو "مسئلہ خلافت" اور "مظالم پنجاب" کا عالمگیر افسانہ ہے۔ لیکن میں اقرار کروں گا کہ گزشتہ دو سال کے

اندر کوئی صبح شام مجھ پر ایسی نہیں گزری ہے جس میں مَیں نے "خلافت" اور "پنجاب" کے لیے گورنمنٹ کے مظالم کا اعلان نہ کیا ہو۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے ہمیشہ یہ کہا جو گورنمنٹ اسلامی خلافت کو پامال کر رہی ہو اور مظالم پنجاب کے لیے کوئی تلافی اور شرمندگی نہ رکھتی ہو ایسی گورنمنٹ کے لیے کسی ہندوستانی کے دل میں وفاداری نہیں ہو سکتی، گورنمنٹ کی جگہ وہ ایک فریق متحارب کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے ۱۳ دسمبر ۱۹۱۸ء کو جب میں رانچی میں گورنمنٹ آف انڈیا کے حکم سے نظر بند تھا، لارڈ چمسفورڈ کو ایک مفصل چٹھی لکھی تھی۔ اس میں واضح کر دیا تھا کہ خلافت اور جزیرۃ العرب کے بارے میں اسلامی احکام کیا ہیں؟ میں نے لکھا تھا اگر برٹش گورنمنٹ اسلامی ممالک پر خلاف وعدہ متصرف ہو گئی تو اسلامی قانون کی رو سے ہندوستانی مسلمان ایک انتہائی کشمکش میں مبتلا ہو جائیں گے ان کے لیے صرف دو ہی راہیں رہ جائیں گی یا اسلام کا ساتھ دیں یا برٹش گورنمنٹ کا۔ وہ مجبور ہوں گے کہ اسلام کا ساتھ دیں۔ بالآخر وہی ہوا گورنمنٹ صریح وعدہ خلافی سے باز نہ رہی۔ اس وعدہ کا بھی ایفا ضروری نہ سمجھا گیا جو گورنمنٹ آف انڈیا نے ۲ نومبر ۱۹۱۳ء کے اعلان میں کیا تھا اور وہ وعدہ بھی فریب وقت ثابت ہوا جو مسٹر لارڈ جارج وزیر اعظم انگلستان نے ۵ جنوری ۱۹۱۸ء کو ہاؤس آف کامنس کی تقریر میں کیا تھا، شریف آدمیوں کے لیے وعدہ خلافی عیب ہے۔ لیکن طاقتور حکومتوں کے لیے کوئی بات بھی عیب نہیں، اس حالت نے مسلمانوں کے لیے آخری کشمکش پیدا کر دی۔ اسلامی قانون کی رُو سے کم از کم بات جو ان کے فرائض میں داخل تھی یہ تھی کہ ایسی گورنمنٹ کی اعانت اور کوآپریشن سے ہاتھ کھینچ لیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا وہ اس وقت تک اس پر قائم رہیں گے۔ جب تک انہیں اپنا مذہب اور مذہب کے اٹل احکام عزیز ہیں مسلمانوں کو یقین ہو گیا ہے اگر وہ حق و انصاف چاہتے ہیں تو اس کی راہ صرف ایک ہی ہے سوراج کا حصول یعنی ایسی قومی گورنمنٹ کا حصول جو ہندوستان کی ہو، ہندوستان میں ہو اور ہندوستان کے لیے ہو۔

اگر ظلم نہیں تو کیا عدل ہے

غرضیکہ اس بارے میں میرا اقرار بالکل صاف اور واضح ہے، موجودہ گورنمنٹ محض ایک ناجائز بیوروکریسی ہے۔ وہ کروڑوں انسانوں کی مرضی اور خواہش کے لیے محض نفی ہے۔ وہ ہمیشہ انصاف اور سچائی پر پرسٹیج کو ترجیح دیتی ہے۔ وہ جلیانوالہ باغ امرتسر کا وحشیانہ قتل عام جائز رکھتی ہے۔ وہ انسانوں کے لیے اس حکم میں کوئی ناانصافی نہیں مانتی کہ چارپایوں کی طرح پیٹ کے بل چلائے جائیں وہ بے گناہ لڑکوں کو صرف اس لیے تازیانے کی ضرب سے بیہوش ہو جانے دیتی ہے کہ کیوں ایک بُت کی طرح "یونین جیک" کو سلام نہیں کرتے، وہ تیس کروڑ انسانوں

کی پیہم التجاؤں پر بھی اسلامی خلافت کی پامالی سے باز نہیں آتی، وہ اپنے تمام وعدوں کے توڑ دینے میں کوئی عیب نہیں سمجھتی۔ وہ سمرنا اور تھریس کو صریح نامنصفانہ طور پر یونانیوں کے حوالے کر دیتی ہے اور پھر تمام اسلامی آبادی کے قتل و غارت کا تماشا دیکھتی ہے، انصاف کی پامالی میں اس کی جرأت انتھک اور دلیری بالکل بے باک ہے اور حقیقت کو جھٹلاتے ہوئے اس کے منہ میں کوئی لگام نہیں، سمرنا میں اسّی فیصدی مسلمانوں کی آبادی ہے مگر وزیر اعظم بغیر کسی شرمندگی کے مسیحی آبادی کی کثرت کا اعلان کر دیتا ہے۔ یونانی حکومت تمام اسلامی آبادی کو طوفان اور آگ کے سیلاب میں غرق کر دیتی ہے لیکن وہ بے دھڑک ترکی مظالم کی فرضی داستانیں بیان کرتا رہتا ہے اور خود انگلستان کے پیچھے امریکن کمیشن کی رپورٹ پوشیدہ کر لی جاتی ہے۔

تو پھر نہ تو ان تمام مظالم و جرائم کے لیے ان کے پاس اعتراف ہے نہ تلافی بلکہ ملک کی جائز اور پر امن جد و جہد کو پامال کرنے کے لیے ہر طرح کا جبر و تشدد شروع کر دیا جاتا ہے۔ جو گزشتہ ایک سال کے اندر ہو چکا ہے۔ اور ۸ نومبر سے اس وقت تک ملک کے ہر حصے میں ہو رہا ہے۔ میں اگر ایسی گورنمنٹ کو ظالم اور "یا درست ہو جاؤ یا مٹ جاؤ" نہ کہوں تو کیا "عادل" اور "نہ تو درست ہو نہ مٹو!" کہوں؟ کیا صرف اس لیے کہ ظلم طاقتور ہے اور اس کے پاس جیل ہے، اس کا حق دار ہو جاتا ہے کہ اس کا نام بدل دیا جائے۔ میں اٹلی کے نیک اور حریت پرست جوزف میزینی کی زبان میں کہوں گا۔ "ہم صرف اس لیے کہ تمہارے ساتھ عارضی طاقت ہے، تمہاری برائیوں سے انکار نہیں کر سکتے۔"

جرم کا قدیم اور ناقابلِ شمار ارتکاب

میں نہایت متعجب ہوں کہ میرے خلاف صرف یہی دو ناتمام اور ناکافی تقریریں کیوں پیش کی گئی ہیں کہ ان ہزاروں صفحات سے جو میرے قلم سے نکل چکے ہیں اور ان بے شمار تقریروں سے جن کی صدائیں ہندوستان کے ایک ایک گوشے میں گونج چکی ہیں۔ صرف یہی سرمایہ گورنمنٹ بہم پہنچا سکی۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ میری کوئی تقریر گزشتہ دو سال کے اندر ایسی نہیں ہوئی ہے جس میں یہ تمام باتیں میں نے بیان نہ کی ہوں، میں مستقل بارہ سال سے اپنی قوم و ملک کو آزادی و حق طلبی کی تعلیم دے رہا ہوں۔ میری اٹھارہ برس کی عمر تھی جب میں نے اس راہ میں تحریر و تقریر شروع کی۔ میں نے زندگی کا بہترین حصہ یعنی عہد شباب صرف اسی مقصد کے عشق میں قربان کر دیا۔ میں اسی کی خاطر چار سال تک نظر بند رہا مگر نظر بندی میں بھی میری ہر صبح و شام اس کی تعلیم و تبلیغ میں بسر ہوئی۔ "رانچی" کے در و دیوار اس کی شہادت دے سکتے ہیں جہاں میں نے نظر بندی کا دائمی زمانہ بسر کیا ہے۔ یہ تو میری

زندگی کا دائمی مقصد ہے۔ میں صرف اسی ایک کام کے لیے جی سکتا ہوں۔ ان الصلوٰتی ونسکی ومحیینی ومماتی للہ رب العالمین۔

آخری اسلامی تحریک

میں اس جرم سے کیونکر انکار کر سکتا ہوں جبکہ میں ہندوستان کی اس آخری اسلامی تحریک کا داعی ہوں جس نے مسلمانانِ ہند کے پولیٹیکل مسلک میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیا اور بالآخر وہاں تک پہنچا دیا جہاں آج نظر آ رہے ہیں یعنی ان میں سے ہر فرد میرے اس جرم میں شریک ہو گیا ہے۔ میں نے ۱۹۱۲ء میں ایک اردو جرنل "الہلال" جاری کیا جو اس تحریک کا آرگن تھا اور جس کی اشاعت کا تمام تر مقصد وہی تھا جو اوپر ظاہر کر چکا ہوں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ "الہلال" نے تین سال کے اندر مسلمانانِ ہند کی مذہبی اور سیاسی حالت میں ایک بالکل نئی حرکت پیدا کر دی ہے۔ وہ اپنے ہندو بھائیوں کی سرگرمیوں سے نہ صرف الگ تھے بلکہ اس کی مخالفت کے لیے بیوروکریسی کے ہاتھ میں ایک ہتھیار کی طرح کام دیتے تھے۔ گورنمنٹ کی تفرقہ انداز پالیسی نے انہیں فریب میں مبتلا کر رکھا تھا کہ ملک میں ہندوؤں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ہندوستان اگر آزاد ہو گیا تو ہندو گورنمنٹ قائم ہو جائے گی۔ مگر "الہلال" نے مسلمانوں کو تعداد کی جگہ ایمان پر اعتماد کرنے کی تلقین کی اور بے خوف ہو کر ہندوؤں کے ساتھ مل جانے کی دعوت دی، اسی سے وہ تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جن کا نتیجہ آج متحدہ تحریک خلافت سوراج ہے۔ بیوروکریسی ایک ایسی تحریک کو زیادہ عرصہ تک برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے پہلے "الہلال" کی ضمانت ضبط کی گئی۔ پھر جب "البلاغ" کے نام سے دوبارہ جاری کیا گیا تو ۱۹۱۶ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نے مجھے نظر بند کر دیا۔ میں بتلانا چاہتا ہوں کہ "الہلال" "تمام تر آزادی یا موت" کی دعوت تھی، اسلام کی مذہبی تعلیمات کے متعلق اس نے جس مسلک بحث و نظر کی بنیاد ڈالی اس کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے۔ صرف اس قدر اشارہ کروں گا کہ ہندوؤں میں آج مہاتما گاندھی مذہبی زندگی کی روح پیدا کر رہے ہیں "الہلال" اس کام سے ۱۹۱۲ء میں فارغ ہو چکا تھا۔ ایک عجیب اتفاق ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کی نئی اور طاقتور سرگرمی اسی وقت شروع ہوئی جب دونوں میں مغربی تہذیب کی جگہ مذہبی تعلیم کی تحریکوں نے پوری طرح فروغ پالیا۔

خلافت کانفرنس کلکتہ

چار سال کے بعد پہلی جنوری ۱۹۲۵ء کو میں رہا کیا گیا۔ اس وقت سے گرفتاری کے لمحے تک میرا تمام وقت انہی مقاصد کی اشاعت و تبلیغ میں صرف ہوا ہے۔ ۲۸-۲۹ فروری ۱۹۲۵ء کو اسی کلکتے کے ٹاؤن ہال میں خلافت کانفرنس کا جلسہ ہوا تھا اور مسلمانوں

نے مایوس ہو کر اپنا آخری اعلان کر دیا تھا۔

" اگر برٹش گورنمنٹ نے مطالبات خلافت کی اب بھی سماعت نہ کی تو مسلمان اپنے شرعی احکام کی رُو سے مجبور ہو جائیں گے کہ تمام وفادارانہ تعلقات منقطع کر دیں" میں اس کانفرنس کا پریسیڈنٹ تھا، میں نے اس کے طولانی پریسیڈینشل ایڈریس میں وہ تمام امور بہ تفصیل بیان کر دیئے تھے جو اس قدر ناقص شکل میں ان دو تقریروں کے اندر دکھلائے گئے ہیں۔

موالات اور فوجی ملازمت میں نے اس ایڈریس میں اس حکم کی بھی تشریح کر دی تھی جس کی بنا پر مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے کہ موجودہ حالت میں گورنمنٹ سے ترکِ موالات کریں"

یعنی کوآپریشن اور اعانت سے ہاتھ کھینچ لیں، یہی "ترکِ موالات" ہے جو آگے چل کر "نان کوآپریشن" کی شکل میں نمودار ہوا۔ اور مہاتما گاندھی جی نے اس کی سربراہی کی۔ اسی کانفرنس میں فوج سے متعلق وہ ریزولیوشن منظور ہوا تھا۔ جس میں اسلامی قانون کے بموجب مسلمانوں کے لیے فوجی نوکری ناجائز بتلائی گئی تھی۔ کیونکہ گورنمنٹ اسلامی خلافت اور اسلامی ملکوں کے خلاف برسرِ پیکار ہے۔ کراچی کا مقدمہ اسی ریزولیوشن کی بنا پر چلایا گیا۔ میں بار بار اخبارات اور تقریروں میں اعلان کر چکا ہوں کہ یہ ریزولیوشن سب سے پہلے میں نے ہی تیار کیا تھا اور میری ہی صدارت میں تین مرتبہ منظور ہوا۔ سب سے پہلے کلکتہ میں پھر بریلی اور لاہور میں۔ میں نے ایڈریس کو مزید اضافے کے بعد کتاب کی شکل میں بھی مرتب کیا جو انگریزی ترجمے کے ساتھ بار بار شائع ہو چکا ہے۔ اور گویا میرے "جرائم" کا ایک تحریری ریکارڈ ہے۔

میری زندگی سرتاسر ۱۲۴ الف ہے میں نے گزشتہ دو سال کے اندر تنہا اور مہاتما گاندھی کے ساتھ تمام ہندوستان کا بار بار دورہ کیا۔ کوئی ایسا شہر نہیں جہاں میں نے

خلافت، پنجاب، سوراج اور نان کوآپریشن پر بار بار تقریریں نہ کی ہوں اور وہ تمام باتیں نہ کہی ہوں جو میری ان دو تقریروں میں دکھلائی گئی ہیں۔ دسمبر ۱۹۲۰ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ آل انڈیا خلافت کانفرنس کا بھی اجلاس ہوا۔ ۱۹۲۱ء میں جمعیۃ العلماء کا بریلی میں جلسہ ہوا۔ گزشتہ اکتوبر میں یو۔پی پراونشل خلافت کانفرنس آگرہ میں منعقد ہوئی۔ نومبر میں آل انڈیا علماء کانفرنس کا لاہور میں اجلاس ہوا۔ ان تمام کانفرنسوں کا بھی میں ہی صدر تھا۔ لیکن ان میں بھی تمام مقررین نے جو کچھ کہا اور صدارتی تقریروں میں میں نے جو خیالات ظاہر کئے ان سب میں وہ تمام باتیں موجود تھیں جو ان دو تقریروں میں دکھلائی گئی ہیں۔ بلکہ میں اقرار کرتا ہوں کہ ان

سے بہت زیادہ قطعی و واضح خیالات ظاہر کیے گئے تھے۔ اگر میری ان دو تقریروں کے مطالب دفعہ ۱۲۴ الف کا جرم ہیں تو میں نہیں سمجھتا کہ صرف پہلی اور پندرھویں جولائی ہی کا ارتکاب کیوں منتخب کیا گیا ہے؟ میں تو اس کثرت کے ساتھ اس کا ارتکاب کر چکا ہوں کہ فی الواقعہ اس کا شمار میرے لیے ناممکن ہو گیا ہے، مجھے کہنا پڑے گا کہ میں نے گزشتہ سالوں کے اندر بجز ۱۲۴۔ الف کے اور کوئی کام نہیں کیا۔

نان وائلنس نان کوآپریشن

ہم نے آزادی اور حق طلبی کی اس جنگ میں "نان وائلنس و نان کوآپریشن" کی راہ اختیار کی ہے۔ ہمارے مقابلے میں طاقت اپنے تمام جبر و تشدد اور خونریزی و سائل کے ساتھ کھڑی ہے۔ لیکن ہمارا اعتماد صرف خدا پر ہے اور اپنی غیر مختتم قربانی اور غیر متزلزل استقامت پر۔ مہاتما گاندھی کی طرح میرا یہ اعتقاد نہیں ہے کہ کسی حال میں بھی ہتھیار سے نہیں لڑنا چاہیے۔ اسلام نے جن حالتوں میں اس کی اجازت دی ہے۔ میں اسے فطرۃ الہٰی اور عدل و اخلاق کے مطابق یقین کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی ہندوستان کی آزادی اور موجودہ جدوجہد کے لیے مہاتما گاندھی کے تمام دلائل سے متفق ہوں۔ اور ان دلائل کی سچائی پر پورا اعتقاد رکھتا ہوں۔ میرا یقین ہے کہ ہندوستان نان وائلنس جدوجہد کے ذریعے فتح مند ہو گا اور اس کی فتح مندی اخلاق و ایمانی طاقت کی فتح مندی کی ایک یادگار مثال ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ہمیشہ لوگوں کو باامن جدوجہد کی تلقین کی اور اس کو کامیابی کی سب سے پہلی شرط قرار دیا۔ خود یہ تقریریں بھی اس موضوع پر تھیں جیسا کہ پیش کردہ نقول سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ میں ان چند مسلمانوں میں سے ہوں جو بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر انہوں نے نہایت مضبوطی کے ساتھ مسلمانوں کو باامن جدوجہد پر قائم نہ رکھا ہوتا تو نہیں معلوم مسئلہ خلافت کی وجہ سے ان کا صبر آزما اضطراب کیسی خوفناک شکل اختیار کر لیتا۔ کم از کم ہندوستان کے ہر حصے میں ایک "مالیبار" کا منظر تو ضرور نظر آ جاتا۔

سی۔ آئی۔ ڈی کے رپورٹرز

اب جب کہ میں ان دو تقریروں کے تمام ان حصوں کا اقرار کر چکا ہوں جن سے پراسیکوشن استدلال کر سکتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر چند الفاظ ان کی پیش کردہ صورت کی نسبت بھی کہہ دوں۔

سی۔ آئی۔ ڈی کے گواہوں نے بیان کیا ہے کہ میری تقریروں کے نوٹس بھی لیے گئے اور مختصر نویسی کے ذریعے بھی قلم بند کی گئیں جو کاپی داخل کی گئی ہے راگز ایٹ اے۔ ادسی، وہ مختصر نویسی کی مرتب کی ہوئی ہے، لیکن یہ میری تقریروں کی ایک ایسی مسخ شدہ صورت ہے کہ اگر چند ناموں اور واقعات کی طرف اشارہ

نہ ہوتا تو میرے لیے شناخت کرنا بھی مشکل تھا۔ وہ بلاشبہ ایک چیز ہے جو دور تک پھیلتی چلی گئی ہے۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ وہ کیا چیز ہے؟ محض بے جوڑ، بے تعلق اور اکثر مقامات پر بے معنی جملے جو بغیر کسی ربط اور سلسلے کے صفحوں پر بکھیر دیئے ہیں۔ گرامر اور محاورہ دونوں سے انہیں یک قلم انکار ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ رپورٹر تقریر سمجھنے اور قلمبند کرنے سے عاجز تھا، اس لیے درمیان سے جملوں کے جملے چھوٹتا جاتا ہے اور تمام حروف ربط و تعلیل تو بالکل ہی حذف کر دیئے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ تمام وہ الفاظ جن کی آواز یا املا میں ذرا سا بھی تشابہ ہے بالکل ہی بدل گئے ہیں اور عبارت یا تو بے معنی ہو گئی ہے یا منحرف۔ مثلاً میں نے یکم جولائی کی تقریر میں مشہور فرنچ شاعر اور ادیب وکٹر ہیوگو کا قول نقل کیا تھا، "آزادی کا بیج کبھی بار آور نہیں ہو سکتا جب تک ظلم کے پانی سے اس کی آبیاری نہ ہو" مختصر نویس نے "ظلم" کی جگہ "دھرم" لکھ دیا ہے جو صریح غلط اور بے موقع ہے۔ البتہ اس کی آواز "ظلم" سے مشابہ ہے۔ اس طرح ایک مقام پر ہے "انہوں نے جیل خانے کی مصیبت کو برباد کیا ہے" حالانکہ مصیبت کو برباد کرنے کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے غالباً میں نے "برداشت کیا ہے" کہا ہوگا یعنی انہوں نے جیل کی مصیبت جھیل لی ہے۔ چونکہ دونوں لفظوں کی آواز ملی جلی ہے اور مختصر نویس خود فہم و اعتبار سے محروم ہے۔ اس لیے "برداشت" کی جگہ "برباد" لکھ گیا۔

اردو مختصر نویسی

اصل یہ ہے کہ اردو مختصر نویسی کا قاعدہ اور مختصر نویس کی ناقابلیت دونوں نقائص کے لیے ذمہ دار ہیں۔ اردو مختصر نویسی کا قاعدہ ۱۹۰۵ء میں کرسچین کالج لکھنؤ کے دو پروفیسروں نے ایجاد کیا جن میں سے ایک کا نام مرزا محمد ہادی بی۔ اے ہے۔ میں اس وقت لکھنؤ ہی میں تھا، اس لیے مجھے ذاتی طور پر اس کے دیکھنے اور موجدوں سے گفتگو کرنے کا بارہا اتفاق ہوا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کے موجدوں نے انگریزی علامات کو بہت تھوڑے سے تغیر کے ساتھ منتقل کر لیا ہے، لیکن وہ اردو حروف و املا کو پوری طرح محفوظ کر دینے میں کامیاب نہ ہو سکے، خود انہیں بھی اس نقص کا ایک حد تک اعتراف تھا۔ لیکن وہ خیال کرتے تھے کہ مختصر نویس کی ذاتی قابلیت اور حافظہ و مناسبت سے اس کی تلافی ہو جائے گی۔ میں اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر کہتا ہوں کہ تجربے سے ان کا خیال درست نہ نکلا۔ صوبجات متحدہ کی گورنمنٹ نے ابتدائی تجربے کے لیے دو پولیس سب انسپکٹروں کو تعلیم دلائی تھی انہوں نے سب سے پہلے آزمائشی طور پر جن پبلک تقریروں کو قلمبند کیا، میں بتلانا چاہتا ہوں کہ وہ میری اور شمس العلماء مولانا

شبلی نعمانی مرحوم کی تقریریں تھیں۔ ہم دونوں نے انجمن اسلامیہ ہردوئی کے سالانہ جلسے میں لیکچر دیئے تھے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مولانا شبلی نے فی منٹ ساٹھ لفظوں کی رفتار سے تقریر کی تھی اور میری تقریر فی منٹ ۸۰ سے ۹۰ تک تھی جیسا کہ خود مختصر نویسوں نے ظاہر کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی تیز رفتار نہ تھی۔ تاہم جب انہوں نے اپنا کام مرتب کر کے دکھلایا تو بالکل ناقص اور غلط تھا، اس کے بعد بھی مجھے بارہا اپنی تقریروں کے قلم بند کرانے کا اتفاق ہوا لیکن ہمیشہ ایسا ہی نتیجہ نکلا۔ ابھی حال کی بات ہے کہ خلافت کانفرنس آگرہ میں میرا زبانی پریسیڈینشل ایڈریس ایک مشاق مختصر نویس سید غلام حسین نے قلم بند کیا جو عرصے تک یو۔پی کے محکمہ سی آئی ڈی میں کام کرنے کے بعد مستعفی ہوا ہے۔ لیکن جب لانگ ہینڈ میں مرتب کر کے مجھے دکھلایا گیا تو اس کا کوئی حصہ صحیح اور مکمل نہ تھا۔ یہ تو اصل قاعدے کا نقص ہے۔ لیکن جب اس پر مختصر نویس کی قابلیت کا بھی اضافہ ہو جائے تو پھر کوئی خرابی ایسی نہیں ہے جس سے انسانی تقریر مسخ نہ کی جائے۔ کلکتہ اور بنگال کی مخصوص حالت نے اس نقص کو اور زیادہ پُر مصیبت بنا دیا ہے۔ یہاں کے دیسی اور یورپین افسر خود اُردو زبان سے بالکل واقفیت نہیں رکھتے حتیٰ کہ معمولی طور پر بول بھی نہیں سکتے، ان کے نزدیک ہر وہ آدمی جو انگریزی سے کسی مختلف لہجے میں آواز نکالے اُردو کا اسکالر ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پولیس اور عدالت ان رپورٹروں اور مختصر نویسوں کو بطور سند کے استعمال کر رہی ہے۔ جن بیچاروں کی استعداد پر ہمیشہ ہم لوگ تمسخر کیا کرتے ہیں۔ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کلکتے کی پولیس اور عدالتوں میں ایک شخص بھی اُردو زبان کے لیے قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ اگر یہاں اس حقیقت کا کچھ بھی احساس ہوتا۔ تو صرف یہی بات بطور ایک عجیب واقعہ کے خیال کی جاتی کہ میری تقریروں کے لیے پولیس اور سی آئی ڈی کے غریب رپورٹروں کی شہادت لی جا رہی ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ کم از کم یہ منظر ضرور میرے لیے تکلیف دہ ہے۔

مشرقی لٹریچر اور سرکاری وسائل علم

یہ کیا ضروری نہیں کہ میں اپنے ڈیفنس کی غرض سے ان شہادتوں کی بے اعتمادی ثابت نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو پورا پورا اقرار کر چکا، مقصود صرف دو باتوں کا اظہار ہے۔

اولاً: جو سرکاری مقدمات اردو تقریر و تحریر کی بنا پر چلائے جاتے ہیں ان کے وسائل ثبوت کس درجہ ناکارہ اور ناقابل اعتماد ہیں؟

ثانیاً: ہندوستان کی بیوروکریسی کی ناکامیابی اور ناموافقت، وہ ڈیڑھ سو برس تک حکومت کر کے بھی اس

قابل نہیں ہوئی کہ ہندوستانی زبانوں کے متعلق صحیح اور مستند ذرائع سے معلومات حاصل کر سکتی، مجھے یاد ہے کہ جب اکتوبر ۱۹۱۶ء میں نظر بند کیا گیا اور بہار گورنمنٹ کے حکام اور پولیس افسر جن کو اردو زبان سے بمقابلہ بنگال زیادہ تعلق ہے، تلاشی کے لیے آئے تو انہوں نے میری تمام کتابوں کو بھی ایک خوفناک لٹریچر سمجھ کر نہایت احتیاط کے ساتھ قبضے میں کر لیا۔ یہ تمام کتابیں عربی اور فارسی زبان میں تھیں اور تاریخ، فقہ، فلسفہ کا معمولی مطبوعہ ذخیرہ تھا جو بازاروں میں فروخت ہوتا رہتا ہے۔ صرف ایک کتاب "مطالب عالیہ" نامی قلمی تھی جو سب سے زیادہ پُراسرار سمجھی گئی، لطف یہ ہے کہ ان کی فہرست ڈپٹی کمشنر کی درخواست سے مجھے ہی مرتب کرنی پڑی۔ کیونکہ تفتیش جرائم کے اس پورے کمیشن میں ایک شخص بھی اس قابل نہ تھا کہ کتابوں کے "ٹائٹل پیج" کو صحت کے ساتھ پڑھ لیتا۔ میں نے نظر بندی کے زمانے میں چار سال تک اپنی ڈاک کے لیے خود ہی سنسر شپ کے فرائض بھی انجام دیئے ہیں کیونکہ جو سرکاری افسر اس غرض کے لیے مقرر کیا گیا تھا وہ اس قدر قابل آدمی تھا کہ اردو کے معمولی لکھے ہوئے خطوط بھی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ وہ اکثر میری ڈاک صرف دستخط کر کے بھیج دیتا اور شب کو آکر مجھ سے اس کا ترجمہ لکھوا لیتا۔

جب کہ نظر بندی میں میں اپنی ڈاک کی خود ہی نگرانی کر رہا تھا۔ تو شملہ اور دہلی کے حکام اپنی کارفرمائی پر نہایت نازاں تھے اور سمجھتے تھے کہ انہوں نے اپنے ایک خطرناک دشمن کو بالکل مجبور اور معطل کر دیا ہے۔ اس وقت بھی میرے قلمی مسودات کلکتہ پولیس کے قبضے میں ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ خوفناک جرم تاریخ، تفسیر قرآن اور لٹریچر ہے، میں یہاں عربی دان اشخاص کی دلچسپی کے لیے ان کتابوں کے چند نام درج کر دیتا ہوں جنہیں نہایت خوفناک سمجھ کر پولیس نے شملہ بھیجا تھا اور عرصے تک سر چارلس کلیولینڈ کے حکم سے میری نظر بندی کے دیگر معاملات کی طرح ان کی بھی تحقیقات ہوتی رہی۔

فتح القدیر، شرح ہدایہ، طبقات الشافعیہ سبکی، ازالۃ الخفاء، کتاب الام، مدونۃ امام مالک، مطالب عالیہ امام رازی، شرح حکمۃ الاشراق، شرح مسلم الثبوت، بحر العلوم، کتاب المستغنی، کتاب اللمع۔ اصل یہ ہے کہ کسی جرم کے لیے جو لٹریچر سے تعلق رکھتا ہو کوئی سی عدالت منصفانہ کارروائی نہیں کر سکتی جو ذاتی طور پر رائے قائم نہ کر سکے۔ یعنی خود اس زبان سے واقف نہ ہو لیکن موجودہ بیوروکریسی علاوہ بیوروکریسی ہونے کے غیر ملکی بھی ہے۔ اس لیے ہر گوشے میں اجنبی اقتدار کی غلامی کے نتائج کام کر رہے ہیں۔ عدالتیں ہندوستان

کی ہیں اور ہندوستان کے لیے ہیں۔ لیکن ان کی زبان جزیرہ برطانیہ کی ہے اور اکثر حالتوں میں ایسے افراد سے مرکب ہے جو ملکی زبان کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہم اس گورنمنٹ سے اور کچھ نہیں چاہتے، صرف یہ چاہتے ہیں کہ جس قدر بھی جلد ممکن ہو وہ اپنے سے بہتر اور حقدار کے لیے اپنی جگہ خالی کر دے۔

موجودہ حالت قدرتی ہے

میں جیسا کہ ابتدا میں لکھ چکا ہوں خاتمہ سخن میں بھی دہراؤں گا۔ آج گورنمنٹ جو کچھ ہمارے ساتھ کر رہی ہے وہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ جس کے لیے خاص طور پر اسے ملامت کی جائے۔ قومی بیداری کے مقابلے میں مقاومت اور جبر وتشدد تمام قابض حکومتوں کے لیے طبیعت ثانیہ کا حکم رکھتا ہے۔ اور ہمیں یہ توقع نہیں رکھنی چاہیئے کہ ہماری خاطر انسانی طبیعت بدل دی جائے گی۔ یہ قدرتی کمزوری افراد اور جماعت دونوں میں یکساں طور پر نمود رکھتی ہے۔ دنیا میں کتنے آدمی ہیں جو اپنے قبضے میں آئی ہوئی چیز صرف اس لیے لوٹا دیں گے کہ وہ اس کے حقدار نہیں۔ پھر ایک پورے براعظم کے لیے ایسی امید کیونکر کی جاسکتی ہے، طاقت کبھی کسی بات کو صرف اس لیے نہیں مان لیتی کہ وہ معقول اور مدلل ہے۔ وہ تو خود بھی طاقت کی نمود کا انتظار کرتی ہے اور جب وہ نمودار ہو جاتی ہے تو پھر ناواجب سے ناواجب مطالبے کے آگے بھی جھک جاتی ہے۔ پس کشمکش اور انتظار ناگزیر ہے۔ اور ایک ایسی قدرتی بات ہے جس کو بالکل دنیا کے معمولی اور روزمرہ کاموں کی طرف بلا کسی تعجب اور شکایت کے انجام پانا چاہیئے۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ تاریخ نے اس بارے میں انسانی ظلم وتعدی کے جو ہیبت ناک مناظر دکھلائے ہیں ان کے مقابلے میں موجودہ جبر وتشدد کسی طرح بھی زیادہ نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کمی اس لیے ہے کہ ابھی ملک کا جذبہ قربانی ناتمام ہے یا اس لیے ہے کہ ظلم زیادہ مکمل نہیں؟ مستقبل اس کو واضح کر دے گا، جس طرح اس کشمکش کا آغاز ہمیشہ یکساں طور پر ہوا ہے اسی طرح خاتمہ بھی ایک ہی طرح ہوا ہے۔ ہمیں معلوم ہے اگر ہمارا جذبہ آزادی وحق طلبی سچا اور اٹل ثابت ہوا تو یہی گورنمنٹ جو آج ہمیں مجرم ٹھہرا رہی ہے کل کو فتح مند محب الوطنوں کی طرح ہمارے استقبال پر مجبور ہوگی۔

بغاوت

مجھ پر سیڈیشن کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ لیکن مجھے "بغاوت" کے معنی سمجھ لینے دو۔ "بغاوت" آزادی کی اس جدوجہد کو کہتے ہیں جو ابھی کامیاب نہیں ہوئی ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں اقرار کرتا ہوں۔ لیکن ساتھ ہی یاد دلاتا ہوں کہ اس کا نام قابل احترام حب الوطنی بھی ہے۔ جب وہ کامیاب ہو جائے، کل تک

آئرلینڈ کے مسلح لیڈر باغی تھے لیکن آج ڈی ویلرا اور گرفیتھ کے لیے برطانیہ عظمیٰ کونسا لقب تجویز کرتی ہے؟ آئرلینڈ کے پارنل (PARNEL) نے ایک مرتبہ کہا تھا۔

"ہمارا کام ہمیشہ ابتدا میں بغاوت اور آخر میں حب الوطنی کی مقدس جنگ تسلیم کیا گیا ہے"۔

قانون قضا ربالحق

میں مسلمان ہوں اور میرے یقین کے لیے وہ بس کرتا ہے جو میری کتاب شریعت نے بتلایا ہے۔ قرآن کہتا ہے۔ جس طرح مادہ اور اجسام میں انتخاب طبعی اور بقاء اصلح کا قانون جاری ہے اور فطرت صرف اسی وجود کو باقی رہنے دیتی ہے جو صحیح و اصلح ہو۔ ٹھیک اسی طرح تمام عقائد و اعمال میں بھی یہی قانون کام کر رہا ہے۔ آخری فتح اسی عمل کی ہوتی ہے جو حق اور سچ ہو اور اس لیے باقی و قائم رہنے کا حقدار ہو۔ پس جب کبھی انصاف اور ناانصافی میں مقابلہ ہوگا تو آخری جیت انصاف ہی کے حق میں آئیگی۔

واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض کذلک یضرب اللہ الامثال (۱۳ : ۱۸) زمین پر وہی چیز رہے گی جو نافع ہو، غیر نافع چھانٹ دی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی اصطلاح میں سچائی کا نام "حق" ہے جس کے معنی ہی جم جانے اور ثابت ہو جانے کے ہیں۔

جھوٹ اور بدی کا نام باطل ہے جس کے معنی ہی مٹ جانے کے ہیں۔ ان الباطل کان ذھوقا۔ باطل تو صرف اسی لیے ہے کہ مٹ جائے، پس آج جو کچھ ہو رہا ہے اس کا فیصلہ کل ہوگا، انصاف باقی رہے گا ناانصافی مٹا دی جائے گی، ہم مستقبل کے فیصلے پر ایمان رکھتے ہیں۔ البتہ یہ قدرتی بات ہے کہ بدلیوں کو دیکھ بارش کا انتظار کیا جائے ہم دیکھ رہے ہیں کہ موسم نے تبدیلی کی تمام نشانیاں قبول کر لی ہیں۔ افسوس ان آنکھوں پر جو نشانیوں سے انکار کریں۔ میں نے اپنی تقریروں میں جو میرے خلاف داخل کی گئی ہیں کہا تھا۔ "آزادی کا بیج کبھی بار آور نہیں ہو سکتا جب تک جبر و تشدد کے پانی سے اس کی آبیاری نہ ہو"۔

لیکن گورنمنٹ نے آبیاری شروع کر دی ہے، میں نے انہی میں کہا تھا "مبلغین خلافت کی گرفتاریوں پر کیوں مغموم ہو؟ اگر تم فی الحقیقت انصاف اور آزادی کے طلب گار ہو تو جیل جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ علی پور کا جیل اس طرح بھر جائے کہ اس کی کوٹھڑیوں میں چوروں کے لیے جگہ باقی نہ رہے"۔ فی الحقیقت جگہ باقی نہیں رہی ہے، پریسیڈنسی و سنٹرل جیل کا بڑا حصہ معمولی قیدیوں سے خالی کر دیا گیا۔ پھر بھی جگہ کافی نہ ہوئی۔ نیا جیل بنایا گیا، وہ بھی آناً فاناً بھر گیا۔ جگہ نکالنے کے لیے سینکڑوں قیدی رہا کر دیے گئے۔ لیکن ان سے

دگنے نئے آگئے۔ اب مزید نئے جیل بنائے جا رہے ہیں۔

سرکاری وکیل، پولیس اور مجسٹریٹ

قبل اس کے کہ میں اپنا بیان ختم کر دوں اپنے ان ہم وطن بھائیوں کی نسبت بھی ایک جملہ کہوں گا جو اس مقدمے میں میرے خلاف کام کر رہے ہیں۔ میں نے اُوپر کہیں کہا ہے کہ سی آئی ڈی کا کام جہالت اور شرارت دونوں سے مرکب ہوتا ہے۔ یہ میں نے اسی ذاتی علم کی بنا پر کہا جو بے شمار مقدمات کی نسبت مجھے حاصل ہے تاہم میں تسلیم کرتا ہوں کہ سی آئی ڈی کے جن آدمیوں نے میرے خلاف شہادت دی ہے۔ انہوں نے اس اعتماد کے سوا جو اپنے کام پر ظاہر کیا ہے کوئی بات بھی غلط نہیں کی ہے۔ میری تقریریں جو پیش کی گئی ہیں ان میں بھی کوئی بات شرارت کی نہیں پاتا۔ جس قدر ان کے اغلاط اور نقائص ہیں غالباً صرف ناقابلیت کا نتیجہ ہیں۔ ایک دو مقامات ایسے ہیں جن کی نسبت خیال کیا جا سکتا ہے کہ دانستہ خراب کر کے دکھلائے ہیں۔ مثلاً جہاں جہاں میں نے لوگوں کو باامن رہنے، ہڑتال نہ کرنے، ہر طرح کے مظاہرات سے مجتنب رہنے کی تلقین کی ہے۔ وہ بقیہ حصوں سے بھی زیادہ اُلجھے ہوتے اور بے ربط ہیں۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی قاعدے کے نقص اور ذاتی ناقابلیت کی وجہ سے ہے نہ کہ شرارت سے۔ البتہ میرا یقین ہے کہ انہوں نے اپنے کام پر جو اعتماد ظاہر کیا ہے اور جس غرض سے یہ کام انجام دیا ہے وہ ضرور معصیت ہے۔ لیکن ساتھ ہی مجھے ان کی کمزوری بھی معلوم ہے۔ وہ محض چند روپیوں کی نوکری کی وجہ سے ایسا کر رہے ہیں اور اتنا قومی ضمیر نہیں رکھتے کہ سچائی کو ہر بات پر ترجیح دیں پس میرے دل میں ان کے لیے کوئی رنج اور ملامت نہیں ہے، پس اس کام کے لیے انہیں معاف کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا بھی معاف کر دے۔ پبلک پراسیکیوٹر بھی جو ان مقدمات پر کام کر رہا ہے۔ میرا ایک ہم وطن بھائی ہے اس کا ضمیر یا ایمان میرے سامنے نہیں ہے محض مزدوری ہے جو اس کام کے لیے وہ گورنمنٹ سے حاصل کرتا ہے۔ پس اس کی طرف سے بھی میرے دل میں کوئی رنج نہیں۔ البتہ میں ان سب کے لیے وہی دعا مانگوں گا جو پیغمبر اسلام نے ایک موقعہ پر مانگی تھی۔ خدایا ان پر راہ کھول دے کیونکہ یہ نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں۔

ناقص امانت قاضی

میں مجسٹریٹ کی نسبت بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ سزا جو اس کے اختیار میں ہے بلا تامل مجھے دے دے، مجھے شکایت یا رنج کا کوئی احساس نہ ہوگا۔ میرا معاملہ پوری مشینری سے ہے کسی ایک پرزے سے نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جب تک مشین

نہیں بدلے گی پرزے اپنا فعل نہیں بدل سکتے۔

میں اپنا بیان اٹلی کے قتیل صداقت گارڈ نیو برونو کے لفظوں پر ختم کرتا ہوں۔ جو میری ہی طرح عدالت کے سامنے کھڑا کیا گیا تھا۔

"زیادہ سے زیادہ سزا جو دی جا سکتی ہے، بلا تامل دے دو، میں یقین دلاتا ہوں کہ سزا کا حکم لکھتے ہوئے جس قدر جنبش تمہارے دل میں پیدا ہوگی اس کا عشر عشیر اضطراب بھی سزا سن کر میرے دل کو نہ ہوگا۔"

خاتمہ مسٹر مجسٹریٹ اب میں اور زیادہ وقت کورٹ کا نہ لوں گا یہ تاریخ کا ایک دلچسپ اور عبرت انگیز باب ہے جس کی ترتیب میں ہم دونوں یکساں طور پر مشغول ہیں۔ ہمارے حصے میں یہ مجرموں کا کٹہرا آیا ہے، تمہارے حصے میں وہ مجسٹریٹ کی کرسی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کام کے لیے وہ کرسی بھی اتنی ہی ضروری چیز ہے جس قدر یہ کٹہرا۔ آؤ اس یادگار اور افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کر دیں۔ مورخ انتظار میں ہے اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے۔ ہمیں جلد جلد یہاں آنے دو اور تم بھی جلد جلد فیصلہ لکھتے رہو۔ ابھی کچھ دنوں تک یہ کام جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا دروازہ کھل جائے گا۔ یہ خدا کے قانون کی عدالت ہے وقت اس کا جج ہے۔ "وہ فیصلہ لکھے گا" اور اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا،

والحمد للہ اولاً و اخراً۔

۱۱ جنوری ۱۹۲۲ء دستخط

پریسیڈنسی جیل، علی پور، کلکتہ احمد

جب تک انگریز برعظیم سے نکل نہیں گیا، اس بیان کا شعلہ روشن رہا۔ جب تک سول نافرمانی کی تحریک چلی یا ملک کی مختلف سیاسی جماعتوں کا حکومت سے ٹکراؤ ہوا یا سامراج دشمن راہنما اپنا پیشہ باغیانہ تقریر کے الزام میں پکڑے گئے تو کئی دفعہ اس بیان کا اتباع کیا گیا، اور عدالتوں میں ان کلمات کی گونج سنی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بیان کے تیور ایک ایسے خطبے کے رہے جو قافلہ حریت کے لیے حدی خوانوں کا نغمہ بھی تھا۔ ملک کی سیاسی جدوجہد کا نعرہ مستانہ بھی اور قومی راہنماؤں کا آوازہ رستخیز بھی۔

راقم نے اپنی تقریروں کے ابتدائی دور میں اس سے نہ صرف آرائش بیان حاصل کی بلکہ اس کے ضمنی عنوانات سے مستقل نوعیت کی بہت سی تقریریں حاصل کیں۔ برعظیم کے سیاسی لٹریچر میں "قول فیصل"

کو ہمیشگی حاصل رہی۔ اس کی شہرت ایک موڑ پر صرف اس لیے رُک گئی کہ مولانا جہاں تھے اس بُت کدے میں اذان کی جگہ نہ تھی وہاں کے لوگ اس کی زبان و مزاج سے ناآشنا تھے اور جس قوم سے مولانا مذہباً منسلک تھے وہ ان سے سیاسۃً ناراض ہو چکی تھی اس کے نزدیک مولانا کے محاسن بھی معائب تھے۔

جن دنوں وزارتی مشن دہلی میں تھا ہم دوسرے تیسرے علی الصباح ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور مختلف سوالات چھیڑ کر شیرینیٔ گفتار کا لُطف اٹھاتے۔ راقم دورانِ گفتگو مولانا کی تحریروں اور تقریروں کے کلمات، برجستہ شعروں کی طرح استعمال کرتا۔ فرماتے بہت عمدہ حافظہ پایا ہے۔ میں خوش ہوتا۔ مولانا سے داد پانا سہل نہ تھا وہ ہر چیز چپ چاپ سنتے کوئی بول پسند آتا تو چہرے پہ رونق سی آجاتی، اندازہ ہوتا کہ تحسین فرما رہے ہیں۔ "قولِ فیصل" کے متعلق راقم نے عرض کیا۔

"ہندوستان کے سیاسی لٹریچر میں اس کا مستقل مقام ہے اس کی بدولت بے شمار سیاسی دماغوں کو جِلا ملی ہے اور کئی نوجوانوں کے سیاسی کردار میں اس سے پختگی آئی ہے۔ بعض جملے شاعرانہ تیر و نشتر سے کہیں زیادہ موثر ہیں۔ بیان میں قومی سیاست کے عزم و آہنگ اور دینی حرارت کی امنگ اور ترنگ کے علاوہ بعض ایسی خوبیاں بھی ہیں، جس سے بیان سیاسی شہ پارہ ہو گیا ہے۔"

فرمایا:

"تب تحریک لاتعاون اس نہج پر تھی کہ ہم لوگ جماعتی طور پر عدالت میں بیان نہ دینے کا فیصلہ کر چکے تھے اور یہ فیصلہ قطعی تھا۔ لوگ قافلہ در قافلہ قید ہو رہے تھے۔ ان قید ہونے والوں کی تعداد کئی ہزار تک چلی گئی۔ ان میں ہر روز اضافہ ہو رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس قافلے میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ بیان نہ دینے کا فیصلہ فی الجملہ مقاطعہ نہ تھا بلکہ ایک پابندی تھی کہ بھانت بھانت کی بولیاں جمع نہ ہوں، جس سے وحدتِ افکار کا بٹوارہ ہو اور وہ یکجائی نہ رہے جو تحریک میں نظم و ضبط قائم رکھنے کے لیے ضروری تھی۔ میرا بیان تحریک کے افکار و مطالب پر ایک خطبہ تھا۔ معاملہ یہ نہ تھا کہ بیان ناگزیر تھا، مقصود یہ تھا کہ تحریک کو اس طرح تقویت ہو گی، عوام کا حوصلہ بڑھے گا کہ جو لوگ حق کے سفر کو نکلتے ہیں وہ ملزموں کے کٹہرے سے خوف زدہ نہیں ہوتے وہاں ان کا لب و لہجہ باہر سے کہیں زیادہ توانا ہوتا ہے۔ اس زمانے میں اس بیان نے فی الواقعہ عوام کو حوصلہ دیا، ان کے ارادوں کو مستحکم کیا اور ان کے دل و دماغ کو انگیز نے کے علاوہ ان

کے حوصلہ و یقین کو علو کیا۔ یہ بیان ایک لحاظ سے میرا ذاتی بیان نہ تھا۔ ایک اجتماعی جہد کا رَجز تھا۔ میں نے عوام کے محسوسات ان کے دماغوں سے کھرچ کے الفاظ کے اس سانچے میں ڈھال دیئے۔ ایکا ایکی قید کی تنہائی میں ایک لہر اُٹھی۔ طبیعت نے چاہا کہ بیان ہونا چاہیئے۔ اور بیان ہوگیا، ایک ہی نشست میں تیار کیا، قلم اُٹھایا کاغذ موجود تھے، لکھنا شروع کیا تو خیالات اسی سرعت سے چلے آ رہے تھے کہ سوال الفاظ کی تلاش کا تھا، الفاظ کے چناؤ کا نہ تھا۔ بسا اوقات ایک ہی بات کے لیے کئی کئی لفظ قلم سے لپٹ کے چلے آتے تھے اور ان کا انتخاب مشکل ہو جاتا تھا۔ لیکن نہ کوئی خیال ملتوی ہوتا، نہ کسی مطلب میں روک آتی۔ مختصر یہ کہ روک ٹوک کے بغیر الفاظ و مطالب اپنی اپنی جگہ لیئے جا رہے تھے:

راقم نے بعض دوسرے بیانوں سے موازنہ کرنا چاہا تو ہاتھ اُٹھا کر فوراً روک دیا۔ فرمایا:

"اس قسم کے موازنے لغو چیز ہیں، اصل چیز یہ نہیں کہ میں نے کیا کہا اور فلاں نے کیا کہا، زبان و بیان کا موازنہ کوئی چیز نہیں اور اگر کوئی چیز ہے تو وہ ایک ذاتی چیز ہے وہ لوگ بھی ہیں جو داغ دھلوی ہی کو سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں۔ چونکہ ان کے نزدیک غالب کے ہاں وہ چیز ہی نہیں جو داغ کے ہاں ہے۔ لہذا ان کے نزدیک داغ کی شاعری غالب کی شاعری کے مقابلے میں عظیم ہے۔ میرا بیان یا دوسرے رفقا کے بیان بالفعل تحریک لاتعاون کے جذبے سے سرشار تھے۔ مصرع طرح ایک ہی تھا۔ جن لوگوں نے غزلہ، دوغزلہ یا سہ غزلہ لکھا وہ سب ان کے رشحاتِ فکر تھے۔ جب شریک مشاعرہ اساتذہ ہی تھے اور سب نغز گو، کہنہ مشق تو ان کے متعلق اس قسم کی تقسیم کہ فلاں غزل سبقت لے گئی یا فلاں بیت حاصلِ مشاعرہ تھا۔ فی الجملہ مشاعرے کی آبرو کے منافی ہے جن لوگوں نے عدالتوں کو للکارا، اصل چیز ان کی للکار ہے اور جہاں تک للکار کا تعلق ہے اس کی گونج اور گرج ملزموں کے جس کٹہرے سے بلند ہوئی اس میں دعوت و عزیمت کے آثار و نقوش بکمال و تمام موجود تھے۔ رہا للکار کا حُسن تو وہ ہر چہرے پر تھا۔"

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے کہا۔

لیکن ہر حُسن ہر شخص پر سحر نہیں کرتا اور نہ ہر طبیعت اس سے متاثر ہوتی ہے۔"

فرمایا:

حسن جہاں تہاں ہو سحر ہوتا ہے، البتہ وہ چیز دوسری ہے جو حسن کے انتخاب میں طبیعتوں کے اخذ و قبول کو متاثر کرتی ہے"۔

مولانا کو موازنہ گوارا نہ تھا اور وہ اس کو ایک طرح کی خفیف الحرکتی سمجھتے تھے۔

راقم نے عرض کیا:

"بیانوں کا موازنہ مقصود تھا، شخصیتوں کا نہیں"۔

فرمایا:

"اس قسم کے موازنے، مجادلے، مناظرے، محاکمے اور تجزیے کسی حال میں عمدہ نہیں ہوتے، ہماری آدھی خرابیاں جو قومی زندگی کا معمول ہو چکی ہیں اس طرز کے جھمیلوں ہی سے پیدا ہوئی ہیں ظاہر ہے کہ آپ مجھ سے مخاطب ہیں اور میرے بیان کو فوقیت دینا چاہتے ہیں۔ لیکن سوال تب نہ اب فوقیت کا نہیں ایک فرض کا تھا۔ اور وہ خصوصیت ہر بیان میں تھی۔ اس قسم کے سوالوں اور جوابوں میں سر کھپانا دماغ کی تپ اور زبان کا رعشہ ہے۔ کسی شخص کے منہ پر اس کی تعریف کی جائے تو یہ اسلاماً ناپسندیدہ فعل ہے اور اخلاقاً کوئی خوشگوار عمل نہیں، ہماری بڑی بڑی گمراہیاں اس کان ہی سے نکلی ہیں"۔

ممکن تھا مولانا کچھ اور فرماتے لیکن عبد اللہ نے کہا پنڈت جی (جواہر لال) آئے ہیں۔ مولانا دوسرے کمرے میں چلے گئے اور اس طرح گفت گو منقطع ہو گئی۔

ترجمان القرآن

قرآن پاک کے تفسیری سلسلے تین ہیں۔ پہلا تفسیر بالروایت یا تفسیر ماثور دوسرا تفسیر بالرائے۔ علماء کے یہی دو سلسلے ہیں۔ تیسرا طریق صوفیاء کا ہے جس کو اشاری یا رمزی کہتے ہیں۔ اسی کی ایک شاخ نظری ہے۔ تفسیر ماثور (یا بالروایت) کی بناء احادیث نبوی، آثار صحابہ اور اقوال تابعین پر ہے۔ اس مدرسہ فکر کے مفسرین نے قرآن کو اس کی سیدھی سادھی دعوت اور اس کے بولتے چالتے پیغام کی بناء پر ترجمہ و بیان کا موضوع بنایا اور پیش کیا ہے۔ اگرچہ بعض مباحث میں کوئی ایک مفسر بہت دُور تک نکل گئے ہیں۔ لیکن ان کے اسلوب میں متکلمین کی سنگینی بالکل نہیں اور نہ وہ فلسفہ کی تقلید میں عقل کے شگوفے چھوڑ کر قارئین کو مرعوب کرتے ہیں۔ ان کی ساری گفتگو قرآن کی منشا اور تعلیم پر مرکوز رہی ہے۔ انہوں نے قرآن کے ترجمہ و توضیح میں نہ صرف عرب محاورہ و روزمرہ کو ملحوظ رکھا بلکہ عرب کے کنایوں، استعاروں، تشبیہوں اور ان کی بعض دوسری خصوصیتوں کو جو عرب معاشرہ کی لسانی روایتوں کے باعث ان کے صنائع و بدائع یا امثال و قصص کا درجہ حاصل کر چکی تھیں نہایت شرح و بسط سے بیان کیا اور قرآنی الفاظ کے معانی کی تحقیق میں دورِ جاہلیت کی شاعری کے ذخائر میں چلے گئے۔ مثلاً ابن عباس نے قرآن کے الفاظ کی تشریح کے لیے دورِ جاہلیت کی عربی شاعری کو لغت کا درجہ دیا۔ امام سیوطی نے "الاتقان" میں قرآن کے دو سو سے زائد الفاظ کے معانی قبل از اسلام کی عربی شاعری میں تلاش کیے۔ ابن عباس سے یہ قول منسوب ہے کہ اسلام سے پہلے کی شاعری کو محفوظ رکھو اس میں قرآن کے الفاظ کی تشریح ملے گی۔ جاحظ کا قول ہے کہ جو شخص دورِ جاہلی کے حالات سے ناواقف ہے وہ قرآن و سنت کو نہیں سمجھ سکتا۔ ماثوری مفسرین اپنی طرف سے نہ کہیں قلم لگاتے اور نہ عقلی مباحث کو چھیڑ کر توضیح و تشریح کے گل بوٹے اگاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ تمام مفسرین خواہ ان کا کسی بھی مکتب فکر سے

تعلق ہو اصولی طور پر متفق ہیں کہ قرآن ایک بے میل سچائی ہے جو کائنات، انسان اور خدا کے باہمی رشتہ کو حرفِ آخر کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ قرآن صرف یہ بتاتا ہے کہ خدا اور اس کی صفات کیا ہیں، اس کائنات کی تکوین کیونکر ہوئی اور انسان ربوبیت کاملہ کا مظہر ہے۔ تمام ادیان کی تعلیمات ایک سی تھیں۔ لیکن ان کے پیرووں نے ان سچائیوں کو گم کر دیا اور تحریف و تلبیس کا شکار ہو گئے۔ قرآن ان تمام سچائیوں کی جامع لیکن آخری کتاب ہے۔ وہ جلال و جمال کا مجموعہ ہے۔ وہ ہمیشہ رہنے والی کتاب ہے۔ جس میں کوئی شک ہی نہیں۔ وہ ایک ضابطہ ہے جس پر چل کر انسان رشد و ہدایت کی سعادت حاصل کر سکتا ہے۔ اس کتاب سے دنیا و عاقبت کی راہیں معلوم ہوتی اور انسان جزا و سزا کے قانون کو اپنے ضمیر میں اتار لیتا ہے۔ غرض قرآن ایک ایسی کتاب ہے کہ اس کے استغراق سے اوامر و نواہی انسان کی اپنی خواہش بن جاتے ہیں۔ اس کا مطالعہ ہمیں اپنے رب کی حقیقت، کائنات کی غایت، انسان کی تخلیق، ملائکہ کے وجود، نبوتوں کے مشن، آخرت کے اسباق، جزا و سزا کے قانون، اور حق و باطل کے امتیازات سے آگاہ کرتا اور اس آگاہی کو ذوق و شوق کی وادیوں سے روحِ انسانی میں اتار دیتا ہے۔ ماثورہی مفسرین قرآن کی اسی سادگی کو ترجمہ و تفسیر میں رچاتے اور پھیلاتے ہیں۔ ہم اگر ان کے بعض مباحث سے قطع نظر کر لیں اور صرف لفظی تشریح کو سامنے رکھیں تو بھی قرآن کی تعلیم ٹھیک ٹھیک ہمارے دلوں میں اتر جاتی ہے اور ہم یقین کی اس نعمت کو پا لیتے ہیں جو فلسفہ کے سفر میں شک کے کانٹوں سے تلوے سہلاتی اور اضطراب کے صحرا میں بھٹکنے کے لیے پھینک دیتی ہے۔ سائنس کی خانہ ویرانی کا عالم بھی یہی ہے کہ وہ ثبوت دیتا ہے لیکن یقین نہیں دیتا۔ انسانی روح کی منزل مقصود آرزو و جستجو یقین ہے جب تک اس کو یقین حاصل نہ ہو وہ کائنات کے توے پر اسپند کے دانے کی طرح رہتا ہے۔ انسانی زندگی یقین کے بغیر جانکنی کی زندگی ہے۔

تفسیر بالرائے اصولی طور پر ایک مستحسن چیز ہے۔ قرآن مجید کے مطالب و معانی پر غور و فکر کرنا اور تقلید و جمود سے ہاتھ اُٹھانا قرآن مجید ہی کی دعوت ہے۔ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غور و فکر کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے اصل خرابی یہ ہوئی کہ جب اسلامی تہذیب آگے چل کر غیر اسلامی تہذیبوں سے دوچار ہوئی تو تفسیر بالرائے مفسرین کے عقلی شعبدوں کی مینا کاری ہو گئی۔ اس کا آغاز یونانی حکماء کے فلسفہ کی اساس پر ہوا۔ اُدھر امویوں اور عباسیوں کے درباروں میں یونان کے حکماء —— سقراط، افلاطون اور ارسطو وغیرہ کی تعلیمات ترجمہ ہو کر پہنچنے لگیں۔ اِدھر مسلمان حکماء نے قرآن پاک کی تعلیمات کو ان فلاسفہ کے افکار سے مناسبتیں دینی

شروع کیں۔ مزید برآں ایران کی زرتشتی تعلیمات اور ہندوستان سے اپنشدوں کے تصورات مسلمان حکماء کے دماغوں میں جگہ پا گئے۔ عربی میں ان کے متراجم علم وفن کا سر آغاز تھا۔ اس سے پہلے عرب صرف شاعری سے آشنا تھے انہیں علم وفن کے ان نوادرات کا علم نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن پاک کی تفسیر میں یونانی، ایرانی اور ہندوستانی الہیات کا تصور اور اس تصور کے تحت کائنات کی غایت کا عقلی استدلال راہ پا گیا اور وہ تمام بحثیں قرآن پاک کی تفسیر کا جزو ہو گئیں جو قرآن پاک کی دعوت سے خارج تھیں یا اس کی تعلیم سے ان کا کوئی رابطہ نہ تھا۔ امام رازی نے جو کچھ لکھا، امام غزالی نے اس باب میں جن خیالات کا اظہار کیا الاشعری (کلامی)، الجصاص (فقہی)، اور زمخشری (معتزلی)، نے تفسیر بالرائے کی جو بنیادیں قائم کیں اس پر متفقین کی ایک ڈار نے اپنی اپنی عمارت کھڑی کی اور وہ قرآن پاک کی دعوت کو اٹھا کر دقیق فلسفیانہ مباحث کے طلسم خانہ میں لے گئے جس سے ایک پیچیدہ علم الکلام پیدا ہو گیا۔

غرض تفسیر بالرائے کا ذخیرہ عقلی و علمی مباحث کے باوجود عام قاریوں کے لیے وہ نظریا فکر پیدا نہیں کرتا جس سے غیاب وحضور کا عشق پیدا ہو۔ قرآن محض عقل نہیں کہ اس کو عقل سے حل کیا جاسکے۔ قرآن ایک عشق ہے جو اپنی جہت خود بنا لیتا اور اپنے قاری و سامع کو مسحور کرتا ہے۔ عقل دلیل دیتی ہے، اعتقاد نہیں دیتی۔ اعتقاد شخصیت سے پیدا ہوتا ہے جو اپنی سیرت سے عقل کو جلا دیتی اور عشق کو طاقت بخشتی ہے۔ اس سلسلہ کے مفسروں نے غالباً اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ کلام اللہ ایک امی کی معرفت عرب کے بدوؤں پر اُتارا گیا تھا۔ چونکہ تفسیر بالرائے میں الفاظ کی تاویل پر تکیہ کیا گیا اس لیے قصص و امثال میں زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق ردوبدل ہوتا رہا، اسی ردوبدل ہی سے مختلف مکاتیب فکر اور امت واحدہ میں بیسیوں فرقے پیدا ہو گئے۔

اشاری تفسیریں قرآن سے متعلق صوفیاء کی تعبیرات و مشاہدات کا مجموعہ ہیں۔ جب تک ہم تصوف اس کے ظہور اور اس کی اساس کو نہ سمجھ لیں ہم قطعاً نہیں جان سکتے کہ اشاری تفسیر ہے کیا؟ اور پس منظر کے مضمرات کیا ہیں۔

تصوف حقیقتاً مطلق العنان حکمرانوں کے سیاسی استبداد و استیلاء، معاشرتی بے انصافی و غارت گری، مذہبی جمود و تعطل اور خشک قسم کی ظاہر داری کے خلاف ایک شدید ردِ عمل اور خاموش احتجاج تھا۔ یہ اس شاہانہ جلال کے خلاف جو حکمرانوں کے ہاں پکڑ دھکڑ کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ فی الحقیقت علماء امت کے

فرار کا ایک مقدس عمل تھا۔ صوفیاء نے اسی جلال کے خلاف جو قہر و غضب کا دوسرا نام تھا۔ نہ صرف احتجاج کیا بلکہ اس کے مقابلہ میں جمال کے تصور کو تصوف کی بنیاد بنا لیا جو رحمت و برکت کا دوسرا نام اور خدا کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ حضرت موسیٰؑ جلال کا مجسمہ اور حضرت عیسیٰؑ جمال کا پیکر تھے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ آخری نبی تھے۔ اس لیے جلال و جمال دونوں کا مرقع و مظہر تھے۔ صوفیاء نے قرآن کے مباحث کو جمالیاتی روپ دے کر اپنے دماغی و قلبی سفر کی بعض ایسی منزلیں بنالیں جس سے طریقت ایک مستقل زندگی بن گئی۔ ورنہ شریعت و تصوف کی اصطلاحیں اسلام کے دور اوّل میں موجود ہی نہ تھیں۔ اگر ان کا کوئی تصور تھا تو وہ صرف الاسلام تھا۔

اشاری تفسیر کسی مربوط یا مسلسل سلسلے کا نام نہیں اس کا اطلاق صوفیاء کے ان اقوال پر ہوتا ہے جو اقوال آیات الٰہی کی تشریح و تفسیر کرتے وقت ان کی زبان سے نکلتے رہے ہیں۔ ان کے ہاں الفاظ کلام اللہ کے صحیح معانی لغت سے زیادہ معرفت سے لیے جاتے ہیں۔ لیکن صوفیا ظاہری معانی کو مسترد بھی نہیں کرتے۔

سہل تستری غالباً پہلا صوفی تھا کہ آیات قرآنی سے متعلق اس کے اقوال ایک مرید نے جمع کئے لیکن اشاری تفسیریں کوئی مربوط یا منضبط سلسلہ نہیں اور نہ اس سلسلہ میں قرآن پاک کی آیت بہ آیت تفسیر کی جاتی ہے۔ اس سلسلہ تفسیر میں مختلف سورتوں سے ہم معنی یا ہم مقصد آیات لے کر ان کی یکسانی کے پہلو بیان کیے جاتے اور ان میں حسن و جمال کی روح ڈھونڈھی جاتی ہے۔ ان باطنی مطالب کے بے شمار نمونے ہیں۔ مثلاً شبلی علیہ الرحمۃ سے وضو اور نماز کا فرق معلوم کیا گیا تو انہوں نے کہا وضو فصل ہے۔ نماز وصل۔ جب آدمی وضو کرتا ہے تو دنیا سے علیحدگی اختیار کرتا ہے۔ جب نماز پڑھتا ہے تو وہ اللہ کے حضور میں ہوتا ہے۔ قرآن میں حسنہ کا لفظ آیا ہے۔ تستری کہتا ہے اس کے معنی اس دنیا میں علم و عبادت کے ہیں اور آخرت میں اللہ کی خوشنودی کے۔ غرض اشاری سلسلہ تفسیر کا لب لباب یہ ہے کہ وہ الفاظ کے لغوی معنی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ باطنی معنی کی کھوج میں رہتا ہے۔ ابن عربی کہتے ہیں کہ قرآن کے معنی ظاہر پرست علماء و فقہاء پر نہیں بلکہ ارباب عرفان و معرفت پر القاء کئے گئے ہیں۔ قرآن ایک سمندر ہے جس کا نہ تو ساحل ہے نہ تہ۔ اس میں بہت سے لوگ ڈوب گئے اور بہت سے سلامت بھی رہے۔ اس بارے میں ابن عربی کا ایک دلچسپ قول ہے کہ "ہم وہ لوگ ہیں جن کی کتابیں عام طور پر نہیں پڑھی جانی چاہئیں"۔ غالباً باطنی مطالب کے اس ذخیرہ کی پیچیدگیوں اور گہرائیوں کو محسوس کرتے ہوئے ابن خلدون نے اصحاب اقتدار کو زور دیا تھا

"کہ عام لوگوں کے مفاد کی خاطر ابن عربی کی تصنیفات جلا دینی چاہئیں۔"

ان تینوں سلسلہ ہائے تفسیر کے بارے میں یہ کہنا کہ فلاں بالکل غلط ہے یا فلاں بالکل صحیح ایک عبث خیال ہے۔ ہر سلسلہ میں علم و نظر، فکر و دانش، معرفت و فراست اور حقائق و نکات کی جلوہ طرازیاں موجود ہیں لیکن ماثوری سلسلہ دعوت قرآن سے اس درجہ قریب ہے کہ قرآن فہمی کے دروازے خود بخود کھلتے چلے جاتے ہیں اور ہم عقل کے جھمگٹوں سے الگ تھلگ قرآن کی حکمت پا جاتے ہیں۔ قرآن عقل کی نہیں حکمت کی دعوت ہے اور حکمت ہی وہ سچائی ہے جو تعین ذات، حفظ نفس اور معرفت خودی کا سروسامان بخشتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا ترجمان القرآن ماثوری سلسلے ہی کی تفسیر ہے۔ انہوں نے جلد اول کے دیباچہ میں امام رازی کی تفسیر کبیر پر تنقیدی اشارہ کر کے متکلمین سے بیزاری کا اظہار کیا۔ ہر چند انہوں نے اشاری تفسیر کا تذکرہ نہیں کیا لیکن ان کی اپنی تفسیر کے بعض لطائف و اشارات اشاری تفسیر کا حسین نمونہ ہیں یوں نظر آتا ہے کہ ان کے نزدیک تصوف کوئی علیحدہ مذہب نہ تھا اور نہ ان کے ہاں صوفیا میں سے کوئی شخصیت معاشرہ کی اجتماعی سیرت کے لیے آئیڈیل تھی۔ انہوں نے طریقت کے عمومی سلسلوں سے کبھی اعتنا نہیں کیا۔ ممکن ہے ان کے نزدیک مجدد الف ثانیؒ کی ذات محض اس لیے مرجع عقیدت نہ ہو کہ وہ نقشبندی سلسلے کے امام تھے۔ ہوسکتا ہے امام ربانیؒ کا وجود ان کے نزدیک اس لیے مرجع ارادت ہو کہ انہوں نے معاشرہ کے عوارض پر تنقید کی اور کلمۃ الحق کی پاداش میں گوالیار کے قلعہ میں قید رہے۔ ابوالکلامؒ کے ذہنی محتین میں ابن عربیؒ اور سفیان ثوریؒ کی بہ نسبت احمد بن حنبلؒ اور ابن تیمیہؒ کو فوقیت حاصل ہے اور اس کے وجوہ واضح ہیں۔

مولانا فرماتے ہیں:

"صدر اول کا دور ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ روم و ایران کے تمدن کی ہوائیں چلنے لگیں اور پھر یونانی علوم کے تراجم نے علوم و فنون وضعیہ کا دور شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جوں جوں وضعیت کا ذوق بڑھتا گیا قرآن کے فطری اسلوبوں سے طبیعتیں نا آشنا ہوتی گئیں۔ رفتہ رفتہ ایک وقت آگیا کہ قرآن کی ہر بات وضعی اور صناعی طریقوں کے سانچوں میں ڈھالے جانے لگی۔ چونکہ ان سانچوں میں وہ ڈھل نہیں سکتی تھی اس لیے طرح طرح کے الجھاؤ پیدا ہونے لگے اور پھر جس قدر کوششیں سلجھانے کی کی گئیں الجھاؤ اور زیادہ بڑھتے گئے۔"

تذکرہ میں لکھتے ہیں :

" قرآن کی حقیقت سے آشنا ہونے کے لیے بیضاوی و بغوی کی ورق گردانی نہیں بلکہ دل دردمند سے الہام اور جبریل عشق کے فیضان کی ضرورت ہے "

دل دردمند کا الہام اور جبریل عشق کا فیضان اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم قرآن کو نظر و فکر کی اس زبان میں سمجھیں جو احادیث نبوی، آثار صحابہ اور اقوال تابعین کے سانچہ میں ڈھلی ہے اور قرآن ہی کے الفاظ و مطالب کی زبان ہے۔

سید سلیمان ندویؒ نے ترجمان القرآن کے اس امتیاز و خصوصیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے تبصرہ میں لکھا ہے کہ :

۱۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ نوجوان مسلمانوں میں قرآن پاک کا ذوق مولانا ابو الکلامؒ کے "الہلال" و "البلاغ" نے پیدا کیا اور جس اسلوب بلاغت کمال انشاء پردازی اور زور تحریر کے ساتھ انہوں نے انگریزی خوان نوجوانوں کے سامنے قرآن پاک کی ہر آیت کو پیش کیا اس نے ان کے لیے ایمان و یقین کے نئے نئے دروازے کھول دیئے۔ اور ان کے دلوں میں قرآن پاک کے معانی و مطالب کی بلندی اور وسعت کو پوری طرح نمایاں کر دیا۔

۲۔ علماء روایت پسند ہوئے تو اسرائیلیات کے شکار ہوئے اور علماء عقلیت پسند ہوئے تو یونانیوں کے مزعومات کے اسیر و پابند۔ تمام علمائے اسلام میں علامہ ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ ہی دو بزرگ ہیں جو ایک طرف روایات کے ناقد و مبصر ہیں تو دوسری طرف یونانی فلسفیات کے نقاد اور ان کے حق و باطل کے واقف کار ہیں ان کے دل ان سب سے ماوری حکمت محمدیؐ کے ذوق چشیدہ اور ان کے سینے معارف نبویؐ کے گنجینہ ہیں۔ ان کی تفسیر تمام تر حکمت و مصلحت اور حقیقت و مغز پر مشتمل ہوتی ہے۔ وہ حکمت نہیں جو یونان کے صنم کدہ سے اچھلی ہو بلکہ وہ جو حجاز کی نہر کوثر سے بہہ کر نکلی ہو یا جو فطرت انسانی کے ربانی چشموں سے ابلی ہو۔

۳۔ مصنف ترجمان القرآن کی یہ دیدہ وری داد کے قابل ہے کہ انہوں نے وقت کی روح کو پہچانا اور اس فتنۂ فرنگ کے عہد میں اس طرز دانش کی پیروی کی جس کو ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ نے فتنۂ تاتار میں پسند کیا تھا۔ جس طرح انہوں نے اس عہد کے مسلمانوں کی تباہی کا راز فلسفۂ یونان

کی دماغی پیروی کو قرار دیا اسی طرح اس عہد کے مسلمانوں کی بربادی کا سبب ترجمان القرآن کے مصنف نے فلسفہ یونان و فرنگ کی ذہنی غلامی کو قرار دیا اور نسخہ علاج بھی وہی تجویز کیا کہ کلام الٰہی کو رسول کی زبان و اصطلاح اور فطرت کے عقل و فلسفہ سے سمجھنا چاہیئے۔

۴۔ ترجمان القرآن دو حصوں میں منقسم ہے۔ حصہ اول مصنف کی تفسیر البیان ہیں سے سورہ فاتحہ کی تفسیر ہے اور حصہ دوم سورہ فاتحہ سے لے کر انعام تک کا تفسیری ترجمہ ہے۔ مصنف کی دیدہ وری اور نکتہ پژوہی کا اصل جولانگاہ پہلا حصہ ہے۔ یہ درحقیقت نصف کتاب ہے۔ اس میں سورہ فاتحہ کے ایک ایک لفظ کی ایسی دل نشیں تشریح اور بصیرت افزا تفسیر ہے کہ اس سورہ کے ام الکتاب واصل قرآن ہونے کا مسئلہ مشاہدۃً معلوم ہونے لگتا ہے اور اسلام کے تمام مہمات مسائل اور اصول دین پر ایک تبصرہ ہو جاتا ہے۔ خصوصاً قرآن پاک کے طرز استدلال خالق کائنات کی ربوبیت و رحمت کے آثار و دلائل اتنی تفصیل سے لکھے ہیں کہ مصنف کی وسعت علم و نظر کی داد بے اختیار دینی پڑتی ہے۔ امام غزالی نے الحکمۃ فی مخلوقات اللہ تعالیٰ میں اور ابن قیم نے مفتاح دار السعادۃ میں اس بحث پر جو کچھ لکھا ہے اس سے زیادہ شرح و بسط اور مقتضیات زمانہ کی مطابقت سے ترجمان القرآن میں یہ بحث آگئی ہے۔ چنانچہ توحید اور دلائل توحید نیز تخلیق بالحق الہدی اور الدین کی مصنف نے جو قرآنی تشریحیں کی ہیں وہ اگر ایک طرف کلمہ پرور ہیں تو دوسری طرف ایمان پرور ہیں۔

۵۔ ترجمان القرآن وقت کی اہم چیز ہے۔ ضرورت ہے اس کو گھر گھر پھیلایا جائے اور نوجوانوں کو اس کے مطالعہ کی ترغیب دی جائے۔

سید صاحب نے اس سے پہلے 'وسعت تاثر' کے زیر عنوان مولانا کی رانچی میں نظربندی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

"رانچی ایک ایسا مقام تھا جہاں مسجدیں بے چراغ تھیں وہاں ایک خورشید سے دیر و حرم سب میں اُجالا ہوگیا۔ مولانا نے نظربندی کا یہ زمانہ جس عزم و استقلال، استغنا اور قوت ایمان کے ساتھ بسر کیا وہ ائمہ سلف کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔"

اسی مضمون کے آخر میں سید صاحب رقمطراز ہیں کہ ان سطروں کو لکھتے وقت مجھ کو یہ دھوکا ہو رہا ہے

کہ کیا میں خود ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ یا شمس الائمہ سرخسیؒ اور اسیہ بن عبدالعزیز اندلسیؒ کے حالات تو نہیں لکھ رہا ہوں۔

سجاد علی انصاری نے لکھا:

۱۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ کا دماغ ان معجزات میں سے ہے جو کارکنان قضا و قدر کی حیرت انگیز کرشمہ سازیوں کو نمایاں کرتے رہتے ہیں۔

۲۔ ہندوستان میں مذہب و سیاست کے اعتبار سے جامعیت کبھی اس سطوت و جبروت سے نمایاں نہیں ہوئی جو مولانا ابوالکلامؒ کی معجز نما شخصیت میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہے۔

۳۔ مولانا آزادؒ نے مسلمانوں کے روشن خیال طبقہ کو (اپنے اعجاز نگارش سے) بتایا کہ قرآن پاک میں غسل و عبادت کے علاوہ کائنات کے حقائق بھی پوشیدہ ہیں وہ محض تنبیہ و تہدید اور تکفیر و تعزیر نہیں (اصلاً منشور حیات ہے کہ انسان کو زندگی بسر کرنے کے لیے ان راہوں سے گزر کے کائنات کے حقائق کا ادراک ہوتا اور اپنے خالق کو پہچان کر ان احساسات پر تکمیل ذات ہوتی ہے) مولانا آزادؒ قرآن لے کر اٹھے تو مسلمان مبہوت ہو گئے (کہ تیرہ سو برس پہلے کے اس صحیفہ میں ہر زمانہ کے لیے دعوت و تذکرہ اور رشد و ہدایت کی روشنی موجود ہے)

ترجمہ کی خصوصیات

(۱) ترجمان القرآن دو جلدوں میں ہے۔ جلد اول کے ۲۰×۲۶/۸ سائز پر ۵۰۵ صفحات جلد دوم کے اسی سائز پر ۵۴۴ صفحات، کل ۱۰۴۹ صفحات ہیں سورہ فاتحہ کو سرمہ معفت نظرجان کر کئی ایک پاکستانی پبلشروں نے الگ شائع کیا۔ لیکن وہ ہندوستانی ایڈیشن کی نقل ہے اور نقل میں کتابت کی بے شمار غلطیاں ہیں۔ ہندوستانی ایڈیشن ساہتیہ اکیڈیمی نئی دہلی نے اردو ٹائپ میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم (صدر جمہوریہ ہند) اور پروفیسر محمد اجمل خان (سیکرٹری مولانا آزادؒ) کی زیر نگرانی چھاپا۔ اس کے ۵۵۳ صفحات ہیں اور سائز ۱۸×۲۲/۸۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے تین صفحہ کا پیش لفظ لکھا ہے۔ پروفیسر محمد اجمل خان کا نام ترتیب و مقدمہ کے زیر عنوان درج ہے۔ لیکن اس میں مقدمہ قسم کی کوئی چیز نہیں۔ اگر ترتیب سے مراد بعض چیزیں جو اس میں چھوٹ گئی تھیں ان کا اندراج ہے۔ مثلاً کتابت کی تصحیح، طباعت کی اصلاح، آیات کے نمبر، مباحث میں مندرجہ آیات کے اعراب، نمبروں کی جانچ، بعض آیات کا چھوٹا ہوا ترجمہ، احادیث نبوی عربی اشعار، مقولے اور بائیبل کے حوالوں کی درستی، یورپی مصنفین اور ان کی تصنیفات کا رومن حروف

میں نام، املاکی صحت اور عبارت کے رموز واوقاف وغیرہ تو یہ کام پروفیسر محمد اجمل خان نے تنہا انجام نہیں دیا۔ ڈاکٹر عبدالحمید خان صاحب، اور جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے استاد عربی مولوی احمد حسن خان بھی ان کے مددگار رہے ہیں۔ پروفیسر محمد اجمل نے تفسیر فاتحہ کے آخر میں دو صفحے کا استدراک لکھا پھر تین صفحے اور ڈیڑھ سطر میں مقدمۃ البیان کے بارھویں باب کی سورہ فاتحہ سے متعلق روداد بیان کی ہے۔

(۲) مولانا سے پہلے قرآن پاک کے تراجم، عربی آیات کے الفاظ کا تحتانی ترجمہ تھے۔ یعنی جس ترتیب سے سورہ کے الفاظ تھے۔ اسی ترتیب سے الفاظ کے نیچے ان کا ترجمہ تھا۔ ان ترجموں میں الفاظ کے معنوی معنوں کا التزام کیا جاتا لیکن اس طرح نہ تو کلام پاک کا زور پیدا ہوتا اور نہ وہ دل نشینی ابھرتی جو قرآن پاک کی دعوت کا سحر ہے۔ مولانا نے اس روش کو یک قلم موقوف کردیا۔ وہ اُردو زبان کے پہلے مترجم و مفسر ہیں جنہوں نے قرآن کا ترجمہ قرآن ہی کے الفاظ میں اس شکوہ سے کیا کہ داغ کا وہ شعر بامعنی ہو گیا ہے

احمد پاک کی خاطر تھی خدا کو منظور

ورنہ قرآن بھی آتا بزبان اُردو

سجاد علی انصاری نے کہا تھا کہ قرآن نازل نہ ہو چکا ہوتا تو مولانا ابوالکلام کی نثر اس کے لیے منتخب کی جاتی یا اقبالؒ کی نظم۔ سید سلیمان ندویؒ نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ترجمہ صحیح، دلنشیں، موثر اور باوقار ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی رقمطراز تھے کہ مولانا ابوالکلام الفاظ کو نبوت والوہیت کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔

غرض کہ مولانا نے اپنے ترجمہ اور تفسیر میں قرآن کا لہجہ اختیار کیا اور عربی آیات کو اُردو آیات بنا دیا۔ اس سے پہلے یہ سحر اور کسی ترجمہ و تفسیر میں نہیں۔ اس ترجمہ کی ایک اور خصوصیت ہے کہ اس کی زبان کسی علاقے یا خطے کی زبان نہیں۔ جیسا کہ ڈپٹی نذیر احمد نے دہلی کی ٹکسالی زبان کا رنگ جمانا چاہا یا سرسید جو اُردو کو عوامی زبان بنانے میں اس کا عربی جامع آثار رہے تھے۔ مولانا نے اپنی تفسیر اور ترجمہ میں مسلمانوں کے ذہنی حرکات کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرآن ہی کی زبان استعمال کی ہے جس سے قرآن کی کشش قائم رہتی اور قاری محسوس کرتا ہے کہ وہ اردو میں قرات کر رہا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے عجمیوں کے استفسار پر کہا تھا کہ وہ عربی نہ جاننے کے باعث فارسی میں نماز پڑھ سکتے ہیں۔ مولانا کے ترجمہ سے قرآن کی دعوت کا تاثر اہل اُردو پر سحر کرتا اور عربی آہنگ قائم رہتا ہے۔ جو لوگ عربی نہیں جانتے وہ خود کو عربی فضا میں محسوس کرتے ہیں۔

(۳) مولانا کے ترجمہ و تفسیر نے ہندوستان کے غیر مسلموں میں بھی قرآن پڑھنے کی ترغیب پیدا کی۔ اس

سے پہلے وہ قرآن کو نہ پڑھتے اور نہ اس پر غور کرتے تھے اکا دکا پنڈت یا گیانی مناظرے یا مجادلے کے لیے قرآن پڑھتے تھے۔ مولانا کے تفسیر و ترجمہ کی ہمہ گیری نے تعلیم یافتہ ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں میں اس کے مطالعہ کا ذوق پیدا کیا جس سے ان کی نئی نسلوں اور بعض پرانے لوگوں میں اسلام آشنائی کی راہیں کھلیں اور وہ اسلام کے بارے میں جن بدگمانیوں کا شکار تھے وہ رفع ہوگئیں الا ان لوگوں کے جو مسلمانوں سے سیاسی اور معاشری طور پر برگشتہ یا بدظن تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ "مولانا کے ترجمان القرآن سے پہلے اُردو میں کوئی ترجمہ ایسا نہیں تھا۔ جو مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کے دلوں کو بھی کھینچ سکے"۔

اس لحاظ سے مولانا کا ترجمہ اور سورہ فاتحہ کی تفسیر بجائے خود اس دعوت کا احیاء ہے جو غیر مسلموں پر مسلمانوں کے سیاسی طرز عمل سے بند ہوگئی اور سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد اسلام میں نامسلموں کے لیے کوئی سی کشش نہ رہی بلکہ اُلٹا تنفر پیدا ہوگیا۔ راقم سے قید و بند کے طویل زمانہ میں بعض تعلیم یافتہ ہندوستانوں نے خود بیان کیا کہ وہ ترجمان القرآن کی معرفت نہ صرف لسانی اعتبار سے "مسلمان" ہو گئے بلکہ اسلام کی اصل تعلیم سے بھی آگاہ ہوئے کہ وہ ان تعصبات سے یکسر مختلف ہے جو پنڈتوں نے ان میں پیدا کیے اور وہ اسلام کو قہر و غضب کا ایک مذہب سمجھتے تھے۔ کانگرسیوں، سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں میں اکثر مقرر ترجمان القرآن کو ساتھ رکھتے کہ اس کے مطالعہ سے ان میں اُردو خطابت کا شکوہ پیدا ہوتا اور وہ قدرت بیان سے مالا مال ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین لکھتے ہیں کہ "مولانا کی زبان اور ان کے بیان میں غضب کی وہ دلکشی ہے جس نے ان کے ترجمے اور تفسیری اشارات میں اردو ادب کے ایک شاہکار کی شان پیدا کر دی ہے"۔

(۴) ذاکر صاحب کے الفاظ ہی میں "مولانا روح تفسیر کے محرم ہیں اور کلام الہٰی کے مطالب کو اس حکیمانہ انداز میں سمجھاتے ہیں جس سے نئے زمانہ کے تنقیدی ذہن کو بھی تسکین ہوجاتی ہے"۔ سورہ فاتحہ کی تفسیر میں مخاطبت کے لیے مولانا نے نئے زمانہ کے اس ذہن کو بہ طور خاص ملحوظ رکھا اور اکثر و بیشتر وقت کے بعض سوالوں کا جواب آگیا ہے فی الجملہ وہ تمام الجھاؤ رفع ہوتے ہیں جو اس دور کی عقلی اور علمی تحریکوں نے پیدا کیے ہیں۔

(۵) مولانا نے جلد اوّل کے آغاز میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کا یہ قول نقل کیا ہے۔

اِیُّ سماءٍ تظلنی و اِیُّ ارضٍ تقلنی اذا قلت فی کتاب اللہ ما لا اعلم۔

(ترجمہ) کونسا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا اور کونسی زمین مجھے اُٹھائے گی اگر میں اللہ کی کتاب سے متعلق کوئی ایسی بات کہوں جس کا مجھے صحیح علم نہیں۔

مولانا نے ترجمہ و تفسیر میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اس قول کو بکمال و تمام ملحوظ رکھا اور ٹھیک وہی مطالب بیان کیے ہیں جن سے اس زمانہ کی لب تشنگیاں سیراب ہو سکتی ہیں اور جن کی غایت ہی کلام الٰہی ہے۔ ترجمان القرآن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مولاناؒ نے اسرائیلیات اور عقلیات دونوں کو ترک کیا اور کلام الٰہی کی غایات پر تفسیر و ترجمہ کی نیو اُٹھائی ہے غالباً یہی چیز مولانا کو دوسرے مفسرین سے ممتاز کرتی ہے۔ کئی ایک روایتی علماء اس پر چیں بجبیں ہوئے حتیٰ کہ بعض صحیح الخیال علماء جو علم و نظر کے معاملوں میں لکیر کے فقیر تھے ان کے لیے بھی مولانا کا یہ طرز استدلال اور اسلوب بیان متقدمین کی طے شدہ راہوں سے بغاوت کے مترادف تھا۔ اور وہ اس کو قدماء کے طریق تفسیر سے متناقض سمجھتے تھے۔ مولانا کے اس اجتہاد پر ان علماء نے بھی انگشت نمائی کی جو ایک زمانہ میں مولانا کو امام الہند تسلیم کرتے تھے۔ چونکہ اپنی روایتی دینی تعلیم کے باعث وہ درس و افتا کی مسند پر فروکش تھے۔ لہٰذا کوئی نئی آواز جو وقت کے اُلجھاؤ دور کرتی ہو انہیں اس لیے قبول نہ تھی کہ اس کا ذکر قدما کے ہاں نہیں۔ اسی زمانہ میں "معارف" اعظم گڑھ میں بھی اس بحث کے بعض پہلو آئے تھے اور معارف ہی کے اہل قلم نے اس کا جواب دیا تھا۔

مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی علمائے اہلحدیث میں ایک نامور بزرگ تھے۔ انہوں نے "واضح البیان" میں مولانا کو ہدف تنقید بنایا اور جو کچھ لکھا اس کا رنگ مناظرانہ تھا۔ مولانا غلام رسول مہر ایڈیٹر انقلاب نے مولانا ابوالکلامؒ کو مطلع کیا اور وہ اعتراضات بھی لکھ دیئے جو مولانا ابراہیم نے ترجمان القرآن کی جلد اوّل پر فرمائے تھے۔ مولانا نے مہر صاحب کو ان اعتراضات کا جواب لکھا (۱۵ جنوری ۱۹۳۶ء) لیکن خط کے آخر میں تحریر کیا کہ براہ عنایت مجھے کتاب نہ بھیجیے میرا نہ دیکھنا ہی بہتر ہے۔ ۱۹۱۸ء میں میں نے جن تین باتوں کا عہد کیا۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ کسی شخص کو جو مناظرانہ طریقہ پر میرے خلاف کچھ لکھے گا نہ تو جواب دوں گا نہ اس کی شکایت سے اپنے نفس کو آلودہ ہونے دوں گا۔[۲]

اعتراض یہ تھا کہ سورہ فاتحہ کے بعض مطالب سے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ ایمان بالرسل ضروری

---

[۱] میرا عقیدہ از ابوالکلام آزادؔ، مطبوعہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ فروری ۱۹۵۹ء صفحہ ۲۰

نہیں اور اسلام کا نظام عبادت ہنگامی ہے۔

مہر صاحب لکھتے ہیں کہ مولانا کا جواب آیا تو اپنے فہم کی نارسائی اور علم کی بے مائیگی پر ندامت ہوئی۔

مولانا نے لکھا کہ:

"جس طرح اصلی دین کی دعوت کامل ہو چکی اور وہ تمام پچھلی دعوتوں کا جامع اور مشترک خلاصہ ہے ٹھیک اسی طرح شرع و منہاج کا معاملہ بھی کامل ہو چکا ہے اور وہ تمام شرائع کے مقاصد وعناصر پر جامع وحاوی ہے۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ اس بحث کا محل تفسیر سورہ فاتحہ یا سورہ بقرہ نہیں، سورہ احزاب ہے۔ یقیناً ایسا سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ تفسیر سورہ فاتحہ میں رمضان کے روزوں کی فرضیت کا بیان نہیں اس لیے مصنف کے نزدیک روزہ ہی فرض نہیں۔ مصنف نے سورہ فاتحہ کی تفسیر ایک خاص اسلوب پر لکھنی چاہی ہے۔ عقائد وفقہ کی کتاب لکھنے کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ سورہ فاتحہ کے بعد ایک سو تیرہ سورتیں اور بھی مع اپنے مقاصد ومطالب کے ہیں۔"[۱]

مولانا نے سورہ فاتحہ کی تفسیر کو اس کی اصل غایت وجود باری تعالیٰ کے اثبات میں پیش کیا ہے۔ اس کی حیثیت فی زمانہ کہ الحاد و زندقہ علمی تحریکوں کی شکل میں پھیل گئے ہیں، ایک ایسے منشور کی ہے جو خدا کی ہستی کا ادراک پیدا کرتا اور اس کے تصور رحمت و ربوبیت کو انسانی ذہن میں جما دیتا ہے۔

(۹) قرآن کی ابدی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ہر زمانہ کے مطابق بولتا ہے۔ اس نے کائنات کی تکوین سے لے کر اپنے نزول تک کے تمام مباحث کو سمیٹا ہی نہیں بلکہ جو کچھ علم و فکر اور فلسفہ و سائنس کے ہاتھوں انسان پر گزر رہا ہے اس کی مشکلوں کو حل کیا اور اس طرح رشد و ہدایت کی آخری کتاب ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ مسئلہ صرف اتنا ہے کہ خدا، انسان اور کائنات کا باہمی رشتہ کیا ہے اور وہ کون سے اصول و مبادی ہیں جو ایمان کامل اور عمل صالح کے آب و رنگ سے ایک ایسے معاشرہ کی بنیاد اٹھاتے ہیں جو ٹھیک ٹھیک قائم ہو جائے تو انسانی فکر و عمل کے لیے کسی موڑ پر کوئی سی کجی نہیں رہتی۔ سورہ فاتحہ کے اکثر مباحث کی اصل انہی نکات پر ہے۔

---

[۱] خط بنام مولانا غلام رسول مہر ماخوذ از میرا عقیدہ از ابوالکلام آزادؔ (صفحہ ۱۹)

(۷) سورۂ فاتحہ کی تفسیر کے مخاطب صرف مسلمان نہیں عام انسان ہیں یہی وجہ ہے کہ مولانا نے تمام راہوں سے ہٹ کر اس میں ان تمام مباحث پر قلم اٹھایا ہے جو فلسفہ و سائنس کی اس ماضی بیزار دنیا میں انسان کو درپیش ہیں۔ ہمارے وہ مفسرین جنہوں نے ان مباحث کو نظر انداز کیا یا قرآن کی تفسیر سے الگ رکھا وہ نہیں جان سکے کہ ان مسائل و مباحث کی فی زمانہ اہمیت کیا ہے؟

(۸) مولانا نے قرآن کی دعوت کو جس انداز، اسلوب اور پیرائے میں پیش کیا وہ بلاشبہ اس زمانہ کے عوارض کا علاج تھا۔ مولانا اس وقت دعوتِ قرآن لے کر نکلے جس وقت مسلمانوں کا انحطاط انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اور وہ ہندوستان میں سیاسی زوال اور مذہبی افلاس کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ مولانا کا اس زمانہ میں اولاً الہلال و البلاغ کے ذریعہ مخاطب ہونا، ثانیاً ترجمان القرآن کی معرفت ہم کلام ہونا ایک معجزاتی اسلوب تھا جو صرف قرآن ہی کی زبان سے بیان ہو سکتا تھا۔

(۹) ترجمان القرآن، قرآن کے اصولی مباحث کی از سر نو تدوین کے علاوہ اس کی مثالی زبان، اس کی ادبی خصوصیات، اس کے اسلوبِ بیان، اس کے مقاصد و مہمات، اس کے طریقِ استدلال، اس کے قصص و امثال اور اس کے نزول و کتابت کی روداد کا مرقع ہے جس سے مولفہ محاسن اجاگر ہو کر انسانی اذہان کو اجال دیتے ہیں۔

(۱۰) ترجمان القرآن کے طرزِ بیان کی خصوصیت کا اندازہ مولانا کے اس اعلان سے بھی ہوتا ہے کہ وہ اسے انگریزی اور فرانسیسی میں فوری طور پر منتقل کرنے کے متمنی تھے۔ ان کے سامنے فارسی، ترکی اور پشتو میں ترجمہ کا منصوبہ بھی تھا۔ اس کے علاوہ چاہتے تھے کہ بنگالی، گجراتی، مرہٹی، تامل، تلگو اور سندھی کے ترجمے ہو جائیں اور ہندی رسم الخط میں بھی اس کی اشاعت ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا نے تفسیر و ترجمہ محض مسلمانوں کی ضرورت کے لیے نہیں کیا بلکہ ان کے پیش نظر مذاہب کے لوگ تھے۔ اور وہ انہیں بتانا چاہتے تھے کہ قرآن کی دعوت کسی ایک ملت یا امت ہی کے لیے نہیں بلکہ ہر انسان اس کا مخاطب ہے۔

(۱۱) مولانا اصول ترجمہ و تفسیر کے تحت فرماتے ہیں ...... "ہر عہد کا مصنف اپنے عہد کی ذہنی آب و ہوا کی پیداوار ہوتا ہے اور اس قاعدے سے صرف وہی دماغ مستثنیٰ ہوتے ہیں جنہیں مجتہدانہ ذوق و نظر کی قدرتی بخشائش نے صفِ عام سے الگ کر دیا ہو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں سے لے کر قرونِ آخرہ تک جس قدر مفسر پیدا ہوئے ان کا طریقِ تفسیر ایک روبہ تنزل معیارِ فکر کی مسلسل زنجیر ہے۔ جس کی ہر پچھلی کڑی پہلی سے پست تر اور ہر سابق لاحق سے بلند تر واقع ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں جس

قدر اُوپر کی طرف بڑھتے جاتے ہیں حقیقت زیادہ واضح، زیادہ بلند اور اپنی قدرتی شکل میں نمایاں ہوتی جاتی ہے جس قدر نیچے اترتے آتے ہیں حالت برعکس ہوتی جاتی ہے۔ یہ صورت حال فی الحقیقت مسلمانوں کے عام دماغی تنزل کا قدرتی نتیجہ تھی انہوں نے جب دیکھا کہ قرآن کی بلندیوں کا ساتھ نہیں دے سکتے تو کوشش کی کہ قرآن کو اس کی بلندیوں سے نیچے اُتارلیں کہ ان کی پستیوں کا ساتھ دے سکے۔"

مولانا نے ترجمان میں قرآن کی حقیقی دعوت اور اس کی شکل و نوعیت سے وہ تمام پردے اُٹھائے جو مختلف عہدوں اور مختلف گوشوں کے خارجی موثرات نے اس کے چہرے پر ڈال دیئے تھے۔ مولانا نے دین کے مسئلہ میں کسی مکتب کے فہم و عمل کی پیروی نہیں کی بلکہ دین کی دعوت و تعلیم کا صحیح صحیح ابلاغ و اتباع کیا ہے۔

(۱۲) مولانا نے تفسیر و ترجمہ دونوں میں وہی طریق خطاب اور طریق استدلال اختیار کیا ہے جو انبیاء کرام علیہم السلام کے طریق ہدایت کا امتیاز رہا اور ان کے لیے بارگاہ ایزدی سے خاص ہو چکا تھا۔

(۱۳) مولانا فرماتے ہیں "قرآن جب نازل ہوا تو اس کے مخاطبوں کا پہلا گروہ ہی ایسا تھا کہ تمدن کے وضعی اور صناعی سانچوں میں ابھی اس کا دماغ نہیں ڈھلا تھا، فطرت کی سیدھی سادی فکری حالت پر قانع تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن اپنی شکل و معنی میں جیسا کہ واقع ہوا تھا ٹھیک ٹھیک ویسا ہی اس کے دلوں میں اُتر گیا اور اسے قرآن کے فہم و معرفت میں کسی طرح کی دشواری محسوس نہیں ہوتی۔ صحابہ کرام پہلی مرتبہ قرآن کی کوئی آیت یا سورت سنتے تھے اور سنتے ہی اس کی حقیقت پالیتے تھے۔ لیکن صدر اوّل کا دور ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ روم و ایران کے تمدن کی ہوائیں چلنے لگیں اور پھر یونانی علوم کے تراجم نے علوم و فنون وضعیہ کا دور شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جوں جوں وضعیت کا ذوق بڑھتا گیا قرآن کے فطری اسلوبوں سے طبیعتیں نا آشنا ہوتی گئیں، رفتہ رفتہ وہ وقت آگیا کہ قرآن کی ہر بات وضعی اور صناعی طریقوں کے سانچوں میں ڈھالی جانے لگی۔ چونکہ ان سانچوں میں وہ ڈھل نہیں سکتی تھی اس لیے طرح طرح کے الجھاؤ پیدا ہونے لگے اور پھر جس قدر کوششیں سلجھانے کی کی گئیں الجھاؤ اور زیادہ بڑھتے گئے۔"

مولانا نے ترجمان القرآن میں وضعیت کے انہی سانچوں کو توڑا اور وہ تمام الجھاؤ ختم کئے جو اسرائیلیات و عقلیات کی بدولت متقدمین کی تفسیر میں پیدا ہو چکے تھے اور جس کا تصنیفی شاہکار امام فخرالدین رازی کی تفسیر کبیر ہے کہ اس کی بدولت شکوک و ایرادات کے دروازے اس طرح کھلے کہ ان کا بند ہونا مشکل ہو گیا۔

(۱۴) مولانا نے ترجمان القرآن میں فلسفہ و منطق کے بجائے تلقین و اذعان کا فطری طریقہ اختیار کیا اور

یہی وہ طریق ہے جسے ہر دماغ وجدانی طور پر پالیتا اور ہر دل قدرتی طور پر قبول کر لیتا ہے۔ مولانا کی تفسیر میں قرآن کے دلائل و براہین کی ساری خوبروئی و دلنشینی بدرجہ اتم موجود ہے۔

(۱۵) ترجمان القرآن کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں پوری احتیاط کے ساتھ ایک ایسا طریق بیان اختیار کیا گیا ہے کہ الفاظ کم سے کم اور مطالب زیادہ سے زیادہ سمٹے ہوئے ہیں۔ کوئی چیز کم ہے تو وہ مطالب کا پھیلاؤ ہے۔ نفس مطالب میں کوئی سی کمی نہیں۔ ہر لفظ اور ہر جملے پر جس قدر غور کیا جائے مطالب و مباحث کے نئے دفتر کھلتے چلے جاتے ہیں۔

(۱۶) ترجمان القرآن کی جلد اوّل ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی پھر عرصہ بعد قلعہ احمد نگر میں بزمانہ قید اس پر نظر ثانی کی تو، فروری ۱۹۴۵ء کے تحریر شدہ دیباچہ میں بیان کیا کہ نظر ثانی کرتے وقت ہر دوسری تیسری سطر میں کوئی نہ کوئی تبدیلی کی گئی ہے اور تشریحی نوٹوں میں جا بجا اضافے کیے گئے ہیں۔ مولانا نے سورہ فاتحہ کی تفسیر میں بہت سے نکات کو سمیٹا ہے مثلاً یہ کہ سورہ فاتحہ میں دین حق کے تمام مقاصد کا خلاصہ موجود ہے اور دین حق کا ماحصل ان چار باتوں پر موقوف ہے۔

اوّل: خدا کی صفات کا ٹھیک ٹھیک تصور کیونکہ انسان کو خدا پرستی کی راہ میں جس قدر ٹھوکریں لگی ہیں وہ صفات ہی کے تصور میں لگی ہیں۔

دوم: قانون مجازات کا اعتقاد یعنی جس طرح دنیا میں ہر چیز کا ایک خاصہ اور قدرتی تاثیر ہے اسی طرح انسانی اعمال کے بھی معنوی خواص و نتائج ہیں۔ نیک عمل کا نتیجہ اچھائی اور بُرے کا برائی۔

سوم: معاد کا یقین یعنی انسان کی زندگی اسی دنیا میں ختم نہیں ہو جاتی اس کے بعد بھی زندگی ہے اور جزا کا معاملہ پیش آنے والا ہے۔

چہارم: فلاح وسعادت کی راہ اور اس کی پہچان۔ غرض سورہ فاتحہ کے سات بول سات آیتیں جنہیں اُم القرآن، الکافیہ الکنز اور اساس القرآن بھی کہا گیا ہے۔ اپنے خالق سے متعلق انسان کی ابدی جستجو اور اس سارے سفر کی آخری منزل کا سنگ میل ہیں۔ کہ انسان اس کے سوا نہ تو اپنے رب کا تصور کر سکتا ہے اور نہ خدا کا تصور اس کے بغیر قائم ہوتا ہے۔ اکثر قوموں اور ملکوں نے اللہ کے تصور کو اپنے حصار میں بند کر لیا اور خدا کو اپنا ہی رب گردانا تھا۔ لیکن اسلام نے خدا کے رب العالمین ہونے کی ہمہ گیر صدا کا اعلان کیا۔ اب تک لوگوں میں خدا کا تصور خوف یا دہشت کا تصور تھا۔ اسلام نے رحمت وعدالت کا تصور پیش کیا۔ مولانا نے اس مبحث میں

ایسے ایسے نکتے بیان کئے اور ایسی ایسی عبارتیں لکھی ہیں کہ علم و نظر میں تفصیل و اطناب کے دفتر مدون کئے جا سکتے ہیں

(۱۷) مولانا نے سورہ فاتحہ کو اُم القرآن کی حیثیت سے تفسیر و بیان کا موضوع بنایا اور ایک عالمی منشور کے طور پر پیش کیا ہے۔ ساری تفسیر ان لوگوں کی جستجو اور اضطراب کا جواب ہے جو اپنے رب کی تلاش میں عقل و فکر کے صحراؤں اور بیابانوں میں گھومتے پھرتے اور اس کی حقیقت جاننے میں کبھی سفر و منزل سے دُور ہو جاتے اور کبھی گمراہی و ضلالت میں کھو جاتے ہیں۔

(۱۸) مولانا نے وحدت ادیان کا جو تصور پیش کیا اور اس باب میں جو نکات بیان کئے، پھر اس پر جو گفتگو کی اس کے متعلق وقت کے سیاسی فتنوں نے مولانا کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا کہ وہ وحدت ادیان کے داعی ہیں، اور اس طرح اسلام ان کی "ناوک افگنی" سے مجروح ہوتا ہے۔

الدین اور الشرع کے زیر عنوان مولانا نے جو کچھ لکھا اس میں دعوت اسلام کے مخالفوں کی سرکشی بیان کی ہے کہ وہ اس لیے دعوت اسلام کے خلاف نہ تھے کہ وہ ان کے مذہب کو جھٹلاتا کیوں ہے، وہ اس لیے خلاف تھے کہ جھٹلاتا کیوں نہیں؟

مولانا نے اھدنا الصراط المستقیم کے مطالب میں ہدایت کی تشریحات کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سب ادیان اس کا سرچشمہ تھے لیکن ان کے پیروؤں نے دین کی وحدت بھلا دی اور شرع کے اختلاف کو بنا نزاع بنا لیا گویا اختلاف دین میں نہ تھا شرع و منہاج میں ہوا اور یہی پچھلے مذاہب کی گمراہی کا باعث ہو گیا سچائی اصلاً سب کے پاس تھی عملاً سب نے کھو دی قرآن کی زبان میں یہ تشیع و تحزب ہے اس کا مطلب ہے الگ الگ جتھے بنا لینا اور گروہ پرستی کی آلائشوں میں کھو جانا۔ اس کا نتیجہ وحدت انسانی کا ضیاع اور گروہ بندی کا ظہور تھا۔ جس نے انسانوں کو مخالف اور متخاصم طبقات میں تقسیم کر ڈالا۔

مولانا کے قلم سے بحث و نظر کا یہ پھیلاؤ اس غرض سے تھا کہ لوگوں نے اپنے مذاہب کی سچائیوں کو جس طرح گم کیا وہ اس کی نشاندھی کریں اور بتائیں کہ گمراہیاں تمہارے دین اور داعی کی نہ تھیں گمراہیاں تمہاری اپنی ہیں کہ تم نے اپنے ادیان کی سچائی کھو دی ہے۔ مولانا یہ سب دعوت و حکمت کے طریق سے بیان نہ کرتے تو فی زمانہ قرآن کی دعوت دینا مشکل تھا۔ قرآن کی دعوت پیغمبر اسلام کی اپنی دعوت نہ تھی۔ اور نہ ان کے اپنے مواعظ تھے۔ خدا کا کلام جو انہیں وحی کی معرفت ملا وہ ایک سچے رسول کی حیثیت سے پیش کر دیتے تھے۔ جب سبھی دین خدا کے تھے اور پیغمبر اسلامؐ سے پہلے خدا کے رسولوں کی معرفت قوموں کی راہنمائی کا ضابطہ

سمجھے تو یہ خیال کہ ان ادیان کا ذکر ہی نہ ہو اور دعوت الٰہی میں انسانی وحدت کی جو ترغیب و تلقین ہے وہ سرے سے بیان ہی نہ ہو ایک ذہنی گمراہی ہے۔

مولانا نے سورہ فاتحہ کی تفسیر میں عالمگیر انسانی معاشرے کی مخفی روح پر قرآن کی یہ حقیقت آشکار کی ہے کہ وہ مختلف مذاہب کے پیروؤں کو ان کے دین کی طرف بلاتا اور کہتا ہے کہ اپنی گم شدہ سچائیوں کی طرف لوٹ جاؤ کہ اب اس سچائی کا نام قرآن مجید ہے۔ قرآن کی اس دعوت کا لب لباب یہ تھا کہ جو لوگ اپنے ادیان سے منحرف ہو چکے تھے اپنے محرف دین کی حقیقتوں کے شناسا ہوں گے تو ان پر رشد و ہدایت کا دروازہ کھلے گا اور وہ بداہتہً دین الحق کی متابعت پر آمادہ ہوں گے۔ تم اس آدمی کو اصلی راستہ پر کیونکر چلا سکتے ہیں جو جانا چاہتا ہے مشرق اقصیٰ کو لیکن جا رہا ہے مغرب اقصیٰ کو۔ لازماً ایسا شخص تب ہی مشرق اقصیٰ تک پہنچے گا جب اس کی سمت اختیار کرے گا یوں سمجھو کہ اسلام سے پہلے جو ادیان تھے وہ ایک ابتدائی نصاب تھا جو قرآن حکیم سے منتہیٰ ہو کر مکمل ہوا۔ جب تک اس کے علم سے محروم ہو گے دین الحق نہ پا سکو گے اور نہ یہ جان سکو گے کہ تم ابتدائی کتاب سے آخری کتاب تک کیونکر پہنچے۔ قرآن خدائی تعلیم کی آخری کتاب ہے۔ مولانا نے مذاہب کے گمراہوں کو وحدت ادیان کی معرفت دین الحق کی طرف بلایا ہے اور یہ ایک ایسا طریق خطاب یا طریق استدلال ہے کہ پیغمبروں کی دعوت اسی انداز بیان سے مکمل ہوتی ہے۔

(۱۹) سورہ فاتحہ کی تفسیر میں رب العالمین، الرحمٰن، الرحیم اور مالک یوم الدین کے مطالب و معانی کا پھیلاؤ، مولانا کے علم کی گہرائی، فکر کی گیرائی اور نظر کی پہنائی کا معجزاتی اسلوب ہے۔ مولانا نے اس حسن و خوبی سے ان ہر چہار صفات ربانی کی تشریح کی ہے کہ انسان افکار کی وسعت اور استدلال کی بلاغت میں اس طرح کھو جاتا ہے کہ اس کا دماغ عقل کے آخری کنارے تک پہنچ کر وحی کی حقیقت سے آگاہ ہوتا اور جان لیتا ہے کہ قرآن پاک انسانی فلسفہ و کلام کی کتاب نہیں بلکہ الہیاتی رشد و ہدایت کا صحیفہ ہے۔ جو انسان کو عقل کے مخمصوں سے نجات دیتا اور حکمت کی راہ پر لاتا ہے۔ "ربوبیت کیا ہے" کے زیر عنوان تقدیر، ہدایت، ہدایت وجدان، ہدایت حواس، براہین قرآنیہ، دعوت تعقل، تخلیق بالحق، برہان ربوبیت، وحی و رسالت، اور وجود معاد کے اساسی مباحث فکر و نظر کی بہت سی گتھیاں حل کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر ربوبیت کے انعامات مثلاً رزق، پانی، ہوا وغیرہ کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس سے نسل انسانی کے مشترکہ استحقاق کی نشاندہی ہوتی ہے۔ خالق سب کا ہے تو اس کے انعام بھی سب کے لیے ہیں۔ اس طرح طبقاتی تقسیم کا جواز باطل ہو جاتا ہے

رب سب کا ہو لیکن ربوبیت سب کے لیئے نہ ہو کیونکہ ممکن ہے ؟ اللہ کا رزق نسل انسانی کے لیے اس کا مشترکہ انعام ہے اس پر کسی جماعت کا قبضہ طبقاتی سماج کو پیدا کرتا ہے جو بلاشبہ تعلیمات ربانی کی خلاف ورزی ہے۔

(۲۰) ہدایت کی بحث میں ایک دلچسپ خیال کئی فکری مشکلوں کو حل کرتا ہے۔ جب ہر چیز کے لیے ہدایت ہے تو انسانوں کے لیے ہدایت کیوں نہیں ؟ رسول منشائے ایزدی کے مظہر ہوتے ہیں اگر مادیئین کے نزدیک راہنما وقتی ضرورتوں کی پیداوار ہیں تو رسالت و نبوت منشائے خداوندی کے تحت مخلوق کی ہدایت و سعادت کا منصب ہے

(۲۱) الرحمن والرحیم کے مباحث اتنے جامع ہیں کہ ان کی وسعت ، تنوع اور اعجاز نہ صرف قرآن کے طرز مخاطبت کی ٹھیک ٹھیک تصویر ہیں بلکہ ان کا اسلوب بیان دلکشی اور دل نشینی کی معراج پر ہے۔ ایک دوسری چیز جو ان مباحث سے اُبھرتی ہے وہ مولانا کی بیان و زبان پر قدرت کاملہ ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو زبان کی جامعیت میں اظہار و بیان کی پوری توانائی کارفرما ہے اور وہ سحر کی تاثیر رکھتی ہے۔ زبان کا یہ حسن تاثیر کلام کا منتہیٰ ہے۔ کسی مرحلے یا موڑ میں احساس تک نہیں ہوتا کہ فلاں چیز بیان نہیں ہو سکی۔ زبان نے عجز کے باعث استدلال کو ادھورا چھوڑ دیا ہے۔ انسان پڑھتا اور جھومتا ہے گویا انعام ایزدی سے بہرہ مند ہو رہا ہے۔ اور احسان کی منزل میں ہے۔

(۲۲) مولانا نے عیسائیوں کے لیے "انجیل اور قرآن" کے زیر عنوان ایک ایسی راہ کھولی ہے جو قرآن سے متعلق ان کی گمراہیوں کا ازالہ کرتی ہے۔ اس بحث میں دعوت مسیح کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے بائبل کے معتقدوں اور نکتہ چینوں کی ٹھوکروں کو واضح کیا اور بتایا ہے کہ حضرت مسیحؑ کی تعلیم کو فطرت انسان کے خلاف سمجھنا بھی تفریق بین الرسل ہے۔

(۲۳) مالک یوم الدین کی بحث میں دین کے لفظ کی پوری سرگزشت لکھ دی ہے اور اس کی نسبت سے جزا کی حقیقت پر ایسی روشنی ڈالی ہے کہ مجازات عملی کا پورا نقشہ واضح ہو جاتا اور ہر چیز صاف ہو جاتی ہے۔ مادیت کی طرح معنویات کے بھی خواص و نتائج ہیں مثلاً "ربوبیت پرورش کرتی ہے۔ رحمت افادہ و فیضان کا سرچشمہ ہے اور عدالت سے بناؤ اور خوبی ظہور میں آتی اور نقصان و فساد کا ازالہ ہوتا ہے۔

اسی بحث میں ظلم، طغیان، اسراف، تبذیر، فساد اور اعتداء و عدوان کے معنی بیان کیے ہیں کہ معاشرہ ان عوارض کے وجود و ظہور ہی سے خراب ہوتا ہے۔

(۲۴) صفات الٰہی کے تصور سے متعلق مولانا نے غور و فکر اور مطالعہ و علم کی جو وادیاں قطع کی ہیں اور زمانہ حال کی تحقیقات پر نقد و نظر کی جو عمارت اٹھائی ہے پھر جس عمق سے مختلف اقوام و ممالک کے تصور الٰہیات کا احاطہ کیا ہے اور ان تمام مباحث کو سمیٹ کر قرآن کے تصورِ الٰہ کی تشریحات و تصریحات کی ہیں غالباً دنیا کے کسی ادب میں ایسی سیر حاصل بحث نہیں۔ اس پورے سلسلہ کے فکری عناصر کی تحلیل کرتے ہوئے مولانا نے ارتقائی تصور کے نکات ثلاثہ کی صراحت کی ہے کہ خدا کا تصور ان مرحلوں سے گزر چکا ہے۔

۱۔ تجسم سے تنزیہہ کی طرف

۲۔ تعدد و اشراک سے توحید کی طرف

۳۔ صفات قہر و جلال سے صفات رحم و جمال کی طرف

ان تینوں کی صراحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ظہور قرآن کے وقت پانچ دینی تصور فکر انسانی پر چھائے ہوئے تھے۔

(۱) چینی (۲) ہندوستانی (۳) مجوسی (۴) یہودی (۵) مسیحی۔

ان پانچوں مذاہب پر طویل ترین معلوماتی اور تجزیاتی حاشیے لکھے ہیں۔ ایک سو ساٹھ اپنشدوں سے متعلق مولانا نے بحث و نظر کی جو عمارت اٹھائی ہے اور اس ضمن میں بعض الفاظ کی مختلف لسانی شکلوں کی جو وضاحت کی ہے اس سے نہ صرف ان الفاظ و مصطلحات کی اصلیت کا انکشاف ہوتا ہے بلکہ عقائد و نظریات کے ماخذ بھی سامنے آجاتے ہیں۔

مولانا نے صفات الٰہی کے اس جائزے میں امام جوینی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ "میری ماں نے جو عقیدہ سکھلایا تھا۔ اس پر دنیا سے جا رہا ہوں"۔ اس کے علاوہ امام فخر الدین رازی کی آخری تصنیف سے اقتباس ذیل درج کیا ہے کہ:

"میں نے علم کلام اور فلسفے کے تمام طریقوں کو خوب دیکھا بھالا لیکن بالآخر معلوم ہوا کہ نہ تو ان میں کسی بیمار کے لیے شفا ہے نہ کسی پیاسے کے لیے سیرابی۔ سب سے بہتر اور حقیقت سے نزدیک تر راہ وہی ہے جو قرآن کی راہ ہے۔"

(۲۵) "اھدنا الصراط المستقیم" کی تفسیر میں مولانا نے تکوین وجود کے چار مرتبے بیان کئے ہیں اور (۱) تخلیق (۲) تسویہ (۳) تقدیر (۴) ہدایت۔ ہدایت کیا ہے؟ وجدان کیا ہے؟ اور جوہر عقل کیا ہے؟ ان تینوں کے

ذکر میں غور و فکر کا ایک خزانہ جمع کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں: "دعوت قرآنی کی تین بہمات ہیں (۱) انسان کی نجات وسعادت کا دارومدار اعتقاد وعمل پر ہے نہ کہ کسی خاص گروہ بندی پر (۲) نوع انسانی کے لیے دین الٰہی ایک ہی ہے اور یکساں طور پر سب کو اسی کی تعلیم دی گئی ہے۔ پس یہ جو پیروان مذاہب نے دین کی وحدت اور عالم گیر حقیقت ضائع کر کے بہت سے متخالف و متخاصم جتھے بنا لیے ہیں یہ صریحاً گمراہی ہے (۳) اصل دین توحید ہے یعنی ایک پروردگار عالم کی براہ راست پرستش کرنی اور تمام بانیان مذاہب نے اسی کی تعلیم دی ہے۔ اس کے خلاف جس قدر عقائد و اعمال اختیار کر لیے گئے ہیں اصلیت سے انحراف کا نتیجہ ہیں"۔

(۲۶) مولانا نے قرآن پاک اور پیروان مذاہب کے مابین نزاع کے تین اصول بیان کیے ہیں۔

۱۔ وہ مذہبی گروہ بندی کا مخالف تھا۔ اور دین کی وحدت یعنی ایک ہونے کا اعلان کرتا تھا۔ اگر پیروان مذاہب یہ مان لیتے تو انہیں تسلیم کر لینا پڑتا کہ دین کی سچائی کسی ایک گروہ کے حصے میں نہیں آئی ہے۔ سب کو یکساں طور پر ملی ہے لیکن یہی ماننا ان کی گروہ پرستی پر شاق گزرتا تھا۔

۲۔ قرآن کہتا تھا: نجات اور سعادت کا دارومدار اعتقاد و عمل پر ہے۔ نسل، قوم، گروہ بندی اور ظاہری رسم اور ریت پر نہیں ہے اگر یہ اصل وہ تسلیم کر لیتے تو پھر نجات کا دروازہ بلا امتیاز تمام نوع انسانی پر کھل جاتا اور کسی ایک مذہبی جتھے کی ٹھیکے داری باقی نہ رہتی لیکن اس بات کے لیے ان میں سے کوئی بھی تیار نہ تھا۔

۳۔ وہ کہتا تھا اصل دین خدا پرستی ہے اور خدا پرستی یہ ہے کہ ایک خدا کی براہ راست پرستش کی جائے لیکن پیروان مذاہب نے کسی نہ کسی شکل میں شرک و بت پرستی کے طریقے اختیار کر لیے تھے۔ اور گو انہیں اس بات سے انکار نہ تھا کہ اصل دین خدا پرستی ہی ہے۔ لیکن یہ بات شاق گزرتی تھی کہ اپنے مالوف اور معتاد طریقوں سے دستبردار ہو جائیں۔

(۲۷) مولانا نے قرآن کی دعوت کا ذکر کرتے ہوئے اس کی تفصیلات کا خلاصہ جن نو (۹) جامع نکات میں پیش کیا ہے انہی کے الفاظ میں وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ نزول قرآن کے وقت دنیا کا مذہبی تخیل اس سے زیادہ وسعت نہیں رکھتا تھا کہ نسلوں، خاندانوں اور قبیلوں کی معاشرتی حد بندیوں کی طرح مذہب کی بھی ایک خاص گروہ بندی کر لی گئی تھی۔ ہر گروہ بندی کا آدمی سمجھتا تھا دین کی سچائی صرف اسی کے حصے میں آئی ہے۔ جو انسان اس کی مذہبی حد بندی

میں داخل ہے نجات یافتہ ہے جو داخل نہیں نجات سے محروم ہے۔

۲۔ ہر گروہ کے نزدیک مذہب کی اصل و حقیقت محض اس کے ظاہری اعمال و رسوم تھے۔ جونہی ایک انسان انہیں اختیار کر لیتا یقین کیا جاتا کہ نجات و سعادت اسے حاصل ہو گئی۔ مثلاً عبادت کی شکل، قربانیوں کے رسوم، کسی خاص طعام کا کھانا یا نہ کھانا، کسی خاص وضع کا استعمال کرنا یا نہ کرنا۔

۳۔ چونکہ یہ اعمال و رسوم ہر مذہب میں الگ الگ تھے اور ہر گروہ کے اجتماعی مقتضیات یکساں نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے ہر مذہب کا پیرو یقین کرتا تھا۔ کہ دوسرا مذہب مذہبی صداقت سے خالی ہے۔ کیونکہ اس کے اعمال و رسوم ویسے نہیں جیسے خود اس نے اختیار کر رکھے ہیں۔

۴۔ ہر مذہبی گروہ کا دعویٰ صرف یہی نہ تھا کہ وہ سچا ہے جب کہ یہ بھی تھا کہ دوسرا جھوٹا ہے۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہر گروہ صرف اتنے ہی پر قانع نہیں رہتا کہ اپنی سچائی کا اعلان کرے بلکہ یہ بھی ضروری سمجھتا کہ دوسروں کے خلاف تعصب و نفرت پھیلائے۔ اس صورتِ حال نے نوعِ انسانی کو ایک دائمی جنگ و جدل کی حالت میں مبتلا کر دیا تھا۔ مذہب اور خدا کے نام پر ہر گروہ دوسرے گروہ سے نفرت کرنا اور اس کا خون بہانا جائز سمجھتا۔

(۵) قرآن نے نوعِ انسانی کے سامنے مذہب کی عالمگیر سچائی کا اصول پیش کیا یعنی :

ا۔ اس نے صرف یہی نہیں بتایا کہ ہر مذہب میں سچائی ہے بلکہ صاف صاف کہہ دیا کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔ اس نے کہا : دین خدا کی عام بخشش ہے۔ اس لیے ممکن نہیں کہ کسی ایک جماعت ہی کو دیا گیا ہو اور دوسروں کا اس میں کوئی حصہ نہ ہو۔

ب۔ اس نے کہا کہ خدا کے تمام قوانینِ فطرت کی طرح انسان کی روحانی سعادت کا قانون بھی ایک ہی ہے اور سب کے لیے ہے۔ پس پیروانِ مذہب کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ انہوں نے دینِ الٰہی کی وحدت فراموش کر کے الگ الگ گروہ بندیاں کر لی ہیں۔ اور ہر گروہ بندی دوسری گروہ بندی سے لڑ رہی ہے۔

ج۔ اس نے بتایا کہ خدا کا دین اس لئے تھا کہ نوعِ انسانی کا تفرقہ اور اختلاف دور ہو۔ اس لیے نہ تھا کہ تفرقہ و نزاع کی علت بن جائے۔ پس اس سے بڑھ کر گمراہی اور کیا ہو سکتی ہے کہ جو چیز تفرقہ دور کرنے کے لیے آئی تھی اسی کو تفرقہ کی بنیاد بنا لیا ہے۔

د۔ اس نے بتایا کہ ایک چیز دین ہے ایک شرع و منہاج ہے۔ دین ایک ہی ہے اور ایک ہی طرح پر سب کو دیا گیا ہے۔ البتہ شرع و منہاج پر اختلاف ہوا اور یہ اختلاف ناگزیر تھا۔ کیونکہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی۔ اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام و اعمال بھی اس کے لیے اختیار کیے جائیں۔ پس شرع و منہاج کے اختلاف سے اصل دین مختلف نہیں ہو جا سکتے تم نے دین کی حقیقت تو فراموش کر دی ہے۔ محض شرع و منہاج کے اختلاف پر ایک دوسرے کو جھٹلا رہے ہو۔

ھ۔ اس نے بتلایا کہ تمہاری مذہبی گروہ بندیوں اور ان کے ظواہر و رسوم کو انسانی نجات و سعادت میں کوئی دخل نہیں۔ یہ گروہ بندیاں تمہاری بنائی ہوئی ہیں۔ ورنہ خدا کا ٹھہرایا ہوا دین تو ایک ہی ہے۔ وہ دین حقیقی کیا ہے؟ وہ کہتا ہے ایمان اور عمل صالح کا قانون۔

و۔ اس نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ اس کی دعوت کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمام مذاہب برحق ہیں۔ لیکن پیروان مذہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں۔ اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی از سر نو اختیار کر لیں تو میرا کام پورا ہو گیا۔ اور انہوں نے مجھے قبول کر لیا۔ تمام مذاہب کی یہی مشترک اور متفقہ سچائی ہے۔ جسے وہ "الدین" اور "الاسلام" کے نام سے پکارتا ہے۔

ز۔ وہ کہتا ہے: خدا کا دین اس لیے نہیں ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے نفرت کرے بلکہ اس لیے ہے کہ ہر انسان دوسرے انسان سے محبت کرے۔ اور سب ایک ہی پروردگار کے رشتہ عبودیت میں بندھ کر ایک ہو جائیں۔ وہ کہتا ہے جب سب کا پروردگار ایک ہے۔ جب سب کا مقصود اسی کی بندگی ہے، جب ہر انسان کے لیے وہی ہوتا ہے جیسا کچھ اس کا عمل ہے تو پھر خدا اور مذاہب کے نام پر یہ تمام جنگ و نزاع کیوں ہے؟

(۶) مذاہب عالم کا اختلاف صرف اختلاف ہی کی حد تک نہیں رہا بلکہ باہمی نفرت و مخاصمت کا ذریعہ بن گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ مخاصمت کیونکر دور ہو؟ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ تمام پیروان مذاہب اپنے دعوی میں سچے مان لیے جائیں کیونکہ ہر مذہب کا پیرو صرف اسی بات کا مدعی نہیں ہے کہ وہ سچا ہے بلکہ اس کا بھی مدعی ہے کہ دوسرے جھوٹے ہیں۔ پس اگر ان کے دعاوی مان لیے جائیں تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر مذہب بیک وقت سچا بھی ہے اور جھوٹا بھی ہے۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ سب کو جھوٹا قرار دیا جائے کیونکہ اگر تمام مذاہب جھوٹے ہیں تو پھر مذہب کی سچائی ہے کہاں؟ پس اگر صورت رفع نزاع کی ہو سکتی ہے تو وہ وہی

ہے جس کی دعوت لے کر قرآن نمودار ہوا ہے۔ تمام مذاہب سچے ہیں۔ کیونکہ اصل دین ایک ہی ہے اور سب کو دیا گیا ہے۔ لیکن تمام پیروان مذاہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے دین کی حقیقت اور وحدت ضائع کر دی ہے اور اپنی گمراہیوں کی الگ الگ ٹولیاں بنالی ہیں۔ اگر ان گمراہیوں سے لوگ باز آ جائیں اور اپنے اپنے مذہب کی حقیقی تعلیم پر کاربند ہو جائیں تو مذاہب کی تمام نزاعات ختم ہو جائیں گی۔ پھر ہر گروہ دیکھ لے گا کہ اس کی راہ بھی اصلاً وہی ہے جو ان تمام گروہوں کی راہ ہے۔ قرآن کہتا ہے تمام مذاہب کی یہی مشترک اور متفقہ حقیقت "الدین" ہے اور یہی نوع انسانی کے لیے حقیقی دین ہے اور اسی کو وہ "السلام" ؏

(۷) نوع انسانی کی باہمی یگانگت اور اتحاد کے جتنے رشتے بھی ہو سکتے تھے سب انسانوں کے ہاتھوں ٹوٹ چکے۔ سب کی نسل ایک تھی مگر ہزاروں نسلیں ہو گئیں۔ سب کی ذہنیت ایک تھی مگر بے شمار قومیتیں بن گئیں سب کی وطنیت ایک تھی لیکن سینکڑوں وطنیتوں میں بٹ گئے۔ سب کا درجہ ایک تھا لیکن امیر و فقیر شریف و وضیع اور ادنی و اعلیٰ کے بہت سے درجے ٹھہرا لئے گئے ایسی حالت میں کونسا رشتہ ہے جو ان تمام تفرقوں پر غالب آسکتا ہے اور تمام انسان ایک ہی صف میں کھڑے ہو جا سکتے ہیں ؟

قرآن کہتا ہے کہ خدا پرستی کا رشتہ ہی ایک رشتہ ہے جو انسانیت کا بچھڑا ہوا گھرانا پھر آباد کر سکتا ہے۔ یہ اعتقاد کہ ہم سب کا پروردگار ایک ہی پروردگار ہے اور ہم سب کے سر اسی ایک چوکھٹ پر جھکے ہوئے ہیں۔ یک جہتی اور یگانگت کا ایسا جذبہ پیدا کر دیتا ہے کہ ممکن نہیں کہ انسان کے بنائے ہوئے تفرقے اس پر غالب آسکیں۔

الغرض قرآن کا سپر مین (SUPRA MAN) جو مولانا کے ان مباحث میں عالم گیر انسانیت کا مظہر ہے ٹھیک ٹھیک وہی انسان ہے جس کی تخلیق ایمان کامل اور عمل صالح سے ہوتی ہے۔

(۲۸) جلد اول الفاتحہ سے الانعام تک ہے۔ اور جلد دوم الاعراف سے المومنون تک۔ اوپر کے اشارات جلد اول سے ماخوذ ہیں۔ ظاہر ہے کہ جلد اول کا نشہ پارہ سورہ فاتحہ کی تفسیر ہی ہے لیکن جلد دوم کے اشارات بجائے خود کئی کتابوں کا پھیلاؤ رکھتے ہیں اور انہیں الگ عنوان بنا کر طویل و بسیط مقالے لکھے جا سکتے ہیں۔

مولانا فرماتے ہیں کہ "انسانی گمراہی کا سب سے بڑا سرچشمہ آباؤ اجداد کی اندھی تقلید ہے۔ جہاں

یک دین کا تعلق ہے اس کی بنیادی اصلیں تین ہیں۔ عمل میں اعتدال، عبادت میں توجہ اور خداپرستی میں اخلاص!

بعض نکات کے ضمن میں فرمایا:

۱۔ ظالم و مستبد حکمرانوں کا تسلط بھی خدا کا ایک عذاب ہے جس میں غافل قومیں مبتلا ہوتی ہیں۔

۲۔ معرفت حقیقت کے دو طریقے ہیں۔ اولاً فکر ثانیاً نظر۔ فکر یہ کہ خدا کی دی ہوئی عقل سے کام لیں اور اپنے اندر سوچیں، سمجھیں۔ نظر یہ کہ کارخانہ ہستی کے عجائب و دقائق کا مشاہدہ کریں اور اس سے بصیرت پائیں۔

۳۔ دین کے معاملہ میں جبر و اکراہ نہیں فہم و اذعان ضرور ہیں۔

۴۔ جزیہ کا حکم مذہبی رواداری و فیاضی کا ایک ایسا معاملہ ہے جس کی کوئی سی نظیر تاریخ اقوام میں نہیں ملتی ہے۔

۵۔ یورپ کے ذہنی ارتقاء کا دور اصلاح کینہ کی تحریک سے شروع ہوا اور اصلاح کینہ کی تاریخ سورہ براءت کے نزول سے شروع ہوئی۔

۶۔ زکوۃ کا نظم انفرادی نہیں، اجتماعی ہے۔ یہ ایک ٹیکس ہے جو حکومت کو ادا کرنا چاہیے نہ یہ کہ خود نکالنا اور خرچ کر دینا۔

۷۔ قرآن کے چار وصف ہیں جن پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا گیا (۱) موعظت (۲) شفاء (۳) ہدایت (۴) رحمت۔

۸۔ دین اللہ کا ہے۔ ملت کی تشکیل پیغمبر کرتے ہیں۔ پیغمبر کے ذمہ ابلاغ ہے۔ محاسبہ اللہ کا کام ہے۔ قرآن نے تاریخ کو ایام اللہ سے تعبیر کیا ہے۔

۹۔ صبر کے معنی ہیں مشکلوں اور مصیبتوں کے مقابلہ میں جمے رہنا۔ شکر کے معنی ہیں اللہ کی بخشی ہوئی قوتوں کی قدر کرنا اور انہیں ٹھیک کام میں لانا۔

(۲۹) قرآن اور سوشلزم کے زیر عنوان "التوبہ" کے ترجمہ میں مولانا نے جو لکھا وہ تفسیر قرآن کی پہلی صدا ہے۔ جو وقت کی اس سب سے بڑی سیاسی و اقتصادی تحریک سے متعلق بلند ہوئی۔

سورہ المومنون کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

(۱) قرآن کی یہ اصل عظیم کہ دولت اللہ کا سب سے بڑا فضل ہے اگر جماعت میں پھیلی ہوئی ہو اور سب سے بڑا فتنہ ہے اگر صرف چند افراد کے قبضہ میں چلی گئی ہو اس لیے وہ ہر جگہ دولت مند افراد کو فساد و گمراہی کا ذمہ دار قرار دیتا ہے اور کہتا ہے فساد کا اصل سرچشمہ وہی ہیں۔

سورۃ توبہ کی تفسیر میں قرآن اور سوشلزم کے متعلق نہایت جامع اشارے کیے ہیں، فرماتے ہیں کہ:

(۱) معیشت کے لحاظ سے تمام افراد و طبقات کی حالت یکساں نہیں ہو سکتی۔ اور یہ عدم یکسانیت بعض حالتوں میں قدرتی ہے۔ کیونکہ سب کی جسمانی و دماغی استعداد یکساں نہیں اور جب استعداد یکساں نہیں تو ناگزیر ہے کہ جدوجہد معیشت کے ثمرات بھی یکساں نہ ہوں۔ بالفاظ دیگر انفرادی ملکیت کا حق تسلیم کر لیا جائے کہ جو جس قدر حاصل کر سکتا ہے وہ اس کا ہے۔ البتہ ریاست پر فرض ہے کہ وہ دولت اور وسائل دولت کا احتکار روکے اور ہر فرد کی ضروریات زندگی اس کے فرائض کا حصہ ہوں۔

(۲) مارکسی نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ انفرادی ملکیت ختم کر دی جائے۔ اور ایسا نظام لایا جائے جو ہر لحاظ سے عدم طبقاتی ہو کر اقتصادی و معیشی مساوات کی حالت پیدا ہو جائے اور وسائل دولت تمام تر قومی ملکیت ہو جائیں انفرادی قبضہ باقی نہ رہے۔

مولانا کے نزدیک پہلی بات فطرت انسانی کے مطابق ہے۔ اس میں ایک شر کو ختم کرنے سے دوسرا کوئی شر پیدا نہیں ہوتا۔ معاشرہ میں توازن و اعتدال رہتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ دنیا کا اس وقت تک کا تجربہ قومی ملکیت کے اشتراکی تجربہ کی تائید نہیں کرتا بلکہ اس کے خلاف ہے اور نہ روس ہی اپنے دعویٰ کی اب تک تکمیل کر سکا ہے لیکن سوشلزم کو اس مطالبہ کا حق ہے کہ مزید تجربہ کا موقع دیا جائے۔ کیونکہ جو لوگ سوشلزم کے جدلیاتی فلسفہ کے سحر میں مبتلا ہیں ان کے لیے تجربہ ہی بہترین استاد ہو سکتا ہے۔

(۳۰) فرمایا ـــــ کلام و خطاب کے تین طریق ہیں۔

۱۔ ارباب دانش کو حکمت کے ساتھ مخاطب کرو۔

۲۔ عوام کو موعظت کے ساتھ۔

۳۔ ارباب خصومت سے جدل کی بھی اجازت ہے لیکن بطریق احسن۔

فرمایا عربی میں شئے کا اطلاق نہ صرف ان چیزوں پر ہوتا ہے جو جسم و حجم رکھتی ہوں بلکہ ہر بات اور ہر حادثہ پر ہوتا ہے حتیٰ کہ دروازہ کھلنے کی آواز کو بھی شئے کہیں گے۔

(۳۱) حضرت یوسف علیہ السلام کے ابتلا و اقتدار اور امرأۃ العزیز کے عشق وغیرہ کی داستان سورئہ میں مولانا نے پہلے مفسروں کی غلطیوں کو استدلال سے بیان کیا اور اس ضمن میں عورت پر کید کے الزام اور مرد کی معصومیت کو اس طرح جھاڑا ہے کہ ان کے نزدیک جنسی بے راہ رویوں کے دائرہ میں سب سے بڑا کید مرد کا ہے۔ مولانا نے یہودیوں اور عیسائیوں کے اس عقیدہ کی از روئے قرآن تردید کی ہے کہ پہلا گناہ عورت سے سرزد ہوا اس بحث میں ثابت کیا ہے کہ عورت کے حقوق مرد کے برابر ہیں۔ تفاوت فرائض میں ہے، حقوق میں نہیں۔ مولانا نے اس سلسلہ میں اس آزادی و مساوات کو نہایت شرح و بسط سے بیان کیا ہے جو تاریخ انسانی میں اسلام نے پہلی دفعہ عورت کو عطا کی اور اس کی ذمہ داری معاشرہ میں برابر کی ہو گئی۔

(۳۲) اصحاب کہف کا پورا قصہ مولانا نے جدید تحقیقات کی استدلالی روشنی میں قلمبند کیا اور اس سلسلہ میں بعض قصص، وقائع اور مباحث سے یکسر اختلاف کیا ہے۔ مولانا نے اس بحث میں سائرس (ایران) کے سوانح و افکار پر روشنی ڈالی اور زردشت کی تعلیمات کا ذکر کرتے ہوئے اس کو دین زردشتی کا پہلا حکمران لکھا ہے۔ اس سلسلہ میں یاجوج ماجوج کی داستان بھی بیان کی ہے جس سے مختلف قبائل کے اقوال بھی زیر بحث آ گئے ہیں۔ اسی میں ذوالقرنین کی شخصیت سے پردہ اٹھایا ہے۔

(۳۳) فرمایا ـــــ عربوں میں تسبیح کا رواج نہ تھا۔ تسبیح پیروان بدھ کی ایجاد ہے۔ انہی سے مسلمانوں نے لی، ورنہ عرب انگلیوں پر شمار کرتے تھے۔

(۳۴) قرآن تقلید کی دعوت نہیں غور و فکر کا مطالبہ کرتا ہے۔ جب قرآن تقلید محض کا مطالبہ نہیں کرتا تو اور کسی کتاب کے لیے یہ مطالبہ کیونکر جائز ہو سکتا ہے اور جب صاحب قرآن اپنی بندگی کی دعوت نہیں دیتے تو اور کوئی وجود کیونکر اپنی طاعت کا مطالبہ کر سکتا ہے۔

(۳۵) دوسری جلد پہلی دفعہ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ پہلی جلد ۱۹۳۰ء میں طبع ہوئی اور اس پر ۱۹۴۵ء میں نظر ثانی کی گئی۔ دوسری جلد کی اشاعت کے بعد مولانا ۲۲ سال زندہ رہے لیکن عوام کو تیسری جلد کا انتظار ہی رہا۔ المختصر بارہ پاروں کا تفسیری ترجمہ شائقین کے انتظار کی نذر ہو گیا۔ یہ بحث کسی دوسری جگہ ہے کہ

تیسری جلد کے ترجمہ پر کیا بیتی؟ اور مقدمہ و بیان کے اعلان کیوں شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکے۔ لیکن مولانا غلام رسول مہر نے مولانا کی رحلت کے بعد ۱۹۶۱ء میں باقیات ترجمان القرآن کے نام سے تیسری جلد کی مختلف آیات و سور کا ترجمہ مع تفسیر و تشریح مدون کیا۔ جو تمام تر مولانا علیہ الرحمۃ کی تحریرات و تصریحات پر مشتمل ہے اور الہلال و البلاغ سے مرتب کیا گیا ہے۔ یہ ۲۷ سورتوں کا ترجمہ ہے۔ آیات کے ساتھ ان کا ترجمہ اور قدرے تفسیری نوٹ ہیں۔ لیکن یہ تراجم بعض مضامین سے الگ کیے گئے ہیں ان کی تشریحات ان مضامین کے دائرے میں ہیں ان تراجم کو مولانا تیسری جلد کے لیے لکھتے اور پہلی دو جلدوں کی طرح تشریحات فرماتے تو لازماً ان کی جامعیت اور کاملیت مختلف ہوتی۔

مولانا مہر نے اپنے دیباچہ میں مولانا کے رشحات قلم کا جائزہ لے کر ترجمان القرآن کی سرگزشت بیان کی ہے کہ طباعت تک پہنچنے کے لیے کن مرحلوں سے کتنے سال ہیں گزرنا پڑا لیکن تیسری جلد کا انتظار آخر کار مولانا کی موت نے ختم کر دیا۔ پروفیسر محمد اجمل مرحوم (پرائیویٹ سیکرٹری مولانا آزاد) نے ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام سورہ فاتحہ کی جلد میں لکھا ہے کہ "جلد دوم کے بعد مولانا نے سورہ نور کا مکمل ترجمہ اور تفسیر کر دی تھی۔ عبدالقیوم الخطاط نے بھی اسے طباعت کے لیے خوش خط لکھ دیا تھا۔ وہ مکمل ترجمہ مل گیا ہے اس کا فوٹو بھی حاصل کر لیا ہے[۱] اور جلد دوم کے ساتھ وہ بھی چھاپا جا رہا ہے۔"

(۲۷) غلام رسول مہر نے باقیات کے ساتھ ترجمان القرآن کے بعض اہم پہلوؤں کی مجمل تشریح کے لیے ایک طویل مقدمہ لکھا ہے۔ جس میں ترجمان القرآن کے فضائل و محاسن بیان کیے ہیں۔ مولانا نے تفسیر قرآن کے متعلق فطرت سے بُعد اور وضعیت کے استغراق پر جو کچھ لکھا، مہر صاحب نے جامعیت کے ساتھ اس کا اختصار کیا۔ تفسیر بالرائے کی مصیبت بیان کی۔ اور ان تمام افکار و مباحث کو انہی کے الفاظ میں لکھا ہے جو متقدمین کی تفسیروں سے مختلف اور اجتہادی تفکر کے حامل ہیں۔

(باقیات ترجمان القرآن کے تحت تفصیلات ملاحظہ ہوں)

۱؎ جنوری ۱۹۷۸ء میں جب یہ سطریں زیر قلم ہیں، راقم کو ابھی وہ نسخہ نہیں ملا۔ ممکن ہے چھپ گیا ہو، چونکہ ہندوستان اور پاکستان میں مواصلاتی تعلقات کا انقطاع ہے اور ایک مدت سے ہندوستان سے کوئی سی کتاب نہیں آ رہی۔ لہٰذا اس نسخہ سے متعلق اشاعت و عدم اشاعت کی بابت کچھ کہنا مشکل ہے۔

(۳۷) ترجمان القرآن کے مباحث کا بیشتر حصہ علماء و مشائخ کے حدودِ فہم سے ہٹا ہوا ہے۔ ان کے ترجمان القرآن کی زبان بھی اجنبی ہے۔ وہ نہ تو اس زبان پر قادر ہیں اور نہ ان مسائل ہی کا استنباط کر سکتے ہیں۔ جن کو مولانا نے ترجمان القرآن کے مختلف مباحث میں شرح صدر سے بیان کیا ہے۔ بعض علماء نے خیال کیا کہ یورپ کی فکری تحریکوں کو زیر بحث لا کر مولانا نے قرآن کے مباحث کا رُخ پھیر دیا ہے اور یہ تفسیر میں ایک طرح کی بدعت ہے۔ سوشلزم سے متعلق علماء کا خیال تھا کہ ایک یہودی تحریک ہے اس پر قرآن کی معاشیات کے تحت نقد و نظر غیر ضروری ہے، گویا ان علماء کے نزدیک یونانی علم الکلام تو متقدمین کی امانت ہے کہ اس کے بغیر فہم قرآن کا دروازہ نہیں کھلتا۔ لیکن جن مسائل سے مسلمانوں کو آج پالا پڑا ہے ان کا قرآنی محاسبہ بدعت سیہ ہے۔ ان علماء کرام کو اندازہ ہی نہیں کہ کلام پاک کی حریف آج انجیل یا تورات نہیں اور نہ اس کی ٹکر ہندومت، کینفوشش ازم یا مجوسیت وغیرہ سے ہے۔ اسلام کا مقابلہ آج یورپ کی سائنسی اور علمی تحریکوں سے ہے۔ ان میں مارکسزم نئی نسلوں کے لیے ایک ایسا سحر ہے کہ جب تک اس کا توڑ نہ ہو ہم نئی پود کو نہ اس سحر سے نکال سکتے ہیں اور نہ مذہب ہی خود کو سنبھال سکتا ہے مولانا نے سوشلزم اور قرآن کے اقتصادی نظام پر چند جامع اشارات کیے ہیں جس سے نہ صرف قرآن کا دولت سے متعلق ٹھیک ٹھیک تصور واضح ہو جاتا ہے بلکہ سوشلزم کا طبعی اور فطری ضعف بھی سامنے آتا ہے کہ انسان کے جوہر استعداد کو سوشلزم کی مجوزہ مساوات سے کوئی مناسبت نہیں۔ کیونکہ ہر شخص کسب کے معاملہ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ فی الجملہ قرآن مجید کا مقابلہ آج بائبل سے نہیں ان تمام علوم و فنون سے ہے جنہوں نے مذہب کے تصورات کو ملوکانہ استحصال کے الزام سے آلودہ کیا اور اشتراکی معاشرے کی ذہنی بنیاد رکھی ہے۔ مولانا پہلے مفسر ہیں جنہوں نے وقت کی اس سب سے بڑی تحریک کا نوٹس لیا جو اس وقت یورپ ہی کے ایک ملک میں حکمران تھی۔ لیکن جس کی پکڑ میں سب سے زیادہ مسلمان ہی تھے۔ اور اب چین کے سوشلسٹ ہو جانے کے بعد سوشلزم کا یہ دھارا مسلمان ملکوں کی طرف کچھ زیادہ ہی مڑ گیا ہے۔ چنانچہ افریشیائی ملکوں میں سوشلزم کے لیے جو میدان کھلا ہے۔ اور نئی نسلوں کے دماغ جس تیزی سے اس طوفان میں بہہ رہے ہیں۔ وہ اب ڈھکی چھپی شے نہیں ہے۔

(۳۸) ترجمان القرآن کی پہلی جلد شائع ہونے پر جناب غلام احمد پرویز نے معارف اعظم گڑھ میں اپنے والہانہ انتظار کا ذکر کیا اور دلیلی معانی کے محمل الفاظ سے باہر آ کر جلوہ نما ہونے پر تبریک کا آغاز غالب کے

اس مصرعہ سے کیا تھا کہ ع

آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

پھر جب وہ خود ایک مفکر کی حیثیت سے سیاسی اُفق پر طلوع ہوئے تو انہوں نے مولانا کی مدح کو اپنا شعار بنا لیا اور وہ سب کچھ بھول گئے جو کبھی ان کے دل کی انگوٹھی میں نگینہ کی طرح جڑا ہوا ہے ـــــ واقعہ یہ ہے کہ ترجمان القرآن کے بعد کئی لوگوں نے ترجمہ و تفسیر میں مولانا کے اجتہاد و انشا کی نقل کی اور بعض نے ان کا طرز و تفکر اختیار کیا۔ لیکن پرواز اُدھوری رہی اور لب بام رہ گئے۔ ایک چیز واضح ہے کہ ترجمان القرآن کے بعد کی تمام تفسیروں میں مولانا کی چھاپ صاف صاف محسوس و معلوم ہوتی ہے۔

(۳۹) ہر زمانہ میں تفاسیر کی ایک خاص ذہنی فضا رہی ہے۔ جس سے کوئی مترجم یا مفسر الگ نہیں رہا۔ مولانا نے جس وقت قرآن کی دعوت کا آغاز کیا وہ زمانہ اور جس وقت ترجمان القرآن کی جلد اول شائع کی، وہ دور بالفعل دماغوں کی آب و ہوا کے لیے مختلف تھا۔ پہلا مسلمانوں کے انحطاط کی طرف روز بروز قدم بڑھانے یورپی علوم و فنون کے قدم جمانے اور تشکیک و ہوا کے زور پکڑنے کا دور تھا۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ان کے ہاتھ سے نکل چکا اور نکل رہا تھا۔ مولانا نے قرآن سے جن آیات و سور کو ترجمہ و تفسیر یا دعوت و تذکیر کے لیے منتخب کیا اور جنہیں مولانا مہر نے باقیات ترجمان القرآن میں الہلال و البلاغ کے مضامین سے لے کر ترتیب دیا وہ اس صورت حال ہی کی عکاس ہیں۔ ترجمان القرآن کی اشاعت کے وقت الحاد و زندقہ، اعراض و انکار اور فسق و معصیت کی راہیں کھل چکی تھیں۔ یورپ کا علمی ضمیر مذہب کی طرف لوٹنا چاہتا تھا۔ مولانا کے سامنے انسانی روح کا یہی مطالبہ تھا۔ انہوں نے سورہ فاتحہ کو تفسیر کے لیے منتخب کیا۔ اور اس کی طویل و بسیط شرح میں ان تمام بے چینیوں اور درماندگیوں کا جواب دیا۔ جس میں کرہ ارض کا عصری انسان ذہنی طور پر گھر چکا تھا۔

(۴۰) ترجمان القرآن کا ایک بڑا حُسن نقد و نظر کی جرأت ہے۔ مولانا نے جس سے اختلاف کیا اس کی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوئے۔ نہ قدماء سے اختلاف کو گناہ گردانتے اور نہ کسی جماعت یا گروہ سے ڈرتے ہیں۔ عامۃ المسلمین قدماء کی تقلید کو اصل دین سمجھتے اور ان پر تنقید کو جرم و گناہ خیال کرتے ہیں۔ مولانا نے امام فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر سے متعلق بلا جھجک لکھا ہے کہ:

"اس میں منطق، فلسفہ حکمت، علم الکلام وغیرہ سب کچھ ہے مگر قرآن نہیں ہے"

(۴۱) مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدیر برہان دھلی لکھتے ہیں کہ سید رضا مصری کی تفسیر المنار اور مولانا کا ترجمان القرآن مطالب و معانی کے اعتبار سے ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ زبانیں دو ہیں، مقصد ایک۔ مولانا علامہ ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ کے شانہ بشانہ ہیں۔

(۴۲) راقم ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک پنجاب کی مختلف جیلوں میں ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت قید و بند کے دن گزار رہا تھا۔ ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک میں کانگرس کے بڑے بڑے ہندو زعماء جیل خانے میں آئے تو ان میں سے اکثر کے پاس ترجمان القرآن کے نسخے تھے معلوم ہوا کہ وہ اس سے زبان سیکھتے اور اپنی تقریروں کے لیے فقرے نکالتے ہیں اُن کا بیان تھا کہ اس کے مطالعہ سے ایک بات ان کے دل میں جم گئی ہے کہ ''اسلام مذاہب کی آخری سچائی ہے اور قرآن خدا ہی کا کلام ہے۔''

ترجمان القرآن کی سرگزشت

مولانا کے ذہن میں قرآن مجید کے ترجمہ، تفسیر اور مقدمہ کا خیال کب پیدا ہوا کچھ کہنا مشکل ہے لیکن ایک چیز واضح ہے کہ الہلال کے ساتھ ہی ان کے ذہن میں یہ خیال اُبھر رہا تھا۔ الہلال کا پہلا پرچہ ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو نکلا۔ اس کی ترتیب و تدوین لب و لہجہ اور مضامین و مقالات ہی ظاہر کر رہے تھے کہ ان کی روح میں کلام الٰہی رچا ہوا ہے۔ پھر جب مولانا نے الہلال و البلاغ کے ابتدائی دور میں (۱۶-۱۹۱۲ء) باب التفسیر کے تحت آیات قرآنی کی تفسیر و ترجمہ کا آغاز کیا تو معلوم ہوا کہ ایڈیٹر الہلال کے قلم کا محور و مرکز قرآن و اسلام ہیں۔ المختصر چند شماروں ہی سے ظاہر ہو گیا کہ مولانا کی طبیعت تفسیر و ترجمہ کی طرف راغب ہے۔ ۹ اکتوبر ۱۹۱۲ء کے شمارہ کی پشت پر ماہنامہ البیان کا اعلان کیا گیا تھا کہ قرآن کریم اور اس کے متعلق تمام علوم و معارف پر تحقیقات کا ایک نیا ذخیرہ فراہم کرنا اور ان موانع و مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کرنا جن کی وجہ سے موجودہ طبقہ روز بروز قرآن کریم کی تعلیمات سے ناآشنا ہوتا جاتا ہے۔ اس ماہنامہ کا مقصد و موضوع ہوگا۔ لیکن البلاغ کا پہلا شمارہ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو شائع ہوا تو اس کے صفحہ اوّل پر ترجمان القرآن کا اعلان تھا۔ اس اعلان میں درج تھا کہ:

> ''آسمانی صحائف و اسفار کے حقیقی عامل و مبلغ حضرت انبیاء کرام و رسل عظام ہیں۔ پس ان کی تبلیغ و تعلیم اور نشر و تبلیغ کا مقدس کام دراصل ایک پیغمبرانہ عمل ہے۔ جس کی توفیق صرف انہی لوگوں کو مل سکتی ہے جنہیں حق تعالیٰ انبیاء کرام کی معیت و تبعیت کا درجہ عطا فرماتا ہے اور ان کا نور علم براہ راست مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہوتا ہے وذالک فضل اللہ۔

ہندوستان کی گزشتہ قرون آخرہ میں سب سے پہلے جس مقدس خاندان کو اس خدمت کی توفیق ملی وہ حضرت شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان تھا۔ ان کے فرزند حجۃ الاسلام امام اعلام مجدد العصر حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ العزیز تھے۔ جنہوں نے سب سے پہلے قرآن حکیم کے ترجمہ کی ضرورت الہام الہٰی سے محسوس کی اور فارسی میں اپنا عدیم النظیر ترجمہ مرتب کیا۔ اس کے بعد حضرت شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہما کا ظہور ہوا اور اردو زبان میں ترجمۃ القرآن کی بنیاد استوار ہوئی۔ شکر اللہ سعیہم اس واقعہ پر ٹھیک ٹھیک ایک صدی گزر چکی ہے لیکن یہ کہنا کسی طرح مبالغہ آمیز نہ سمجھا جائے گا کہ نشر و تبلیغ قرآن حکیم کی جو بنیاد اس خاندان بزرگ نے رکھی تھی اس کی تکمیل کا شرف حق تعالیٰ نے ایڈیٹر الہلال کے لیے مخصوص کر دیا تھا جنہوں نے بعض داعیان حق و علم کے اصرار سے اپنے انداز ممتاز و بلاغت و انتشار، مخصوص و فہم حقائق و معارف قرآنیہ و ضروریات و احتیاجات وقت کو ملحوظ رکھ کر قرآن حکیم کا یہ اردو ترجمہ نہایت سلیس، عام فہم، معنی خیز حقیقت فرما عبارت میں مرتب کیا ہے اور بحمداللہ زیر طبع ہے۔ یہ ترجمہ کیا ہے ان لوگوں کے لیے جو الہلال کا مطالعہ کر چکے ہیں اس کا جواب دینا بالکل غیر ضروری ہے۔

یہ ترجمہ ٹائپ کی جگہ لیتھو میں چھاپا جا رہا ہے تاکہ ارزاں ہو اور بچوں عورتوں سب کے مطالعہ میں آسکے۔ قیمت فی جلد چھ روپے رکھی گئی ہے۔ لیکن جو حضرات اس اعلان کو دیکھتے ہی قیمت بھیج دیں گے ان سے صرف ساڑھے چار روپے لیے جائیں گے۔ درخواستیں اور روپیہ منیجر البلاغ کے نام بھیجنا چاہیے۔"

یہ اعلان ۳۱ مارچ ۱۹۱۶ء تک چھپتا رہا۔ اس وقت مولانا کی عمر ۲۸ سال تھی۔ اُدھر ۲ نومبر ۱۹۱۵ء کے شمارے سے البیان فی مقاصد القرآن کا اشتہار بھی صفحہ آخر میں تھا۔ اور لگاتار چھپتا رہا۔ اس کی عبارت حسب ذیل ہے۔

"مولانا ابوالکلام آزاد کے قلم سے قرآن حکیم کی اس تفسیر کے متعلق اس قدر ظاہر کر دینا کافی ہے کہ قرآن حکیم کے حقائق و معارف اور اس کی محیط الکل معلمانہ دعوت کا موجودہ دور جس قلم کے فیضان سے پیدا ہوا ہے یہ اسی قلم سے نکلی ہوئی مفصل اور مکمل تفسیر القرآن ہے۔ یہ تفسیر موزوں

کتابی تقطیع پر چھپنا شروع ہو گئی ہے۔ ہر مہینہ کے وسط میں اس کے کم سے کم ۴۸ اور زیادہ سے زیادہ سو صفحے اعلیٰ درجہ کے سازوسامان طباعت کے ساتھ شائع ہوتے رہیں گے۔ اس سلسلہ کا پہلا نمبر جس میں نصف حصہ مقدمہ تفسیر اور نصف سورہ فاتحہ کی تفسیر کا ہوگا انشاء اللہ ۵ صفر کو شائع ہو جائے گا۔ قیمت سالانہ آخر محرم تک چار روپے بعد کو پانچ روپے"

یہ دونوں اعلان اس امر کی شہادت تھے کہ ترجمہ و تفسیر مولانا کے قلم سے نکل چکے ہیں اور اب طباعت کے مرحلے میں ہیں۔ مولانا مہر نے الہلال کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس وقت تک ترجمہ آٹھ پاروں تک۔ اور تفسیر کا مسودہ سورہ نساء تک پہنچ چکا تھا۔ گو البلاغ کے اس اعلان سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ترجمہ آٹھ پاروں تک پہنچ چکا تھا۔ اور تفسیر سورہ نساء تک ہو چکی تھی۔ لیکن البیان (تفسیر) کے متعلق اس اعلان سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا تھا کہ ہر مہینہ کے وسط میں قسط وار ۴۸ سے ۱۰۰ صفحے شائع کرنے کا معاملہ یہی تھا کہ مولانا ساتھ ساتھ لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن البلاغ کا آخری شمارہ تین اشاعتوں ۱۷، ۲۴، ۳۱ مارچ کا مجموعہ تھا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۱۶ء کو حکومت بنگال نے ڈیفنس آف انڈیا رولز کی دفعہ ۳ ب کے تحت مولانا کو حکم دیا کہ وہ حدود بنگال سے باہر چلے جائیں۔ مولانا ترجمان القرآن جلد اول کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ اس سے پہلے اسی ضابطہ کے تحت دہلی، پنجاب، یوپی اور مدراس کی حکومتیں اپنے اپنے صوبوں میں ان کا داخلہ روک چکی تھیں۔ اب صرف بہار اور بمبئی ہی دو صوبے رہ گئے تھے جہاں وہ جا سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے اس مقصد کے لیے رانچی منتخب کیا۔ اور اس انتخاب میں خیال یہ تھا کہ اس طرح وہ کلکتہ سے قریب رہ کر شاید تصنیف و طباعت کا کام جاری رکھ سکیں گے۔ اس مقصد کے لیے مولانا نے ایک ہفتہ کی مہلت لی۔ اور ۳ اپریل کو رانچی گئے۔ لیکن جیسا کہ مولانا نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اس کے ساتھ ہی ہفتہ وار البلاغ اور البلاغ پریس کا تمام کارخانہ درہم برہم ہو گیا اور اعلان کا پورا نقشہ الٹ گیا۔ مولانا فرماتے ہیں "کہ جب ترجمہ و تفسیر کی اشاعت کا اعلان کیا گیا تو ترجمہ پانچ پاروں تک پہنچ چکا تھا۔ اور تفسیر سورہ آل عمران تک مکمل ہو چکی تھی۔ مقدمہ یادداشتوں کی شکل میں قلمبند تھا۔ اس خیال سے کہ تھوڑے وقت کے اندر زیادہ سے زیادہ کام انجام پا جائے میں نے تصنیف کے ساتھ چھپائی کا سلسلہ بھی جاری کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ اس طرح سال بھر کے اندر ترجمہ مکمل ہو جائے گا۔ اور چھپ بھی جائیگا۔ نیز تفسیر کی بھی کم از کم پہلی جلد شائع ہو جائے گی۔ ہر سات دن کی مشغولیت میں نے یوں تقسیم کر دی تھی کہ تین دن البلاغ کی ترتیب میں صرف کرتا دو دن ترجمے اور دو دن تفسیر میں۔

۳؍اپریل ۱۹۱۶ء کو جب میں کلکتہ سے روانہ ہوا تو تفسیر کے چھ فارم چھپ چکے تھے۔ اور ترجمہ کی کتابت شروع ہو رہی تھی۔ اب میں نے کوشش کی کہ میری عدم موجودگی میں پریس جاری رہے اور کم از کم تفسیر اور ترجمہ کا کام ہوتا رہے۔ چنانچہ جون ۱۹۱۶ء میں پریس کے دوبارہ اجراء کا انتظام ہو گیا۔ اور میں مسودات کی ترتیب میں مشغول ہو گیا۔ تاکہ پریس کے حوالے کر دوں۔ لیکن ۸؍جولائی ۱۹۱۶ء کو یکایک حکومت ہند نے میری نظر بندی کے احکام جاری کر دیئے۔ اور اس طرح اس امید کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ نظر بندی کے بعد کوئی موقع نہ رہا کہ باہر کی دنیا سے کسی طرح کا علاقہ رکھ سکوں۔

اب میرے اختیار میں صرف ایک ہی کام رہ گیا تھا یعنی تصنیف و تسوید کا مشغلہ، نظر بندی کی اکیس[۲] دفعات میں سے کوئی دفعہ بھی مجھے اس سے نہیں روکتی تھی۔ میں نے اس پر قناعت کی اتنا ہی نہیں بلکہ میں نے خیال کیا اگر زندگی کی تمام آزادیوں سے محروم ہونے پر لکھنے پڑھنے کی آزادی سے محروم نہیں ہوں اور اس کے نتائج محفوظ ہیں تو زندگی کی راحتوں میں سے کوئی راحت بھی مجھ سے الگ نہیں ہوئی۔ میں اس عالم میں پوری زندگی بسر کر دے سکتا ہوں۔ لیکن ابھی اس صورت حال پر تین مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ معلوم ہو گیا، اس گوشہ میں بھی مجھے محرومی ہی سے دوچار ہونا تھا۔

نظر بندی کے احکام جس وقت نافذ کیے گئے تو میری قیام گاہ کی تلاشی بھی لی گئی تھی۔ اور جس قدر کاغذات ملے تھے افسران تفتیش نے اپنے قبضہ میں کر لیے تھے۔ انہی میں ترجمہ و تفسیر کا مسودہ بھی تھا لیکن جب معائنہ کے بعد معلوم ہوا کہ ان میں کوئی چیز قابلِ اعتراض اور حکومت کے مفید مقصد نہیں تو دو ہفتے کے بعد واپس دیئے گئے۔

لیکن جب تفتیش کے نتیجہ سے حکومت ہند کو اطلاع دی گئی تو اس نے مقامی حکومت کے فیصلے سے اتفاق نہیں کیا۔ وہاں خیال کیا گیا کہ مقامی حکومت نے کاغذات واپس دے دینے میں جلدی کی اور بہت ممکن ہے کہ پوری ہوشیاری کے ساتھ معائنہ نہ کیا گیا ہو۔ اس زمانہ میں حکومت ہند کے محکمہ تفتیش کا افسر اعلیٰ سر چارلس کلیولینڈ تھا۔ اور مختلف اسباب سے جن کی تشریح کا یہ موقع نہیں اسے میری مخالفت میں ایک خاص کد ہو گئی تھی۔ وہ پہلے کلکتہ آیا اور دو ہفتے تک تفتیش میں مشغول رہا پھر رانچی آیا اور از سر نو میرے مکان کی تلاشی لی گئی۔ تلاشی کے بعد کہا گیا کہ جو کاغذات پچھلی تلاشی کے موقع پر لیے گئے تھے اب حکومت ہند کے معائنے کے لیے بھیجے جائیں گے۔ چنانچہ تمام کاغذات حتیٰ کہ چھپی ہوئی کتابیں بھی لے لی گئیں۔ ان میں نہ صرف ترجمہ و تفسیر کا مسودہ

تھا بلکہ بعض دوسری مصنفات کے بھی مکمل و نامکمل مسودات تھے۔

جس وقت یہ معاملہ پیش آیا ترجمہ کا مسودہ آٹھ پاروں تک اور تفسیر کا مسودہ سورہ نسا تک پہنچ چکا تھا۔ لیکن اب ان کا ایک ورق بھی میرے قبضے میں نہ تھا۔ تاہم میں نے نویں پارے سے ترجمے کی ترتیب جاری رکھی۔ اور ۱۹۱۸ء کے اواخر تک کام ختم کر دیا۔ اب اگر ابتدا کے آٹھ پاروں کا ترجمہ واپس مل جائے تو پورے قرآن کا ترجمہ مکمل تھا۔

میں نے کاغذات کی واپسی کے لیے خط و کتابت کی لیکن جواب ملا کہ نہ تو سردست واپس دیے جا سکتے ہیں نہ یہی بتلایا جا سکتا ہے کہ کب تک واپس کیے جائیں گے۔[1] چونکہ کاغذات کی واپسی کی بظاہر کوئی قریبی امید نظر نہیں آتی تھی اور کچھ معلوم نہ تھا کہ آگے چل کر کیا صورت حال پیش آئے اس لیے یہی مناسب معلوم ہوا کہ از سر نو ان پاروں کا ترجمہ کر کے کتابت مکمل کر لی جائے۔ یہ کام آسان نہ تھا۔ ایک لکھی ہوئی چیز کو دوبارہ لکھنا طبیعت پر بہت شاق گزرتا ہے تاہم میں نے چند ماہ کی محنت کے بعد یہ حصہ بھی از سر نو مکمل کر لیا ۔

گفتہ گر شد ز کفم شکر کہ ناگفتہ بجاست

از دو صد گنج یکے مشت گہر باختہ ام

اس خیال سے کہ مسودہ بہتر حالت میں مرتب ہو جائے اور اگر کسی دوسرے شخص کے حوالے کیا جائے تو تصحیح میں آسانی ہو میں نے اردو ٹائپ رائٹر منگوا کر اسے ٹائپ کرانا شروع کر دیا۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۱۹ء میں نصف سے زیادہ حصہ ٹائپ ہو چکا تھا۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کو حکومت نے مجھے رہا کر دیا اور اب طباعت و اشاعت کی تمام رکاوٹیں راہ سے دور ہو گئیں۔ لیکن یہ وقت وہ تھا کہ ملک میں ایک عام سیاسی حرکت کا مواد طیار ہو رہا تھا۔ اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ الہلال کی سیاسی دعوت کی صدائے بازگشت ہر

---

[1] یہ کاغذات مجھے رہائی کے بعد ۱۹۲۰ء میں واپس ملے۔ رہائی کے بعد جب میں نے مطالبہ کیا تو کئی ماہ تک کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس زمانہ میں صوبہ بہار کے گورنر لارڈ سنہا تھے۔ مجھ میں اور ان میں اس وقت سے شناسائی تھی جب ۱۹۱۹ء میں وہ حکومت ہند کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر تھے۔ وہ علاج کے لیے کلکتہ آئے اور ایک دوست کے یہاں اتفاقاً ملاقات ہو گئی میں نے یہ واقعہ ان سے بیان کیا انہوں نے حکومت ہند سے خط و کتابت کی اور دو ہفتے کے بعد تمام کاغذات مجھے واپس مل گئے۔

گوشے سے بلند ہونے لگی تھی۔ میرے لیے ممکن نہ تھا کہ وقت کے تقاضے سے تغافل کرتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ رہا ہوتے ہی تحریک لاتعاون کی سرگرمیوں میں مشغول ہو گیا اور عرصہ تک اس کی مہلت ہی نہ ملی کہ کسی دوسری طرف نگاہ اٹھا سکتا۔

لیکن جب ۱۹۲۱ء میں ملک کے ہر گوشے سے "ترجمان القرآن" کے لیے تقاضا شروع ہوا تو مجھے اس کی اشاعت کے لیے آمادہ ہو جانا پڑا۔ چونکہ ٹائپ کی چھپائی اس کے لیے موزوں نہیں سمجھی گئی تھی اس لیے کتابت کا انتظام کیا گیا۔ پہلے متن کی کتابت کرائی گئی پھر ترجمہ لکھوانا شروع کیا۔ نومبر ۱۹۲۱ء میں متن کی کتابت ختم ہو چکی تھی۔ ترجمہ کی کتابت شروع ہوئی تھی۔ لیکن وقت کا فیصلہ اب بھی میرے خلاف تھا۔

۱۹۲۱ء کے اواخر میں تحریک لاتعاون کی سرگرمیاں منتہائے عروج تک پہنچ گئی تھیں اور اب ناگزیر تھا کہ حکومت بھی اپنے تمام وسائل کام میں لائے۔ ۲۰ نومبر کو سب سے پہلے حکومت بنگال نے قدم اٹھایا اور ان تمام مجالس کو خلاف قانون قرار دے دیا جو تحریک کی سرگرمیوں میں مشغول تھیں اس اقدام نے کانگرس کو عدم متابعت قانون کے اجرا کا موقع دے دیا اور دسمبر ۱۹۲۱ء کو بعض دوسرے رفقائے بنگال کے ساتھ مجھے بھی گرفتار کر لیا گیا۔

اس مرتبہ میری گرفتاری پریس کے انتظامات میں خلل نہیں ڈال سکتی تھی کیونکہ کتاب مکمل موجود تھی اور میں نے اس کا پورا انتظام کر لیا تھا کہ میری عدم موجودگی میں کام بدستور جاری رہے۔ لیکن گرفتاری کے بعد جو واقعہ پیش آیا وہ اس افسانہ کی آخری المناکی ہے، اس کی وجہ سے نہ صرف ترجمان القرآن اور تفسیر کی اشاعت رک گئی بلکہ میری علمی زندگی کے ولولے ہی افسردہ ہو گئے۔

گرفتاری کے بعد جب حکومت نے محسوس کیا کہ میرے برخلاف مقدمہ چلانے کے لیے کافی مواد موجود نہیں ہے تو اسے مواد کی جستجو ہوئی اور اس لیے تیسری مرتبہ میرے مکان اور مطبع کی تلاشی لی گئی۔ تلاشی کے لیے جو لوگ آئے تھے ان میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اردو، عربی، فارسی کی استعداد رکھتا ہو جو چیز بھی ان زبانوں میں لکھی ہوئی ملی انہوں نے خیال کیا اس میں کوئی نہ کوئی بات حکومت کے خلاف ضرور ہو گی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قلمی مسودات کا تمام ذخیرہ اٹھا لے گئے۔ حتیٰ کہ ترجمان القرآن کی تمام لکھی ہوئی کاپیاں بھی توڑ مروڑ کر مسودات کے ڈھیر میں ملا دیں۔

سوء اتفاق سے اس وقت کسی شخص نے مطالبہ نہیں کیا کہ کاغذات مرتب کر کے لیے جاتیں اور

حسب قاعدہ ان پر گواہوں کے دستخط ہو جائیں۔ نیز ان کی رسید تفصیل کے ساتھ مرتب کر کے دی جائے۔ افسران تفتیش اپنے ساتھ چھپا ہوا فارم لائے تھے۔ صرف یہ لکھ کر کہ متفرق قلمی کاغذات لیے گئے چھپا ہوا فارم دے دیا اور روانہ ہو گئے۔

پندرہ ماہ بعد رہا ہوا تو حکومت سے کاغذات کا مطالبہ کیا۔ ایک عرصہ کی خط و کتابت کے بعد کاغذات ملے مگر اس حالت میں ملے کہ تمام ذخیرہ برباد ہو چکا تھا۔

افسران تفتیش نے جب ان کاغذات پر قبضہ کیا تو یہ قلمی مسودات کے مختلف مجموعے تھے۔ ان میں مختلف مکمل و غیر مکمل تصنیفات کے علاوہ بڑا ذخیرہ یادداشتوں کا تھا۔ لیکن جب واپس ملے تو محض اوراق پریشان کا ایک ڈھیر تھا۔ اور نصف سے زیادہ اوراق یا تو ضائع ہو چکے تھے یا اطراف سے پھٹے ہوئے اور پارہ پارہ تھے۔

یہ میرے صبر و شکیب کے لیے زندگی کی سب سے بڑی آزمائش تھی لیکن میں نے کوشش کی کہ اس میں بھی پورا اتروں اور یہ سب سے زیادہ تلخ گھونٹ تھا جو جام حوادث نے میرے لبوں سے لگایا لیکن میں نے بغیر کسی شکایت کے پی لیا البتہ اس سے انکار نہیں کرتا کہ اس کی تلخی آج تک گلوگیر ہے ؎

رگ و پے میں جب اترے زہر غم تب دیکھیے کیا ہو
ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہے

سیاسی زندگی کی شورشیں اور علمی زندگی کی جمعیتیں ایک زندگی میں جمع نہیں ہو سکتیں اور پنبہ و آتش میں آشتی محال ہے۔ میں نے چاہا دونوں کو بیک وقت جمع کر دوں، میں نامراد ایک طرف متاع فکر کے انبار لگاتا رہا دوسری طرف برق خرمن سوز کو بھی دعوت دیتا رہا۔ نتیجہ معلوم تھا اور مجھے حق نہیں کہ حرف شکایت زبان پر لاؤں۔ عرفی نے میری زبانی کہہ دیا ہے ؎

زاں شکستم کہ بہ دنبال دل خویش مدام
در نشیب شکن زلف پریشاں رفتم

اب ترجمان القرآن اور تفسیر کی ہستی اس کے سوا ممکن نہ تھی کہ از سر نو محنت کی جائے لیکن اس حادثے کے بعد طبیعت کچھ اس طرح افسردہ ہو گئی کہ ہر چند کوشش کی مگر ساتھ نہ دے سکی میں نے محسوس کیا کہ حادثے کا زخم اتنا ہلکا نہیں ہے کہ فوراً مندمل ہو جائے۔

طبیعت کی بڑی رکاوٹ جو رہ رہ کر سامنے آتی تھی یہ تصور تھا کہ ایک تصنیف کی ہوئی چیز دوبارہ تصنیف کی جائے واقعہ یہ ہے کہ اہل قلم کے لیے اس سے زیادہ مشکل کام کوئی نہیں وہ ہزاروں نئے صفحے بآسانی لکھ دے گا مگر ایک ضائع شدہ صفحے کے دوبارہ لکھنے میں اپنی طبیعت کو یک قلم درماندہ پائے گا۔ فکر و طبیعت کی جوگرمجوشی پچھلی محنتوں کے تصور سے بجھ جاتی ہے۔ بہت دشوار ہوتا ہے کہ اسے دوبارہ پیدا کیا جائے۔ اس حالت کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ایسی بدقسمتیوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ میں نے ٹامس کارلائل کے حالات میں جب پڑھا تھا۔ کہ اس نے انقلاب فرانس پر اپنی مشہور کتاب تصنیف کی اور اہل فن نے اسے قوت تصنیف کا ایک غیر معمولی مظاہرہ سمجھا تو میں نہیں سمجھ سکا تھا کہ اس میں غیر معمولی بات کیا ہے؟ لیکن اس حادثے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ نہ صرف غیر معمولی ہے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہے اور فی الحقیقت کارلائل کی مصنفانہ عظمت کا اس سے بڑھ کر اور کوئی ثبوت نہیں ہو سکتا۔

کئی سال گزر گئے مگر میں اپنے آپ کو اس کام کے لیے آمادہ نہ کر سکا ؎

دلے سرگزشتہ دارم کہ درصحراست پنداری

بار بار ایسا ہوا کہ ترجمہ و تفسیر کے بچے کھچے اوراق نکالے لیکن جونہی برباد شدہ کاغذات پر نظر پڑی طبیعت کا انقباض تازہ ہو گیا اور دو چار صفحے لکھ کر چھوڑ دینا پڑا ـــــ لیکن ایک ایسے کام کی طرف سے جس کی نسبت میرا یقین تھا کہ مسلمانوں کے لیے وقت کا سب سے زیادہ ضروری کام ہے ممکن نہ تھا کہ زیادہ عرصہ تک طبیعت غافل رہتی جس قدر وقت گزرتا جاتا تھا۔ اس ضرورت کا احساس میرے لیے ناقابل برداشت ہوتا جاتا تھا میں محسوس کرتا تھا کہ اگر یہ کام مجھ سے انجام نہ پایا تو شاید عرصہ تک اس کی انجام دہی کا کوئی سامان نہ ہو۔

۱۹۲۷ء قریب الاختتام تھا۔ کہ اچانک مدتوں کی رکی ہوئی طبیعت میں جنبش ہوئی اور رشتہ کار کی جو گرہ ذہن و دماغ کی پیہم کوششیں نہ کھول سکی تھیں۔ دل کے جوشش بے اختیار سے خود بخود کھل گئی۔ کام شروع کیا تو ابتدا میں چند دنوں تک طبیعت رکی رکی رہی لیکن جونہی ذوق و فکر کے دو چار جام گردش میں آئے طبیعت کی ساری رکاوٹیں دور ہو گئیں اور پھر تو ایسا معلوم ہونے لگا گویا اس شورش کدہ ہستی میں افسردگی و خمار آلودگی کا کبھی گزر ہی نہیں ہوا تھا ؎

بہ بدمستی سزد گر متہم سازد مرا ساقی
ہنوز از بادہ دوشینہ ام پیمانہ بو دارد

اتنا ہی نہیں بلکہ کہنا چاہیے شورش تازہ کی سرمستیاں مجلس دوشیں کی کیفیتوں سے بھی کہیں تندتر ہوگئیں ؂

چہ مستی است ندانم کہ رو بہ ما آورد
کہ بود ساقی و ایں بادہ از کجا آورد؟

سبحان اللہ عالم روح و قلب کے تصرفات کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ یا تو یہ حال تھا کہ بار بار کوشش کی مگر طبیعت کا انقباض دُور نہیں ہوا —— یا اب خود بخود کھلی تو اس طرح کھلی کہ قلم روکنا بھی چاہوں تو رُک نہیں سکتا۔

شور نیست نوا ریزیٔ تار نفسم را
پیدا نہ اسے جنبش مضراب کجائی؟

بہرحال کام شروع ہوگیا اور اس خیال سے کہ سورہ فاتحہ کی تفسیر ترجمہ کے لیے بھی ضروری تھی سب سے پہلے اس کی طرف متوجہ ہوا پھر ترجمہ کی ترتیب شروع کی۔ حالات اب بھی موافق نہ تھے۔ صحت روز بروز کمزور ہو رہی تھی۔ سیاسی مشغولیت کی آلودگیاں بدستور خلل انداز تھیں۔ تاہم کام کا سلسلہ کم و بیش جاری رہا۔ اور ۲۰ جولائی ۱۹۳۰ء کو آخری سورہ کے ترجمہ و ترتیب سے فارغ ہوگیا ؂

تا دستِ رسم بود، زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

ترجمان القرآن پہلی دفعہ ۱۹۳۱ء کے اوائل میں منظر عام پر آیا۔ اور نومبر ۱۹۳۰ء میں مولانا نے محولہ بالا دیباچہ لکھا لیکن اس سے پہلے الہلال کے دورِ آخر کے دوسرے شمارے (۲۴ جون ۱۹۲۷ء) میں مولانا نے بعض مسودوں کی ویرانی کا ذکر کرتے ہوئے افتتاحیہ میں یہی روداد بیان کی تھی کہ ۱۹۱۶ء میں جب بنگال سے مجھے خارج کیا گیا اور رانچی گیا تو یہ وہ وقت تھا کہ البلاغ اور دارالارشاد کی مشغولیت کے ساتھ میں نے اپنے افکار و تحقیقات کی تحریر و ترتیب بھی شروع کر دی تھی۔ جن امور کی تکمیل و ترتیب پیشِ نظر تھی وہ کسی ایک ہی موضوع سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ بے شمار گوشے سامنے آتے تھے۔ اور ہر گوشہ نظر میں اس کثرت

سے متفرق اور منتشر حقیقتیں نمایاں ہوتی تھیں کہ ان سب کا جمع کرنا اور اصول وکلیات کے ماتحت لانا آسان نہ تھا۔ ضرورت تھی کہ عرصہ تک فکر وکاوش کا معاملہ جاری رہے۔ بہت سی چیزیں ابتدائی شکل میں مرتب ہوئی تھیں بہت سی ناتمام تھیں۔ برسوں سے دماغ اس کا عادی ہو گیا ہے کہ ہمیشہ کسی نہ کسی گوشۂ تحقیق کی فکر اور کسی نہ کسی عقدۂ کار کے حل میں مشغول رہتا ہے اور اس لیے بے شمار یادداشتیں جو فی الحقیقت کسی نہ کسی معاملہ علم و تحقیق کی اصولی بنیادیں ہوتی ہیں قلم سے نکلتی رہتی ہیں۔ اس وقت تک کم از کم ایک ہزار چھوٹے بڑے پرچے تو صرف یادداشتوں ہی کے سیاہ ہو چکے ہوں گے ؎

تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

یہ تمام ذخیرہ دماغ کا حاصل اور زندگی کا سرمایہ تھا۔ اس میں سے کچھ حصہ تو اپنے ساتھ رانچی لے گیا تھا۔ باقی حصہ کلکتہ کے سکونتی مکان میں چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ اس وقت حالات کی رفتار کچھ عجیب طرح کی تھی۔ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ مستقبل میں کیا پیش آئے گا؟ لیکن جب پانچ ماہ کے بعد حکومت ہند نے میری نظر بندی کے احکام جاری کیے تو ایک ہی وقت میں رانچی اور کلکتہ دونو جگہ خانہ تلاشی کی گئی اور پھر اس وقت سے لگاتار سلسلہ اس کا جاری ہو گیا۔ رانچی میں دو مرتبہ اور کلکتہ میں تین مرتبہ یہ معاملہ پیش آیا۔ کلکتہ میں نہ صرف میرے سکونتی مکان اور مطبع ہی کی تلاشی لی گئی بلکہ ان تمام مکانات کی بھی لی گئی جہاں کوئی ادنیٰ سا شبہ بھی میرے کاغذات کی موجودگی کا ہو سکتا تھا۔ کاغذات زیادہ تر متفرق مسودات تھے۔ یادداشتیں تھیں، مجمل اشارات تھے۔ میں یادداشت عموماً فارسی میں یا عربی میں لکھا کرتا ہوں کیونکہ اردو میں اختصار ممکن نہیں۔ تلاشی کا کام زیادہ تر انگریز حکام یا بنگالی ماتحتوں کے ذمہ تھا۔ اگر ان میں کوئی مسلمان تھا بھی تو ٹوٹی پھوٹی اردو کے سوا کچھ نہ جانتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر کاغذ پر اسرار اور ہر سطر سیاسی راز بن گئی اور سب کو ایک ڈھیر کی شکل میں جمع کر کے قبضہ میں لے لیا گیا۔ کاش احتیاط کے ساتھ جمع کرتے اور احتیاط کے ساتھ رکھتے لیکن ان میں سے کون تھا جسے ان چیزوں کا درد ہوتا؟ نتیجہ یہ نکلا کہ نصف سے زیادہ اوراق تو تلاشی کے وقت کی بے احتیاطیوں میں ضائع ہو گئے اور نصف جو باقی رہے انہیں بھی اس بے احتیاطی میں ادھر ادھر جوڑ دیا گیا کہ کوئی ایک چیز بھی اپنی اصل شکل میں باقی نہ رہی پھر اس پر طرہ یہ ہے کہ یہ برباد شدہ ذخیرہ بھی پورا واپس نہیں ملا۔ جو کاغذات کلکتہ سے لیے گئے تھے بیان کیا جاتا ہے کہ کچھ دنوں تک پولیس کمشنر کے دفتر میں رکھے گئے۔ اتفاقاً وہاں کے ایک گوشے

میں آگ لگ گئی اور دفتر کے سامان کے ساتھ بعض اوراق بھی جل گئے۔ پولیس کے دفتر میں آگ بھی لگی تھی تواسی وقت جب یہ دفتر پریشاں وہاں جمع تھا ع

گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟

ان سودات میں حسب ذیل کتابیں ایک حد تک مرتب تھیں۔

تاریخ معتزلہ، سیرت شاہ ولی اللہ، دیوان غالب اُردو پر تبصرہ، خصائص مسلم، امثال القرآن، شرف جہاں قزوینی پر تبصرہ، مقدمہ تفسیر کے ناتمام اجزا ترجمان القرآن کا مسودہ سورہ ہود تک، تفسیر البیان سورہ نساء کے ابتدائی حصے تک، مضامین اور یادداشتوں کا ذخیرہ ان کے علاوہ ہے۔ قیام رانچی کے ابتدائی زمانہ میں دو رسالے نئے لکھنا شروع کئے تھے۔ ایک وحدت قوانین کائنات، دوسرا قانون انتخاب طبعی اور معنویت کائنات پر، ان کے اوراق بھی اسی ذخیرہ میں شامل ہو گئے۔

اس کے بعد رانچی کی زندگی میں وہاں کی مقامی خدمات سے جس قدر وقت بچا تصنیف و تالیف میں صرف ہوا۔ مقدمہ، ترجمہ اور تفسیر کے بارے میں بہت سی تبدیلیاں فکر و خیال میں ہو گئی تھیں۔ تقریباً ازسرنو کام شروع ہوا تھا۔ جنوری ۱۹۲۰ء میں میں اپنا تمام نیا ذخیرہ لے کر رانچی سے نکلا۔ اس مرتبہ ارادہ کر لیا تھا کم ازکم ترجمان القرآن کسی نہ کسی طرح شائع کر دینا چاہیئے۔ اسی خیال سے متن قرآن کی کاپیاں ایک عزیز دوست نے اپنے اہتمام و تصرف سے لاہور میں لکھوائیں اور ترجمہ کی کتابت کا کام بھی ستمبر ۱۹۲۱ء میں شروع ہو گیا۔

اگر پانچ چھ ماہ تک بھی یہ حالت باقی رہتی تو باوجود ہر طرح کی سیاسی مشغولیت کی سرگرانیوں کے عجیب نہیں کہ کسی نہ کسی طرح یہ ایک چیز مکمل ہو جاتی لیکن اسے کیا کیجئے کہ اگر ایک طرف ان خرمن سازیوں اور سرمایہ اندوزیوں کی کوششیں جاری تھیں تو دوسری طرف نگاہ برق کی دعوت میں بھی کوتاہی نہیں ہوتی تھی۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء کو میں گرفتار ہوا۔ اور پھر خانہ تلاشیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مختلف اغراض سے (جن کی تشریح کا یہ موقع نہیں) پے در پے تلاشیاں لی گئیں۔

نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف بے شمار مسودات و اوراق بلکہ کتابت کی ہوئی کاپیوں کا تمام ذخیرہ پریشاں و منتشر ہو کر پولیس کے قبضے میں چلا گیا۔ چھ جنوری ۱۹۲۳ء کو جب رہا ہو کر واپس آیا تو ۱۹۱۶ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک کی تمام محنت تقریباً رائیگاں ہو چکی تھی۔

متی یساعدنا الوصال ودھرنا

یومان یوم نوی ویوم صدود

عرصہ کی ردوکد کے بعد اوراق واپس ملے۔ لیکن تمام تر ناقص، منتشر اور برباد شدہ تھے۔ اب بغیر نئی محنت کے ان کا کوئی حصہ بھی کام نہیں دے سکتا تھا۔ یہ بربادی پہلی بربادی سے بھی زیادہ ہمت شکن تھی۔ لیکن چونکہ خود اختیاری حالات کا نتیجہ تھی۔ اس لیے جس طرح پہلی مرتبہ صبر و خاموشی کے ساتھ برداشت کر لی گئی تھی اس مرتبہ بھی برداشت کر لینا پڑی حتیٰ کہ آج سے پہلے شاید اس کا تذکرہ بھی قلم و زبان سے آشنا نہیں ہوا۔

جن لوگوں کو تصنیف و تالیف کے معاملات کی خبر ہے وہ جانتے ہیں کہ ایک مفکر اور اہل قلم کے لیے یہ بات کتنی مشکل اور اذیت دہ ہوتی ہے کہ اپنی لکھی ہوئی چیز برباد دیکھے اور دوبارہ قلم اٹھانے پر مجبور ہو۔ مشہور ہے کہ جب کارلائل کی تاریخ انقلاب فرانس کا مسودہ جل گیا تو عرصہ تک اس کا یہ حال تھا کہ قلم پکڑتا اور بغیر ایک حرف کے چھوڑ دیتا۔ کارلائل کا حادثہ اتفاقی تھا اس لیے اسے شکایت زیب دیتی تھی اور اس کی بے شکیبی بھی قابل ملامت نہیں لیکن مجھے جو حوادث پیش آئے وہ اتفاقی نہ تھے۔ اختیاری تھے۔ اس لیے دل کیلئے کتنے ہی درد انگیز اور ہمت شکن ہوں لیکن دماغ کے لیے ان میں کوئی وجہ شکایت نہیں ہوسکتی تھی۔ مجھے دو نو مرتبہ تسلیم کر لینا پڑا کہ یا تو اس طرح کی زندگی اختیار نہیں کرنی تھی یا کی ہے تو پھر اس کے تمام لازمی نتائج گوارا کر لینے چاہئیں۔ سرمد کا فیصلہ صرف ایک گوشۂ عشق ہی کا نہیں بلکہ انسان کی تمام مصیبتوں کے لیے عام وابدی فیصلہ ہے ؎

یا تن بہ رضائے دوست می باید داد

یا قطع نظر زیار می باید کرد

یہ طویل روداد صرف اس لیے نقل کی ہے کہ تفسیر و ترجمہ کے لیے جس یکسوئی دماغ، فراغت خاطر اور دوسری مشغولیتوں سے انقطاع کامل کی ضرورت تھی وہ اس سارے عرصہ میں ناپید ہیں۔''

مولانا ۲ جنوری ۱۹۲۳ء کو رہا ہوئے تو ملک کی سیاسی زندگی میں خلل واقع ہو رہا تھا نہ صرف یہ کہ ہندو اور مسلمان دو صفوں میں بٹ رہے تھے بلکہ کانگرس کی صفوں میں بھی تفریق و تقسیم کا غلغلہ سر اٹھا چکا تھا چینجرز و نو چینجرز کے دو واضح گروپ ن گئے تھے ایک طرف مہاتما جی کے پیروکار تھے۔ دوسری طرف سی آر داس اور پنڈت موتی لال نہرو وغیرہم تھے۔ یہ محض دو ذہنوں کا اختلاف ہی نہ تھا بلکہ ایک کھلا تصادم تھا۔

گاندھی جی کے رفقاء اسمبلیوں میں داخلہ کے خلاف تھے۔ اس کے برعکس داس اور نہرو داخلہ کے حامی تھے۔ اور ان کا استدلال یہ تھا کہ اسمبلیوں میں جاکر حکومت کو زچ کیا جائے تو ملک کے حق میں بہتر نتائج پیدا ہو سکتے ہیں یہ ایک ایسا موڑ تھا کہ کانگرس کے دولخت ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس صورت حال سے عہدہ برا ہونے کے لیے کانگرس کا سپیشل اجلاس (ستمبر ۱۹۲۳ء) دہلی میں منعقد ہوا۔ مولانا آزاد صدر تھے پہلے کسی باب میں اجلاس کے حالات و نتائج کا ذکر آچکا ہے جس قسم کی یہ مصروفیت تھی اس کے باعث ترجمہ و تفسیر کا رک جانا لازم تھا۔

مولانا کو اپنے تمام تفسیری مسودات اور بعض دوسری تالیفات کے سرکاری ہاتھوں برباد ہو جانے کا شدید ملال تھا۔ اور اس ملال کے صدماتی واردات کو صرف وہی طبیعتیں جان سکتی ہیں جنہیں قلم و بیان کا یہ حادثہ پیش آیا ہو اور ایک مصنف یا مولف کی حیثیت میں وہ اس سانحہ سے گزر چکی ہوں۔ قرآن کا ترجمہ و تفسیر سال ڈیڑھ سال کا کام نہ تھا۔ اس کے لیے سالہا سال کے شب و روز اور ان کا سکون درکار تھا۔ ۱۹۲۷ء میں مولانا نے الہلال نکالا لیکن سیاسی مصروفیتوں کی بے پناہی کے باعث اس کا اشاعتی سفر مشکل ہو گیا آخر چھ ماہ بعد اشاعت موقوف کر دی پھر دو اڑھائی سال میں ترجمان کی جلد اول تیار کی جو کتابت کے مرحلے گزار کر ۱۹ نومبر ۱۹۳۰ء کو مکمل ہوئی اور اوائل ۱۹۳۱ء میں شائع ہو گئی۔ اس کا دیباچہ وغیرہ ڈسٹرکٹ جیل میرٹھ میں لکھا۔ معاملہ اس پر ختم ہو جاتا تو کسی حد تک گوارا تھا۔ لیکن پہلے ایڈیشن کی کتابت، طباعت، کاغذ کی خریداری جلد بندی اور اس کے بعد یکمشت فروخت کے لیے مولانا کو سخت قسم کی ذہنی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی روداد مولانا کے ان خطوط سے معلوم کی جا سکتی ہے جو مولانا غلام رسول مہر کے علاوہ بعض دوسرے دوستوں کو لکھتے رہے اور کئی مجموعوں میں نقل ہو چکے ہیں۔ اس سلسلہ میں منشی عبدالقیوم خان خطاط (ترجمان القرآن) کا مضمون بہ عنوان "مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں ڈیڑھ سال" مطبوعہ روزنامہ الجمعیۃ دہلی آزاد نمبر سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کس حال میں تھے

انجمن ترقی اردو ہند کے مجلہ اردو ادب علی گڑھ نے آزاد نمبر شائع کیا تو اس میں کاتب ترجمان کے نام مولانا کے خطوط نقل کیے جن سے مولانا کی تنگ دستیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

ترجمان القرآن کی دوسری جلد ۱۹۳۶ء کے وسط میں شائع ہوئی۔ اس کا حرف آغاز ۱۳ اپریل ۱۹۳۶ء کی تحریر ہے۔ مولانا نے یہ چار صفحے موتی نگر کانگرس کیمپ لکھنؤ میں رقم کیے۔ جلد دوم کی طباعت و اشاعت کے اخراجات کی صعوبتوں کے لیے غلام رسول مہر کے نام مولانا کے خطوط ملاحظہ فرمایئے جو نقش آزاد کے نام سے کتاب منزل لاہور نے اواخر ۱۹۵۹ء میں شائع کیے تھے۔ خود راقم الحروف کے پاس مولانا کے بعض خطوط موجود ہیں جو انہوں

سے نے اپنے ایک عقیدت مند دوست کو قرض حسنہ کے لیے لکھے کہ جس فرم سے ترجمان القرآن (جلد دوم) کیلئے کاغذ لینا مطلوب تھا وہ رقم کا پیشگی تقاضا کر رہی تھی۔ اور اسی صورت میں کاغذ کلکتہ سے بجنور جا سکتا تھا۔ ادھر مدینہ پریس بجنور کے مالکوں کو بھی طباعت کی رقم چاہیے تھی۔ اور ترجمان القرآن وہاں سے نقد اُجرت پر لایا جا سکتا تھا۔ طباعت کے علاوہ کتابت کے واجبات بھی واجب الادا تھے۔ اس غرض سے منشی عبدالقیوم خطاط مدینہ پریس بجنور میں آ بیٹھا تھا اُس نے لکھا ہے کہ:

۱۔ مجھے اکتوبر ۱۹۳۴ء سے مارچ ۱۹۳۶ء تک ڈیڑھ سال مولانا کی خدمت میں حاضر رہنے کا اتفاق ہوا۔

۲۔ ترجمان القرآن جلد دوم کی کارگزاری تین صفحے یومیہ اور مشاہرہ ۹۰ روپے ماہانہ طے پایا۔ میں نے اصرار کیا کہ تیس یا چالیس روپے ماہوار لیا کروں گا باقی رقم کا آخر میں حساب ہو جائے گا۔ تین صفحے یومیہ کی شرط نباہ نہ سکا تو میں نے مشاہرہ ۹۰ سے ۷۰ روپے کر دیا۔ مولانا نے منظور فرما لیا۔

۳۔ کتابت کے لیے اولاً مسودہ کے چار پانچ اوراق ملے پھر ایک ایک دو دو صفحے تازہ تحریر کے آتے رہے۔

۴۔ یہاں آکر مشاہدۃً پتہ چلا کہ مولانا کا سفر قرضوں کے سنگ ہائے گراں سے حد درجہ کٹھن ہے لیکن مشکلات و موانعات کے باوجود وہ غیر متزلزل استقلال کے ساتھ قدم بڑھاتے جاتے ہیں۔

۵۔ مولانا جس کوٹھی میں رہتے تھے اس کا ماہانہ کرایہ دو سو روپے ماہوار تھا، ان دنوں اور کوئی ذریعہ آمدنی نہ تھا اکثر قرض حسنہ پر گذر کرتے۔ اس کوٹھی کی نچلی منزل ایک ترک عربی سیٹھ کو ساٹھ روپے ماہانہ پر دے رکھی تھی۔ وہ کرایہ وصول ہوتا تو ذاتی ضرورتوں میں کام آجاتا۔ مالک کو کرایہ ادا نہیں ہو رہا تھا۔ عجیب فقر و فاقہ کے دن تھے۔

۶۔ ہر روز ضرورت کے مطابق خوراک کا سامان یعنی آٹا، چاول، گھی، تیل، مسالحہ ایک دکان سے قرض آتا اور مہینہ بعد حساب چکتا تھا۔ ایک بنگالی معتقد اپنے گاؤں کے تالاب سے چھوٹی چھوٹی زندہ مچھلیاں لاتا جنہیں کوٹھی کے مختصر سے حوض میں چھوڑ دیا جاتا اور وہ دو تین روز

کام میں آتی تھیں۔ اسی طرح ایک اور معتقد اکثر گوشت دے جاتا یا کبھی کبھار مرغ ورنہ خشکہ چاول اور ارہر کی دال صبح وشام کا کھانا تھا۔ ترکاری میں عموماً تیل استعمال ہوتا تھا۔ گھر میں کوئی خادمہ نہ تھی۔ باہر ایک بنگالی خادم سید علی نامی تھا جو بازار کا معمولی کام کرتا یا چائے کو دم دیتا تھا۔ یا پھر چاول دال تیار کر کے اندر بھیج دیتا۔ مولانا اکثر صبح کی چائے خود تیار کرتے تھے۔

۷۔ ترجمان القرآن جلد دوم کی چھ ہزار جلدیں شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور کو فروخت کر دی گئیں۔ مستری محمد صدیق مولانا کے ایک معتقد تھے۔ انہوں نے شیخ صاحب سے روپیہ لے کر پریس کا بل ادا کیا۔ میری باقیماندہ رقم مجھے دی۔ تمام جلدیں شیخ صاحب کے حوالے کیں اور جو روپیہ بچا مولانا کو بھیج دیا۔ جس کا بڑا حصہ قرضوں میں تقسیم ہوگیا۔ شاید ایک قلیل سی رقم بچی ہوگی۔

۸۔ مولانا نے اوائل ۱۹۴۸ء میں سورۂ نور کا ترجمہ مراد آباد بھجوادیا اور کوئی تین صفحوں کی کتابت ہوگئی پھر مسلسل درخواست کے باوجود مسودہ کا انتظار ہی رہا اور تیسری جلد اس سے آگے نہ بڑھ سکی۔ پروفیسر محمد اجمل خان نے سورہ فاتحہ مطبوعہ ساہیتہ اکادمی میں لکھا ہے کہ عبدالقیوم الخطاط سے سورۂ نور کا ترجمہ وتفسیر مل گیا ہے اور ہم نے فوٹو بھی حاصل کرلیا ہے۔ اب جلد دوم کے ساتھ چھاپا جارہا ہے۔

۹۔ مولانا نے قلعہ احمد نگر میں جلد اوّل پر نظرثانی کی اور تفسیر کی تعداد ڈیوڑھی ہوگئی۔ اس نظرثانی کے ترجمہ میں جابجا تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ اس کے دیباچے پر ۷، فروری ۱۹۴۵ء کی تاریخ ہے۔

۱۰۔ جن دنوں مولانا احمد نگر کے قلعہ میں قید تھے۔ ان کی کوٹھی کا نچلا حصہ ایک دوسرے شخص نے دوسو روپے ماہوار پر لے رکھا تھا اور اسی آمدنی سے گھر کا خرچ چلتا تھا۔

(الجمعیۃ دہلی آزاد نمبر)

بہر حال اصل سوال تیسری جلد کا ہے۔ مولانا کی بعض تحریروں، دوستوں کے نام خطوط اور بعض عقیدتمندوں سے ملاقاتی ارشادات کو ملحوظ رکھیں تو گمان ہوتا ہے کہ تیسری جلد تیار ہوچکی تھی اور مولانا اس سلسلہ میں یہی فرماتے تھے کہ سارا کام ختم ہوچکا ہے۔ کتابت ہورہی ہے، طباعت کا مرحلہ باقی ہے۔ مولانا کی رحلت کے بعد یہ سارا طلسم پاش پاش ہوگیا۔ شوق خالی ہاتھ رہ گیا، انتظار کی نگاہیں تھک کے ٹوٹ گئیں۔ پروفیسر محمد اجمل خان مولانا کی عمر کے اواخر کی دو دہائیوں میں ان کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ انہیں مسودہ ملا تو صرف سورہ نور

کا ترجمہ اور وہ بھی ترجمان کے کاتب منشی عبد القیوم خان سے۔ سوال یہ ہے کہ مولانا کے سامان میں کوئی پرزہ کاغذ تھا یا نہیں؟ حیرت ہے کہ مولانا کے ہاں سے کوئی تحریر برآمد نہ ہوئی۔ جواہر لال نہرو کو جن بڑے آدمیوں نے خطوط لکھے ان کا مجموعہ چھپ چکا ہے۔ مولانا کے تعلقات بھی اکابر عہد سے تھے اور وہ خود بھی ایک بڑے آدمی تھے۔

لازماً باہمی خط وکتابت ہوگی۔ کیا ان کے نام کے تمام خطوط ضائع ہو گئے یا ان پر کوئی اور حادثہ بیت گیا؟ جن لوگوں نے اپنے نام مولانا کے خطوط شائع کئے ہیں وہ ان کے خطوط کا جواب ہیں۔ ان کے خطوط کہاں گئے؟ مولانا نے رفقاء اکابر کے خطوط محفوظ نہیں کئے یا ان خطوط کے معاملہ میں وہ اس قدر مستغنی تھے کہ ان خطوط کے رکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کرتے تھے۔ طبیعت تسلیم نہیں کرتی کہ مولانا نے بے توجہی کی ہو علامہ شبلی کے خطوط جو ان کے نام ہیں مکاتیب شبلی میں موجود ہیں۔ وہ مولانا ہی نے سید سلیمان کو دیئے ہوں گے۔ وہ خطوط جو مولانا کو عوام کے علاوہ خواص سے آتے تھے کہاں گئے؟ ان میں گاندھی جی اور جواہر لال کے خطوط بھی تھے۔ لیکن مولانا کی رحلت کے بعد نہ جانے یہ اثاثہ کہاں گیا۔ ایسی کسی چیز کا نہ ہونا فی الجملہ تعجب انگیز ہے؟ ان حالات میں ترجمان القرآن تیسری جلد کے مفقود ہونے کی تین ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔

ا۔ مولانا نے ضروری مباحث اور اہم نکات کا صرف خاکہ تیار کیا ہو پھر اس سلسلے کے سب اشارات مرتب کر لئے ہوں۔ لیکن سیاسی مشغولیتوں کے باعث تیسری جلد مرتب نہ ہو سکی ہو۔ مولانا کو اپنی ذات پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ قلم اٹھائیں گے اور کتابت کی رفتار کے ساتھ تیسری جلد مکمل کر دیں گے مگر ۱۹۳۶ء کے بعد دو اڑھائی سال ان کے لیے کسی قدر عدیم الفرصتی کا زمانہ تھا۔ ۱۹۳۷ء میں صوبجاتی خود مختاری کے تحت پہلے انتخابات ہوئے۔ کانگرس نے پنجاب، آسام، بنگال اور سندھ کے سوا ہر جگہ وزارتیں قائم کیں۔ مسلمان وزیروں کے نگران مولانا ہی تھے۔ مسلم لیگ نے کانگرس کی وزارتوں کے خلاف میدان رستخیز گرم کیا تو معاملہ کی سنگینی نے مولانا کی مشغولیتوں میں اضافہ کر دیا۔ ادھر ستمبر ۱۹۳۹ء کے آغاز میں دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ ادھر ۱۹۴۰ء میں وہ کانگرس کے صدر منتخب ہوئے پھر ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۵ء تک ایک آدھ وقفہ کے سوا قید میں رہے۔ اس دوران میں برطانوی حکومت کے مشن آتے رہے۔ ان سے بحیثیت صدر کانگرس گفتگو کا بار ان پر تھا۔ پھر ۱۹۴۷ء تک کہ ۱۴، ۱۵ اگست کو برعظیم آزاد ہو گیا اور مولانا کے نقطہ نگاہ کی ہار ہو گئی۔ ان کے لیے فرصت کا لمحہ ہی نہ تھا۔ اس کے بعد فروری ۱۹۵۸ء تک دس سال کی مدت ان کے اضطراب مسلسل کا زمانہ تھا۔ مختصر یہ کہ مولانا صدمات کا مجسمہ اور سانحات کا پیکر ہو چکے تھے۔ اس عرصہ میں وہ جی نہیں رہے تھے بلکہ عناصر خمسہ کو بہلا رہے تھے اور ایک آہ نارسیدہ، نالہ نا کشیدہ

کی طرح گرد و پیش کی انگیٹھیوں میں تپ رہے تھے۔ اس زمانہ میں ترجمہ وتفسیر ناممکن تھے۔

۲۔ مولانا یورپی فلسفہ و افکار کی نت نئی کاوشوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ترجمہ وتفسیر کو جس انداز میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ قرآن کے معانی و مطالب اس سے مختلف ہیں۔ قرآن محض عقل سے حل نہیں ہوتا۔ وہ عشق کی معرفت سے حل ہوتا ہے اور ایمان کی زبان میں بولتا ہے۔ شاید دماغ کے اس سفر ہی میں پیمانہ عمر لبریز ہوگیا اور تفسیر اُدھوری رہ گئی۔

۳۔ مولانا کا ذوق تھا کہ اپنے علم کی بیکرانی کے باعث اپنے مسودہ کو بار بار بدلتے آخر وقت تک ترمیم و تنسیخ اور حک و اضافہ فرماتے۔ ان سے یہ شکایت کاتبوں کو بھی تھی کہ وہ ہر لحظ مسودہ میں اصلاح کرتے اور پلیٹ پر کاپی جمنے تک الفاظ و مطالب میں تغیر و تبدل فرماتے۔ مولانا غلام رسول مہر نے بھی اپنے بعض مضامین میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اور مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے بھی ذکر آزاد میں یہی لکھا ہے۔

میرا خیال ہے کہ مولانا نے جلد سوم تیار کر لی تھی لیکن وہ خود اس سے مطمئن نہ تھے۔ ان کے ذہن میں بعض مطالب میں اضافہ کا خیال تھا۔ اور وہ معاشرے کی مادی گمراہیوں کے اندھیرے کو قرآن حکیم کی ملہمانہ روشنی سے دُور کرنا چاہتے تھے۔ لیکن سیاسی مشغولیتوں نے انہیں اس کی فرصت ہی نہ دی کہ وقت آخر آگیا اور دنیا ترجمہ وتفسیر کی تیسری جلد سے محروم ہوگئی۔

راقم ۱۹۵۰ء میں مولانا کی یادفرمائی پر دہلی گیا تو بعض دوسرے استفسارات کے تنا تھ ترجمان القرآن کی تیسری جلد کے متعلق بھی دریافت کیا۔ فرمایا:

”مسودہ تیار ہے کچھ اجزاء کتابت کے لیے بھیج دیئے تھے لیکن ملکی معاملات اتھل پتھل ہو گئے تو اس فرض سے غافل ہونا پڑا۔ خیال تھا کہ التوا مختصر ہوگا۔ لیکن مسلمانوں نے میرے دل کو اس قدر آزردہ کیا ہے کہ اب اس میں شگفتگی پیدا ہی نہیں ہوتی۔ گو دل صد پارہ کی قاشیں بھی کام آسکتی ہیں لیکن جب دل ہی مرقد ہو جائے تو حسرتوں کے اس مزار پر نہ دیئے جلتے ہیں نہ کوئی دوسری رونق پیدا ہوتی ہے۔

قرآن مجید کا ترجمہ وتفسیر اور مقدمہ بیان انشا پردازی یا افسانہ نگاری نہیں اور نہ شاعری کا ہیجان ہے کہ صریر خامہ کے نوائے سروش ہوتے ہی غیب سے مضامین آنے لگیں۔ قرآن مجید کے لیے جبریل عشق کے فیضان اور مشکوٰۃ نبوت کے عرفان کی ضرورت ہے

اور یہ دولت اتنی ارزاں نہیں کہ اِدھر غنچہ کو آواز دی اُدھر قلمدان آگیا۔ اس سفر میں سالہا سال وادیاں قطع کرنی پڑتی ہیں۔"

عرض کیا: "لوگوں میں انتظار ہی نہیں، اضطراب بھی ہے۔"

فرمایا:

"مجھے لوگوں کے اضطراب و انتظار کا اندازہ ہے لیکن میں چاہتا ہوں تیسری جلد پہلی دو جلدوں کی طرح نہ رہے وہ نظر ثانی سے مستغنی ہو۔ جو لفظ ایک دفعہ قلم سے نکل جائے اس کو دوبارہ اٹھایا نہ جا سکے۔ قرآن پر جتنا غور کریں اس کی راہیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ اس کے ایک ایک لفظ میں مطالب و معانی کا ذخیرہ ہے جب بھی ترجمہ و تفسیر کا مسودہ سامنے آتا ہے معلوم ہوتا ہے——

" فلاں چیز رہ گئی ہے اس کا مفہوم اس سے کشادہ ہے اور یہی وجہ اس میں تاخیر کی ہے—— قدرے رُک کے فرمایا:

"بہر حال کاتب کو بلوایا ہے کوئی امر مانع نہ ہوا تو انشاء اللہ مسودہ اس کے حوالے کر دوں گا۔"

لیکن جس سال مولانا سے گفتگو ہوئی اس کے اگلے سال مولانا ۲۲ فروری کو انتقال فرما گئے۔ ع

پھر ان کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

مقدمہ اور البیان کے مسودات کا تو علم ہی نہیں کہ ان پر کیا بیتی؟ مولانا وہ افکار اپنے دماغ ہی میں لیکر اللہ کو پیارے ہو گئے اس سلسلہ میں اشارات کا اگر کوئی مسودہ تھا تو وہ ترجمان القرآن کی تیسری جلد کے ساتھ ہی ناپید ہو گیا۔ بہر حال تیسری جلد کے عنقا ہونے کا المیہ ایسا ہے کہ ایک پورا عہد جو ترجمہ و تفسیر کے انتظار میں تھا اس محرومی کے احساس سے متاثر رہا۔ مولانا نے سچ فرمایا تھا۔

"افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کر سکا۔ غالب کو تو صرف اپنی ایک شاعری ہی کا رونا تھا۔ نہیں معلوم میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیں گی ؎

ناروا بود بہ بازار جہاں جنس وفا

رونقے گشتم و از طالع دُکاں رفتم

تذکرہ | تذکرہ مولانا کے قلم سے پہلی کتاب ہے اپنی کہانی اپنی زبانی، اپنے اجداد اور ان کے سلسلوں کی رشد و

یا پھر دعوت وعزیمت کی بعض شخصیتوں کے سوانح وافکار۔ پہلا ایڈیشن مطبوعہ البلاغ پریس کلکتہ عربی ٹائپ ۲۰×۲۶/۸ سائز کے ۳۱۷ صفحات۔ مرتب مرزا فضل الدین احمد بی ایس سی، ای ایم، ایف جی ایس دیوکو، آغاز میں اس کے قلم سے الف تاں ۱۴ صفحات کا مقدمہ۔ میرزا صاحب ۲۸۶ صفحہ پر رقمطراز ہیں کہ:

"اس مسودہ میں اس کے بعد دوسرا باب حضرت شیخ محمد بن شیخ جمال الدین رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں تھا۔ اور اس پر انہوں نے اپنے والد مرحوم کے مادری سلسلے کا حال ختم کر دیا تھا۔ اس کے بعد تیسرے باب میں ان کے جد امجد حضرت شاہ محمد افضل رحمۃ اللہ علیہ کے حالات ہیں اور پھر مولانا منورالدین رحمۃ اللہ علیہ کے۔ چونکہ بعض وجوہ سے اب کتاب کو دو حصوں میں شائع کرنا مناسب نظر آیا، اس لیے پہلے حصے کو یہیں ختم کر دیا جاتا ہے۔ دوسرا باب حصہ دوم سے شروع ہوگا اس کے ساتھ خود مولانا کے حالات کا حصہ بھی ملا دیا جائے گا جو خاکسار نے مرتب کیا ہے۔ البتہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خاتمہ کتاب کی ایک فصل جس میں مولانا نے اپنے انداز خاص میں خود اپنے حالات کی طرف چند اشارات کیے ہیں اور جن سے اس تذکرہ کے زمانہ تحریر کے حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے اسی حصہ کے آخر میں درج کر دی جائے تاکہ اس جلد کا اختتام بھی بالاجمال مولانا ہی کے حالات پر ہو اگرچہ ان اشارات سے ان عقیدت مندوں کی پیاس نہیں بجھے گی جو ان کے مفصل حالات کے لیے تشنہ ہیں۔"

غرض ۲۸۵ صفحات خاندانی حالات وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ آخر کے ۳۲ صفحات مولانا کے اپنے حالات میں ہیں ان کا انداز انشائیہ نگاری کا ہے بالفاظ دیگر مولانا نے اپنی ذات کے بارے میں شاعری کی ہے۔ آخری دو فصلوں میں پہلی فصل رانچی سے متعلق ہے جہاں مولانا نظر بند تھے، آخری فصل کے اڑھائی صفحوں میں مولوی محی الدین احمد کی گرفتاری پر اپنے مضطربانہ تاثر کا اظہار کیا ہے۔ فی الجملہ ۳۱ صفحات میں سے صرف ۲۴ صفحے مولانا نے اپنی ذات کے بارے میں لکھے ہیں۔ ان میں بیں پچیس سال کے ایک نوجوان کی اڑانوں کا افسانہ ہے یا پھر شاعرانہ اسلوب میں ایک ایسی سرگزشت ہے جو رندی وشوخی کی تمام منزلیں قطع کر چکی اور اپنے دامن تر پر نازاں رہی ہے۔ یہ گویا اس شعر کی تفسیر ہے ؂

ہر کسے را و امن تہمت اما دیگران
باز می پوشند و ما در آفتاب لند ختیم

مولانا رانچی آسام سے باہر وحشی اقوام کے ایک گاؤں مورا بادی میں نظر بند تھے مرزا فضل الدین احمد مئی ۱۹۱۶ء میں مولانا سے ملنے رانچی گئے تو ان سے سوانح لکھنے پر اصرار کیا۔ مولانا اولاً عذر و انکار کرتے رہے پھر راضی ہو گئے۔ میرزا فضل الدین کو ایک خط میں لکھا ہے:

"جو کچھ بے اختیار قلم سے نکل جاتا ہے بھیج دیتا ہوں"

چنانچہ ہفتے بعد پہلے سولہ صفحے لکھ کر بھیج دیے جون ۱۹۱۶ء سے ۷ اکتوبر ۱۹۱۶ء تک سلسلہ جاری رہا۔ کبھی کبھار قلم رُک جاتا۔ میرزا فضل الدین اصرار کرتے تو پھر شروع فرما دیتے۔ غرض ساڑھے چار ماہ کی مدت میں تذکرہ مکمل ہو گیا۔ ابتدا آخر کے ۴۱ صفحات تذکرہ کی تکمیل میں شامل نہ تھے۔ مولانا کو نظر بند کیا گیا تو فروری ۱۹۱۶ء میں میرزا صاحب اجازت لے کر مولانا سے ملنے رانچی گئے وہاں ذاتی حالات لکھنے پر اصرار کیا۔ مولانا کسی طرح تیار نہ تھے۔ میرزا صاحب کوئی چھ ماہ رہے آخر پندرہ سوال مرتب کئے اور مولانا سے جواب لے کر واپس آ گئے لیکن مولانا نے پورا مسودہ نظر ثانی کے لیے منگوا لیا اور اپنی طبیعت کے مطابق تاخیر کر دی۔ میرزا فضل الدین لکھتے ہیں کہ مولانا کو طباعت کے دوران میں بھی اصرار ہی رہا کہ تذکرہ شائع نہ ہو جو کتاب ۷ اکتوبر ۱۹۱۶ء میں مکمل ہوئی تھی اس کی اشاعت کا اعلان جنوری ۱۹۱۹ء میں کیا گیا اور میرزا فضل الدین نے اس کا دیباچہ ۱۶ اگست ۱۹۱۹ء کو لکھا گویا تذکرہ اپنی تکمیل کے تین سوا تین سال بعد شائع ہوا۔

پروفیسر محمد مجیب چانسلر جامعہ ملیہ دہلی تذکرہ سے متعلق اپنے ایک انگریزی مقالہ میں لکھتے ہیں کہ:

"تذکرہ اسلامی فکر کے موضوع پر ایک مقالہ کی حیثیت سے پڑھا جا سکتا ہے اس کی حیثیت ایک کتاب سے بہت زیادہ ہے وہ ایک اشاریہ ہے ایک شخصیت ہے ایک شعلہ اور جوش ہے ایک الہامی آواز کی قوت نطق، ایک بڑے دل کا گریہ و بکا، ایک المیہ کا محزون نغمہ اور ایک فتح کا مسرت انگیز زمزمہ، وہ ایک ایسی خود نوشت سوانح عمری ہے جو ایک تصور کا پیکر بن گئی ہے اور ایسا تصور جو فطرت انسانی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔"

اسی مضمون میں ہے کہ:

"یہ غیر محدود آمد ہی ہے جس نے تذکرہ کو اشخاص کا ایسا موثر بیان اور مذہبی و اخلاقی مسائل کا پرجوش مذاکرہ بنا دیا ہے اس سے مولانا آزادؔ کی شخصیت واقعی طور پر اس قدر منعکس ہوئی ہے کہ کسی صحیح سے صحیح سوانح عمری سے بھی ظاہر نہیں ہو سکتی۔ تذکرہ موضوع نہیں ہے۔ حمایت حق ہے

جس کی تکمیل کے لیے متبحر علم وفضل، الفاظ پر زور اقتدار اور غیر معمولی قدرت کے طرز بیان سے کارفرمائی کی گئی ہے۔"

تذکرہ فی الواقعہ مولانا کی ایک غیر مربوط مگر عظیم تحریر ہے۔ جہاں تک اسلوب نگارش کا تعلق ہے۔ اصلاً الہلال والبلاغ سے مشابہ ہے اس میں اس زمانہ کی چالیس فی صد عربی، تیس فی صد فارسی اور تیس فی صد اردو ہے۔ ساری کتاب میں اوائل شباب کی رنگینی مضمر ہے۔ ہر صفحہ سے مطالعہ کی پختگی، مشاہدہ کی وسعت اور تخیل کا تنوع جھلکتا ہے۔ مولانا کی ساری تعلیم عربی و فارسی ہی میں ہوئی تھی۔ یوں بھی اس زمانہ کے مذہبی شرفاء عربی و فارسی کے سحر سے نکل نہیں سکتے تھے۔ سرسید نے عربی و فارسی کا زور توڑنا چاہا اس کی جگہ بولی ٹھولی اختیار کی۔ مولانا الطاف حسین حالی سادہ زبان لکھنے کے دھنی تھے۔ لیکن جو دعوت مولانا کے ہاں تھی اس کے لیے عربی و فارسی سے مفر ناممکن تھا۔ مسلمانوں کو مخاطب کرنے کے لیے دونوں لازم تھیں۔ ان کے بغیر مسلمانوں کے وجدان وشعور اور جذبہ و ارادہ کو مخاطب کرنا بے سود تھا۔ سرسید کی سادگی نے تہذیب الاخلاق کی وساطت سے اُردو نثر کا رُخ بدلا پھر مولانا حالی نے مقدمہ شعروشاعری، حیات سعدی اور حیات جاوید وغیرہ لکھ کر سادہ طرز تحریر کی عمارت اٹھائی لیکن اس عوامی دعوئی طرز کے باوجود اردو کو عربی و فارسی کے عرش سے اتارنا مشکل تھا۔ تب مسلمانوں میں عربی و فارسی الفاظ ہی کے شکوہ سے بجلیاں دوڑتی تھیں۔ تذکرہ میں مولانا نے مخاطبین کو اپنی ذہنی سطح سے آواز دی ہے یہ ان کے مزاج اور تربیت کے خلاف تھا کہ وہ عوام کی سطح پہ آکر ان سے ہم کلام ہوتے اور قاریوں کی عام استعداد کو ملحوظ رکھتے۔ انہوں نے تذکرہ لکھتے وقت عرب کا سوز دروں اور عجم کا حسن طبیعت اختیار کیا۔ تذکرہ ان کے طنطنہ علم اور ہمہ ہمہ تشکر کا اظہار ہے۔ وہ شعوری نہیں تو غیر شعوری طور پر اپنے سامعین کو مرعوب کرتے اور سینا سے نگارش سے لن ترانی کو صدا دیتے ہیں۔ ان کے مخاطب عام مسلمانوں کے علاوہ دین و مذہب کے وہ افراد تھے۔ جو انگریزی کو اپنے لیے حرام قرار دے چکے تھے۔

اردو کا مزاج پہلی جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴ء) کے بعد بدلنا شروع ہوا لیکن ۱۹۳۱ء تک اس کی چھاپ اسلامی ہی رہی اور جہاں تک زبان کا سراپا تھا اس کے اعضائے رئیسہ عربی و فارسی ہی کے آب و گل سے تیار ہوتے رہے۔ دوسری جنگ عظیم ۴۵-۱۹۳۹ء تک اُردو شاعری کا شکوہ آہنگ اور ولولہ عربی و فارسی ہی کے الفاظ سے تھا۔ مثلاً اقبالؒ کی ملہمانہ شاعری کا سارا کارخانہ عربی و فارسی الفاظ پر قائم ہے۔ اسی

طرح جوش کی انقلابی شاعری بھی عربی و فارسی الفاظ ہی سے اُستوار ہے۔

مولانا نے الہلال، البلاغ اور تذکرہ میں عربی و فارسی کے جو الفاظ استعمال کئے۔ ان سے جو ترکیبیں وضع کیں اور فقروں کی ساخت میں اشعار کو جس طرح موزوں کیا وہ سب ان کا اعجاز تھے۔ ان سے پہلے الفاظ کا یہ ذخیرہ نہ کبھی اُردو نثر میں اس طرح شامل تھا اور نہ ان الفاظ میں وہ برجستہ پن نظر آتا تھا۔ جو مولانا کی طرز نگارش کا سحر ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے بعض خانہ نشین الفاظ کو جلوہ عام بنا دیا اور بے شمار عربی الفاظ کو محمل سے نکال کر بازار فکر کی رونق بڑھا دی۔ اسی طرح فارسی کے ہزاروں الفاظ ان کے قلم کی نوک سے متحرک ہو گئے۔ اس سے پہلے اردو لغت ان سے خالی تھا۔ میرے اپنے اندازہ کے مطابق قریب قریب تین ساڑھے تین ہزار الفاظ و مصطلحات ہوں گے جو کسی بڑے سے بڑے ادیب یا شاعر نے ان سے پہلے اردو میں شامل نہ کیے تھے مولانا کہہ سکتے تھے ؎

کہ میں نے اُنھیں آسماں کر دیا

”تذکرہ“ حقیقتاً کئی مباحث کا مخزن ہے اس کی مثال ایک ایسی جھیل کی سی ہے جس میں کئی چشمے اکٹھے ہوں۔ یوں کہیے کہ ایک چمنستان ہے جس میں طرح طرح کے پھول، کلیاں، شاخیں، قطعے اور روشیں سرسبز نظر آتی ہیں۔ اپنے اجداد سے متعلق تو مولانا نے کم سے کم لکھا ہے مثلاً، ۳۱ صفحوں میں مادری سلسلہ کے مورث اعلیٰ شیخ جمال الدین دہلوی کے متعلق زیادہ سے زیادہ پانچ چھ صفحے کا اجمالی تذکرہ ہے۔ باقی ان کے مختلف سلسلوں اور ان سلسلوں کے ماخذ و مصادر کی مختلف کڑیوں کی حکایت ہے۔ جس میں بے شمار علمی، ادبی، عمرانی، سیاسی، تاریخی، دینی، فقہی اور اعتقادی مباحث آ گئے ہیں۔ اپنے خاندانی حالات کے لیے مولانا نے والد مرحوم کے ایک قلمی رسالہ اور روایات پر انحصار کیا ہے۔ چونکہ کوئی دوسرا رسالہ کتاب یا مقالہ نظر بندی میں سامنے نہ تھا۔ اس لیے کسی روایت یا اس کے حوالے میں ہو سکتا ہے۔ تذکرہ کے حوالے زیادہ تر حافظ کی بنیاد پر ہیں جس سے بشریت خارج نہیں کی جا سکتی۔ تاہم ان کے معجزاتی حافظہ کا اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت نے ان کے دماغ کو اس اعتبار سے گنج قارون بنا دیا تھا۔ مولانا نے آخری صفحوں میں جو کچھ اپنے متعلق لکھا، وہ محض رومانی شاعری ہے۔ ان چند صفحوں میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ انہوں نے رندی کا سفر کیا اور ہوس کی بادیہ پیمائی کو نکلے تھے۔ جہاں تک تصنیفی اصول و مقدمات کا تعلق ہے تذکرہ میں کوئی ترتیب نہیں صرف لفظ فصل کے زیر عنوان ایک نیا مبحث یا ایک نیا مضمون چھیڑ دیا ہے۔ کئی مقامات

کی عبارتیں اس حد تک خطیبانہ ہیں گویا مولانا منبر پر ہجوم کے سامنے خطبہ دے رہے ہیں۔

تمام مباحث کو دعوت وعزیمت کے اذکار کی خصوصیت حاصل ہے یا پھر دعوت وعزیمت کے سفر میں آبلہ پائی کا تذکرہ اور خار مغیلان کی داستان سرائیاں ہیں، قتل وسلب اور تکفیر وتضلیل کے معرکے ہیں، معاصرت کی فتنہ پردازیوں اور تعصب کاریوں کے ہنگامے ہیں ان کے تجزیے اور ان پر تبصرے ہیں فرقہ مہدیہ کے بانی سید محمد جونپوری کے احوال ووقائع ہیں ان کی دعوت وتذکیر کا دفاع ہے۔

تذکرہ کا لب لباب یہ ہے کہ اس میں عمل صالح اور اس کی متحرک ومظہر شخصیتوں کے سوانح ہیں، بعض درباری فتنوں کی روداد ہے، اس زمانہ میں درباری علماء کا مزاج تھا کہ وہ اوامر کی تلقین اور نواہی کی تکذیب کرنے والوں کے دشمن ہو جاتے، تذکرہ میں انہی علماء کی فتنہ کاریوں کو بیان کیا ہے۔

امام ابن تیمیہؒ سے متعلق اگرچہ ہندوستان میں سب سے پہلا مضمون علامہ شبلی نے لکھا لیکن مولانا ابوالکلام آزاد نے تذکرہ میں ان کا ذکر چھیڑ کر پہلی دفعہ ان سے متعلق صحیح مطالعہ کی بنیاد رکھی اس سے خود مولانا کے ذہنی نشو کا سراغ ملتا اور اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی سیرت ڈھالنے میں ابن تیمیہؒ کے افکار وسوانح کو بھی دخل تھا۔ مولانا ایک سیاسی انسان تھے اور یہ راستہ انہوں نے دین ہی کی معرفت اختیار کیا تھا بعض حلقوں میں ان کے سیاسی راستہ پر انگشت نمائی کی گئی۔ بالخصوص اس زمانہ میں جب مسلم لیگ اور کانگرس کے راستوں کا اختلاف تصادم کی شدت اختیار کر گیا اور معاملہ دشنام تک جا پہنچا۔ اس معرکہ میں ایک تو وہ لوگ تھے جو اصولاً سیاسی اختلاف رکھتے اور معدودے چند تھے۔ ایک بڑا گروہ ان لوگوں کا تھا جو اپنے اغراض ومقاصد کے تابع تھے۔ سب سے دلچسپ حال ان اہل علم، اہل قلم اور اہل صومعہ کا تھا جن کی استبداد نوازیوں اور تن آسانیوں کو مسلم لیگ کا دامن مل گیا۔ ان سب نے اکٹھا ہو کر مولانا پر سیاسی یلغار کی اور اس طرح دین میں اپنی گوتاہ نامی کا بدلہ لینا چاہا۔ اکابر ومشائخ کے ان تماشائیوں نے تماشا دیکھنے ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ گلوخ اندازی میں برابر کا حصہ لیا۔ کسی نے وحدت ادیان کا فتنہ چھیڑا، کسی نے سورہ فاتحہ کی تفسیر سے انکار رسالت کا شوشہ اٹھایا۔ کسی نے کہا، مولانا عقل کے ہو گئے ہیں اور قرآن مجید کو ایمان کے بجائے عقل سے ماپنا چاہتے ہیں۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ ترجمان القرآن کی بحث میں اس کا جواب آچکا ہے لیکن ان بے بصر دانشوروں میں اخلاص ہوتا تو مولانا پر جو اعتراض کر رہے تھے ان کا جواب ترجمان سے کہیں پہلے تذکرہ میں موجود تھا۔ مولانا نے امام ابن تیمیہؒ کا یہ قول نقل کیا کہ متکلمین وفلاسفہ سے بڑھ کر مضطرب ومحروم اور اطمینان

قلب وسرور روح کی لذت سے یک قلم نا آشنا دوسرا کوئی گروہ نہیں۔" اور تذکرہ ہی میں لکھا ہے کہ اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت نہ صرف اساس کائنات ہے بلکہ ان کے اتباع ہی کا نام عناصر حیات ہے۔

سیرۃ النبی سے متعلق تذکرہ کے صفحہ ۴۰ پر مولانا نے امام ابن تیمیہؒ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"سیرت کے مطالعہ و تفکر سے قرآن کے رموز و اسرار و غوامض کھلتے ہیں۔ قرآن و حیات نبوی معناً ایک ہی ہیں۔ قرآن متن ہے سیرت شرح، قرآن علم ہے سیرت عمل، سیرت ایک مجسم و متمثل قرآن ہے، مولانا قرآن ہی سے سیرت نبوی مکمل کرنے کے مجوز تھے۔ علامہ شبلیؒ کو اس طرف متوجہ کیا۔ اور خود الہلال و البلاغ میں اس انداز ہی سے سیرت اطہر کے بعض پہلو بیان کئے۔ ان تمام مقاموں کو مولانا غلام رسول مہر نے "رسول رحمتؐ" کے نام سے اضافہ مطالب کے ساتھ مدون کیا۔ یہ آٹھ سو صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے۔ تذکرہ میں ۱۸۰ تا ۱۸۸ صفحہ تک مولانا نے سیرت النبیؐ پر غایت درجہ عالمانہ و والہانہ اشارات کئے ہیں۔ مولانا مہر فرماتے تھے کہ اب تک سیرت پر عربی، فارسی اور اُردو میں جو مواد چھپا ہے اس میں وہ حسن و ندرت نہیں جو مولانا کے ان اشارات و مقالات میں ہے۔

تذکرہ سے پہلے اردو کتابوں میں حوالے دینے کا رواج نہ تھا۔ مولانا نے بقید صفحات و سطور کتابوں کا حوالہ دیا۔ تذکرہ فی الجملہ ان کے حافظہ کا شہ پارہ ہے۔ غرض جس ڈھب کی زندگی ان کا شعار اور اُن کا ولولہ تھا تذکرہ اس کی جامع تصویر ہے۔ ان کے سوانح و افکار کا مرقع ہے اور ان کی شخصیت کے عوامل و عناصر کی بالواسطہ دستاویز ہے۔ افسوس کہ تذکرہ کا دوسرا حصہ یعنی میرزا فضل الدین کے سوالات اور مولانا کے جوابات کی جلد شائع نہ ہو سکی۔ پھر کسی نے اس بارے میں کبھی کوئی جستجو ہی نہ کی، ہوا کیا؟ نذر حوادث ہو گئی یا مولانا نے میرزا فضل الدین سے نظر ثانی کی خواہش پر اسے نذر تغافل کر دی یا مولانا مہر کی روایت کے مطابق میرزا فضل الدین اپنے وطن گورداسپور لے گئے اور واپس نہ کی۔

تذکرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ نظر بندی میں مولانا کے زیر قلم مندرجہ ذیل کتابیں تھیں۔

۱۔ تفسیر، ترجمہ، مقدمہ

۲۔ سیرت شاہ ولی اللہ

۳۔ دیوان غالب اُردو پر تبصرہ

۴۔ شرف جہاں قزوینی کے دیوان پر تبصرہ

۵۔ سیرت حضرت مجدد الف ثانی اس کی تسوید کا آغاز ۱۱ اگست ۱۹۱۶ء کو رانچی میں شروع کی اور ۱۲ اگست کو پورے ایک ہفتہ میں مکمل ہو گئی متوسط تقطیع کے ۱۷۳ صفحے تھے۔

۶۔ امتحان الخلف

۷۔ الکلم الطیب

۸۔ القول الثابت

۹۔ سیرت طیبہ از قرآن مجید

۱۰۔ سیرت امام احمد بن حنبل

سیرت امام ابن تیمیہؒ

۱۱۔ حدیث غربت کی شرح

ترجمہ کی دو جلدیں چھپیں۔ تفسیر و مقدمہ کا پتہ ہی نہیں کہ قلم سے قرطاس کو منتقل ہوئے یا نہیں؟ اگر سالماً یا جزواً لکھے گئے تو کہاں چلے گئے۔ اس کے علاوہ جن مصنفات کے نام دیئے گئے ہیں نہ جانے ان پر کیا بیتی، بہر حال وہ کتابیں نہ کبھی شائع ہوئیں نہ کسی نے کسی حال میں انہیں دیکھا۔ گمان غالب ہے کہ مولانا کی یہ تمام تالیفات ادھورا ہونے کی وجہ سے رحلت کر گئیں۔ ایک مختصر سی مدت ہی میں مولانا اتنا آگے نکل چکے تھے کہ ان کے فکر و انشاء کا ارتقا ہو گیا اور ان مسودوں کو ذہناً متروک کر دیا۔ جہاں تک دوسروں کے سوانح حیات کا تعلق ہے وہ خود سوانح حیات ہو گئے۔ انہیں اپنی شخصیت کے علو نے دوسروں کے سوانح لکھنے سے روک دیا۔ حیات سرمد ان کے قلم کی ابتدائی کوشش تھی۔ اور وہ اس طرز انشاء سے مطمئن نہ تھے۔

تذکرہ کے متعلق بھی ان کا یہی نقطہ نگاہ تھا کہ میرزا فضل الدین نے ان کی منشاء کے خلاف شائع کیا تھا۔ اب اس کا دوبارہ چھاپنا ان کے نزدیک خارج از بحث تھا۔ وہ تذکرہ سے بہت آگے نکل چکے تھے شاید ان کا یہ خیال ہو کہ تذکرہ کا ابوالکلام ۱۹۱۶ء میں تھا ۱۹۲۰ء میں ایک دوسرے ابوالکلام نے سفر شروع کیا۔ راقم نے ۱۹۵۶ء میں مولانا سے تذکرہ کی اشاعت کا ذکر کیا تو فرمایا کہ وہ ایک مرحوم ماضی کے ذوق نگارش کی داستان سرائی ہے۔ اس زمانہ میں کہ چالیس برس ہو چکے ہیں اب فہم و نظر اور تدبر و فکر کے لیے اس قسم کی حکائتیں اضافی سی ہیں۔ یوں سمجھو کہ تذکرہ متروکات سخن میں سے ہے۔ میرے پیش نظر سوانح و افکار کا پورا خاکہ موجود ہے لیکن وقت کی تنگ دامانی اور صورت حالات کی پریشانی نے قرطاس و قلم کو معطل کر رکھا ہے معاملات

کسی مقام پر ٹھہر جائیں تو پوری کہانی لکھی جا سکتی ہے۔

غبارِ خاطر

غبارِ خاطر مولانا کے قلم سے اُن کی آخری تصنیف ہے اس کا پہلا ایڈیشن مئی ۱۹۴۶ء میں چھپا اور ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ دوسرا ایڈیشن تین ماہ بعد شائع ہوا اور وہ بھی بعجلت فروخت ہو گیا۔ یہ دونوں ایڈیشن حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی نے چھاپے لیکن مولانا ان کی طباعت و کتابت سے خوش نہ تھے۔

اس کا تیسرا ایڈیشن آزاد ہند پبلیکیشنز لمیٹڈ ۸ میکلوڈ روڈ لاہور نے پچیس ۲۵ ہزار روپے رائلٹی دے کر پانچ ہزار کی تعداد میں شائع کیا، ہر لحاظ سے معیاری تھا چونکہ زمانہ کاغذ پر کنٹرول کا تھا۔ لہذا مکتبہ احرار ناشر تھا سٹر پر وہ چھپے آزاد ہند پبلیکیشنز کے مینیجنگ ڈائرکٹر تھے نواب زادہ نصر اللہ خان چیئرمین اور راقم مدیر مطبوعات۔ پہلے دو ایڈیشنوں میں آخری خط نہیں تھا، مولانا نے تیسرے ایڈیشن کے لیے مرحمت فرمایا۔ تیسرا ایڈیشن فروری ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ ملک میں ہندو مسلم فسادات کی ہمہ گیر خرابی کے باوجود دو تین ماہ ہی میں ختم ہو گیا۔ برعظیم کی تقسیم کے بعد پاکستان میں رائلٹی کا سوال نہ رہا کئی ناشروں نے چوری اور سینہ زوری کے تحت کئی کئی ایڈیشن چھاپ لیے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ ۱۹۶۷ء میں ساہتیہ اکادمی دہلی کے زیر اہتمام ڈاکٹر مالک رام نے تقریباً ۱۲۳ صفحوں کے حواشی اور ۱۹۰ صفحات کا مقدمہ لکھ کر مطبوعاتِ آزاد کے ضمن میں غبارِ خاطر کا نیا ایڈیشن شائع کیا۔ لاہور کے ایک دو ناشروں نے اس کو بھی اڑا لیا، غرض ایک محتاط اندازے کے مطابق مارچ ۱۹۷۴ء تک مختلف ناشروں کے اہتمام میں کوئی چالیس ایڈیشن نکل چکے اور کوئی ڈیڑھ لاکھ کتاب فروخت ہو چکی ہے۔

کُل ۲۴ خطوط ہیں۔ پہلا خط شملہ سے، دوسرا سری نگر (کشمیر) سے اور چوتھا بمبئی جیل میں براہ ناگپور لکھا گیا۔ باقی ۲۰ خطوط قلعہ احمد نگر میں ۹ اگست ۱۹۴۲ء سے لے کر ۱۵ جون ۱۹۴۵ء تک وقتاً فوقتاً لکھے گئے بظاہر ہے کہ یہ خط قید و بند کے دوران پوسٹ نہیں کیے جا سکتے تھے، مولانا نے دیباچہ میں انہیں نج کے خطوط قرار دیا اور لکھا ہے کہ انہیں اس خیال سے قلمبند نہیں کیا گیا تھا کہ ان کی اشاعت ہو گی۔ لیکن اپنے پرائیویٹ سیکرٹری پروفیسر محمد اجمل خان کے اصرار پر اشاعت کے لیے راضی ہو گئے اور میر عظمت اللہ بے خبر بلگرامی کے ایک رسالہ ’غبارِ خاطر‘ کا نام مستعار لے کر ان خطوط کو شائع فرما دیا۔

شملہ کا خط فی الجملہ مخاطبت کا حرفِ آغاز ہے۔ ادھر سری نگر سے خط اول بھی آغاز ہی کی ایک دلفریبی ہے۔ خط دوم میں قید کے سفر کی اجمالی روداد اور ان خطوط کا تذکرہ وغیرہ ہے۔ چوتھے خط میں قبل از گرفتاری کے ذہنی واردات کا تھوڑا سا ذکر ہے۔ انفلوئنزا کی شدت، کلکتہ سے بمبئی کا سفر، چائے نوشی کے ذوق کی لطافت، فنجانوں

اور بیمانوں کی مناسبت، سگریٹ نوشی کی عادت، اور بحالت قید میں اس کے ترک پر استقلال۔ پانچواں خط "داستان بے ستون و کوہ کن" اسیری کے آغاز سے قلعہ احمد نگر کی نظر بندی تک کے وقائع یعنی گرفتاری کیونکر ہوئی۔ اور قافلہ اسیران کیسے چلا؟ پھر قلعہ احمد نگر پہنچ کر اس کی پوری تاریخ معہ جزئیات سامنے آئی حافظہ کا ہر گوشہ تازہ ہو گیا۔ فرماتے ہیں:

"یہی احمد نگر کا قلعہ ہے جس کی سنگی دیواروں پر برہان شاہ کی بہن چاند بی بی نے اپنے عزم و شجاعت کی یادگار زمانہ داستانیں کندہ کی تھیں اور جنہیں تاریخ نے پتھر کی سلوں سے اُتار کر اپنے اوراق و دفاتر میں محفوظ کر لیا ہے۔"

چھٹا خط پچھلی قیدوں پر ایک جامع کنایہ اور اس ضمن میں سوانحی خطوط کی چند جھلکیوں کا مجموعہ ہے۔ لیکن اس کا اصل مضمون جس سے مولانا کے تبحر علمی عمق نظری اور جودت فکری کی بے پناہیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ فلسفہ، سائنس اور مذہب سے متعلق ان کے مبحث کی نکتہ آرائیاں اور اس راہ میں ان کے فکر کی قدم فرسائیاں ہیں۔

ساتواں خط چائے دسبوحی سے شروع ہوتا، کچھ خاندان کی طرف مڑتا، پھر قلعہ کی فضا میں پلٹتا اور ادبی گل کاری کرتا ہوا ختم ہو جاتا ہے۔ آٹھواں خط بھی کچھ ایسے ہی سانچہ میں ڈھلا ہے۔ اس سے مولانا کے مصائبات کا اندازہ ہوتا ہے۔ نواں خط حکایت مادہ و تریاق ہے۔ جس میں دماغ کے عیش اور جسم کی لذت کا ذکر ہے۔ فرماتے ہیں:

"میں لذتیت سے ان کا دماغ لے لیتا ہوں اور جسم دوسروں کے لیے چھوڑ دیتا ہوں۔"

اسی خط میں ایک فرانسیسی اہل قلم آندری ژید کے سوانح سے ایک فقرہ نقل کیا ہے کہ "خوش رہنا محض ایک طبعی احتیاج ہی نہیں بلکہ ایک اخلاقی ذمہ داری ہے۔" اور اس پر مذہب فلسفہ اور اخلاق کے اصول زندگی کی ایک پوری مجلس جمادی ہے۔ دسواں خط ذاتی حالات و معمولات کے ماخذ و دستاویز کا درجہ رکھتا ہے۔ گیارہواں خط پہلے خط سے کہیں زیادہ سوانحی مواد کے ابتدائی سلسلے مہیا کرتا ہے۔ بارہواں خط وجود باری تعالیٰ پر انسانی فکر کی نقش آرائیوں کا اظہار ہے۔ تیرھواں خط اسی خط کے مبحث کا اعادہ، شرح اور تفصیل ہے اور جدید و قدیم نظریات خدا پرستی کا نچوڑ ہے۔ چودھواں خط، پانچویں صلیبی حملے کی سرگزشت از ژسے آن وہ ژوایں ویل کا جائزہ ہے۔ مولانا نے اس کتاب کے دو خاص مندرجات پر قلم اٹھایا اور مصنف کی کج رواتیوں پر تنقید کی ہے۔ یہ ایک تاریخی لیکن عالمانہ مکتوب ہے۔

جس میں بعض صوفیانہ روایتوں اور حکایتوں کا تجزیاتی اجمال بھی آگیا ہے۔ پندرہواں خط چائے کا تذکرہ ہے جس میں زمانہ حال تک کے نوشیدنی مرحلوں کی روداد ہے (یہی خط ہے جس نے برعظیم میں سفید یاسمین کی شہرت کا آغاز کیا) اور اپنی چائے نوشی کی داستان بیان کی ہے بولھویں خط میں بھی چائے ہی کا تذکرہ ہے۔ مولانا نے سردی سے اپنے لگاؤ کا ذکر کیا اور قلم کی بہار آفرینی تازہ کی ہے۔ سترہواں خط انانیتی ادبیات سے متعلق ہے۔ جس میں اہل قلم کی الیغو ر) پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے نزدیک الیغو فکری انفرادیت کا ایک قدرتی سرجوش ہے۔ مولانا کی شخصیت کا مطالعہ اس خط کے مندرجات کی معرفت بآسانی ہوسکتا ہے کہ وہ عمر بھر الیغو کے سانچے میں ڈھلے رہے اور ان کے افکار و تاثرات کے رنگ و روغن میں الیغو ہی کی فرمانروائی تھی۔ اٹھارہواں خط بظاہر حکایت زاغ و بلبل ہے لیکن اس میں ادبی مطائبات کے علاوہ سیاسیات کی دور دراز طنز بھی ہے۔ انیسواں خط چڑیا چڑے کی کہانی ہے لیکن مطائبات کا چشمہ صافی۔ قدرت تحریر کی مینا کاری کہہ لیجیے۔ بیسواں خط اسی کہانی کی ایک دوسری فصل ہے کہ طبیعت غور و فکر کے دائرے بننے لگتی ہے۔ اکیسواں خط زلیخا (اہلیہ) کی موت پر قلم کی زبانی دل کی خون فشانی ہے۔ بعض فقرے تعزیتی حکایت کے شہ پارے ہیں۔ بائیسواں خط موسم کی تبدیلی پر ایک تاثر ہے تیسواں خط ابوالعلا معری کے زمانہ سے متعلق ایک شعر کی تفسیر کہہ لیجیے۔

چوبیسواں خط موسیقی کے متعلق ایک جامع مقالہ ہے۔ ایجاز و اختصار کی پہنائی میں مطالب و معانی کا سمندر سمٹا ہوا ہے۔ مولانا نے اس خط میں نہ صرف اپنے ذوق موسیقی کی سرگزشت بیان کی۔ بلکہ سیاستدان ابوالکلام کے بجائے ایک ایسے ابوالکلام کو پیش کیا ہے جو دماغ کے عیش دل کے عشق اور جسم کے اقتضا کا انسان ہے جس نے اپنے عنفوان شباب میں تاج محل کے عقبی تختوں پر چاندنی راتوں میں ستار بجائی عمر رفتہ کو آواز دی پھر سنگی مینار دں اور ان کی برجیوں کو ہنستا ہوا پایا۔ حیرت ہے کہ اس خط کے ابوالکلام نے رومانی لمحات سے کیونکر چھٹکارا پایا اور سیاست کی پتھریلی زمین میں عمر مستعار کی آزردہ تنہائیوں کو کیونکر دفن کرتا رہا۔ اس خط کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیقی کی صحبتوں کا ابوالکلام اور سیاست کی محفلوں کا ابوالکلام دو مختلف وجود تھے آخری ابوالکلام چوب خشک صحرا تھا لیکن اس خط کا ابوالکلام چناروں کی چھاؤں میں جوانی چناکہ افتدادانی کی تصویر تھا۔

غبار خاطر کی اشاعت اس وقت ہوئی جب سیاست کا گرد و غبار ہر طرف چھا رہا تھا : : مسلمانوں

میں لیگ کی وجہ سے مولانا کے خلاف ہنگامہ برپا تھا۔ غبارِ خاطر پر بعض تنقیدیں لیگ کے سیاسی ذہن سے کی گئیں حتیٰ کہ بعض دانشور واقف ہی نہ تھے کہ غبارِ خاطر میں کیا ہے، وہ اپنے مقالوں میں پہلودار تنقیدیں کرتے رہے اب اس زمانہ میں کہ سیاست و ادب میں حزبی رشتہ ہو چکا ہے۔ کسی تنقیدی مقالے پر معاشرہ کے اجتماعی مطالعہ کا اعتماد قائم ہونا ممکن نہیں۔ یوں بھی تنقید ایک مطالعاتی جبر ہے جو قارئین کے ذہنوں پر دار رکھا جاتا اور اس طرح مطالعہ کی آزاد راہیں مسدود کی جاتی ہیں۔

مولانا سے غالب کے خطوط کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ غالب کے عوائج و مصائب اور زمانہ و فضا مختلف ہے مولانا کا سفر اور اس کا عہد دوسرا تھا۔ انہوں نے اپنی بپتا سنانے کے لیے خط نہیں لکھے بلکہ قید کی تنہائیوں میں مخاطبت کی ایک صحبت پیدا کی اور اس طرح خیالات کی گزرگاہ میں چوبیس خط لکھ ڈالے جو ان کی ہمہ گیر شخصیت کا پرتو اور ان کے بوقلموں خیالات کا آئینہ ہیں۔ وہ کوئی ناول نہیں اور نہ کسی موضوع کی تفصیل ہیں۔ غبارِ خاطر کا نام ہی ان خطوط پر جامع تنقید ہے۔ جیسے جیسے دل کی لہریں ابھرتی رہیں قلم لکھتا رہا۔ اور اسی طرح ایک مرقع تیار ہوگیا۔ غبارِ خاطر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مولانا کے طرزِ تحریر کا جادو بولتا چالتا اور اور ان کے حسنِ بیان کا آہو چوکڑی بھرتا دکھائی دیتا ہے۔ مولانا نے ان خطوط میں اپنے سوانح حیات کے بعض ورق کھول دیئے ہیں ان سے گم شدہ کڑیاں تلاش کرنا ان کے سوانح نگار کا کام ہے۔

کاروانِ خیال

مولانا کے خطوط کا مجموعہ ہے اور مرتب ہیں محمد عبدالشاہد خاں شیروانی، لیکن اس میں دس خط مولانا کے صدیق مکرم حبیب الرحمٰن شیروانی کے اور سترہ مولانا کے ہیں۔ مولانا کا ایک خط مرتب کے نام بھی ہے لیکن وہ دیباچہ میں نقل کیا ہے۔ اس طرح مولانا کے ۱۸ خطوط ہو جاتے ہیں۔ تین خط ایسے ہیں جو غبارِ خاطر میں آچکے ہیں۔ باقی پندرہ خطوط میں زیادہ تر رسیدی رقعے ہیں۔ ان میں تین چار خط اہم ہیں ایک خط میں سفرِ بغداد کا تفصیلی ذکر ہے۔ ایک میں موسیقی سے لگاؤ کا تذکرہ ہے اور شبلی کے مذاقِ شعر و ادب کے متعلق رواں دواں قسم کا تبصرہ یا تجزیہ ہے۔ ایک خط عبارت کی تبدیلی سے غبارِ خاطر میں درج ہے۔ کاروانِ خیال اگرچہ غبارِ خاطر کے بعد طبع ہوئی لیکن اس کے بعض خطوط غبارِ خاطر سے پہلے لکھے گئے۔ فاضل مرتب کا مقدمہ افادہ کی چیز ہے۔ مرتب نے دونوں کے باہمی تعلقات اُجاگر کئے اور بہت سی عمدہ باتیں بیان کی ہیں۔ جو شخص مولانا کے سوانح پر کام کرنا چاہے وہ کاروانِ خیال کے پانچ چھ خطوط سے بہت سی بنیادیں فراہم کرسکتا اور ان گوشوں سے واقف ہوسکتا ہے جن سے مولانا کے عقیدت مندوں کا آشنا ہونا ضروری ہے۔ المختصر ان خطوط سے مولانا

کے سوانح و افکار کی ترتیب و تجزیہ میں کماحقہٗ مدد ملتی ہے۔

مولانا کی دوسری تصنیفات کی طرح یہ کتاب بھی کئی کئی ناشروں نے چھاپی اور ہزاروں کی تعداد میں بکی ہے۔

مکاتیبِ ابوالکلام مولانا کے اِدھر اُدھر سے فراہم کردہ خطوط کا یہ پہلا مجموعہ تھا۔ جاودبستان لاہور نے شائع کیا۔ پھر دوسرے تیسرے ایڈیشن میں مزید خطوط شامل کئے گئے۔ ایک خط مولانا حالی اور دو خط مولانا شبلی کے نام ہیں۔ ۳۸ خط سید سلیمان ندوی کے نام ہیں اور ۳ خط عبدالقادر قصوری کے فرزند مولانا محی الدین احمد کے نام ہیں۔ ان کے علاوہ پانچ خط مولانا مہر کے نام ہیں لیکن وہ بعض حوالوں سے ماخوذ ہیں۔ مولانا مہر نے مکمل خطوط اپنے مجموعہ "نقشِ آزاد" میں نقل کئے ہیں۔ کچھ خطوط مختلف مستفسرین کے نام ہیں جن میں بعض مذہبی مباحث کا جواب دیا گیا ہے۔

ان خطوط سے بھی مولانا کے سوانح و افکار کی تدوین کو تقویت پہنچتی اور ان کے فکر و نظر کی وسعتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

میرا عقیدہ قاضی سید احمد حسین ممبر پارلیمنٹ (بھارت) نے مدون کیا اور مکتبہ جامعہ دہلی نے فروری ۱۹۵۹ء میں شائع کیا۔ مولانا غلام رسول مہر نے توضیح لکھی۔ مرتب نے پیش لفظ۔ خط زیادہ نہیں حکیم سعد اللہ، مولانا مہر اور مولانا ثناء اللہ کے نام پانچ چھ خطوں کا مجموعہ ہے جس میں مولانا نے ان کے استفسار پر اپنے عقیدے سے متعلق بعض غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کا ازالہ کیا۔ اور ایمان باللہ کے ساتھ ایمان بالرسالت کا مقام و محل بیان فرمایا ہے۔

مکاتیبِ ابوالکلام آزادؒ مرتبہ ابو سلمان شاہجہانپوری، ناشر اردو اکیڈمی سندھ سن اشاعت فروری ۱۹۶۸ء بہ قول مرتب اس مجموعہ میں ۱۹۰۰ء سے لے کر ۱۹۵۷ء تک کے خطوط ہیں ان کی تعداد ۱۷۱ ہے۔ ۱۴۸ مولانا کے اپنے قلم سے ہیں اور ۲۳ ان کے حسب ہدایت سیکرٹریوں کے قلم سے۔ حصہ اوّل میں مولانا کے مختلف مجموعہ ہائے خطوط پر تبصرہ ہے۔ حصہ دوم میں علامہ شبلی، علامہ حالی، مفتی کفایت اللہ، سید سلیمان ندوی، پنڈت جواہر لال نہرو اور چودھری خلیق الزمان کے علاوہ کئی ایک احباب کے نام تقریباً ۵۹ خطوط ہیں۔ اس حصہ میں بعض وقتی تحریریں بھی ہیں۔ تیسرا حصہ ان لوگوں کے تعارف و تذکرہ کا ہے جن کے نام اس مجموعہ کے خطوط ہیں یہ ایک قابل مطالعہ افادی مجموعہ ہے۔ جس سے مولانا کی سیرت کے خطوط اُبھرتے اور ان سے ایک سوانحی خاکہ تیار ہوتا ہے۔

نقشِ آزادؒ

مرتبہ مولانا غلام رسول مہر، ناشر کتاب منزل لاہور۔ کتاب کے تین حصے ہیں۔ حصہ اول میں (صفحہ ایک سے ۵۰۲ تک) مہر صاحب کے نام مولانا کے خطوط ہیں۔ یہ کل ۱۸۱ خط ہیں، جن میں سے ۱۴۲ مولانا کے قلم سے ہیں، دو ان کی طرف سے تار ہیں۔ اور باقی ۵۰ خطوط ان کے پرائیویٹ سیکرٹری محمد اجمل خان اور ۳ خطوط پرسنل سیکرٹری مسٹر ایم این مسعود کے قلم سے ہیں۔

اس مجموعہ کا دوسرا حصہ ان نوٹوں پر مشتمل ہے جو مولانا مہر کی گرانقدر تصنیف غالب کا مطالعہ کرتے وقت چھڑواں اوراق پر لکھے تھے۔ تیسرا حصہ ۱۱ خطوط ایک پیام اور ایک اپیل پر مشتمل ہے۔ اس میں آٹھ خطوط خواجہ حسن نظامی، ایک خط ملا واحدی، ایک خط شفاعت اللہ مرحوم اور چار خط نیاز فتح پوری کے نام ہیں۔ مہر کے نام جو خطوط ہیں ان سے نہ صرف مولانا کی وضعداری، غیرت مندی اور فقر و فاقہ کی تصویر نمایاں ہوتی ہے بلکہ وہ ذہنی گرد و غبار بھی چھٹ جاتا ہے جو ان کے متعلق ایک زمانہ میں سیاسی زبانوں کی معرفت پھیل گیا تھا۔ ترجمان القرآن جلد اول کی اشاعت کے عرصہ بعد جب کانگریس اور لیگ کی آویزش عام ہوئی تو بعض بے قابو طبیعتوں نے ترجمان القرآن کے ترجمہ و تفسیر پر افترا باندھا کہ اس تفسیر کے لیے کانگریس نے تجوریاں مہیا کی تھیں لیکن منشی عبدالقیوم خطاط کے بیان اور بعض دوسرے شواہد سے قطع نظر نقش آزاد کے خطوط ہی سے ثابت ہوتا ہے کہ کاغذ کی خرید کتابت کی اجرت اور طباعت کے بلوں کی راہ میں کتنی مشکلیں سر اٹھا کے کھڑی تھیں اور مولانا فقر و استغنا کی کس منزل میں تھے۔

نقشِ آزاد کے بعض خطوط آج کے حالات میں الہامی معلوم ہوتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ مکتوب الیہ مہر تھے جن کا سیاسی راستہ روزنامہ "انقلاب" کی آخری ہچکی تک مولانا سے مختلف رہا۔ ان مکاتیب میں بیشتر فقرے اس انداز کے ہیں کہ مہر صاحب اس سلسلہ میں راقم سے گفتگو کرتے وقت اشکبار ہو جاتے اور فرماتے کہ "ان خطوط کو اب پڑھتا ہوں تو ہوک اٹھتی ہے۔ انقلاب کا سیاسی سفر مخصوص و مختلف تھا تب ہماری نگاہیں مستقبل سے ہٹی ہوئی تھیں ہم ان فقروں کو الفاظ کی دلفریبی سمجھتے لیکن آج اندازہ ہوتا ہے کہ ان چند کلمات میں مستقبل کا حقیقی تجزیہ اپنے واضح نتائج کے ساتھ موجود تھا۔"

تبرکاتِ آزادؒ

مرتبہ مولانا مہر، ناشر کتاب منزل لاہور

۹۸ مکاتیب اور مقالات کا مجموعہ۔ ابتدا چھ صفحات کا دیباچہ، بہ قول مہر خطوط کا یہ مجموعہ دینی و علمی اور تعلیمی و اخلاقی مسائل سے متعلق مجتہدانہ بصیرت و موعظت کا نادیدہ موقع ہے۔ اس میں مولوی

محی الدین احمد کے نام جو خطوط ہیں وہ بیش قیمت معلومات کا ذخیرہ ہیں۔ عبدالماجد دریا آبادی اور سید سلیمان ندوی کے نام نجی کے خطوط بھی مولانا کی سیرت نگاری میں مدد دیتے اور بعض سوانحی پہلو سامنے لاتے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض متفرق خطوط ہیں اور سب کسی نہ کسی مسئلہ سے متعلق ہیں۔

مکاتیب کا پہلا حصہ ۷۰ خطوط پر مشتمل ہے۔ دوسرا اٹھارہ خطوط کا مجموعہ ہے۔ تیسرا ۲۸ خطوں کا باب ہے۔ اور چوتھا پندرہ مکاتیب سے مملو ہے۔ مضامین میں ہجرت کا فتویٰ فتنۂ ارتداد اور مسلمان و مسئلہ خلافت۔ اور جمہوریہ ترکیہ ابن سعود اور حرمین شریفین، مقابر و آثار پہ عمارات دیش بندھو چترنجن داس، کیا آخری منزل آگئی ہے؟ ان مضامین کے مطالعہ سے مولانا کی ژرف نگاہی اور دقیقہ رسی کا اندازہ ہوتا ہے کہ ایک شخص نے اپنے فکر و عمل کے لیے پہلے دن جو راہ ٹھہرائی تھی اپنی رحلت تک اس پر قائم رہا۔ اور نصف صدی کی گردش نے وہی نتائج پیدا کیے جو اس نے آغاز سفر میں بیان کیے تھے۔

مندرجہ بالا مجموعے مولانا کے تمام خطوط کا مجموعہ نہیں ابھی تک ان کے بے شمار خطوط غیر مطبوعہ ہیں۔ پھر تقسیم کے وقت ان کی ایک بڑی تعداد ضائع ہو چکی ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے پاس کئی ایک خطوط تھے۔ شیخ حسام الدین کے پاس بھی چند مکتوب تھے۔ لیکن وہ تقسیم کے خرابہ میں ضائع ہو گئے۔ اس طرح جو لوگ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے بھاگ بھاگ کر پاکستان آئے ان میں سے تقریباً سب کا ذخیرہ ضائع ہو گیا جو خطوط شائع ہوئے ان میں غالب تعداد علمی و عمرانی تہذیبی و ثقافتی اور ادبی و لسانی مسائل سے متعلق خطوط کی ہے۔ بعض خطوں میں نجی قسم کے واقعات ہیں یا پھر دین و مذہب کے بارے میں بعض سوالات کا جواب وغیرہ ہے۔ مولانا ایک سیاسی انسان اور ایک عظیم سیاسی راہنما تھے۔ لیکن ان تمام مجموعوں میں کوئی سیاسی خط نہیں۔ آخر مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر انصاری، حکیم محمد اجمل خان، سردار پٹیل، بابو راجندر پرشاد اور دوسرے بیسیوں راہنما تھے جن سے مولانا مکاتبت کرتے اور خط و کتابت فرماتے تھے۔

راقم کے پاس ذاتی خطوط کے علاوہ چھ صفحے کا ایک خط ہے۔ مولانا نے یہ خط صوبائی کانگرس کمیٹی سرحد کے صدر خان علی گل خان کو خان غلام محمد خان لوند خوڑ کی اپیل منظور کرتے ہوئے لکھا اور خان عبدالغفار خان کے فیصلہ کو مسترد کیا ہے۔ اس خط کی عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا فیصلہ ایک منصف کے دماغ سے کرتے اور لکھتے ادیب کے قلم سے تھے۔ نہ جانے اس طرح کے کس قدر خطوط گم ہو گئے اور کتنے کہاں پڑے

ہیں۔ ایسے ہی بعض خطوط کا ذکر مختلف اصحاب قلم نے اپنے مقالوں میں کیا ہے۔ جواہر لال نہرو نے اپنی ایک کتاب "کچھ پرانے خطوط میں" مولانا کے چار پانچ خط نقل کیے ہیں مہادیو ڈیسائی نے بھی اپنی کسی تصنیف میں ایک دو خط نقل کیے ہیں۔ پیارے لال نے مہاتما گاندھی کے آخری لمحات میں ایک آدھ خط دیا ہے۔ چوہدری خلیق الزمان نے اپنے سوانح حالات میں اپنے نام ایک خط کا عکس دیا ہے غرض مولانا کے بے شمار خطوط جن سے کئی مجموعے مرتب ہو سکتے ہیں اب تک اشاعت کی دسترس میں نہیں۔

مولانا نے راقم سے ۱۹۵۶ء میں بیان کیا کہ وہ ہندوستان اور پاکستان کے متنازعہ مسئلوں سے متعلق لیاقت علی خان کو فل سکیپ سائز کے ۱۰ صفحات کا ایک طویل خط لکھ چکے ہیں لیکن لیاقت نے جواب ایک طرف رہا رسید تک نہیں دی۔ اگر وہ اس خط پر غور کرتے تو بہت سی پیچیدگیاں ختم ہو جاتیں اور ہندوستان و پاکستان کے مابین جو کھچاؤ بڑھتا جا رہا ہے وہ معدوم ہو جاتا۔

مولانا نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا، لیاقت علی نے غالباً میرے الفاظ پر غور نہیں کیا۔ غور کرتے تو ایک پُر امن مستقبل کی طرف بڑھنا دشوار نہ تھا۔ مسئلہ اب کانگرس اور لیگ کا نہیں رہا، پرائی طاقت جا چکی ہے اب مسئلہ دو آزاد مملکتوں کا ہے۔ ان کی سرحدیں ہی شانہ بشانہ نہیں بلکہ دوسری بیسیوں چیزیں کئی واسطوں سے مربوط ہیں میں چاہتا ہوں دونوں مملکتوں میں دوستی اور ہمسائیگی کا رشتہ اس پختگی سے استوار ہو کہ ایک دوسرے کے بارے میں کسی شک، شبہ اور خوف کے بغیر وہ اپنے عوام کی ترقی و خوشحالی میں مساعی ہوں۔ اور یہ حقیقت کبھی مجروح نہ ہو کہ دونوں ریاستیں ہر لحاظ سے اپنے اپنے حدود میں خود مختار ہیں۔

خان عبدالغفار خان نے راقم سے کہا تھا کہ ان کے پاس مولانا کے بہت سے خطوط ہیں ڈاکٹر خان صاحب نے بھی کئی خطوط کا ذکر کیا تھا نہ معلوم ان خطوط پر کیا بیتی؟ راجہ حسن اختر راوی تھے کہ علامہ اقبال کے پاس مولانا کے تقریباً ڈیڑھ درجن خطوط تھے۔ لیکن اب ان کو ڈھونڈنا یا پانا نظر بہ ظاہر ایک امر محال ہے کچھ نہیں کہا جا سکتا ان خطوط کا کس قدر ذخیرہ تلف ہو چکا ہے۔

دیگر تصانیف

مولانا کی تصانیف میں دین و ادب کی معراج کے اعتبار سے درجہ اول ترجمان القرآن (ہر دو جلد) کو حاصل ہے۔ اُن کی بقاء اور شہرت کے لیے یہ نا تمام تفسیر و ترجمہ کافی ہے۔ دوسرے درجہ پر ادبی و علمی اعتبار سے غبار خاطر (مجموعہ مکاتیب) ہے۔ تیسرا درجہ تذکرہ کو دیا جا سکتا ہے جو مختلف شخصیتوں کے استقامت و ایثار کی ایک کہانی ہے اور اس زمانے کے طرز انشاء کا ایک جامع شاہکار و قول فیصل

عدالت میں ایک بیان ہے لیکن اس کی سیاسی و تاریخی عظمت کو ادب کے صیقل نے تلوار بنا دیا ہے۔ قول فیصل کی مثال فردوسی کے شاہنامہ کی طرح رزمیہ ہے یا پھر رامائن کے طرز پر حق و باطل کی معرکہ آرائی کا افسانہ ہے۔ لہجہ نظم کا، زبان نثر کی اسلوب مبارزت کا۔

"مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب بظاہر پروانشل خلافت کانفرنس بنگال کا خطبہ صدارت ہے لیکن حقیقتاً" ۱۹۱۴ء کی جنگ میں خلافت عثمانیہ کے خاتمہ پر خلافت کے موضوع اور جزیرۃ العرب کے مضمون پر نہ صرف جامع و مانع دستاویز ہے بلکہ اس زمانہ تک مسلمانوں نے تاریخ میں جو خصوصیتیں قائم کی تھیں اور دین کے جو فرائض قرآن نے ان کی ریاست، معاشرے، افراد، جماعت اور حکمرانوں کو سونپے ہیں ان کا تذکرہ تاریخ اور بیان ہے۔ اردو زبان میں اس سے پہلے اس دلکشی کے ساتھ اس موضوع پر ایسی کوئی تحریر نہیں۔

مولانا نے انڈین نیشنل کانگرس، جمعیۃ العلماء ہند اور خلافت کمیٹی وغیرہ کے مختلف سالانہ اجتماعات میں ۱۹۴۰ء تک بحیثیت صدر جو تحریری خطبات دیئے وہ راقم نے پہلی دفعہ اواخر ۱۹۴۴ء میں جمع کر کے رسالہ نقوش کے مالک و مدیر جناب محمد طفیل اور ان کے دوست لطیف فاروقی کو دیئے تھے۔ ہر دو نے ان دنوں اشاعتی سفر شروع کیا اور مشترکہ طور پر مکتبہ شعر و ادب کی بنا ڈالی تھی۔ "خطبات ابوالکلام آزادؒ" اس مکتبہ کی پہلی کتاب تھی۔ ان دنوں لاہور میں ادارہ ادبستان مولانا آزاد کے مقالات الہلال سے انتخاب کر کے چھاپ رہا تھا۔ اور ان کی نظر بندی کے زمانے میں دو تین مجموعے چھاپ چکا تھا۔ ادبستان نے راقم سے خطبات کا سودا کرنا چاہا لیکن معاملہ رہ گیا۔ دہلی کانگرس کے سپیشل اجلاس (۱۹۲۳ء) کا خطبہ کسی کے پاس نہ تھا۔ راقم کو مولانا کے ایک عقیدتمند نے مظفر گڑھ سے ارسال کیا۔ ادھر مکتبہ شعر و ادب کے اہتمام میں مجموعہ شائع ہوا ادھر ادبستان نے پہلا نسخہ خرید تے ہی خود ایک مجموعہ مدون کیا ملک نصر اللہ خان عزیز سے درخواست کی کہ وہ دیباچہ لکھ دیں۔ ملک صاحب نے دیباچہ لکھا اور وہ شائع ہو گیا۔ محمد طفیل اور لطیف فاروقی باہمی اشتراک چھوڑ کر الگ ہو گئے تو خطبات کا تیسرا ایڈیشن اشاعت سے رہ گیا۔ نہ جانے پھر یہ غلطی کس طرح راہ پا گئی کہ خطبات کے جامع اول ملک نصر اللہ خان عزیز قرار دیئے گئے۔ راقم کا نام عنقا ہو گیا۔

ان خطبات کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ:

۱۔ مولانا کی ابتدائی زبان، اس کا لہجہ اور ان کا پیام کیا تھا۔

۲۔ مولانا کی ارتقائی زبان اس کا لہجہ اور ان کا پیام کیا تھا۔

۳۔ ان خطبات سے مولانا کے ادبی نشو اور فکری بلوغ کے مختلف مرحلے معلوم ہوتے ہیں۔

۴۔ مولانا کے تدبر کی پختگی، نظر کی فراست اور فکر کی صلابت کا پتہ چلتا ہے۔

۵۔ بعض جملے الہامی اور دوامی ہیں اس نصف صدی کے واقعات نے ان کی تصدیق کی ہے۔

۶۔ ایک خطیب میں جو خصائص و محاسن ہونے چاہئیں وہ سب ان میں موجود ہیں۔

۷۔ ان میں ایک جامع کمالات انسان کی گہرائی اور گیرائی موجود ہے۔

۸۔ ان کے مطالعہ سے ہم نصف صدی کے برعظیم کی تاریخ مرتب کر سکتے اور ان کے ماخذ معلوم کر سکتے ہیں۔

۹۔ ان میں خطابت کے سبھی لوازم ایک طبی نسخہ کے اجزا کی طرح تولہ، ماشہ، رتی کی رعایت سے موجود ہیں۔

۱۰۔ فنِ تقریر کے طلبہ ان سے متعلمانہ استفادہ کر سکتے ہیں۔

۱۱۔ ان خطبات میں ایک خطیب، ایک مدبر، ایک عالم، ایک مفکر، ایک ادیب اور ایک معلم کی عظیم روح بولتی چالتی نظر آتی ہے۔

مولانا آزاد کی چھوٹی چھوٹی کتابوں میں کئی ایک عہد طفلی کی تصنیفات ہیں۔ جناب عابد رضا بیدار (رامپور) اور ابوسلمان شاہجہانپوری (کراچی) کی تحقیق کے مطابق مولانا نے ۱۸۹۸ء میں کہ اس وقت دس برس کے تھے شاعری کا آغاز کیا۔ اور تحریر و کتابت کی طرف ڈیڑھ دو سال بعد راغب ہو گئے۔ مولانا کا سنِ پیدائش ۱۸۸۸ء ہے غالباً ۱۹۰۰ء میں جب کہ مولانا کی عمر ۱۲ سال کی تھی، آپ نے جلال الدین سیوطی کے ایک مختصر رسالہ نور اللہ فی الخصائل الجمعہ کا ترجمہ کیا۔ پھر جلال الدین سیوطی ہی کے ایک دوسرے رسالے انیس الحبیب فی خصائص الحبیب کا ترجمہ کیا۔ وہ ترجمہ خصائص محمدیہ کے نام سے شائع ہوا۔ امام غزالی علیہ الرحمۃ کی ایک کتاب منہاج العابدین کا ترجمہ کیا۔ اور وہ بھی شائع ہو گیا۔ نفحات الانس کا ترجمہ شروع کیا۔ لیکن چند اجزاء کے بعد چھوڑ دیا۔ ۱۹۰۰ء میں طبیعت فارسی شاعری کو مڑ گئی۔ نل و دمن کے وزن پر ایک مثنوی لکھنا شروع کی لیکن ناتمام رہ گئی۔

مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب آبِ حیات کے حصہ اول کا دورِ دوم تک فارسی میں ترجمہ کیا اور ترکی کے ایک فاضل سیاح طاہر بک کو دکھایا۔ تب مولانا ان سے فارسی شاعری اور فارسی نثر میں اصلاح لیتے تھے۔ کشش مادہ اور کشش عشق کے نام سے ایک رسالہ لکھا جس میں یہ ثابت کیا کہ عالم مادہ کی طرح عالم جذبات بھی ہے اور دونو کے قوانین یکساں ہیں۔ فنون امام غزالی کا ایک رسالہ ہے اس کا ترجمہ کیا، اس عمر اور اسی زمانہ میں بعض رسائل

کے لیے مضامین لکھنا شروع کیے۔ ۱۹۰۱ء یا ۱۹۰۲ء میں تیرہ چودہ سال کی عمر ہو گئی تو امام غزالی کی تہافۃ الفلاسفہ کا ترجمہ شروع کیا لیکن نصف کے بعد طبیعت اُچاٹ ہو گئی اور ترجمہ نامکمل رہ گیا۔

۱۹۰۲ء میں فرہنگ جدید کے نام سے فارسی لغت مرتب کیا۔ یہ مرزا غالب کی قاطع برہان اور ہدایت قلی کی فرہنگ ناصری کے طرز پر تھا۔ اسی زمانہ میں دیوان غزلیات شائع کیا۔ جو اب تک مفقود و عنقا ہے۔ لیکن ابوسلمان شاہجہانپوری نے بعض غزلیں "ارمغانِ آزاد" میں جمع کی ہیں۔ جو شاعری کی ہر صنف میں ابتدائی مشق کے سرسری نمونے ہیں۔ چہار مقالہ شاعری کے بعض مباحث کے متعلق تصنیف ہے۔ اعلان الحق ایک رسالہ ہے۔ آج کل کی اصطلاح میں کتابچہ (قیمت ۲ آنے) جس میں ہلال رمضان کے متعلق شرعی بحثیں نہایت تحقیق کے ساتھ کی گئیں اور کلکتہ کے ان علماء کے رشحات وارشادات کا جواب دیا گیا ہے جو مولانا آزادؔ کے والد مولانا خیر الدین کو مولوی شر الدین کا نام دے کر متہم کرتے تھے۔ پس منظر یہ تھا کہ مولانا کے والد سحر بیان واعظ ہونے کی وجہ سے عوام الناس میں پرستش کی حد تک مقبول تھے۔ ان کے خیالات حنفی مسلک پر خانقاہی نوعیت کے تھے۔ وہ پیروں کی سی چال ڈھال رکھتے اور انہی کی طرح "مقام اُلوہیت" میں رہتے تھے۔ دوسرے علماء نے ان کی مقبولیت کا رد اس طرح کیا کہ ان کی کرامتوں کو رگید نا شروع کیا اور ان کی بدعتوں پر حملے کیے۔ مولانا آزاد اس وقت ۱۰ برس کے تھے۔ والد کی حمایت میں رسالہ قلمبند کیا اور یہ ایک قدرتی امر تھا لیکن ان میں ابھی اس انفرادیت کا ظہور نہیں ہوا تھا جس نے انہیں واقعۃً ابوالکلام بنا دیا۔ اور وہ فکر و نظر اور علم و قلم میں یکتا ہو گئے۔ اس عمر کے اس رسالے سے ایک چیز معلوم ہوتی ہے کہ جو مسلک انہوں نے اپنے والد کے مخالفین کا جواب دیتے وقت اختیار کیا وہ مسلک پھر ان کی مساعی زبان و قلم کا نصب العین ہو گیا۔ ان کی زبان سے نہ کبھی کسی شخص کے خلاف ذاتیات کی آلودگی کا کوئی لفظ نکلا اور نہ انہوں نے سب و شتم یا طعن و طنز کی رکیک راہیں اختیار کیں۔ اعلان الحق ان کے قلم کی پہلی نگارش ہے جو عمر بھر کے اسی مسلک کی بناء قرار دی جا سکتی ہے۔ ان کے قلم میں طعن کا شائبہ ہی نہ تھا۔

"العلوم الجدیدۃ والاسلام" ایک تصنیف تھی۔ معلوم نہیں شائع ہوئی کہ نہیں لیکن "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" میں اس کا تذکرہ ہے کہ علوم جدیدہ کے مقابلہ میں اگر کوئی علم کلام مذہب و اسلام کا دفاع کر سکتا ہے تو وہ سرسید کا علم کلام ہے۔ احسن المسالک صوفی ازم اور طریق ریاضت کے مختلف اسکولوں کی تشریح میں لکھی گئی۔ لیکن اس کی اشاعت وطباعت کا حال بھی معلوم نہیں۔ "الہیئت" اس میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ جدید اسٹرانومی کے تمام اصول مسلمان حکماء دریافت کر چکے تھے۔ اس زمانہ میں میوکینولی نلاماویان کے رسالہ سولر سسٹم کا اُردو ترجمہ کیا۔ جو

ایک فارسی ترجمہ کا ترجمہ تھا۔

المعتزلہ: فرقہ معتزلہ کی تمام تاریخ جو مولانا کی دوسری زیر ذہن تصنیفات کی طرح ادھوری رہ گئی۔

حقیقت معجزات: آریوں اور عیسائیوں کے جواب میں مناظرانہ مباحث جنہیں حکیم محمد حسن شاہجہانپوری نے رسالہ کی شکل میں چھاپ دیا۔ علامہ فرید وجدی مصری نے المراۃ المسلم (مسلمان عورت) لکھی تو مولانا نے الندوہ کیلئے ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک چھپتا رہا پھر کتابی شکل میں شائع ہوگیا۔

معارف النغمات: فن موسیقی میں تھی۔ اس کی ترتیب میں مرزا احمد ہادی نے بھی معاونت کی تھی سال تصنیف ۱۹۰۵ء یا ۱۹۰۶ء ہے۔

اسلامی توحید اور مذاہب عالم: یہ کتاب بھی ۱۸ برس سے قبل کی تصنیف ہے۔ اس میں مولانا نے اسلام کے نظریہ توحید کی وسعتوں کا جائزہ لیا اور بیان کیا کہ یورپ اور ایشیا کے تمام مذاہب اس سے متاثر ہوئے۔ مسیحیت میں ریفارمیشن اور لوتھر کی تحریک بھی لاطینی میں ترجمہ قرآن کا نتیجہ تھیں۔ بابا نانک اور بھگت کبیر کی تحریکیں میں بھی اسلامی توحید کے اثرات تھے۔ حتیٰ کہ راجہ رام موہن رائے اور دیانند سرسوتی بھی اسلام کے نظریہ توحید کی خوشہ چینی سے متمتع ہوئے۔

حیات سرمد: ایک مقالہ ہے جو خواجہ حسن نظامی کی فرمائش پر لکھا گیا۔ پھر رباعیات سرمد کا دیباچہ بنا۔ اس کا دوسرا حصہ ڈاک میں تلف ہوگیا تو ملا واحدی نے اس حصہ کی نارسائی پر خط لکھا۔ جواب دیا کہ:

"اب نہ اتنی مہلت ہے کہ پھر لکھوں اور نہ اس میں اتنی اہمیت ہے کہ دوبارہ وقت صرف کیا جائے۔

تاریخ کے سینکڑوں ارباب اجتہاد و تجدید شکوہ سنج بے اتفاقی ہیں۔ انہیں چھوڑ کر سرمد وغیرہ پر کون وقت ضائع کرے۔"

ابوسلمان شاہجہانپوری کی رائے کے مطابق مولانا کے عہد طفلی کی ان کتابوں کا زمانہ تصنیف ۱۸۹۹ء سے ۱۹۱۰ء تک ہے۔ عبدالرزاق ملیح آبادی نے "ابوالکلام کی کہانی خود ان کی زبانی" میں ان کتابوں کا اجمالی تذکرہ کیا ہے اور محولہ اشارات اس کتاب ہی سے مستعار ہیں۔ اب ان کتابوں میں مسلمان عورت کے سوا کوئی سی کتاب دستیاب نہیں ہوتی البتہ "حیات سرمد" کا دیباچہ مل جاتا ہے۔ جو پہلے مقالہ تھا۔ لیکن سرمد کی رباعیات کے مرتبین نے دیباچہ بنا لیا، تب سے دیباچہ کے طور پر مشہور ہے۔

۱۹۲۷ء میں الہلال کا دورِ ثانی ختم ہوگیا تو ۱۹۳۹ء تک مولانا کے قلم سے ترجمان القرآن ہر دو جلد کے علاوہ کوئی تحریر نہ نکلی نہ کوئی کتاب چھپی، نہ کسی نے ادھر اُدھر سے کوئی ذخیرہ مرتب کیا۔ ۱۹۳۹ء میں ادبستان لاہور نے انتخاب الہلال شائع کیا پھر ۱۹۴۲ء کے دوران بس الہلال ہی سے مرتب کی ہوئی دو ایک کتابیں نکلیں اس کے بعد ۱۹۴۴ء میں بالخصوص اور ۱۹۴۵ء سے لے کر ۱۹۴۷ء کے اوائل تک بالعموم مولانا کے مضامین اور الہلال کے مندرجات کئی اداروں نے مولانا کے نام سے چھاپے۔ ایک دو ناشر حیدر آباد دکن کے تھے، بعض کتابیں لکھنؤ سے اور کچھ دہلی سے شائع ہوئیں۔ لیکن ان کا آغاز لاہور سے ہوا اور لاہور سب میں بازی لے گیا۔

لاہور میں عبداللہ ملک نے ادبستان اور عبداللہ بٹ نے قومی کتب خانہ کو اس راہ پر لگایا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں راقم کے برادر خورد ولی بخش کاشمیری نے اپنے طور پر مولانا کے مضامین انتخاب کر کے چھاپنا شروع کیے ان کتابوں کی مانگ نے کئی ایک پبلشروں کا حوصلہ بڑھا دیا اور وہ الہلال والبلاغ کے مضامین انتخاب کر کے مولانا کے نام سے شائع کرنے لگے۔ ان مجموعوں میں کوئی حسن، نظم اور تحقیق ملحوظ نہ رکھی گئی۔ نتیجۃً بعض ایسے مضامین بھی مولانا سے منسوب ہو کر شائع ہو گئے جو ان کے قلم سے نہ تھے لیکن الہلال والبلاغ میں شائع ہو گئے تھے۔ ان کے مولف و مصنف سید سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، عبداللہ عمادی، مرزا احمد عسکری، عبدالواحد ندوی، حامد علی صدیقی یا عبدالرزاق ملیح آبادی تھے۔ ناشروں نے اپنا فائدہ سوچا اور ہر قسم کے مضامین مرتب کر کے مولانا سے منسوب کر دیئے۔ جہاں تک ضرب و تقسیم کے ان مجموعوں کا تعلق ہے۔ مولانا ان سے بیزار تھے۔ ذرا تے ناشروں نے ان کے نام پر رطب و یابس جمع کر دیا ہے اور جو کچھ چھاپا ہے یہی نہیں کہ اس کا ایک حصہ ان کے قلم سے نہیں ہے بلکہ اکثر مجموعے مجروح کیے گئے اور املا کی غلطیوں سے پُر ہیں۔

ان کتابوں کے تین دور ہیں۔

اولاً، تحریک خلافت کے زمانہ میں منشی مشتاق احمد ناظم قومی دارالاشاعت میرٹھ نے مولانا کے نام سے الہلال والبلاغ کی تحریروں اور صدارتی خطبات کے اخذ سے بیس بائیس مجموعے شائع کیے۔ مثلاً مضامین الہلال، مقالاتِ الہلال، انتخابِ الہلال، تحریکِ آزادی، عیدین، ام الکتاب، امر بالمعروف، ولادتِ نبوی، ذکریٰ، افسانہ ہجر و وصال، اولیاء اللہ و اولیاء الشیطان، حقیقت الصیام، حقیقت الحج، حقیقت الذکوٰۃ،

صدائے حق، جہاد اور اسلام حزب اللہ، تعلیم ترک موالات کا مقصد، اتحاد اسلامی، مضامین آزاد، الحرب فی القرآن اور صبح امید وغیرہ۔ الہلال بک ایجنسی لاہور نے بھی بعض کتابچے شائع کیے۔

ثانیاً، ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۷ء تک کا دور ہے جو دو تہائی لاہور اور ایک تہائی دہلی، لکھنؤ اور حیدرآباد دکن کے ناشروں کی "مساعی" پر مشتمل ہے۔

ثالثاً آزادی کے بعد کا دور ہے۔ پاکستان نے ہندوستان سے بڑھ کر لیکن املا و انشا کی صحت سے بے نیاز ہو کر مولانا کے افکار و رشحات پر مشتمل یا الہلال و البلاغ سے ماخوذ مقالات کی درجنوں کتابیں شائع کی ہیں۔ ایک ناشر نے الہلال سے بعض شخصیتوں کے متعلق مضامین لے کر کتاب بنا دی۔ ناشر مذکور طابع بھی تھا، کاتب بھی اور مرتب بھی۔ اس میں سی۔ آر۔ داس سے متعلق مضمون تو یقیناً مولانا کے قلم سے ہے۔ باقی کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ ادارہ الہلال کے مضامین ہیں یا مولانا کے قلم سے ہیں۔ بعض دوستوں نے الہلال سے "انسانیت موت کے دروازے پر" نقل کیا اور مولانا سے منسوب کر کے شائع کیا۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ عبدالرزاق ملیح آبادی کے قلم سے تھا۔ ایک دوسری روایت یہ ہے کہ مولانا نے ملیح آبادی کو آمادہ کیا کہ وہ تاریخ اسلام اور سوانح اکابر میں سے مشاہیر کے عالم نزع کے آخری لمحات ترتیب دیں۔ مولانا نے ان مقالات پر قلم لگایا اور وہ قلم لگاتے وقت بڑے سے بڑے قلمکار کی تحریر کا کم سے کم دو تہائی حصہ بدل دیتے تھے۔ حزب تقسیم کی ان کتابوں ہی میں "شہید اعظم" (شہادت حسین کا رسالہ) اور "خون شہادت کے دو قطرے" بھی ہیں۔ جس میں ایک مضمون منصور پر ہے جو مولانا کے قلم سے نہیں دوسرا سرمد سے متعلق مولانا کا مضمون ہے۔

مولانا کی تحریروں نے تقسیم کے بعد پاکستان میں بے حد مقبولیت حاصل کی۔ ایک دفعہ کراچی کے ایک ادبی ادارے نے اعلان کیا کہ "اس سال سب سے زیادہ کتابیں مولانا آزاد کی فروخت ہوئی ہیں۔ پاکستانی نوجوان نہ صرف مولانا کے سوانح و افکار جاننا چاہتے ہیں بلکہ ان کے سحر تحریر کا شکار ہو رہے ہیں۔" لاہور میں ایک ناشر (مکتبہ عظمت) نے رسول عربی نام کا ایک مصنوعی ڈرامہ مولانا کے نام سے شائع کر دیا۔ عابد رضا بیدار نے ناشر کی اس سینہ زوری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ مذکورہ ڈرامہ دراصل توفیق الحکیم کا ہے اور مترجم ملیح آبادی ہیں۔ واللہ اعلم، لیکن جہاں تک اس کے دیباچہ کا تعلق ہے اس کی ضعیف زبان ناشر کی ہے۔ راقم نے ناشر مذکور کو اس سینہ زوری سے باز رکھنا چاہا تو اس کا جواب تھا "ہم مہاجر ہیں۔ اپنی جائیداد ہندوستان میں چھوڑ آئے ہیں۔ یہاں روپیہ پیدا کرنے کے لیے اس قسم کا ڈھونگ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ آپ مولانا کی ادبی عظمت اور دینی تبحر

کا احساس نہ کریں ہماری ویرانی کو ملحوظ رکھیں ہمارے لیے مولانا کا نام متروکہ جائیداد ہے اور ایک مہاجر کو متروکہ جائیداد سے مستفید ہونے کا حق پہنچتا ہے۔

برعظیم کی آزادی کے بعد مولانا کے قلم سے کوئی تصنیف نہ نکلی بعض تقریریں یا دو چار نشریے چھپ چھپا گئے۔ البتہ حکومت ہند کے پبلیکیشنز ڈویژن نے شائع کئے ان کا ذکر خطابت کے تحت آچکا ہے۔

مولانا کی رحلت کے تھوڑے عرصہ بعد ان کے سوانح   کے نام سے شائع ہوئے۔ پروفیسر ہمایوں کبیر جو حکومت ہند میں وزیر مملکت رہے اور وزارتی مشن سے گفت گو کے زمانے کی بعض ملاقاتوں میں مولانا کے انگریزی ترجمان تھے۔ اس سوانح عمری کے مرتب و مترجم ہیں۔ ان کی روایت کے مطابق مولانا کو اپنے سوانح حیات لکھنے یا لکھوانے کے معاملہ میں تیار کرنا ناممکن تھا۔ آخر ایک طویل تگ و دو کے بعد وہ سیاسی حد تک تاریخ کے ان وقائع کو بیان کرنے پر آمادہ ہوگئے جو آزادی کی جد و جہد کا ناگزیر حصہ تھے۔

اس طرح سوانح حیات کے تقریباً ڈھائی سو صفحات کوئی دو ڈھائی سال میں تیار ہوئے۔ ہمایوں کبیر ابتدائیہ میں رقمطراز ہیں کہ جب میں دورہ پر نہ ہوتا تو مولانا کی صحبت میں شام کا گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزارتا وہ گفتگو کے فن میں عجیب ملکہ رکھتے تھے۔ اور اپنی سرگزشت کو ایک جیتی جاگتی تصویر بنا دیا کرتے تھے میں ساتھ ساتھ خاصے مفصل نوٹ لیتا رہتا تھا۔ اور جب کسی معاملہ میں وضاحت یا مزید معلومات کی ضرورت ہوتی تو سوال پوچھ لیا کرتا تھا۔ مولانا اپنی ذاتی وضع کے مطابق اپنے ذاتی معاملوں کا ذکر کرنے سے سختی کے ساتھ انکار کرتے رہتے لیکن تمام پبلک مسئلوں پر انہوں نے کھلے دل اور مخلصانہ انداز سے گفتگو کی۔ جب میرے پاس کتاب کے ایک باب کے لیے مواد جمع ہو جاتا تو میں انگریزی میں اس کا مسودہ تیار کر کے ان کی خدمت میں جلد سے جلد پیش کر دیتا۔ وہ ہر باب کو پہلے خود دیکھتے پھر ہم دونوں مل کر اس کو پڑھتے۔ اس منزل پر انہوں نے کبھی کچھ بڑھا کر کبھی کچھ بدل کر کبھی کچھ خارج کر کے مسودہ میں بہت سی ترمیمیں کیں، ہم اس طرح کام کرتے رہے یہاں تک کہ ستمبر ۱۹۵۷ء میں پوری کتاب کا پہلا مسودہ میں نے ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ جب پوری کتاب مولانا کے ہاتھ آگئی تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس کے قریب تیس صفحات جن میں ایسے مسائل اور ایسے تاثرات پر بحث کی گئی ہے جو بڑی حد تک ذاتی اور شخصی تھے فی الحال شائع نہ کئے جائیں اور ان صفحات کے سر بمہر مسودہ کو کلکتہ کی نیشنل لائبریری اور نئی دہلی کی نیشنل آرکائیز میں رکھ دیا جائے۔ اور انہیں کتاب کی اشاعت کے تیس سال بعد شائع کیا جائے۔ مولانا کے حسب ہدایت کانٹ چھانٹ کے بعد نومبر ۱۹۵۷ء میں کتاب کا مسودہ

جب انہیں دوبارہ دے دیا گیا تو اس دفعہ بھی کچھ تبدیلیاں کیں اور فرمایا کہ کتاب اب اشاعت کے قابل ہو گئی ہے۔ نومبر ۱۹۵۸ء کو مولانا کی سترھویں سالگرہ تھی اور اس موقع پر کتاب شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا لیکن مولانا کا پیمانۂ عمر ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء ہی کو لبریز ہو گیا اور کتاب نومبر ۱۹۵۸ء کے بجائے جنوری ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔

اُردو کی بدقسمتی تھی کہ اس کے عظیم المرتبت ادیب کے سوانح حالات انگریزی میں شائع ہوئے اور ان کا اردو ترجمہ مولانا کی زبان سے محروم رہا۔ تاہم جامعہ ملیہ دلی کے وائس چانسلر پروفیسر محمد مجیب نے سادہ و سہل زبان میں شستہ و رفتہ ترجمہ کیا۔ جو ہماری آزادی کے نام سے انگریزی کے پبلشر اورینٹ لونگ مینس ہی نے شائع کیا۔ اس کی ذیلی سرخی ہے۔ ایک "تاریخ جو آپ بیتی بھی ہے" یہ کل سات لفظ ہیں لیکن کتاب کا جامع تعارف ہے۔ مولانا مہر، مولانا آزادؒ کے سوانحی حالات لکھنے کا پختہ عزم رکھتے تھے۔ اور راقم کے اصرار پر ایک خاکہ بھی تیار کر چکے تھے۔ لیکن چند فرمائشی مضامین کے سواقلم کے دوسرے اشغال ہی میں رحلت کر گئے۔ انہوں نے اس کتاب کے متعلق چٹان میں لکھا کہ مولانا کی تصنیف نہیں اور جواز صرف یہ تھا کہ مولانا کے حدی حالات میں دو ایک ایسی غلطیاں ہیں جو خود مولانا کے قلم کی اپنی روایتوں کے خلاف ہیں مثلاً ان کی والدہ کو محمد ظاہر وتری کی بیٹی لکھا گیا۔ تذکرہ کی روایت کے مطابق وہ بیٹی نہیں بھانجی تھیں۔ اول تو یہ تسامح ہے دوسرے انگریزی میں بھانجی کے لیے کوئی موزوں لفظ نہیں۔ تیسرے پہلا باب جو مولانا کے خاندانی حالات پر مشتمل ہے وہ اصل مسودہ کا جز نہیں۔ بلکہ اس خاکے کی تفصیلات کا خلاصہ ہے جو خاکہ کی حد تک مولانا نے دیکھا اور صاد کیا۔ یہ باب سوانح میں خاکہ کی بنا پر شامل کیا گیا۔ اور غالباً مولانا کی وفات کے بعد تحریر ہوا ہے۔

مولانا مہر کی اس تحریر پر "جامعہ" دہلی میں جناب لطیف اعظمی نے قلم اُٹھایا اور ان کے اعتراض کا مسکت الفاظ میں رد کیا۔ خود مولانا مہر کے اعتراض میں کوئی وزن نہ تھا۔ مولانا ابوالکلام اور ہمایوں کبیر حکومت ہند میں ساتھ تھے۔ مولانا ہی انہیں کلکتہ یونیورسٹی سے پروفیسری چھڑا کر لائے تھے۔ پروفیسر محمد اجمل جو مولانا کے سیکرٹری تھے، اس ساری روداد کے عینی شاہد تھے۔ ہمایوں کبیر نے مولانا مہر کی تشفی کر دی اور دہلی کے بعض اہل قلم نے جو مولانا سے قریب رکھتے تھے اس کی توثیق فرما دی کہ "ہماری آزادی" کی ترتیب و تحریر سے متعلق ہمایوں کبیر نے جو کچھ پیش لفظ میں لکھا ہے وہ حرف بحرف صحیح ہے۔ اور مسودہ مولانا ہی کا املا کرایا ہوا ہے۔

مولانا مہر عمر کے آخری دنوں میں خود توثیق کرتے تھے کہ وہ اس بحث کو چھیڑ کر کچھ معلومات حاصل

کرنا چاہتے تھے۔ اس کتاب کے سیاسی واقعات مولانا ہی کے زبان سے ہیں۔ انسان جن واقعات میں سے خود گزرا ہو انہیں کوئی دوسرا شخص ہو بہو بیان نہیں کر سکتا۔ ان میں کوئی غلطی ہوتی تو اس وقت جواہر لال زندہ تھے اور بعض دوسرے رفقا۔ بھی وہ فوراً تصحیح کر دیتے اور فرما دیتے کہ فلاں واقعہ غلط ہے۔ سردار پٹیل سے متعلق جو کچھ لکھا گیا وہ اندرون خانہ کے ایک رازدان کی حیثیت سے صرف مولانا ہی لکھ سکتے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مولانا نے کلکتہ اور دہلی میں محفوظ کردہ مسودوں پہ اپنے دستخط کئے ہیں اور یہ اس کتاب کی صداقت پر مہر ہے۔ کہ اس کے مصنف مولانا ہیں۔" ہماری آزادی" فی الواقعہ ایک ایسے راہنما کے قلم سے ہندوستان کی جدوجہد آزادی اور برطانوی استعمار سے نبرد آزمائی کا تذکرہ و تاریخ ہے جو صف اول کے راہنما کی حیثیت سے خود اس میں شریک تھا۔ اور جب ہندوستان کو اختیارات منتقل ہو رہے تھے تو اس وقت انڈین نیشنل کانگریس کا صدر ہونے کی حیثیت سے برطانوی مشن سے گفتگو کر رہا تھا۔ ادھر ستمبر ۱۹۳۹ء سے اگست ۱۹۴۷ء تک یعنی دوسری جنگ عظیم چھڑنے سے لے کہ ہندوستان اور پاکستان کے یوم آزادی تک ملک بھر میں صف اول کے راہنما زندہ تھے۔ مہاتما گاندھی، قائداعظم محمد علیؒ جناح، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزادؒ، سردار پٹیل لیکن ان میں سے مولانا آزادؒ کے سوا کسی نے بھی آزادی کے بعد اپنے سوانح پر قلم نہیں اٹھایا اور نہ کسی طرح وہ روداد سنائی جو برطانوی اقتدار سے برعظیم کی آخری گفتگو تھی۔ مولانا آزادؒ ہی واحد راہنما ہیں جو ہمیں یہ کہانی سنا گئے ہیں۔

ابوالکلام کی کہانی خود ان کی زبانی

ابوالکلام کی کہانی خود ان کی زبانی: عبدالرزاق ملیح آبادی کے قلم سے ہے۔ "آغاز" کے زیر عنوان ملیح آبادی رقمطراز ہیں کہ یہ کتاب جیل کی یکجائی کا نتیجہ ہے۔ مولانا کو اکسانا شروع کیا کہ تذکرے کی دوسری جلد لکھا دیں۔ ہفتوں میرے بھائی، میرے بھائی کہہ کر ٹالتے رہے۔ میں بھلا پیچھا چھوڑنے والا تھا تقاضا جاری رکھا، آخر راضی ہو گئے اور یہ کتاب لکھانا شروع کرا دی۔ وہ بولتے جاتے تھے میں پنسل سے گھسیٹتا جاتا اور رات کو مسودہ صاف کر لیتا تھا۔ مولانا نے یہ کتاب اس طرح لکھوا دی کہ سامنے نہ کوئی نوٹ ہوتا تھا اور نہ کبھی مجھ سے پوچھا کل کیا لکھوایا تھا۔ دوسرے دن بیٹھتے ہی بولنے لگتے کہ رشتہ فوراً مل جاتا۔"

ملیح آبادی لکھتے ہیں کہ مولانا نے تذکرے میں جوانی دیوانی کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ اردو ادب قیامت تک فخر کرے گا۔ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ تذکرے میں اس عنوان سے جو اجمال ہے اس کی شرح ہو

جائے وہ بمشکل راضی ہوگئے اور بہت کچھ لکھوادیا، لیکن اگلے روز صبح ہی صبح مسودہ لوٹا لیا، فرمایا نظر ثانی کروں، عرض کیا آپ کی نظر ثانی کا حال معلوم ہے، یعنی مسودہ غائب اور یہی ہوا۔

اس کتاب میں مولانا نے نہ صرف اپنے والد مرحوم کے حالات بلاکم وکاست بیان کئے ہیں بلکہ اوائل عمر کا سفرنامہ بھی لکھوایا ہے، بہ قول ملیح آبادی:

"ایک ننھا سا بچہ ہے، دل فریب چہرہ پر بوڑھوں کی سنجیدگی چھائی ہوئی ہے، "ابوالکلام" بنا چلا جارہا ہے اور آپ ہیں کہ اس خارق عادت، ذہانت وفطانت پر حیرت میں ڈوبتے اور عش عش کرتے چلے جارہے ہیں۔"

اس کتاب کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ مولانا کی روزمرہ کی بات چیت قلمبند ہوگئی ہے۔ مولانا کے قلم کی گل کاریاں تو بہت کچھ محفوظ ہو چکی ہیں مولانا کی معجز بیانیاں بھی ہماری موجودہ نسل کے کانوں میں برابر گونجتی رہیں گی اور کوئی کوئی تقریر قلم بند ہو چکی ہے۔ مگر مولانا نج میں بیٹھ کر کس طرح گفتگو کرتے تھے ان کی یہ گفتگو ہو بہو اس کتاب میں محفوظ ہو چکی ہے اور یہ ایک بڑی بات ہے۔ چونکہ تقریروں کی زبان الگ ہوتی ہے اور تحریر بھی روزمرہ گفت گو کا ساتھ نہیں دیتی، اس کتاب میں بعینہٖ وہی کچھ ہے جو مولانا کی زبان سے نکلا تھا۔ میں نے اس میں کسی قسم کا تصرف یا تغیر وتبدل کرنا خلافِ دیانت سمجھا ہے۔"

ملیح آبادی لکھتے ہیں:

"لکھا دینے کے بعد اس کتاب کو مولانا بالکل ہی بھول گئے مجھے حق الیقین ہے کتاب یاد آجاتی تو نظر ثانی کے بہانے ضرور چھین لیتے اور ان کے بے شمار مسودوں کی طرح یہ بھی ہمیشہ کے لیے غائب ہوجاتی۔"

یہ کتاب اشاعت سے ۳۷ برس پہلے ۱۹۲۱ء میں لکھائی گئی۔ مولانا کو یاد ہوتا یا ملیح آبادی سے حاصل کر پاتے تو لازم تھا کہ مسودہ غائب ہوجاتا، ملیح آبادی جانتے تھے کہ اس زمانے میں مولانا بعض وہ خیالات پبلک میں لانا پسند نہ کرتے جو کتاب میں درج ہیں۔ راقم کا خیال بھی یہی ہے کہ مولانا شاید اس طرح اپنے سوانح پیش نہ کرتے۔ جب تک ان کے قلم سے کوئی سی کتاب طباعت کے لیے مشین پر نہ چلی جاتی، وہ اس میں کانٹ چھانٹ اور اصلاح وترمیم کے خوگر تھے۔

یہ کہانی اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ اس میں ابوالکلامؒ سے پہلے کا ابوالکلامؒ موجود ہے ایک ایسا ابوالکلامؒ

جو ابھی ابوالکلام نہیں بنا تھا جس کے دل کا ہر یقین شک کے حصار میں تھا اور جس کی روح کا ہر اعتقاد تذبذب کے نرغہ میں تھا۔

مولانا نے الہلال کے سن اجرا سے لے کر عمر کی آخری کروٹ تک سرسید کے افکار و نظریات سے اختلاف کیا بلکہ ان کے زبردست نقاد رہے۔ مولانا الطاف حسین حالی سے ایک گونہ ارادت کے باوجود سرسید کی سوانح عمری "حیات جاوید" پر زبردست تنقید کی۔ اپنی کتاب کے آخری اوراق میں مولانا نے ابتدائی عمر کے اس پڑاؤ کا حال لکھوایا ہے۔ جب گھر کی فضا سے باغی ہو کر سرسید کی ذہنی راہنمائی قبول کی اور سرسید کے ہو رہے تھے۔ لیکن وہ حالت بھی زیادہ دیر نہ رہی اس نے اعتقاد و عمل کے نئے دروازے کھول دیئے اور مولانا ایک ایسے دوراہے پر کھڑے ہو گئے جو اس وقت ان پر واضح نہیں تھا لیکن آئندہ کے سفر کا سنگ میل تھا، مولانا نے اس مرحلے کو اپنی زندگی کے سب سے زیادہ تاریک وقت کا نام دیا اور روماغ کا عالم نزع کہا ہے۔ ملیح آبادی نے آخر میں لکھا ہے کہ مولانا یہاں تک لکھا چکے تھے کہ جیل سے رہا ہو گئے اور یہ دلفریب داستان افسوس یہیں رک گئی۔ بہرحال یہ کتاب مولانا کی ابتدائی عمر کے حالات پر ایک منفرد نگارش ہے کہ اس ابوالکلام کی کہانی ہے جو عرصہ بعد ابوالکلام بنا امام الہند کہلایا اور الہلال کا صور پھونکا۔ مولانا نے الہلال جلد ۴ نمبر ا صفحہ ۲۶ پر لکھا ہے کہ:

"قرآن حکیم مسلمانوں کا حقیقی امام ہے"

اور ترجمان القرآن جلد اوّل کے صفحہ ۷ پر رقمطراز ہیں:

"میرا یقین ہے کہ مسلمانوں کی زندگی و سعادت کے لیے سرچشمہ حیات حقیقت قرآن کا انبعاث ہے"۔

مولانا نے اس حقیقت کو اعراض و انکار کی بہت سی وادیاں قطع کرنے کے بعد پایا تھا۔ اس کتاب میں مولانا کی وہ ساری ذہنی کشمکش خود ان کی زبانی موجود ہے، جو سرسید کے افکار و عقائد سے متاثر ہو کر موروثی مذہب سے ان کی دل برداشتگی کا باعث ہوئی اور وہ خاندانی مذہب سے بغاوت کی راہ پر آ گئے۔ اپنے والد کے مسلک پر ان کا لوٹنا محال تھا کہ والد کا راستہ عشق کے غلو کا راستہ تھا۔ اور اس ساری کشمکش میں حقیقی اسلام ان کے سامنے آ چکا تھا وہ اس میں ڈوب گئے۔ ترجمان القرآن کی دو نو جلدیں اسی یقین و اعتقاد کی سرچشتی اور علم و صداقت کے ولولے سے معمور ہیں کہ ہر چیز استدلال و ایقان کے ترازو میں تلی ہوئی نظر آتی ہے۔

اس کتاب میں ایک چیز انتہائی عمدگی سے بیان ہوئی ہے کہ مولانا نے اپنے والد کے غلو فی المذہب ہی کو ہدف نہیں بنایا بلکہ صلحائے اُمت کے خلاف ان کا طرزِ عمل بھی بیان کیا ہے اور ان مصائب کو شرحِ صدر سے لکھا ہے۔ جو ان کے ہاتھوں علمائے اہلِ حدیث پر ہندوستان اور حجاز میں بیت رہے تھے۔

نوادر ابو الکلام

سرسید بک ڈپو علی گڑھ نے ۱۹۶۲ء میں شائع کیا۔ مرتب عبدالغفار خان شکیل ایم اے ایل ایل بی ابتدائی گیارہ صفحات میں مولانا کے فارسی اُردو اشعار ہیں اور وہ کچھ زیادہ نہیں، دو چار غزلیں، ایک آدھ قصیدہ اور چھ سات رباعیاں۔ ان میں کوئی چیز نوادر میں سے نہیں۔ باب دوم میں مخزن لاہور، سرپنچ پٹنہ اور وکیل امرتسر سے ماخوذ ابتدائی مضامین ہیں۔ باب سوم میں ۱۹۱۴ء اور ۱۹۲۷ء کے الہلال کا انتخاب ہے، لیکن یقین نہیں کہ سب مولانا ہی کے قلم سے ہوں۔ باب چہارم میں قرآن و سوشلزم، ایک ہی مضمون ہے۔ مولانا حسرت موہانی کے اردوئے معلی نومبر ۱۹۲۵ء سے منقول ہے۔ باب پنجم میں پانچ تقریریں ہیں، ابتدائی تین تقریریں موضوع کے لحاظ سے فکر انگیز ہیں۔ باب ششم میں مختلف رسائل سے نقل کیے ہوئے خطوط ہیں، ایک خط حکیم محمد علی ایڈیٹر مرقع عالم کے نام چار خط یحییٰ اعظمی کے نام ایک البرامکہ کے مولف مولوی عبدالرزاق کانپوری کے نام ایک سید افتخار عالم کے نام چار قاضی عبدالغفار کے نام ایک عبدالرحمٰن ممبر پارلیمنٹ کے نام ایک محمد اکبر باٹوی کے نام ایک بابائے اردو مولوی عبدالحق کے نام گیارہ مولوی عبدالماجد مدیر صدق کے نام چودہ منشی عبدالقیوم خطاط ترجمان القرآن کے نام اور ایک بیگم حسرت موہانی کے نام۔ مزید دو خط ان کے سیکرٹریوں کی طرف سے ریاست میسور کے ایک صاحب ایم این جاوید کے نام ہیں۔

ناشروں کے مجموعے

مولانا رحلت فرما گئے تو پاکستان میں ان کے نام سے الہلال، البلاغ سے منقول مضامین تقسیم کے تحت بہت سی کتابیں شائع ہونے لگیں۔ ایک نوجوان نے سادات سٹریٹ میکلوڈ روڈ لاہور میں ابو الکلام اکیڈمی قائم کی، اور کئی ایک مجموعے شائع کیے۔ انہی مجموعوں میں ایک مجموعہ درس وفا تھا۔ اس میں الہلال سے ماخوذ چار افسانے تھے، پہلا جنید بغدادی اور ابن ساباط کا واقعہ ہے، دوسرا امیر تیمور گورکانی سے ایک عورت کی فریاد ہے جس کے اکلوتے بچے کو قزاق اُٹھا کر لے گئے تھے۔ تیسرا وکٹر ہیوگو کے افسانہ قربانی کا ترجمہ ہے۔ چوتھا ترکی کے شاہزادہ جم کی روداد ہے کہ اس نے اپنے بھائی کے ہاتھوں ہزیمت اُٹھانے کے باوجود سلطنت ترکی سے غداری نہ کی، اور موت کے آغوش میں چلا گیا۔ ابن ساباط اور وکٹر ہیوگو کے مضمون کا ڈھنگ تو مولانا کے قلم ہی کا ہے لیکن باقی دو مضامین کے متعلق یہ گمان بھی مشکل ہے۔ راقم کا

خیال ہے کہ ضرب و تقسیم کے تحت ان سے منسوب ہو گئے ہیں، البتہ جامع الشواہد مولانا ہی کے قلم سے ہے اور کئی دفعہ کئی ناشروں نے مختلف شہروں میں چھاپی ہے۔ اس میں مساجد کے حقوق و آداب وغیرہ کے علاوہ یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی اجازت سے نامسلمان مساجد میں شرعاً داخل ہو سکتے اور ان کی مجالس میں بیٹھ سکتے ہیں۔

اصحاب کہف ترجمان القرآن سے الگ کر کے اوبستان لاہور نے پہلی دفعہ ۱۹۴۹ء میں شائع کی۔ فلسفہ، مکتبہ چٹان لاہور نے شائع کی۔ مولانا نے ہندوستان کے آزاد ہوتے ہی ۱۹۴۷ء میں ایک ایجوکیشن کانفرنس طلب کی اور ڈاکٹر رادھا کرشنن کو فلسفہ کی ایک نئی تاریخ لکھنے کے لیے مجوزہ بورڈ کا صدر بنایا۔ انہوں نے مشرقی و مغربی فلسفہ کی ایک نئی تاریخ مرتب کی، مولانا نے اس تاریخ کا دیباچہ لکھا۔ فلسفہ محمد وارث کامل کے قلم سے اس دیباچے ہی کا ترجمہ ہے۔ ایک باقاعدہ کتاب بنانے کے خیال سے فاضل مرتب نے ترجمان القرآن جلد اول اور غبار خاطر کے وہ مباحث بھی اس میں شامل کر دیے ہیں، جو فلسفہ سے متعلق تھے۔ اس پیوندی ترتیب میں کتابی تسلسل کے علاوہ ربط و ضبط بھی ہے اور یہ مطلق محسوس نہیں ہوتا کہ مختلف کتابوں کی عبارتیں جوڑ کر یہ کتاب تیار کی گئی ہے۔

خطبات جمعات و عیدین مرتبہ سیف صدیقی ناشر زمزم بک ایجنسی لاہور کل گیارہ خطبات ہیں جو فاضل مرتب نے بالی گنج کلکتہ کی مسجد میں ۱۹۳۴ء کے دوران ہر جمعہ کی نماز میں سماعت کیے اور گھر جا کر قلمبند کرتے رہے۔ مرتب کا بیان ہے کہ انہوں نے مولانا کے انداز بیان کو باقی رکھنے کی پوری سعی کی ہے۔ ان خطبات میں مولانا کی آواز ضرور موجود ہے۔

تحریک آزادی مرتبہ انور عارف، ناشر مکتبہ ماحول کراچی، مولانا ہی کی تحریروں اور تقریروں کا مجموعہ ہے۔ اس میں کوئی نئی چیز نہیں جو کچھ مولانا نے مختلف مواقع پر لکھا یا کہا مرتب نے جمع کیا ہے۔ سات مضمون ہیں آخر میں مرزائیت وغیرہ سے متعلق مولانا کے دو تین خط ہیں، لکھنؤ کانفرنس کا طویل مضمون ایک تاریخی روداد ہے جس سے ہندوستان کے فرقہ وارانہ فساد اور نہرو رپورٹ کے مزاج کی بعض جھلکیاں معلوم ہوتی ہیں۔

مضامین ابلاغ مرتبہ محمود الحسن صدیقی ناشر آئینہ ادب چوک انارکلی لاہور دس مضامین کا مجموعہ ہے اور یہ سب مولانا ہی کے رشحات قلم کہے جا سکتے ہیں۔ ناشر نے شروع میں لکھا ہے کہ وقت کے سیاسی ہنگاموں نے اگرچہ مولانا ابوالکلام کو ہم سے الگ کر دیا لیکن ان کے قلم سے نکلے ہوئے جملے آج بھی ہمارے دلوں کو محبوب ہیں۔

ان کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف نے تیر و نشتر کا کام کیا اور قوم کے جسد و روح میں نئی زندگی پیدا کی ہے۔

عبد اللہ بٹ مرحوم نے مولانا آزاد سے متعلق ملک کے نامور اہل قلم اور بعض سیاسی اکابر کے مضامین کا ایک مجموعہ شائع کیا، پھر "الہلال" سے مقالات آزاد اور مضامین آزاد مرتب کئے، ہر سہ کتابیں قومی کتب خانہ لاہور نے ۱۹۴۴ء میں شائع کیں ان سے مولانا آزاد کے سحر قلم کا نئی پود اور ان لوگوں کو پہلی دفعہ اندازہ ہوا۔ جو الہلال کے غروب ہونے کے بعد پیدا ہوئے یا جوان ہوئے تھے "مضامین آزاد" میں الہلال کی سیاسی تعلیم کے زیر عنوان مقالہ اول مولانا کے سوانح و افکار پر کام کرنے والوں کو تحقیقی خطوط مہیا کرتا ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے متعلق حدیث الغاشیہ کے صفحات مطالبات کی چیز ہیں۔ الغرض یہ مجموعہ حتی الامکان صحت کے ساتھ شائع کیا گیا اور ہر مقالہ اپنی انفرادی خصوصیت کے علاوہ مستقل اہمیت رکھتا ہے۔

مضامین لسان الصدق

مرتب ہیں عبد القوی دسنوی اور ناشر ہے نسیم بک ڈپو لکھنؤ سال اشاعت دسمبر ۱۹۶۷ء اس مجموعہ میں پانچ مضمون ہیں، مرتب نے مولانا آزاد ہی کی تحریروں کا انتخاب کیا ہے، مرتب کا دیباچہ قابل مطالعہ ہے۔ لسان الصدق کے مقاصد اربعہ سے متعلق مولانا کا مضمون ان کے ابتدائی ادبی سفر کی عکاسی کرتا اور ان کے ذہنی بلوغ کی ابتدائی کڑی ہے۔ انجمن حمایت اسلام سے متعلق مختصر سا مضمون خوب ہے۔ آخر میں لسان الصدق سے متعلق معاصرین کی آراء ہیں۔ چونکہ لسان الصدق نومبر ۱۹۰۳ء میں نکلنا شروع ہوا تھا، اور مولانا کی عمر اس وقت پندرہ سال تھی۔ اس لیے ان آراء سے مولانا کے مستقبل کی تصویر ملتی اور ان کے ذہنی آب و گل کا پتہ چلتا ہے۔ سر شیخ عبد القادر اور مولانا ظفر علی خان کے علاوہ بعض رسائل کی آراء بھی نقل کی گئی ہیں ان سب نے ابوالکلام کے ذوق کی بلوغت کا اعتراف کیا ہے۔

باقیات ترجمان القرآن

مولانا غلام رسول مہر (ایڈیٹر انقلاب) نے عمر بھر مولانا آزاد کے سیاسی نظریات سے اختلاف کیا لیکن دین و ادب میں ہمیشہ ان کے معتقد رہے۔

مولانا آزاد کو مہر صاحب کے اس تعلق خاطر کا اعتراف تھا۔ جب بھی مہر و سالک سیاسی افکار کی حریفانہ و معاندانہ مخالفت کے باوجود ملاقات کو حاضر ہوتے۔ مولانا نہ صرف خندہ پیشانی سے پیش آتے بلکہ کم آمیز ہونے کے باوجود ان کے لیے دروازہ ہمیشہ کھلا رکھا، مہر صاحب مولانا سے کچھ زیادہ ہی قریب تھے، اور مولانا

بھی انہیں عزیز ہی سمجھتے تھے، مہر صاحب آزادی کے بعد مولانا کا ذکر اس محبت اور عقیدت سے کرتے کہ حیرت ہوتی، وہ گویا ان کے عشق میں ڈوب گئے تھے۔ اکثر اپنے ماضی کی سیاسی جدوجہد پر افسوس کرتے اور مولانا کے فکر و نظر کو خراج پیش کرتے، فرماتے۔

"مولانا برعظیم کے لیے قدرت کا عطیہ تھے۔ ہم نے ان کی فراست کو جھٹلا کر اپنے مستقبل کو آگ لگا دی ہے۔"

راقم نے ان سے ہر ملاقات میں مسلسل گزارش کی کہ وہ مولانا کے سوانح و افکار پر کوئی مبسوط کتاب لکھیں۔ ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اوائل عمر سے وہ مولانا کے قاری و سامع اور عزیز و شناسا تھے۔ اور عملی سیاست کے لیل و نہار سے گزرے تھے۔ کئی تحریکوں میں حصہ لیتے رہے۔ زمیندار و انقلاب کے ایڈیٹر کی حیثیت سے سیاسی زندگی کی ہر چال سے واقف تھے۔ روزنامچہ لکھنے کا شوق تھا، زمانہ طالب علمی سے لے کر اپنی زندگی کے آخری دن تک روزنامچہ لکھتے رہے۔ مولانا کے سوانح کی ضرورت کا احساس و اعتراف کرتے لیکن معیشت کی فکر میں فرمائشی کتابوں کا ایک انبار ان کے گرد و پیش رہتا، اور وہ ان کی ترتیب و ترجمہ اور تالیف و تصحیح میں لگے رہتے۔ راقم نے عرض کیا کہ اس طرح آپ مولانا کے سوانح نہ لکھ پائیں گے، کیونکہ اب آپ کے لیے ہندوستان جانا مشکل ہے اور وہ معلومات حاصل کرنا بھی دشوار ہے جو مولانا کی سوانح عمری کے لیے آپ فراہم کرنا چاہتے ہیں۔ یوں بھی ہندوستان میں اب کسی رفیق سفر کا ملنا مشکل ہوگا، بسم اللہ کیجیے، یادداشتوں کی شکل میں مختلف ابواب یا موضوع لکھتے جائیے اور جمع کرتے رہیے۔ اس طرح ایک ذخیرہ ہو جائے گا، پھر انہیں ترتیب دے کر کتاب بنا لیجیے تب وہ خلا پورا کرنے میں آسانی ہوگی جو اس وقت کتاب سے تشریح یا محسوس ہوں گے، مہر صاحب مان گئے۔ راقم سے کہا، اچھا۔ دوسرے تیسرے روز سوالات کا ایک نقشہ بنا کر بھیج دیا کرو، جوابات سے راستہ کھل جائیگا اور اس طرح مواد یکجا کر لیں گے۔ لیکن مہر صاحب کی مصروفیتوں کے لیے جواب دینا مشکل تھا، بیل منڈھے نہ چڑھی۔ چٹان کے لیے کچھ مقالے لکھے اور کچھ ادھر ادھر کے رسائل و جرائد میں تحریر کیا جس سے ایک اچھا خاصا مواد جمع ہو گیا لیکن کتاب کی شکل نہ بن سکی اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مولانا آزاد کی وفات کے بعد جب ترجمان القرآن کی تیسری جلد کا مسئلہ اٹھا اور نتیجہ ع

آرزو، پھر آرزو کے بعد خون آرزو

کے سوا کچھ تھا نہیں تو مہر صاحب نے تیسری جلد کے خلا کو باقیات قرآن کے نام سے پُر کرنا چاہا، چنانچہ ترجمان القرآن

کی دو جلدوں کے اٹھارہ پاروں کو چھوڑ کر باقی بارہ پاروں کی اُن آیات و سورہ کا ترجمہ مع تفسیر و تشریح الہلال و البلاغ سے جمع کیا، جو مختلف مضامین میں استعمال ہوئیں، یہ ۷۰ سورتوں کے ترجمہ و تصریح اور تشریح و تفسیر کا مجموعہ ہے بعض ضروری وضاحتیں حاشیے میں لکھ دی ہیں۔ مہر صاحب لکھتے ہیں :

"میں نے جو چیزیں جمع کی ہیں ان کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ یہ "ترجمان القرآن" جلد سوم کا بدل ہوگا، حاشا و کلا، مطلب صرف یہ ہے کہ جو کچھ بھی مولانا کے قلم سے اس حصہ قرآن کے متعلق نکلا جو جلد سوم کا موضوع تھا وہ خوانندگان کرام کے سامنے آجائے۔ مجھے یہ کہنے کا بھی کوئی حق نہیں کہ اگر مولانا کی مرتب فرمائی ہوئی جلد سوم شائع ہوتی تو ان آیتوں کا ترجمہ یا تشریح وہی ہوتی جو میں نے مولانا کی تحریرات سے پیش کی ہے۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ اگر وہ سب کچھ میسر نہیں آسکتا جس کی توقع مولانا کی ذات گرامی سے تھی تو جو کچھ مل سکتا ہے اسے پیش کرنے میں تامل نہ ہونا چاہیے۔ بے شک وہ نقاش کا نقش اول ہی ہو نقش ثانی نہ ہو۔

مولانا کا طریقہ یہ تھا کہ کسی مضمون یا مقالے کے سلسلے میں قرآن مجید کی آیات پیش کرتے تھے تو عموماً تشریحی ترجمہ فرماتے تھے۔ پیش نظر مجموعہ میں بھی ایسی آیات ہیں جن کا ترجمہ تشریحی ہے۔ میں نے اپنی سمجھ کے مطابق حتی الامکان تشریحی حصوں کے آگے پیچھے خطوط وحدانی کھینچ دیے ہیں تاکہ ترجمہ اور تشریح الگ الگ ہوجائیں۔ لیکن اس کوشش میں ہر جگہ کامیاب نہیں ہوا۔ بعض مقامات پر کوئی ٹکڑا ترجمے سے رہ گیا یا مثلاً ایک دو سورتوں کا بہت بڑا حصہ مکمل ہوگیا۔ صرف دو تین آیتیں کسی وجہ سے نظر انداز ہوگئیں تو میں نے ایسے مقامات کے لیے حضرت شیخ الہند کا ترجمہ لکھ دیا اور اس کے گرد خطوط کھینچ کر حوالہ دے دیا۔ تشریحات میں بھی میں نے مولانا ہی کی عبارتیں قائم رکھی ہیں۔ اور زیادہ تر عبارتیں ترجمہ شدہ آیات کے آس پاس ہی تھیں۔ البتہ جہاں عبارتوں کا دامن بہت پھیل گیا تھا وہاں میں نے کچھ حصے حذف کر دیے اور جہاں ربط مطالب کے لیے اپنی طرف سے چند الفاظ کا اضافہ کرنا پڑا انہیں خطوط وحدانی میں دے دیا تاکہ مولانا کی عبارتوں سے الگ رہیں، خدا کا شکر ہے کہ ایسے ٹکڑے بہت کم ہیں۔ انتہائی احتیاط کے باوجود مجھے اعتراف میں تامل نہ ہونا چاہیے کہ ممکن ہے میں نے اپنی علمی بے بضاعتی یا نافہمی کے باعث ٹھوکریں کھائی ہوں۔ اگر ایسا ہوا تو ان ٹھوکروں کے لیے مجھے ملزم گردانا

جائے۔ مولانا کی ذات گرامی کو اس کے لیے ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

من و دل گر فنا شویم چہ باک

غرض اندر میاں سلامت اوست

مولانا کے ساتھ میرے تعلق کی مدت چالیس سال سے کم نہ تھی۔ اور ان میں سے پینتیس سال ایسے گزرے جن میں ان کی شفقتیں اور نوازشیں میرے لیے افتخار کا بہت بڑا سرمایہ بنی رہیں۔ یہاں تک کہ بعض سیاسی امور میں اختلاف رائے بھی اثر انداز نہ ہوا۔ عقیدت و نیاز کی اس طویل مدت کے تقاضے بڑے گراں قدر تھے۔ افسوس کہ میری ہمت درماندہ انہیں پورا نہ کرسکی۔ تاہم جو کچھ ممکن تھا اس میں حتی الامکان کوتاہی نہ ہوئی۔ اہل نظر خود اندازہ فرما سکتے ہیں کہ مولانا کی تحریرات سے ان آیات کی بہم آوری بحر بیکراں سے موتی نکالنے کے برابر جفاکشی و مشقت خیزی کی متقاضی ضرور تھی۔ میرا نصب العین صرف یہ رہا کہ مولانا کے جتنے بھی افادات و فیوض بصورت منضبط منظر عام پر آسکیں آجائیں۔ مختلف اصحاب اپنے علوم و معارف کی ترتیب و اشاعت کے لیے ادارے قائم کر گئے، جن میں سے بعض اداروں نے اب خانقاہی مسندوں کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ مولانا نے خدا جانے ایسے کتنے اداروں کے لیے شاہانہ امداد و اعانت کا بندوبست کیا مگر بہترین مواقع کے باوجود اپنے لیے کسی ایسے ادارے کی بنیاد نہ رکھی۔ بے نفسی، حسن کردار اور اخلاص کی ایسی ایمان افروز نظیریں ہر جگہ نظر نہیں آسکتیں۔ مرحوم کی ذات گرامی سے عقیدت و نیاز کے ہر مدعی کا فرض ہے کہ وہ ان کے علوم و معارف کی تہذیب و ترتیب کے لیے جو کچھ کرسکتا ہے جلد از جلد کرے۔ عقیدت کا اصل تقاضا یہی ہے ورنہ وقتاً فوقتاً چند الفاظ ستائش مرتب کر دینے سے کیا نتیجہ نکل سکتا ہے؟"

رسول رحمت یہ کتاب ترجمان القرآن سائز کے ۲۹۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ مرتب مولانا غلام رسول مہر ہیں اور ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔ کتاب کیا ہے؟ مولانا آزادؒ کے سیرۃ النبیؐ سے متعلق مقالات کا مجموعہ ہے۔ جنہیں مہر صاحب نے بہ ترتیب و اضافۂ مطالب مدون کیا ہے۔

مولانا نے الہلال و البلاغ میں سیرت طیبہ کے مختلف پہلوؤں پر مختلف اوقات میں بہت سے مقالے شائع کئے۔ ربیع الاول کی تقریب میں وہ ایک دو یا اس سے زیادہ مقالے تحریر فرماتے تھے۔

بعض لوگ سیرۃ طیبہ سے متعلق استفسار کرتے تو مولانا مفصل جواب رقم کرتے۔

مولانا الہلال والبلاغ سے بھی پہلے اس خیال کے داعی سمجھے کہ سیرت رسولؐ قرآن پاک سے مرتب کی جائے۔ علامہ شبلی نے سیرت النبیؐ پر قلم اٹھایا تو انہیں بھی مشورہ دیتے رہے، الہلال میں اس انداز کا ایک خاکہ بھی شائع کیا۔ مولانا فرماتے حیات وسیرت کا کوئی ٹکڑا ایسا نہیں جس کے لیے قرآن میں ایک سے زیادہ آیات نہ ہوں صرف قرآن ہی بس کرتا ہے کہ دنیا کو بتلادے کہ اس کا لانے والا کون تھا؟ کیسے زمانہ میں آیا؟ کس ملک میں پیدا ہوا؟ اس کے خویش و بیگانہ کیسے تھے، قوم مرزبوم کا کیا حال تھا اس نے کس طرح زندگی بسر کی؟ اس نے دنیا کے ساتھ کیا کیا؟ اس نے دن کیسے کاٹے؟ راتیں کیونکر بسر کیں، اس نے جب دنیا پر پہلی نظر ڈالی تو دنیا کا حال کیا تھا؟ جب واپسیں نظر وداع ڈالی تو وہ کہاں سے کہاں پہنچ چکی تھی؟ مولانا نے تذکرہ میں لکھا ہے کہ قرآن اور حیات نبوت معناً ایک ہی ہیں۔ قرآن متن ہے سیرت اس کی تشریح، قرآن علم ہے تو سیرت اس کا عملی نقشہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مقدس ایک مجسم و متشکل قرآن تھا'' غرض رسول رحمت کے مقالات قرآن سے سیرت طیبہ کے استنباط کا ڈھنگ سکھاتے اور سلیقہ بتاتے ہیں۔ مہر صاحب نے ان مقالوں پر ضروری حواشی لکھے اور بعض تمہیدی عبارتیں تحریر کی ہیں۔

کل ۱۰۵ ابواب اور ۱۰۵ ہی مقالے ہیں، مولانا نے رحمۃ العالمین کے معانی و مطالب جس بلاغت سے بیان کئے ہیں، اس سے پہلے رحمۃ العالمین کا یہ جامع و مانع تصور کسی نے بیان نہیں کیا، سیرت کا ایک بڑا ذخیرہ راقم الحروف کی نظر سے گزرا ہے لیکن یہ چیز اور کسی میں نہیں ہے۔

مولانا کچھ عرصے کے لیے سیاست کے نگر سے نکل آتے اور قرطاس و قلم کی صحبت میں چلے جاتے تو کم سے کم علم و فکر اور دین وسیرت کی آفاقی تشنگیاں رفع ہو جاتیں اور وہ خلا باقی نہ رہتا جو سائنس کی اس دنیا میں مذہب سے متعلق فلسفے نے پیدا کیا ہے۔ مولانا کا دماغ قدرت نے اس سلیقے میں ڈھالا تھا کہ وہ یورپ کی علمی قیادت کے چیلنج کا جواب دے سکتے تھے۔ لیکن سیاست کے خارستان میں وہ اس طرح کھو گئے کہ علم ان کے دماغ کی کاسنی و معنوں ہی میں رہ گیا۔

انبیائے کرام ترجمان القرآن سائز کے ۳۶۰ صفحات کی یہ کتاب بھی شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے شائع کی ہے۔ مولانا غلام رسول مہر مرتب ہیں اور مجموعہ ہے مولانا آزادؒ کے ان مقالات کا جو انبیائے کرام سے متعلق الہلال والبلاغ میں چھپتے رہے یا ترجمان القرآن میں داعی حق علیہ السلام کی سیرت سے متعلق تحریر کئے گئے۔

رسول رحمت کی طرح اس کتاب کا مقدمہ بھی مولانا ہی کے دو مقالوں پر مشتمل ہے۔ ایک میں سیر انبیاء کی غرض و غایت واضح کی گئی ہے، دوسرے میں بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید میں مخصوص دعوتوں پر کیوں اکتفا کیا گیا؟ ان مقالات میں کتاب کا نصف حضرت ابراہیم علیہ السلام سے متعلق ہے، دوسرا حصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہے حضرت یوسف علیہ السلام کی داستان ترجمان القرآن سے ماخوذ ہے، حضرت یحییٰ علیہ السلام پر دو مقالے ہیں ان کے علاوہ حضرت ایوب علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت یونس علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام پر بھی مقالات ہیں۔ ہودؑ اور صالحؑ کا تذکرہ اور نوح علیہ السلام کی سرگزشت ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے نہ صرف ان انبیائے کرام علیہم السلام کی غادت سے خالی کہانی ملتی ہے بلکہ عبر و بصائر کے بعض واقعات جہد و عمل کا گنج شائگاں محسوس ہوتے ہیں۔

رسائل و جرائد کی ادارت

مولانا فرماتے ہیں کہ:

"سب سے بڑا مقام جو کسی انسان کے لیے ہو سکتا ہے یہ نظر آتا تھا کہ مضامین لکھے جائیں اور وہ میرے نام سے شائع ہوں اس کے بعد اس سے بلند تر مقام یہ تھا کہ کسی اخبار یا رسالے کے ایڈیٹر ہوں"

(ابو الکلام کی کہانی خود ان کی زبانی، از ملیح آبادی)

مولانا نے اخبارات میں قدم رکھنے سے ایک آدھ برس پہلے قلم کا سفر شروع کیا تو بعض عربی رسائل کے ترجمے کیے۔ ندوۃ العلماء کے سلسلے میں مخالفین کے بعض عجیب عجیب رسائل کا جواب لکھا پھر اپنے والد کے ایک عقیدت مند محمد موسیٰ نامی ایک شخص کو جس کا اپنا پریس تھا ترغیب دے کر پہلا ہفتہ وار المصباح جاری کرایا اور اس کے ایڈیٹر ہو گئے۔ یہ پرچہ ۱۹۰۰ء کے اواخر میں عید کے روز نکلا۔ مولانا نے اس میں پہلا مضمون عید الفطر ۱۲ سال کی عمر میں لکھا جو ملک بھر میں کئی جگہ نقل ہوا۔ لاہور کے پیسہ اخبار نے اس کو بہت نمایاں کیا، لیکن المصباح تین چار مہینے ہی میں بند ہو گیا۔ پھر شیخ عبد القادر کے "مخزن" لاہور میں کئی مضمون لکھے، کلکتے میں ایک صاحب عبد الغفار مصطفائی پریس کے مالک تھے ان سے شراکت کی اور ہفتہ وار "احسن الاخبار" جاری کیا۔ مولوی احمد حسن عربی کے فاضل اور انگریزی انٹرنس تک پڑھے ہوئے تھے وہ شریک مدیر تھے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ:

"احسن الاخبار کے دفتر میں مصر، قسطنطنیہ، طرابلس، تیونس، الجزائر اور امریکہ کے تمام عربی اخبارات و رسائل مبادلہ میں آتے جس سے نہ صرف عالم اسلامی کے مسائل سے پوری

اور گہری واقفیت ہوگئی بلکہ عربی علم وادب کا ذوق بھی ان میں رچ بس گیا۔

"احسن الاخبار" تقریباً مولانا ہی مرتب کرتے تھے۔ تحفۂ احمدیہ یا محمدیہ دہ، مولانا محمد علی سے مل کر دوبارہ نکالا اور اس کی ترتیب علمی و مذہبی کر دی۔ اس میں حافظ شیرازی اور عمر خیام پر مختلف اہل قلم نے ایک سلسلہ مضمون لکھا جس میں اس نکتے پر بحث کی گئی کہ شعراء کے کلام سے ان کی سیرت منعکس ہوتی ہے یا نہیں جام و سبو کی صورتیں واقعی ہوتی ہیں یا محض شاعرانہ تصویر کشی ہے۔ منشی نوبت رائے نظر لکھنؤ سے ماہنامہ "خدنگ نظر" نکالتے تھے۔ انہوں نے کوئی سال بعد نثر کا حصہ مولانا کے سپرد کر دیا۔

علامہ شبلی سے مولانا کے تعلقات کا آغاز اس رسالے ہی میں شائع شدہ ایک مضمون "عکس ریز" کے باعث ہوا۔ مرقع عالم ہردوئی سے ایک رسالہ نکلتا تھا، اس میں کئی ایک مضمون لکھے، حیدرآباد کے بعض رسائل میں قلم اٹھایا۔ "لسان الصدق" جو مولانا کا ذاتی رسالہ تھا اس کے ایک مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ایڈورڈ گزٹ شاہجہان پور کے وقتی ایڈیٹر بھی رہے۔ عابد رضا بیدار نے وقتی ایڈیٹری کا زمانہ ۱۹۰۲ء یا ۱۹۰۳ء میں سے کسی وقت قرار دیا ہے۔ احسن الاخبار بند ہو گیا تو بیرونی ممالک سے مبادلے میں جو اخبار آتے تھے، ان کی آمد رکنے لگی، مولانا نے انجمن الاصلاح کے زیر اہتمام دار الاخبار (ریڈنگ روم) ——— دار المطالعہ قرأت خانہ، قائم کر رکھا تھا۔ جہاں دنیا بھر کے اخبارات بالخصوص عربی اخبارات آتے۔ اس آمد کو قائم رکھنے کے لیے مولانا نے رفقاء کے مشورے سے ماہنامہ "لسان الصدق" جاری کیا۔ اس وقت مولانا کی عمر مشکل پندرہ سولہ برس ہوگی۔ "لسان الصدق" کا نہایت شاندار تعریفی الفاظ میں خیر مقدم کیا گیا۔

جناب عبد القوی دسنوی نے نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ کے زیر اہتمام دسمبر ۱۹۶۷ء میں "مضامین لسان الصدق" کے نام سے کتابی مجموعہ شائع کیا۔ تو اس میں "پہلی بات" کے زیر عنوان ۱۹ نومبر ۱۹۶۶ء کی تحریر میں لکھا ہے کہ:

۱۔ "لسان الصدق" کے شمارے دسنہ (پٹنہ) کے مشہور کتب خانہ الاصلاح میں موجود ہیں۔

۲۔ یہ پہلا ماہنامہ تھا جو مولانا آزاد کے زیر ادارت نومبر ۱۹۰۳ء میں کلکتے سے نکلنا شروع ہوا۔ آخری پرچہ مئی ۱۹۰۵ء کا تھا، رسالہ موقت نہیں تھا، بعض دفعہ دو دو تین تین ماہ کا شمارہ اکٹھا نکلا اور کئی ناغے ہوتے تھے۔

اس رسالے کے مقاصد حسب ذیل تھے۔

الف۔ سوشل ریفارم یعنی مسلمانوں کی معاشرت اور رسومات کی اصلاح کرنی۔

ب ۔ ترقی اُردو، یعنی اُردو زبان کے علمی لٹریچر کے دائرے کو وسیع کرنا۔

ج ۔ علمی مذاق کی اشاعت، بالخصوص بنگال میں۔

د ۔ تنقید، یعنی اردو تصانیف پر منصفانہ ریویو کرنا۔

مولانا نے جلد اول کے شمارہ اول ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء میں ان چاروں مقاصد پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی کی تحریک و اصرار پر اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک الندوہ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر رہے۔ فرید وجدی کی کتاب المراۃ المسلمہ (مسلمان عورت) کا ترجمہ اور اس پر تبصرہ اسی زمانے کے الندوہ میں لکھا اور وہ نومبر و دسمبر (۱۹۰۵ء) اور جنوری (۱۹۰۶ء) میں شائع ہوا۔ "وکیل" امرتسر نے اس کو نقل کیا۔

مولانا کے رشحات قلم مرتبین کی اپنی منشا و ترتیب سے ۱۹۴۰ء کے بعد شائع ہونے لگے تو فرید وجدی کا یہ ترجمہ بھی ناشروں نے چھاپ ڈالا، مولانا کے علم میں آیا تو انہوں نے محمد یونس خالدی کو ایک خط میں لکھا۔

"یہ مضامین پندرہ سولہ برس کی عمر میں لکھے گئے تھے، ان میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن میں میری رائے بدل گئی ہے اور بہت سی باتیں اب صحیح نہیں سمجھتا۔ فرید وجدی نے اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے وہ نہایت سطحی ہے۔ اور علمی تحقیقات کے خلاف مولانا شبلی کی فرمائش پر میں نے ریویو لکھ دیا تھا۔ اس وقت میری معلومات محدود تھیں۔"

ممکن ہے مولانا الندوہ کو نہ چھوڑتے لیکن قدرت ان کے مقدر میں جو لکھ چکی تھی ایک تو اس کے خطوط آ رہے تھے، دوسرے مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی "عنایتوں" سے وہاں ایک ایسا طائفہ بن چکا تھا جو مولانا سے علامہ شبلی کے التفات پر حسد کرتا اور کترنی کی طرح چلتی ہوئی زبان سے کانٹے بکھیرتا تھا۔ مولانا نے ان کے حسد کو فتنہ بننے سے پہلے ختم کر دیا۔ اور علامہ شبلی کو اپنے ان معاندین کی زبان درازی سے محفوظ کیا چنانچہ الندوہ کو مارچ ۱۹۰۶ء میں چھوڑ دیا اور اپریل ۱۹۰۶ء میں امرتسر کے اخبار "وکیل" (ہفتے میں دو بار) کے ایڈیٹر ہو گئے اور ہفتے میں تین بار کر دیا، لیکن ستمبر ۱۹۰۶ء میں آپ کے بڑے بھائی غلام یٰسین آہ کا ممالک اسلامیہ سے واپسی پر انتقال ہو گیا تو نومبر میں والد کے اصرار پر "وکیل" چھوڑ کر کلکتے چلے گئے لیکن آپ کو نہ تو اپنے والد کے مسلک سے اتفاق تھا اور نہ ان کی پیری مریدی کو جاری رکھنا چاہتے تھے۔ آپ کا میدان کتب و رسائل کا میدان تھا۔

مولوی عبدالہادی کلکتے سے "دارالسلطنت" نکالتے تھے۔ وفات پا گئے تو پرچہ بند ہو گیا، ان کے فرزند مولوی عبداللطیف تاجر چرم تھے۔ مولانا کے ایک دوست محمد یوسف اجر نے انہیں "دارالسلطنت" جاری

لکھنے پر آمادہ کیا، تو مولانا کو ایڈیٹر بنا دیا۔ جنوری ۱۹۰۶ء سے چند ماہ تک مولانا اس کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ لیکن پھر مالک کی ادارتی مداخلت کے باعث الگ ہو گئے۔ نتیجۃً اخبار بند ہو گیا۔

دارالسلطنت سے علیحدگی کے بعد مولانا دوبارہ وکیل میں چلے گئے اور وکیل بائی ویکلی (BI-WEEKLY) ہو گیا کوئی نو دس ماہ وہاں رہے، لیکن جولائی ۱۹۰۸ء کے آخر میں قطع تعلق فرمالیا۔ پھر انہی دنوں مصر و عراق وغیرہ کے سفر کو چلے گئے۔

مولانا کا یہ زمانہ جو ۱۹۰۰ء کے شروع سے ۱۹۰۸ء تک پہنچا آپ کی عمر کے بیس سال تھے۔ ان آٹھ برسوں میں مولانا نے بہت سے رسائل و جرائد کی ادارت کی۔

اوپر جو کچھ زیر بحث آیا وہ ایک اجمالی جائزہ ہے، ورنہ ہندوستان میں مولانا کی صحافت کے اس ہشت سالہ دور پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، بالخصوص عابد رضا بیدار کی وہ تحقیق و جستجو جو مولانا ابوالکلام آزاد کے زیر عنوان شائع ہوئی اس بارے میں بہت سے گمشدہ گوشوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی بعض نقادوں نے مولانا پر قلم اٹھایا اور کئی وادیاں جو ان کے قلم نے اوائل عمر میں قطع کی تھیں ان کی خبر دی ہے۔

پنجاب یونیورسٹی پاکستان میں شعبہ صحافت کے سربراہ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے بھی مولانا کی صحافت پر دو چار مقالے لکھے ہیں ان کا ماخذ عبدالرزاق ملیح آبادی کے قلم سے ابوالکلام کی کہانی خود ان کی زبانی کے مندرجات ہیں۔ ان کے علاوہ ابوسلمان شاہجہانپوری نے بھی مولانا کی ابتدائی نگارشات جمع کرنے میں خاصی محنت کی ہے۔

مولانا کی صحافت کا یہ زمانہ جو آٹھ سال سے زیادہ نہیں قلم کی ابتدائی مشق کا دور ہے یا پھر اخبار نویسی کے آغاز میں شوق کی قدم فرسائیوں کا تذکرہ ہے۔ مولانا کی اصل شخصیت الہلال سے طلوع ہوئی، ترجمان القرآن سے نصف النہار پر آگئی اور ملکی سیاست نے اسے ایک عظیم قیادت بنا دیا، وہ جامع الصفات نہ ہوتے تو اس ابتدائی تذکرے کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ ان کے سوانح کی تلاش میں یہ چیزیں سامنے آئی ہیں۔

بہرحال اس سرگزشت کا یہ پہلو معمولی نہیں کہ ایک فرد کا جو اپنی جوانی کے چھٹے سال الہلال کے افق سے اسلامی ہندوستان کی متاع و مطاع ہو گیا وہ اپنی ابتدائی عمر میں زبان و قلم کی دھن میں کلکتے سے لکھنؤ، اعظم گڑھ، بمبئی حیدرآباد، امرتسر، رامپور اور جانے کہاں کہاں گھومتا رہا اور یہ تمام شہر تب اس کے شوق کا سنگ میل تھے۔ ہم اس سے اتفاق نہیں کرتے کہ مولانا علامہ شبلی کے فیضان نگاہ کی بدولت صحافت کے سفر میں شہسوار ہو گئے،

البتہ یہ ضرور ہے کہ مولانا آزاد سے علامہ شبلی کے باقاعدہ خوشہ چیں اور بعض ارشد تلامذہ حسد نہ کرتے تو گمان ہے کہ دارالمصنفین کی عنان سید سلیمان ندوی کے بجائے مولانا ابوالکلام کے ہاتھ میں ہوتی۔

الہلال کا اجراء

مولانا ابوالکلام اور الہلال لازم و ملزوم ہیں۔ دونوں ایک خاص دور تک گل و بلبل کا عروضی لازمہ تھے۔ الہلال شمع تھا، مولانا پروانہ۔ الہلال پروانہ تھا، مولانا شمع۔ الہلال ناقہ تھا مولانا حدی خوان۔ الہلال کارواں تھا مولانا میر کارواں، الہلال قرطاس تھا، مولانا قلم، الہلال صریر خامہ تھا مولانا نوائے سروش، الہلال لیلیٰ تھا مولانا قیس، الہلال عذرا تھا، مولانا وامق تھے، الہلال نعرۂ رستخیز تھا مولانا مرد رستخیز، غرض مسلمانوں کی سیاسی صحافت، جس نے برطانوی استبداد کے خلاف مسلمانوں کا ذہنی کارواں مرتب کیا وہ اس زمانے میں تین آدمیوں کے ہاتھ میں تھی، مولانا آزادؒ، مولانا محمد علیؒ، مولانا ظفر علیؒ، تینوں صحافت کی معرفت افق سیاست پر نمودار ہوئے۔ محمد علیؒ نے ہفتہ وار "کامریڈ" نکالا اور "کامریڈ" نے ان کی شخصیت اٹھائی، جب اُردو روزنامہ ہمدرد جاری کیا تو وہ مولانا محمد علی ہوچکے اور رئیس الاحرار کہلاتے تھے۔ مولانا ظفر علیؒ سیاسی زعیم کی حیثیت میں زمیندار کے اُفق سے اُبھرے، زمیندار ان کی سیاسی شہرت کا نقیب تھا، مولانا ابوالکلامؒ کو الہلال نے امام الہند بنادیا اور صحافت کے لالہ زار سے سیاست کے کارزار میں لے آیا وہ آئے الہلال کی معرفت لیکن کچھ عرصہ بعد الہلال ان کے فضائل و افکار اور محاسن و محامد کی دستاویز ہوگیا۔ پہلے وہ الہلال کی وجہ سے مولانا ابوالکلام آزاد ہوئے۔ پھر الہلال ان کی بدولت سحر بلال ہوگیا۔ مہاتما گاندھی نے ینگ انڈیا نکالا تو وہ ان کی سیادت کا ذریعہ نہ تھا ان کے ابلاغ افکار کا ایک واسطہ تھا، گویا ینگ انڈیا مہاتما گاندھی کی بدولت تھا، وہ ینگ انڈیا کی بدولت نہ تھے۔

الہلال جب نکلا تو ابوالکلام اس کی بدولت تھے، ابوالکلام صف اوّل کے رہنما ہوگئے تو وہ ان کے ابتدائی سوانح و افکار کی دستاویز اور ماخذ ہوگیا۔ المختصر الہلال مولانا کی صحافتی معراج تھا اور یہ حقیقت ہے کہ الہلال سے بڑا ہفتہ وار آج ۷۱ برس بعد بھی اُردو صحافت پیش نہیں کرسکی، نہ اتنا بڑا مجلّہ نہ اتنا بڑا ایڈیٹر اور نہ اتنا بڑا ذہن،

علمی، تاریخی، فکری اور جذباتی صحیفہ۔ لوگ پڑھتے تو سر دھنتے اور دیکھتے تو مست ہوتے تھے۔ اس کی خوبیاں اس کے ساتھ ختم ہوگئیں، وہ پرچہ نہیں ایک عہد تھا۔ ایک تاریخ تھا، ایک دعوت تھا، ایک انجمن تھا ایک تحریک اور ایک اکادمی تھا۔

پہلا پرچہ ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو نکلا، پھر نومبر ۱۹۱۴ء میں اس کی ضمانت ضبط ہوگئی تو بند ہوگیا۔ الہلال کی جگہ البلاغ نکالا گیا، یہ الہلال کا بدل تھا۔ پہلا شمارہ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو نکلا، اصلاً ہفتہ وار تھا لیکن اکثر پندرہ روزہ میں نکلتا رہا، آخری نمبر ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹ مارچ اور ۳ اپریل ۱۹۱۶ء کا شمارہ تھا، مارچ میں مولانا کو حکم ملا کہ وہ حدود بنگال ترک کردیں۔ وہ رانچی (آسام) چلے گئے، جہاں ۳۰ مارچ ۱۹۱۶ء سے یکم جنوری ۱۹۲۰ء تک نظربند رہے۔ اس نظربندی نے البلاغ کا خاتمہ کر دیا۔

الہلال کا دوسرا دور ۱۰ جون ۱۹۲۷ء سے شروع ہوکر ۲۵ شماروں کی حیات مستعار کے بعد دسمبر ۱۹۲۷ء میں ختم ہوگیا۔

مولانا عبدالقادر قصوری کے فرزند مولوی محی الدین قصوری نے البلاغ کی اشاعت کے زمانے میں اقدام جاری کیا، مولانا اس کے محرک تھے۔ لیکن اقدام بعجلت بند ہوگیا۔ پھر ۲۳ دسمبر ۱۹۲۱ء کو ہفتہ وار "پیغام" جاری کیا۔ عبدالرزاق ملیح آبادی ایڈیٹر اور مولانا نگران تھے۔ کل ۱۳ شمارے نکلے کہ ایڈیٹر اور نگران دونو گرفتار ہوگئے۔ "پیغام" عنقا ہوگیا۔ "پیغام" کے بعض مضامین (اداریے وغیرہ) جو مولانا کے قلم سے ہیں یا بعض ہدایت نامے جو عبدالرزاق ملیح آبادی کو لکھے، انہوں نے اپنی تالیف "ذکر آزاد" میں نقل کر دیئے ہیں۔ الجامعہ کے نام سے عربی کا ایک مجلہ نکالا، نگران خود تھے اور مدیر عبدالرزاق ملیح آبادی۔ پہلا پرچہ یکم اپریل ۱۹۲۳ء کو نکلا۔ آخری مارچ ۱۹۲۴ء کو، اس دوران میں کبھی کبھار دو دو تین تین شمارے یکجا شائع ہوتے رہے۔ الہلال سے ملتا جلتا سائز اور ۲۴ صفحے، اس مجلے کا نصب العین پان اسلام ازم اور مشرق کا اتحاد تھا۔ لیکن اس میں سب سے زیادہ شریف مکہ کو ہدف بنایا گیا، اور وہ اس مجلے سے سخت نالاں تھا، اپنے زمانہ اقتدار میں اس نے الجامعہ کا داخلہ حجاز میں بند کر دیا۔ اس میں پہلی دفعہ محمد علی، شوکت علی اور ان کی والدہ محترمہ کا مشترکہ فوٹو شائع ہوا مہاتما گاندھی کی تصویر دو دفعہ چھاپی گئی۔

الہلال کا سحر و تاثر ہی ایسا تھا کہ مولانا کو ہمیشہ اس پر ناز رہا، اور یہ ناز بیجا نہیں تھا، اپنی بہت سی تقاریر و خطبات میں الہلال کا ذکر کیا اور فرمایا، ان چیزوں کو جو آج تحریک، موقف، نصب العین یا ذریعہ وسیلہ و مقصد

بن رہی ہیں وہ اتنے برس پہلے الہلال میں ملک و قوم کو ان کی ضرورت سے مطلع کر چکے ہیں۔ رام گڑھ کے خطبۂ صدارت میں الہلال کی اس دعوت اور اپنے فکر کی ہمیشگی کا ذکر کیا کہ ملک و قوم کو جو مسائل آج پیش آ رہے ہیں وہ ان کے امکان و ظہور کے متعلق برسوں پہلے نشاندہی کر چکے ہیں، الہلال انہی حقائق کا اعلان و اظہار تھا۔ ان کے نزدیک الہلال ہندوستان کی آزادی، مسلمانوں کی وحدت، خدا کی طاعت، اسلام کی دعوت، مشرق کی بیداری، غلامی کی بیخ کنی، جہاد کے ولولے، یقین کی دولت، نظم کی طاقت، ایمان کی نصرت، اتحاد کے جلال اور غیر ملکی استعمار کے خلاف ہندوستانی قوم کے اعلان مبارزت کا وثیقہ تھا۔

الہلال کے ذہنی اثرات کا جائزہ لینے اور اس کی دعوت کا سیاسی تجزیہ کرنے کے لیے لازم ہے کہ ہم ان امور کا پتہ چلائیں کہ:

۱۔ الہلال نکلا تو اس وقت ملک کی صحافت کہاں تھی؟ اس کا مزاج کیا تھا اردو جرائد کی سطح کیا تھی اور سیاسی آب و ہوا کا درجۂ حرارت کیا تھا؟

۲۔ الہلال نے کس فضا میں آنکھیں کھولیں، اس کے سامنے کس قسم کے حالات اور کس انداز کے واقعات اُبھر رہے یا ڈھل رہے تھے۔

۳۔ داعی اور رعایا آپس میں ہمکلام ہونے کے لیے کیا اسلوب رکھتے تھے۔

۴۔ عالمی سیاست بالخصوص اسلامی سیاست کے احوال و افکار اور ان کے نتائج و آثار کیا تھے۔

۵۔ ہندوستانی مسلمان کس مقام پر تھے۔

۶۔ ہندوستان کس طرف جا رہا تھا۔ اور مسلمان اس سفر میں کہاں تھے۔

۷۔ مسلمانوں میں پڑھے لکھے افراد کا فی صد تناسب کیا تھا۔

۸۔ مسلمانوں سے مخاطبت کے لیے کونسی زبان ثمر آور ہو سکتی تھی،

۹۔ الہلال کی زبان ایک تحریک کی زبان اور سرسید کی زبان ایک تعلیم کی زبان تھی۔ مسلمانوں کو ان کا ماضی یاد دلانے اور نیند سے جھنجھوڑنے کے لیے الہلال کی زبان طورِ سینا کی زبان تھی۔

۱۰۔ الہلال ہندوستانی مسلمانوں کے لیے کیا کچھ لایا۔ اور اس کی آبیاری سے کس قسم کا چمن کھلا۔

۱۱۔ الہلال کی بدولت ادب و صحافت میں کونسی نئی نئی راہیں کھلیں اور اُردو زبان کن نئے مضمونوں اور موضوعوں سے آشنا ہوئی،

۱۲۔ الہلال کے مدرسہ فکر سے جو لوگ نکلے یا اس کی آواز سے مسحور و متاثر ہوئے ان کی انجمن یا ادارے سے ملک و قوم نے کیا حاصل کیا۔

۱۳۔ الہلال سے پہلے ہفتہ وار صحافت ایک پیشہ تھی۔ الہلال نے تحریک بنایا اور اس کی ہیئت اس طرح بدلی کہ ۱۹۱۲ء کے وسط کا انسان دنگ رہ گیا۔ آج اکسٹھ[۶۱] برس بعد جب کہ ملک آزاد ہے لیکن صحافت، تحریک، فرض اور عبادت کے حدود سے نکل کے صنعت، تجارت یا پیشہ بن گئی ہے، اب نہ کوئی اعتقاد ہے نہ عبادت اور نہ ایسی کوئی تحریک جو ایک قوم کی مثبت لیکن اجتماعی خواہش ہوتی ہے۔

ہندوستان میں صحافت کے ابتدائی آثار مغلوں کے زمانے سے ملتے ہیں۔ برطانوی عہد کے نصف آخر میں اس کی شکل درباری سے عوامی ہوگئی اور اخبار حکام کے بجائے عوام کے لیے نکلنے لگے مغلوں کے زمانے میں اس کی شکل قلمی خبرناموں کی سی تھی اور خطاط لکھتے تھے۔ مغلوں کے زمانہ انحطاط میں کہ ہندوستان سے ان کی حکومت کے چل چلاؤ کا زمانہ تھا انگریزی اخباروں میں دربار معلی اور سکھ دربار کی خبریں چھپ جاتی تھیں، لیکن اردو کی حد تک انیسویں صدی کا نصف اول قلمی اخباروں کا زمانہ تھا۔

جہاں تک طباعت کا تعلق ہے اس کی ایجاد کا سہرا چینیوں کے سر ہے۔ اس کی ابتدا ٹھپے کی چھپائی سے ہوئی، لیکن یورپ کے مادی و استعماری اور تہذیبی و صنعتی غلبے کی بدولت طباعت و صحافت کی ہمہ گیری کا غلغلہ ہوا۔ یورپ ہی سے طباعت کی مشینیں اور صحافت کا سامان ہندوستان آیا۔ برطانوی حکومت نے بلوغ بخشا شروع میں انگریزی اخبار میر لشکر تھے، انہی کی بدولت دوسری زبانوں میں صحافت کے چراغ روشن ہوئے۔ ہندوستان (برعظیم) میں طباعت کی ابتدا پرتگیزیوں نے (۱۵۵۰ء) میں کی ان کا پہلا چھاپہ خانہ گوا میں لگا پھر سترھویں صدی کے وسط میں ایک پارسی بھیم جی نے گجراتی رسم الخط ڈھلوایا اور سورت میں چھاپہ خانہ قائم کیا۔ انگریزوں نے بمبئی میں اپنا پہلا چھاپہ خانہ ۱۶۷۴ء میں لگایا پھر ۱۷۷۹ء میں کلکتے میں سرکاری چھاپہ خانہ کھولا گیا۔ اسی سال جیمز نے کلکتے میں اپنا پریس جاری کیا۔ ۱۷۸۰ء کے لگ بھگ سر چارلس ولکنز نے فارسی رسم الخط کا ٹائپ ڈھالا، اس کا پہلا نمونہ ۲۹ مارچ ۱۷۸۴ء کو سامنے آیا، کلکتہ گزٹ کے صفحہ اول پر دربار معلی کی خبریں شائع ہوتیں ادھر عربی ٹائپ ایجاد ہو چکا تھا۔ اردو ٹائپ (نستعلیق) کا نمونہ ۸ جولائی ۱۷۹۰ء کے کلکتہ کرانیکل میں دیا گیا۔ ۱۸۰۱ء میں کلکتے کے چار انگریزی چھاپہ خانوں میں اردو اور فارسی کتابیں چھپتی تھیں۔ ۱۸۰۳ء میں ہندوستانی پریس کے نام سے کلکتے میں فارسی رسم الخط کی چھپائی کے لیے چھاپہ خانہ قائم ہوا۔ ۱۸۳۶ء میں لیتھو کی چھپائی کا آغاز ہوا۔

۱۷۶۶ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک ملازم ولیم بولٹس نے راز ہائے درون پردہ کی چہرہ کشائی کیلئے ہندوستان سے پہلا اخبار شروع کرنا چاہا، لیکن کمپنی کے ارباب حل وعقد تاڑ گئے انہوں نے ولیم کو بنگال سے فوراً نکل جانے اور ستمبر کے مہینے میں یورپ چلے جانے کا حکم دیا، اس نے انگلستان پہنچ کر ایسٹ انڈیا کمپنی کی وحشیانہ لوٹ مار اور ظالمانہ استحصال پر پانسو صفحے کی کتاب لکھی، اس واقعہ کے بارہ سال بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے پرنٹر جیمز آگسٹس ہکی نے جیل سے رہا ہو کر چھاپہ خانہ قائم کیا اور اس کے تحت پہلا مطبوعہ اخبار بنگال گزٹ نکالا۔ اس کی شدید نکتہ چینی سے خوفزدہ ہو کر کمپنی نے اخبار کو ڈاک کے ذریعے بھیجنے کی مراعات واپس لے لیں۔ ہکی کا قلم جراح کا نشتر اور قصاب کا چھرا تھا اس نے کمپنی کے ارباب بست وکشاد کو اپنے نقد ونظر کی آماجگاہ بنایا۔ چرچ کے سب سے بڑے مشنری کو لتاڑا، اس کو چار ماہ قید اور پانسو روپے جرمانہ کی سزا ہوئی، لیکن وہ دبا نہیں اس نے وارن ہیسٹنگز (گورنر جنرل) اور چیف جسٹس کے خلاف لکھنا شروع کیا، چیف جسٹس نے اس کی گرفتاری کے لیے چار سو یورپی فوجیوں اور ان کے دیسی ساتھیوں کو بھیجا انہوں نے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن اس نے بلا وارنٹ گرفتار ہونے سے انکار کر دیا۔ نتیجۃً فریقین میں تصادم ہوا، سرکاری دستہ فرار ہو گیا۔ ہکی فوراً بعد سپریم کورٹ میں پیش ہو گیا۔ عدالت برخاست ہو چکی تھی لیکن دس ہزار کی ضمانت داخل نہ ہو سکی وہ نظر بند ہو گیا۔ آخر سپریم کورٹ نے اسے ایک الزام میں سال بھر قید اور دو سو روپے جرمانہ کی سزا دی، دوسرے الزام میں وارن ہیسٹنگز کو پانچ ہزار روپے بطور جرمانہ ادا کرنے کا حکم دیا لیکن وارن ہیسٹنگز نے جرمانہ لینے سے انکار کر دیا۔ اس طرح یہ سزا معاف ہو گئی۔ ہکی جنون کا تو ن رہا اور اپنے قلم کو اسی طرح تیز دھار رکھا اور کسی دشمن یا مخالف کو ہرگز معاف نہ کیا، لیکن معاشی ابتری کے باعث آخر اخبار بند ہو گیا۔

جس سال جیمز ہکی نے بنگال گزٹ جاری کیا اسی سال نومبر میں ڈی میسمک (DE MESOMK) پیٹر ریڈ (PETER REED) نام کے دو تاجروں نے کلکتہ سے انڈیا گزٹ جاری کیا اس میں جیمز ہکی کے خلاف لکھا جاتا اور دربار معلی کی خبریں دی جاتیں۔ سلطان ٹیپو کے والد حیدر علی سے جنگ کی تفصیلات بھی اسی میں چھپتی رہیں۔ ۴ مارچ ۱۷۸۴ء کو حکومت کی زیر سرپرستی "کلکتہ گزٹ" جاری کیا گیا۔ اس کا ایڈیٹر فرانسس گلڈان تھا۔ جس نے فارسی کی بے شمار کتابیں انگریزی میں منتقل کی تھیں اور فارسی انگریزی لغت لکھا تھا۔

اس اخبار کا ایک عجیب پہلو یہ تھا کہ اس میں کلکتے کی انگریز دوشیزاؤں کے نام عاشقانہ گیت کھلے بندوں شائع کیے جاتے، اس اخبار کے دو سال بعد "کلکتہ کرانیکل" نکلا، اور کئی مختلف الاوقات مجلے شائع ہونے لگے، ولیم ڈوان

ہکی کے بعد دوسرا شخص تھا جس نے "بنگال جرنل" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے انگریزی حکام کو آڑے ہاتھوں لیا، "بنگال جرنل" سے الگ ہونے کے بعد اس نے انڈین ورلڈ کے نام سے ایک نیا اخبار جاری کیا اس کی بے باکی کے باعث اسے گرفتار کر کے انگلستان جانے والے ایک جہاز میں بٹھا دیا گیا اور تقریباً بیس ہزار روپیے کی جایداد ضبط کر لی گئی، وہ انگلستان سے امریکہ پہنچا اور صحافت میں بڑا نام پیدا کیا، غرض ۱۷۹۱ء سے ۱۷۹۸ء کے درمیانی عرصے میں حکومت نے کلکتے کے کئی اخباروں کے خلاف کاروائی کی اور وجہ صرف یہ تھی کہ حکومت فوجی خبروں کی اشاعت ایک خاص ڈھنگ سے چاہتی تھی مگر اخبارات اس پر راضی نہ ہوتے تھے۔ اسی سلسلے میں ڈاکٹر چارلس میک کو ۱۷۹۸ء میں جلاوطن ہونا پڑا۔ اسی زمانے میں مدراس سے کئی ایک اخبار جاری ہوئے جن میں آر ولیمز کے "مدراس گزٹ" کو کمپنی کے حکام کی ناراضی کے باعث سنسر شپ کا شکار ہونا پڑا ایک شخص ایم فریر نے ۱۷۹۵ء میں حکومت سے اجازت لے کر "ایسٹ انڈیا ہیرلڈ" جاری کیا لیکن حکومت نے اسے فوراً گرفتار کر لیا اور جہاز میں بٹھا کر انگلستان روانہ کر دیا لیکن وہ جہاز ہی سے غائب ہو گیا پھر پتہ نہ چلا کہاں ہے؟

صوبہ بمبئی کا پہلا اخبار "بمبئی ہیرلڈ" تھا جو ۱۷۸۹ء میں جاری ہوا۔ ایک دوسری روایت ہے کہ بمبئی کا پہلا پرچہ "بمبئی گزٹ" تھا۔ بہرحال ان دونوں کے ایڈیٹر انگریز تھے۔ الغرض اس زمانے میں جو اخبار جاری ہوئے وہ ہندوستان میں صحافت کی ابتدا ضرور تھے، لیکن ان کے ایڈیٹر ایسٹ انڈیا کمپنی کے برطرف ملازم تھے جو ذاتی رقابتوں کے پیش نظر اندرونی بدعنوانیوں کی نقاب کشائی کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے نقصان اُٹھایا اور جو سرکاری تائید و حمایت کرتے رہے وہ مالی منفعت اُٹھاتے رہے۔ اس زمانے میں کوئی صحافتی قانون نہ تھا۔ حکومت کو پتہ چلتا کہ فلاں شخص اس کا مخالف ہے اور اخبار نکالنا چاہتا ہے تو وہ اسے دیس بدر کر دیتی کوئی صحافی حکومت کو تنگ کرتا تو حکومت اولاً ڈاک کی سہولتیں چھین لیتی۔ ثانیاً سنسر شپ عائد کرتی، ایڈیٹر باز نہ آتا تو جلاوطن کر دیتی، ان اخباروں سے کوئی خدشہ تھا تو یہ تھا کہ مقامی یورپی آبادی ان سے متاثر ہوتی اور کمپنی انگلستان میں بدنام ہوتی ہندوستانی عوام کے تاثر یا ان کے رد عمل کا سوال ہی خارج از بحث تھا۔ ان اخبارات کی اشاعت سو یا دو سو سے زیادہ نہ تھی، اور یہی فی الجملہ ان کا طول و عرض تھا۔

اس تحقیقی بحث سے قطع نظر کہ اُردو کا پہلا اخبار کون سا تھا اور کب جاری ہوا، عام طور پر "جام جہاں نما" کلکتہ (۱۸۲۲ء) کو فارسی کا پہلا اخبار قرار دیا جاتا ہے، اس نے اپنی اشاعت کے اگلے سال اُردو ضمیمہ جاری کیا اور وہ پانچ سال جاری رہا۔ اس کے برعکس "دھلی کا اردو اخبار" اردو کا پہلا مکمل اخبار تھا جس کے ایڈیٹر مولانا

محمد حسین آزاد کے والد مولانا محمد باقر تھے۔ یہ اخبار ۱۸۳۶ء میں دہلی سے جاری ہوا۔ "جامِ جہاں نما" کے متعلق تازہ تحقیق کے مطابق کہا جاتا ہے کہ ابتداً اردو ہی میں نکلا تھا لیکن قارئین اردو کے حق میں نہ تھے۔ نتیجۃً جلد ہی فارسی میں منتقل ہوگیا، اس وقت مسلمان حکمرانوں کی بدولت لکھا پڑھی کی زبان فارسی تھی، کمپنی فارسی کو ختم کرکے اردو یا ہندوستانی لانا چاہتی تھی۔ عوام چونکہ فارسی سے مانوس تھے اسی لیے "جامِ جہاں نما" کو اردو چھوڑ کر فارسی اختیار کرنا پڑی، کچھ عرصہ بعد اردو ضمیمہ نکالا گیا پھر ترک کر دیا ادھر "جامِ جہاں نما" کی اشاعت کے تین ہفتے بعد ہندوؤں کے بہت بڑے مصلح برہمو سماج کے بانی اور عربی و فارسی کے فاضل اجل راجہ رام موہن رائے نے کلکتے سے "مراۃ الاخبار" جاری کیا، یہ اخبار ۲۰ اپریل ۱۸۲۲ء کو شروع ہوا، لیکن زیادہ عمر نہ پائی اور بانی کی حادثے کے بند ہوگیا۔ ان اخباروں کے علاوہ بعض علاقائی زبانوں مثلاً بنگالی، ہندی، گجراتی، مرہٹی، تامل اور پنجابی میں بھی کئی ایک اخبار نکالے گئے مگر لیکن حالات کی بے مائگی نے ساتھ نہ دیا کبھی معاشی ابتری کا شکار ہو گئے کبھی عوام کی بے توجہی نے ڈبو دیا اور کبھی سرکار کی ناراضی سے ان کا سورج ڈوب گیا۔

برعظیم میں انگریزی صحافت کا آغاز ۱۷۸۰ء میں ہوا۔ پہلے بیس سال تک کوئی قانون ایسا نہ تھا جس کے ذریعے صحافت پر کوئی سی قدغن عائد ہوتی، مارکوئیس ویلزلی نے مئی ۱۷۹۹ء میں مدیران جرائد پر پابندی عائد کی کہ:

۱۔ ہر اخبار کے آخر میں پرنٹر کا نام درج کیا جائے۔

۲۔ ہر اخبار کا مالک اور ایڈیٹر گورنمنٹ کے سیکرٹری کو اپنے نام اور سکونت سے مطلع کرے۔

۳۔ اتوار کے دن ناغہ کیا جائے۔

۴۔ جب تک حکومت کے سیکرٹری یا اس کے نامزد کردہ کسی شخص نے اخبار کا معائنہ نہ کیا ہو اسے شائع نہ کیا جائے۔

۵۔ جو شخص کسی قاعدے کی خلاف ورزی کرے گا اسے فوری طور پر یورپ روانہ کیا جاسکے گا۔

المختصر اخبارات پر سنسر شپ کا یہ آغاز تھا۔ اس وقت کلکتے سے سات اخبار نکلتے تھے۔ ان سب نے ان شرائط کو بلا تامل قبول کر لیا لیکن ۱۸۱۳ء میں لارڈ ہیسٹنگز نے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا تو بعض قابلِ اعتراض پمفلٹوں کی اشاعت پر چھاپہ خانوں کی نگرانی و احتساب کے لیے نئے قواعد کا اعلان کیا۔

۱۸۱۸ء میں سنسر شپ منسوخ ہو گئی لیکن اخبارات کو ہدایات کی گئیں کہ وہ کمپنی کے ڈائریکٹروں، انگلستان کے پبلک اداروں، مقامی نظم و نسق، سیاسی معاہدات، کونسل کے ممبروں، سپریم کورٹ کے ججوں اور کلکتے کے لارڈ بشپ

کے متعلق اشارۃً یا کنایۃً بھی کوئی سی نکتہ چینی نہ کریں، اس کے علاوہ ان تمام چیزوں کی اشاعت سے پرہیز کیا جائے، جس سے یہ معلوم ہو کہ ہندوستانی عوام کے مذہبی عقائد و عبادات میں مداخلت کی گئی ہے۔ نجی سکینڈل اور ذاتی حملوں سے احتراز کیا جائے اور انگلستان سمیت ممالک غیر کے اخبارات سے ایسے اقتباسات ہرگز نقل نہ کیے جائیں جن سے ہندوستان میں برطانیہ کی شہرت داغدار ہو۔

لارڈ ہیسٹنگز کے بعد جان ایڈم گورنر جنرل بنا تو اس نے ۱۸ دسمبر ۱۸۲۳ء کو پریس آرڈی ننس جاری کیا کہ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل سے لائسنس لیے بغیر کوئی اخبار یا رسالہ شائع نہیں کیا جاسکتا اور جاری کردہ لائسنس کسی وقت بھی واپس لیا جاسکتا ہے، نیز ہر وہ چھاپہ خانہ ضبط کر لیا جائے گا جو لائسنس کے بغیر کتابیں یا اخبار چھاپے گا، اس کے علاوہ حکومت پریس کا لائسنس ضبط کرنے کی مجاز ہوگی، ہر چھاپہ خانہ اپنے ہاں کی مطبوعہ کتاب یا اخبار حکام مجاز کو مہیا کرے گا۔ راجہ رام موہن رائے نے اس آرڈی ننس کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی لیکن مسترد ہو گئی، اس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے راجہ صاحب نے "مراۃ الاخبار" بند کر دیا اور ایک زبردست اداریے میں اس آرڈی ننس کو عزت نفس کی توہین قرار دیا۔ اس آرڈی ننس کے تحت کئی ایک اخبارات بند کیے گئے۔ بعض ایڈیٹر ملک بدر کیے گئے۔

لارڈ ولیم بنٹنگ گورنر جنرل ہوئے تو انہوں نے اخبارات کی آزادی بحال کی، ان کی خدمت میں چھ انگریز اور تین ہندوستانی ایڈیٹروں نے ایک عرضداشت پیش کی جس میں پریس آرڈی ننس کی منسوخی کا مطالبہ کیا لیکن لارڈ بنٹنگ خرابی صحت کے باعث مستعفی ہو گئے تو ان کی جگہ سر چارلس مٹکاف مقرر ہوئے، انہوں نے پریس کے ضوابط منسوخ کر دیئے ان کی جگہ ایک نیا پریس ایکٹ نافذ کیا، جس کے مطابق:

۱۔ اخبار جاری کرنے کے لیے محض ایک ڈیکلریشن کی ضرورت لازم قرار دی گئی۔

۲۔ پرنٹر اور پبلشر کو اخبار میں مطبوعہ مواد کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔

۳۔ ہر شمارے میں پرنٹر، پبلشر اور پریس کے علاوہ مقام اشاعت کا نام چھاپنا ضروری قرار دیا گیا۔

۴۔ قواعد کی خلاف ورزی پر دو سال تک قید اور پانچ ہزار روپے تک جرمانے کی سزا تجویز کی گئی۔

سر چارلس کے اس اقدام پر بطور شکر گزاری کلکتے میں مٹکاف ہال بنایا گیا ایک لائبریری قائم کی گئی، لیکن انگلستان کی برسر اقتدار وِگ پارٹی ناراض ہو گئی۔ اس نے سر چارلس کو گورنر جنرل کے عہدے سے ہٹا دیا۔

انیسویں صدی کے نصف اول میں پڑھے لکھے طبقے کی زبان فارسی تھی اور یہ مسلمانوں ہی کی زبان نہ

تھی بلکہ ہندو اہل علم کا ذریعہ اظہار بھی فارسی ہی تھا۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے اپنی کتاب "صحافت" میں لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے فارسی زبان میں کل ۱۹ اخبار جاری ہوئے ان میں سے ایک "مفرح القلوب" ۱۸۵۵ء میں کراچی سے نکلا دوسرا "مطلع خورشید" سکھر سے، تیسرا "مرتضائی" پشاور، ان کے علاوہ مدراس میں بھی فارسی کا ایک اخبار جاری تھا۔ لیکن فارسی صحافت کا سب سے بڑا مرکز کلکتہ تھا، جہاں سے فارسی کے نو اخبار نکلتے تھے، دوسرا مرکز دہلی تھا جہاں فارسی کے دو اخبار تھے ان ۱۹ میں سے صرف چار اخبار سرکار کے طرفدار تھے۔ تب عوام کے لیے اخبار خریدنا قریب قریب ناممکن تھا صرف روسا اور امراء ہی اخبار خریدتے اور پڑھتے تھے۔ جہاں تک اشاعت کا تعلق ہے "جام جہاں نما" کی اشاعت صرف ۲۶ پرچے تھی "سراج الاخبار" کی چونتیس، غرض کسی اخبار کی اشاعت ڈیڑھ سو سے زائد نہ تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے فارسی زبان کو کالعدم کرنے کے لیے "فورٹ ولیم کالج" کی بنا ڈالی اور اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا تو اس پس منظر میں اردو صحافت کا آغاز ہوا، اس کے دو مرکز تھے، اول دہلی دوم لاہور، دہلی میں جن اخباروں کی شہرت ہوئی ان میں مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر کا "دہلی اردو اخبار" سرفہرست تھا۔ سرسید احمد کے بھائی سید محمد خان نے "سید الاخبار" جاری کیا لیکن ۱۸۵۰ء میں بند ہو گیا۔ اسی طرح ادھر "صادق الاخبار" کے نام سے دہلی میں چار اخبار جاری ہوئے اور بند ہوتے گئے، مولوی کریم الدین دہلی کالج میں استاد تھے اور ایک عالم و ادیب کی حیثیت سے ان کی خاصی شہرت تھی، انہوں نے "کریم الاخبار" جاری کیا۔ مزید برآں دہلی سے اور کئی اخبار جاری ہوئے۔ رسائل بھی نکالے گئے ان سے اردو اخبار نویسی پروان چڑھتی رہی۔ پھر ۱۴ جنوری ۱۸۵۰ء کو لاہور سے "کوہ نور" جاری ہوا، یہ واحد اخبار تھا جس نے اپنی ۵۵ سالہ زندگی میں لاتعداد صحافی پیدا کئے، اس کی ریس میں کئی اخباروں نے نور کا لفظ اپنے نام کا جزو آخر بنا لیا، مثلاً "دریائے نور"، "باغ نور" وغیرہ۔ "کوہ نور" کے بانی منشی ہرسکھ رائے تھے۔ وہ سکندرآباد سے آکر لاہور میں آباد ہوئے تھے "کوہ نور" حکومت کی منشا میں ڈھلا ہوا روزنامہ تھا لیکن منشی ہرسکھ رائے "ازالہ حیثیت عرفی" کے مقدمے میں ۲ سال قید ہو گئے۔

"کوہ نور" کے چند ماہ بعد لاہور سے "دریائے نور" نکلا، یہ اردو کا پہلا آزاد اخبار تھا، فقیر سراج الدین اس کے سرپرست تھے ۱۸۵۵ء میں ایک ہفتہ وار "لاہور گزٹ" نکلا۔ مگر سال کے اندر اندر بند ہو گیا، پھر دوسرا اخبار "پنجاب جرنل" نکلا۔ منشی سید محمد عظیم نے ۱۸۵۷ء میں "پنجابی اخبار" جاری کیا۔ ایک نیم سرکاری اخبار "مفاد ہند" ڈپٹی کمشنر لاہور کی سرپرستی میں جاری ہوا۔ لاہور کے بعد پنجاب کا دوسرا اخباری مرکز سیالکوٹ تھا۔ اس کا پہلا اخبار "ریاض الاخبار" تھا۔ اس کے علاوہ "چشمہ فیض" اور "خورشید عالم" بھی دو مقامی ہفتہ وار تھے۔ ایک آدھ پندرہ روزہ اور دو تین ماہنامے نکلتے رہے۔

۱۸۵۲ء میں ملتان سے "ریاض نور" جاری ہوا۔ ڈیڑھ سال بعد "شعاع الشمس" جاری کیا گیا۔ دونوں کی چشمک تیز ہوگئی تو "شعاع الشمس" بند ہوگیا۔ ان کے علاوہ گوجرانوالہ، گجرات، راولپنڈی، شملہ، لدھیانہ، بٹالہ، امرتسر وغیرہ سے کئی ایک ہفتہ وار نکالے گئے۔ ۱۸۴۶ء میں آگرہ کالج کے زیر اہتمام "صدر الاخبار" نکلا پھر اس کا نام بدل کر "اخبار الحقائق" کر دیا گیا۔ میرٹھ سے "جام جمشید" کا اجرا ہوا۔ آگرہ سے ایک صاحب محی الدین نے "اسعد الاخبار" جاری کیا۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے اخبار بھی آگرہ سے نکلتے رہے جن میں منشی نول کشور کا "سفیر آگرہ" نمایاں تھا۔ ادھر لکھنؤ میں چھاپہ خانے مدت سے قائم تھے۔ لیکن پہلا جریدہ "لکھنؤ اخبار" ۱۸۴۷ء میں جاری ہوا۔ پھر "طلسم لکھنؤ" اور "سحر سامری" نکالے گئے۔ شمالی ہند کے بعض دوسرے شہروں مثلاً بنارس، بریلی اور علی گڑھ سے بھی اخبار نکل رہے تھے۔ مدراس کا پہلا اردو اخبار "اعظم الاخبار" تھا جو ۱۸۴۸ء میں جاری کیا گیا۔ ۱۸۴۹ء میں "آفتاب عالم تاب" نکلا۔ اسی سال ایک اور "تیسیر الاخبار" جاری ہوا۔ پھر ۱۸۵۵ء میں "مظہر الاخبار" نکلا۔ ۱۸۵۰ء میں "مدراس سے" آیا۔ "جامع الاخبار" مدراس اس دور کا ایک اہم اخبار تھا۔ اسی دوران میں علمی اور ادبی صحافت بھی ایک خاص مزاج پر استوار ہوتی رہی۔ ملک کے طول و عرض میں کئی ایک گلدستے نکالے گئے۔ جن کا مقصد شعر و شاعری کو فروغ دینا تھا۔ لارڈ میکالے نے ۱۸۳۶ء میں صحافت پر جو یادداشت مرتب کی اس میں اس خیال کا اظہار کیا کہ عوام میں مطبوعہ صحافت کا اتنا اثر نہیں جتنا قلمی صحافت کا ہے۔ اس کی روایت کے مطابق صرف "دھلی" سے ہر روز ایک سو بیس قلمی اخبار باہر بھیجے جاتے تھے۔ اور اس زمانے میں اخبارات کا مشن بظاہر رائے عامہ کی ترجمانی تھا۔ ۱۸۵۷ء تک جو اخبارات نکلتے رہے وہ زیادہ تر داستان گو تھے۔ یا پھر حکومت پر ایک آدھ اخبار میں میٹھی میٹھی تنقید ہوتی۔ لیکن قلمی اخبارات فی الواقع سخت جان تھے۔ سر جان میکلم کا بیان ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جو کچھ ہوا وہ تمام تر قلمی اخبارات کی تحریک و تاثر کا نتیجہ تھا۔

ایک عجیب بات ہے کہ اس زمانے کے انگریزی اخبارات نے تواتر سے مطالبہ کیا کہ دیسی اخباروں کو بند کیا جائے۔ حالانکہ دو تین اخباروں کو چھوڑ کر تمام ہندوستانی اخبار حکومت کے ساتھ تھے۔ یہ ایک دردناک حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے جرم میں سب سے زیادہ سزا کے مستحق ہندوستانی اخبار سمجھے گئے اور انہیں سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ "دھلی اردو اخبار" کے ایڈیٹر مولانا محمد باقر کو اس الزام میں گولی سے اڑا دیا گیا کہ وہ دھلی کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر کے قتل کی سازش میں شریک تھے۔ ان کے فرزند مولانا محمد حسین آزاد "دھلی اردو اخبار" کے پرنٹر اور پبلشر تھے، ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو گئے تو پا پیادہ لکھنؤ بھاگ کر جان بچائی "صادق الاخبار"

کے ایڈیٹر جمیل الدین تین سال قید کیے گئے۔

۱۸۵۷ء تک کی فارسی اور اردو صحافت کا خلاصہ یہ ہے کہ اخباروں کی اشاعت محدود تھی لیکن ان کے قارئین بلاشبہ با اثر طبقے کے لوگ تھے۔ انقلاب سے کوئی دو تین مہینے پہلے بعض اخباروں نے جرأت دکھائی اور وہ اجنبی راج کے خلاف خبریں دینے اور ان پر تبصرہ کرنے میں دلیر ہوگئے۔ لیکن دوسری دیسی زبانوں میں سے کوئی اخبار زیر عتاب نہ آیا، تعزیری کاروائی فارسی اور اُردو اخباروں کے خلاف کی گئی البتہ لارڈ کیننگ یا ان کے رفقا کے خلاف جن انگریزی اخباروں کا لب ولہجہ سخت تھا انہیں زیر عتاب لایا گیا۔ ۱۸۵۷ء کے جہاد حریت میں دہلی کے اخبار مقدمۃ الجیش تھے۔ انقلاب کے خاتمے پر ان کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ مسلمانوں کے ہاتھ سے ادارت سلب کر لی گئی۔ ۱۸۵۳ء میں اردو کے پینتیس۳۵ اخبار تھے۔ ۱۸۵۸ء میں صرف بارہ رہ گئے جن میں صرف ایک اخبار کی ادارت کسی مسلمان کے ہاتھ میں تھی۔

۱۸۵۷ء کی خونریزی کے بعد انگریزوں کے وحشیانہ مظالم نے نہ صرف مسلمانوں کی اجتماعی روح سلب کر لی بلکہ ان کی معنوی طاقت کو اس طرح کچل ڈالا کہ وہ گویا من حیثیت المجموع ایک خوفزدہ جماعت ہوگئے۔ چنانچہ نئے صحافتی دور کا آغاز اس طرح ہوا کہ ۱۸۵۸ء میں منشی نول کشور نے لکھنؤ سے "اودھ اخبار" جاری کیا جو چند سال بعد روزنامہ ہوگیا اور تقریباً نوے سال زندہ رہا۔ اودھ اخبار ایک غیر فرقہ دارانہ اخبار تھا اور اس کا لسانی سراپا مسلمانوں کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ منشی نول کشور ۱۸۹۵ء میں انتقال کر گئے۔

۳ مارچ ۱۸۶۶ء کو علی گڑھ سے اخبار سائنٹیفک سوسائٹی یا علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری ہوا، پہلے ہفت روزہ تھا پھر سہ روزہ ہوگیا۔ اس کا ایک کالم انگریزی اور ایک اردو میں ہوتا، سرسید احمد خان اس میں سیاسی مسائل پر مقالات و شذرات لکھتے۔ اخبار کا مقصد انگریزوں اور ہندوستانیوں کو ایک دوسرے کے خیالات سے آگاہ رکھنا تھا، سرسید احمد انگریزوں سے جس موالات کے مؤید تھے یہ اس کا آئینہ تھا۔

سرسید نے برعظیم کے مسلمانوں کی اصلاح و بیداری کے لیے جو تعلیمی، معاشرتی اور مذہبی تحریک شروع کی اس کی تکمیل کے لیے انگلستان سے لوٹ کر ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو "تہذیب الاخلاق" جاری کیا، جو مہینے میں تین بار نکلتا، اس کے دو نام تھے ایک تہذیب الاخلاق دوسرا دی محمڈن سوشل ریفارمر۔ اس رسالے کی بدولت اُردو ادب نے ایک انقلابی کروٹ لی، اردو شاعری کا رُخ بدلا، مذہبی ادب میں تموج پیدا ہوا، سادہ اور سہل زبان کی بنا پڑی، محمڈن کالج قائم ہوا۔ مسلمانوں میں انگریزی زبان پڑھنے کا شوق بڑھا۔ لیکن تہذیب الاخلاق میں

سرسید نے مذہباً جو طرزِ فکر پیش کرنا چاہا اس سے ملک بھر میں مدافعت و احتجاج کا غلغلہ پیدا ہو گیا، نتیجۃً سرسید نے تہذیب الاخلاق کا مذہبی حصہ منسوخ کر دیا۔

لکھنؤ سے اودھ پنچ نکلا، یہ طنز و مزاح کا جریدہ تھا، جس سے ملک کے بعض معروف اہل قلم وابستہ ہو گئے۔ لیکن طنز و مزاح کا یہ پہلا پرچہ نہیں تھا اس سے پہلے جنوری ۱۸۵۵ء میں رام پور سے "مذاق" نکلتا رہا۔ دوسرا پرچہ مدراس پنچ تھا، جو ۱۸۵۹ء میں جاری ہوا۔ جنوری ۱۸۷۶ء میں بمبئی سے "فرحت الاحباب" نکالا گیا۔ اسی سال مراد آباد سے "رہیل کھنڈ پنچ" نکلا۔ اور پٹنہ سے "بہار پنچ" جاری ہوئے گویا اودھ پنچ چھٹا مزاحیہ اخبار تھا۔ اس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین تھے۔ ۱۸۷۷ء میں نکلا اور ۱۹۱۲ء تک جاری رہا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کے علاوہ مرزا مچھو بیگ نواب سید محمد آزاد، اکبر الہ آبادی، تربھون ناتھ ہجر، جوالا پرشاد برق، احمد علی شوق اور احمد علی کسمنڈوی بھی ادارہ تحریر میں شریک نگارش تھے۔

اودھ پنچ ہندو مسلم اتحاد کا حامی، انڈین نیشنل کانگریس کا موید، حکمرانوں کا نکتہ چیں، مغربی تہذیب کا حریف، اور مشرقی تہذیب کا حلیف تھا۔

اودھ پنچ کی دیکھا دیکھی ہندوستان بھر میں کوئی سولہ پنچ نکل آئے جن میں سیالکوٹ کا پنچ، چلتی لاہور کا علاوہ دو پارہ تیس مار خاں، شریر اور دہلی کا چلتا پرزہ معروف تھے۔ اس دوران میں یعنی ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۰۰ء تک کئی ایک اخبار اور رسالے ملک کے مختلف حصوں سے نکلتے رہے۔ ان میں "اخبار انجمن پنجاب" "منشی پیارے لال آشوب اور محمد حسین آزاد کی ادارت میں تھا۔ ان رسائل کا مقصد زیادہ تر حکومت اور عوام میں رابطہ پیدا کرنا اور تعلیمی و تہذیبی سرگرمیوں کو بڑھانا تھا۔

حمایت اسلام لاہور ۱۸۸۵ء میں نکلا، پہلے ماہنامہ تھا پھر ہفتہ وار ہو گیا۔ ۱۹۷۴ء میں انجمن حمایت اسلام کے اسکول اور کالج سرکاری تحویل میں چلے گئے تو بند ہو گیا۔ مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی نے یکم اگست ۱۸۹۰ء کو ہفتہ دار "مہذب" نکالا۔ اس کا مقصد حکومت کی خیر خواہی کا دم بھرنا اور مسلمانوں کو کانگرس سے بچانا تھا۔ ۱۸۸۳ء میں لکھنؤ سے "ہندوستانی" نکلا، جو پہلے ہفتہ وار پھر ہفتے میں دو دفعہ اور آخر میں تین دفعہ ہو گیا۔

منشی سراج الدین احمد نے جنوری ۱۸۷۷ء میں الہ آباد سے ہفتہ وار "قیصر الاخبار" نکالا۔ اس میں ہلکے پھلکے طنزیہ تبصرے ہوتے اور سیاسی مسائل کو پیش کیا جاتا۔ الہ آباد سے ایک دوسرا اخبار "احسن الاخبار" ۸ جنوری ۱۸۷۸ء کو حاجی محمد کبیر الحق نے جاری کیا، یہ ایک ماڈریٹ اخبار تھا اور اس میں اسلامی خبریں نمایاں ہوتی تھیں۔

حکیم محمد محمود خان نے منشی بہاری لال مشتاق کی ادارت میں دھلی سے اکمل الاخبار جاری کیا، علامہ دتاتریہ کیفی کی رائے کے مطابق یہ اپنے وقت کے ثقہ اخباروں میں سے تھا۔

مولوی محرم علی چشتی نے ۵ جنوری ۱۸۸۴ء کو لاہور ہی سے "رفیق ہند" جاری کیا۔ یکم جولائی ۱۸۷۷ء کو دیوان موناسنگھ نے مولوی نبی بخش کی ادارت میں "آفتاب عالمتاب" جاری کیا، اسی طرح بمبئی، مدراس، بنگلور، حیدرآباد دکن سے کئی اخبار شروع ہوئے، اور عرصے تک نکلتے رہے۔ لیکن یہ اخبار بس اخبار ہی تھے۔ ان کے سامنے کسی علمی اور قومی ضرورت کی دعوت یا استعماری استبداد پر نکتہ چینی نہ تھی۔

۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء کے درمیان جو اردو روزنامے نکلے، ان میں اردو گائیڈ کلکتہ (۱۸۵۸ء) اودھ اخبار لکھنؤ (۱۸۷۴ء) اور روزنامچہ پنجاب (۱۸۷۵ء) قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ ۱۸۸۴ء میں لاہور سے دو روزنامے "شام وصال" اور "نسیم صبح" ضمیمہ کی شکل میں نکلتے رہے۔ رہبر ہند روزنامہ کیا گیا، بعض لوگ اسے لاہور کا پہلا روزنامہ قرار دیتے ہیں، ۱۵ دسمبر کو کلکتے سے "آئینہ نمائش" نام کا روزنامہ تین ماہ کے لیے جاری ہوا۔ ۲۴ اپریل ۱۸۸۵ء کو کلکتے سے "پیک صبا" نکلا اور یکم مئی ۱۸۸۵ء کو "روزنامچہ ملک"۔ ادھر لکھنؤ سے اودھ اخبار کے علاوہ ۱۸۸۲ء میں روزنامچہ لکھنؤ جاری ہوا۔ پھر ۱۸۸۵ء میں کئی ایک روزانہ اخبار نکلے، الہ آباد سے یکم نومبر ۱۸۷۷ء کو قیصر الاخبار کا روزانہ ایڈیشن شروع کیا گیا۔ دکن سے بھی کئی ایک روزنامے جاری ہوئے، زیادہ عمر "مشیر دکن" نے پائی جو برعظیم کی آزادی تک نکلتا رہا۔ مدراس کا پہلا روزنامہ "آغاز" تھا۔ جو ۱۸۸۴ء میں نکلا۔ رنگون سے حدیقہ روزگار (۱۸۸۴ء)، بمبئی سے "خادم ہند" (۱۸۸۳ء) اور پٹنہ سے انیس بہار (۱۸۷۶ء) جاری ہوئے۔ یہ روزنامے ضرور تھے لیکن ان میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جو ان کے رشحات قلم کو باقی رکھتی یا کسی تحریک کا حرف آغاز ہوتی۔ ان کی سرگزشت بس اتنی ہے کہ ایک زمانے میں اس نام کے اخبار جاری ہوئے تھے۔

انیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں سے لے کر بیسویں صدی کی پہلی ڈیڑھ دہائی میں لاہور سے "اخبار عام" اور "پیسہ اخبار" نکلے، امرتسر سے وکیل نکلا، موخر الذکر کے ادارہ تحریر میں مولانا عبد اللہ العمادی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے علاوہ آخری دور میں مولانا عبد اللہ سہاس ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۰۵ء کا آغاز عجب ہلچل کا زمانہ تھا، کانگرس کی بنیاد اگرچہ ۱۸۸۵ء میں ایک انگریز افسر مسٹر اے۔ او ہیوم نے رکھی، لیکن ایک قومی تنظیم کی حیثیت سے انیسویں صدی کی ڈیڑھ دہائی تک ممتاز نہ ہو سکی۔ ۱۹۰۵ء میں بنارس کے سالانہ اجلاس میں ۷۵۶ مندوبین شامل ہوئے جن میں صرف سترہ مسلمان تھے۔ اسی سال لارڈ کرزن نے ڈھاکہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اس تقسیم کے خلاف زبردست ہنگامہ

شروع ہوگیا۔ ہر کہیں انارکی پھیل گئی۔ جگہ جگہ بم پھٹنے لگے۔ کانگرس نے بھی تقسیم کی مخالفت کی، ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کے ایک وفد نے سر آغا خان کی راہنمائی میں لارڈ منٹو، دوائسرائے ہند سے ملاقات کی اور نیابتی اداروں میں مسلمانوں کے لیے تحفظات کا مطالبہ کیا اس کے علاوہ مرکزی، صوبائی اور بلدیاتی اداروں میں جداگانہ انتخاب رائج کرنے پر زور دیا۔ لارڈ منٹو کے بالواسطہ ایما پر یہ وفد ان سے ملا تھا۔ چنانچہ ۱۹۰۹ء میں اصلاحات نافذ ہوئیں تو جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا گیا۔ اس کی روداد پہلے آچکی ہے کہ نواب وقار الملک اور نواب سلیم اللہ خان ڈھاکہ نے ۱۹۰۶ء میں کل ہند مسلمان راہنماؤں کو جمع کر کے مسلم لیگ کی نیو رکھی،

اس وقت کانگرس کی راہنمائی آرہندو گھوش، بپن چندرپال، بال گنگا دھر تلک اور لالہ لاجپت رائے کے ہاتھ میں تھی اور یہ تمام راہنما پکے ہندو تھے۔ تلک کے نزدیک سیواجی مرہٹہ قومی ہیرو تھا۔ ۱۹۰۷ء میں حکومت نے لالہ لاجپت رائے کو جلاوطن کر دیا۔ اسی سال روس و برطانیہ نے ایران پر قبضہ کر کے اپنے اپنے حلقہ اثر میں بانٹ لیا، اس بٹوارے کے خلاف ایرانی نیشنلسٹوں نے مشروطہ یعنی آئین کی تحریک شروع کی۔ اور ایک سال کے اندر اندر خاندان قاچار کا تختہ اُلٹ ڈالا، اگلے سال ترکی میں انقلاب آگیا۔ انجمن اتحاد ترقی نے سلطان عبدالحمید کو تخت سے اتار دیا لیکن جمہوری انداز کی حکومت کے باوجود خلافت و سلطان کے ادارے قائم رکھے۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر کے طرابلس چھین لیا۔ روس نے مشہد مقدس پر گولہ باری کی۔ مغرب کی بڑی طاقتوں کے اشارے پر بلقانی ریاستوں نے ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۳ء میں ترکی کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ نتیجۃً ترکی کے یورپی مقبوضات اس سے چھن گئے۔ ۱۹۱۲ء میں کلکتے کے بجائے دھلی کو ہندوستان کا دار الخلافہ بنایا گیا۔

گاندھی جی ۱۹۱۹ء میں کانگرس میں داخل ہوئے اس سے پہلے کانگرس کا مزاج و نہاد مسٹر اے او ہیوم کے تاسیسی مقاصد پر تھا۔ ۱۸۸۵ء سے ۱۹۱۸ء تک کانگرس کے ۳۵ اجلاس ہوئے۔ تین کی صدارت پارسیوں نے کی ۲۱ کی ہندوؤں نے، ایک کی ہندوستانی عیسائی نے، ۶ کی انگریزوں نے اور چار کی مسلمانوں نے۔ لیکن علی گڑھ کے بعض انگریز پرنسپلوں، اولاً بیک، ثانیاً ماریسن کی بدولت، سرسید اور دوسرے اکابر مسلمانوں کو کانگرس سے الگ رکھنے کی تحریک اٹھا چکے تھے اور اس کے برگ و بار انتہائی سرسبز تھے، ادھر یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو سے ہندی کو بھڑانے کا فرض ابتداً علی گڑھ کالج کے پرنسپل مسٹر مارنس نے انجام دیا۔ ادھر ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی میں مسلمانوں کی ہزیمت نے انہیں ہندوستان کے طول و عرض میں ایک زندہ لاش کر دیا تھا۔ اس کے بعد علماء کی ایک جماعت نے انہیں انگریزوں کی غلامی پر راضی رکھنا چاہا، کئی علماء نے برطانوی عملداری کے حق میں فتوے جاری کیے۔ حتیٰ کہ مکہ معظمہ کے بعض

علماء سے بھی ہندوستان کے دارالسلام ہونے کے فتوے حاصل کیئے گئے۔ جنگ امبیلہ (سرحد ۱۸۶۳ء) کے بعد انگریزوں نے مجاہدین اور ان کے معاونین کو فنا کرنے کی ٹھانی، انبالہ (۱۸۶۴ء)، پٹنہ (۱۸۶۵ء)، راج محل (۱۸۷۰ء)، مالوہ (۱۸۷۰ء) اور پٹنہ (۱۸۷۱ء) میں مقدمہ ہائے سازش قائم کر کے سید احمد شہید کی تحریک کے باقیات کو خوفناک سزاؤں کے حوالے کیا۔ موت کی سزا دی، عمر قید کیا اور جائیدادیں ضبط کیں۔ پھر قرآن مجید کی تفسیر و ترجمہ میں مدافعت و مداخلت شروع ہوئی۔ ڈپٹی نذیر احمد نے انگریزوں کو اولوالامر قرار دیا۔

سر ولیم میور یوپی کا گورنر تھا۔ اس نے علی گڑھ کالج کی پہلی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ وہ ہندوستان میں سب سے پہلا شخص تھا جس نے حضور سرورِ کائنات، اور دینِ اسلام کے خلاف سب سے بدتر کتاب لکھی۔ اس میں لکھا کہ "انسانیت کے دو سب سے بڑے دشمن محمدؐ کی تلوار اور محمدؐ کا قرآن ہیں"۔ اس سر ولیم میور ہی نے ڈپٹی نذیر احمد کو اولوالامر کی تفسیر پر شمس العلماء کا خطاب دلوایا، اور ایڈنبرا یونیورسٹی سے ایل ایل ڈی کی ڈگری دلوائی۔ پنجاب میں مرزا غلام احمد پیدا کیا گیا۔ غرض مسلمانوں میں کئی فرقے سر اُٹھا کر اندرونی شیرازہ بندی کو خراب کر رہے اور مسلمانوں کی دینی وحدت میں خلل ڈال رہے تھے۔

المختصر ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم چھڑنے سے پہلے تمام دنیا کے مسلمان انحطاط کی طرف قدم بڑھا رہے تھے اور ہندوستان کے مسلمان ایک ایسے غار میں گر چکے تھے کہ ان میں انفرادی دہشت زدگی اور جماعتی اختلال پیدا ہو چکا تھا۔ سر سید کے متعلق آج یہ کہہ دینا آسان ہے کہ وہ انگریزوں کے دوست تھے اور کاسہ لیسی کے میدانوں میں چہل قدمی کرتے رہے، لیکن ۱۸۵۷ء کے خونیں ڈرامے کا تصور کیجیے پھر اس پس منظر میں ان کی مساعی کو تولیے معلوم یہ ہوگا کہ انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو اسپین کے مسلمانوں کی طرح معدوم ہو جانے سے بچا لیا۔ وہ مسلمانوں کے جسمانی محافظ تھے۔ اور وہ علماء جن کے ہراول دستے کی سالاری پر مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ تھے کی۔ مسلمانوں کے دینی محافظ تھے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا وجود ان ہر دو گروہوں ہی کا مرہون تھا۔ لیکن الہلال، کامریڈ اور زمیندار سے پہلے ہندوستانی مسلمان ذھنا پابہ زنجیر تھے۔ ان کے گرد و پیش خوف کا حصار تھا۔ اور وہ اپنی تاریخ کے سرمائے سے بہمہ وجوہ خالی الذہن تھے، اگر کہیں کوئی چنگاری تھی تو خاکستر میں دبی ہوئی۔ اور اس کی مثال بیوہ کے آنسو کی طرح تھی۔ جو عموماً تخلیہ میں بہہ کر مٹی میں تحلیل ہو جاتا یا رخساروں کی خشکی چاٹ لیتی یا پھر دامن میں رہ جاتا ہے۔

الہلال کے دینی اثرات کا جائزہ لینے کے لیے جو سوالات اُبھر آتے ہیں ان میں سے کئی ایک سوالات

کا جواب پہلے اوراق میں آچکا ہے۔ اجمالاً یہ کہ :

۱۔ الہلال نکلا تو اُردو صحافت میں دعوتِ دین کا رستخیزی دور مفقود تھا۔ اخبار سیاست و مذہب کو زندگی کے دو مختلف وظائف سمجھتے تھے۔ مذہب ان کے نزدیک ذاتی عقائد کی چیز تھا۔ علماء آپس میں شرعی تو تکار و فقہی تھکا فضیحتی کا شکار تھے۔ کوئی بین الاقوامی احساس یا ملکی سیاست کا فعال تاثر ان کے فکر و نظر میں نہیں تھا۔ اخباروں کا اجتماعی مزاج مجلسی تھا۔ ملک سیاسی طور پر ذہنی جدوجہد کی فضا میں انگڑائی لے رہا تھا۔ لیکن اڑان کے لیے بال و پر نہ تھے۔

۲۔ الہلال نے اُس وقت اپنے سفر کا آغاز کیا جب مسلمان داخلی اعتبار سے سپر انداز ہو چکے، اور خارجی اعتبار سے ناکارہ محض تھے۔ اور یہ وہ زمانہ تھا جب عیسائی سلطنتیں عالمی طاقت کی حیثیت سے مسلمانوں کی بیخ کنی کا فیصلہ کر چکی تھیں۔

۳۔ ہندوستان کے راعی اپنی رعایا سے مؤدبانہ اور ملتجیانہ لب و لہجہ چاہتے تھے۔

۴۔ مسلمانوں کا عالمی سانچہ بسرعت ٹوٹ رہا تھا۔ خلافتِ عثمانیہ کے یورپی مقبوضات اس کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ اور جو باقی رہا وہ مردِ بیمار تھا۔

۵۔ ہندوستانی مسلمان سلطنت کھونے کے بعد دینی وحدت کھو چکے، اور اب اپنے ہی پیشواؤں کی استعماری چراگاہوں کا غلہ تھے۔

۶۔ ہندوستان میں قومی آزادی کا تصور پیدا ہو رہا تھا لیکن مسلمان اس تصور سے خالی الذہن ہو چکے تھے۔

۷۔ اس وقت کے پڑھے لکھے مسلمانوں کا تناسب معلوم کرنا مشکل ہے۔ لیکن عام روایتوں کے مطابق ایک دو چار فیصد سے زیادہ نہ تھا۔ اور ان میں حروف اُٹھانے والے بھی شامل تھے۔

۸۔ اس زمانے میں مذہب و سلطنت کی زبان ہی مسلمانوں کو متاثر کر سکتی تھی۔ مذہب کی زبان عربی، سلطنت کی زبان فارسی تھی۔ ان زبانوں سے محروم ہوئے انہیں کچھ زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا۔ لیکن ان کا مزاج ان زبانوں ہی کے مطابق تھا۔ اور وہ لسانی اعتبار سے ان کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ ان زبانوں کی گونج اور گرج ان کے خمیر میں رچی ہوئی تھی۔

۹۔ الہلال، مبارزت کی دعوت تھا۔ اس دعوت کے لیے وہی زبان تیر بہدف تھی جو الہلال نے استعمال

کی اور مسلمان صدیوں سے جس کے وارث تھے ۔

۱۰۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے الفاظ میں الہلال نے انہیں بھولا ہوا سبق یاد دلایا، سید سلیمان ندویؒ کی یہ رائے پہلے نقل ہو چکی ہے کہ "نوجوان مسلمانوں میں قرآن پاک کا ذوق پیدا کیا، ان کے لیے ایمان ویقین کے نئے نئے دروازے کھول دیئے۔ اور ان کے دلوں میں قرآن پاک کے مطالب ومعانی کی بلندی و وسعت کو پوری طرح نمایاں کر دیا۔ اور مولانا آزاد نے اس فتنۂ فرنگ کے عہد میں اس طرز وروش کی پیروی کی جس کو ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ نے فتنۂ تاتار میں پسند کیا تھا۔"

سجاد علی انصاری کے ان الفاظ پر ایک دفعہ پھر غور کیجیے کہ یہی الہلال کا امتیاز تھا۔

"الہلال نے ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اس طرح بیدار کر دیا جس طرح نفخ صور سے لاکھوں برس کے سوئے ہوئے انسان زندہ ہو جائیں گے۔ میرا عقیدہ ہے اگر قرآن نازل نہ ہو چکا ہوتا تو مولانا ابوالکلام کی نثر اس کے لیے منتخب کی جاتی۔"

الہلال نے خلافت کے زمانے کی نصف لیڈرشپ پیدا کی اور اس زمانے کی خطابت کو نئے بال و پر دیئے۔ اس ضمن میں الہلال کا ایک عظیم کارنامہ یہ تھا کہ اس نے ملک میں نہ صرف جلیل القدر صحافی پیدا کئے۔ مثلاً مولانا غلام رسول مہر، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اور قاضی عبدالغفار وغیرہ جو مولانا سے غایت درجہ متاثر تھے بلکہ سید سلیمان ندویؒ، علامہ عبداللہ العمادی، مولوی حامد علی صدیقی، عبدالواحد کانپوری اور مولانا عبدالسلام ندوی کے رشحات قلم کا آغاز بھی الہلال ہی سے ہوا۔

برِعظیم کی آزادی ملک وقوم پرور مسلمانوں میں صف اوّل کی لیڈرشپ الہلال کی مخلوق یا الہلال سے متاثر تھی۔ ایک دور میں مسلمانوں کی ہمہ قسم لیڈرشپ (تناسب کا تعین کئے بغیر) بھی الہلال ہی کی خوشہ چیں رہی اور اہل قلم اور اہل سیاست کے اکثریتی افراد نے اعتراف واقرار کیا کہ انہیں اس وادی میں الہلال لایا، اور وہ مولانا کے رشحات قلم سے مسحور ہوئے۔ جمعیۃ العلماء ہند، مجلس احرار اسلام اور خدائی خدمت گار تحریک کے نوے فی صد زعماء مولانا آزاد اور الہلال کی دعوت پر جنگ آزادی میں شریک ہوئے۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر محمد مجیب وغیرہ بھی اپنے قومی درد اور ادبی عشق کو الہلال سے منسوب کرتے تھے۔

۱۱۔ الہلال اردو زبان کا پہلا باتصویر جریدہ تھا اس سے پہلے جتنے ہفتہ وار تھے وہ چند سو سے آگے نہ تھے،

لیکن الہلال پہلا ہفتہ وار تھا جس کی اشاعت فی ہفتہ دس ہزار ہوگئی، آج کے لاکھ ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ ۱۹۲۷ء میں ٹائپ اور نستعلیق کو یکجا کیا، اس کا پہلا دور تمام تر ٹائپ میں تھا۔ الہلال ہی کی بدولت صحافت میں موضوعات کا تنوّع پیدا ہوا۔ الہلال مذہب، سیاست، معاشیات، نفسیات، جغرافیہ، تاریخ، عمرانیات سوانح، ادب، ثقافت اور شعروانشاء کا مرقع تھا۔ اس عہد کے نامور اہل قلم، شبلیؒ، اقبالؒ اور حسرتؒ کے رشحات فکر الہلال میں چھپتے تھے۔ اور یہ اس کی عظمت کا اعتراف تھا۔ کہ علامہ اقبال نے بھی اس کے لیے خریدار مہیا کئے تھے۔ الہلال کا طرز مخاطبت داعی کا تھا اور وہ پیغمبرانہ لہجہ میں گفت گو کرتا تھا۔

۱۲۔ حقیقت یہ ہے کہ الہلال ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا محرک اوّل تھا۔

۱۳۔ الہلال اپنی روایتوں کا بانی و خاتم تھا۔ آج تک برِ عظیم اس کی نظیر نہیں لاسکا، ہندوستان میں کسی رسالے یا مجلّے سے اتنے انسان کبھی متاثر نہیں ہوئے جتنے الہلال سے متاثر ہو کر انگریزی استعمار کے خلاف جنگ آزادی کے راہنما ہو گئے۔ الہلال اسلامی ہندوستان کے جوش جہاد کی انشاء کے میدان میں آخری کروٹ تھا۔

۱۴۔ الہلال سے پہلے ہندوستان کے مسلمان من حیث الجماعت عالمی مسلمان نہ تھے۔ الہلال نے یہ خصوصیت پیدا کی۔ اس کا اظہار تحریک خلافت کے زمانے میں ہوا۔ اور یہی چیز پاکستان کے قیام اور ہندوستان کی آزادی تک برعظیم کے مسلمانوں کے خون میں گردش کرتی رہی۔

پاکستان کی تحریک حقیقۃً مسلمانوں کا سیاسی مطالبہ تھا اور اس مطالبہ کی پیدائش ہندوؤں کی عمرانی تنگ نظری اور معاشی کوتاہ بینی سے ہوئی۔ جس طاقت نے اس مطالبے کو پروان چڑھایا اور قوت بخشی حتیٰ کہ انگریزوں اور ہندوؤں کے لیے اس کا تسلیم کرنا ناگزیر ہوگیا۔ وہ مذہب کی طاقت تھی۔ اس کی پشت پناہی اسلام کر رہا تھا۔ وہی اسلام جس نے ۱۸۵۷ء میں دیوبند کے حصار میں پناہ لی جو الہلال کے اُفق سے طلوع ہوا۔ اور دیکھتے دیکھتے مسلمانوں کے خون کی گردش بن گیا۔ پھر اسلامی ہندوستان کی نشوونما ہوئی جس کو اقبال کی فکر نے مجلّیٰ کیا اور ابوالاعلیٰ مودودی نے پاکستان میں اسلامی تحریک بنا دیا۔

الہلال نکلا تو کانگرس اور لیگ کا ابتدائی دور تھا۔ مسلم لیگ کی نیو سرکاری مسلمانوں نے اُٹھائی اور وہ مسلمانوں کو کانگرس سے الگ رکھنے کی دوڑ میں سرگرم تھے۔ کانگرس کی لیڈرشپ لیگ کی لیڈرشپ کے مقابلے میں حریت فکر کی مالک تھی۔ اس کا ظاہری چلن مشترکہ نمائندگی کا تھا لیکن ہندو کا معاشی و سماجی ذہن اس پر غالب تھا، اس کے

سالانہ اجلاس خالی خولی قراردادوں کا مجموعہ سمجھتے اور بس، مولانا ان دنوں لیگ سے مجتنب تھے تو کانگرس سے بھی متنفر تھے۔ الہلال کے مقاصد اور پولیٹیکل تعلیم کے تحت ۸ ستمبر ۱۹۱۲ء کو لکھا:

- ہمارے پاس اگر کچھ ہے تو قرآن ہی ہے اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے۔
- ہم نے تو اپنے پولیٹیکل خیالات مذہب ہی سے سیکھے ہیں، وہ مذہبی رنگ ہی میں نہیں بلکہ مذہب کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ ہم انہیں مذہب سے کیونکر علیحدہ کر دیں، ہمارے عقیدے میں ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا کسی اور تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہو ایک کفر صریح ہے اور پالیٹیکس بھی اس میں داخل ہے۔
- "قرآن سامنے ہوتا" تو نہ گورنمنٹ کے دروازے پر جھکنا پڑتا نہ ہندوؤں کے اقتدار کی ضرورت پیش آتی، اسی سے سب کچھ سیکھتے جس کی بدولت تمام دنیا کو سب کچھ سکھایا ہے۔
- اسلام انسان کے لیے ایک جامع اور اکمل قانون لے کر آیا ہے۔
- الہلال کا مقصد اصلی اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ مسلمانوں کو ان کے تمام اعمال و معتقدات میں صرف کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے، خواہ تعلیمی مسائل ہوں خواہ تمدنی یا سیاسی ہوں خواہ اور کچھ ہو۔ وہ ہر جگہ مسلمانوں کو صرف مسلمان دیکھنا چاہتا ہے۔
- خدا تم کو اپنے کلام کے آگے سر بلند کرتا ہے۔ تم کیوں اس سے گردن موڑ کر انسانوں کے آگے ذلت کا سر جھکاتے ہو، اس کے سوا الہلال کی تعلیم کا اور کوئی مقصد نہیں۔
- اسلام اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ اس کے پیروؤں کو اپنی پولیٹیکل پالیسی قائم کرنے کے لیے ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے۔ مسلمانوں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی پولیٹیکل تعلیموں کے آگے جھک کر اپنا راستہ پیدا کریں۔ ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں وہ خود دنیا کو اپنی جماعت میں شامل کرنے والے اور اپنی راہ پر چلانے والے ہیں۔ اور صدیوں تک چلا چکے ہیں۔ ہم کسی کے ساتھ نہیں صرف خدا کے ساتھ ہیں۔
- الہلال کی پالیٹیکس یہی دعوت ہے کہ نہ تو گورنمنٹ پر بے جا اعتماد رکھیے نہ ہندوؤں کے حلقہ درس میں شریک ہوئیے صرف اس راہ پر چلیے جو اسلام کی بتلائی ہوئی صراط المستقیم ہے۔

اس اداریے میں مولانا نے ہندو انارکسٹوں کے طرز تشدد سے ہاتھ اٹھاتے ہوئے ہندوستان میں برٹش

گورنمنٹ کے قائم کردہ امن کا اعتراف کیا۔ لیکن نہایت خوبصورتی سے زور اس پر دیا کہ ہم اپنے مذہبی اصول کے مطابق ملک کی ترقی و آزادی کے لیے سعی کریں گے۔

۱۹۱۲ء کے ہندوستان میں برطانوی استعمار کے قہر و غضب کا جو عالم تھا۔ الہلال اس کا اندازہ شناس تھا۔ اس نے ہر قدم حکمت عملی سے اٹھایا۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۱۲ء کے اداریہ "صبح امید" میں لکھا کہ:

"اب تک فی الحقیقت پالیٹیکس میں نہ تو قوم کی کوئی پالیسی تھی اور نہ کوئی رائے، صرف چند ارباب رسوخ واقتدار تھے۔ جو اپنے محلوں میں بیٹھ کر تجویز رانی کر لیا کرتے تھے۔ پھر تمام قوم کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اس کے ہاتھوں میں اپنی چھڑی پکڑا دیتے۔ اور وہ کولہو کے بیل کی طرح ان کے بتائے ہوئے مرکز ذلالت کا طواف کرتی رہتی تھی۔ اصل قوت عام قوم کی ہے اور سچی پالیسی وہی ہے جو خود قوم کے دماغوں میں پیدا ہوتی ہو۔"

مسلمانوں کی آئندہ شاہراہ مقصود کیا ہونی چاہیئے" کے زیر عنوان ۹، ۱۶، ۲۳، اکتوبر اور ۶، نومبر ۱۹۱۲ء کے شماروں میں جو افتتاحیے لکھے ان میں فرمایا:

۱۔ امن موت ہے اور خطرہ صرف زندگی ہی کو ہوتا ہے۔

۲۔ ہمارے عقیدے میں بھی آجکل مسلمانوں کے لیے عبرت اور تنبیہ کا سب سے بڑا سبق ہندوؤں کے سیاسی اعمال ہیں اور بڑی بدبختی یہی تھی کہ آج تک اس سے عبرت حاصل نہیں کی گئی لیکن "پیروان امام مبین" کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی مذہبی موت نہیں ہو سکتی کہ اعمال زندگی کے ایک ضروری شعبے میں اسلام ان کو تعلیم دینے سے مجبور و لاچار ہو گیا ہو اور اس کی طرف سے مایوس ہو کر انہیں ایک دوسری قوم کے دسترخوان کی چھوڑی ہوئی ہڈیوں پر ملچانا پڑے۔

۳۔ اسلام تو اعتقاد وعمل کی ہر صداقت اور کائنات کے ہر حسن وجمال کا نام ہے، جہاں کہیں صداقت اور جمال موجود ہے یقین کرنا چاہیئے کہ وہ اسلام ہے، مسلمانوں کو نہ پولیٹیکل پالیسی کی تلاش وجستجو میں وقت ضائع کرنا چاہیئے نہ اعلیٰ تعلیم کے اضافہ لامتناہی میں پڑنا چاہیئے، نہ لیگ کے غلامانہ اور مرگ آور پالیٹیکس پر توجہ کرنی چاہیئے اور نہ کانگرس کی رپورٹوں میں اپنے لیے نسخہ فلاح ڈھونڈنا چاہیئے، ان کو صرف ایک ہی کام کرنا چاہیئے یعنی بلا سوچے ہوئے کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں، اپنا ہاتھ دست الٰہی میں دے دینا چاہیئے۔

۴۔ آج دنیا قوم اور وطن کے نام میں اپنے لیے جو تاثیر رکھتی ہے وہ اثر مسلمانوں کے لیے صرف اسلام یا خدا کے لفظ میں ہے، مسلمانوں کے لیے ہر شے ان کے مذہب میں ہے۔

الہلال بابت ۱۸ دسمبر ۱۹۱۲ء کے الہلال میں "الجہاد فی سبیل الحریت" کے زیرعنوان واشگاف الفاظ میں لکھا:

"یقیناً ایک دن آئے گا جب کہ ہندوستان کا آخری سیاسی انقلاب ہو چکا ہوگا۔ غلامی کی وہ بیڑیاں جو اس نے خود اپنے پاؤں میں ڈال لی ہیں بیسویں صدی کی ہوائے حریت کی تیغ سے کٹ کر گر چکی ہوں گی اور وہ سب کچھ ہو چکے گا جس کا ہونا لازم ہے۔ اس وقت ہندوستان کی ملکی ترقی کی ایک تاریخ لکھی گئی تو آپ کو معلوم ہے اس میں ہندوستان کے سات کروڑ انسانوں کی نسبت کیا لکھا جائے گا؟ اس میں لکھا جائے گا کہ ایک بدبخت اور زبوں طالع قوم جو ہمیشہ ملکی ترقی کے لیے ایک روک، ملک کی فلاح کے لیے ایک بدقسمتی راہ آزادی میں سنگ گراں، حاکمانہ طمع کا کھلونا، دست احباب میں بازیچہ لعب، ہندوستان کی پیشانی پر ایک گہرا زخم اور گورنمنٹ کے ہاتھ میں ملک کی امنگوں کو پامال کرنے کے لیے ایک پتھر بن کر رہی! اس میں لکھا جائے گا کہ ایک قابلِ رحم مگر مسحور انسانوں کا گلہ جس کے ہر فرد کو کسی زبردست کاہن نے اپنے منتر سے جانور بنا دیا تھا جو اپنے نچانے والے آقا کے ہاتھ میں اپنی گردن کی رسی دیکھتی تھی اور خوش ہوتی تھی، جس میں کوئی انسانی ارادہ، کوئی انسانی حرکت اور کوئی انسانی زندگی کا ثبوت نہ تھا جو نہ اپنے دماغ سے سوچ سکتی تھی نہ اپنی آواز سے بول سکتی تھی، نہ اپنے پاؤں سے چل سکتی تھی۔ اور نہ اپنے ہاتھوں کو اپنا ہاتھ سمجھ کر اٹھا سکتی تھی، ایک معمول جو مسمرائزر کے ارادے پر زندہ ہو، ایک وجود شل جو صرف زمین کے لیے بار ہو ایک درخت جو حرکت کے لیے ہوا کا منتظر ہو ایک پتھر جو بغیر کسی ذی روح کے حرکت دیے ہل نہ سکتا ہو اور سب سے آخر یہ کہ ایک بدبختی کا داغ جو انسانیت کی پیشانی پر ہو۔

پھر اس میں لکھا جائے گا، یہ حالت اس قوم کی تھی جو آہ کہ مسلم تھی۔

اگر تم کہو کہ تاریخ ہند میں ہمارے لیے شرف و عظمت کا بھی ایک باب ہوگا تو تم خاموش رہو اور مجھ سے کہو کہ میں اسے پڑھ دوں، بے شک ایک باب ہوگا مگر جانتے ہو اس میں کیا ہوگا؟ اس

میں لکھا ہوگا کہ ہندوستان ملکی ترقی اور قومی آزادی کی راہ میں بڑھا، ہندوؤں نے اس کے لیے اپنے سروں کو ہتھیلی پر رکھا، مگر مسلمان غاروں کے اندر چھپ گئے۔ ملک نے پکارا مگر انہوں نے اپنے منہ اور زبان پر قفل چڑھا دیئے، ملک غیر منصفانہ قوانین کا شاکی تھا، ہندوؤں نے اس کے لیے جہاد شروع کیا۔ پر اس قوم مجاہد نے یہی نہیں کیا کہ صرف چپ رہی بلکہ مجنونانہ بر چیخ اٹھی کہ تمام کام کرنے والے باغی ہیں، اسے کیا خبر کہ بیسویں صدی میں کوئی ملک غلام نہیں رہ سکتا، شاید ہی دنیا میں کسی قوم نے پالیٹیکس کی ایسی صریح تذلیل و توہین کی ہوگی جیسی چھ سال تم نے کی تم نے، اے چاندی اور سونے کو پوجنے والو تم نے کی، تمہارا وجود یک سر سیاست کی تحقیر اور تمہارے اعمال اس کی معزز پیشانی پر کلنک کا ایک ٹیکا ہیں۔“

”ہندو مسلمانوں کا سوال بھی ایک بازیگر کا کھیل ہے اور بدبختی سے ناچنے والے ناچ رہے ہیں، فوج میں پھوٹ پڑ گئی ہے اور غنیم مطمئن ہے، یہ خیال کہ تم نے ابھی تعلیم میں ترقی نہیں کی اس لیے تمہارا پالیٹکس یہی ہے کہ پہلے ہندوؤں سے اپنے غصب کردہ حقوق چھین لو۔ غور کرو کہ حریف شاطر کی چال کس قیامت کی چال تھی۔“

”اگر مسلمانوں کی آنکھوں کو لیڈروں کے عمل السحر نے بند کر دیا ہوتا تو وہ اس منظر کو دیکھتے اور خون کے آنسو روتے، وہ دیکھتے کہ یہ کیا بدبختی ہے کہ ملک کی ترقی و فلاح کا مسئلہ ہی سرے سے ہندو مسلم مسئلہ ہو گیا ہے اور مسلمانوں کو من حیث القوم اس سے کوئی تعلق نہیں رہا۔“

الہلال مسلم لیگ کے بارے میں خوش رائے نہ تھا، علی گڑھ کی سیاست کا سخت ناقد تھا۔ اور یونیورسٹی کی تاسیس میں حکومت کے عمل دخل کو کم سے کم دیکھنے کا متمنی تھا، چونکہ مولانا آزادؒ کا علامہ شبلیؒ سے تعلق خاطر تھا۔ اس لیے ان کی دلچسپی کا مرکز ندوہ تھا الہلال کا تقریباً ایک تہائی حصہ ندوہ کے مسائل و مباحث پر مشتمل ہوتا۔ ۱۹۱۴ء کے ہر شمارے میں ندوہ کا ذکر رہا۔

الہلال والبلاغ کا ابتدائی دور عثمانی سلطنت سے بلقانی ریاستوں کی آویزش، طرابلس پر اٹلی کے تصرف، خلافت عثمانیہ کے مشئون اور مسلمانوں پر اسی طرح کے روزمرہ کے استعماری حوادث کی داستان مسلسل تھا۔ فی الجملہ الہلال کا یہ دور خالص اسلامی دور تھا۔ اس دور میں مولانا نے الہلال والبلاغ کے صفحات میں قرآن و اسلام کو پیش کیا اور حزب اللہ کی نیو اٹھائی۔ ان محولا موضوعات کے علاوہ مسجد کانپور، مسجد سکر پور

اُردوئے معلیٰ، مسلم گزٹ اور زمیندار وغیرہ کے اجلاء پر اپنے خاص انداز میں خامہ فرسائی کی، عربی زبان کے حوالے سے اُردو زبان کی علمی اصطلاحات پر نہایت قیمتی مضمون شائع کئے اور اس طرح علمی مباحث کا ایک نیا دروازہ کھولا۔

۱۹۲۷ء کا الہلال ۱۶-۱۹۱۲ء کے الہلال کی دعوت سے مختلف تھا۔ اس میں مولانا ایڈیٹر ہونے کے باوجود کم ہی شریک ہوئے لیکن ان کا ذوق وایقان اور قلم وزبان بدرجہ اتم موجود تھے۔ الہلال کا دور اوّل تحریک کا دور تھا۔ لیکن دورِ ثانی اس سے مختلف تھا وہ ایک قاموسی کا شہ پارہ اور مدیر کی بجائے مدبر کا جریدہ تھا کہ اب تک اس پر دین وسیاست اور انشا ر وعلم کے گنج شائیگاں کا گمان ہوتا ہے۔

الہلال کی نثر

الہلال کی نثر تمام تر مولانا آزادؒ کی نثر ہے، اس نثر کا ایک خاص اسلوب ایک منفرد پیرہن اور ایک پُرشکوہ مزاج تھا۔ مولانا ہی اس کے موجد اور وہی اس کے خاتم تھے۔ جن فضلاء نے ادارہ تحریر میں کام کیا اُن کے رشحاتِ قلم میں مولانا ہی کا رنگ تھا۔ الہلال سے الگ ہوئے تو ان کا اسلوب بدل گیا اور خود صاحب طرز ہو گئے۔

مولانا عبدالسلام ندوی الہلال کے ادارہ تحریر میں رہے۔ وہ "دار المصنفین" اعظم گڑھ میں سید سلیمان ندوی کے رفیق قلم اور ان کے ہم فکر وہم مسلک تھے جنوری ۴۲ ۱۹ء کے "معارف" میں زبان اُردو سے متعلق ان کا ایک خطبہ صدارت درج ہے۔ اس میں فرماتے ہیں:

"مولانا ابو الکلام آزاد کا طرز تحریر اُردو زبان کا ایک معجزہ ہے جس کی تقلید ناممکن ہے۔ جن لوگوں نے اس کی تقلید کی ان کا وہی حشر ہوا جو مسیلمہ کذاب کا ہوا۔"

مولانا حامد حسن قادری، پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ نے "داستان تاریخ اُردو" میں سرسید کے دور کو نثر کا پانچواں دور (۱۸۷۰ء تا ۱۹۰۰ء) قرار دیا ہے اور چھٹے دور کی نیو مولانا محمد حسین آزاد (متوفی ۱۹۱۰ء) سے اٹھائی ہے اور اس دور میں مولوی ذکاء اللہ دہلوی (متوفی ۱۹۱۰ء) مولوی نذیر احمد دہلوی (متوفی ۱۹۱۲ء) خواجہ الطاف حسین حالی (متوفی ۱۹۱۴ء) مولوی سید علی بلگرامی (متوفی ۱۹۱۱ء) کو شریک کیا ہے، ان کے علاوہ میر ناصر علی (پیدائش ۱۸۴۷ء) اور خواجہ سید ناصر نذیر فراق دہلوی (پیدائش ۱۸۶۵ء) کو بھی اسی دور میں شامل کیا ہے۔ لیکن فاضل مولف نے پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولوی عبدالحلیم شرر، مرزا محمد ہادی رسوا، اور منشی سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ کو اس دور میں شامل نہیں کیا اور صرف یہ بیان کیا ہے کہ ان کی پہلی اور بڑی حیثیت ناول نگار کی

ہے۔ دوسرے ان کے فن کا ارتقا بیسویں صدی میں ہوا اور یہ چاروں ظرافت کے پیش رو تھے''۔

اس تقسیم و تجزیہ کے مطابق محمد حسین آزاد اگر نثر کے چھٹے دور کے راہنما تھے تو ساتواں دور ابوالکلام آزادؒ اور ظفر علی خانؒ وغیرہ کا تھا، یا پھر ان کے ہمراہیوں اور جانشینوں کا تھا، حقیقت یہ ہے کہ ابوالکلام کی معجز انثر کے سوا عوام کو شعر نے نثر سے کہیں زیادہ متاثر کیا۔ ادب نے عوام کے ذہنوں کو اتنا نہیں جھنجھوڑا جتنا صحافت نے اور صحافت سے کہیں زیادہ اردو خطابت نے عوام کو جگایا، اٹھایا اور اڑایا، جواہر لال نہرو نے اعتراف کیا تھا کہ ''ہندوستان میں قومی آزادی کی تحریک کو پھیلانے اور چلانے میں اردو کا سب سے بڑا حصہ ہے'' اور یہ حقیقت ہے کہ انگریزی ہندوستان میں تحریک آزادی کے دوران اُردو اخبار بھی مختلف اوقات میں حکومت کے زیر عتاب رہے اور امتحان و ابتلا کے شدائد سے گزرے۔ جتنی نظمیں بحق سرکار ضبط ہوئیں وہ ۹۰ فیصد اُردو میں تھیں اور قید ہونے والے شاعروں میں بھی ۹۰ فی صد اردو شاعر تھے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے مقرر اُردو ہی کے مقرر تھے۔ جن ادبی مورخوں نے ادب کے مختلف دَور قائم کئے وہ اگر ہر دَور کے سرفہرست مصنفین و مولفین کی تحقیقات و تالیفات کی مجموعی اشاعت کا حساب کریں تو ان کی تعداد الہلال، کامریڈ، زمیندار اور ہمدرد کے ایک شمارے کی اشاعت سے بھی کم ہوگی، حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے معاشرے اور ہندوستان کے سماج کو اتنا کتابوں نے بیدار نہیں کیا جتنا اخباروں نے جگایا اور ان پر سحر کیا۔ زمیندار، کامریڈ اور الہلال تاریخ ساز ہی نہیں خود تاریخ تھے۔ اور یہ خصوصیت کسی دوسرے جریدے یا مجلے کو حاصل نہیں ہوئی اور نہ کسی نے سیادت و سیاست میں اتنے منظم برگ و بار پیدا کئے۔

مولانا غلام رسول مہر برعظیم کے جلیل القدر صحافی تھے وہ اپنے ایک مضمون ''نادرہ روزگار شخصیت'' میں لکھتے ہیں۔

''الہلال کے دور اول ہی میں دنیا نے تسلیم کر دیا تھا کہ علم و فضل میں ایسا آدمی صدیوں سے پیدا نہیں ہوا''۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے ''ایام عشق و جنوں'' کے عنوان سے لکھا۔

''ابوالکلام کی شخصیت اقلیم معنی تھی''۔

ایک دوسرے مضمون میں تحریر کیا۔

''ابوالکلام ایک بے پناہ قلم لے کر پیدا ہوئے تھے۔ لیکن انہیں سقراط کی طرح اپنی ہی قوم کے

ہاتھوں زہر کا پیالہ پینا پڑا۔"
پنجاب کے مشہور ریڈیائی ڈرامہ نگار رفیع انور نے لکھا،
" ان کے رشحاتِ قلم پر سینکڑوں اسپنسر اور ہزاروں میکاسے بے دریغ نچھاور کیے جا سکتے ہیں۔"
عبدالماجد دریاآبادی اپنا قلمی بغض مولانا محمد علی سے ارادت کی آڑ میں نکالتے رہے لیکن مولانا محمد علی کا مولانا آزاد کے متعلق قول تھا کہ:
"میں نے لیڈری ابوالکلامؒ کی نثر اور اقبالؒ کی شاعری سے سیکھی ہے۔"
حسرت موہانی نے الہلال ہی سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں بھی مزا نہ رہا

سجاد انصاری مرحوم کے الفاظ ذیل "معارف" اعظم گڑھ کے ایڈیٹر سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے اپنے مضمون "الہلال کا مطالعہ" میں نقل کیے ہیں۔
"میرا عقیدہ ہے اگر قرآن نازل نہ ہوتا تو ابوالکلام کی نثر اس کے لیے منتخب کی جاتی یا اقبالؒ کی نظم، میرے نزدیک ابوالکلامؒ اور اقبالؒ حقیقی معنوں میں فوق البشر ہیں۔"
سید صباح الدین رقمطراز ہیں کہ:
" مولانا کی قلمی لالہ کاری سے میں نے اپنے داغہائے دل کو روشن ہوتے پایا۔ الہلال کے اوراق الٹتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے سحر سامری سے کوئی مسحور کر رہا ہے۔ اردو میں الہلال کی جھنکار اور للکار ایک بالکل نئی چیز تھی وہ ایک صدائے ربانی معلوم ہوتی تھی اور الہلال ان کے قلم سے سحر بلال بن گیا تھا۔
نواب بہادر یار جنگ جو مسلم لیگ کے سب سے بڑے خطیب تھے فرماتے "وہ الہلال پڑھ کر مقرر ہوئے تھے"۔ سید سلیمان ندوی فرماتے: "مولانا شبلی کا ارشاد تھا کہ میں ایجاز کا بادشاہ ہوں ابوالکلام اطناب کا بادشاہ ہے۔"
سرسید کی عبارت کی ناہمواری اور پھیکے پن کو حالی نے اپنی سادگی اور پرکاری سے دور کیا۔ محمد حسین آزاد نے اس کو رنگینی اور دلکشی عطا کی۔ ڈپٹی نذیر احمد نے برجستگی اور صاف گوئی دی۔ شبلی

نے متانت، ثقاہت اور لطافت بخشی لیکن اُردو کے اسلوب بیان میں شوکت وحشمت اور عظمت وجلال کی جو کمی تھی اس کو مولانا آزادؔ نے الہلال کے ذریعے پورا کیا۔ الہلال ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی دینی اور سیاسی زندگی کا ایک اہم موڑ تھا۔ مولانا نے الہلال کی معرفت مسلمانوں کی دینی محبت ملی غیرت اور قومی بصیرت کا منار تیار کیا پھر اس کی چوٹی پر چڑھ کے ملکی سیاست اور وطن آزادی کا صور پھونکا۔ جس نے انگریزوں کے تعمیر کردہ طلائی قصر کی بنیاد ہلا دی۔"

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی تصنیف "تلاش ہند" میں الہلال کا ذکر کرتے ہوئے اس کے اسالیب ومطالب کو مسلمانوں کے لیے ایک ایسی آواز قرار دیا کہ اس سے پہلے وہ اس کی توانائی وزیبائی سے ناواقف تھے۔

جمہوریہ ہند کے پہلے صدر بابو راجندر پرشاد اُردو اور فارسی میں دست گاہ رکھتے تھے۔ ان کا اُردو رسم الخط نہایت خوبصورت اور حروف کی نشست کے اعتبار سے اس طرح تھا کہ ہر لفظ کا ٹانکہ ٹانکہ بولتا تھا۔ راقم الحروف وزارتی مشن کے زمانے میں ان سے ملا تو دورانِ گفتگو الہلال کا ذکر آگیا، کہنے لگے:

"مسلمانوں نے صاحبِ الہلال سے وہی سلوک کیا ہے جو امویوں نے کربلا میں آلِ رسولؐ سے کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی کا مسلمان الہلال کا ذہنی قرض اتارنا چاہے تو عمر بھر اتار نہیں سکتا ہے۔"

مفتی کفایت اللہ اپنے تبحرِ دینی کے باعث ثانی ابو حنیفہ کہلاتے تھے۔ راقم الحروف مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے ہمراہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس زمانے کے اخباروں کی روش پر بات چیت شروع ہو گئی مولانا حبیب الرحمٰن کہہ رہے تھے کہ آج کے اخبار بگولے ہیں، ان میں تلوار کا گھاؤ نہیں۔ مفتی صاحب نے فرمایا، اخبار ہر دور میں قومی ضرورتوں کے مظہر ہوتے ہیں، الہلال اس زمانے کے مسلمانوں کی دینی خواہشوں اور سیاسی آرزوؤں کا آئینہ تھا، ابو الکلامؒ کے قلم نے اس کو صورِ اسرافیل بنا دیا۔ اخبار تو اب بھی ہیں، لیکن ایڈیٹروں میں کوئی ابو الکلامؒ نہیں، بادل ہیں رعد نہیں۔"

مولانا ظفر علی خانؒ شہید گنج کے بعد کانگرس کی ہمنوائی سے کٹ کے مسلم لیگ کے ہو گئے لیکن ہجو نگاری کا ولولہ خاص رکھنے کے باوجود "استعمار دشمن" مسلمانوں کے اوصاف کا اعتراف کرتے اور انہیں مسلمانوں کی رُوح

قرار دیتے تھے۔ ایک دفعہ مولانا ابوالکلام آزاد کا ذکر آیا، تو فرمایا۔

”اُردو ادب الہلال کی اداؤں سے بالابلند ہوگیا، دین قیم کے چہرے پر اس کی صداؤں سے رونق آگئی اور سیاست کا بازار اس کے ولولوں سے معمور ہوگیا، الہلال قرن اول کی آواز تھا لیکن کامریڈ میں صحابہ کا التہاب تھا اور نہ زمیندار بلال کی اذان تھا۔“

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ خطابت کے بادشاہ تھے، جس طرح الہلال کی صحافت میں قرآن کی آیتیں اور شاعری کے تیرونشتر ہر پیرے یا فقرے کے موڑ پر ہوتے۔ اسی طرح شاہ جی کی خطابت میں شاعری کا جمال اور قرآن کا جلال ہوتا۔ سامعین ان کے سحر کا شکار ہوتے، شاہ جی الہلال کے ذہنی شاگرد تھے۔

الہلال کا جادو تھا کہ سارا ملک اسی کا ہوگیا۔ اس نے تحلیلوں اور رہنماؤں کی ایک ایسی جماعت پیدا کی جس نے استعمار دشمن ہندوستان تیار کیا۔ الہلال کے اس فیضان سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جماعت اسلامی، خاکسار تحریک، مجلسِ احرار اور تبلیغی جماعت کے ذہنی پس منظر میں اسلام سے شغف کی حد تک الہلال ہی کے دورِ اوّل کا ولولہ ہے۔

سفر نامۂ اشاعت

الہلال کے دو نو ادوار اور البلاغ کے ایام اشاعت کا اجتماعی زمانہ سوا تین سال تھا۔ الہلال کا پہلا دور دو سال اور چار ماہ کا تھا، البلاغ ایک سال کے وقفے سے ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو نکلا اور ۳۱ مارچ ۱۹۱۶ء تک چلا۔ پورے پانچ ماہ۔ الہلال کا دورِ ثانی (۱۹۲۷ء) چھ ماہ ہے۔ ترتیب یہ ہے۔

الہلال دَورِ اوّل

۱۔ ۱۳ جولائی تا ۲۵ دسمبر ۱۹۱۲ء۔

۲۔ ۸ جنوری ۱۹۱۳ء تا ۱۷ دسمبر ۱۹۱۳ء۔

۳۔ ۷ جنوری ۱۹۱۴ء تا ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء

البلاغ

۱۔ ۱۰ جون ۱۹۲۷ء ——— تا

۹ دسمبر ۱۹۲۷ء۔

الہلال دَورِ ثانی

۱۔ ۱۰ جون ۱۹۲۷ء تا ۹ دسمبر ۱۹۲۷ء

صرف ۱۹۱۳ء پورا سال ہے جب الہلال سال بھر نکلا۔

ایک چھچلتی ہوئی نگاہ میں ان تمام پرچوں کی شکل یہ ہے کہ ۱۹۱۲ء کے تمام پرچوں کا سرورق سرخی مائل

گلابی، اور ہر شمارہ ٹائیٹل سمیت بیس صفحات کا ہے۔ تمام پرچہ مکینیکل نیوز پرنٹ پر ہے قیمت ۳ آنے سرورق پر کسی شخصیت یا واقعہ کی تصویر مع فہرست مضامین کے ہے۔

مندرجات کا جائزہ

شمارہ اوّل ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء

پہلے صفحے پر سید جمال الدین افغانی کی تصویر ہے اور اندر شیخ محمد عبدہ مصری، سید محمد رشید رضا مصری، یوز باشی، جاوید ملک، شیخ سلیمان باشی مع جماعت مجاہدین کی تصویریں ہیں۔ ان کے علاوہ غزہ میں عثمانی کیمپ کی تصویر ہے۔ ان کے افکار و احوال کا روایتی تذکرہ ہے۔

افتتاحیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ الہلال کے اجرا کا خیال مولانا کو پہلے ۱۹۰۶ء میں ہوا تھا، سید رشید رضا مصری کے بارے میں مع تصاویر تین صفحے کا مضمون ہے، سب سے بڑا مضمون ناموران غزوہ طرابلس پر ہے، کارزار کے عنوان سے تصویر سمیت وہاں کی صورت حال کا بیان ہے۔ میدان جنگ کے تار ہیں، اس کے علاوہ قسطنطنیہ کی ڈاک ہے۔ شیخ سنوسی کے انتقال کی خبر ہے، اور عالم اسلامی کے احوال کا خلاصہ ہے۔ آئندہ شماروں کی تصاویر اور مضامین کا اعلان ہے۔

۲۰ جولائی

صفحہ اول پر فرہاد بک اور شیخ اقبال کی تصویر ہے، مضامین میں الہلال کے طباعتی سفر کی مشکلات کا ذکر ہے، احرار اسلام کے زیر عنوان الحریت فی الاسلام کے مقالہ کی ابتدا ہے۔ سید رشید رضا پر دوسری قسط ہے۔ ناموران غزوہ طرابلس کے اور کارزار طرابلس کے تصویری مقالات ہیں۔ شیخ احمد سنوسی کے علم جہاد کی تصویر ہے۔ اسلامی ممالک کی خبریں ہیں اور اس سلسلہ کے ضروری وقائع و کوائف ہیں۔

۲۷ جولائی

قیمت فی پرچہ ساڑھے تین آنے کر دی گئی، صفحہ اول پر برطانوی کیمپ میں عثمانی بیا ببر کی تصویر ہے، توفیق پاشا، کامل پاشا، فتحی بک اور ایرانی مجاہدین کی تصویریں ہیں، قسطنطنیہ کے احوال کا تذکرہ ہے، مسلم یونیورسٹی اور مسلم لیگ پر سرکاری سائے کی حکایت ہے۔ رشید رضا مصری کے متعلق تیسری قسط ہے، ناموران غزوہ طرابلس اور کشتگان کارزار طرابلس کی داستان ہے۔ اسلامی ممالک اور اقصائے مغرب کی خبریں ہیں۔

۴ اگست

صفحہ اوّل کی تصویر میں محمود شوکت پاشا میدان قواعد میں فوج کے جوانوں سے مخاطب ہیں، افتتاحیہ مسلم یونیورسٹی کے مسئلے پر ہے اور خاصا طویل ہے۔ قسطنطنیہ میں ہجوم مشکلات کے عنوان سے ایک مضمون ہے باقی وہی ناموران غزوہ طرابلس کی خبریں ہیں۔ کارزار طرابلس اور بیروت پر گولہ باری کے تصویری مناظر ہیں۔ اس کے علاوہ مغرب اقصیٰ اور عالم اسلام کی خبریں ہیں۔

۱۱ اگست

صفحہ اوّل پر محمد حسن بیک ترکستانی جس نے مجاہدین طرابلس کو فوراً کروڑ روپے کا عطیہ بھیجا، کی تصویر ہے۔ شذرات کے علاوہ "الامر بالمعروف و نہی عن المنکر" پر ۲ صفحے کا اداریہ، مراسلات کے دو صفحے، ناموران غزوہ طرابلس مع تصاویر، کارزار طرابلس کے احوال اور مسیحی لشکر کے ہاتھوں قتل عام کی تصویر، عالم اسلامی کے تحت مسلمانانِ چین کا تذکرہ، محمود شوکت پاشا کی روداد، شئون عثمانیہ اور اس سلسلے کی خبروں کا اختصار۔

۱۸ اگست

صفحہ اوّل پر طبروق کے کمانڈر ادھم پاشا کی تصویر، شذرات میں، ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی و تعلیمی امور کا تذکرہ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر قسط نمبر ۲، مسلم یونیورسٹی کے خواب کی تعبیر (مقالہ)، ناموران غزوہ طرابلس اور کارزار طرابلس مع تصاویر، مسلمان ممالک کی خبروں کا خلاصہ۔

۲۵ اگست

صفحہ اوّل پر انور پاشا کی تصویر، "زمیندار" اور "وطن" سے اپیل کہ باہمی تو تکار بند کردیں، نشۂ شام کی نصفِ شب یا مسلم یونیورسٹی کے زیرعنوان اداریہ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی تیسری قسط، ناموران غزوہ طرابلس، ممالک اسلامی کی خبروں کا خلاصہ۔

یکم ستمبر

صفحہ اوّل پر طرابلس کے ایک کمانڈر کی تصویر، شذرات، پنجاب کے اسمٰعیلی ہندو، مسلم یونیورسٹی کمیٹی، نشۂ شام کی نصفِ شب یا مسلم یونیورسٹی (اداریہ) مغرب اقصیٰ کے زیرعنوان خلاصہ کوائف مقالات، علی گڑھ کے استاد عربی کا طویل عربی میں مراسلہ، ناموران غزوہ طرابلس، کارزار طرابلس اور عالم اسلامی مع تصاویر۔

۸ ستمبر

حصہ اول پر ادھم پاشا کی تصویر، مختلف الموضوع شذرات، مغرب اقصیٰ کا خبرنامہ، الہلال کے مقاصد اور سیاسی تعلیم پر ایک خط اور اس کا جواب، مسلم یونیورسٹی کمیٹی کے متعلق مولانا محمد علی کا نامہ گرامی، مولانا کا عرض حال کے زیرعنوان جواب، ناموران غزوہ طرابلس اور کارزار طرابلس مع تصاویر، یوروپین ترکی اور ریاستہائے بلقان کا نقشہ۔

۱۵ ستمبر ابراہیم ثریا بک کی تصویر (صفحہ اول) یونیورسٹی کمیٹی پر مقالہ ، عید الفطر کے زیر عنوان افتتاحیہ "تمدن خطرے میں"، عبدالماجد دریا آبادی کا مقالہ ، مسلم یونیورسٹی کے سلسلے میں مولانا محمد علی ایڈیٹر کامریڈ کا دوسرا خط ، ناموران غزوہ طرابلس ، کارزار طرابلس مع تصاویر۔

۲۲ ستمبر صفحہ اول پر اٹھارہ برس کے عثمانی مجاہد ، احمد حلیمی بک کی تصویر۔ اندر پورے صفحے کے ایڈیشن آرٹ پیپر پر شاہ جارج پنجم کی تصویر۔ لکھنؤ سے ایک گمنام تہدیدی مراسلہ اور اس کا جواب ، کشاف کے قلمی نام سے بہ عنوان مسلم یونیورسٹی علامہ شبلی کی نظم ، ناموران غزوہ طرابلس و کارزار طرابلس مع تصاویر بعض دوسرے مراسلات (ہمارے قومی صلاح کار ، "تمدن خطرے میں" (قسط نمبر ۲)۔

۲۹ ستمبر خان انور پاشا کی تصویر ، شذرات کے ۲ صفحے ، اداریہ بہ عنوان "صبح امید" شئون عثمانیہ ، بیروت میں عون اللہ نام کا جنگی جہاز اٹلی کی گولہ باری کا شکار ہوا تو اس جہاز کے ایک افسر نواد بک نے اپنے اعزا کو جو خط لکھا وہ ناموران غزوہ طرابلس کے تحت ڈیڑھ صفحے میں درج ہے۔ کارزار طرابلس کی تفصیلات۔

۶ اکتوبر صفحہ اول پر منصور پاشا الطرابلسی کی تصویر اور شہدائے ایران کی خونیں تصاویر کا پورا صفحہ اور ان آٹھ مصلوب مجاہدین اسلام کی تصویر جنہیں روسیوں نے سرشام درختوں سے باندھ کر پھانسی دے دی ، اس کے علاوہ ایک شکم چاک مجاہد کی تصویر اور ایک گولی کھا کر دار پر کھنچے ہوئے نوجوان کی تصویر۔ الہلال کی توسیع اشاعت کا آغاز۔ علامہ اقبال نے بھی دس خریدار مہیا کئے۔ شذرات کا صفحہ تذکرہ کے زیر عنوان لکھنؤ سے گمنام مراسلت مسلمانوں کی آئندہ شاہراہ مقصود ، افتتاحیہ ، شئون عثمانیہ ، گمنام شہید ایران ، مراسلات ناموران غزوہ طرابلس مع تصاویر ، تعلیم والحاق کے مسئلہ پر اکبر الہ آبادی کا خط ، الہلال کی دعوت پر صدائے ملت (خطوط) صفحہ آخر پر ماہنامہ البیان کا اعلان۔

۱۳ اکتوبر صفحہ اول پر طرابلس کے پندرہ سالہ شہید علی نظمی آفندی کی تصویر۔ شذرات کے تحت مسلمانوں کا سچا لیڈر کون ہے؟ من انصاری الی اللہ (مقالہ) مسلمانوں کی آئندہ شاہراہ مقصود نمبر ۲ (طویل اداریہ) آزادی رائے ، (سرسید احمد خان) ہندوستان میں پین اسلام ازم (پروفیسر ویمبرے کے خیالات) مذاکرہ علمیہ ، ناموران غزوہ طرابلس ، کارزار طرابلس مع تصاویر ، جنگ ترکی ویورپ ، عثمانی فوج کے جانباز افسروں کی پورے صفحے پر تصویر۔

۲۳ راکتوبر صفحہ اول پر عبدالرحمن بک کی تصویر۔ شذرات (تین صفحے) مسلمانوں کی شاہراہ مقصود۔ (اداریہ) نامورانِ غزوہ طرابلس، شئون عثمانیہ با تصویر، مولانا شبلی کی کشاف کے نام سے "یونیورسٹی اور الحاق" پر فکاہی نظم۔ مولانا آزاد کی علمی مجلس کلکتہ میں تقریر (چھ صفحے) عثمانی طلبہ اور جوش ملت پرستی کے مظاہر (عربی ڈاک) کوائف عالم اسلامی، اشاعت اسلام (علامہ شبلی) دعوت اصلاح مسلمین و اتحاد اسلامی (از مسٹر حسن قدوائی بیرسٹر)

۱۳ رنومبر شذرات کے زیرِ عنوان جنگ کے ماضی و مستقبل پر تین صفحہ کا مقالہ۔ "الجہاد فی الاسلام" کے زیر عنوان اداریہ۔ جنگ پر ایک جرمن جرنیل کے خیالات۔ الاسلام والاصلاح (مقالہ) یونیورسٹی کے زیر عنوان وصافت کی فکاہی نظم۔ صفحہ اول کے علاوہ مجلّے کے اندر فاطمہ بنت عبد اللہ پندرہ سالہ عرب مجاہدہ کی تصویر جو طرابلس کے غازیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہو گئی، علامہ اقبال نے اسی مجاہدہ پر "بانگ درا" میں نظم کہی ہے۔ نامورانِ غزوہ طرابلس اور کارزار طرابلس معہ تصاویر، مولانا کی علمی مجلس میں تقریر کا بقیہ (۲ صفحے) شئون عثمانیہ۔

۲۰ رنومبر اس شمارے کے پہلے صفحے پر کوئی تصویر نہیں۔ قرآن پاک کی آیات درج ہیں۔ شذرات کا مضمون گزشتہ سے پیوستہ ہے، ایک صفحہ میں ان شہداء کی چار تصویریں ہیں جنہیں ایران میں روسیوں نے تختہ دار پر کھینچا۔ اداریہ عید الاضحیٰ پر ہے۔ مقالہ الاسلام والاصلاح کی دوسری قسط ہے۔ صفحے ۲ پر شہر آشوب اسلام یا تعزیت عید کے زیر عنوان ۲۴ اشعار کی ایک نظم، شاعر کا نام درج نہیں تیوروں سے اندازہ ہوتا ہے غالباً علامہ شبلی کی ہے۔ اسی شمارے میں میدانِ جنگ کے پیش آمدہ واقعات کا خلاصہ ہے۔

۲۷ رنومبر شذرات، افکار و حوادث کے کالم کا اضافہ، مقالات میں الاسلام والاصلاح کی تیسری قسط اقرار حقیقت صفحہ اول کی تصویر ایک یونانی جہاز پر ترکوں کا قبضہ، شئون عثمانیہ کے تحت جنگ بلقان پر ایک صفحہ کا مضمون، اس کے علاوہ محاذ جنگ کی بہت سی خبروں کا خلاصہ اور ان کی تصویریں، مسئلہ الحاق پر فکاہات کے زیر عنوان وصافت کی نظم اور مراسلات بسلسلہ اتحاد اسلامی۔

۴ دسمبر صفحہ اول پر ناظم پاشا کی تصویر ہے۔ شذرات اور "افکار و حوادث" کے علاوہ عید الاضحیٰ پر مقالہ نمبر ۳۔ مولانا شبلی کے قلم سے فارسی میں ایک طویل ترکیب بند، شئون عثمانیہ اور بعض جنگی خبروں کی تفصیلات۔ جنگ بلقان اور دول یورپ، یورپین ترکی اور ریاستہائے بلقان (نقشہ)

۱۱ دسمبر صفحہ اوّل پر ناقہ سوار انور پاشا کی تصویر، اندر آرٹ پیپر پر اس تصویر کا پورا صفحہ۔ شذرات (۳ صفحے)

عید الاضحیٰ پر چوتھا مقالہ۔ ایک عربی نظم فکاہات کے زیر عنوان آنریبل سید امیر علی سے وصداقت کا ایک بھرپور نظم میں خطاب ۔ از وصافت ۔ انگلستان اور اسلام مقالہ شئون عثمانیہ ۔ اس کے علاوہ خبروں کے تین صفحے۔

۱۸ دسمبر شذرات میں ملکی سیاست پر لطیف طنز یں ہیں۔ صفحہ اوّل کی تصویر ایک عثمانی مشین گن کی ہے۔ جس نے حملہ آور بلغاریوں کی صفیں اڑا دیں۔ اس کے افسر اعلیٰ محمود حصاری کو تمغہ سلطانی دیا گیا۔ صفحہ ۲ پر ہندوستان کے اس میڈیکل مین کی تصویر ہے جو ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی زیر قیادت بلقان کے مجروحوں کی مرہم پٹی کے لیے ترکی گیا۔ اس وفد کے روح رواں مولانا محمد علی ایڈیٹر کامریڈ تھے۔ مولانا نے تصویر پر لکھا ہے :

" اے وہ لوگو! کہ زخمیوں کے ملک میں جا رہے ہو۔ جب وہاں پہنچ کر زخموں کو دھونا تو ذرا احتیاط کرنا کہ وہ زخم ان زخمیوں کے نہیں بلکہ اسلام کے ہیں" صفحہ ۴ پر شاہ بلغاریہ کی ایک تصویر ہے کہ "صوفیہ" کے شاہی گرجے میں قسیس اعظم کامیابی کی دعا سے رہا ہے۔ صفحہ پانچ پر "الجہاد"، "الجہاد" کے زیر عنوان وہ طویل مقالہ ہے جس کے اقتباسات الہلال کے سیاسی نصب العین کی صراحت میں نقل کیے جا چکے ہیں۔ صفحہ نمبر ۱۳ پر "الہلال کا لب ولہجہ" کے زیر عنوان علامہ شبلی کی کشاف کے ادبی نام سے ایک دلچسپ نظم ہے اس شمارے کے آخر میں یورپین ترکی اور دریاستہائے بلقان کا جغرافیائی نقشہ ہے۔ اس کے علاوہ گورنر یو پی کی تقریر صفحہ ۱۱، ۱۲ پر۔ شئون عثمانیہ اور شمالی ڈاک۔

۲۵ دسمبر صفحہ اول پر ترکی کی بحری و بری فوج کے بلغاری محاذ کو تہس نہس کرنے کی تصویر ہے۔ اور صفحہ نمبر ۴ پر غازی محمود پاشا کی تصویر ہے جو پاؤں میں گولی لگنے سے زخمی ہوئے تھے، دوسری تصویر ان پانچ بلغاری عورتوں کی ہے، جنہوں نے مسلمانوں کے محلے میں آگ لگا کر عیسائی اخباروں سے خراج تحسین حاصل کیا، اداریہ الہلال کی پہلی ششماہی کے اختتام پر ہے۔ مظالم بلغاریہ کی تفصیلات اور دوسری خبریں اجمالاً دی گئی ہیں۔ دعوت الہلال کی نسبت کئی ایک مراسلات درج ہیں۔ فغان مسلم کے نام سے عبدالحکیم سیفت شاہجہان پوری کی ایک نظم ہے اور یہ علامہ شبلی کے بعد پہلے شاعر ہیں جنہیں الہلال میں جگہ دی گئی۔ صفحہ ۱۶ پر نیاز فتحپوری کا الہلال کے طرز بیان کی ستائش میں خط ہے۔ شئون عثمانیہ مراسلات کے صفحات ہیں۔

۱۹۱۳ء

۸ جنوری صفحہ اوّل پر لندن میں صلح کانفرنس کی تصویر ہے یہی تصویر پورے صفحے پر اندر بھی دی

گئی ہے۔ شذرات کے عنوان سے صلح کانفرنس اور جنگ کے بارے میں تبصراتی خبریں ہیں۔ اداریے کا عنوان ہے "فاتحہ جلد جدید"، صفحہ ۸ پر "ناموران غزوہ بلقان" کی روداد کا آغاز ہے۔ صفحہ ۱۰ کا مقالہ "تاریخ کی بازگشت" کے عنوان سے بیسویں صدی کی عیسائی سلطنتوں کے صلیبی معرکوں پر تبصرہ ہے۔ اس کے علاوہ "شئون عثمانیہ" اور بعض دوسری خبریں ہیں۔ مراسلات کا صفحہ اور فکاہات کے زیر عنوان مسلم لیگ پر وصافت کی نظم ہے۔

۱۵ر جنوری صفحہ اوّل پر انور پاشا کی تصویر ہے۔ پہلا مقالہ "الہلال" کے مخصوص خطابیہ انداز میں "یا لیست قومی یعلمون" کے عنوان سے ہے۔ اداریہ فاتحہ جلد جدید (نمبر ۲) ہے، دوسرا مقالہ تاریخ عمران، عربی کا ایک صفحہ ہے۔ "یونیورسٹی ڈیپوٹیشن" کے عنوان سے مولانا شبلی کی کشاف کے ادبی نام سے نظم ہے۔ شئون عثمانیہ اور جنگ بلقان کے حوادث و واقعات کی تفصیلات کے علاوہ بعض دوسرے پیش آمدہ مسائل کی تخیصات ہیں۔

۲۲ر جنوری پہلے صفحہ کی تصویر بلا عبارت ہے۔ انجمن ہلال احمر قسطنطنیہ کا پیغام ہے۔ شذرات ہیں۔ بلقان اور ترکی آویزش کی تفصیلات ہیں، صفحہ ۳ پر جامع مسجد ایڈریانوپل کی تصویر ہے۔ "فاتحہ جلد جدید" کا مسلسل اداریہ ہے۔ مولانا شبلی نعمانی کی تصویر اور سیرت نبوی پر ان کے قلم سے ایک طویل مقالہ ہے۔ "شہر آشوب اسلام" کے عنوان سے نیاز فتحپوری کی دو صفحوں پر طویل نظم ہے۔ شئون عثمانیہ کے تحت "مظالم یونان" کی روداد ہے۔

۲۹ر جنوری صفحہ اوّل پر افواج عثمانیہ کے صدر اعظم و سپہ سالار غازی محمود شوکت پاشا کی تصویر ہے قسطنطنیہ سے "الہلال" کے نام آمدہ تاروں کا ترجمہ ہے۔ محمود شوکت پاشا کا الہلال کے نام جوابی تار ہے۔ حیات بعد الممات (انقلاب عثمانی) کے زیر عنوان ساڑھے چار صفحے کا طویل اداریہ ہے۔ طلعت بیے، ناظم پاشا، کامل پاشا کے علاوہ ناموران غزوہ بلقان کے طویل مضمون میں غازی انور بیے اور مجاہد دستور نیازی بیے کی تصاویر ہیں۔ "ایک پر اسرار جد و جہد" کے زیر عنوان عثمانی انقلاب کی سرگزشت ہے۔ مولانا شبلی کے مقالہ سیرۃ نبوی کی دوسری قسط ہے۔ "شئون عثمانیہ" ہیں۔ حسرت موہانی اور نیاز فتحپوری کا کلام ہے۔ نقاد کے ادبی نام سے مسلم لیگ کے خلاف علامہ شبلی کی فکاہی نظم ہے۔ سر میاں محمد شفیع کو لیگ کا صدر بنانے پر احتجاجی مراسلہ ہے۔

۵ر فروری صفحہ اوّل پر جامع سلیم ایڈریانوپل کے صحن کی تصویر ہے۔ شذرات کے زیر عنوان "کلکتے کا ایک عظیم الشان دن ۲ فروری"۔ دو صفحے کا مضمون ہے۔ دراصل جنگ بلقان سے متعلق ایک

جلسہ عام کی روداد ہے۔"جنگ بعد از صلح" کے عنوان سے ترکی اور بلقان کی آویزش کا تذکرہ ہے۔ اداریے کا عنوان ہے"حدیث الغاشیہ" ایک دوسرا مقالہ ترکی کے اسباب شکست پر اخبار پانیر کے نامہ نگار کی تحریر کا ترجمہ ہے۔ سیّد حسن بلگرامی کی تصویر ہے۔ سیرۃ نبوی پر مولانا شبلی کا تیسرا مقالہ ہے۔ نیاز فتحپوری اور نقاد کی نظمیں ہیں۔ مقالہ بلغاریہ کی تفصیلات اور جنگ بلقان کی داستان ہے۔ شئون عثمانیہ کی روداد ہے۔

۱۲ فروری صفحہ اوّل پر انقلاب عثمانی کے نامور رکن پرنس یوسف عزالدین کی تصویر ہے۔ قسطنطنیہ سے آمدہ تاروں کا ترجمہ ہے۔ جنگ کی روداد ہے۔ احمد حسین خان بی اے کا مجالس میلاد النبوی پر ایک مختصر مضمون ہے۔ مولانا نے جوابا پانچ چھ صفحے لکھے ہیں۔ "نامورانِ غزوہ بلقان" کے زیر عنوان سرگزشت انقلاب ہے۔ شبلی نعمانی کی اسوہ حسنہ پر ایک نظم ہے۔ نقاد نے "نگاہات" کے زیر عنوان قطعات لکھے ہیں۔ علامہ شبلی کا سیرۃ نبوی پر چوتھا مقالہ ہے۔ مراسلات کے زیر عنوان خواجہ کمال الدین کا طویل خط ہے۔ مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے اجلاس لکھنؤ کی چھ صفحوں پر مشتمل روداد ہے۔ جنگی تصویر کا پورا صفحہ ہے۔ جنگ بلقان سے متعلق شذرات کا ڈیڑھ صفحہ ہے اور شئون عثمانیہ۔

۱۹ فروری صفحہ اوّل پر سلانیک کے ایک مرغزار کی تصویر ہے۔ شذرات میں وہی جنگ اور صلح کے معاملات ہیں۔ افکار و حوادث کا نگاہی کالم ہے۔ جس میں سر آغا خان پر ہلکی پھلکی طنز کی گئی ہے ——— اداریے کے تحت کلکتے کے ایک جلسے کی روداد ہے۔ اس جلسے میں سر آغا خان کے خیالات کی تغلیط کی گئی ہے۔ مسٹر مظہر الحق، مولانا آزاد، مولوی اے۔کے فضل حق نے اس جلسے کو خطاب کیا تھا۔ "شئون عثمانیہ" کے تحت کامل پاشا کی قومی مجلس کے اقوال ہیں۔ نگاہات میں کشاف کے دو قطعے ہیں۔ "انگلستان اور اسلام" ضمنی سرخی "صلح اور جنگ" کے زیر عنوان مقالہ ہے۔ "کیا صبح قیامت آگئی ہے" ایک دوسرا مقالہ ہے۔ مراسلات ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی کی ایک طویل نظم ہے "نامورانِ غزوہ بلقان" کا تذکرہ ہے۔ انور پاشا کی تصویر ہے۔

۲۶ فروری صفحہ اوّل پر ایک عثمانی جنگی جہاز کی تصویر ہے۔ اندر مسٹر مظہر الحق بیرسٹر کی تصویر ہے۔ "چندہ ہلال احمر" کے زیر عنوان تین صفحے کا مضمون ہے۔ یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی سے متعلق "حدیث الغاشیہ" ہے۔ نقاد کی مسلم یونیورسٹی کے نصاب تعلیم پر نظم ہے۔ "معجزہ اور خوارق" پر مقالہ ہے جواب شکوہ اقبال کے زیر عنوان ریاست رامپور کے ہوم سیکرٹری کی دو صفحے میں ایک نظم ہے۔ مذاکرہ علمیہ میں ریڈیم کا تذکرہ ہے۔ اس پر الہلال کا طویل نوٹ ہے۔ ایک تصویر چوتھی صدی ہجری کی تحریر کا ایک ٹکڑا ہے شئون عثمانیہ

ہیں۔ ناموران غزوہ بلقان اور مراسلات کا صفحہ ہے۔

۵ / مارچ

صفحہ اول پر ادرنہ کے ایک خیمے کی تصویر ہے جس میں غازی انور بے اپنے ہمرازوں کے ساتھ فروکش ہیں۔ سرورق کے اندر پورے صفحے پر انقلاب عثمانی (۲۳ جنوری ۱۹۱۳ء) کی ایک معرکہ آرا تصویر ہے۔ غازی انور بے باب عالی میں داخل ہو رہے ہیں، ناظم پاشا کا اے ڈی کانگ ان پہ گولی چلاتا ہے لیکن جوابی فائر سے ناظم پاشا گولی کھا کر چت ہو جاتے ہیں۔ خصوصی تاروں کے علاوہ شذرات، افکار و حوادث "حدیث الغاشیہ"، ناموران غزوہ بلقان، مستقبل اور اسلام اور شئون عثمانیہ کے مستقل صفحات ہیں۔ شذرات میں چندہ ہلال احمر اور مجوزہ یونیورسٹی ڈیپوٹیشن کا تذکرہ ہے۔ افکار و حوادث میں ناصح مشفق کے تحت گورنر یوپی اور کاسہ لیسوں سے متعلق مطایبات ہیں۔ نقاد کی ایک اور کثافت کی دو فکاہی نظمیں ہیں۔ اداریہ یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی پر ہے۔

۱۲ / مارچ

صفحہ اول پر نیازی بے کی تصویر ہے۔ شذرات مسلم یونیورسٹی سے مظہر الحق بیرسٹر کے استعفیٰ اور بعض دوسری خبروں پر ہیں۔ اسی شمارے میں مظہر الحق کے استعفیٰ کا خط بھی ہے۔ ایک صفحہ پر باب عالی کے دروازہ پر انقلاب خواہوں کے ہجوم اور انس واعظ کی تصویر ہے جو اندر خانہ انجمن اتحاد و ترقی کا طرفدار تھا۔ یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی پر اداریہ ہے۔ تاریخ تمدن یورپ کا ایک صفحہ مقالہ ہے۔ باقی شئون عثمانیہ کے علاوہ مراسلات اور ناموران بلقان کے صفحات ہیں۔

۱۹ / مارچ

صفحہ اول پر میڈیا جہاز کے کپتان کی تصویر ہے۔ افکار و حوادث کا صفحہ ہے۔ حضرت امام رضا اور مامون الرشید عباسی پر الزام قتل کے عنوان سے اداریہ ہے۔ ایک صفحے پر انقلاب عثمانی کے دوسرے دن انجمن اتحاد و ترقی کی نئی وزارت سے متعلق تصاویر ہیں۔ دوسرے صفحے پر نصرت غیبی کے عنوان سے ترک شہسواروں کی تصویر ہے۔ تیسرے صفحے پر قطب جنوبی کے دریافت کنندگان کی تصویریں ہیں، چوتھا صفحہ بھی انہی کی تصویروں سے پُر ہے۔ یونیورسٹی فاؤنڈیشن پر نقاد کی طویل نظم ہے۔ قطب جنوبی پر مذاکرہ علمیہ کے زیر عنوان کپتان رابرٹ اسکاٹ کے سفر کی تفصیلات ہیں۔ شذرات و افکار و حوادث ہیں۔ مطبوعات اردو پر انتقاد کے زیر عنوان تبصرہ کا آغاز ہے۔ کثافت و نقاد کا مطایباتی کلام ہے۔

۲۶ / مارچ

صفحہ اول پر میڈیا جہاز کی تصویر ہے۔ اندر پورے صفحے میں ڈاکٹر انصاری کی زیر قیادت آل انڈیا میڈیکل مشن کی دو تصویریں ہیں، ایک تصویر ترک نرسوں کے ساتھ ہے، دوسری لیفٹیننٹ کرنل

انور بے کے ساتھ اداریہ "العرب" کے زیر عنوان ہے۔ شذرات ہفتہ جنگ پر ہیں۔ مذاکرہ علمیہ قطب جنوبی پر ہے۔ ایک تصویر بیسویں صدی کے ترقی یافتہ یورپ پر ہے۔ لیگ پر نقادی اور ترکوں پر شقاوت کی نظمیں ہیں، باقی وہی نامواران غزوہ بلقان، شئون عثمانیہ اور جنگ کی تفصیلات ہیں۔

۲ اپریل صفحہ اول پر ادرنہ کے رہنما غازی شکری پاشا کی تصویر ہے۔ گزشتہ شمارے میں شائع شدہ شقاوت کی نظم کے بے معنی ہونے پر اظہار تاسف۔ اس کے علاوہ پچھلے شمارے کے نکات پر اظہار افسوس ہے، شذرات تسخیر ادرنہ پر دو صفحے کے ہیں؛ اداریہ "حدیث الغاشیۃ" "جاء الحق وزھق الباطل" (چار صفحے)، "انگلستان اور اسلام" کے عنوان سے مقالہ (از بینٹ)، "الاخلاق" کے نام سے ڈیڑھ صفحے کا مضمون ہے۔ مذاکرہ علمیہ کا موضوع ہے "الحبات"۔ علامہ شبلی نعمانی کی "خلافت فاروقی کا ایک واقعہ" طویل نظم ہے۔ اکبر الہ آبادی کی ایک غزل ہے۔ وصاف کی حسب معمول لیگ پر طبع آزمائی۔ باقی وہی جنگ و حرب کے احوال ووقائع کی تلخیصات ہیں۔

۹ اپریل صفحہ اول کی تصویر مسجد سلیم ادرنہ کے منبر کی ہے۔ اس کے اندر سلطان سلیم ملک ثانی اور ان کے مقبرہ واقع ادرنہ کی تصویر ہے۔ شذرات کے تحت شاہ یونان یا مجاہد صلیب کا ماتم مقالہ۔ اداریہ سقوط ادرنہ (دو قسطیں طویل مقالہ)، مراسلات میں ایک صفحہ پر خواجہ کمال الدین مقیم لندن کا طویل مراسلہ صدا بصحرا ہے۔ علامہ شبلی کی فارسی و اردو میں دو نظمیں۔ مسئلہ تعطیل جمعہ پر مقالہ ہے۔ الحیات کے موضوع پر مذاکرہ علمیہ اور مبشر حسین قدوائی کے قلم سے ہلال وصلیب پر مضمون۔ بعض دوسرے خطوط۔ پرچہ دو شماروں کا ہے۔

۲۳ اپریل صفحہ اول کی تصویر جامع سلیم ادرنہ کا حوض اور اندر پورے صفحے پر جامع سلیم ایڈریانوپل کی تصویر بر عنوان یورپین ٹرکی کی آخری متاع عزت جو ہم سے چھین لی گئی، مولانا شبلی نعمانی اور الندوہ کے مسئلے پر طویل شذرہ البلاغ کے عنوان سے مقالہ خطاب. من انصاری الی اللہ کی تحریک تاریخ الحرب میں سے ایک صفحہ بہ ضمن مدافعت محصورین تذکرہ ادرنہ، اور مجلس خدام کعبہ کا اعلان و اظہار، از مبشر حسین قدوائی بیرسٹر) انتقاد میں اہی. این بینٹ کی کتاب "طرابلس میں ترکوں کے ساتھ" پر تبصرہ۔ "الاخلاق" محمود احمد عباسی کا مقالہ اور الہلال کی دو صفحے پر تصریحات۔

۳۰ اپریل جنگ کا میدان کارزار۔ علامہ شبلی نعمانی اور مسئلہ الندوہ (طویل مقالہ) اداریہ مدافعت محصورین محاصرہ قرطاجنہ قسط ۲۔ مذاکرہ علمیہ۔ قطب جنوبی ڈاکٹر بی مان اور موجودہ ہندوستان۔ مختلف علمی مراسلات، نیاز فتحپوری اور اکبر الہ آبادی کا کلام۔ مسلمان لیڈروں کی خدمت میں کھلی چٹھی۔ عالم اسلامی

کی خبریں۔

۷ مئی صفحہ اول پر مشہد قرطاجنہ کی تصویر۔ مولانا شبلی نعمانی اور مسئلہ الندوہ۔ جنگ کے احوال پر شذرات: "آہ کاش مجھے وہ صور قیامت ملتا" کا معرکہ آرا مقالہ، اداریہ حول ادرنہ۔ افکار و نتائج گزشتہ شمارے کے مستقل عنوانوں کے باقیات، شئون عثمانیہ، رضا علی وحشت کے علاوہ ایک پر گمنام شاعر کے چار شعر، علمی مراسلات۔ علامہ شبلی پر بے جا الزامات کا رد۔

۱۴ مئی صفحہ اول پر جامع سلانیک کے منبر کی تصویر۔ مولانا شبلی اور الندوہ کی تیسری قسط انصار اللہ کا قرطاس رکنیت۔ اداریہ بعنوان البصائر، شئون عثمانیہ، مراسلات، اختلال دولت عثمانیہ اور مصائب اسلامی، متفرق اخبار و کوائف مع تصاویر۔

۲۱ مئی صفحہ اول پر شکری پاشا کی تصویر، اندر معرکہ ایڈریانوپل کی تصویریں۔ یورپین ترکی کے مہاجروں کی اعانت کا اعلان۔ شذرات، اردو پریس علی گڑھ کی ضمانت، طویل مقالہ بطل ادرنہ شکری پاشا کے حالات، علامہ شبلی کی نظم و غزل، مقالہ بعنوان حیات بعد الموت، مراسلات، انجمن خدام کعبہ، شئون عثمانیہ، دفاع و سقوط ادرنہ کا افسانہ طویل روداد، علمی مراسلات۔

۲۸ مئی صفحہ اول پر قلعہ وحصار حمیدی کی تصویر۔ اندر ادرنہ کے میدان جنگ میں لاشوں کا ڈھیر، پادریوں کی دعا، تصویر، قسطنطنیہ کی گلیوں میں بے خانماں مہاجرین کی اعانت۔ مولانا حسرت موہانی کے جریدہ اردوئے معلیٰ سے ضمانت طلبی پر ڈیڑھ صفحے کا مقالہ۔ جنگ بلقان میں یورپ سے اسلامی حکومت کے خاتمے کا نوحہ۔ جنگ بلقان کے نتائج پر اداریہ (تین صفحے)، کویت، بحرین، مسقط، قطر اور شط العرب سے باب عالی کے اقتدار کا اختتام انگلستان کے اثر و نفوذ کا آغاز اور بغداد و ریلوے کی نظارت میں انگریز افسروں کے داخلے کا المیہ دولت بنو امیہ کے بارے میں الہلال کی نظری روش سے متعلق ایک خط اور جوابی معروضات، علاوہ ازاں حزب اللہ اور خواتین، شئون اسلامیہ، ناموران غزوہ بلقان اور اس سلسلے کے بعض علمی مراسلات۔ اہم مباحث پر خطوط۔

۴ جون صفحہ اول پر شفاخانہ ہلال احمر کی تصویر۔ مسلمانان ہند اور انگریزی حکومت کی حکمت عملی پر اداریہ۔ بنو امیہ اور الہلال پر مقالہ خاص، باقی وہی ناموران غزوہ بلقان اور بے خانماں مہاجرین کا تذکرہ۔ شذرات بعنوان من انصاری الی اللہ، اعانہ مہاجرین عثمانیہ وغیرہ۔ مراسلات کے تحت کیا عرب سے اسلام کی حکومت

ست جائیگی (دو صفحے کا مقالہ)

۱۱ر جون صفحۂ اوّل شائیلاک یہودی اور اس کے مقروض کی تصویر۔ اس سلسلہ میں ایک خاص مقالہ خواجہ غلام الثقلین کے قلم سے مسئلہ سود پر ہے۔ شذرات کے عنوان سے کانپور کی مسجد کے انہدام پر طویل مقالہ ہے۔ اخلاق و آداب میں موروثی اثر مذاکرہ علمیہ کا مقالہ ہے۔ مذہب یا سیاست کے زیر عنوان علامہ شبلی نعمانی کی طویل نظم ہے۔ مراکش کے ایک تاراج شدہ بازار کی تصویر مع مضمون اور حملہ فرانس کی روداد ہے۔ کارزار طرابلس، نتائج جنگ اور دوسرے احوال و وقائع۔

۱۸ر جون شذرات کے تحت تذکار شہداء اسلام اور محمود شوکت پاشا کی شہادت پر قلم کا المیہ اردوئے معلی کے لیے زر اعانہ کی اپیل "مسئلہ سود" (اداریہ)، مذاکرہ علمیہ کے تحت عبدالماجد دریا آبادی کے مشہور مضمون "خط و کرب" کا آغاز "نتائج و عبر" کے تحت ایک تاریخی مقالہ، فلپائن کے مسلمانوں کی شکایت اور مختلف مراسلات۔

۲۵ر جون دوسری ششماہی کا آخری پرچہ۔ اداریہ میں پیش آمدہ حالات پر تبصرہ حزب اللہ کے اغراض و مقاصد کا اعلان "خط و کرب" کی دوسری قسط۔ احزاب اسلام کے زیر عنوان الحدیث فی الاسلام، کارزار طرابلس میدان جنگ کا خبر نامہ۔ مرحوم شوکت پاشا کی مختلف تصاویر اور اہم مراسلات و مکاتیب۔

۲ر جولائی افتتاحیہ عربی میں بعنوان شذرات حزب اللہ کے اغراض و مقاصد کی دوسری قسط۔ احزاب اسلام کے زیر عنوان نظام حکومت اسلامیہ پر قسط اوّل، مقالات کے زیر عنوان مراسلات جنگ، "دعوۃ الی الحق" تین صفحے کا مقالہ، شئون عثمانیہ، وقائع و کوائف۔

۹ر جولائی عثمانی فوج کی حربی تصویریں۔ مولانا آزاد کے سوری جانے کی اطلاع۔ مسجد کانپور کے المیے پر اداریہ۔ مسجد کانپور کے سانحہ پر شذراتی تبصرہ۔ حزب اللہ کے اغراض و مقاصد کی تیسری قسط۔ الہلال کی تیسری ششماہی کا ذکر اور پیش آمدہ واقعات پہ اظہار خیال۔ شئون عثمانیہ، جرائم استبداد، مسلمانان اسلام ناموران غزوہ بلقان نظام حکومت اسلامیہ (۲) مغرب اقصیٰ اور دوسرے مضامین۔

۱۶ر جولائی ڈاکٹر انصاری کی ترکی سے واپسی۔ مولانا محمد علی کے روزنامہ ہمدرد کا خیر مقدم۔ انبیائے کرام کے اسوہ حسنہ کے زیر عنوان اسوہ نوحی (اداریہ)، علم الانسان پر مقالہ۔ مدنیت فرنگ کی داستان استبداد الجزائر سے ایک مظلوم کا خط۔ نظام حکومت اسلامیہ کی تیسری قسط۔ علامہ شبلی کی نظم۔ شئون عثمانیہ، مسئلہ شرقیہ

انگلستان، ترکی اور ہندوستان۔ مراسلہ بسلسلہ خط و کرب یا لذت و الم از عبدالماجد دریابادی، عراق کی تصاویر۔

۲۳ر جولائی صفحۂ اول کی تصویر میں ایک ترک کے سر پہ ایک بلغاری صلیب بنا رہا ہے۔ تیغ ادرنہ پر شذرات کے تحت طویل معلوماتی مقالہ۔ مقالات کے تحت مصر، ایران اور ترکی کی رفتار سیاست وقائع و حقائق کے تحت تفسیری سلسلہ، مذاکرہ علمیہ میں فلسفۂ تشکیک، مراسلات میں حادثۂ مسجد کانپور کی مسئولیت از محمود احمد عباسی۔ آخر میں مہاجرین عثمانیہ کے زر اعانہ کی چھٹی فہرست اور مکاتیب۔

۳۰ر جولائی صفحۂ اول پر پرنس سعید حلیم پاشا کی تصویر۔ شذرات کے تحت دول یورپ کی کارروائی۔ حزب اللہ کے اغراض و مقاصد کی چوتھی قسط۔ فلسفۂ حیات و موت، شئون عثمانیہ ترکوں اور عربوں کی باہمی آویزش۔ برید فرنگ اور مختلف الملعنی احوال و وقائع۔ مراسلات وغیرہ۔

۶ر اگست مشہد اکبر کے زیر عنوان کانپور کی مسجد کا حزنیہ، مغرب اقصیٰ کا خبر نامہ انگریزی فوج کی روداد کہ اس نے احرار مراکش سے طنجہ میں کیا سلوک کیا۔ تذکار نزول قرآن پر طویل اداریہ۔ افسانۂ عجم کے زیر عنوان مظف لم بلقان سے متعلق برطانوی ذہنیت کا عمومی تجزیہ، مصر اور قبرص کے احوال پر مقالہ۔ عزیز لکھنوی کی نظم اور رضا علی وحشت کی غزل، قطع و برید کے مضمون، ضرب و تقسیم کی خبریں، شئون عثمانیہ، مسئلہ شرقیہ بلغاری اور سرحدی فوج کا جامع سلیم ادرنہ میں وحشیانہ داخلہ (تصویر)، مراسلات۔

۲۰ر اگست صفحۂ اول پر ترکی کی مسلمان عورتوں کے ایک علمی اجتماع کی تصویر، قرآنی آیات کے تفسیری مباحث۔ خط و کرب یا لذت و الم پر مولانا عبدالماجد دریا آبادی کا اور اسی موضوع پر بعض دوسرے فضلا کے خطوط۔ مسجد کانپور کے متعلق مراسلات مشہد کانپور، بعض مخصوص علمی مباحث بہ عنوان مذاکرہ علمیہ، شذرات کے تحت یورپ کیوں خاموش ہے۔ کشتِ ساق سے قرآن کا مدعا کیا ہے (اداریہ) میں کون ہوں (مقالہ از عبدالغفار اختر)

۲۷ر اگست مولانا آزاد کی مسوری سے واپسی، مسلم گزٹ لکھنؤ کے مالک سے صفحۂ اول پر استفسار کہ وہ مطلع کریں، انھوں نے سلیم پانی پتی کو ڈپٹی کمشنر لکھنؤ کی ہدایت پر ایڈیٹری سے الگ کیا ہے؟ پورے صفحے پر سازش کنندگان انقلاب عثمانی کی شخصی تصویریں۔ مسجد کانپور کے حادثے پر اداریہ۔ عربی زبان اور علمی اصطلاحات پر سید سلیمان ندوی کا مضمون۔ کئی ایک علمی و سیاسی مراسلات۔ برید فرنگ۔

۳، ۱۰ر ستمبر صفحۂ اول پر شوکت پاشا کے جنازے کی تصویر، مسجد کانپور کے حادثے پر مشہد اکبر خطاب

کے عنوان سے اداریہ۔ شہدائے مسجد کانپور کے سلسلہ میں لکھنؤ کے جلسے کی روداد۔ سرکاری اعضاء کو مولانا ابوالکلام آزاد کا اس قدر خوف تھا کہ انہوں نے صوبائی گورنر سے احکام لے کر جلسے کا انعقاد روک دیا۔ عربی زبان و علمی اصطلاحات (مذاکرہ علمیہ) بعض اہم مسائل کا خلاصہ، خبرنامے، مقالات، شذرات، تاریخ اسلام کا ایک غیر معروف صفحہ۔ حبش میں ایک اسلامی حکومت (اداریہ نمبر ۲)، قرآن کریم اور اصطلاح لفظ کفار، فکاہات کے زیر عنوان ۳ نظمیں۔

۱۷ ستمبر مسجد کانپور کی مجلس دفاع کے عہدے داروں کا اعلان۔ صدر، مولانا آزاد۔ سیکرٹری مولوی اے کے فضل الحق ایم اے ایڈوکیٹ ہائی کورٹ کلکتہ۔ خزانچی، مسٹر اے رسول بیرسٹر۔ افکار و حوادث بہ عنوان ارشاد الملوک بسلسلہ مسجد کانپور۔ شئون داخلہ فتح قسطنطنیہ، ملک حبش کی اسلامی حکومت، اختلال توازن دول، خطوط کرب یالذت والم۔ (از الہلال) افسانہ ماتم، برید فرنگ، فتح قسطنطنیہ (اداریہ) انسانیت کا ماتم (مقالہ) مراسلات۔ بعض دوسرے مختصر مضامین۔

۲۴ ستمبر صفحہ اول پر مسجد مقدس کانپور کی تصویر، پہلا مضمون الہلال پریس سے دو ہزار کی ضمانت طلبی۔ رفتار سیاست۔ حزب اللہ کے اغراض و مقاصد۔ (اداریہ)، پہلی قسط، مسجد کانپور کے حاشیے پر دو تصویریں ان میں ایک تصویر ان گیارہ لڑکوں کی ہے جنہیں عشق مسجد کے جرم میں تیرہ ستمبر کو گرفتار کیا گیا۔ دوسری صفحہ اول کی تصویر ہے۔ احیاء اسلام کے تحت نظام حکومت اسلامیہ کی بحث، ودقائق وحقائق کے تحت قصص القرآن کا آغاز۔ مولانا شبلی کی دو نظمیں۔ خواجہ حسرت موہانی کے قلم سے حزب اللہ پر ایک طویل مراسلہ۔ خطوط و مکاتیب۔

یکم اکتوبر صفحہ اول پر مسجد کانپور کا اندرونی منظر۔ اسی سلسلہ کی تصویروں کے دو صفحے، ایک تصویر مسجد کانپور کے صحن پر خون کے دھبوں کی ہے۔ دوسری مسجد کے سلسلے میں قید ہونے والوں کے اس بارے میں مراسلات و مقالات۔ شذرات کے تحت مسلم گزٹ لکھنؤ کی روداد۔ مسجد کانپور کے سلسلے میں بعض واقعات کی تصدیق و توضیح، الہلال کی ضمانت پر ساڑھے تین صفحے کا اداریہ۔ علامہ شبلی نعمانی کی نظم اور خطوکرب پر دو صفحے کی بحث۔ رفتار سیاست، الہلال پریس کی ضمانت (اداریہ)

۸ اکتوبر صفحہ اول پر بیس بچوں کی تصویر جنہیں مسجد کانپور کے سلسلے میں گرفتار کیا گیا۔ اس کے علاوہ دو صفحوں پر چار تصویریں۔ ایک تصویر مسجد کے محراب کی ہے، جس پر خون کے چھینٹے نظر

آرہے ہیں دوسری منہدم کی ہوئی دیوار کی ہے۔ شذرات میں سرکاری مسلمانوں کی داغدار سیرت کا اجمالی تجزیہ۔ مجلس دفاع مطابع وجرائد کی روداد کے علاوہ افکار وحوادث، مسلم گزٹ لکھنؤ کی داستان اور اسلام میں مساجد کی دینی اہمیت (اداریہ)۔ احرار قوم کے عنوان سے مولانا شبلی نعمانی کی نظم ہے۔ دعوتِ الہلال پر بہت سے مراسلات گزشتہ سلسلہ ہائے مضامین کے باقیات۔

۱۵ اکتوبر گزشتہ مباحث ومسائل کے علاوہ قصص القرآن کی دوسری قسط۔ اداریہ گزشتہ سے پیوستہ۔ مذاکرہ علمیہ کے تحت عربی زبان اور علمی اصطلاحات۔ فتنۂ عمان پر ایک طویل مراسلہ، صفحہ اوّل پر ایک آٹھ سالہ بچی کی تصویر جو مسجد کانپور کے سلسلہ میں زخمی ہوگئی۔ حادثۂ فاجعہ کانپور۔ کلکتہ کے جلسہ منعقدہ ۱۲ اکتوبر کی روداد، علامہ شبلی کی شرائط صلح کے عنوان سے نظم (بسلسلہ مسجد کانپور)

۲۲ اکتوبر حادثہ فاجعہ کانپور کے سلسلے میں پورے صفحے پر ڈیفنس کونسل کی تصویر۔ شذرات کے زیرِ عنوان مسجد کانپور کے سلسلے میں بعنوان گم شدہ امن کی واپسی دو صفحے کا مضمون۔ ۲ جولائی سے ۴ اکتوبر تک کی سرگزشت۔ لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند کے اعلان کا خیر مقدم۔ اس کے علاوہ اخبار سیاست، افکار وحوادث آئرلینڈ میں ہوم رول۔ مساجد کی حیثیت دینی، شئونِ عثمانیہ عالم اسلامی، برید فرنگ فن مکالمت، عبدالماجد دریا آبادی کا بسلسلہ خط وکتابت خط اور الہلال کا جواب۔

۲۹ اکتوبر پورے صفحے پر لارڈ ہارڈنگ کی تصویر۔ مسجد کانپور کے سلسلے میں ۱۹ اکتوبر کے جلسے کی روداد۔ مولانا آزاد کی تقریر کے دو صفحے، شذرات کے تحت گم شدہ امن کی واپسی بسلسلہ مسجد کانپور رفتار سیاست اور افکار وحوادث وغیرہ کے مستقل عنوان، اسلام میں مساجد کی حیثیت (اداریہ) آئرلینڈ ہوم رول کی دوسری قسط۔ فن مکالمت کے مضمون کا دوسرا حصہ۔ نظام دکن کی طرف سے علامہ شبلی نعمانی کے ماہانہ وظیفے میں دوسو روپے کا اضافہ۔ مجلس دفاع مطابع وجرائد سے متعلق بشیر قدوائی بیرسٹر کا مراسلہ۔ شبلی نعمانی اور نظم نصیر آبادی کی نظمیں۔ الہلال اور پریس ایکٹ سے متعلق خطوط۔

۵ نومبر صفحہ اول پر مجلس دفاع ملی قسطنطنیہ کے اجلاس کی تصویر۔ شروع میں مسجد کانپور سے متعلق ۱۹ اکتوبر کے جلسے کی روداد کا دوسرا حصہ۔ سید سلیمان ندوی کی تقریر۔ ان کے علاوہ بعض دوسرے اصحاب کی تقریریں۔ علامہ شبلی نعمانی، نیاز فتحپوری اور وصاف کی نظمیں، افکار وحوادث، گزشتہ سے پیوستہ مضامین واداریہ برید فرنگ، مسئلہ عمان، مسجد کانپور کی مصالحت کے خطوط، مطبوعات جدیدہ پر تبصرہ، حکومت بلغاریہ اور دولت

عثمانیہ میں مشروط صلح۔

۱۲ر نومبر یوم الحج اور حزب اللہ کے عنوان سے ایک طویل مقالہ، منیٰ کی تصویر کے نیچے معرکہ آرا طویل تحریری خطبہ، سیرتِ نبویؐ پہ ایک نہایت مفید مقالہ، قتلِ نفس سے متعلق قرآن پاک کے احکام، داخلی امور اور خارجی واقعات کی تلخیصات، صفحہ اول پر سلطان تیمور والیٔ عمان کی تصویر، مسجد کانپور کے بارے میں نقد و نظر پر مشتمل بعض خطوط، افکار و حوادث، شئون عثمانیہ، برید فرنگ، مختلف تصاویر۔

۲۶ر نومبر جنوبی افریقہ پر معلوماتی مقالہ اور اداریہ۔ تاریخ اسلام اور بحریات، "جبل اسود بعد از جنگ"، جنگ بلقان کی سبک انجامی، ترکی اور انگلستان، شیعوں اور سنیوں میں اتفاق کی ضرورت کے زیر عنوان مقالات، برید فرنگ، شئون عثمانیہ۔

۳ر دسمبر الہلال کی لوح کے نیچے گاندھی جی کی تصویر۔ سرخی ہے "رئیس الاحرار مسٹر گاندھی جو جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے حقوق کی ۲۰ برس سے قیادت کر رہے ہیں"۔ پورے صفحے میں جنوبی افریقہ کا خبر نامہ۔ گاندھی جی اس تصویر میں انگریزی لباس پہنے ہوئے ہیں۔ شذرات کے تحت بعنوان صدا بصحرا الہلال کی طباعت پر اظہارِ خیال۔ ایک دوسرا مضمون فتنۂ اجودھیا کے عنوان سے اجودھیائی مسلمانوں کی اس روش پر اظہارِ تعجب کہ انہوں نے اس غصے میں آکر نماز چھوڑ دی کہ الہلال نے قربانی کی نسبت لکھ دیا تھا کہ ائمہ اسلام کے نزدیک قربانی سنت ہے۔ یہ مضمون غایت درجہ دلچسپ ہے۔ ایک دوسری تصویر رابندر ناتھ ٹیگور کے عالم شباب کی ہے اس زمانے میں انھیں ایک لاکھ بیس ہزار کا نوبل پرائز دیا گیا تھا۔ حزب اللہ پر چھ صفحے کی آخری قسط ہے اس کے علاوہ باقی مضامین مسلسل مندرجات کی اقساط ہیں۔

۱۰ر دسمبر ابتدا جنوبی افریقہ کے احوال و کوائف کا صفحہ، عشرہ محرم الحرام پر طویل مقالہ۔ انڈین نیشنل کانگرس کراچی کے اجلاس پر اثباتی تبصرہ۔ محمڈن ایجوکیشنل کانگرس آگرہ کے اجلاس پر اثباتی تبصرہ۔ محمڈن ایجوکیشنل کانگرس علی گڑھ کے خبر نامے کا جائزہ۔ مسلم لیگ کے زیر عنوان ایک صفحے کا مضمون، آخری فقرہ ہے "کب تک بدبخت مسلمانوں کا پالیٹکس سر آغا خان یا سید امیر علی کے بت کدے کا نام ہوگا"۔ مسئلہ شرقیہ، شئون عثمانیہ اور برید فرنگ کے علاوہ خلق عظیم کے عنوان سے مولانا شبلی کی نظم ہے۔ تنازع البقا پر ایک پرمغز مقالہ۔ مذاکرہ علمیہ کے تحت مذہب نشو و ارتقا کا ایک ذریعہ چھ صفحات کا مضمون؛

۱۷ دسمبر | پہلا مضمون جنوبی افریقہ پر۔ آخری ہفتہ کے عنوان سے شذرات کے تحت روداد الہلال بعض دوسرے وقتی مسائل پر قلم کی نوک جھونک۔ اداریہ کے تحت یونان اور ترکی کے صلح نامے کا متن اور اس پر تبصرہ۔ مذاکرات علمیہ میں مذہب نشو و ارتقا پر ڈاکٹر رسل ویلیس کے مضمون کا ترجمہ (قسط دوم) ایک صفحہ اصطلاحات علمیہ کا۔ آخر میں البصائر کے تحت ادارہ سیرت نبوی پر حکیم غلام غوث سکنہ بہاولپور کا مضمون۔ علمی اصطلاحات آئرلینڈ ہوم رُول بل۔

البلاغ

۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء تا ۳۱ مارچ ۱۹۱۶ء

۱۲ نومبر | صفحہ اوّل پر ترجمان القرآن یعنی قرآن پاک کے ترجمے کا اعلان۔ "نواد ا تلخ ترمی زن" کے زیر عنوان علامہ اقبال کی نظم۔ مہینے میں دو بار اشاعت کا اعلان ضخامت دوگنی، قیمت آٹھ آنے۔ افتتاحیہ تمام تر عربی میں پانچ صفحے۔ حضرت ابراہیم کے اسوہ حسنہ پر چھ صفحے کا مقالہ بصائر و حکم کے تحت جنگ کا اثر اخلاق پر، مقالات کے زیر عنوان جنگ کا اثر فن روایت پر (چار صفحے) مذاکرۃ علمیہ، نیند کی حقیقت پر، آثار عتیقہ (بیجاپور کی اسلامی عمارات، اور دار الارشاد کے علاوہ البیان فی مقاصد القرآن کی اشاعت کا اعلان۔

۲۶ نومبر | مالی مشکلات کا تذکرہ فاتحہ البلاغ عربی کا دوسرا افتتاحیہ (چھ صفحے) شہادت حسین علیہ السلام پر مولانا کی تقریر، حادثہ محزنہ کربلا امن و اسلام اور فلسفۂ احتساب (بسلسلہ تفسیر) کے علاوہ مولانا حسرت موہانی کی غزل سے

سب ہو گئے چپ بس ایک حسرت
گویا ہیں ابو الکلام آزادؔ

تاریخ امت مسلمہ (تذکرہ طوفان نوح) آثار عتیقہ بیجاپور، غزوات اسلامیہ اور تجارت۔ بصائر و حکم کے تحت جنگ کا اثر اخلاق پر (دوسری قسط)

۱۰ دسمبر | عہد التوار انتظار کے تحت سرگزشت الہلال احرار اسلام کے تحت تفسیر سورہ فاتحہ کا صفحہ بصائر و حکم

کے تحت "جنگ اور صلح" تاریخ امت مسلمہ (تیسری قسط) اسیرانِ جنگ (مقالہ)۔

۱۷ر دسمبر	عہد التوا و انتظار کی دوسری قسط۔ اسیرانِ جنگ کی دوسری قسط۔ مولانا شبلی کی حیات علمی و ادبی پر ایک سرسری نظر۔ مولانا کی ایک تقریر فلسفہ اجتماع اور جنگ۔ تاریخ امت مسلمہ (چوتھی قسط) الحریت

فی الاسلام۔ تاریخ معتزلہ کا ایک صفحہ، فلسفہ اجتماع اور جنگ (خط اوّل)، مراسلات۔

۴ر جنوری	البلاغ کے باقاعدہ ہفتہ وار شائع ہونے کا اعلان۔ ولادت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ماہ ربیع الاوّل۔ الدین والسیاستہ (مقالہ) جنگ اور مطالعہ علم النفس۔ (البصائر و حکم) اسوۂ محمدی۔

حکومت شوریٰ اور اسلام۔ تاریخ معتزلہ کا ایک ورق، آل انڈیا محمڈن کانفرنس۔ مولانا کا صاحبزادہ آفتاب احمد کے نام خط اور اس کا جواب۔ الحرب فی الاسلام۔

۲۸ر جنوری ۴ر فروری	دعوۃ الی القرآن۔ مسلم لیگ پر دو صفحے کا اداریہ۔ مامون الرشید کے دربار میں مسئلہ خلق قرآن۔ عہد سلف کی دعوۃ الی الحق کا نظارہ۔ تربیت عسکریہ اور

قرآن حکیم۔ الحرب فی الاسلام۔ تربیت یافتگان عہد نبوت کا اسوہ حسنہ۔

۱۱ر فروری	اسلام اور سوشلزم۔ سید سلیمان ندوی کا طویل مقالہ (دعوۃ الی القرآن) مسئلہ خلق قرآن سے متعلق راست بازنہ بانوں کی روداد۔ احتساب اور اسلام۔ اسلام اور تربیت عسکری۔

باب التفسیر، بریدِ فرنگ۔

۱۸ر فروری	افکار و حوادث، مجوزہ شیعہ کالج کے پس منظر سے اختلاف، علم الانسان (مذاکرہ علمیہ) بریدِ فرنگ مسئلہ خلق قرآن کی تیسری قسط۔ باب تفسیر اصلاح معاشرت اور اسلام (از سید سلیمان ندویؒ)

افکار و حوادث۔

۲۵ر فروری	مجوزہ شیعہ کالج۔ اختلاف اور وجوہ اختلاف (چار صفحوں کا مضمون) شئون اسلامیہ کے تحت عراق اور بیلاسے عراق۔ تفسیر سورہ والتین، باب تفسیر سلیمان فارسی کا اسوہ حسنہ

(از عبدالسلام ندوی) مطبوعات جدیدہ۔

۱۰ر مارچ	مجوزہ شیعہ کالج سے متعلق آخری قسط۔ افسانہ ہجر و وصال، باب التفسیر (الحق والباطل) مذاکرہ علمیہ اختلاف صور الوجع۔ خواطر فی الاسلام۔ شئون اسلامیہ۔ جامع ازہر (از سید سلیمان ندوی)

گزشتہ سے پیوستہ مضامین۔

۱۷۔۲۴ مارچ	گورنمنٹ بنگال کے حکم جلاوطنی پر اظہار خیال، افکار و حوادث، مذاکرہ علمیہ، مدارس اسلامیہ، افسانۂ ذلت یا مسلم یونیورسٹی، مرزا غالب کا غیر مطبوعہ قصیدہ، نذرِ تہنیت والی رام پور،

باب التفسیر گزشتہ سے پیوستہ مضامین (البلاغ کے تمام شماروں کے صفحہ اوّل پر ترجمان القرآن کا اشتہار بہ التزام چھپتا رہا)

الہلال سنہ ۱۹۱۴ء

۷، ۱۴ جنوری	صفحہ اوّل پر بیگم صاحبہ بھوپال کی تصویر، چوتھی ششماہی کا عربی اردو افتتاحیہ۔ آگرہ کی مغلیہ عمارتیں (تصاویر)، بیگم بھوپال پر مقالہ، افکار و حوادث، غرائب الافلاک

(مذاکرہ علمیہ) اتحاد شیعہ و اہل سنّت (از پروفیسر فدا حسین علی گڑھ) مراسلات (انگلستان میں تبلیغ اسلام اور مکتوب آستانہ علیہ) بستر مرگ پر ایک نظر الوداعی۔ برید فرنگ۔ سر ابراہیم رحمت اللہ کا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں صدارتی خطبہ۔

۲۱ جنوری	صفحہ اوّل پر شاہجہان کی تصویر، آثار ہند کے زیر عنوان صفحہ اوّل کی تصویر کے علاوہ ملکہ ممتاز محل اور تاج محل کی تصویر۔ جنوبی افریقہ کے احوال۔ زمیندار کی ضبطی ضمانت

پر تین صفحے کا اداریہ اور اس کی خدمات کا اعتراف، شمارۂ اول کے اداریہ کی دوسری قسط، ندوۃ العلما (قسط اوّل)، سقط کے حالات۔ تندرستی۔ شئون عثمانیہ۔ برید فرنگ۔ سر ابراہیم رحمت اللہ کی مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں صدارتی تقریر کا دوسرا حصہ۔

۲۸ جنوری	جنوبی افریقہ کے احوال و کوائف، حادثہ زمیندار پریس لاہور (۳ صفحے) ندوۃ العلماء (قسط نمبر ۲) سقط (قسط نمبر ۲) مراسلات، افتراحیات عثمانیہ۔ جزائر فلپائن (مقالہ)

شیخ الاسلام فلپائن کی تصویر۔ مذاکرۂ علمیہ (آثار عرب) برید فرنگ مراسلات۔ سید جمال الدین افغانی اور حضرت مفتی محمد عبدہٗ کی تصاویر۔

۴ فروری	صفحہ اوّل پر سر ابراہیم رحمت اللہ کی تصویر۔ تذکرہ اسلامی خبروں کا خلاصہ۔ افکار و حوادث دعوت الی الحق و داعی الی الحق (اداریہ) ندوۃ العلماء (قسط نمبر ۳) ۱۹۱۵ء کی موتمر اسلام۔

شئون عثمانیہ۔ مذاکرۂ علمیہ (آثار عرب) آثار عتیقہ۔ (بابل سے متعلق مقالہ مع تصاویر) ابراہیم رحمت اللہ

کی صدارتی تقریر (تیسری قسط)

۱۱ر فروری اہم عالمی خبروں کا خلاصہ۔ زمیندار پریس کی ضبطی پر برطانوی پارلیمنٹ کے بعض ارکان کی ہمدردی، مولانا ظفر علی خاں لندن میں۔ ۱۹۱۴ء کی موتمر امن، ندوۃ العلما (قسط ۴)، علوم القرآن (از سید سلیمان ندوی)، مذاکرات علمیہ (آثار عرب)، ارض مقدس۔ اتحاد شیعہ وسنی۔ معارف ترانیہ شئون عثمانیہ جرمنی جنگی شپ۔ کارزار طرابلس مع تصاویر (ختم جنگ کے اسباب)، اخوان الصفا (دار المصنفین کی اسکیم کے متعلق مولانا شبلی کے خیالات)، عالمی خبروں کا ان سبوع کے زیر عنوان خلاصہ۔

۱۸ر فروری افکار و حوادث (زمیندار کے پریس کی ضبطی پر)، مذاکراۃ علمیہ (آثار عرب) کارزار طرابلس (ختم جنگ کے اسباب)، آثار عتیقہ (جزیرہ کریٹ)، شئون عثمانیہ۔ صفحہ اوّل پر شریف مکہ کی تصویر۔ علوم القرآن، برید فرنگ۔ بلاد عثمانیہ کی زرخیزی۔ مراسلات۔

۲۵ر فروری عالمی خبروں کا خلاصہ۔ شذرات۔ مذاکراۃ علمیہ (قطب جنوبی کی ایک مہم)، علوم القرآن۔ کارزار طرابلس۔ عالم اسلامی بسلسلہ سیاست روس۔ شئون عثمانیہ۔ جزائر ایجین۔ آثار عتیقہ تذکرہ وتصاویر (بابل)، مراسلات، برید فرنگ (البانیہ کا دار السلطنت کہاں ہوگا)

۴، ۱۱ر مارچ ندوہ کے طلبہ کی اسٹرائک، مسجد (شکر پور کلکتہ) کا حادثہ، ندوۃ العلماء (قسط نمبر ۵)، شہیدا (ایک بنگالی لڑکی جان پر رہو گئی) آثار عتیقہ (بعلبک)، مذاکراۃ علمیہ، ایام کی حقیقت عالم اسلامی حقیقۃ الصلوٰۃ، ناموران غزوہ بلقان۔ شیخ سنوسی کے قلعہ کی تصویر۔ فلپائن کے شیخ الاسلام کا مراسلہ۔

۱۸ر مارچ ندوہ کے طلبہ کی اسٹرائک۔ (ایک دینی تحریک کی انتہائی تخریب)، مسئلہ قیام الہلال (اداریہ) ندوۃ العلما (قسط ۶)، حقیقۃ الصلوٰۃ۔ آثار عتیقہ گزشتہ سے پیوستہ، عالم اسلامی، مراسلات مکتوب لندن۔

۲۵ر مارچ کلکتے کی ایک مسجد کی تصویر اور اس پر ایک نوٹ کہ اس مسجد کو دیگر مساجد و مقابر کے ساتھ پورٹ کمشنر کلکتہ نے خرید لیا اور خطرہ میں ہے۔ دار العلوم ندوہ کی اسٹرائک کا مسئلہ۔ قیام الہلال کا آخری فیصلہ (دو ہزار خریداروں کے حصول کی خواہش)، ندوۃ العلماء (قسط نمبر ۷) حقیقۃ الصلوٰۃ۔ کارزار طرابلس شئون عثمانیہ مراسلات مذاکرہ علمیہ، ندوۃ العلماء کے متعلق خطوط (تین صفحے) گزشتہ سے پیوستہ مضامین۔ تبصرہ کتب۔

یکم اپریل دہلی ڈیپوٹیشن (مقالہ) لشکرپور کی مسجد کا مسئلہ۔ ندوۃ العلماء شئون عثمانیہ۔ کارزار طرابلس، شیخ سنوسی وطریقہ سنوسیہ۔ ہوائی جنگ۔ آثار عتیقہ (مصر) مراسلات۔

۸؍اپریل چین کے دار الحکومت پکین میں مکتب رشیدیہ کی تاسیس وتصویر۔ مسئلہ بقا واصلاح ندوہ، نظامت ندوۃ العلماء۔ مذاکرۂ علمیہ (ابتدائی تعلیم) الشرق اقصیٰ اور دعوت اسلام شیخ سنوسی اور طریقہ سنوسیہ (شمالی افریقہ کا سرمخفی) الشرق اقصیٰ ودعوت اسلام۔ مراسلات۔

۱۵؍اپریل ندوۃ العلماء کے متعلق۔ ۱؍مئی کے اجلاس دہلی کا اعلان نصف پرچہ میں ندوہ کے متعلق مختلف مضامین۔ نفس انسانی کا ناقابل بیان عمق حریت اور حیات اسلامی قرآن حکیم کی تصریحات۔ شیخ سنوسی اور طریقہ سنوسیہ۔ ہوائی جنگ تصویری مقابلہ۔

۲۹؍اپریل ندوہ سے متعلق ابتدائی چار صفحے۔ اس عنوان سے مختلف مضمون۔ عالم اسلامی کے تحت آثار قرنیہ (باتصویر مقالہ)۔ باقی وہی گزشتہ سے پیوستہ مضامین۔ ابتدائی تعلیم سے متعلق مقالہ۔ مولانا حسرت موہانی کا ندوہ سے متعلق خط۔ علمی خبریں۔ مراسلات۔

۶؍مئی ندوہ کی بقا، واصلاح۔ بعض احادیث کی صحت وعدم صحت کے متعلق (اداریہ) یورپ اور قدیم تصاویر۔ شیخ سنوسی اور طریقہ سنوسیہ۔ کارزار طرابلس۔ مسئلہ قیام الہلال۔ مذاکرۂ علمیہ۔ آثار قرنیہ الحریت فی الاسلام۔

۱۳، ۲۰؍مئی مسئلہ قیام الہلال، روزنامہ ہمدرد کا ٹائپ سے لیتھو کی چھپائی کو منتقل ہونا۔ اس پر تبصرہ مکتوب لندن۔ مسئلہ مساجد وقبور لشکرپور۔ واقعہ ابلاء۔ انکار حدیث ومصلحین متفرقین مکتوب آستانہ عالیہ الحریت فی الاسلام۔ مسئلہ اصلاح وبقا ندوہ۔ ۱؍مئی کے جلسے کی روداد طرابلس و بلقان کے بعد مسئلہ شام آثار عتیقہ (مصر) فلسطین وعراق کے احوال۔ مسئلہ قیام الہلال علمی مراسلات۔ مختلف کوائف ووقائع۔

۲۷؍مئی مسئلہ قیام الہلال۔ اسد پاشا کی البانیہ میں گرفتاری اور جلاوطنی البانیہ میں مسلمانوں پر مظالم۔ مسئلہ مساجد وقبور لشکرپور معہ تصاویر۔ مذاکرہ علمیہ حدیث، تفسیر اور سیرت کی ایک مشترک بحث مسئلہ بقا واصلاح ندوہ تاریخ الکیمیا۔ برید فرنگ۔ السٹر کا معرکہ۔

۳؍جون مسلمانان ہند اور دولت عثمانیہ کی جنگی اعانت کے زیر عنوان "ہند دیپڑیٹ" کے جواب میں

اداریہ۔ مسئلہ مساجد وقبور لشکر پور، حدیث، تفسیر اور سیرت گزشتہ سے پیوستہ۔ فلسفہ اسبادیات کا ایک سرسری مطالعہ، ترکی اور تعلیم وحدیث نسواں، ایک ایڈیٹر اور وزیر فرانس کی نزاع روزنامہ فگارو پیرس کے ایڈیٹر کو فرانس کے وزیر مال کی بیوی نے اس کے دفتر میں جاکر ریوالور سے ہلاک کردیا تھا، برید فرنگ کے تحت اس سانحے کی با تصویر روداد۔ علمی خبریں۔

۱۰ ارجون الاسبوع کے عنوان سے عالمی خبروں کی تلخیصات۔ لشکر پور کی مساجد ومقابر کے سلسلے میں ٹاؤن ہال کا مجوزہ جلسہ۔ ایک یوروپین لیڈی اور جنوبی عرب کی سیاست، مذاکرۂ علمیہ۔ دنامہ بر کبوتر، شئون عثمانیہ۔ مسقط، عمان۔ یمن۔ حضرموت کے احوال وکوائف۔ عالم اسلامی، غربی ہند میں عربوں کا ابتدائی ورود۔ مکتوب لندن۔ مراسلات۔ علمی خبریں۔

۱۷ ارجون الاسبوع کے تحت مسئلہ اصلاح وبقا ندوہ اور زمیندار کی لاہور چیف کورٹ میں اپیل، ادبیات کے زیر عنوان مرزا غالب سے متعلق بعض نئی معلومات اور ایک غیر مطبوعہ قصیدہ (۵ صفحے) گزشتہ سے پیوستہ مضامین۔ دولت علیہ اور یونان۔ عیسائی مذہب (تصویری مقالہ) شئون عثمانیہ، برید فرنگ، علمی خبریں۔

۲۴ ارجون مسٹر تلک کی ۱۷ ارجون کو رہائی۔ خاتمہ جلد چہارم کے زیر عنوان طویل اداریہ۔ باب التفسیر کے تحت اختلاف الوان کا موضوع۔ رباعیات عمر خیام کے ایک امریکن ایڈیشن پر پونے تین صفحے کا تبصرہ (باتصویر)، مولانا شبلی کی عدل جہانگیری کے عنوان سے نظم۔ شئون عثمانیہ۔ برید فرنگ۔ امی کا جلسہ دہلی (از حکیم اجمل خان)

یکم جولائی صفحۂ اول پہ عمر خیام کی تصویر۔ اندر پرنس سعید حلیم شاہ صدر اعظم دولت عثمانیہ کی تصویر، پانچویں سہ ماہی کا عربی میں اداریہ، مرزا غالب کی تب غیر مطبوعہ غزل ع

ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں

نیاز فتح پوری کی نظم التجائے پروانہ "ان الحکم الا للّٰہ خط اول" زمیندار کی ضمانت اور ضبطی پہ چیف کورٹ لاہور کی نامنظوری۔ اختلاف الوان (تفسیر) علم نباتات اور حیوانات۔ رباعیات عمر خیام کے امریکن ایڈیشن پہ تبصرہ۔ کنیڈا میں ہندوستانیوں کی حالت زار۔ (باتصویر)، امی کا جلسہ دہلی بابت ندوہ (از حکیم اجمل خان)

۸ جولائی | کراچی میں عظیم نامی فلم پر مسلمانوں کا اضطراب، بابو گنگا پرشاد ایڈیٹر ہندوستان کی رحلت۔ اعلان جماعت حزب اللہ، الہلال کی پانچویں ششماہی (اداریہ)، الفاظ القرآن (سید سلیمان ندوی) عالم نباتات وحیوانات، برید فرنگ (انگلستان کے حقوق طلبوں کی داستان) "اسوۂ حسنہ" پورے صفحے کی نظم (شاعر کا نام درج نہیں)، ہوائی ریل۔ مراسلات۔

۱۵ جولائی | الاسبوع (مختلف خبریں)، مسئلہ قیام الہلال، پہلی منزل (سواد و صفحے) مشہد اکبر (مسجد کانپور کی تعمیر جدید) اولیاء اللہ واولیاء الشیطان (اداریہ)، تفسیر قرآن کا ایک باب، آئرلینڈ کا بحری حادثہ۔ ریڈیم اور اس کے اثرات۔ خطرناک مکھی۔ (حیوانات)، جدہ میں کھارے پانی کو میٹھا بنانے کا کارخانہ۔ باب التفسیر۔

۲۲ جولائی | لیڈی ہارڈنگ کا انتقال۔ مسئلہ قیام الہلال، مسئلہ اصلاح و بقاء ندوہ مسئلہ مسجد کانپور۔ اولیاء اللہ واولیاء الشیطان۔ مدارس اسلامیہ، مطالعہ قرآن کا ایک لمحہ فکریہ، مکتوب آستانہ عالیہ، پروفیسر بوس اور علماء انگلستان کی قدردانی، مرزا غالب مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام ع

فقیر غالب مسکین کا ہے کہن تکیہ

آئرلینڈ کا راہنما اسٹوارٹ پارنل عشق و محبت کی زندگی میں، آثار عتیقہ۔ دولت عثمانیہ کا مستقبل۔

۲۹ جولائی | تصویر شہداء کے اور ان کی یادگار (تصویر)، مسئلہ مسجد کانپور، مدارس اسلامیہ (ندوہ)، رمضان المبارک پر تین صفحے کا مقالہ۔ بخارا میں دعوت اصلاح کا آغاز، حزب اللہ (مقالہ)، اکتشافات واختراع وائرلیس ٹائپ رائٹر، کہربا اور خزائن الارض، خوردبینی دوربین) روح اور اس کا مسکن۔ احتساب اور اسلام حوادث وسوانح۔ الاحتساب فی الاسلام۔ (عبدالسلام ندوی) وقائع وکوائف۔

۵ اگست | جنگ چھڑنے کا جائزہ، تذکار نزول قرآن۔ احتساب اور اسلام (دوسری قسط)، روح نباتات اور احساس مسئلہ البانیہ (مع تصاویر)، قطب جنوبی کی مہم (مع تصاویر)، ندوہ کا جدید دستور العمل الاحتساب فی الاسلام (قسط ۲) گزشتہ سے پیوستہ مضامین۔

۱۲ اگست | جنگ کے پیش نظر الہلال کے روزانہ ضمیمہ کی اشاعت۔ ہفتہ جنگ (دو صفحے)، ماہ مقدس۔ لیلۃ القدر، باب التفسیر بصائر وحکم۔ گزشتہ سے پیوستہ مضامین۔

۱۹ - ۲۶ اگست | جنگ پر الطاقۃ الکبریٰ کے تحت اداریہ۔ تربیت اطفال۔ یورپ کی تاریخ حرب

پر ایک نظر۔ روح اور اُس کا مسکن (مذاکرہ علمیہ) جرمنی کے بحری قوی کا ایک منظرِ عمومی (با تصویر) شریک جنگ ممالک کے سربراہوں کی تصاویر۔ انگلستان کے قوی بحریہ۔ گزشتہ سے پیوستہ مضامین۔

۲ر ستمبر جرمنی کے ہاتھوں سقوط بلجیم (تفصیلات)، معاصرہ پیرس کے قریبی آثار۔ الحرب فی الاسلام (اداریہ)، بحر شمالی برطانیہ، جرمنی، فرانس، دولت عثمانیہ، امریکہ، جاپان، اٹلی، آسٹریا کے جنگی جہازوں کا جائزہ اور موازنہ۔ موجودہ فن صحافت (نامہ نگاروں) جنگ کی مسابقت، شراب کا اثر حیوانات پر۔ جرجی زیدان (ایڈیٹر الہلال مصر) کی رحلت، رزمِ جنگ۔ یورپ مع تصاویر۔

۹ر ستمبر صفحہ اول پر محاذِ جنگ کا نقشہ، (ار سبوع کے تحت) جنگی خبریں (اختصار) پورا شمارہ جنگ کے وقائع، احوال اور تصاویر پر مشتمل ہے۔

۱۶ر ستمبر لارڈ ریڈنگ کی تصویر صفحہ اوّل، ہفتہ جنگ کی حتر ورنی تلخیصات مع تصاویر، اداریہ (غزوات اسلامیہ اور اس کی یادگاریں)، جنگ کے موضوع و مضمون پر مقالات۔

۲۳ر ستمبر نغمہ حسن و طبل جنگ کی رومانی تصویر پورا صفحہ اور مقالہ۔ ہفتہ جنگ، افکار و حوادث غزوات اسلامیہ۔ صلیب احمر میدانِ جنگ کے شفاخانے۔ انسان کی جنگ اور کتوں کی عجیب و غریب خدمات۔ جنگ سے متعلق تفصیلات و تلخیصات۔ شہنشاہ آسٹریا کے حالات (آغاز جنگ کا شعلہ اوّل)

۳۰ر ستمبر شخصیات جنگ کی تصاویر (دو صفحے)، جنگی جہازوں کی تصاویر (دو صفحے)، ہفتہ جنگ۔ افکار و حوادث۔ جنگ کی خبریں۔ ہندوستان میں پہلے بحری حملے کا اقدام۔ فلسفہ الحرب (یورپ کا نیا نقشہ جو تیار ہو رہا ہے (مقالہ)، بریدِ فرنگ۔ مراسلات، مذاکرات

۷ر اکتوبر جرمنی توپ خانہ میدانِ جنگ میں۔ جرمنی اور برطانیہ کے عسکری سواروں کا تصادم۔ پابندی عہد اور قرآن حکیم (اداریہ)، الحرب (مقالہ)، جنگ کی بعض اہم تصویریں (چار صفحے)، ہفتہ جنگ (۵ صفحے)، رائٹر (خبر رساں ایجنسی کی تاریخ تاسیس و اشاعت) جنگ کی مزید تصویریں (چار صفحے) بحری سرنگیں اور دوسرے جنگی حقائق۔

۱۴ر اکتوبر برطانیہ کی جنگی امداد کے ہندوستانی مددگاروں کی تصاویر (چار صفحے)، بیگم بھوپال، نواب رام پور، نظام حیدرآباد، مہاراجہ میسور، مہاراجہ بڑودہ، مہاراجہ بیکانیر، مہاراجہ گوالیار، ٹھاکر صاحب

گنڈال، مہاراجہ جے پور، مہاراجہ کوٹا، مہاراجہ جموں وکشمیر، نواب ٹونک، مہاراجہ دیتیا، مہاراجہ پرکھادی اس کے علاوہ جرمنی قیدیوں کی کلکتے میں آمد اور دوسری تصویریں۔ سقوط بلجیم۔ کاماگاٹا مارو کے مسافروں کی گرفتاری کے مقام بج بج کی تصویر۔ شاہ رومانیہ کی وفات۔ ورود مقدس (یوم الحج)، پابندی عہد اور اسلام۔ جنگ کی قوت محرکہ فلسفہ کے تحت "الحرب" تار پیڈو، جنگ کے متعلق موضوعی خبریں۔ پیشانی کے نیچے غازی انور پاشا کی تصویر؛ تار پیڈو (مذاکرہ علمیہ)، جرمنی کی ترقی کا راز، علمی مراسلات۔

۲۸ اکتوبر | الہلال کے روایتی سرورق کی تبدیلی آرٹ پیپر، قطرات رنگ (مقالہ) مولانا ظفر علی خان کی سزایابی پر، واقعہ لاہور کے عنوان سے اظہار خیال؛ تصاویر کے چھ صفحے۔ جنگی امداد دینے والے رئیس اور نوابوں کی تصاویر، جنگ کے میدان سے مختلف تصویریں۔ باقی گزشتہ سے پیوستہ مضامین، جنگ نامہ۔ فاتح و پیغمبر کا امتیاز (مقالہ)؛ تاریخ فریضہ حج، عید اور تکمیل شریعت، بریدِ فرنگ۔ نام نہاد جرمن مظالم۔ ایک جرمنی خاتون کا خط، جنگ کی خبریں۔

۱۱ نومبر | مسجد نبوی کی تعمیر کے زیر عنوان شبلی نعمانی کی نظم فاتح افواج کا داخلہ ممالک مفتوحہ میں (مقالہ) اہل غرب کی ترقی کا راز، پریس بیورو لندن (بریدِ فرنگ) اداریہ بر عنوان ہندوستان اور پروجرمنز (پانیر الہ آباد نے الہلال کو پرو جرمن قرار دے کر حکومت کو اس کے بند کر دینے کا مشورہ دیا تھا)، (چھ صفحے) جنگ کے اشخاص و وقائع کی تصاویر (چار صفحے) شئون اسلامیہ۔

۱۸ نومبر | فاتح افواج کا داخلہ ممالک مفتوحہ میں (قسط نمبر ۳) باب التفسیر کے زیر عنوان الحرب فی القرآن بحریات اسلامیہ، بریدِ فرنگ، عالمگیر جنگ کی سازش۔ ہندوستان اور پرو جرمنز (۲) بنگال اور پانیر (چار صفحے) تصاویر جنگ، حادثہ فاجعہ علمیہ کے زیر عنوان مولانا شبلی نعمانی کے انتقال کی خبر اور سیاہ حاشیہ کے اندر تصویر (پورا صفحہ) شئون اسلامیہ۔ صفحہ آخر میں حاشیے کے اندر الہلال پریس کی ضبطی ضمانت کا چوکھٹہ ۱۶ نومبر کو دو ہزار کی پہلی ضمانت ضبط کی گئی۔ اس کے علاوہ ۱۶ اور ۲۱ اکتوبر ۱۹۱۴ء کے شمارے بھی ضبط کیے گئے۔

الہلال سنہ ۱۹۲۷ء

۱۰ جون | ۱۹۲۷ء کا الہلال نصف ٹائپ (نسخ) اور نصف لیتھو (نستعلیق) میں شائع ہونے لگا۔

سرورق کی تصویر ختم کر دی گئی۔ صرف لفظ 'الہلال' طبع ہونے لگا۔

اداریہ آغاز، فتوح الشام کی سریانی تاریخ، ذرہ آب کی سرگزشت، تاج کے لیے دو جرمن عورتوں کی جنگ "حسن وعشق اور تاج وتخت"، "رومانیہ کا تخت شاہی ایک فتنہ گر حسن کے رحم پر" آثار عتیقہ اندلس میں اسلامی تمدن کا آخری نقش قدم، شام کی حرکت استقلال، تختہ دار پر کھینچے ہوئے احرار کی تصویریں، اور اور نیشنلزم مرغی پہلے پیدا ہوئی یا انڈا؟ مومن اور منکر کا ایک دلچسپ مکالمہ، اچھی مجلسیں، بعض مشہور آدمیوں کے لطیفے، مکتوب انگورہ، مکتوب مصر، فلسطین کی چٹھی، اخباری زندگی کا ایک لمحہ۔

۲۴ جون ۱۳۴۵ھ اداریہ "الہلال کا تیسرا دور" ادبیات کے تحت موجودہ ترکی شاعری کا ایک نمونہ مطبوعات جدیدہ کے تحت کیا یورپ میں ادبی نسل موجود ہے؟ مذاکرۂ علمیہ کے تحت برقی مچھلیاں، حج شام کی حرکت استقلال کی خونچکاں تصویریں، انسانیت موت کے دروازے پر کا سلسلہ مضامین قسط اول امام علی، اسلام اور نیشنلزم قسط نمبر ۲۔ عالمی خبروں کی تلخیصات، مکتوب قسطنطنیہ، مکتوب مصر، مکتوب چین، مکتوب فرانس، مکتوب جرمنی۔ عالم مطبوعات وصحائف، خواطر وسوانح۔

۱ر۸ جولائی رنگیلا رسول (رخاکم بدہن) کے متعلق پنجاب ہائی کورٹ کے فیصلے پر مولانا کا طویل بیان، انسان کی تخلیق وظہور کا اولین محل، درازی قد کی علمی توضیح، قابلیت کا مقیاس ومیزان، فرانسیسی اولوالعزمی کی قربانی، دیش بندھو سی آر داس (ایک باتصویر مقالہ تعزیت خاکہ) مغرب اقصیٰ اور اندلس پر ایک نظر امتیاز، مکتوب قسطنطنیہ، مکتوب عراق، فلسطین میں صیہونی تحریک، مکتوب شام، مکتوب مصر، ٹیکسلا، مکتوب فرانس، اسلام اور نیشنلزم قسط نمبر ۳۔

۱۵ جولائی اردو ٹائپ کی طباعت پر نظر وبحث، ایک انگریز خاتون جو شام میں متوطن ہوگئی۔ وکٹر ہوگو کے افسانہ محبت اور قربانی کا ترجمہ، مذاکرۂ علمیہ بہ عنوان انسانی عمر کی درازی اور اعادۂ شباب انسانیت موت کے دروازے پر (امام حسین) مکتوب چین، مکتوب قسطنطنیہ ہجری سن کی داستان۔

۲۲ جولائی ازمنہ وسطیٰ میں عربی طبابت، انسانی عمر کی درازی پر ڈاکٹر لوف اور مسٹر چرچل کا مکالمہ، مکتوب لندن، مکتوب فرانس، مکتوب مصر، مکتوب شام، علم الآثار مصر، سیروفی الارض کے تحت تیونس اور رومانیہ سے متعلق تاثرات، گزشتہ سے پیوستہ مضامین، انسانیت موت کے دروازے پر (امام حسین) محبت اور قربانی (وکٹر ہیوگو)

۲۹ جولائی علم الآثار مصر، انقلاب فرانس کے ارکان ثلاثہ، والٹیر، کیا نپولین مسلمان ہوگیا تھا؟ (ایک تاریخی بحث)، پان یورپین تحریک اور امن عالم، تین ہزار سال پہلے کی شاعری، مکتوب امریکہ، مکتوب انگورہ، گزشتہ سے پیوستہ مضامین۔ انسانیت موت کے دروازے پر (امام حسین)، ہجری سنہ کا آغاز (قسط ۲)

۵ اگست مذاکرۂ علمیہ کے تحت نظریہ ارتقاء کا گمشدہ حلقہ، ریڈیم، جان ژاک روسو، مکتوب شام، انسانیت موت کے دروازے پر (عمرو بن العاص)، اٹلی کے نئے اصول حکمرانی (مسولینی کی عجیب و غریب تقریر)، مکتوب قسطنطنیہ، میری صحیفہ نگاری کی زندگی کا ایک لمحہ (ایک فرانسیسی صحافی)، تفسیر سورہ فاتحہ کا ایک صفحہ الحمد للہ رب العالمین۔ بعض عالمی خبروں کا خلاصہ۔

۱۲ اگست حقیقت کہاں ہے؟ (یونانی علم الاصنام کا ایک افسانہ)، مذاکرۂ علمیہ کے تحت زمین پر کائنات حیات کا آغاز، آثار عتیقہ کے زیر عنوان علم الآثار، جان ژاک روسو کی دوسری قسط، ادبیات کے تحت مغرب کے حکماء اور شعراء کے بعض افکار و خواطر، راسپوٹین کے سوانح، نوجوان ترکی پر ایک نظر، مکتوب قسطنطنیہ حجاج بن یوسف (موت کے دروازے پر)

۱۹ اگست جان ژاک روسو (قسط نمبر ۳)، مطبوعات جدیدہ کے زیر عنوان مخاطبات ارواح، اردو ٹائپ کا مسئلہ (افکار و آراء)، سات عجائبات عالم، شامی جہاد وطنی کا التواء (تصاویر کے دو صفحے)، لیلیٰ و مجنوں سے متعلق مصری اہل قلم ڈاکٹر طہٰ حسین کا مضمون، تفسیر سورہ فاتحہ کا ایک صفحہ (۲)، مختارات (حاصل مطالعہ)

۲۶ اگست لیلیٰ و مجنوں (قسط ۲)، سید جمال الدین اسد آبادی، ہندوستان اور حکیم البیرونی، یونانی ادب کے تراجم، گزشتہ سے پیوستہ مضامین، ریاستہائے متحدہ امریکہ، انسانیت موت کے دروازے پر (امیر معاویہ)، مکتوب حجاز، سیروا فی الارض (ایک مصری سیاح نجد میں)، ایک کروڑ پتی نے خودکشی کرتے وقت کیا محسوس کیا؟ نپولین پر قاتلانہ حملے۔ سات عجائبات عالم (۳) مشتری کا مجسمہ، عالمی احوال و وقائع۔

۲ ستمبر سات عجائبات عالم (روڈس کا عظیم بت)، بابل کے معلق باغ، باب اہرام مصر، تفسیر سورہ فاتحہ کا ایک صفحہ، مذاکرۂ علمیہ کے تحت لاسلکی کا راز۔ مقرر یا سیاسی (مقالہ) سعد زغلول پاشا،

سوانح وافکار، تاریخ و عبر (عہد عباسیہ کا ایک صفحہ، الامین اور المامون)، ماں کی محبت، گورکی کے ایک افسانے کا ترجمہ (اختر شیرانی کے قلم سے)، پراپیگنڈا (تشریحی مقالہ)، دنیا کا جدید ترین شہر آسٹریلیا کا نیا دارالحکومت غدر، ۱۸۵۷ء تصویر کا دوسرا رخ، سعد پاشا زغلول کے اقوال۔

۹ ستمبر مذاکراۃ علمیہ کے تحت قانون توارث جسمانی و معنوی، عہد انقلاب اور شخصی استبداد، دنیا کی موجودہ سیاست پر ایک سرسری نظر، علم اور دین، کیا قانون پر نکتہ چینی قانون کی توہین ہے؟ وکٹر ہیوگو کی تقریر، ہندوستان کی تجارت پر مشرق و مغرب کا تصادم، اخبار نویسی سے متعلق بادشاہوں کے اقوال، ایک مصری سیاح نجد میں "غدر، ۱۸۵۷ء تصویر کا دوسرا رخ، دل آزار مذہبی تحریریں، (اسلام اور سزائے قتل)، مکتوب آستانہ، مکتوب شام، مکتوب امریکہ، سعد پاشا زغلول کے اقوال۔

۱۶ ستمبر برید فرنگ کے زیر عنوان مکتوب فرانس "قانون پر تنقید" وکٹر ہیوگو کی تقریر (۲)، شخصی آزادی مختلف مذاہب کی نظر میں، صحیح بخاری کا ایک تاریخی نسخہ، عہد امویہ کا خاتمہ اور عباسیہ کی تاسیس، مکتوب مصر، ایک مصری سیاح نجد میں، گزشتہ سے پیوستہ مضامین۔

۳۰ ستمبر مذاکراۃ علمیہ کے تحت فوق البشر، جراثیم حیات، احساس الم کا ازالہ، شہزادہ جم کا افسوسناک انجام (افسانہ)، حب ذات کس میں زیادہ ہے، مرد میں یا عورت میں؟ علم الاجتماع (۱)، مکتوب مصر، ماہ ربیع الاول کا اختتام، گزشتہ سے پیوستہ مضامین۔

۷ اکتوبر علم الاجتماع (۲)، مختارات (حاصل مطالعہ)، آثار عتیقہ، خلیفہ ہارون رشید اور فرانسیسی سفارت، مصطفی فاضل پاشا، بدنصیب کروڑپتی، مکتوب قسطنطنیہ، غضبناک محبوبہ (پال ھیس کا افسانہ)، اکابر تاریخ اسلام کے مختصر وفیات (انسانیت موت کے دروازے پر) اسلام اور سزا قتل، دل آزار مذہبی تحریریں)

۱۴ اکتوبر باب التفسیر کے تحت حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ایک بادشاہ کا مکالمہ، مذاکراۃ علمیہ کے تحت عالم سماوی، تاریخ عبر کے تحت مسیحیت اور بت پرستی، ترکی حکومت کے اجتماعی و سیاسی تغیرات، مکتوب آستانہ، اکابر اسلام کی مختصر وفیات، گزشتہ سے پیوستہ مضامین۔

۲۱ اکتوبر علم اور کلیسا کا معرکہ، دنیا کی مشترک اور عام فہم زبان اسپرنٹو، حکومت ترکیہ کے اجتماعی و سیاسی تغیرات (یہ مقالہ با تصویر ہے اس میں ایک تصویر عجیب و غریب ہے کہ سلطان عبدالحمید کے سامنے

وزرا نے حکومت سجدہ کر رہے ہیں، آثار عتیقہ کے تحت شہر رقیم کے احوال، روحانیات کی مجلس (افسانہ)، مکتوب حجاز، مدحت پاشا (سوانح و افکار)، مکتوب جرمنی، اکابر تاریخ اسلامی کی مختصر وفیات۔

۲۸ر اکتوبر حکومت ترکی کے اجتماعی وسیاسی تغیرات، شہر رقیم کا انکشاف (۲)، برید فرنگ، سفیروں کا استقبال، مذاکرۂ علمیہ کے تحت علوم مادیہ کی ترقی، امیر محمد بن عبدالکریم کی تصویر بعنوان ایک فراموش شدہ عظمت، روح کے موضوع پر ساٹھ اطبائے عصر کے مباحث، مدحت پاشا (۲) مکتوب حجاز، نپولین پر دوسرا حملہ (افسانہ)، اوائل عہد اموی کی اسلامی ذہنیت۔

۴ر نومبر کمیونزم اور اس کے مقاصد (ساڑھے چار صفحے کا مقالہ)، ابن بطوطہ کی سیاحت، ہوائی سفر کا ایک نیا تجربہ، بالشویک روس کی عدالت (تصویر)، بعض علمی خبروں کا خلاصہ، مدحت پاشا کے قید خانے سے خطوط، ہندوستان انگریزی حکومت سے پہلے اور بعد، مذاکرۂ علمیہ کے تحت نظریۂ نشو و ارتقا کی موجودہ منزل، گزشتہ سے پیوستہ مضامین۔

۱۱ر نومبر ہندوستان اور مجموعہ عالم کے زیر عنوان جغرافیائی، اقتصادی اور عمرانی لحاظ سے ہندوستان کا جائزہ، مستشرقین اور استشراق (مقالہ)، کمیونزم اور اس کے مقاصد (۲)، یورپ میں ظاہر ہونے والے ایک مشرقی درویش، باب التفسیر، حجۃ ابراہیمی، مدحت پاشا، مکتوب آستانہ، فرانس کا آخری مقبول ڈرامہ ایلین کا شوہر، آزادی کی راہ میں، تاریخ قرطاجنہ کا ایک صفحہ، زرق امیر سعادیہ کے دربار میں۔

۱۸ر نومبر باب التفسیر، تفسیر کا قرآنی وغیر قرآنی طریقہ، کمیونزم اور اس کے مقاصد (۳)، مصر اور ترکی کی نسوانی تحریکات، ہندوستان، انگریز مدبروں اور مصنفوں کی نظر میں، غازی مصطفےٰ کمال کا تاریخی خطبہ، خلیفہ عبدالحمید کی فرانسیسی تاریخ، تاریخ کا سب سے بڑا سوانگ، نام نہاد مجلس اقوام۔

۲۵ر نومبر نپولین کا چرکسی غلام رستم بن رضا، باب التفسیر، حجت ابراہیمی، آثار عتیقہ کے زیر عنوان فراعنۂ مصر کے عظیم ہیکل، علم اور کلیسا، تاریخ و خبر کے تحت عربوں کے آتش بار اسلحہ پر یونانی ہم عصر مورخ کا بیان، اقتصادی لحاظ سے ہندوستان کی موجودہ حیثیت، مکتوب قسطنطنیہ، راسپوٹین کی کہانی، پرنس یوسوپف کی زبانی، برطانوی شہنشاہیت کا تنزل، حاصل مطالعہ۔

۲ر دسمبر نپولین اور اس کی اخلاقی زندگی، انسانی عظمت اور اخلاقی نامرادی، باب التفسیر، حجت ابراہیمی، جدید مذہب (رومی مقالہ)، آثار عتیقہ، فرانس کی نئی اثری دریافت، برید فرنگ، عرب خلفاء

وسلاطین کے مختصر جوابات ۔خط استوا کے افریقی قبائل ، غدر ۱۸۵۷ء (تصویر کا دوسرا رُخ) مکتوب حجاز ، سائنسی خبروں کی تلخیصات ۔

۹ دسمبر	جدید مذہب رومی ، آخری مملوک سلطان مصر ، قدما کی مفقود صنعتیں ، مذاکرہ علمیہ ، روسی انقلاب کی جوبلی ، ترکی کی نسوانی تحریکات ، جلیانوالہ باغ کا قتل عام ، مکتوب آستانہ ، مکتوب مصر ، مصر کی سیاسی بیداری ، نحاس پاشا کی زبانی ، اسلام اور سزائے قتل (مولانا ابوالکلام آزاد)

۱۹۲۷ء کا الہلال دورِ اوّل کے الہلال والبلاغ کی بہ نسبت زبان کے اعتبار سے سادہ وسلیس تھا ، اس میں عربی کی بھرمار اور فارسی کا ہجوم نہیں تھا ۔ دورِ اول کے اکثر عنوان قرآن پاک کی آیات سے لیے جاتے اور ایک عنوان کے ساتھ کئی عنوان ہوتے تھے ۔ ۱۹۲۷ء کے الہلال کا مزاج اس سے مختلف ہوگیا ۔ اس دور کے الہلال میں کئی چیزیں مفقود تھیں ۔ مثلاً صفحہ اول تصویر سے خالی رہا ، سرورق کے اندر لوح کے نیچے ٹائپ اور لیتھو (نسخ و نستعلیق) کے سوال پر حصول آرا کی بحث ۱۵ جولائی سے ۹ دسمبر کے آخری پرچے تک موجود رہی ۔

عربی حروف کے حق میں ۲۳۵ ، مشترکہ طباعت کے حق میں ۲۰۸ ، پتھر کی چھپائی کے حق میں ۱۹۰ آرائیں آئیں ۔ پہلے دور میں اداریے اور شذرات عام تھے ، اس دور میں اداریہ کا ہے ما ہے لکھا گیا ۔ ملک کے وقتی مسائل پر جس سے برعظیم کی داخلی سیاست کے اتار چڑھاؤ کا علم ہو ، کوئی سی تحریر نہیں ۔ غرض اس دور کے الہلال کی ترتیب و تدوین میں مولانا موجود تو ہیں لیکن ان کے اپنے قلم سے کچھ زیادہ مقالے نہیں ، البتہ جو مقالات چھپے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی نگاہ اور قلم ان میں شریک ہیں[1] ۔

---

[1] الہلال والبلاغ کے مندرجات کا جائزہ میری ہدایت کے مطابق میری بیٹی صوفیہ سلمہا نے مرتب کیا ہے ۔ جو کچھ الہلال والبلاغ میں چھپتا رہا ، جائزہ میں ان مطبوعہ مقالات کے اشارات ہیں ۔ مولانا الہلال والبلاغ کے ابتدائی دور میں ایک مقالہ کے لیے کئی سرخیاں قائم کرتے تھے ۔ اس جائزہ میں ہر مضمون کی صرف ایک سرخی لی گئی ہے ۔ الہلال والبلاغ (دورِ اول) کے ہر مقالہ میں کئی کئی تصویریں ہوتی تھیں ۔ جائزہ میں ان

سب کا حوالہ نہیں اور نہ سب مضامین ہی کا ذکر ہے۔ ممکن ہے بعض مضامین کا حوالہ سہواً رہ گیا ہو۔ اس کے علاوہ وہی مراسلات و مکاتیب الہلال و البلاغ میں راہ پاتے تھے جو کسی علمی، فکری، سیاسی، ادبی تہذیبی اور تفسیری مسئلے سے متعلق ہوتے یا اُن میں ملّی رعایت سے کوئی خبر ہوتی۔ اس جائزے سے صرف عنوانوں کا علم ہوتا ہے۔ مولانا کے قلم کی معجز نگاری اور علم کی بے پناہی کا اندازہ الہلال و البلاغ کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے۔

دعوتِ الہلال کے نتائج

بیسویں صدی کے عشرہ ثانی کا آغاز ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی سرگزشت کا ایک نیا باب تھا۔ اب تک صورتِ حال کا نقشہ یہ تھا کہ ۱۷۵۷ء میں مسلمان ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقتل میں کھڑے تھے۔ سلطان ٹیپو کی شہادت (۱۷۹۹ء) سے مسلمانوں کے زوال و قتال کا آغاز ہوا اور ۱۸۵۷ء کے خونیں شب و روز تک پہنچا۔ اس سے بڑی قیامت فی الجملہ ہندوستانی مسلمانوں پر کبھی نہ بیتی تھی جو ۱۸۵۷ء میں بیت گئی اور کئی سال تک مختلف شکلوں میں جاری رہی۔ پھر ۱۸۵۷ء کا شعلہ بجھا گیا تو علمائے حق کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی اور انہیں سرسری سماعتوں کے بعد تختہ ہائے دار پر کھینچا گیا۔ علمائے صادق پور (پٹنہ) اس معرکہ ابتلا میں ہمہ گیر تشدد کا آخری شکار تھے۔ کل پانچ مقدمات چلائے گئے۔ پہلا مقدمہ انبالہ (۱۸۶۴ء) اس میں گیارہ افراد ماخوذ تھے۔ دوسرا مقدمہ پٹنہ (۱۸۶۵ء) اس کے واحد ملزم مولانا احمد اللہ صادق پوری تھے۔ تیسرا مقدمہ مالدہ بنگال (۱۸۷۰ء) اس کے ملزم مولانا امیر الدین تھے۔ چوتھا مقدمہ راج محل (۱۸۷۰ء) راج محل صوبہ بہار کی بھاگل پور کمشنری میں واقع تھا، اس کے ملزم ابراہیم منڈل تھے۔ پانچواں مقدمہ پٹنہ میں تھا اس میں کل سات ملزم تھے۔ ادھر سید احمد شہید علیہ الرحمہ کے باقیات، جماعت مجاہدین کے نام سے سرحد کے قبائلی علاقے میں تھے، انگریزوں نے بنگال سے پنجاب تک محض اشتباہ کی بنا پر ان کے حقیقی و فرضی رفقاء کو چن چن کے اپنے بہیمانہ تشدد کی بھینٹ چڑھا دیا۔

۱۸۵۷ء کے بعد ۱۸۶۳ء میں جنگ امبیلہ انگریزی استبداد کی خون آشامیوں کا نقطہ عروج تھا جس میں جماعت مجاہدین کا قلع قمع کیا گیا۔

ادھر ہندوستان سے افغانستان کے خلاف برطانوی استبداد کی مہمیں بھی مسلمانوں کو مغلوب کرنے ہی کا حصہ تھیں۔ ۷۹-۱۸۷۸ء کی جنگ میں امیر محمد یعقوب تاج و تخت سے محروم ہوئے اور ہندوستان

میں نظر بند کیے گئے، ان کی باقی عمر ڈیرہ دون میں گزری۔ ان کا بھائی سردار محمد ایوب ابتداً لاہور میں رہا پھر راولپنڈی میں۔ وفات پا گیا تو پشاور میں دفن ہوا۔

ان کی جلاوطنی پر حکومت امیر عبدالرحمٰن کو ملی۔ برطانوی استعمار نے ۱۸۷۹ء میں افغانستان سے ایک ایسی جنگ لڑی جو بہ قول جنرل خارسٹ ہندوستانی بغاوت کے بعد دوسرا ابتلا تھا۔

غرض ۱۸۷۹ء سے لے کر ۱۹۰۰ء تک صرف سرحدی علاقے میں اکیاون جنگیں لڑی گئیں۔ اور یہ سب ہندوستان سے مسلمانوں کو محو کر دینے یا انہیں ہمیشہ کے لیے خوفزدہ کرنے کی برطانوی مہموں کا استبدادی عمل اور اس کی استعماری مشقیں تھیں۔

۱۹۰۱ء تک برطانوی استبداد کے سیل کا تمام بہاؤ ہندوستانی مسلمانوں کے خلاف تھا۔ ادھر بنگال و بہار کے مسلمان استبداد کے اس زنغے میں تھے۔ ادھر وسط ہندوستان کے مسلمان ۱۸۵۷ء کا حشر گزار کر ایک سراسیمہ زندگی گزار رہے تھے، اور پنجاب و سرحد جماعت مجاہدین کی موجودگی کے باعث برطانوی استبداد کی زد میں تھے۔ ان دنوں جماعت مجاہدین کی دعوت جہاد کا خصوصی رابطہ پنجاب سے تھا۔ مرزا غلام احمد اس جہاد ہی کو موقوف کرنے کے لیے نبوت کی مسند پر فائز کیے گئے۔

لارڈ کرزن نے پنجاب کو برطانوی استعمار کے لیے ریڑھ کی ہڈی پاکر تقسیم بنگال سے پہلے تقسیم پنجاب کی اور ۱۹۰۱ء میں پشاور، مردان، کوہاٹ، بنوں، ڈیرہ اسماعیل خان اور ہزارہ کے علاقے کاٹ کر شمال مغربی صوبہ سرحد کی بنیاد رکھی اور اس طرح ان علاقوں کو سرزمین بے آئین بنا ڈالا۔ پھر کی رو سے کسی بھی شخص کو صرف اس پاداش میں فوراً پھانسی دی جا سکتی تھی کہ وہ کسی انگریز کو قتل کرنے کی نیت رکھتا ہے اور اس پر حکام مجاز نے شب کیا ہے۔ پھر پھانسی کی نوعیت یہ تھی کہ عدالت جس طرح چاہے مجرم کو لٹکوا سکتی اور جہاں چاہے سزائے موت دے سکتی ہے اس کے علاوہ عدالت کو یہ بھی اختیار تھا کہ وہ اس کی نعش کو آگ یا چرنے میں جلوا دے اور یہ سب ہندوستان کے مسلمانوں کو شل کر دینے کی استبدادی مہم تھی۔ غرض مسلمانوں کی ویرانی کو مختلف شکلیں دینے ہی کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۱۲ء میں بہار و اڑیسہ کو بنگال سے کاٹ کر علیحدہ صوبہ بنایا گیا۔

ہندوستانی مسلمان ممکن تھا، ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ حریت کی پاداش میں تمام تر ختم کیے جاتے لیکن ایک تو اتنی بڑی تعداد کو ہندوستان سے ختم کرنا مشکل تھا۔ دوسرے اس قسم کا فیصلہ یا ارادہ انگریزی عملداری

ناموافق تھا۔ تیسرے ہندوستان ابھی ہندو مسلم کی تفریق تک نہیں پہنچا تھا۔ چوتھے مسلمانوں کی مدافعتی قوت کی بعض ایسی صورتیں نکل آئی تھیں کہ وہ خود برطانوی عملداری کے حسب حال تھیں۔

پنجاب میں برطانوی عملداری کو ٹوانوں، نونوں، کھرڑوں اور جاٹوں وغیرہ ایسے قبائل ہاتھ آگئے جو اس کے لیے فوجی اعتبار سے ریڑھ کی ہڈی ثابت ہوئے، دوسرے میرزا غلام احمد نے مسلمانوں کو جہاد سے باز رکھنے کے لیے دستارِ نبوت باندھ لی ادھر ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کے لیے الہامی سندیں حرفِ آخر تھیں۔ ان کے علاوہ ہندوستان میں شیعہ سنی عقائد آمنے سامنے ہوگئے۔ جن لوگوں نے جہاد کو مسلمانوں کے لیے فرض قرار دیا اور اسلامی زندگی کا لازمہ ٹھہرایا، انہیں وہابی کہہ کر ان کے خلاف منبر و محراب کے ذریعے تحریک اہتمام پھیلائی گئی۔ نتیجۃً جو اسلام غیر اسلام سے لڑتا تھا وہ آپس میں گتھم گتھا ہوگیا۔ ادھر سرسید کی تحریک نے مسلمانوں کا جوش ٹھنڈا کیا۔ اور مسلمان انگریزی سرکار سے وفاداری بشرطِ استواری کی اس راہ پر آگئے کہ ۱۸۵۷ء کا مسلمان کسی نہ کسی وجہ سے بہ انتشار اجتماعی طور پر عنقا ہوگیا۔ لیکن سرسید کی انگریز دوستی خرابی کی آخری حد تک بھی مخلص ہی تھی، سرسید نے ۱۸۵۷ء دیکھا تھا۔ انہوں نے حسن و قبح سے قطع نظر اپنی پالیسی سے ہندوستانی مسلمانوں کے جسم کا تحفظ کیا۔ ادھر جن بزرگوں نے دیوبند کی نیو اٹھائی انہوں نے مسلمانوں کی روح کا تحفظ کیا۔ سرسید نے کام شروع کیا تو انگریزی استبداد اوج پر تھا۔ اور علماء صادق پور کا پانچواں مقدمہ زیر تفتیش تھا، بالفاظ دیگر ہندوستانی مسلمان اس طرح کی چابک دستیوں سے ختم کیے جا رہے تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو برطانوی حکومت کے خونخوار تکراؤ سے بچا لینے کا پہلا مرحلہ سرسید کی تحریک کا آغاز تھا۔ سرسید ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ حریت کی شاہراہ خونیں کے سربریدہ کاروان دیکھ چکے تھے، انہوں نے ۱۸۵۹ء میں رسالہ "اسباب بغاوت ہند" لکھا۔ پھر "وفادار مسلمانان ہند" کا ایک سلسلہ مضامین شروع کیا جو ان کی جرأت اور مسلمانوں کی مدافعت کا ایک وردمندانہ سلسلہ تھا۔ آج رسالہ "اسباب بغاوت ہند" کے متعلق منفی رائے قائم کرنا آسان ہے لیکن جن دنوں سرسید نے قلم اٹھایا وہ بجلیوں میں نشیمن سازی کا زمانہ تھا، ان دنوں حکومت ہند کے فارن سیکرٹری مسٹر سیسل بیڈن نے اس رسالے کے متعلق سرکاری یادداشتوں میں لکھا تھا کہ ایک باغیانہ تحریر ہے لیکن وائسرائے نے اتفاق نہ کیا اور اس طرح رسالہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔

مشنریوں نے ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کی مہم تیز کی اور اسلام پر کھلم کھلا حملے شروع کیے۔ اس نزاع کو ختم کرنے کے لیے سرسید نے ابتداً "تبئین الکلام" لکھی۔ جس کا مقصود انگریزوں

اور مسلمانوں کے مابین عقائد کا اختلاف ختم کرنا تھا۔ لیکن وہ ایک تالیف تھی اور تالیف ہی رہی۔ دوسری کتاب احکام طعام اہل کتاب ۱۸۶۸ء میں تالیف کی جس میں آیات قرآنی اور احادیث رسالت سے یہ ثابت کرنا چاہا کہ انگریزوں کے یہاں کا کھانا اور ان کا ذبیحہ جائز ہے بشرطیکہ حرام چیزوں سے پاک ہو۔ لیکن سرسید اس طرح بھی مسلمانوں سے انگریزوں کی نفرت دور نہ کر سکے۔ سر ولیم میور یوپی کا لیفٹیننٹ گورنر تھا، اسی نے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی اور شمس العلماء مولوی نذیر احمد دہلوی کو ایڈنبرا یونیورسٹی سے ایل ایل ڈی کی ڈگری دلوائی۔ لیکن اس کے خبث باطن کا یہ حال تھا کہ وہ ہندوستان میں پہلا انگریز تھا جس نے لائف آف محمد لکھ کر حضورؐ کی اہانت اور اسلام کے خلاف بدگوئی کا آغاز کیا۔ سرسید اس کتاب کو پڑھ کر بے چین ہو گئے، انہوں نے خطبات احمدیہ کے نام سے جواب لکھا۔ اس کے علاوہ ابطال غلامی تصنیف کی۔ آخری دنوں میں جب وہ ضعیفی کے عالم میں تھے ایک عیسائی کی ایک ایسی کتاب کا رد لکھا جس میں اس نے حضورؐ کی ازواج مطہرات پر رکیک حملے کئے تھے۔ سرسید مراد آباد میں سب جج تھے تو وہاں فارسی کا ایک مدرسہ قائم کیا پھر ۱۸۶۴ء میں غازی پور میں ہندو مسلمانوں کا مشترکہ اسکول بنوایا اور وہیں ایک سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی جو ۱۸۶۴ء میں ان کے ساتھ علی گڑھ منتقل ہو گئی یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو اپنے دونوں صاحبزادوں کے ساتھ انگلستان گئے، وہاں ملکہ وکٹوریہ، پرنس آف ویلز اور انگلستان کے دوسرے عمائدین نے پذیرائی کی۔ ۱۸۷۰ء کو واپس ہندوستان آئے اور ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو "تہذیب الاخلاق" جاری کیا، جس کے ہمہ گیر اثرات ہندوستانی مسلمانوں کے نئے ذہن کی بنیاد ہو گئے۔ ڈاکٹر ہنٹر نے ۱۸۷۱ء میں ایک کتاب "مسلمانانِ ہند" لکھی۔ جس میں وہابیت و بغاوت کو ہم معنی قرار دیا، اس کتاب کی اشاعت پر سرسید وہابیوں کی حمایت کے لیے کھڑے ہو گئے اور انگریزی اردو میں چودہ مضامین کا جوابی سلسلہ لکھا اور اعلان کیا میں خود وہابی ہوں۔ پھر جو ملکہ وکٹوریہ کی سالگرہ کا دن تھا ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ اسکول کا آغاز کیا، یکم جون (۱۸۷۵ء) کو چھاؤنی کے پرانے بنگلوں میں تعلیم شروع کی، آخر یہی اسکول کالج بنا اور سرسید کی وفات کے بعد یونیورسٹی کہ سرسید کی تحریک کا حاصل تھا۔ فی الجملہ علی گڑھ کی تحریک تمام تر سرسید ہی کی تحریک تھی اور ایک ہی تصور و عمل کے دو نام تھے۔

۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسید رحلت کر گئے لیکن ان کی تحریک کے ذہنی اثرات اتنے پھیل چکے تھے کہ اس دور کو بجا طور پر سرسید کی تحریک کا دور کہا جا سکتا ہے۔

علی گڑھ کالج کے پہلے پرنسپل مسٹر سڈنس تھے ان کے علاوہ کئی ایک انگریز اساتذہ کا تقرر ہوتا رہا۔ لیکن

انڈین نیشنل کانگرس سے پہلے صورتِ حال یہ تھی کہ انگریز اساتذہ تعلیمی اوقات کے سوا طلبہ سے الگ تھلگ رہتے۔ مسٹر تھیوڈور بیک نومبر ۱۸۸۳ء میں پرنسپل ہوکر آئے تو ان کا طرزِ عمل مختلف تھا۔ وہ طلبہ سے ملتے ملاتے اور ان کی بہبود کا خیال رکھتے۔ ان کے ساتھ انگریز اساتذہ بھی انہی کے نقشِ قدم پر چلتے، طلبہ کی بعض انجمنیں بنائی گئیں جو ان کے لیے بہمہ خصائص بالکل نئی چیزیں تھیں۔

مولوی سمیع اللہ خان علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھنے میں سرسید کا دایاں بازوں تھے، انہی کی وجہ سے علی گڑھ میں مدرسہ کھولا گیا۔ اس غرض سے ابتدائی زمین انہی کی عطا کی ہوئی تھی اور انہی کے دم سے علی گڑھ کے رؤسا کالج کے مددگار تھے، مولوی صاحب اور ان کے دوستوں کا خیال تھا کہ علی گڑھ میں انگریز اساتذہ کی بھرمار نہ کی جائے۔ اس کے برعکس ہندوستانی پروفیسروں سے کام لیا جائے۔ مسٹر بیک علی گڑھ کی معرفت ہندوستانی مسلمانوں کی سیاست کا رُخ پھیرنے کے لیے مضطرب تھے۔ وہ مولوی سمیع اللہ خان کی اس تجویز پر ان سے کبیدہ ہوگئے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ سرسید نے منیجنگ کمیٹی معطل کرکے بورڈ آف منیجمنٹ قائم کیا۔ اور مولوی سمیع اللہ خان کو اس کی رکنیت سے محروم رکھا۔ ادھر پرنسپل اور انگریز اساتذہ نے ملی بھگت کی اور سید محمود کو بہ اصرار جائنٹ سیکرٹری بنوا دیا۔ یہ مولوی سمیع اللہ خان کے خلاف بالواسطہ ایک اقدام ہی تھا، نتیجۃً مولوی سمیع اللہ خان اور ان کے رفقاء جو کالج کے بنیادی اور ابتدائی مددگار تھے اس قضیے سے الگ ہوکر گوشہ نشین ہوگئے اور یہ انگریزی کی سیاست کاری کا ایک ایسا موڑ تھا کہ اس کے نتائج سے ملکی پالٹکس کا نقشہ پلٹ گیا۔ اور سیاست کا پانسہ سرکاری ہاتھوں میں آگیا۔

سرسید کی ۲۳ سالہ سیکرٹری شپ میں کل ایک سو بیس طلبہ گریجویٹ ہوئے جن میں ستانوے مسلمان اور تیئیس نامسلمان تھے۔ سرسید رحلت کرگئے تو ان کے فرزند سید محمود کالج کے آنریری سیکرٹری مقرر ہوئے لیکن وہ دس ماہ بعد ۳۱ جنوری ۱۸۹۹ء کو خرابی صحت کی بنا پر مستعفی ہوگئے۔ ان کی جگہ نواب محسن الملک منتخب ہوئے نواب صاحب کی مساعی مشکور سے نہ صرف کالج کا پچھلا قرض اتر گیا بلکہ لاکھوں روپے کالج فنڈ میں جمع ہوگئے۔ اور جو عمارتیں سالہا سال سے ادھوری پڑی تھیں وہ مکمل ہوگئیں۔ اس کے علاوہ طلبہ کی تعداد بھی دوگنی ہوگئی۔ پرنسپل بیک بیمار ہوکر سرسید کی وفات کے ڈیڑھ سال بعد ستمبر ۱۸۹۹ء میں وفات پاگئے مسٹر تھیوڈور ماریسن ان کے جانشین ہوئے، ان کی شبانہ روز مساعی سے تعلیم کا معیار الہ آباد یونیورسٹی سے بھی اونچا ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی سے طلبہ کو جو شغف پیدا ہوا وہ بیک، ماریسن اور آرنلڈ کے فیضانِ تلمذ

کا نتیجہ تھا۔ ان طلبہ کی بین الصوبائی برادری جو ہندوستانی مسلمانوں کی عبقریت کا ظہور تھا، تمام تر انگریز اساتذہ کی مرہونِ منت تھی۔ ان اساتذہ کا سلسلہ ۱۸۸۳ء سے شروع ہو کر ۱۹۰۵ء میں مسٹر ماریسن کی مراجعت انگلستان پر ختم ہو گیا، لیکن ان سے پہلے یا ان کے بعد جو اکا دکا انگریز استاد کالج سے منسلک ہوئے ان کا طرزِ عمل محض روایتی تعلیم تک محدود رہا۔ نواب محسن الملک ۱۹۰۷ء میں رحلت کر گئے تو نواب وقار الملک مقرر ہوئے، لیکن ان کی انگریز اساتذہ سے نہ بن سکی ان اساتذہ نے صوبہ کے گورنر سے شکایت کی۔ گورنر نے نواب وقار الملک کو طلب کیا اور انگریز اساتذہ کے حق میں فیصلہ دے کر نواب صاحب کو مجبور کیا کہ وہ اس فیصلے پر دستخط کر دیں۔ انہوں نے فوراً دستخط کرنے سے انکار کیا لیکن اگلے روز مقامی ٹرسٹیوں کے اصرار پر دستخط کر دیئے۔ علی گڑھ واپس پہنچے تو صاحبزادہ آفتاب احمد خان اور دوسرے ٹرسٹیوں نے اتفاق نہ کیا۔ یہ مسئلہ اتنا بڑھا کہ ہندوستان بھر میں مسلمانوں نے احتجاجی جلسے شروع کئے اور ان کی قراردادیں گورنر یوپی کو بھیجیں، نتیجۃً سر مزمل اللہ خان کی وساطت سے فریقین میں صفائی ہو گئی۔

انڈین نیشنل کانگرس ایک انگریز مسٹر اے۔ او ہیوم نے ۱۸۸۵ء میں اس خیال سے قائم کی کہ اس کی معرفت ہندوستانی قوم کے جذبات و احساسات اور خیالات و خواہشات معلوم کی جائیں۔ پس منظر یہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کا خونخوار زمانہ بیت گیا تو ایک طویل اور دہشت ناک سناٹے کے بعد انگریزی پڑھے لکھے ہندوستانی، برطانوی استحصال کو شدت سے محسوس کرنے لگے۔ ادھر کئی صوبوں میں سیاسی نکتہ چینی کو بال و پر مل گئے، انڈین نیشنل کانگرس اس صورتِ حال سے آگاہ ہونے کا ایک ذریعہ خیال کی گئی، لیکن بسرعت تمام ان لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی جو انگریزوں کے استعماری مقاصد پر کئی واسطوں سے نقد و نظر کرتے تھے۔

پرنسپل بیک نے کانگرس کے بلحاظ افکار کی نبض پر ہاتھ رکھا اور محسوس کیا کہ برطانوی عملداری کیلئے اس کا وجود خطرناک ہے اور اس کے دماغ میں ہندو مسلم اتحاد کا جو نقشہ ہے وہ انگریزی حکومت کے مصالح و مقاصد کے خلاف ہے، چنانچہ اس نے کانگرس کے خلاف اینگلو انڈین اخبارات مثلاً "پائنیر الٰہ آباد" وغیرہ میں مضامین کا سلسلہ چھیڑ کر سر سید کو ہم خیال بنا لیا۔ سر سید نے کانگرس سے مسلمانوں کی علیحدگی کا بیڑہ اٹھایا اور انگریز دوستی میں اس قدر آگے بڑھے کہ سید جمال الدین افغانی جو ان دنوں ملک بدر ہو کر ہندوستان میں مقیم تھے، ان کے خلاف عربی رسالوں میں زوردار تنقید کرتے رہے۔ لیکن سر سید اپنی دوڑ میں کامیاب رہے۔ جن دو مسلمانوں نے اب تک کانگرس کے مختلف اجلاسوں کی صدارت کی تھی ان میں ایک مسٹر بدرالدین طیب جی

(۱۸۸۷ء) مدراس کانگرس کے صدر تھے دوسرے مسٹر رحمت اللہ سیانی (۱۸۹۶ء) کلکتہ کانگرس کے صدر ہوئے تھے۔ سرسید کا شمالی ہند میں جہاں مسلمانوں کے فعال مرکز تھے بہت زیادہ اثر تھا اور وہ بہ وجوہ ان کے ساتھ تھے۔ کانگرس کے مسلمان صدر صرف اس لیے مسترد ہو گئے کہ دونو بمبئی کے تھے اور شمالی ہند کے مسلمانوں سے انہیں کوئی رابطہ نہ تھا۔ مسٹر بیک نے کانگرس سے مسلمانوں کے اجتناب کو پختہ کرنے کے لیے انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قائم کی اور دس سال تک اس پر قابض رہے۔ پھر جب اس ایسوسی ایشن پر شبہ ہوا کہ وہ کانگرس کا بچہ شتر ہو رہی ہے تو اس کو توڑ کر ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کی۔ اس کی افتتاحی تقریر میں مسٹر بیک نے کہا کہ :

> "چند سال سے ملک میں دو قسم کے ایجی ٹیشن زور شور پر ہیں، ایک انڈین نیشنل کانگرس کی تنظیم ہے دوسرے انسداد گاؤ کشی کی تحریک ہے۔ ان میں سے تحریک اوّل صریحاً انگریزوں کے خلاف ہے اور تحریک ثانی مسلمانوں کے۔ چونکہ ان دونو تحریکوں کا نشانہ مسلمان اور انگریز ہیں لہٰذا ان دونو کو متحد ہو کر ان کا مقابلہ کرنا چاہیئے، اور جمہوری سلطنت کے اجرا کو اس ملک میں روکنا چاہیئے جو اس وطن کے حسب حال نہیں ہے، ہمارا باہمی اتحاد عمل اور سلطنت سے حقیقی وفاداری ہی ہمارے کام کی اصل اساس ہے۔"

گویا باہمی اتحاد عمل اور وفاداری بشرط استواری کا وعظ اس وقت شروع کیا جب انڈین نیشنل کانگرس برطانوی استعمار کی دور اندیشیوں کے لیے خطرے کا موجب ہو گئی، اور کئی ایک ہندو لیڈر مثلاً لوکمانیہ تلک، لالہ لاجپت رائے، اور سردار اجیت سنگھ وغیرہ حکومت کے خلاف نکتہ چینی کی پاداش میں قید و بند کی نذر ہو گئے یا جلاوطن کئے گئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب بنگال میں طلبا نے زبردست ہڑتالیں کیں، پونا میں تعزیری پولیس بٹھائی گئی، نظر بندی کے لیے سرد پا قانون بنائے گئے، بنگال، بمبئی، مدراس اور مہاراشٹر میں دہشت پسندی کے واقعات رونما ہوئے اور سارے ملک کے افق پر ایجی ٹیشن کے ابر پارے چھا گئے۔

سلطان ٹیپو کی شہادت (۱۷۵۷ء) سے لے کر بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری (۱۸۵۷ء) تک انگریزوں کا واحد نصب العین ہندوستان سے مسلمانوں کا خاتمہ تھا۔ پھر بیسویں صدی کے سال اول تک اس خاتمے کی مختلف شکلیں ڈھلتی رہیں۔ عجب نہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمان ہسپانیہ کے مسلمانوں کی طرح مٹ جاتے لیکن قدرت کو منظور نہ تھا اس کے وجوہ پہلے صفحات میں اشارتاً بیان کئے جا چکے ہیں۔ پرنسپل بیک نے جو کچھ کہا وہ بداہتہً ہندوستان

میں انگریزوں کی نئی ذہنی کروٹ کا آغاز تھا اور ملک میں انگریزی عملداری کو طول دینے کی سیاسی میناکاری کا ایک حصہ۔

نواب سلیم اللہ خاں (نواب ڈھاکہ) کی دعوت پر دسمبر ۱۹۰۶ء میں قیام مسلم لیگ کا ڈول ڈالا گیا۔ نوسال تک لیگ کی ابتدائی قیادت صدارتی اعتبار سے نواب وقار الملک، آدم جی، پیر بھائی، سر علی امام، سر آغا خان، نواب ڈھاکہ، سر شفیع، اور سر ابراہیم رحمت اللہ وغیرہ کے ہاتھ میں رہی، جن لوگوں کو جماعتی اغراض و مقاصد مرتب کرنے کی نامزد کمیٹی میں رکھا گیا، ان میں نواب سید علی بوگرہ اور جسٹس شاہ دین (لاہور) وغیرہ بھی تھے، نواب محسن الملک جائنٹ سیکرٹری رہے۔ لیگ کی وفاداری میں تھوڑی سی دراڑ سید نبی اللہ بار ایٹ لا لکھنؤ کی صدارت کے زمانے (۱۹۱۰ء) میں پیدا ہوئی لیکن حزم و احتیاط کے ساتھ اگست ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم چھڑ گئی تو حکومت نے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا شوکت علیؒ، مولانا ظفر علیخاںؒ اور مولانا حسرت موہانیؒ کو نظر بند کر دیا، شیخ الہند محمود الحسنؒ کو ان کے عزیز تلامذہ مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولوی عزیز گلؒ وغیرہ کے ساتھ برطانوی حکومت نے شریف مکہ کے ذریعے حجاز میں گرفتار کیا اور مالٹا میں لا کر نظر بند کر دیا۔ شریف مکہ نے حکم دیا تھا کہ نماز مغرب سے پہلے مولانا محمود الحسنؒ حاضر نہ ہوئے تو ان کے دو گرفتار شدہ ساتھیوں (مولانا عزیز گل اور حکیم نصرت حسین) کو گولی سے اڑا دیا جائے۔ اس پر حضرت شیخ الہند فوراً تشریف لے آئے اور گرفتار ہو گئے پھر ان کی رہائی ۱۲ مارچ ۱۹۲۰ء کو ہوئی۔

مسلم لیگ کے دور جدید کا آغاز دسمبر ۱۹۱۵ء کے سالانہ اجلاس میں ہوا، اور دسمبر ۱۹۱۶ء کے اجلاس میں بصدارت محمد علی جناح لیگ رجعت پسندی کے ویرانہ سے نکل کر آزاد خیالی کے مرغزار میں داخل ہوئی اور بہ قول علامہ شبلی نور اللہ مرقدہ، ایک سیاسی جماعت بن گئی، کانگرس اور لیگ کے درمیان باہمی حقوق پر پیکٹ ہو گیا۔ کانگرس کے ساتھ مسلم لیگ کا آخری اجلاس ۱۹۲۱ء میں بصدارت مولانا حسرت موہانی منعقد ہوا لیکن ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۳ء کے دو سال کسی گرمجوشی کے بغیر نکل گئے، پھر ۱۹۲۴ء میں مسلم لیگ خانہ زاد رجعت پسندوں کی طرف منتقل ہو گئی اور تیرہ سال تک اس کا عالم قریب قریب یہی رہا۔ محمد علی جناح ۱۹۲۷ء میں اس کے صدر منتخب ہوئے، ۱۹۴۰ء میں پاکستان کا مطالبہ اس کا موقف ہو گیا پھر پاکستان بن جانے تک قائد اعظم ہی صدر رہے بالفاظ دیگر مسلم لیگ کا روشن چہرہ قائد اعظم تھے اور پاکستان کا مطالبہ اس کی تحریک کا پہلا اور آخری جاندار موقف تھا۔ ورنہ مسلم لیگ ان دنوں بھی جب ہندوستان کامل آزادی کے لیے جدوجہد

کر رہا تھا، مسلمانوں کے رجعتی عناصر کا دارالفرقان تھا۔ اور اس کی سیاست اکثر و بیشتر ان لوگوں کے ہاتھ میں رہی جو انگریزوں کی ناراضی کا حوصلہ نہ رکھتے تھے۔

لارڈ کرزن نے ۱۶ راکتوبر ۱۹۰۵ء کو بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ تو مسلمانوں کی رجعتی قیادت نے خوشنودی کا اظہار کیا، لیکن ہندوؤں نے اس کے خلاف تحریکی ہنگامہ برپا کر دیا۔ نتیجۃً دسمبر ۱۹۱۱ء میں شاہ جارج پنجم نے دھلی دربار میں اس تقسیم کو منسوخ کر دیا اور دارالحکومت کلکتہ سے دھلی منتقل ہو گیا۔ جس سے مسلم لیگ کی رجعتی سیادت کو گہری چوٹ لگی اور وہ تمام مسلمان راہنما جو برطانوی حکومت کے توسط سے ان کے لیڈر تھے ایک معطل عضو ہو گئے۔ تاہم جنگ طرابلس کے زمانے (۱۹۱۲ء) میں بھی رجعتی قیادت کے یہی لیل ونہار تھے۔ ان کے لیے مسجد کانپور کا حادثہ بھی بے معنی تھا اور دوسری جنگ عظیم میں تو ان کا طرز عمل غیر مشروط وفاداری کا ہو گیا۔

بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں صحافت کا حال یہ تھا کہ اردو اخبارات نا شستہ بے جان تھے۔ کسی اخبار میں سیاسی اعتبار سے کا ہے ماہے کوئی ترنگ ہوتی تو وہ اجتماعی نہ تھی انفرادی تھی انگریزی اخبار بھی کسی تحریک کے ترجمان نہ تھے، ان میں کوئی منچلا حکومت کے کسی قول یا فعل پر نکتہ چینی کرتا تو وہ کسی اجتماعی ذہن کا طرفدار نہ تھا، بلکہ وہ اس کے قلم کا طرز گفتار تھا جس میں دونوں قسم کے پیوند لگے ہوتے۔

"زمیندار" مدت سے جاری تھا۔ مولانا ظفر علی خاں کے والد مولوی سراج الدین احمد اس کے بانی تھے، لیکن مولانا ظفر علی خان نے والد کی وفات کے بعد یکم جنوری ۱۹۱۰ء میں روزنامہ "زمیندار" کی عنان ادارت سنبھالی تو ایکا ایکی اپنے معاصروں کی مرعوب صحافت کو پچھاڑ دیا۔ "کامریڈ" یکم جنوری ۱۹۱۱ء کو نکلا جو مولانا محمد علی جوہر کی انگریزی تحریروں کا شعلۂ جوالہ تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو "الہلال" نکالا اور وہ صحافت کا انقلابی معجزہ تھا کہ دنوں ہی میں "الہلال" کہیں سے کہیں نکل گیا اور سارا ملک اس سے گونج اٹھا۔ ان تینوں جرائد میں کچھ زیادہ فاصلہ نہ تھا، لیکن جہاں تک سیاسی آہنگ، قومی احساس، اور مسلمانوں سے لگاؤ کا تعلق تھا، تینوں ایک ایسے قافلے کے حدی خوان تھے جس نے اپنا سفر شروع کر دیا لیکن قافلہ بجائے خود ابھی مرتب ہو رہا تھا۔ ادھر پورا ملک ان کا ہم قدم نہ سہی ہم آواز ہو چکا تھا۔

مولانا محمد علی جوہر دل گداختہ لے کر پیدا ہوئے اور برق طپاں تھے، انہوں نے ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء کو

ہمدرد نکالا، جو ایک صفحے کا ضمیمہ یا اخبار تھا لیکن اس دور میں ان کی عظمت کا باعث "کامریڈ" تھا جس کے لیے خود وائسرائے مضطرب رہتا، اور ہر ہفتہ بالاستیعاب پڑھتا تھا۔ برنارڈ شا نے مولانا محمد علی کی موت پر کہا تھا کہ ان کا قلم میکالے کا، ان کی زبان برک کی اور ان کا دل نپولین کا تھا، کامریڈ نے ہندوستان کے انگریزی پڑھے لکھے مسلمانوں کو کس حد تک متاثر کیا، اس کا اندازہ یوپی کے ان انگریزی خواندہ مسلمانوں سے ہو سکتا ہے جو تحریک خلافت میں شامل ہوئے اور قید و بند کی صعوبتوں کو لبیک کہا۔ بہر حال کامریڈ انگریزی خواندہ مسلمانوں کی نئی بیداری تھا لیکن مسلمان عوام کی بیداری مولانا محمد علی کی شخصیت کے شخصی کردار کی مرہون تھی، مولانا محمد علی "کامریڈ" کی معرفت مسلمانوں کے لیڈر نہیں بنے اور نہ مسلمانوں کی نئی قیادت اس کی دعوت سے ابھری، مولانا محمد علی کی عظمت کا راز ان کی پُرشکوہ سیادت متنوع شخصیت اور پُرتاثیر خطابت کے علاوہ آزمائش و ابتلا میں ان کی فقیدالمثال استقامت میں تھا، وہ کسی خارجی عمل سے لیڈر نہیں بنے تھے، ان کا داخلی کردار اس کی اساس تھا۔

مولانا ظفر علی خان کا "زمیندار" ان کی سیادت کا حرف آغاز تھا۔ وہ ایک جامع الصفات متحرک انسان تھے، ادیب، خطیب اور شاعر، انہی چیزوں نے ان کا سیاسی وجود تیار کیا۔ زمیندار ملک کے ویرانے میں نعرہ رستخیز تھا اس نے مسلمانوں کو اس حد تک متاثر کیا کہ پنجاب جو قلعہ استعمار تھا، ایک انقلابی آواز سے پہلی دفعہ آشنا ہوا۔ اور مسلمان جو برطانوی حکومت ہی کے ہو کے رہ گئے تھے ان کی صفوں میں استعمار کے خلاف ہلچل پیدا ہوئی۔ "زمیندار" نے خیبر سے دہلی تک ان تمام بتوں کو پاش پاش کیا، اور ان کے تقدس کو ہدف قلم بنایا جو برطانوی عملداری کے "زلہ ربا" اور مسلمانوں کے "آقائے ولی نعمت" کہلاتے تھے۔ پنجاب کاسہ لیس خاندانوں کی نگری اور ان کے تابع عوام کا خطہ تھا۔ مولانا ظفر علی خان نے "زمیندار" کے محاذ سے ان پر وہ تابڑ توڑ حملے کیے کہ ان کا پتا پانی پانی ہو گیا۔ اور وہ چلا چلا کر سر مائیکل اوڈوائر کو عرضداشتیں بھیجتے رہے کہ "زمیندار" کا احتساب کیا جائے اور انہیں اس سے بچایا جائے۔ اس کی ہمہ گیری سے حکومت کی خوفزدگی کا یہ عالم تھا کہ "زمیندار" اسلامی ہندوستان میں پہلا اخبار تھا جس سے ضمانت طلبی اور ضمانت ضبطی کا آغاز ہوا۔ جس کے مطابع ضبط کیے گئے۔ جس کے اکثر ایڈیٹر قید ہوتے رہے اور جسے کئی دفعہ تعطل و تنسیخ کی مدتیں گزارنا پڑیں، زمیندار کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس نے ملک کے لیے نامور ایڈیٹر پیدا کیے۔ اس لحاظ سے وہ صحافت کا سب سے بڑا دبستان تھا۔ زمیندار نے کئی تحریکیں اٹھائیں۔ کئی جماعتیں پیدا کیں اور مسلمانوں کو نہ صرف جری راہنماؤں کی جماعت دی بلکہ بے شمار سیاسی کارکن پیدا کیے جو برعظیم کی آزادی کے آخری مرحلے تک

کانگرس، مسلم لیگ، مجلس احرار، اور جمعیۃ العلمائے ہند کی روح رواں ہے۔ "الہلال" "کامریڈ" کے مقابلے میں "زمیندار" نے بڑی عمر پائی، اس کی موت قومی آزادی کے بعد خود مسلمانوں کے ہاتھوں ہوئی لیکن وہ پاکستان کے حصار آزادی کا معمر قلعہ دار تھا۔

"الہلال" ہندوستانی مسلمانوں کے جگر دار خواص کی آواز تھا۔ اس کی بدولت ان علماء و اکابر کو سہارا ملا جو سید احمد شہید، جماعت مجاہدین، علمائے صادق پور اور اکابر دیوبند کی فکر کے وارث تھے۔ جنہیں برطانوی استعمار سے موروثی اختلاف تھا۔ اور اس کی بہر نوع بیخ کنی کے متمنی تھے۔

الہلال نے علماء کے ولولۂ جہاد کو عوامی تحریک بنا دیا اور ان کے پیچ و تاب کو ایک ایسی شکل دی کہ ان کا ذوق جہاد کھلے میدانوں کی تحریک بن گیا، اب ان کا جذبہ حریت عوام کی چیز تھا اور جو کچھ ان کے دلوں میں تھا وہ تمام تر پبلک ہو گیا۔ اب کسی خفیہ سازش یا خفیہ مرکز کی ضرورت نہ تھی اور نہ بیرون ملک کسی جوڑ توڑ کا معاملہ تھا، اب کھلا میدان اور صاف للکار تھی۔ الہلال نے پیغمبری آواز میں صور اسرافیل پھونکا۔ اس کی تنقید و تحسین دونوں میں رزم کا ولولہ تھا۔ مولانا آزادؒ لیڈری کے میدان میں الہلال ہی کی معرفت آئے اور امام الہند بھی اپنی معجز نما تحریروں سے ہوئے۔ ظاہر ہے کہ الہلال کی زبان عوام کی زبان نہ تھی اس کا لب و لہجہ ایک ایسے داعی کا لب و لہجہ تھا جو قرآن کا مسلمان تھا اور اس کی تعلیمات ہی سے ذہنی نشو و نما پائی تھی۔ اس رعایت سے زمیندار عوام کا اخبار تھا اور الہلال خواص کا لیکن الہلال نے معاصر اخباروں کو بھی متاثر کیا اور بزرگوں سے اس طرح ہمکلام ہوا کہ وہ سوتے سے جاگ اٹھے۔ الغرض اسلامی ہندوستان کی نئی لیڈر شپ کا کم سے کم نصف الہلال ہی کی دعوت کا مرہون تھا۔ تب دین و سیاست اور ادب و فکر کا ہر گوشہ اس کے فیضان کا شکر گزار تھا۔

مولانا آزادؒ سے مولانا محمد علیؒ کی معاصرانہ چشمک ایک طبعی امر تھا۔ لیکن جب دونوں ایک ہی تحریک کے دست و بازو تھے تو مولانا محمد علیؒ نہ صرف مولانا آزادؒ کی معجز نگاریوں اور جادو بیانیوں کا اعتراف و اعلان کرتے بلکہ ان کے دماغ کو عربی ذہانت اور عجمی فطانت کا شہ پارہ کہتے تھے۔ آپ نے اس زمانے میں لاہور کے ایک جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"ابو الکلام نے ہندوستان میں گمشدہ اسلام کو دریافت کیا ہے وہ ایک یگانہ عصر انسان ہیں۔"

مولانا شوکت علی لاہور میں شہید گنج کانفرنس کی صدارت کے لیے آئے تو خلیفہ شجاع الدین کے ہاں کسی طرح مولانا آزادؒ کا ذکر چھڑ گیا فرمایا:

"وہ قرنِ اوّل کے مسلمانوں کی ذہنی فراست کا نمونہ ہیں ان میں ایک ہی نقص ہے کہ عوام سے پرہیز کرتے ہیں ورنہ فقہی میدانوں میں جن راست باز زبانوں کے سوانح و افکار پڑھ کر دل کو ایک گونہ مسرت اور دماغ کو حیرت ہوتی ہے کہ اس پائے کے عظیم لوگ بھی ہم میں تھے۔ مولانا آزادؒ فی زمانہ ان کی تصویر ہیں۔"

حسرت موہانی کا ایک شعر ہے ؎

جس زمانے میں سب تھے مہر بلب
ایک گویا تھے ابوالکلام آزاد

مولانا ظفر علی خان نے مولانا آزادؒ کی مدح میں کئی اشعار کہے ہیں۔ لیکن ایک شعر ؎

جہاں اجتہاد میں سلف کی راہ گم ہوئی
ہے تجھ کو اس کی جستجو تو پوچھ ابوالکلامؒ سے

خان عبدالغفار خان نے سیاست میں اپنے داخلے کی روداد بیان کرتے ہوئے بتایا کہ:

"وہ الہلال اور زمیندار کے مطالعے سے اس پُرخار وادی میں آئے تھے۔ مولانا آزادؒ کے ساتھ کانگرس ورکنگ کمیٹی میں سولہ سال بسر کیے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا مجلس عاملہ کا دماغ تھے اور یہی ان کا حسن واحد تھا جس کی بدولت وہ اختلافی مباحث میں بھی فریقین کا احترام نہیں کھوتے تھے۔"

مولانا حسین احمد مدنیؒ نے مولانا سے متعلق کئی دفعہ اظہار کیا کہ "وہ آیات من اللہ میں سے ہیں۔ ابوالکلام نہ ہوتے تو ہندوستان میں مسلمانوں کا انقلابی سفر دیر تک معطل رہتا۔ وہ ایک جامع الصفات انسان ہیں کہ اس قسم کے انسان صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔"

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی (ناظم جمعیۃ العلمائے ہند) فرماتے تھے۔

"مجھے سیاست کا چسکا الہلال نے ڈالا اور ابوالکلام آزادؒ نے میدانِ رستخیز میں لا کھڑا کیا۔"

مولانا شبیر احمد عثمانی مولانا آزادؒ سے مختلف راستے پر تھے لیکن لاہور (پاکستان) میں ایک ملاقات کے دوران میں فرمایا:

"مولانا آزاد نے سیاسی آواز کو دینی لہجہ دے کر اس زمانے کے علماء کو خطابت کا ایک

نیا اسلوب دیا اور اس یگانہ اسلوب کے سحر میں کسی کو اختلاف نہیں۔ میں نے ابتدا خود الہلال کی خوشہ چینی کی ہے۔"

مسٹر آصف علی نے لکھا تھا:

"مولانا آزادؒ روز بروز پیدا نہیں ہوتے، ہم سب ان کے افکار کی ملکار ہیں، وہ نہ ہوتے تو شاید ہمارا قافلہ مرتب نہ ہوتا۔"

علامہ انور شاہ کاشمیری سے متعلق مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی نے بتایا کہ مولانا آزادؒ دیوبند میں حضرت قاسم نانوتوی اور حضرت شیخ الہند کی قبروں کے پاس ٹہل رہے تھے۔ علامہ انور شاہ نے دور سے دیکھا تو فرمایا:

"وہ دیکھو علم ٹہل رہا ہے۔"

فرمایا: ابوالکلام نے الہلال کا صور پھونک کر ہم سب کو جگایا ہے۔"

احرار زعماء الہلال و زمیندار کی پکار پر ملک کی سیاسی جدوجہد میں شامل ہوئے تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے ایک جلسے میں مولانا ظفر علی خان کے دونو گالوں پر عقیدت کے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"ظفر علی خان تیرے ستارہ صبح نے میرے جگر میں آگ لگا دی تھی۔"

لیکن مولانا آزادؒ سے شاہ جی کی ارادت کا یہ حال تھا کہ اپنی سیاسی زندگی کو ان کی تصنیف کہتے، فرماتے۔ "الہلال نے مجھے خطابت سکھائی، سیاست پڑھائی اور زبان و بیان کی ندرت بخشی ہے، الہلال نہ ہوتا تو نہ جانے کب تک ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں خلا رہتا۔"

چودھری افضل حق احرار کا شہ دماغ تھے، شاہ جی انہیں جماعت احرار کا مہاتما کہتے۔ چودھری صاحب اوائل عمر میں سب انسپکٹر پولیس بھرتی ہوئے تھے۔ مولانا آزاد کی صدارت میں جلسہ عام تھا کہ چودھری صاحب نے سرعام وردی اُتار کر استعفیٰ دے دیا اور تحریک لاتعاون میں شریک ہو گئے۔ چودھری صاحب مولانا کو ملک علم کا شہنشاہ اور تدبر کے اعتبار سے بے پناہ کہتے تھے۔ فرماتے: ابوالکلام نے مجھے اس راہ پر ڈالا اور شاہ جی نے تھانیدار کی وردی اُتروا دی۔

مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی نے مولانا کو ہمیشہ اپنا مرشد کہا، فرماتے:

"ابوالکلام میں ابوذرؓ کا فقر، علیؓ کا استغنا، صدیقؓ کا عشق، فاروقؓ کا دبدبہ اور عثمانؓ کی حیا اور احمد بن حنبلؒ

کی استقامت رچی ہوئی ہے، وہ ان خصائص کا مجسمہ ہیں۔

شیخ حسام الدین احرار کا بازو تھے۔ مولانا سے ان کے عشق کا یہ حال تھا کہ ان کے خلاف اختلافی بول تک نہ سنتے، کسی زبان پر ایسا کلمہ ہوتا تو اس سے الجھ پڑتے۔ فرماتے "ہم لوگ انسانی وجود میں ابوالکلام کی تحریریں ہیں"

سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی کی آراء پہلے نقل ہو چکی ہیں، مولانا امین احسن اصلاحی نے ابوسعید بزمی سے گفت گو کرتے ہوئے کہا کہ "ابوالکلام کا دماغ کئی ہزار دماغوں کا نچوڑ ہے"

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی دعوت قرآن میں الہلال کے دَورِ اوّل کی واضح چھاپ موجود ہے۔ قاضی عبدالغفار کا طرز تحریر اپنا تھا لیکن حسن تحریر میں الہلال ہی کا رنگ جھلکتا تھا۔ ان کی کتاب آثار ابوالکلام مولانا سے ان کے تعلقات کی حکایت اور مولانا کے ذہنی اثرات کی سرگزشت ہے۔ رشید احمد صدیقی نے مولانا کی وفات پر جو مضمون لکھا، وہ سب سے بڑا خراج ہے۔ جو علی گڑھ کے اس معجز نگار ادیب کے قلم سے مولانا کی عظمت نے حاصل کیا۔ اس مضمون کے مطالعے سے کوئی ہیچ باقی نہیں رہتا، فی الواقعہ ابوالکلام کا دماغ قدرت کا معجزہ تھا۔ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی قیادت کا ایک عظیم عہد ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے مولانا کو فکر و نظر کی معراج پر دیکھا۔ اور ان کی محراب عظمت میں اپنے قلم کی پیشانی کو جھکایا ہے۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے نزدیک وہ قبلۂ دیدہ و دل تھے۔ اور ڈاکٹر سید عابد حسین کی نگاہ میں ان کی عظمت کا کنارہ ہی نہ تھا۔ نیاز فتح پوری نے خود راقم سے بیان کیا کہ ابوالکلام بنا کر قدرت نے وہ سانچہ ہی توڑ ڈالا جس میں اس عبقری روزگار کو ڈھالا تھا۔

سید سلیمان ندویؒ کی مولانا سے ناراضی بے قابو ہو گئی اور عبدالماجد دریا آبادی نے "اپی وآن" شروع کی تو دارالمصنفین کے ایک پرانے رفیق مولانا سعید احمد انصاری نے راقم کو اپنے والا نامے میں لکھا کہ:

"ابوالکلام سے حسد نہ کی جائے تو کس سے کی جائے، وہ جواب دینے کے عادی نہ تھے اور یہ لوگ نشتر زنی کے بغیر جینے سے معذور۔ ابوالکلام، شاہ ولی اللہ کے بعد مسلمانوں کی سب سے بڑی ذہانت کا نام تھا"

ملیح آبادی نے ذکر آزاد میں لکھا ہے "میں اخبار نویس ہی نہ ہوتا اگر مولانا کی رفاقت میسر نہ آتی، میرے قلم کی رونق کا سرچشمہ انہی کی ذات تھی"۔ غلام رسول مہر پنجاب کے بہت بڑے صحافی اور بلند پایہ انشا پرداز تھے۔ انہیں تحقیق و تنقید کے سیاسی میدانوں میں کمال حاصل تھا وہ انگریزی، عربی، فارسی اور اردو میں

یکہ تاز تھے۔ مولانا سے ان کی عقیدت ان مختلف کتابوں سے معلوم ہو جاتی ہے جو مولانا کے مقالات و مکاتیب کا مجموعہ ہیں اور ان کی مرتب کی ہوئی ہیں۔ راقم کے نام ایک مکتوب میں لکھا ہے:

"ہم نے مولانا کے معاملے میں کفران نعمت کیا ان کی فراست سے فرار ہماری عقلوں کا الحاد تھا مولانا ہندوستان میں عرب و عجم کی نفاستوں کا پیکر تھے۔ میں نے خود زندگی کا آغاز الہلال کے مطالعہ سے کیا، میرے قلم کا ذوق مولانا کے اسی فیضان نگاہ کا نتیجہ ہے۔ لیکن ہم نے مولانا کے علم و عمل کو ٹھکرا کر شومئی قسمت خرید کی ہے، مولانا کا وجود اس مشرق کے لیے رب لایزال کا عطیہ تھا۔ ہم نے اسی طرح کھو دیا جس طرح اندھا بینائی کھو چکتا ہے۔"

چراغ حسن حسرت ادیب طناز تھے ایک دفعہ مولانا کے ضمن میں فرمایا:

"ابوالکلام ایک عظیم الشان وجود کا نام ہے لیکن اس وجود کا دوسرا نام ایک تحریک اور ایک ادارہ ہے۔ ان سے ہمکلام ہو کر پراسنے دور کی علمی صداقتوں پر یقین آتا ہے۔ ان کی قدر نہ کرنے کا نتیجہ ہے کہ برعظیم کے مسلمان ایک عظیم ذہنی بحران کا شکار ہیں۔ ابوالکلام اور اقبال کے سوا برعظیم کے مسلمان صحرائی مخلوق ہیں۔"

اختر شیرانی مرحوم کہا کرتے تھے ہندوستان میں مسلمانوں کی ادبی ذہانت کے محور تین ہیں۔

(۱) ابوالفضل (۲) مرزا غالب (۳) مولانا آزاد۔

علامہ سیماب اکبر آبادی آگرہ کے مشہور شاعر اور یگانہ استاد تھے۔ پاکستان بنا تو کراچی آگئے، وہیں انتقال کیا، انہیں تاج محل سے غایت درجہ لگاؤ تھا۔ ان کے مجموعہ ہائے کلام میں تاج محل پر بہت سی نظمیں ہیں۔ مولانا آزاد کا ذکر آیا تو کہنے لگے:

"اس تقسیم نے انہیں ہم سے چھین لیا ہے وہ انسانوں کا تاج محل ہیں۔"

جوش ملیح آبادی اپنی ذات سے باہر نہیں جھانکتے خود کو مہاسنے کمال سمجھتے ہیں۔ مولانا آزاد کے تذکرے میں فرمایا:

"مولانا شاعر ہوتے تو ہم غرق ہو جاتے کیونکہ صدیوں تک ان کا نچوڑ پیدا ہونا مشکل تھا۔ وہ نفائس روزگار میں سے تھے، کئی دفعہ اشتباہ ہوتا ہے کہ ہم ان کی صدا سے بازگشت ہیں۔"

گاندھی جی اپنے ساتھیوں میں مولانا کو تاریخ کا سب سے بڑا عالم اور اپنا استاد کہتے تھے۔ مولانا کی شخصیت

سے متعلق ان کا جو نقطہ نگاہ تھا اس کی ایک بڑی تصویر مہادیو ڈیسائی کی کتاب "ابوالکلام آزاد" ہے۔ گاندھی جی نے اس کتاب کا مختصر دیباچہ لکھا ہے وہ مولانا کو علم میں ڈھلا ہوا انسان سمجھتے اور ان کے نزدیک وہ ایک ایسے سیاست دان تھے جو واقعات کے بجائے نظریات پر زندگی گزارنا اور رمین ولیسار کی لیپاپوتی سے بے نیاز رہتا ہے۔ جواہر لال نہرو نے ان کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ اور وہ ان کی ہمہ گیر شخصیت کے معترف تھے ان کے خیال میں مولانا جدید و قدیم ہندوستان کی تعلیم و تہذیب کا فکری مجسمہ تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو مولانا کے ذاتی دوست تھے، مولانا کے متعلق ان کا خیال تھا کہ ان کے عناصر اربعہ آگ، پانی، مٹی اور ہوا نہیں بلکہ علم، فکر، فہم اور تدبر ہیں۔" پنڈت جی کے یہ الفاظ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے راقم سے بیان کئے تھے ہی، آر داس مولانا کے جگری دوست تھے ان کا تاثر یہ تھا کہ مولانا علم کی سب سے بڑی حمیت ہیں۔ بھولا بھائی ڈیسائی نے مولانا سے متعلق ایک کتاب کے طابع کو لکھا کہ "مولانا کمالات و محاسن کا ایک ایسا مجموعہ ہیں کہ ان کی ذات ہندوستان کے علم، یونان کے فلسفے حجاز کے حافظے، ایران کے حسن اور جدید یورپ کی دانش علم سے لدی پھندی نظر آتی ہے۔"

نواب حبیب الرحمٰن خان شیروانی (صدیق مکرم) کے نزدیک مولانا علم کے آبشار اور استقامت کا پہاڑ تھے۔ علامہ شبلی کو مولانا سے اتنا لگاؤ تھا کہ ہر لحظہ انہیں ساتھ رکھنا چاہتے لیکن مولانا عنفوان شباب کی سرحدوں سے قریب ہونے کے باعث سیلانی طبیعت رکھتے تھے، علامہ شبلی کو اندازہ تھا کہ سلف تمام ذہانتیں اس نوعمر وجود میں جمع ہو رہی ہیں۔ آغا حشر نے راقم کے سامنے لاہور کی ایک صحبت میں ذکر کیا کہ "ابوالکلام ابھی نوجوانی کے حدود میں داخل نہ ہوئے تھے۔ لیکن ان کے علم و نظر کی وسعت اور زبان و بیان کی طاقت پر تعجب ہوتا تھا کہ اس نوعمری میں قدرت نے ایک یونانی دماغ کو عجمی حسن دے کر عربی شانے پر رکھ دیا ہے اور ہوتا ہے تو ہندوستان کی ذہانت حالہ کتنے ہوتی ہے۔"

اس ہندوستان میں جو ۱۹۲۰ء سے ابھرنا شروع ہوا صرف مہاتما گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزادؒ دو شخصیتیں ایسی تھیں جن سے ہندوستان کی جدید لیڈر شپ پیدا ہوئی، لیکن مہاتما گاندھی کا واسطہ انسانوں کی اس جماعت سے تھا جو بت کدے سے اُٹھی اور اس کی روایتوں کو اپنے مذہب کی اساس سمجھتی تھی۔ اس کے لیے افراد ہی پوجا کے لائق تھے، گاندھی جی نے اپنے دور کی لیڈر شپ کو جنم دیا، پروان چڑھایا اور جواہر لال بنا دیا لیکن مولانا آزادؒ اس قوم کے فرد تھے جس کی تلواریں اپنے ہی اکابر کے لہو سے گلنار رہی ہیں۔ ابوالکلام کے دبستان

الہلال سے جو لوگ تیار ہوئے وہ سیاست و سیادت کی وادیاں ضرور قطع کرتے رہے۔ لیکن جس قوم کے اعضا و ارکان تھے، اس کے خارستان میں تلوے سہلاتے رہے۔ ابوالکلام سب کچھ تھا لیکن اس سب کچھ کے باوجود آخر دم تک تنہا رہا۔ اس کی تربیت گاہ میں کوئی جواہر لال نہ تھا اس کے آخری شب و روز جنگل میں سرما کی چاندنی تھے یا پھر ہجر کے آنسو کہ شب کا سناٹا اور صبح کا اجالا دونوں تماشائی ہوتے ہیں۔

معاصرین کی آراء

راقم نے بعض عصری شخصیتوں سے مولانا کے متعلق ان کی مطالعاتی و تجرباتی رائے دریافت کی۔ وہ جو کچھ کہتے رہے انہیں اپنی یادداشتوں میں لکھتا رہا۔ اکثر آراء پر تیس سے چالیس برس گزر چکے ہیں۔ حقیقتہً یہ مولانا کی شخصیت و عبقریت کی تصویر ہے جن شخصیتوں کی مولانا سے متعلق دی جا رہی ہیں، وہ مولانا کے ہم عصر و ہم سفر تھے۔ سالہا سال ایک ساتھ رہے اور براہ راست مطالعہ و تجزیہ کیا۔ مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، بابو راجندر پرشاد، اور سردار ولبھ بھائی پٹیل کی آراء شخصی بصیرت کا تجزیاتی آئینہ ہیں۔ عربی کہاوت ہے کہ حسن وہ ہے جس کا سوکنوں کو بھی اعتراف ہو۔ کانگرس کے ان عناصر اربعہ نے اپنی بلندیوں سے مولانا کی رفعتوں کا اقرار کیا ہے۔ ان کے علاوہ خان عبدالغفار خان کی رائے ہے، وہ مجلس عاملہ کے مباحث میں گاندھی جی کے ہم رائے ہوتے اور مولانا سے اختلاف کرتے۔ ان کے نگارخانۂ خیال میں مولانا کی تصویر اپنی رعنائی و زیبائی کے ساتھ آویزاں ہے۔ مولانا ظفر علی خان نے معاصرت کی روایتی چشمک سے بے نیاز ہو کر اقرار محاسن کیا ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اردو کے سب سے بڑے خطیب اور زبان و بیان کے ساحر تھے۔ ہمیشہ فرماتے کہ "الہلال" نے ان کا ذہنی سانچہ تیار کیا تھا۔ غرض ان مختصر آراء میں مولانا کے سوانح و افکار کی بے شمار جھلکیاں ہیں۔ مطالعہ فرمائیے:

مہاتما گاندھی

وزارتی مشن کا زمانہ تھا مہاتما گاندھی ہریجن کالونی دہلی میں معمول کے مطابق کٹیا بنا کے رہ رہے تھے، راقم نے بعض دوستوں کی معیت میں ان سے دو بار ملاقات کی ایک دفعہ خود استدعا کی اور ملاقات ہو گئی، دوسری دفعہ سید عطاء اللہ شاہ کی ہمراہی میں۔ پہلی ملاقات میں روزنامہ "ڈان" کا شمارہ ان کے سامنے تھا۔ سرخ پنسل سے کسی مقالے پر نشان کھنچے، مہاتما جی نے فرمایا:

"ڈان نے مولانا آزاد کی مسلمانوں سے غداری کا مفروضہ قائم کیا اور اس پر طعن و تضحیک کی زبان استعمال کی ہے۔ ہماری سیاست اسی لیے صاف نہیں کہ ہم اختلاف کرنے والوں کی ذات کو رگیدنے کے شوق میں جھوٹ بولنے اور بہتان باندھنے سے ہچکچاتے نہیں، مجھ سے خود کرپس اور پیتھک لارنس نے کہا ہے کہ مولانا آزاد سے ہم نے اب تک سات آٹھ دفعہ ملاقات کی ہے، انہوں نے مسٹر جناح کا نام ہمیشہ عزت سے لیا اور ان کا تذکرہ نقطۂ نگاہ کے معلوم اختلاف یا ٹکراؤ کے باوجود اس طرح کیا جس طرح شرفا آپس میں تبادلۂ افکار کرتے اور ایک دوسرے کی دیانت و صیانت پر کوئی چھینٹا نہیں اڑاتے اس کے برعکس مسٹر جناح نے کئی دفعہ مولانا کے متعلق حقارت کے الفاظ استعمال کئے اور ہمارے تاثر کو مجروح کرنا چاہا۔ اب جو کچھ ڈان نے لکھا وہ مسٹر جناح کے خیالات کا عکس ہے۔ کرپس کہہ رہے تھے کہ مولانا نے ہم سے درشت لہجہ میں کوئی کلمہ کبھی اشارۃً بھی نہیں کہا۔ ڈان میں جو کچھ لکھا گیا اس سے شاید کسی کو متاثر یا مسموم کرنا مطلوب ہے۔ کل ہی کرپس نے کہا اور پیتھک لارنس نے تائید کی کہ مولانا مشرقی شرافت کا مجسمہ ہیں ان کا ذہن انسائیکلوپیڈیا ہے۔ وہ سیاست کو تاریخ کی میزان میں تولتے، استدلال سے وزن کرتے اور حقائق سے قیمت لگاتے ہیں، مولانا کوئی فالتو بات نہیں کرتے ان کی ہر بات تلی ہوتی اور قومی یا مذہبی انسان کے بجائے ایک عالمی انسان کے اسلوب میں ہوتی ہے۔ ہم نے ہندوستان کے مسئلے کو حل کرنے کیلئے فی الحال ذہن میں جو نتائج مرتب کئے ہیں ان میں زیادہ نہیں تو نصف باتیں مولانا کے خطوط پر مرتب کی ہیں۔"

راقم نے گاندھی جی سے سوال کیا کہ "ہندوستان میں آپ کی پوری سیاسی عمر مولانا کے ساتھ گزری ہے اس طویل تجربے میں آپ نے ان کے متعلق کیا رائے قائم کی ہے؟" گاندھی جی نے فرمایا:

"آپ کا سوال پیچیدہ ہے اور پیچیدہ ہونے کے علاوہ طویل بھی ہے۔ رفقار کے متعلق رائے دینا آسان نہیں، ہر تصویر کے بہت سے رُخ ہوتے ہیں، مولانا علم کے شہنشاہ ہیں میں انہیں افلاطون، ارسطو، فیثا غورث کی طرح کا ویسا ہی انسان سمجھتا ہوں، وہ تاریخ کے بہت بڑے عالم ہیں۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی میں جہاں تک تاریخ کے شعور کا تعلق ہے۔

کوئی بھی ان کا ہم پایہ نہیں، سب ان سے پیچھے ہیں، اردو زبان ان کی لونڈی ہے، وہ عربی و فارسی کے جید عالم ہیں، خطابت کے فن میں ڈیما سیتھنز اور سسرو کے ہم رتبہ ہیں لیکن ان کے متعلق ہم نے کتابوں میں پڑھا ہے، مولانا کو ہم نے دیکھا اور سنا ہے، وہ ایک سائنسدان کے انداز میں بات چیت کرتے اور مباحث کی بوقلمونی کو چند فقروں ہی میں نتیجے پر لے آتے ہیں۔ جواہر لال ان کے خیالات کی انگریزی کرتے ہیں۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی میں پیچیدہ، پہلودار اور دقیق قراردادیں مولانا ہی پیش کرتے اور اندرونی اپوزیشن کو چپ کرتے ہیں، جہاں تک کلام میں تاثیر اور استدلال میں سحر کا تعلق ہے اس وقت ہندوستان بھر میں کوئی شخص ان کی نظیر نہیں۔ مولانا میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ عوام سے گریز کرتے اور اپنے ہی خیالوں کے انسان ہیں۔ انہیں اپنے دماغ پر بھروسہ ہے۔ وہ عوام کی طاقت کو سمجھتے ہیں لیکن ان سے کٹے اور کھنچے رہتے ہیں۔ عوام سے گریز یا عوام سے فراری کا نتیجہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے عتاب کا شکار ہیں، مسلمانوں نے ان سے انصاف نہیں کیا۔ مسلمانوں کو حق تھا کہ ان سے اختلاف کریں، لیکن ایک ایسا شخص جو بعد سے الفاظ بول نہیں سکتا، جو کسی بڑے چھوٹے حریف پر طعن و طنز نہیں کر سکتا اور جہاں ذاتیات کے وصول اڑتی ہو وہاں سے منزلوں پیچھے ہٹ جاتا ہے؛ اس کے خلاف گالی گفتار، کذب و افترا اور طعن و تضحیک سے تو خدا خوش نہیں ہوتا۔ مولانا کی ذہانت، ہندوستان کے لیے عطیہ الٰہی ہے، میں کانگرس میں آیا تو ان سے پہلی ملاقات ہی میں اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک جی نی الیس (عبقری) ہیں۔ اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلاف کا یہ طوفان نہیں تھا بلکہ تحریک خلافت اور پنجاب کے مارشل لا نے باہمی اتحاد کی ایک بے نظیر فضا پیدا کر دی تھی۔ ملک کے شہ دماغ کانگرس کی صفوں میں تھے۔ مسلمانوں میں سے حکیم اجمل خان، مولانا محمد علی اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری ذہانت و قابلیت کے انسان تھے۔ حکیم صاحب کی سوجھ بوجھ اور فہمیدہ شخصیت کا ہر گوشہ میں احترام تھا۔ وہ محض طبابت کی وجہ ہی سے مسیح الملک نہ تھے ان کا ہاتھ ملک کی سیاسی نبض پر بھی تھا، وہ حالات و واقعات کی صحیح صحیح تشخیص کرتے تھے، مولانا محمد علی شجاعت کا پیکر تھے۔

وہ عوام کو اپنے زورِ بیان سے موہ لیتے اور عوام ان کی طرف کھنچے چلے جاتے تھے۔ بلاشبہ ہندوستان کی نئی بیداری میں ان کا وجود ابر و رعد کی پہلی صدا تھا، لیکن وہ جذبات کے انسان تھے۔ ڈاکٹر انصاری ہاتھ کے سخی، دل کے غنی اور دماغ کے دھنی تھے، سمندر کی تہوں سے موتی نکال لاتے ان سے غربا کے لیے سخاوت کا ایک چشمہ اُبلتا۔ مسلمانوں نے ان سے بھی غیر اخلاقی سلوک کیا۔ مولانا آزادؔ مقابلۃً کم عمر تھے۔ لیکن اس وقت بھی کانگرس میں صفِ اوّل کے راہنما تھے، ان کا شمول پہلے ہی دن سے ہمارے لیے فخر و مسرت کا باعث رہا۔ ہم ان سے مشوروں پہ مشورے حاصل کرتے اور وہ ہمیں امن و جنگ دونو حالتوں میں اپنی مفید رایوں سے مستفید ہونے کا موقع دیتے، یہ ان کی ذہانت کا اعتراف تھا کہ ۱۹۲۳ء میں جب ان کی عمر ۳۵ سال تھی کانگرس کے سب سے کم عمر صدر ہوئے وہ جواہر لال نہرو سے بھی کم عمر میں صدر ہوئے۔"

راقم نے سوال کیا۔

مہاتما جی، مولانا اور آپ کے درمیان سیاسی امور میں اختلافِ رائے ہو تو اس صورت میں کیا ہوتا ہے؟

مہاتما جی نے مسکراتے ہوئے کہا:

"مولانا میں اپنے علم کی بے پناہی کے باعث ذہنی طور پر ایک انا ہے، وہ بہت سے معاملات ایک مثالی اور نظری انسان کی حیثیت سے حل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس دنیا میں ہر چیز مثالی اور نظری طور پہ حل نہیں ہوتی۔ یہ دنیا واقعات و حالات کی بوقلمونیوں کا مجموعہ ہے۔ یہاں اَن مل اور بے جوڑ چیزیں چلتی ہیں، جن کی عقل تصدیق نہیں کرتی لیکن وجدان توثیق کرتا ہے وہ ہر چیز کو عقل، استدلال اور منطق سے دیکھتے ہیں، میں اندر کی آواز پر عمل کرتا ہوں۔ ان کی تدبیریں قرینِ حقیقت ہوتی ہیں۔ بسا اوقات مجھے لوٹ کر ان سے اتفاق کرنا پڑتا ہے۔ مولانا کی سب سے بڑی خوبی اختلافِ آراء کی نظری آویزش میں یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی خیال، نظریے اور نتیجے کو ذاتی وقار کا مسئلہ نہیں بناتے، اور ہر تیزی کو نرم روی سے حل کرتے ہیں۔"

کانگرس میں ایک ہائی کمانڈ ہے، مولانا اس ہائی کمانڈ کے رکن ہیں، ان کا اپنے ساتھیوں میں احترام ہے اور وہ سب ان کی آراء کے وزن کو محسوس کرتے ہیں، کانگرس کی دوسری طاقت ملک کے عوام ہیں، بے شک ملک کے عوام کی بہت بڑی اکثریت کانگرس کے ساتھ ہے لیکن مسلمانوں کی اکثریت کچھ اس طرح علیحدہ ہے کہ متحدہ قومیت کی داعی ہونے کے باوجود کانگرس اکثریتی مسلمانوں کی نمائندہ نہیں۔ اس اعتبار سے مسلمانوں نے مولانا کی پوزیشن کو کانگرس میں ضعیف کیا ہے اور شاید مولانا داخلی طور پر محسوس کرتے ہیں۔"

راقم نے عرض کیا۔

کیا یہ صحیح نہیں کہ مولانا نے خود مسلمانوں کو رجعتی لیڈرشپ کے حوالے کیا اور ان سے اس طرح کنارہ کیا کہ مسلمان بھی ان سے کنارہ کر گئے؟"

مہاتما جی نے کہا:

"کسی حد تک یہ بات ٹھیک ہے، عوام کسی لیڈر کو اس وقت تک پسند نہیں کرتے جب تک وہ ان میں گھل مل نہ جائے یا وہی بات نہ کرے جو ان کے شعور ولاشعور میں مختلف اسباب ومحرکات کے باعث دوران خون ہو چکی ہے، مولانا نے عوام سے اجتناب کیا ان سے رابطہ منقطع رکھا مطالعہ وقلم کے ہو گئے، اور ہر عوامی چیز سے دور رہے، ان کی اپنی زندگی فقر و درویشی کی زندگی ہے، وہ غیرت مندی کی سچی تصویر ہیں لیکن مزاج ان کا شاہی ہے اور عوام کی طبیعت اس سے مختلف واقع ہوئی ہے۔

مہاتما جی نے مسکراتے ہوئے کہا، ہندوؤں میں خلقتہً ہیرو ورشپ ہے۔ مسلمانوں کا مزاج اس کے الٹ ہے، بہر حال یہ ایک تجزیاتی پہلو ہے، جہاں تک مولانا کا تعلق ہے ہم نے انہیں ایک سچا مسلمان پایا ہے۔ میں انہیں ہندوستان کی عظمت سمجھتا ہوں، مسلمانوں کو انہیں ایک عصری شخصیت کے علاوہ انعام ایزدی سمجھنا چاہیے تھا لیکن یہ ایک دردناک المیہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی زبان وبیان کی تمام غلاظتیں ان پر صرف کر دی ہیں، مولانا اسلام کے ترجمان اور مسلمان ثقافت کا نمائندہ نہ ہوتے، صرف سیاست کے کھلاڑی یا مغربی ثقافت کا مجسمہ ہوتے تو ممکن تھا مسلمان ان کے گرویدہ ہوتے اور اغلب تھا نہیں

اس مقام پرستش پر لے جاتے جو اسلام کے نزدیک جائز نہیں، لیکن ہماری اصطلاح میں ہیرو ورشپ کا مقام ہے۔"

پنڈت جواہر لال نہرو

عبد اللہ بٹ پنجاب کے نیشنلسٹ طلبہ میں ایک محرک نوجوان اور پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سیکرٹری تھے۔ انہوں نے "ابوالکلام آزاد" کے نام سے ملک کے بعض چیدہ اہل قلم اور سرفہرست سیاست دانوں کے مضامین کا مجموعہ مدون کیا اور لاہور کے مشہور پبلشر قومی کتب خانے نے شائع کیا، اس کے پیش لفظ پر یکم جون ۱۹۴۳ء کی تاریخ ہے۔ ایک مقالہ بہ عنوان "ایک غیر معمولی سیاست دان" پنڈت جواہر لال نہرو کے قلم سے ہے، یہ کہنا مشکل ہے کہ پنڈت جی نے یہ مقالہ کب لکھا؟ کہاں لکھا؟ بہر حال یہ مقالہ دوسری جنگ عظیم سے پہلے اور بہت پہلے کا ہے۔ احمد نگر کے قلعہ میں پنڈت جی مولانا کے ساتھ تھے، پنڈت جی نے وہاں "تلاش ہند" تصنیف کی تو اس کے دیباچے میں مولانا کی بیکراں علمیت بے پناہ ذہانت اور محیر العقول فطانت کا اعتراف کیا ہے، ایک دوسری جگہ اسی کتاب میں الہلال کے اجتہاد کی ستائش کی اور مولانا کو زبردست خراج ادا کیا ہے، "ابوالکلام آزاد" کے مجموعے کا مضمون حسب ذیل ہے۔

"کسی آشنا ہستی کے متعلق کچھ اظہار خیال کرنا ایک مشکل کام ہے اور پھر یہ مشکل اور بھی مشکل ہو جاتی ہے جب وہ ہستی ایک ایسے سیاسی رفیق کی ہو جو قومی کاموں کی ہمہ قسم ذمہ داریوں اور تکلیفوں میں ساتھی رہی ہو یہی وجہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق قلم اٹھانا میرے لیے کوئی آسان کام نہیں ہے۔ تقریباً ۲۲ سال ہوئے جب پہلے پہل میری ملاقات مولانا سے ہوئی لیکن مولانا کی علمیت قومی کاموں میں عزم و ثبات اور جنگ عظیم کے دوران میں ان کی نظر بندی کے متعلق میں اس سے پیشتر بھی بہت کچھ سن چکا تھا اور ان سے ملنے کے لیے بے تاب تھا۔ عمر کے اعتبار سے ان کا ابھی عالم شباب تھا لیکن ان کے چہرے پر پختہ کاری اور بالغ نظری کے گہرے نقوش تھے اور اس طرح ان کی جگہ بزرگان کانگرس کے درمیان ناگزیر تھی، چونکہ مجھے خود بھی اس وقت کانگرس کے اندرونی حلقوں سے اتنا گہرا ربط و ضبط نہیں تھا۔ اس وقت دور ہی سے مطالعہ کرنے کا موقع ملتا رہا، لیکن اس کے بعد کانگرس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگوں میں بغور مطالعہ کرنے کا موقع ملا اور بالخصوص پچھلے دس بارہ برس سے تو مجھے ان سے بہت گہرا تعلق رہا ہے، اگر ہمارے ایام قید و بند اور میری ہندوستان سے غیر حاضری کے زمانے کو اس میں سے مستثنیٰ کر دیا جائے تو کانگرس کے روزانہ مشاغل

اور اس کی عظیم الشان تجویزوں اور اہم فیصلوں میں مجھے ان کی مسلسل رفاقت کی عزت حاصل رہی ہے کانگریس کی تاریخ میں اور بنابریں ہندوستان کی تاریخ میں بہت کم لوگ اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ کانگریس کی تجاویز وعزائم کی تراش خراش اور وضع قطع میں ان کا زبردست ہاتھ کس طرح مصروف رہا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ پریذیڈنٹ ہوں یا ورکنگ کمیٹی کے ایک عام ممبر ان کی رائیں اور مشورے غیر معمولی طور پر وقیع سمجھے جاتے تھے کیونکہ ان راؤں اور مشوروں کے پس پردہ دانش و تدبر اور فہم و فراست کی غیر معمولی پختگی اور گھلاوٹ روز بروز نمایاں تر ہوتی جا رہی تھی۔

مولانا عام دنیا سے بالکل مختلف اور نرالے سیاست دان ہیں، آپ ایک کامیاب سیاست دان کے طبعی مزاج سے معرا ہیں جو ٹھوس اور بے حس ہو کر حملہ کرنے اور حملہ سہنے کے قابل ہو جاتا ہے آپ کی افتاد طبیعت سرتاسر اس کے خلاف ہے آپ بے حد شرمیلے اور خلوت پسند ہیں۔ مزید برآں آپ کے پہلو میں ایک بہت زیادہ حساس دل ہے باوجود ایک موثر اور باوقار مقرر ہونے کے شور وشغب اور ہنگامہ خیزیوں سے بہت گھبراتے ہیں ان کو عوام میں تقریر کرنے کے لیے آمادہ کرنا کوئی آسان کام نہیں حق یہ ہے کہ ان کی اصل خصوصیت علم و فضل تھی، حالات کی نزاکت نے انہیں عزلت و گردش کی زندگی پر مجبور کر دیا ہے۔

مولانا کو دیکھ کر مجھے وہ فرانسیسی قاموسی اکثر یاد آجاتے ہیں جو انقلاب فرانس سے کچھ عرصہ پہلے وہاں موجود تھے۔ تاریخ اقوام ماضیہ میں ان کا درک و بصیرت یقیناً حیرت انگیز ہے اور یہ وسیع علم ان کے دماغ میں عجیب ضبط و ترتیب کے ساتھ موجود ہے، ان کا ذہن مدلل باضابطہ اور سلجھا ہوا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے منطق و فلسفہ کے کسی قدیم سکول میں تعلیم حاصل کی ہے، ان کا عام رویہ معقولیت پسند ہے۔ بایں ہم ان کے پس منظر میں ایک ایسا انسان ہے جو علم کے پہاڑوں کو نرم و نازک بنا کر کبھی کبھی بلند مگر خشک ظرافت پیش کرتا ہے۔

اگر اس قدر خلوت پسندی اور شرمیلا پن ان کی طبیعت کا خاصہ نہ ہوتا تو وہ ملکی اور قومی کاموں میں اس سے بھی بڑھ کر حصہ لیتے کیونکہ ان کے قلم میں ایک سحر اور ان کے لبوں میں ایک اعجاز ہے جو ہزاروں بے حس دلوں کو حرکت و عمل کی طرف راغب کر سکتا ہے ہم نے یہ اعجاز پرور آواز اب پبلک میں شاذ و نادر ہی سنی ہے اور بدقسمتی سے انہوں نے اپنے جادو نگار قلم سے بھی پہلے کی طرح دلآویزیاں اور رنگینیاں پیدا کرنی چھوڑ

دی ہیں۔

مجھے ہمیشہ تصنیفی زندگی سے ان کی بے اعتنائی پر افسوس ہوا ہے کیونکہ جو زبان وہ لکھتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ پر معنی الفاظ سے مملو ہوتی ہے وہ جو عنفوانِ شباب ہی میں انہوں نے نہ صرف ہندوستان بلکہ مغربی ایشیا، عربی ممالک اور مصر سے خراجِ تحسین وصول کر لیا تھا محض ان کے قلم کی بدولت تھا اور اب تک یہ حالت ہے کہ اگر ان عربی بولنے والے ممالک میں کوئی سیاح ہندوستان سے جاتا ہے تو اس سے ابوالکلام کے متعلق ضرور دریافت کیا جاتا ہے۔ اگر انہوں نے اپنا یہ جہادِ قلمی جاری رکھا ہوتا تو آج ہماری قوم کو صاف اور سلجھے ہوئے طرزِ فکر اور بنابریں صحیح راہِ عمل کے تعین میں کس قدر گراں بہا تقویت نصیب ہوتی ہے۔

یہ محض حالات کا تقاضا ہے کہ وہ دوسرے فرائض اور ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر لینے کے لیے مجبور ہو گئے اور اب فیصلہ تاریخ کرے گی کہ انہوں نے یہ سب کچھ کس طرح بوجوہ احسن ادا کیا۔ لیکن جنہیں ان کو بہت زیادہ قریب سے دیکھنے کی عزت حاصل ہے تاریخ کے فیصلے کے واسطے زحمت کشِ انتظار کیوں ہوں، وہ ہمارے لیے اور ملک و قوم کے لیے قوتوں کا ایک محکم پہاڑ رہے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ ہم نے ان کی رائے سے اتفاق کیا یا اختلاف، ہم یہ ہمیشہ ملحوظ رکھتے رہے کہ ان کی رائے بہت زیادہ وقیع ہوتی ہے اور ہم آسانی سے اس سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ رائے ایک ایسے آزمودہ کار اور صائب دماغ کی پیداوار ہوتی ہے جسے ماضی و حال کے علم و فضل اور غیر معمولی دانش و فراست سے نوازا گیا ہے اور یہ ہمہ گیر قوتیں بہت کم ہستیوں کا حصہ ہوتی ہیں۔

اس عظیم المرتبت ہندوستانی میں نئی پود کے اخذ و جذب کے واسطے بہت کچھ ہے، وہ ایک ہی وقت میں زبردست عالمِ دین اور ہندوستانی اتحاد کے نمائندہ و شارح ہیں۔ ان دو چیزوں کے اتحاد میں انہوں نے مطلقاً دقت محسوس نہیں کی ان سے کم علم لوگوں کو ہندوستانی زندگی کے اختلافات میں ایک باہمی آویزش نظر آتی ہے، لیکن مولانا اس عام سطح سے بہت بلند واقع ہوئے ہیں اور ان بلندیوں سے انہوں نے نہ صرف اس تنوع کے پس پردہ حقیقی اتحاد و یک جہتی کو دیکھ لیا ہے بلکہ یہ بھی معلوم کر لیا کہ ہندوستان اور اس کی مختلف روؤں کی نجات اس ایک یک جہتی اور اتحاد ہی سے وابستہ ہے۔[1]

---

[1] پنڈت جی کے مضمون کا اردو ترجمہ عبداللہ بٹ کی مرتبہ کتاب سے نقل کیا ہے اس وقت انگریزی متن سامنے نہ تھا ورنہ بعض فقرے مزید اختصار کے ساتھ شگفتہ ہو سکتے تھے۔

مولانا وفات پا گئے تو راقم ان کے جنازے میں شمول کے لیے دھلی گیا۔ پنڈت جی اس وقت حزن و یاس کی تصویر تھے، انہیں دفنانے کے بعد پنڈت جی مولانا کی کوٹھی میں آئے تو ہم چند لوگ وہاں تھے، سب احتراماً کھڑے ہو گئے لیکن پنڈت جی کی پریشانی کا یہ حال تھا کہ تسلیمات لیے بغیر یہ کہتے ہوئے مولانا کے کمرے کی طرف بڑھ گئے کہ مولانا سے مل کے ابھی آتا ہوں پھر آٹھ دس منٹ میں واپس آ گئے ان کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے معاً پائیں باغ میں چلے گئے جہاں مولانا صبح و شام ٹہلا کرتے تھے، پنڈت جی کو بے حال دیکھ کر پربودھ چندر ان کے پیچھے ہو گئے۔ پنڈت جی شاخوں سے پوچھ رہے تھے۔

"مولانا تو چلے گئے کیا اب بھی پھول کھلاؤ گی"

اور پھولوں سے کہہ رہے تھے:

"اب بھی کھلو گے —؟" اور روشوں سے کہہ رہے تھے تم ہمیشہ کے لیے ویران ہو گئی ہو"

پنڈت جی واپس آئے راقم سے کہا:

"شورش تم آ گئے جنازے میں شرکت کی؟ کب آئے تھے؟ مولانا سے ملاقات ہوئی؟ اب تو کبھی ملاقات نہ ہو گی"

اور میں ڈھاریں مار مار کر رونے لگا۔ اجمل نے مجھے گلے لگا لیا اور دن ڈھلے جلسہ عام تھا۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریہ ہندوستان جلسے کے صدر تھے، پنڈت جی نے اپنی تقریر کے اشکبار لہجے میں کہا:

"مولانا کی موت نے ہندوستان کو اس کی ایک بڑی عظمت سے محروم کر دیا ہے، وہ ہماری ان شخصیتوں میں سے تھے جو تاریخ کے طلوع سے اب تک ہندوستان نے پیدا کی ہیں ان کے جنازے میں لوگوں کا ہجوم مہاتما جی کی ارتھی سے بھی زیادہ تھا۔ میں سوچتا رہا ایک شخص جو عوام سے ہمیشہ دور رہا اور جس کی سب سے بڑی پریشانی کا نام عوام تھے، اس کے جنازے میں بیکراں ہجوم کہاں سے آیا گویا سارا ہندوستان امڈ آیا تھا۔ میرے دل نے جواب دیا کہ وہ ہندوستان کی عظمت ہونے کے باوجود فی زمانہ ہندوستان کے سب سے بڑے مظلوم انسان تھے، لوگوں نے ان کی مظلومیت کا احساس و اعتراف کیا ہے۔ ہندوستان

میں بڑے بڑے لوگ ہر دور میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ قدرت کا نظام یہی ہے کہ وہ انسانوں کی آبادیوں کو خلاء کا شکار نہیں ہونے دیتی ، ہر دور میں بڑے آدمی پیدا کرتی ہے ، مولانا کی موت سے وہ دروازہ بند نہیں ہوا ، ہندوستان آئندہ بھی بڑے آدمی پیدا کرتا رہے گا البتہ ہم ان کی رحلت سے ایک زبردست خلاء کا شکار ہو گئے ہیں کہ آزادی سے پہلے غلام ہندوستان کی جدوجہد میں اور آزادی کے بعد آزاد ہندوستان کی تگ و دو میں جب بعض مسائل کی پیچیدگیاں ہمارے لیے سدِ سکندری بن جاتی تھیں تو ہم سوچتے تھے کہ آئیے مولانا سے حل دریافت کریں ، حیرت ہوتی کہ وہ دم زدن میں ہر اٹکا دور کر دیتے ہر گتھی سلجھا دیتے ہر سوال کا مسکت جواب فرماتے اور ہر مسئلے کا حل بتاتے ہم ان کی ذہانت سے فیضیاب ہوتے اور ان کی بدولت ہمیشہ ناؤ منجدھار سے نکال کر سلامتی و ثبات اور فراست و فہم کے کناروں پر لے چلتے ہمارا غم ان کی مفارقت کا غم تو ہے لیکن ایک بڑا غم یہ ہے کہ ہم ایک عظیم دانش کی راہنمائی سے محروم ہو گئے ہیں۔"

راقم نے وزارتی مشن کے زمانہ میں میر احمد حسن شملوی کے ہاں پنڈت جی سے مولانا سے متعلق عرض کیا کہ "عوام سے براہ راست خطاب نہیں کرتے ، شاید ان سے متنفر ہیں اور شاید عوام کے ان سے کھچاؤ کی وجہ یہی تنفر ہے ، ملک میں ان کے جاں نثار عقیدت مندوں کی ایک بڑی جماعت ہے لیکن ان کے لیے بھی مولانا سے ملنا جوئے شیر سے کم نہیں ؟ اگر مولانا عوام سے منقطع نہ ہوتے تو ہندوستان کی سیاست مختلف ہوتی۔"

پنڈت جی نے کہا ،

"مولانا کی طبیعت کا ایک سانچہ بن چکا ہے اس کو توڑنا یا موڑنا مشکل ہے ان کے علم کی بے پناہی نے ان میں ایک شانِ کجکلاہی پیدا کر دی ہے اور وہ اس سے کسی حال میں بھی دستبردار نہیں ہوتے ، اپنی زبان پر کسی کی شکایت نہیں لاتے اور بڑے سے بڑا حادثہ دل پہ گزار لیتے ہیں۔ مسلمان عوام نے اپنے سیاسی خواص کی پیروی میں ان کے متعلق جو زبان بولی ہے اور جس بدگوئی کے انبار لگائے ہیں وہ سب کچھ انتہائی شرمناک ہے۔ ایک انسان جو مستعمل معنوں میں سیاست دان نہ ہو ، علم کی نزاکت کے سانچے

میں ڈھلا ہو، اور ادب کی نفاست پر اس کے مزاج کی اساس ہو اس کے احساس کی پژمردگی کا اندازہ عوام نہیں کر سکتے۔ عوام اگر جوش و غضب کی طاقت ہیں تو مسلمانوں کی اپنی زبان میں کالانعام بھی ہیں۔ وہ تعبیر سے شاذ ہی واسطہ رکھتے ہیں ان کی عمومی عادت تخریبی ہوتی ہے۔ میں ایک حد تک تاریخ اسلام کا طالب علم ہوں، اور اس کے مطالعے نے مجھے اس خیال کے بنانے میں مدد دی ہے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ اپنے دین کی عظمتوں سے ان کی زندگی میں شرمناک برتاؤ کیا ہے پھر ایک زمانہ گزر جانے کے بعد تاریخ نے ان کی عظمت کا اعتراف کیا اور ان کے علم سے راہنمائی حاصل کی ہے۔

بہرحال مولانا عوام سے مایوس نہ ہوتے تو ممکن تھا تاریخ مختلف ہوتی۔ لیکن مولانا عوام کے ہو جاتے تو وقت کی ستائش انہیں ضرور حاصل ہوتی لیکن پھر شاید وہ ابوالکلام نہ ہوتے۔"

سردار ولبھ بھائی پٹیل

ڈاکٹر راجندر پرشاد اور سردار ولبھ بھائی پٹیل برلا ہاؤس میں مقیم تھے، مولوی عزیز الرحمٰن لدھیانوی، خلف الرشید مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے ان سے وقت لیا اور اس طرح ملاقات ہو گئی، ہم نے باتوں باتوں میں بہت کوشش کی کہ سردار صاحب بولیں لیکن وہ گھنٹہ بھر ہماری ہی باتیں سنتے رہے خود ایک حرف تک نہ کہا، ہم نے محسوس کیا کہ ہم پتھر میں جونک لگا رہے ہیں، کوئی ہفتہ بعد شری برجو دھ چندر جی کی معیت میں پھر ان سے ملاقات ہوئی تو مولانا آزاد کے متعلق میرے سوالات کی نوعیت نے انہیں جواب دینے پر آمادہ کیا۔

میں نے کہا:

"سردار صاحب اس میں کہاں تک صداقت ہے کہ وزارتی مشن کے مذاکرات میں مولانا کا مسلمان ہونا سیاستہ درست نہیں۔ مسلم لیگ ان کی پوزیشن خراب کرتی اور مسلمانوں کی واحد نمائندگی کے زعم میں ان کی شخصیت کو ماند کرتی ہے۔ ادھر وزارتی مشن باطنی طور پر کانگرس کے ہندو راہنماؤں سے بات کرنا چاہتا ہے تاکہ ہندو مسلم قضیہ کے متعلق اپنے ذہن کے خطوط سیدھا کر سکے۔ کانگرس بہرحال انسانوں ہی کا مجموعہ ہے، مثلاً آپ کے متعلق خود کانگرس کے بعض ذمہ دار صوبائی نمائندوں کی طرف سے تاثر دیا جا رہا ہے کہ آپ انتقال اختیارات یا حکومتی مذاکرات کے اس مرحلے میں مولانا کی ترجمانی کو بہ وجوہ خرابی اور خلل کا موجب خیال کرتے ہیں؟"

سردار صاحب مسکرائے کہنے لگے۔

"ہر شخص اپنے خیالات کا مجاز ہے، یہ مرحلہ ہی ایسا ہے کہ طرح طرح کے خیالات آوارہ ہو کر اُڑ رہے ہیں، مجھ میں اور مولانا میں بہت زیادہ ذہنی فاصلہ ہے لیکن وہ بعض قومی امور سے متعلق نظریاتی چیز ہے ورنہ مولانا کے متعلق جہاں تک ہمارے اعتماد کا تعلق ہے ہم ان کی اصابت فکر اور بے داغ حب الوطنی پر شبہ نہیں کر سکتے، اس ملک کے مختلف مکاتیب فکر کی لیڈرشپ ابوالکلام کے دماغ و دل کی مالک ہوتی تو ہم بہت پہلے آزاد ہو چکے ہوتے اور ہندو مسلم مسئلہ سرے سے پیدا ہی نہ ہوتا، مجھے مولانا کے متعلق کوئی شکایت ہے تو یہ کہ وہ ترکی بہ ترکی جواب نہیں دیتے، مولانا نے آج تک مسٹر جناح کے متعلق ایک ادنیٰ اسا ناگوار کلمہ بھی نہیں کہا وہ شاید بھونڈے الفاظ جانتے ہی نہیں، مسٹر جناح نے انہیں ملنے سے انکار کیا تو یہ ان کی مرضی کا مسئلہ تھا۔ لیکن گالی دینا ایک ایسے شخص کو زیب نہیں دیتا جو اپنے تئیں واحد نمائندہ کہلاتا ہے" ہم نے مولانا سے مسٹر جناح کی اس گالی کا منہ توڑ جواب دینے کے لیے اصرار کیا تو ان کا جواب تھا۔

"مسٹر جناح نے اس کلمہ استہزا سے اپنی عزت میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ ان کا خیال ہو کہ اس طرح ان کی طبیعت خوش رہتی ہے تو انہیں اپنی صحت کی بحالی کے لیے ان کلمات کو وٹامن کے طور پر استعمال کرنا چاہیے، انسان کو اپنی تندرستی کے لیے اُن چیزوں کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے جو مذہب نے حرام ٹھہرائی ہیں، مسٹر جناح کو بھی اپنی تندرستی کے لیے ان چیزوں کے استعمال کا حق پہنچتا ہے۔ دوسری چیز اس ضمن میں مولانا نے یہ کہی کہ ہم ذاتیات کی لڑائی چھیڑ کر صحت یاب نہیں ہو سکتے۔ اور نہ قومی مسائل اس طرح حل ہوتے ہیں۔

بدمزگی کا علاج بدمزگی نہیں اس طرح مسائل کا راستہ ہونا مشکل ہے۔ قربانی جان و مال کے ایثار ہی کا نام نہیں، حق و صداقت کے لیے عزت و شہرت کا تیاگ دینا بھی قربانی ہے۔ مسٹر جناح کی درشتی نے قوم کو غلط راہ پر ڈال دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ سیادت کا طرز عمل معتقدین کے لیے لازمہ تقلید ہو جاتا ہے، پاکستان بن گیا تو اس ساری لیڈرشپ کو

جو مسٹر جناح کے اس کلمہ استہزا سے خوش ہوئی ہے، خود اس مقتل سے گزرنا ہوگا۔ وہ محسوس کریں گے کہ ہم الف ننگا مخلوق کے بازار سے گزر رہے ہیں۔ رہا وزارتی مشن سے متعلق یہ خیال کہ وہ مولانا سے بات چیت کرتے ہوئے کوئی روک محسوس کرتا ہے تو یہ غلط ہے۔ وزارتی مشن جانتا ہے کہ مولانا کو کانگریس کا پورا پورا اعتماد حاصل ہے اور مولانا جو کچھ ان سے کہتے اجتماعی اعتماد سے کہتے ہیں، مولانا سے کسی مسئلے میں اختلاف ہو تو آپس میں ہو سکتا ہے، لیکن وزارتی مشن کے مذاکرات میں نہیں۔ مولانا ہندوستان کی ترجمانی کر رہے ہیں، انہوں نے وزارتی مشن پر ہندوستانی ذہانت کا نقش جما دیا ہے۔"

راقم نے سوال کیا:

سردار صاحب آپ میں اور مولانا میں ذہنی فاصلے کیا ہیں؟ سردار صاحب کے چہرے پر کھلی مسکراہٹ پھیل گئی، کہنے لگے۔

"وہ مسلمان ہیں میں ہندو ہوں، کیا یہ ذہنی فاصلہ نہیں"؟ پھر کھل کے ہنستے ہوئے کہا "لیکن ہندوستان کی آزادی کے حصول کی جدوجہد نے ہمیں اس طرح یکجا کیا ہے کہ جو لوگ ہمارے ذہنی فاصلے اجاگر کرنا چاہتے ہیں وہ ہمارے درمیان آرا کا اختلاف اچھال سکتے ہیں لیکن کوئی تنازعہ، تکرار یا ٹکراؤ پیدا نہیں کر سکتے، ہمیں غیر ملکی غلامی کے خلاف جدوجہد نے یک جان دو قالب کر دیا ہے۔ اس میدان میں ہم متحد العمل ہیں، مولانا سے میرے یا میرے بعض ساتھیوں کے اختلاف کی وجہ "گاندھی ازم ہے"۔ ہم گاندھی جی کے پیروکار ہیں اور انہیں پراچین ہندوستان کے رشیوں کی طرح مانتے ہیں، مولانا گاندھی ازم کے پیرو نہیں وہ قومی جدوجہد میں گاندھی جی کے ساتھی ہیں ان سے اختلاف بھی کرتے ہیں اور اتفاق بھی، بعض اہم مسائل میں انہیں بنیادی اختلاف ہوتا ہے، مثلاً اہنسا (عدم تشدد) گاندھی جی کا دھرم ہے، مولانا اس کو جدوجہد آزادی میں بے بس ہندوستان کا ہتھیار کہتے ہیں۔

سردار پٹیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ہم لوگ گاندھی جی کا مجوزہ لباس پہنتے ہیں اور ہم میں سے ننانوے فی صد قومی نشان کے طور پر گاندھی ٹوپی رکھتے ہیں۔ لیکن مولانا اس باب میں بھی مغلئی تہذیب کے دلدادہ ہیں۔ وہ مسلمانوں کی سی اچکن اور مسلمانوں

کی سی ٹوپی پہنتے ہیں۔ خان عبدالغفار خان اور ڈاکٹر سید محمود کانگرس کی مجلس عاملہ کے مستقل ممبر ہیں، انہوں نے اپنے تئیں گاندھی جی کے سانچے میں ڈھال لیا ہے، ڈاکٹر سید محمود ہمیشہ گاندھی ٹوپی پہنتے ہیں، لیکن مولانا کے ذہن میں اس کا تصور ہی نہیں۔ بات معمولی ہے لیکن مولانا اس طرح اپنی انفرادیت قائم رکھنے اور اپنے مخصوص کلچر سے الگ نہیں ہوتے۔ ان کی نشست و برخاست تمام تر مشرقی انداز کی اسلامی وضع قطع رکھتی ہے۔ بہر حال مولانا اس ہندوستان کی رواداری اور تحمل کے نمائندہ ہیں جو مغلوں کے عہد کی امتیازی خصوصیت تھی۔"

"مولانا کے بارے میں آپ کی اجتماعی رائے کیا ہے؟" میں نے سردار صاحب سے آخری سوال کیا۔

سردار صاحب نے کہا:

"مولانا کی ذہانت، فطانت، فراست، تدبر، علم اور ان سب کی گیرائی و گہرائی مجھ ایسے اکل کھرے انسان کے ردّ و قبول کی محتاج نہیں، وہ دمشق، بغداد، اور دھلی کی مسلمان سلطنتوں کے عہد کمال کی عبقریت کا آخری وجود ہیں، انہیں قدرت نے ہندوستان کے زمانہ ابتلا میں پیدا کیا ہے، وہ ہندوؤں میں ہوتے تو مہاتما تلک اور مہاتما گاندھی ہوتے، ہندو عوام انہیں رشیوں کی طرح پوجتے لیکن مسلمانوں نے ان سے وہ سلوک کیا ہے جو کلیسا اور مذہب کے معرکہ میں یورپ کے کوتاہ فکر پادریوں نے نئی دنیا کے رہنماؤں سے کیا تھا۔"

راقم نے عرض کیا:

"جان گنتھر نے اندرون ایشیا میں آپ کو راجن بابو کو اور مولانا کو کانگرس کے ارباب ثلاثہ قرار دیا اور لکھا ہے کہ آپ اس جسم واحد کا بازو مولانا اس کا دماغ اور راجندر پرشاد اس کا دل ہیں۔"

سردار صاحب مسکرائے۔ راجن بابو نے کہا۔

"مولانا کی شخصیت بلاشبہ کانگرس کے وجود میں دماغ کی ہے۔"

میں نے یوسف مہر علی کے حوالے سے عرض کیا کہ انہوں نے مولانا کے سوانحی خاکے میں لکھا ہے۔

"آپ کی شخصیت بالکل ان قاموسیوں کی طرح ہے جنہوں نے انقلاب فرانس کو اپنی تحریروں

میں ڈھالا تھا۔

- آپ گاندھی جی کے فلسفۂ عدم تشدد کے عقیدۃً حامی نہیں بلکہ ہندوستان کی آزادی کے لیے لیے بس قوم کا اسلحہ سمجھتے ہیں۔
- ہندوستان کے معمر سیاست دانوں میں سب سے زیادہ انتہا پسند ہیں۔ کانگرس میں دائیں اور بائیں بازو کے لیے نقطہ اتحاد ہیں۔
- آپ ایسے انسانوں کا ہر ملک میں عموماً اور ہندوستان میں خصوصاً فقدان ہے۔"

سردار پٹیل نے کہا :

"یوسف مہر علی نے غلط نہیں لکھا"

راجن بابو بولے :

"ان کا حرف حرف درست ہے"

ڈاکٹر راجندر پرشاد ڈاکٹر راجندر پرشاد کا اردو خط اور اسلوب تحریر نہایت عمدہ تھا، اسی طرح بات چیت میں ان کا لب ولہجہ نستعلیق تھا، راقم نے مولانا کے متعلق عرض کیا کہ وہ بعض سوالات کے جواب کو خوبصورت الفاظ میں ٹال جاتے ہیں۔ راجن بابو بولے :

"وہ ابوالکلام ہیں"

راقم نے مولانا سے متعلق راجن بابو کا مجموعی تاثر دریافت کیا کہ اس طویل رفاقت میں آپ نے ان کے متعلق کیا رائے قائم کی ہے۔

جواباً کہا۔

"ہم لوگ گاندھی وادی ہیں مہادیو ڈیسائی مہاتما جی کے سیکرٹری تھے انہوں نے مولانا سے متعلق کتاب لکھی ہے اس کے علاوہ دو چار مضمون بھی ملک کے بڑے بڑے روزناموں میں سپرد قلم کئے۔ فی الجملہ ان کے تاثرات ہم سب کے تاثرات ہیں۔ ہم گاندھی وادی مولانا کے متعلق وہی محسوس کرتے اور رائے رکھتے ہیں جو مہادیو ڈیسائی نے بیان کیا ہے کہ :

۱۔ ان کی شخصیت میں اتنا جذب اور کشش ہے کہ ان کی ہر جگہ تعظیم کی جاتی ہے۔

۲۔ وہ کانگرس میں اپنی مثال نہیں رکھتے ان کے اعجاز بیان سے انسان مسحور ہو جاتا ہے۔

۳۔ ان سے بڑھ کر کانگریس میں اور کوئی معاملہ فہم سیاست دان اور سیاسی جوڑ توڑ کرنے والی شخصیت نہیں ہے۔

۴۔ مہاتما جی سیاسی زندگی کے انتہائی خطرناک مراحل میں ہمیشہ ان سے رجوع کرتے ہیں۔

۵۔ موتی لال نہرو اور سی آر داس ان سے مشورہ کیے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتے تھے۔

۶۔ نمائش و ہنگامہ سے ہمیشہ محترز رہتے ہیں۔

۷۔ علم اللسان میں اپنی نظیر آپ ہیں۔

۸۔ گاندھی جی ان کی زبان کو ہندوستان کی لینگوا فرینکا کہتے ہیں۔

۹۔ ان کی لائبریری انگریزی اور فرانسیسی کتابوں سے بھری رہتی ہے۔ فلسفہ، مذہب، سائنس سیاست، ادب، شاعری، ناول اور عمرانیات وغیرہ کے جدید و قدیم اہل قلم کی معیاری کتابیں ان کے مطالعے میں رہ چکی اور رہتی ہیں جو نئی کتاب ثقہ اہل قلم سے نکلتی ہے، وہاں کے پاس فوراً چلی آتی ہے وہ صرف کتاب دوست ہیں۔

۱۰۔ سحر خطابت سے عوام پر جادو کر دیتے لیکن عوام سے کنی کتراتے اور ملاقاتیوں سے پرہیز کرتے ہیں۔

۱۱۔ عوام سے ان کے اجتناب کا واحد سبب ان کا تبحر علمی ہے، وہ قلم کاغذ اور کتاب کی تنہائی کو عظیم سے عظیم مجمع پر ترجیح دیتے ہیں۔

۱۲۔ انہیں اپنے کردار کی عرشی رفعت پر غیر متزلزل اعتماد ہے۔

۱۳۔ وہ کسی حالت میں بھی اپنی انفرادیت ترک نہیں کرتے۔"

راجن بابو نے مہادیو ڈیسائی کی ان تحریروں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ:

"ہم لوگ گاندھی وادی یعنی مہاتما جی کے پیرو ہیں۔ لیکن مولانا مہاتما جی کے ساتھی اور ان کے رفیق جہد ہیں، اپنی بے پایاں انا کے باعث وہ بڑے سے بڑے شخصی حریف کی خرافات کا جواب نہیں دیتے، ان کے نزدیک ذاتیات کی جنگ ناقابل اعتنا ہے۔ اس کو بدرو میں روڑے پھینکنے کے مصداق سمجھتے ہیں۔ جس کے چھینٹے اڑ کر اپنے ہی بدن پر آتے ہیں۔"

مولانا کے متعلق راجن بابو کا ایک مضمون "الجمعیۃ دہلی" کے ابوالکلام نمبر میں شائع ہوا تھا اس میں لکھا تھا کہ:

۱۔ وہ ستمبر ۱۹۲۰ء میں پہلے پہل مولانا سے متعارف ہوئے، جب انہوں نے تحریکِ خلافت کے شروع میں مہاتما جی اور مولانا محمد علی کے ساتھ بہار کا دورہ کیا، تب انہیں ایک سحر طراز خطیب کی حیثیت سے دیکھا کہ اُن کی آواز دلوں کی گہرائی میں اتر کر عوام کے خوابیدہ جذبات کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر بیدار کر دیتی، غرض ان کی تقاریر سے چہار جانب آزادی کا طوفان اُمڈ آیا تھا۔

۲۔ مہاتما جی ۱۹۲۱ء کے شروع میں قید کیے گئے تو کچھ عرصہ بعد کانگرس کے ممتاز راہنماؤں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ کانگرس کو لیجسلیٹو کونسل کے انتخابات میں حصہ لینا چاہیے یا نہیں۔ پہلے کلکتے کے ہنگامی اجلاس میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ کیا گیا۔ پھر ناگپور اور احمد آباد کے اجلاس میں اس کی توثیق کی گئی، گیا کانگرس میں شرکت و مقاطعہ دونوں کے حامیوں نے طاقت کا مظاہرہ کیا۔ لیکن مقاطعے کے حامی جیت گئے، دونوں طرف کانگرس کے ممتاز راہنما تھے اور ان کے اختلاف سے کانگرس کو زبردست دھچکا لگنے کا امکان تھا۔ مولانا آزاد اس قضیئے کو نپٹانے کے لیے کانگرس کے سپیشل اجلاس منعقدہ دہلی (۱۹۲۳ء) کے صدر منتخب کیے گئے۔ وہ دو تین سال ہی میں کانگرس کے صدر ہو گئے اس کی وجہ ان کا زورِ خطابت، ان کی غیر معمولی ذہانت، دانشمندی، معاملہ فہمی، متضاد عناصر کو یکجا کرنے کی قوت اور مختلف الخیال طبیعتوں میں ہم آہنگی و یکسانیت پیدا کرنے کی بے نظیر صلاحیت تھی۔ ان کی انہی خوبیوں نے ان کے رفقاء کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا تھا۔

۳۔ ہمیں تحریکِ آزادی کی طویل مدت میں ان کی حب الوطنی، ایثار، قربانی اور مضبوط قوت فیصلہ کا بار بار اعتراف کرنا پڑا اور یہ انہی کا کمال تھا کہ ۱۹۲۳ء میں چینجرز اور نو چینجرز کے خیالات کا مساوی طور پر احترام کیا گیا اور جانبین میں مفاہمت کا راستہ پیدا ہو گیا۔

۴۔ وہ اپنے عقائد پر غیر متزلزل چٹان کی طرح جمے رہتے اور کسی طرح ان سے ہٹتے نہیں تھے۔

راقم نے استفسار کیا کہ آپ نے مہاتما جی کے متعلق لکھا ہے کہ ان کا ذکر کرنا ایسا ہی ہے جیسے تیرتھ یاترا کرنا، تو کیا مولانا کے متعلق آپ نے ایسی کوئی رائے قائم کی ہے؟

بابو جی نے کہا۔ مہاتما جی کا تذکرہ بالکل دوسری بات ہے۔ وہ پراچین ہندوستان کے

رشیوں کا بدل ہیں ان کے متعلق ہمارے تاثرات عقیدت کی انتہا پر ہیں۔ مولانا ہماری جدوجہد کے پر استقامت قافلے کی آبرو ہیں، انہیں مل کر ہمیں تہذیب و شائستگی اور علم و فکر کی معراج سے ہمکلامی کا احساس ہوتا ہے، وہ اپنے علمی تبحر کی دھونس نہیں جماتے اور نہ کسی کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں، لیکن وہ کسی عنوان یا شخصیت سے مرعوب بھی نہیں ہوتے، وہ عمر بھر کے ساتھیوں سے ان کی آراء میں اختلاف بھی کرتے ہیں، لیکن کبھی تصادم کی طرف نہیں آتے، وہ رفقاء کو اپنے طرزِ استدلال کے تسلسل سے قائل کرتے اور اپنے افکار کی عمارت اٹھاتے ہیں، کئی معاملوں میں بالخصوص جب وہ مہاتما جی کے نقطۂ نگاہ سے اختلاف کرتے ہیں تو ہمیں قدرتی طور پر ان سے اختلاف ہوتا ہے لیکن ان کے اختلاف کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ دلوں پر گراں نہیں گزرتا، وہ گفتار کی شیرینی سے پتھروں کو موم کرتے اور شدید سے شدید اختلاف میں اپنے خیالوں کی ذہنی فضا پیدا کر لیتے ہیں، یہ خوبی صرف انہی میں ہے کہ خیالات کو جگمگا سکتے ہیں۔ اگر کانگرس کی عوامی فضا ان کی سیادت میں ڈھلی ہو اور وہ شخصاً عوام میں تحلیل ہو سکیں تو ان کے خیالات سے اختلاف کرنا مشکل کیا ناممکن ہو لیکن وہ عوام کی طاقت سے زیادہ اپنی ذہانت اور اپنے تبحر پر بھروسہ کرتے ہیں، انہیں عوام کی جذباتی اور عمومی فضا سے زیادہ اپنے علم کی گہرائی اور گیرائی پر اعتماد ہے، وہ جلوت کے نہیں خلوت کے انسان ہیں۔ اور عوام کے جھنجھٹ میں پڑنے کی بجائے لیڈر شپ کو رام کرتے ہیں، ان کے خیالوں کو عوام تک پہنچانا اس لیڈر شپ کا فرض ہے۔ وہ یہی محسوس کرتے اور یہی خواہش رکھتے ہیں۔"

راقم نے ایک اور سوال کیا۔

"جب سبھاش چندر بوس کانگرس کی صدارت سے مستعفی ہوئے، اور آپ نے صدارت کا چارج لیا تو سبھاش بابو کا غصہ مولانا کے خلاف زیادہ تھا، وہ اپنے بیانوں میں انہیں مغل اعظم کہتے اور اس طرح بیان دیتے گویا ان سے جو سلوک ہوا اس کے مسئول مولانا ہیں، مولانا محمد علی جوہر کانگرس سے الگ ہوئے تو ان کا غصہ بھی مولانا کے خلاف تھا۔ قائد اعظم بھی مولانا ہی کو معتوب کرتے ہیں آخر اس کی وجہ کیا ہے؟"

باپو جی بولے۔

"اس کی وجہ مولانا کی ہمہ گیر شخصیت اور ان کا علم ہے۔ مولانا پبلک جواب کبھی نہیں دیتے اور نہ تو للکار جانتے ہیں۔ وہ اپنے منفرد مقام سے قومی، سیاسی اور جماعتی نوعیت کے مسئلوں کو صاف کرتے ہیں تو ان کی ذہانت کا ٹکراؤ دوسرے سے ہوتا اور ان کے لیے غصے کا موجب بنتا ہے۔ سبھاش بابو محسوس کرتے تھے کہ مولانا کی ذہانت نے ان کے وار کو روک کر کند کر دیا ہے وہ ان کے خلاف ہو گئے۔ مولانا محمد علی کا ٹکراؤ مولانا آزادؒ کی شخصیت سے نہیں ان کے علم سے تھا اور وہ اس کی تاب نہ لا سکتے تھے، قائد اعظم محض سیاست دان ہیں، وہ مہاتما گاندھی کے مدمقابل ہو کر لڑنا چاہتے ہیں، مولانا ان کے ہم مذہب ہیں اور انہیں اسلام کے بارے میں بحر بیکراں کا درجہ حاصل ہے اور اسلام کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال نہیں کرتے۔ قائد اعظم نے مسلمان عوام کی اسی عصبیت کو سیاسی اسلحہ بنا لیا ہے اور یہی قائد اعظم کے مولانا سے ٹکراؤ کا سبب ہے:

راجن بابو نے بالآخر کہا:

"مولانا ہندوستان کی پندرہ سو سال کی تاریخ کے اسلامی و آریائی ارتقاء کا نچوڑ ہیں۔ آج ہندوستان کی عمارتوں میں سب سے زیادہ خوبصورت عمارت تاج محل ہے۔ اور انسانوں میں سب سے زیادہ خوبصورت انسان ابوالکلام ہیں، میں آپ کے اس قول سے متفق ہوں کہ ان کے ہم مذہبوں نے ان کی قدر نہیں کی، فی الواقعہ وہ ہندوستان کے شوالے میں وہی اذان ہیں، جو گنگا و جمنا کے کناروں پر قافلہ اسلام کی آمد سے پہلی بار گونجی تھی"

مولانا ظفر علی خانؒ

مولانا ظفر علی خان پنجاب کے استعماری ویرانے میں کلمۃ الحق کی پہلی صدا تھے، حقیقت یہ ہے کہ "زمیندار" نے جو مولانا کے والد کی رحلت کے بعد ان کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا، ایک نیا پنجاب پیدا کیا اور مسلمانوں کو ایک ایسا ولولہ دیا جس سے پنجاب ہی نہیں بلکہ سرحد و سندھ کے علاقے بھی محروم تھے، مولانا نے "زمیندار" کے مینارہ اسلوب سے بے باکی و بے خوفی کی روشنی پھیلائی وہ قلم کے دھنی اور زبان کے غنی تھے۔ ان کے قلم اور زبان میں عوام کے لیے جادو تھا، وہ "آناً فاناً" ایک تحریک پیدا کر دیتے، ان کے مزاج میں ٹھہراؤ اور طبیعت میں جماؤ ہوتا تو قلم و زبان کے اعتبار سے پنجاب کے ابوالکلام ہوتے، لیکن ان کے دل و دماغ پر شاعری نے ایسا قبضہ کیا تھا کہ وہ

سیاست داں سے کہیں زیادہ شاعر تھے۔ تقریر میں ان کا اسلوب عوامی تھا، وہ جذبات سے کھیلتے اور جذبات کے لیے جیتے تھے۔ نظم میں صحافتی شاعری کے موجد اور انشاء میں اخباری زبان کے مجتہد تھے۔ تحریک خلافت کے آغاز میں ہندوستان کے مسلمانوں کو جو نئی لیڈرشپ حاصل ہوئی اس کی تین شخصیتوں میں سے ایک تھے، مولانا آزادؒ، مولانا محمد علیؒ اور مولانا ظفر علیؒ تینوں قلم و زبان کے شہسوار تھے، لیکن تینوں کی معرکہ آرا شخصیت میں بعد المشرقین تھا۔ تینوں رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ مولانا محمد علیؒ اور مولانا ظفر علیؒ نے تو مولانا آزادؒ پر سیاسی اور ذاتی حملے بھی کئے لیکن مولانا آزادؒ نے چپ ہی سادھی اور چپ ہی کے ہو گئے۔ مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی آپس میں بھڑ گئے۔ تو بلا کا رن پڑا۔ لیکن باہمی ٹکراؤ کے باوجود تینوں کے قلم و زبان میں استخلاص وطن اور سرفرازی اسلام کے متعلق حیرت انگیز مماثلت تھی۔ تینوں مسلمانوں کی سربلندی چاہتے۔ لیکن تینوں کے راستے الگ الگ تھے۔ مولانا آزادؒ کی طبیعت میں علم کا ٹھہراؤ تھا، مولانا محمد علی کی طبیعت میں جذبات کا بہاؤ، مولانا ظفر علی خان بارودی طبیعت کے انسان تھے۔ اگر تینوں مہاتما گاندھی، سردار پٹیل اور پنڈت جواہر لال کی طرح ایک ہوتے تو اغلب تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی ناؤ کنارے پر آلگتی اور وہ اس سود و زیاں کا شکار نہ ہوتے جس کا حاصل عوامی سیاست کی عمومی بدپرہیزی کے باعث سانحہ ہو گیا۔ یہ ایک حادثہ تھا جو مسلمانوں کو پیش آیا اور ہندوستان میں ان کی سیاست مختلف کوٹھیوں سے کرمغرب و تقسیم کا شکار ہو گئی۔ مولانا محمد علی سے تو راقم کو شخصی نیاز نہیں رہا کہ ان کی رحلت کے وقت راقم ساتویں یا آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا، لیکن مولانا ظفر علی خان سے شرف تلمذ حاصل کیا، خیر سے ماند شے تک ان کے ساتھ شریک سفر رہا، ہندوستان کی سیاست اور مختلف شخصیتوں کے بارے میں جب کبھی ان سے بات چیت ہوتی تو ان نجی محفلوں میں قلم و زبان کی تیزی سے پرہیز کرتے۔ ان کے تبصرے نہایت نپے تلے اور گلے بندھے ہوتے۔ کئی دفعہ مولانا آزادؒ کا ذکر آیا تو ان کے متعلق نہایت وقیع رائے ظاہر کی، ایک دفعہ کہیں سفر پر جا رہے تھے، عملہ نے اصرار کیا تو جاتے جاتے ایک طویل نظم بالبداہت ارشاد فرمائی، مطلع تھا ؎

مجھے بھی انتساب ہے ادب کے اس مقام سے
ملی ہوئی ہے جس کی حد قدم گہ نظام سے

دسواں یا گیارھواں شعر تھا ؎

جہاں اجتہاد میں سالف کی راہ گم ہوئی
ہے تجھ کو اس کی جستجو تو پوچھ ابوالکلام سے

راقم ہمراہ تھا۔ استفسار کیا:

"مولانا ابوالکلام کے متعلق آپ نے جو شعر کہا ہے وہ محض قافیہ کی بندش ہے یا فی الواقعہ آپ یہی سمجھتے ہیں؟"

فرمایا:

"جو کچھ میں نے کہا، وہ لفظاً ہی نہیں معناً بھی درست ہے۔"

عرض کیا:

"کیا مولانا ابوالکلام تفسیر قرآن میں اسلاف کے پیرو اور اس عہد کے مجتہد ہیں؟"

فرمایا:

"بالکل، اللہ تعالیٰ نے قرآن فہمی کے باب میں انہیں خاص ملکہ عطا کیا ہے، وہ زمانہ اور اس کی فکری تحریکوں کو بخوبی سمجھتے اور قرآن کو ہر زمانے کی پیچیدگیوں کا حل قرار دے کر انسانی معاشرے کو اس کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں۔ وہ قرآن کی ابدی دعوت پر نظام کائنات کی اساس رکھتے ہیں، ان پر بفضل ایزدی علم القرآن کے دروازے اس طرح کھلے ہیں کہ ان کے لیے کوئی سی راہ مسدود و منقطع نہیں، ان کی ادا قرآن کی ادا ہے۔"

راقم: "مولانا کے ترجمہ و تفسیر میں بڑی خوبی کیا ہے؟ اور وہ کونسا پہلو ہے جو دوسرے تراجم و تفاسیر کے مقابلے میں منفرد ہے؟"

مولانا:

"ان کے ترجمہ و تفسیر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ قرآن ہی کی زبان میں خطاب کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے ان کے الفاظ الوہیت اور نبوت کا جامہ پہنے ہوئے ہیں اور یہ صرف اللہ کی دین ہے، دوسرے تراجم جو اب تک ہندوستان میں ہوئے ہیں، وہ قرآن کے الفاظ میں لغوی و لسانی ترجمہ ہیں، ان میں قرآن کے شکوہ کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ عربی الفاظ کا ترجمہ اردو الفاظ میں کیا گیا ہے، مطالب کی طاقت و پہنائی زائل ہو گئی ہے۔ آزاد کی تفسیر

محض مقامی یا محض اسلامی نہیں، بین الاقوامی و بین الملّی ہے، وہ الہیاتی زبان میں کائنات کو خطاب کرتے ہیں۔"

راقم: "ادب میں ان کا مقام کیا ہے؟"

مولانا:

"فی الواقعہ وہ ایک سحرطراز ادیب ہیں، ان کا قلم تلوار ہے، وہ قرن اوّل کے غزوات کی چہرہ کشائی کرتے، اور عصرِ حاضر کی رزم گاہوں میں مسلمانوں کی فتح مندیاں ڈھونڈتے ہیں۔ ان کا اسلوب بیان بے مثال ہے آدمی ان کے الفاظ سے مسحور ہوتا اور مطالب میں ڈوب جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ نکتہ آفرینی کے اعتبار سے اس وقت ہندوستان بھر میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ قلم کی نزاکت اور قلم کی طاقت مبدء فیاض نے ان کے لیے ارزاں کر دی ہے۔"

راقم: "ان کی زبان عوام کے لیے مشکل ہے؟"

مولانا:

"کوئی زبان مشکل نہیں ہوتی، سوال ہمارے علم کا ہے کہ ہم کس حد تک اس سے بہرہ یاب ہیں۔ ان کی زبان قرآن کی زبان ہے، جو قرآن نہیں جانتے یا اس کی زبان سے نابلد ہیں ان کے لیے ان کی زبان فی الواقعہ مشکل ہے، ورنہ وہ آبشار کی طرح بہتی ہوئی اور چاندی کی طرح کھلی ہوئی زبان لکھتے ہیں، وہ ہمارے عظیم ماضی کی زبان و بیان کے وارث ہیں۔"

راقم: "ان کے عوام سے کٹ کے رہنے کی وجہ کیا ہے؟"

مولانا:

"ہر طبیعت کا ایک اسلوب ہوتا ہے ان کی طبیعت عوام گریز واقع ہوئی ہے۔"

راقم: "مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت ان کی سیاست سے متفق نہیں، وجہ کیا ہے

(۱۹۳۶ء کی ایک مکالمت ہے)

مولانا:

"مسلمانوں کی عمومی تاریخ ہی یہ ہے کہ جن کی محراب عظمت میں ان کی موت کے بعد جبین اعتراف جھکاتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی میں ان کے اعراض و انکار کی زد میں رہتے

اور ان کے استبداد کی بھٹی میں پھکتے ہیں پھر جب وہ اللہ کو پیارے ہو جاتے تو ایک زمانہ گزرنے پر مسلمان ان کی عظمت کا احساس کرتے اور ان کی مرحوم شخصیت کے گرد جمع ہوتے ہیں۔ قرن اول سے یہی ہو رہا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے ائمہ کی رسوائی اپنے سلطانوں سے کرائی اور خود تماشائی بنے رہے۔ اب غلامی کے زمانے میں وہ دولت کو پوجتے اور طاقت کو مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک قربانی و استقامت کسی انسان کی اضافی اور علم و دیانت ضمنی خوبی ہیں۔ مسلمان من حیث المجموع ایک ہنگامہ پرست قوم ہے۔ وہ ہنگامہ گزر جانے کے بعد ٹھنڈی پڑ جاتی اور عموماً انہی کی وہ دشمن ہوتی ہے جو ابتلا روزگار میں پیش پیش رہے ہوں۔ جو لوگ انگریزوں کی غلامی کا جواز ڈھونڈتے اور ان کی طاعت کرتے ہیں وہ ان لوگوں پر اعتراض کریں جو انگریزوں کے استبداد سے لڑتے ہیں تو یہ ایک دردناک المیہ ہے۔"

راقم: "ان کی صحافت کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟"

مولانا:

"اب وہ صحافت ہی سے دستکش ہو چکے ہیں، لیکن الہلال بلاشبہ صور اسرافیل تھا، اس نے ہندوستانی مسلمانوں کے دینی قبرستان میں قم باذن اللہ کہا اور اس صدا نے انہیں جگا دیا تھا الہلال محض جریدہ ہی نہیں صحیفہ تھا کہ ہفتہ وار صحافت میں اس کا جواب نہ تھا۔"

راقم: "مولانا کے ساتھ آپ کے روابط کیونکر رہے۔"

مولانا:

"میرے ساتھ انہیں ہمیشہ تعلق خاطر رہا، سر مائیکل اوڈوائر نے زمیندار کو اپنے عتاب کا نشانہ بنایا تو الہلال میں انہوں نے کئی مقالے تحریر کیے اور حکومت کی روش پر نکتہ چینی کرتے ہوئے زمیندار کی آواز کو زندہ رکھنے کے لیے عامۃ المسلمین کو آمادہ کیا۔"

راقم: "آپ مولانا سے ملتے تو گفت گو عموماً کس موضوع پر ہوتی؟"

مولانا:

"ہر موضوع پر جو اس وقت ہندوستان میں قومی آزادی اور مسلمانوں کے استقلال کا موضوع

ہوتا:

راقم: ”آپ نے ادب پر کبھی بات چیت کی؟

مولانا:

”کبھی دفعہ آزاد اردو ادب کی رفتار موڑ دینے اور اس کو کاملاً انقلابی ڈگر پہ لانے کے متمنی تھے۔

راقم: ”وہ مزاجاً کس ڈگر کے انسان تھے؟“

مولانا:

”مہادیو ڈیسائی انہیں مغلی تہذیب کا اُجلا نقش کہتے ہیں۔ لیکن وہ مغلی تہذیب سے کہیں زیادہ عربی تہذیب کی مارد و تصویر ہیں۔ وہ دہلی مرحوم کے نہیں بغداد مرحوم کے انسان تھے۔ جب مسلمانوں کا وہاں طوطی بولتا تھا اور بغداد اس دور کی متمدن دنیا میں عروس البلاد تھا مولانا نے اپنی بات سمیٹتے ہوئے کہا۔ وہ امویوں کے دمشق عباسیوں کے بغداد اور مغلوں کی دہلی میں ہوتے تو ان کا وجود جہاں ہوتے اس قرن یا عہد کے لیے مایۂ ناز ہوتا۔ وہ انسانی قامت میں ڈھلی ہوئی تاریخ کی ایک عظیم سچائی ہیں۔

راقم: ”ان حالات میں مسلمان ان سے کیونکر استفادہ کر سکتے ہیں؟“

مولانا:

”یہ سوال تمہاری ذہنی اپج ہے، علم جب مخاطبت کا میدان خالی پاتا اور عمل اپنوں کی بے رخی سے کبیدہ خاطر ہوتا ہے تو عبقری انسان کی خلوت ہی اس کی انجمن ہوتی ہے۔ آزاد اپنے تئیں دور افتادہ صدا اور غریب الدیار انسان سمجھتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ وہ اس عہد اور محل کے انسان نہیں لیکن اس عہد اور محل میں پیدا ہو کر ناقدری زمانہ کی ستم رسیدہ ہیں۔ وہ سیاست دان نہیں کیونکہ سیاست دان ہمیشہ اپنے مستقبل پہ سوچتے ہیں، وہ مدبر ہیں اور مدبر انسان کے مستقبل پہ سوچتا ہے، ہندوستان جن اقوام کا مجموعہ ہے ان میں کوئی سی قوم اپنی بوقلمونیوں کے باعث آزاد سے متفق نہیں، وہ اپنے تئیں اس طرح محسوس کرتے ہیں جس طرح لالۂ خود رو بیابان میں ہو۔“

خان عبدالغفار خان | پاکستان میں اپنی طویل قید سے بادشاہ خان اچانک رہا کر دیئے گئے تو ابتداً

سرحد میں ان کا داخلہ ممنوع تھا، وہ راولپنڈی سے رہا ہو کر لاہور پہنچے اور راقم کے ہاں مقیم ہوئے۔ راقم انہیں ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی چلتی پھرتی تاریخ سمجھتا اور سرحد جو کبھی سرزمین بے آئین تھا، اس کا نجات دہندہ خیال کرتا تھا، ان سے تاریخ کے متعلق استفسار شروع کیا تو وہ ہر موضوع پہ مفصل روشنی ڈالتے، واقعات بتاتے ان کے موڑ بیان فرماتے اور شخصیات کے بارے میں تفصیلی تذکرہ کرتے تھے۔

چونکہ ان کی تاریخ پاکستان کی تاریخ سے مختلف تھی اور وہ لیگ میں نہ رہے تھے اور پاکستان لیگ کی مساعی کا نتیجہ تھا اس لیے ان سے کسی نے وہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کی جن سے ملکی آزادی اور قومی استقلال کی تاریخ تیار ہوتی اور بہت سے سیاسی راز بے نقاب ہوتے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ جو لوگ آزادی کے بعد پاکستان کے وارث ہوتے گئے وہ خود کوئی ماضی نہ رکھتے تھے اور نہ مسلمانوں کے بارے میں برعظیم کے متعلق کسی جدوجہد میں کبھی شریک ہوئے تھے، وہ آزادی پر قابض ہو کر اپنے تئیں تب ہی اچھال اور اجال سکتے تھے کہ اپنے ماضی کی ویرانی چھپائیں مگر ان لوگوں کو اوجھل رکھیں اور ان کا تذکرہ وسوانح موقوف کر دیں جو برعظیم کی آزادی کے لیے برطانوی استبداد سے لڑتے رہے اور ایک طویل جدوجہد کے سنگین لمحات گزار کر اس ملک کی آزادی کا باعث ہوئے۔ صوبہ سرحد کی شخصیتوں کا مرہون ہو سکتا ہے اور اس کی داستان آزادی میں بہت سے نام لیے جا سکتے ہیں، لیکن حقیقتہً اس کی آزادی خان عبدالغفار خان کی عظیم قیادت میں خدائی خدمت گار تحریک کی بے نظیر قربانیوں کا ثمرہ تھی۔ اور خان عبدالغفار خان ان عظیم و رفیع قربانیوں کا مطلع روشن تھے۔

راقم نے بادشاہ خان سے کانگرس ہائی کمانڈ کے مستقل ارکان کی بابت پوچھنا شروع کیا تو انہوں نے فرداً فرداً ہر شخص کے مختلف خصائص بیان کیے، بادشاہ خان نے کہا۔

"انسان بہر حال انسان ہوتا ہے بڑے آدمی انسانوں سے مختلف نہیں ہوتے وہ انسان ہی ہوتے ہیں، لیکن قدرت بعض محاسن و محامد دے کر انہیں بڑا بنا دیتی ہے۔ بڑائی اس کے سوا کچھ نہیں کہ چند معلوم و معروف سچائیاں ہیں جنہیں اختیار کرنے سے آدمی بڑا ہو جاتا ہے۔ ان بڑائیوں میں سرفہرست شخصی کریکٹر ہے جس شخص کی سیرت مستقیم ہو گی اور وہ سچائی کے پیرہن میں ایثار ذات کا جوہر رکھتا ہو گا، وہ بلاشبہ عظیم آدمی ہے اور اس کے عظیم ہونے میں کوئی سا شبہ نہیں۔

کانگرس میں گاندھی جی عظیم انسان تھے تو اس کی وجہ ان کا شخصی کردار تھا انہوں نے اپنی ذات کی نفی کی تو ایک کھرا اور سچا انسان ہو گئے۔ اپنا سب کچھ حتیٰ کہ اپنے شب و روز بھی قوم کی بھینٹ کر دیئے۔ بالآخر ہندوستان ہی کے لیے نذر اجل ہو گئے وہ ایک ایسا چراغ تھے جس سے کئی چراغ روشن ہوئے اور ایک اندھیری رات بقعہ نور ہو گئی۔ وہ بظاہر ماورائی باتیں کرتے، اور ان سے اپنی روح کا رشتہ جوڑتے تھے، فرماتے کہ ان کی آواز روحانی ہے، غرض اس منحنی وجود نے صدیوں کے غلام ہندوستان کو جگا دیا، اور ایک ایسی قوم میں ولولہ آزادی پیدا کیا، جس کی شریانوں سے خون تک نچڑ چکا تھا۔ وہ خود ایک عظیم راہنما تھے، لیکن انہوں نے کئی عظیم راہنما پیدا کئے، ہندوستان کی آزادی کانگرس کی مرہون ہے اور کانگرس ان کی مرہون ہے وہ کانگرس کے عظیم دور کے معمار تھے، انہوں نے کانگرس کو برطانوی استبداد کے خلاف ستیہ و اہنسا کی شاہراہ پر تلوار بنا دیا اور یہ تلوار آزادی کی جدوجہد میں اس طرح چمکی کہ برعظیم آزاد ہو گیا۔"

پنڈت جواہر لال کے متعلق ایک دوسری ملاقات میں بادشاہ خان نے کہا۔

"وہ جدید ہندوستان کے عالمی انسان تھے، گاندھی جی کے جانشین تھے اور مہاتما جی نے خود اس کا اعلان کیا تھا، لیکن ان کا سراپا جذبات میں ڈھلا تھا، وہ قدیم ہندوستان کے جذبات اور جدید ہندوستان کے خیالات کا مجموعہ تھے وہ بوڑھے ہو کر بھی نوجوان ہندوستان کے راہنما تھے، گاندھی جی ہندوستان کے دیوتا تھے تو وہ ہندوستان کے سیاست دان۔ کانگرس کے عوام ان سے بے پناہ عقیدت رکھتے، ہندوستان کی سیاست کا تاج ان کے سر پر جگمگاتا وہ اپنے ملک کی مختلف تہذیبوں اور مختلف دھاروں کا مرقع تھے، ان کے مطالعے کی وسعت نے انہیں بین الاقوامی شخصیت کے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں ان کی تحریریں نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھی جاتی تھیں، وہ امریکہ و یورپ میں ایک سیاست دان کے علاوہ ایک مصنف کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتے تھے، ان کی شخصیت قومی جدوجہد نے اتنی بلند کی تھی کہ ہندوستان کی وزارت عظمیٰ ان کے لیے باعث فخر نہیں بلکہ وزارت عظمیٰ کیلئے

وہ باعث فخر تھے، ہندوستان کی عوامی لہر کا نام جواہر لال تھا۔

راقم نے پوچھا، سردار پٹیل؟

بادشاہ خان نے کہا:

"وہ ایک فولادی انسان تھے، اپنے اعصاب پر انہیں اس قدر قابو حاصل تھا کہ اپنے خیالات کے خلاف انہیں کبھی تذبذب نہ ہوتا۔ اور نہ ان سے دستبردار ہوتے، وہ گاندھی وادی تھے لیکن ہٹیلے، ایک دفعہ جس بات پر اڑ جاتے پھر اس سے ہٹتے نہیں تھے، ان میں طبیعت کی سنگینی کے باوجود دھیما پن تھا۔ وہ ادب کے نہیں، ریاضی کے انسان تھے، اور صورت حال پر نظریات کے تحت نہیں واقعات کے مطابق غور کرتے تھے۔ راجندر بابو ایک منکسر المزاج سیاست دان اور کتابوں میں ڈوبے ہوئے انسان اور خلیفۂ گاندھی بھگت تھے۔"

"اور مولانا آزاد؟" راقم نے دریافت کیا۔

بادشاہ خان نے کہا:

"مجھے سیاسی چسکا الہلال نے ڈالا، اور میری زندگی کا دھارا بدل دیا، الہلال اور زمیندار یہی دو اخبار تھے جو مجھے سیاست کی وادی میں لائے اور میں ہمیشہ کے لیے قومی جدوجہد کا ہو گیا، میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے ابتداً مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خاں کے قلم کی جولانیوں نے اس درجہ متاثر کیا کہ برطانوی استعمار کے خلاف جدوجہد عمر بھر کا سفر ہو گئی۔

کوئی سولہ سترہ برس مولانا آزاد کے ساتھ کانگرس ورکنگ کمیٹی میں رہا۔ اور یہ ساتھ اس وقت چھوٹا جب ملک تقسیم ہو کر آزاد ہو گیا، ایک زمانے میں ان سے مصافحہ کرنے کی حسرت تھی، پھر سالہا سال ان کی رفاقت میں بسر کیے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا کا نگرس میں شروع شخصیت تھے، وہ ہماری طرح منکسر المزاج اور درویش خو انسان نہیں تھے۔ لیکن ان کی گھٹی میں فقر و استغنا پڑے تھے۔ وہ علم کے بل پر مزاج کے شہنشاہ تھے کسی پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلے کے نتیجے پر پہنچنا ان کے لیے مشکل نہ تھا۔ آن ہو احد میں حاصل کلام تک پہنچ

جاتے اور جہاں تک کسی مسئلے یا موضوع کے بیان کرنے کا تعلق تھا وہ ایک بہتے ہوئے مقدس دریا کی طرح تھے، انسان ان کے کلام کی طاقت سے مغلوب ہوتا اور ان کی شیوہ بیانی سے مفتوح ہو جاتا، کانگرس ورکنگ کمیٹی عبقریوں کا مجموعہ تھی لیکن مولانا آزاد سب پر چھائے رہتے، کوئی شخص ان کے دماغ و زبان کی تاب نہیں لا سکتا تھا، بسا اوقات کئی تجویزیں گاندھی جی کی تالیف ہوتیں۔ لیکن آل انڈیا کانگرس کمیٹی سے منوانے کے لیے مولانا ہی کی طلاقت لسانی کام آتی اور مجوزہ سے کہیں زیادہ ان کا زورِ بیان توثیق کا باعث ہوتا۔"

میں نے پوچھا:

"مولانا کے متعلق آپ کا اجتماعی تاثر کیا ہے؟"

بادشاہ خان نے کہا۔

"مولانا ایک ہمہ گیر انسان تھے، وہ ہر موضوع پر اس جامعیت کے ساتھ بولتے کہ سب ہمہ تن گوش ہوتے۔ ورکنگ کمیٹی میں عالمی مسائل کا تجزیہ فرماتے تو حیرت ہوتی کہ اس شخص کی نگاہ کتنی عمیق ہے۔ ملکی مسائل پر بات چیت کرتے تو ہم ششدر رہ جاتے کہ ان کا نقطۂ نگاہ ہم سے مختلف بھی ہے اور صحیح بھی، اکثر نتائج انہی کے تجزیے و نظریے کے مطابق ہوتے کانگرس کی بہت سی قراردادیں ان کے قلم سے نکلیں، پنڈت جواہر لال انگریزی میں ترجمہ کرتے۔ اگر قرارداد پنڈت جی کے قلم سے ہوتی تو مولانا اس کے بہت سے انگریزی الفاظ بدلوا ڈالتے، اور ان کے متبادل الفاظ تجویز کرتے۔ ان کا دماغ قدرت کے عجائبات کا خزینہ تھا۔ وہ برعظیم کے مسلمانوں کی علمی وجاہتوں کی آخری ذہانت تھے، مسلمانوں نے ان سے جو سلوک کیا وہ اس یقین کو راسخ کرتا تھا کہ اسلامی تاریخ انہی المیوں سے پُر ہے، امام احمد بن حنبلؒ یا امام ابن تیمیہؒ بھی تو ان ناموافق راہوں سے گزرے تھے، مسلمانوں کی تاریخ قتلِ عمرؓ سے شروع ہو کر اس زمانے تک کچھ ایسی ہی چلی آ رہی ہے کہ ان کے ہاں کسی عظمت کا اعتراف اس کی رحلت ہی سے شروع ہوتا ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

شاہ جی ہندوستانی مسلمانوں کے ویرانہ آباد میں قدرت کا عطیہ تھے وہ خود ایک عہد، ایک تاریخ، ایک ادارہ، ایک تحریک

اور ایک جماعت تھے، ان سے بڑا عوامی خطیب اُردو زبان نے پیدا کیا اور نہ مستقبل قریب میں اس کے آثار ہی نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام و بیان کی تاثیر و سحر کا یہ حال تھا کہ دلوں کی سنگینی موم کی طرح پگھلتی اور دماغوں کا انجماد رواں دواں ہو جاتا۔ انہیں ہوا کے جھونکے اور سمندر کی موجیں بھی گوش بر آواز ہو کر سنتی تھیں، ان کا بیان تھا کہ وہ مسجد ہی کے حجرے میں اپنی زندگی گزار دینا چاہتے تھے اور اس نہج ہی سے ان کی تعلیم و تربیت ہوئی تھی لیکن "الہلال و زمیندار" انہیں جدوجہد کے میدان میں لائے اور ستارہ صبح نے ان کے جگر میں آگ لگا دی۔ الہلال کے بارے میں فرمایا:

"الہلال نے ان کی شریانوں میں لہو دوڑایا اور وہ ایک محرک انسان کی طرح قرن اوّل کی طرف لوٹ گئے پھر وہاں سے بال و پر لے کر ہندوستان کے اُفق پر پرواز کی۔ الہلال نے قرآن فہمی کے ذوق میں انہیں وسعت و تنوع دیا، اور ان کی کایا کلپ ہو گئی۔ ان کی خطابت کا اسلوب اور اس کے مختلف زاویے الہلال کے مرہون ہیں۔ آزاد ان کے ذہنی مرشد تھے۔ ان سے بہت سی ملاقاتوں میں فیضان حاصل کیا، ہر ملاقات علم و نظر کی ایک نئی دریافت ہوتی۔ آزاد جس موضوع پر بولتے، معلوم ہوتا انہی کا خانہ زاد ہے، انہیں قرآن کی تفسیر میں منفرد پایا، ترجمے میں یکتا، حدیث میں یگانہ، فقہ میں بے مثال، ادب میں بحرِ ناپیدا کنار، شاعری کا معدن اور نثر میں رستم و اسفندیار۔ گھنٹوں بولتے لیکن تکرار عنقا، فنون لطیفہ میں ان کا جوڑ نہ تھا۔ امام الہند فن موسیقی پر زبان کھولتا تو گلفشانیٔ گفتار سے لالہ زار کھل جاتا۔ "غبارِ خاطر" کا آخری خط ان کے اسی ذوق عظیم کی نشاندہی کرتا ہے۔ ہندوستان کے وزیر تعلیم کی حیثیت سے مختلف تصویروں پہ ان کے تشریحی حاشیے لاجواب ہیں، میں نے ایک تقریب میں مصوری سے متعلق ان کی ایک تقریر سنی ہے، ملک بھر کے نامور مصور جمع تھے اور وہ ان کی معلومات پر سر دھن رہے تھے۔ سنگ تراشی کے بارے میں ایک دن تاج محل کا ذکر کیا تو دنیا بھر میں گھماتے پھرے۔ سنگ تراشی و معماری کے ارتقاء تہذیب کی تاریخ اس طرح بیان کی کہ مخصوص اصطلاحوں کے ساتھ خوبصورت الفاظ کی لہریں اچھل اچھل کر بہہ رہی تھیں۔ ایک دن مختلف قوموں کے فواکہات و مشروبات کی طلسم ہوشربا بیان کی تو گفت گو کئی گھنٹوں تک پھیل گئی۔ ہم جواء

تھے کہ جاپان اور میکسیکو کے فواکہات و مشروبات کی جزئیات تک سے بھی آشنا ہیں۔ ایک دفعہ کبوتروں کا ذکر چھڑ گیا تو ان کی نسلوں اور خوبیوں کا مرقع بنا ڈالا، پھر چرند و پرند کی عادتوں پر روشنی ڈالی تو ایک تہائی دن اس کی نذر ہو گیا، کسی نے غالب کا ذکر چھیڑا تو سبحان اللہ گویا خود غالب ہیں، یا ان کے ساتھ عمر گزاری ہے، وہ ولی دکنی سے لے کر عصر حاضر کے ہر شاعر کو جانتے اور ان کے بعض چیدہ چیدہ اشعار بھی حفظ تھے، ادب کے ہر شعبہ میں ان کی نگاہ تھی۔ ایک دن رستم زماں گاماں پہلوان ملنے آ گئے ہم لوگ وہیں تھے، اب جو پہلوانی کی تاریخ بیان کی تو ہم دنگ رہ گئے گویا رستم و اسفندیار کے ساتھ ڈنٹر پیلتے رہے ہیں۔ بنوٹ پر گفتگو کی تو پوری کتاب کہہ ڈالی۔ مولانا محمد علی الٰہ آباد میں سنگم پر کشتی رانی کے لیے چلے گئے واپس آئے تو ان سے یہی موضوع چھیڑ دیا، وہ گر بتائے کہ فن کی پوری تاریخ سامنے آ گئی۔ تمباکو پر روشنی ڈالی تو کہاں سے کہاں نکل گئے۔ پان کا تذکرہ کیا تو پتے سے لے کر کتھے تک اور سپاری سے لے کر قوام تک، جانے کیا کچھ بیان کیا۔ ہم ششدر رہ گئے، الٰہ العالمین ابوالکلام ہیں کہ صحیفہ کائنات۔

ایک دن مختلف ملکوں کی خواتین پر اس شائستگی سے اظہار خیال کیا کہ عباسی عہد کے ان داستان گو عبقریوں کی یاد تازہ ہو گئی جو اس موضوع میں عربی زبان کے بانکپن کی رعایت سے یگانۂ عصر تھے۔ مولانا کے طرزِ کلام کا عظیم پہلو یہ تھا کہ ان کی زبان پر کبھی مبتذل الفاظ نہ آتے، وہ ان الفاظ ہی سے نا آشنا تھے۔ فرماتے رکیک الفاظ مغرب الاخلاق قوموں کا سنڈاس ہوتے ہیں۔“

راقم وزارتی مشن کے زمانے میں شاہ جیؒ کے ہمراہ دہلی میں تھا ایک دن وقت لے کر مولانا کے ہاں پہنچے تو اس جلسے کا ذکر آ گیا، جو گئی رات دہلی میں جامع مسجد کے سامنے ہوا تھا اور کوئی ڈیڑھ لاکھ آدمی شریک تھے، پنڈت جواہر لال نہرو بھی اس جلسے میں آئے تھے۔ اور کرپس نے بھی تھوڑی سی دیر جلسے کے بے پناہ ہجوم پر نگاہ کی تھی۔

مولانا نے شاہ جیؒ کی شیوہ بیانی کو سراہتے ہوئے استفسار کیا۔

”شاہ صاحب، سنا ہے آپ تقریر میں گالی بھی لڑھکا دیتے ہیں؟“

”حضرت آپ سے کس نے کہا؟“

"کوئی بیان کر رہا تھا۔"

"کون؟"

"ہر کسی کا نام نہ تو حافظے کی چیز ہے اور نہ ہر نام کا پوچھنا ضروری ہوتا ہے۔"

"تو حضرت آپ نے اس روایت پر اعتماد کر لیا۔"

سوال روایت کا نہیں نہ اعتماد کا ہے، آپ سے جو تعلق خاطر ہے، اس کے باعث معاًوہ چیز یاد آگئی۔"

"جی نہیں۔ راوی نے غلط بیانی کی ہے بلکہ جھوٹ بولا ہے۔"

"الحمد للہ، وہ پھانس اس لیے دماغ میں رہ گئی کہ آج سے چوبیس یا پچیس سال پہلے آپ نے ہیر وارث شاہ کے بعض بند سنائے تھے۔ جن میں جل تھل قسم کے قافیے تھے۔ میں نے خیال کیا جس شخص کو اس قسم کے اشعار یاد رہے ہوں ممکن ہے حالات کی برہمی نے اس سے گالی اگلوا دی ہو۔"

شاہ جی مسکرائے اور کہا۔

"حضرت ربع صدی پہلے کی وہ صحبت آپ کو اب تک یاد ہے۔"

فرمایا:

"میرے بھائی، سوال کسی صحبت کی یادداشت کا نہیں، گو حافظہ ہر طرح کی شاہراہوں اور پگڈنڈیوں سے گزرتا ہے لیکن بعض چیزیں حافظے کے خانوں میں بھول چوک ہو کر رہ جاتی ہیں، وارث شاہ کا کلام تھا آپ کی وجہ سے حافظے میں ایک تاثر رہ گیا اب جو آپ سامنے آئے تو وہ تاثر بھی تازہ ہو گیا۔"

راقم نے شاہ جی سے کہا:

"شاہ جی آپ نے زندگی میں کتنی دفعہ مولانا سے ملاقاتیں کی ہیں؟"

فرمایا:

"یاد تو نہیں لیکن بیسیوں دفعہ ان سے فیض حاصل کیا ہم نشین رہا، ہم سفر رہا، اور بارہا ملاقاتیں کی ہیں۔"

"ان ملاقاتوں کو خود لکھتے نہیں تو کسی سے لکھوا دیجیے، اس طرح ایک عمدہ کتاب ہو جائے گی۔"

"بھائی میں قلم کا آدمی نہیں۔"

"میں حاضر ہوں آپ بولتے اور سناتے رہیئے میں لکھتا جاؤں گا۔"

"خامہ فرسائی بھی تو ایک روگ ہے، پھر یہ چیزیں سکون دل سے ہوتی ہیں۔ فرصت میں قلمبند کی جاسکتی یا کرائی جاسکتی ہیں۔ آج زمانہ وہ ہے کہ سکون و فرصت دونوں عنقا ہیں۔"

"اس طرح ان گفتگوؤں کے اکارت ہو جانے کا احتمال ہے۔ ایسا شخص جو آپ کے نزدیک اسلامی معاشرے کے اس قحط الرجال میں سب سے بڑا عبقری ہے اس کی گفتگوئیں قلمبند کرنا آئندہ نسلوں کی ایک امانت انہیں سونپنا ہے۔"

"ہاں بھائی ٹھیک ہے، لیکن مولانا کی زبان کہاں سے لاؤں ہم لوگ۔ مولانا کے افکار کے سوانح ہیں۔"

شاہ جی ٹال گئے لیکن صبح و شام کی یکجائی کے باعث مولانا کا ذکر چھڑا رہتا، کئی باتیں معلوم ہوئیں، مولانا کے عظیم فقرے شاہ جی کے نوک زباں تھے۔

شاہ جیؒ نے فرمایا:

"احرار کی بنیاد مولانا ہی کے مشورہ سے رکھی گئی۔ لیکن ہم لاہور میں وہ کلکتے میں، ہم جلوت کے وہ خلوت کے، انہیں ملنا مرغ کند مک ڈھونڈ لانے کے مصداق تھا، ہم ان سے دوستانہ بے تکلفی نہ رکھتے، ہمارے اور ان کے درمیان علم کا فاصلہ تو تھا ہی لیکن ان کا ادب و احترام بھی ایک طبعی فاصلہ تھا۔ ہمارے سامنے روزمرہ کے عوارض تھے اور وہ ان کی طرف نگاہ ہی نہ کرتے تھے۔ تاہم یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ احرار الہلال کی بازگشت ہیں۔"

"مولانا مسلمانوں سے اس قدر مایوس کیوں ہیں"؟ راقم نے شاہ جیؒ سے پوچھا۔

فرمایا:

وہ تو نہیں لیکن مسلمان ان سے مایوس ہیں۔ مولانا ان کی سطح پر اترتے ہیں، ورنہ ان کے دماغوں کی پستیوں سے ہمکلام ہوتے ہیں۔ مسلمان شاعری کی پیداوار ہیں، وہ لیڈرشپ سے اپنی خواہشوں کا اتباع چاہتے اور خود لائحہ عمل تجویز کر کے اسے تختہ دار پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان میں برطانوی اقتدار کی مضبوطی کے بعد مسلمانوں کی لیڈرشپ سرکاری امراء کی تحویل میں چلی گئی، اور وہ اجتماعی طور پر بڑے بڑے جاگیرداروں، زمینداروں، تعلقداروں اور تمنداروں کی ملکیت ہو گئے۔ مسلمان زندہ ہوتے تو مولانا مایوس نہ ہوتے اور مولانا تعلقدار

ہوتے تو مسلمان ان سے بددل نہ ہوتے۔"

"مولانا کی عبقریت کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟"

"مولانا چونکہ مسلمان ہیں اس لیے ہر جہتی اعتراف مفقود ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ابوالکلام کانگرس کی سب سے بڑی فراست کا نام ہے وہ کانگرس کو طوفانوں سے نکالتے اور مخالفین کے دلوں میں اتارتے ہیں۔"

شاہ جی نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا مسلمانوں نے انہیں کربلا میں کھڑا کیا ہے ان کے لیے مسلمانوں کی اکثریت فراست کا کنارہ ہے، آج مسلمان صرف مسلمان ہوتے اور انہیں اپنی تاریخ کا علم ہوتا تو ان کی عقیدت کا مرجع ہوتے، یہ کوئی معمولی چیز ہے کہ جس ہندوستان کو انگریزوں نے مسلمانوں سے چھینا تھا اس ہندوستان کی آزادی کے لیے ابوالکلامؒ انگریزوں سے گفت گو کر رہا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق اُردو کو اپنی متاع سمجھتے ہیں اور مسلمان اردو پر سیاست پچھے جاتے ہیں گو مجھے خدشہ ہے کہ مسلمانوں کی اس عصبیت کے باعث اُردو نہ صرف ہندوستان میں زخم کھائے گی بلکہ ایک عظیم ابتلاء کا شکار ہوگی۔ لیکن مولانا دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے نمائندوں سے کہ ان کی زبان ہی اس وقت دنیا کی سب سے بڑی زبان ہے، اردو میں مذاکرات کر رہے ہے اور اُردو میں ہمکلام ہوتے ہیں افسوس نہ بابائے اُردو اس پر فخر کرتے اور نہ مسلمانوں کو اس سے خوشی ہوتی ہے۔ یہ ایک جذباتی بات ہی سہی لیکن ایک جذباتی قوم جب سیاسی طور پر نابینا ہو جائے تو وہ حُسن پر قبح کو ترجیح دیتی اور زیاں پر سود کا گمان کرتی ہے۔ مسلمانوں کی سرگزشت انہی حادثوں سے اٹی ہوئی ہے۔

شاہ جی نے کہا ابوالکلامؒ،

۱۔ اس زمانے میں ملتِ اسلامیہ کے سب سے بڑے عبقری ہیں اور فی الواقعہ ابوالکلامؒ ہیں۔

۲۔ ان کا وجود قدرت کا عطیہ اور ان کا دماغ معجزۂ الٰہی ہے۔

۳۔ وہ مسلمانوں کی اس لیڈرشپ کے میرِ قافلہ ہیں۔ جو تحریکِ خلافت کے زمانے میں اُبھری اور قربانی و استقامت کی مظہر ہوگئی اور اب بھی مسلمانوں کی ناقدری کے باوجود ہندوستان میں

سرگرم جہد ہے۔

۴۔ وہ قرن اول کے حجازی کی آواز ہیں جو صدیوں کی مسافت کے بعد ہندوستان پہنچ کر خود مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو گئی۔

۵۔ ان کے ذہنی کمالات صرف اس وجہ سے عوام میں نہیں آتے کہ مسلمان ہیں، مسلمان انہیں مانتے نہیں اور ہندوؤں کے لیے ایک مسلمان کی پوجا ور شپ) کیونکر ممکن ہے؟

۶۔ وہ ہندوستان میں اسلام کی صدائے رستخیز تھے، لیکن برطانوی عہد میں مسلمانوں کو رزم کے حدی خوان کی نہیں بزم کے نغمہ خوان کی ضرورت رہی ہے اور وہ ہمیشہ گفتار کے غازی ہی کا اتباع کرتے ہیں۔

۷۔ مولانا نے مسیح کے مانند صلیب پائی اور سقراط کی طرح زہر کا جام پیا ہے۔ شاہ جی نے کہا مولانا نہ ہوتے تو ہم نہ ہوتے، ممکن تھا ہندوستان کوئی اور کروٹ لیتا اور مسلمانوں کی سیاسی رفتار بیابانوں کی سمت مڑ جاتی۔ بہر حال مسلمانوں نے مولانا سے جو سلوک کیا وہ یکے درمیان زندیقان کے مصداق ہے۔

کردار کشی

مولانا کے خلاف تحریک پاکستان میں سیاسی اشتعال کے وجوہ ظاہر تھے، جب قومی مزاج آپے سے باہر ہو تو قلم خشمگیں اور زبانیں دراز ہوتی ہیں۔ مسلمان اس صورت حال ہی کا شکار تھے، سیاست و شرافت شاذ ہی یکجا ہوتے ہیں۔ لیگ کا ذہن غایت درجہ قہر و غضب میں تھا۔ جب قائد اعظم مولانا کی تحقیر کر چکے تھے تو پھر دوسروں سے کیا توقع ہو سکتی تھی۔ عوام تو سب و شتم کی حدیں پھاند گئے تھے لیکن کچھ خواص بھی انہی رنگوں سے ہولی کھیل رہے تھے، اس سلسلہ میں دو چار افسروں نے جو انگریزی عہد میں خانہ زاد قسم کے انسان تھے، مولانا کے خلاف کئی افسانے وضع کیے اور ذاتیات کا رنگ پھینک کر ہولی کھیلی۔ مولانا ان لسانی حادثوں سے چپ چاپ گزرتے رہے۔ ہر زخم سہا اور چوٹ بھی لیکن اس طرح رہے جیسے ایک مستقیم انسان گندے اندھیروں سے گزرتا ہے وہ اس سارے سانحہ میں صبر و استقامت کی تصویر تھے۔ ان کے عقیدت مند مسلمانوں میں کم نہ تھے لیکن سب و شتم کا پلڑا اقتدار سے جھک گیا تھا۔ مولانا اپنے عقیدت مندوں کو اس محاذ پر نبرد آزمائی سے روک دیتے اور فرماتے اس کا حاصل کچھ نہیں۔ انسان نشہ کی حالت میں اسی طرح بہک جاتا اور کھرج کی لے میں ژاژ خائی کرتا ہے۔ جب نشہ اترے گا تو انہیں احساس ہو گا کہ وہ حواس کے تعطل کا شکار ہو گئے تھے۔ مسلمان دوڑتے ہیں یا بیٹھ جاتے ہیں۔ انہوں نے ابھی چلنا نہیں سیکھا۔ اور یہ حالت راست کی نہیں کہ ہم منتقم ہوں۔ حالت افسوس کی ہے کہ جذبات میں کھولاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ اس وقت مسلمانوں کے جذبات بیمار ہیں اور بیماری کا علاج بے دردی نہیں ہمدردی ہے۔" اس سلسلہ میں جو چیز اندوہناک تھی وہ بعض علماء و مشائخ کا طرز عمل تھا کہ اپنے تقویٰ و علم کے باوجود وہ یہ سب کچھ گوارا کر رہے تھے اور اس سے بے نیاز تھے کہ یہی چیزیں اخلاق کے انحطاط کا باعث ہو کر قومی سیرت کے زوال کا باعث ہوتی ہیں۔ کچھ تو مسلمانوں کی تاریخ

ہی ایسی ہے کہ بیشتر علماء نے ہمیشہ اپنے عہد کی متبحر شخصیتوں کی اہانت پر صاد کیا ان کی پسپائی پر چپ رہے یا خوش ہوئے۔ اس تاریخی المیہ کی سرگزشت یہی ہے کہ علماء نے دولت کی ہمراہی میں اپنی صف کی عصری شخصیتوں کو ہمیشہ آزمائش و ابتلا میں جھونکا ہے۔ مولانا معاصرت کی اس آگ سے کندن بن کر نکلے اور تاریخ کے صفحات پر گہرے نقوش چھوڑ گئے۔ لیکن آزادی کے بعد سیاسی معاندت کا شعلہ کجلا گیا۔ اور ہندوستان کا مسلمان تجربوں کی ایک نئی شاہراہ پر چلنے لگا۔ پاکستان قائم ہو گیا تو مولانا اس کی تصویر میں نہ تھے۔ سید سلیمان ندوی ۱۴ جون ۱۹۵۰ء کو پاکستان وارد ہوئے۔ سوال یہ نہیں وہ کیونکر آئے مختصر یہ کہ مولانا احتشام الحق تھانوی کی تحریک پر خان لیاقت علی خان سے منسوب ایک غلط وعدے پر تشریف لائے اور یہیں ٹھہر گئے۔ ان کا پاکستان میں ٹھہر جانا اہل علم کے لیے مسرت کا باعث تھا۔ تمام علمی حلقوں میں ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ لیکن یہ بات بعجلت کھل گئی کہ مولانا آزادؒ سے کبیدہ خاطر ہیں۔ اور یہ ایک افسوسناک امر تھا۔ سید صاحب مولانا آزادؒ سے کہیں پہلے نومبر ۱۹۵۳ء میں وفات پا گئے لیکن یہ عقدہ مولانا کی وفات (فروری ۱۹۵۸ء) کے بعد کھلا کہ سید صاحب کی مولانا سے ناراضی کا سبب کیا تھا۔ جب تک مولانا آزادؒ حیات تھے، مولانا عبدالماجد دریا آبادی ایڈیٹر "صدق جدید" سراپا نیاز رہے۔ جونہی ان کی آنکھیں بند ہوئیں عبدالماجد نے قلم کے نشتر چبھونا شروع کیے۔ اور قدیم الایام کے بغض کو سے کرچیاں ہو گئے۔ ادھر پاکستان میں سید صاحبؒ کے بعض کوتاہ فکر عقیدت مندوں یا مولانا نور اللہ مرقدہ کے خود ساختہ حریفوں نے شوشے چھوڑنا شروع کیے۔ سید صاحب کی رحلت کے سات سال بعد ۱۹۶۰ء میں آپ کے ایک مرید غلام احمد بی اے عثمانیہ نے تذکرہ سلیمان شائع کیا اور اس میں مولانا آزادؒ پر کلوخ اندازی کی۔ اس طرح یہ چیز نمایاں ہو گئی کہ سید صاحب علیہ الرحمۃ مولانا قدس سرہ سے ناخوش تھے۔

عبدالماجد دریا آبادی نے مولانا کی وفات پر رسمی تعزیت کا اظہار کیا کہ اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ لیکن جو کچھ لکھا اس کے بین السطور سے محسوس ہوتا تھا کہ ان کا ذہن صاف نہیں۔ اور ان کا دل پہلے دن کی طرح میلا ہے۔ حکومت ہند کی وزارت اطلاعات کے ماہنامہ "آجکل" نے مولانا کی رحلت کے پانچ ماہ بعد ابوالکلامؒ نمبر نکالا تو اس نمبر پر تبصرہ کرتے ہوئے عبدالماجد نے چٹکی لی کہ اس نمبر میں مذہبی لوگ بھی شامل ہیں مثلاً سعید احمد اکبر آبادی اور غلام رسول مہر لاہوری۔ وہ یا جمعیۃ العلماء میں سے کوئی صاحب مولانا کی مذہبی زندگی پر روشنی

ڈالتے کہ صوم وصلوٰۃ کے معاملہ میں ان کا شعار کیا تھا؟[1] ظاہر ہے کہ یہ ایک ابلہانہ شوخی تھی۔ عبدالماجد جانتے تھے کہ "آجکل" کے ایڈیٹر بالمکند عرش ملسیانی ہیں۔ یہ کوئی تسامح تھا تو کسی مسلمان ایڈیٹر سے نہیں ہوا تھا اور نہ آجکل میں مولانا کی مذہبی زندگی کا تذکرہ لازم تھا۔ اوّل تو صوم وصلوٰۃ کا تعلق انسان اور رب کے مابین ہے، کسی نمائش کی چیز نہیں اور نہ اس کا تعلق ابلاغ عامہ سے ہے۔ عبدالماجد نے سعید احمد اکبرآبادی اور غلام رسول مہر کا نام لکھ کر محض تکلف کیا۔ انہیں معلوم تھا کہ دونوں بزرگ مولانا کے ساتھ کبھی نہیں رہے وہ مولانا سے کبھی کبھار ملتے ضرور تھے لیکن مولانا کے نگران نہ تھے۔ اس بارے میں اگر روشنی ڈالنا لازم تھا تو وہ لوگ قلم اٹھانے کے مجاز تھے جو مولانا کے ساتھ رہے یا جنہیں کسی طرح مولانا کی نمازوں کے مشاہدہ کا موقع ملا۔

عبدالماجد کی مولانا سے ناراضی کے کئی اسباب تھے۔ جو انہوں نے خود ہی پیدا کیے۔ مثلاً علامہ شبلی، مولانا آزادؒ سے انتہائی شیفتگی رکھتے تھے۔ اور یہ عبدالماجد کے لیے کدورت کا ایک سبب تھا۔ ایک دوسرا سبب "الہلال" میں عبدالماجد کے ایک مقالہ کا ترجمہ تھا جو کئی شماروں میں پھیل گیا۔ اس کے علاوہ مولانا سے محمد علی جوہر کا ٹکراؤ تھا۔ عبدالماجد محمد علی جوہر کے ساتھ تھے۔ آخری سبب حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی بیعت تھا۔ حضرت تھانویؒ اپنی مشیخیت کے انسان تھے اور انہیں برطانوی سرکار کے خلاف ہر جدوجہد سے پرہیز رہا۔ عبدالماجد کسی جدوجہد کے انسان ہی نہ تھے۔ ان کا مزاج سرکاری تھا۔ اور ان کے بھائی ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ان میں اور مولانا میں یکسانی کا سوال ہی نہ تھا۔ ان کی ناراضی کا ایک سبب شاید یہ بھی تھا کہ مولانا تاریخ کے سفر میں بہت آگے نکل گئے بلکہ تاریخ ہو گئے۔ لیکن عبدالماجد ہندوستان کی ہر نوعی جدوجہد میں تاریخ سے محروم رہے۔ انہیں یہ صدمہ نہیں تھا کہ مولانا وفات پا گئے۔ ان کا صدمہ یہ تھا کہ مولانا تاریخ کی عظمت ہو کر رخصت ہوئے۔ انہوں نے مولانا کے وفات پاتے ہی ان کے کفن پر گل کاری شروع کی۔ راقم "صدق جدید" میں دیکھ چکا تھا کہ عبدالماجد کے نزدیک کئی ایک الم غلم انسان بھی علیہ الرحمۃ ہیں لیکن مقام بخشش پر فروکش ہو کر مولانا آزادؒ کو مرحوم تو لکھتے ہیں، لیکن رح کا نشان نہیں دیتے راقم نے انہیں خط لکھا کہ "یہ حضرت مولانا آزادؒ کے بارے میں تسامح ہے یا تساہل یا آپ انہیں اس کا مستحق نہیں گردانتے"؟ چونکہ راقم کے ساتھ ان کے تعلقات فیاضی کی حد تک وسیع تھے اور اکثر باتیں بلا جھجک

۱؎ اس ضمن میں سوانحی برگ وبار کے تحت اشاراتی ذکر آ چکا ہے۔

لکھتے تھے، فوراً پوسٹ کارڈ لکھا:

"واہ صاحب، آپ بھی کمال غضب کرتے ہیں۔ ہر متوفی یقینی نہیں کہ جنتی ہو اور نہ ہر کوئی اللہ کی رحمت کا استحقاق رکھتا ہے۔"

مولانا کی وفات کے ۲۶ روز بعد ۱۹ مارچ کو عبدالماجد نے راقم کے نام ایک خط لکھا۔ جس میں سید صاحب سے منسوب اس روایت کا انکشاف کیا کہ "مولانا ترک نماز، ترک روزہ اور شغل شبانہ سے ملوث تھے"۔ ایک دوسرے خط میں ۱۰ اپریل ۱۹۵۸ء کو لکھا کہ "عالم اسرار کے لفظ میں صریح فحش کنایہ ہی ہے مولانا شبلی کی نظر ادھر نہ گئی ورنہ وہ ہرگز یہ لفظ نہ لاتے۔ الفاظ کے بارے میں بڑے محتاط تھے۔"

علامہ شبلی نے مولانا ابوالکلام کے نام ۱۵ جون ۱۹۰۹ء کے محررہ خط میں لکھا تھا کہ "افتخار عالم" مولوی نذیر احمد کی لائف لکھ کر انہیں آلودہ ہاتھوں سے حیات شبلی کو چھونا چاہتے ہیں۔ میں نے لکھ دیا ہے ظاہری حالات تو ہر جگہ سے مل جائیں گے لیکن عالم اسرار خدا کے سوا ایک اور بھی ہے؟ وہاں سے منگوا لیجیے تبھی بتاتو نہ دو گے"۔

عبدالماجد نے محولہ خط میں لکھا کہ "شاید آپ کے خلوص ہی کا نتیجہ ہے کہ دل کھول کر آپ کے سامنے رکھ دیا ہے"۔ مولانا کے شغل شبانہ کا راوی کون تھا ان کے قلم سے سنئے:

"مولانا کے ابتدائی دور (قیام بمبئی) کے ایک رفیق آغا حشر مرحوم تھے۔ وہ ایسے ایسے قصے بیان کرتے تھے کہ مولانا کا کوئی معتقد انہیں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ آغا سے ۱۹۱۵ء میں میری خوب ملاقاتیں رہی تھیں۔ وہ نخاسہ لکھنؤ میں مع اپنی کمپنی کے ٹھہرے ہوئے تھے۔"

آغا صاحب کی تمام زندگی لہو ولعب میں گذری۔ اپنی رحلت تک شراب کے شیفتہ اور بستر کے فریفتہ رہے۔ ان کا لاہور میں انتقال ہوا۔ جنازہ اٹھا تو عزاداروں میں چار ادیبوں کے سوا باقی سب ڈوم ڈھاری شریک تھے۔ اور جب انہیں لحد میں اتارا گیا تو ایک مشہور طوائف ان کی قبر سے لپٹ لپٹ کے رو رہی تھی۔ اس کا نوحہ تھا "آغا جی! اب کس کے ساتھ پیار کروں گی"۔ عبدالماجد کا ان کی قصہ گویوں پر اعتماد کرنا بجائے خود ایک سانحہ تھا ورنہ قرآن کے نزدیک ایسا کوئی راوی کسی حال میں ثقہ نہیں ہوتا۔

آغا صاحب مکالمہ نویسی اور افسانہ سازی میں یگانہ تھے۔ رہا یہ سوال کہ مولانا کی مذہبی زندگی کا حال

کیا تھا تو ملک نصر اللہ خان عزیز رکن جماعت اسلامی و ایڈیٹر روزنامہ "تسنیم" نے جواب لکھا کہ وہ ۱۹۳۰ء میں مولانا کے ساتھ گونڈہ جیل میں رہے ہیں۔ مولانا نہایت خشوع و خضوع سے نماز پڑھتے اس کا اثر ان کے چہرے سے مترشح ہوتا۔ اور شدت تاثر سے ان کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔ جن دنوں کانگرس کے صدر تھے تو نماز کے وقت مسند صدارت سے اٹھ کر اپنے خیمے میں چلے جاتے اور تھوڑی دیر بعد واپس آ جاتے۔ ترجمان القرآن کے کاتب منشی عبد القیوم نے اپنے مضمون میں لکھا کہ وہ مولانا کی خدمت میں ڈیڑھ سال رہے ہیں۔ مولانا فجر اور مغرب کی نماز قریب کی مسجد میں پڑھتے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ناظم جمعیۃ العلماء نے لکھا کہ مولانا رات بہت جلد سو جاتے۔ صبح ۳ یا ساڑھے تین بجے بیدار ہوتے۔ اول چار سے آٹھ رکعت تک خدا کے حضور میں سربسجود ہوتے پھر جا کے بیٹھتے۔ اس کے بعد قرآن حکیم کی آیات پر غور کرتے، پھر نماز فجر پڑھ کر اپنے دوسرے کاموں میں لگ جاتے۔ مولانا اسد اللہ خان میرٹھی آپ کے ساتھ میرٹھ جیل میں رہے۔ انہوں نے "الجمعیت" کے ابو الکلام نمبر میں لکھا کہ مولانا صبح جیل میں ٹہلا کرتے اور قرآن پاک کی آیات تلاوت فرماتے۔ اس وقت صبح کی دلکشی کے ساتھ ان کا لہجہ کچھ اور دلکش ہو جاتا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ راوی تھے کہ مولانا نماز اس طرح پڑھتے گویا براہ راست اپنے خدا سے ہمکلام ہیں۔ خان عبد الغفار خان نے بیان کیا کہ مولانا نماز میں کوئی سی غفلت نہ کرتے تھے۔

عبدالماجد کے ذہنی الجھن کا عجیب عالم رہا اور وہ رکے نہیں۔ ان کے نام سید سلیمان ندوی کے جو خطوط تھے ان کا مجموعہ مکتوبات سلیمانی کے نام سے ۱۹۶۳ء میں شائع کیا۔ لیکن مولانا سے جو بغض انہیں تھا وہ اس خط سے ظاہر ہے جو ماجد صاحب نے سید صاحب کے محفوظات سے اڑایا۔ اور اس مجموعہ میں بلا جواز بلا نسبت نقل کیا۔ اور تشریح یہ لکھا کہ خط کا آخری صفحہ نہیں مل سکا جس پر تاریخ درج ہو گی۔ حالانکہ معاملہ صرف تاریخ ہی کا نہ تھا۔ اس میں سید صاحب کے متعلق ایسی ہی غلط روایتوں اور لغزشکاتوں کا ذکر تھا، جیسا کہ اس خط میں مولانا کے خلاف ان کے قلم سے نکلی تھیں۔ عبدالماجد کے خیال میں یہ خط شروع ۱۹۱۴ء کا ہے۔ اگر ماجد صاحب اس خط کی اشاعت ضروری سمجھتے تھے اور اس کے بغیر ان کا مجموعہ ناقص رہتا تھا، تو ان کا فرض تھا کہ سید صاحب قدس سرہٗ کا خط بھی درج کرتے کیونکہ مجموعہ مکتوبات سلیمانی کا تھا۔ اس خط کی اشاعت سے عبدالماجد نے اپنے بغض کو آسودہ کرنا چاہا ورنہ یہ خط نہ تو سید صاحب نے شائع کرنے کا حوصلہ کیا، نہ سید صاحب کی موت پر صدق نے ان کے نام مولانا کے خطوط میں شائع کیا۔ اور نہ مولانا کی وفات پر چھاپا گیا۔ نصف صدی

تک خط پڑا رہا۔ جب کاتب اور مکتوب الیہ اللہ کو پیارے ہو گئے تو عبدالماجد نے اس کی اشاعت سے اپنے دل کی ڈھارس بندھائی۔ سید صاحب نے اس خط میں مولانا کے اسرار پر دس باتیں لکھیں کچھ تو ان کی ذات کے متعلق تھیں، کچھ الہلال کی تحریر و مضامین سے متعلق اور کچھ مالی امانت و خیانت کے متعلق۔ مولانا نے اس خط میں سید صاحب کو صدیقی الجلیل الاعز کے لقب سے مخاطب کیا۔ اور نہایت اخلاص سے جواب دیا۔ کہ آپ جن بدگمانیوں کا شکار ہیں وہ صحیح نہیں۔ ایک چیز مولانا نے ترجمان القرآن کے دیباچے میں لکھی ہے کہ وہ فسق والحاد کی تمام وادیوں سے نکلے ہیں۔ اس خط میں بھی انہوں نے اس مختصر دور کا ذکر کیا کہ شاید ہی فسق و فجور کا کوئی درجہ ایسا ہو جو مجھ بد بخت سے رہ گیا ہو۔ لیکن الہلال شروع کیا تو یہ سب باتیں ختم ہو چکی تھیں۔ مولانا نے اس خط میں لکھا کہ "ایک شخص نے آپ کے حوالے سے لکھا ہے، تم شراب پیتے ہو اور اسی وجہ سے سید سلیمان چلے گئے ہیں، میں نے جی میں کہا یہ تو صحیح نہیں ہے۔ معلوم نہیں اس کی نسبت آپ کا بیان صحیح ہے یا غلط، میں شراب پیتا تھا اور شراب پر کیا موقوف ہے، میں نے سبھی طرح کی سیہ کاریاں کی ہیں، لیکن الحمدللہ خدا نے مجھے توبہ کی توفیق دی اور اب نہیں کرتا۔" سید صاحب نے مولانا پر شک کیا کہ چندوں کے معاملہ میں شاید نقص امانت ہو رہا ہے۔ مولانا نے لکھا کہ آپ کے اس بیان سے دل بہت زخمی اور غمگین ہوا کہ آپ کے نزدیک میں حرام خور اور اخبث ہو گیا ہوں۔ اس طویل خط میں سید صاحب کی تمام غلط فہمیوں کا ازالہ کیا۔ وہ چاہتے تو سید صاحب کے خط کو نظر انداز کر سکتے تھے اور جواب نہ دیتے۔ لیکن انہوں نے ایک بلند انسان ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا اور سید صاحب کی بدظنی کو رفع کیا۔ مولانا ۲۰ سال کی عمر سے قبل کچھ عرصہ لہو و لعب اور الحاد و انکار کی صحبتوں میں رہے پھر دستبردار ہو گئے۔ ان کی زندگی میں انقلاب آ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے فضل و کرم اور علم و نظر کے دروازے کھول دیئے۔ خود عبدالماجد ایک بڑی عمر تک ملحدوں میں شامل رہے اور تماشہ، لکھنؤ کی صحبتیں ان کے شریک حال رہیں۔ غالباً اپنے اس دور کی تشفی کے لیے انہوں نے مولانا کا خط دارالمصنفین سے ہتھیا کر مکتوبات سلیمانی میں شامل کیا۔ جب انہوں نے توبہ کی اور اسلام کی راہ پر آ گئے تو ان کا "عبدالماجد" سراپا بدل گیا۔ ان کا قلم اور ان کی زبان دونوں مسلمان ہو گئے۔ اگر کوئی شخص ان کے فسق و الحاد کی زندگی کریدے تو یہ اس کی بد مذاقی ہو گی۔ لیکن عبدالماجد کے نفس کی معراج کہیے کہ ایک طرف گور کنارے پہنچ کر مولانا کے کفن کو اپنے قلم کی مقراض سے کاٹنا چاہا۔ دوسری طرف لہو و لعب میں ڈھلے ہوئے کئی انسانوں کا دفاع کیا۔ حتیٰ کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے

صرف اس لیے طرفدار ہو گئے کہ مولانا آزادؒ سے عناد و اہتمام میں وہ بھی ان کے شریک سخن تھے انہیں یاد ہی نہ رہا کہ بابائے اردو علامہ شبلی نوراللہ مرقدہ پر چھینٹے اڑانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اور اگر کوئی مولف علامہ شبلی کی رنگین زندگی یا "حیات معاشقہ" کے زیر عنوان قلم اٹھاتا ہے تو اس کا دیباچہ بھی سج دھج سے لکھتے ہیں۔ عبدالماجد جانتے تھے کہ بابائے اردو کا مذہبی ذوق کیا ہے۔ ان کا ذہن خدا کے تصور سے کس عمر تک منفی رہا۔ اور ان کی داستان حیات میں غزل کی خصوصی جھلک کس قدر رہی۔ لیکن مولانا ابوالکلامؒ سے بغض و عناد نے ان سب چیزوں پر پانی پھیر دیا۔ انہیں یاد ہی نہ رہا کہ بابائے اردو نے مولانا محمد علی کے متعلق "چند ہم عصر" میں کیا لکھا تھا اور وہ دارالمصنفین کے متعلق کشادہ دل نہ تھے۔ اور نہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے متعلق انہیں کوئی حسن ظن تھا۔ عبدالماجد بابائے اردو سے اس لیے قریب ہو گئے کہ مولانا آزادؒ سے متعلق وہ ان کے ہم مشرب تھے۔ اور پاکستان میں مولانا کے خلاف ہر چیز کہہ سکتے تھے۔

عبدالماجد نے مکتوبات سلیمانی میں مولانا کا خط کس طرح شامل کیا اس کا حال دارالمصنفین اعظم گڑھ میں سید صاحب کے جانشین اور ان کی سوانح عمری کے مرتب معین الدین ندوی نے راقم کو انہی دنوں لکھا تھا وہ خط ۸ دسمبر ۱۹۶۲ء کا تحریر کردہ اور حسب ذیل ہے:

مکرمی!

السلام علیکم۔ امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ یہ خط ایک غرض سے لکھنے کی ضرورت پیش آئی۔ مولانا ابوالکلامؒ اور مولانا عبدالماجد صاحب کے معاملات میں دارالمصنفین کی پوزیشن آپ کو معلوم ہو چکی ہے۔ لیکن سید صاحب کا تعلق دارالمصنفین سے ایسا گہرا اور ناقابل انقطاع ہے کہ ان کی ان تحریروں کا بھی جن کو براہ راست دارالمصنفین سے کوئی تعلق نہ ہو اس سے ربط پیدا کیا جا سکتا ہے۔

مولانا عبدالماجد صاحب نے اپنے مکتوبات سلیمانی کا مجموعہ شائع کر دیا ان میں بعض خطوط ایسے بھی ہیں جن کی اشاعت مناسب نہ تھی۔ مولانا ابوالکلام کا ایک خط جس کو انہوں نے حاشیہ میں شائع کیا ہے ہم لوگوں کی نگاہ میں ہرگز قابل اشاعت نہ تھا۔ گو اس سے مولانا کی بڑائی ہی ظاہر ہوتی ہے لیکن اس سے فتنہ بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ ہم لوگ ان تمام خطوط کی

اشاعت کے خلاف تھے جن سے کسی کی توہین کا پہلو نکلتا ہو۔ یا کسی کی دل آزاری ہوتی ہو یا کسی کی نگاہ میں سید صاحب کی پوزیشن مجروح ہوتی ہو۔ چنانچہ ہم سب نے مولانا عبدالماجد کو اس سے روکنے کی کوشش کی، مگر انہوں نے کسی کی شنوائی نہیں کی۔ مولانا عبدالماجد کا خط ان کے دوسرے خطوط کے ساتھ دارالمصنفین میں محفوظ تھا۔ میں نے ان کے اور سب خط معارف میں شائع کئے تھے، مگر اس کو شائع نہیں کیا تھا۔ مولانا عبدالماجد صاحب کے علم میں یہ خط تھا۔ انہوں نے کئی سال ہوئے اس کی نقل مانگی تھی۔ اس وقت مکتوبات سلیمانی کی اشاعت کا کوئی ذکر بھی نہ تھا۔ میں اس کی نقل دینے سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اس شرط کے ساتھ ان کو نقل بھجوا دی تھی کہ اس کو کہیں شائع نہ کیا جائے گا۔ لیکن دفعۃً معلوم ہوا کہ انہوں نے مکتوبات سلیمانی کے حاشیہ میں اس کو شائع کر دیا ہے گو اس کی اشاعت کا نتیجہ اُلٹا نکلا۔ اس لیے کہ اس سے مولانا ابوالکلامؒ کی توہین کی بجائے ان کی بڑائی ظاہر ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں ان خطوط کی اشاعت کی ذمہ داری دارالمصنفین پر نہیں ہے۔ بلکہ اس نے اس کو اپنی ایجنسی میں بھی نہیں رکھا ہے۔ اس بارے میں جلد ہی معارف میں تفصیل سے لکھوں گا۔ ادھر میں مسلسل سفر میں رہا۔ ورنہ شاید دسمبر کے پرچے میں میری تحریر نکل جاتی۔ اب رہ گیا مولانا ابوالکلام کے متعلق سید صاحب کے خیالات کا سوال تو اس میں چند پہلوؤں پر نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ دونوں بزرگ نہ صرف معاصر تھے بلکہ نوجوانی میں "علامہ سید سلیمان ندوی" اور "امام الہند مولانا ابوالکلام" بننے سے پہلے برسوں ایک ساتھ رہ چکے تھے۔ اور اس زمانہ کے ایک دوسرے کے محاسن و معائب سے واقف تھے۔ اس لیے وہ ایک دوسرے کو اس نظر سے نہیں دیکھ سکتے تھے جس نظر سے ہم ان کو دیکھتے ہیں۔ پھر یہ خطوط نوجوانی کے زمانہ کے ہیں۔ جب دو نوجوانوں میں اس قسم کی بدگمانیوں کا پیدا ہو جانا نہ قابل تعجب ہے اور نہ قابل اعتراض۔ اصل اعتبار تو پختہ عمر کے خیالات کا ہوتا ہے اور مجھے یہ معلوم ہے اس مجموعہ کے بعض خطوط سے بھی اس کی شہادت ملتی ہے کہ مولانا ابوالکلام کے متعلق سید صاحب کے خیالات بہت بدل گئے تھے، میں نے بارہا سید صاحب کی زبان سے مولانا کے علم و فضل

ذہانت وطباعی، اصابت رائے اور دوسرے علمی و اخلاقی کمالات کا اعتراف سنا ہے۔ انہوں نے ترجمان القرآن کے ریویو میں جن الفاظ میں مولانا کے کمالات کی داد دی ہے اس کی توقع کسی ہم مرتبہ معاصر سے مشکل ہی سے کی جا سکتی ہے۔ یہ ممکن ہے ان میں معاصرانہ چشمک بھی رہی ہو اور کبھی کبھار اس کے مظاہر بھی نظر آ جاتے ہوں۔ تو اس سے نہ صرف معاصر علماء بلکہ مشائخ و صوفیا تک خالی نہیں ہیں۔ مگر اس سے نہ کسی کی عظمت اور بڑائی پر حرف آتا ہے اور نہ کوئی سوءِ ظن پیدا کرنا صحیح ہے۔ ہم اہلِ سنّت کا جن میں آپ بھی شامل ہیں عقیدہ تو یہ ہے کہ اکابر کے معاملات میں سکوت سے کام لیں۔

اس تحریر کا مقصد یہ ہے کہ اس مجموعہ کو دار المصنفین سے کوئی تعلق نہیں۔ اور نہ اس کے کارکنوں نے قابلِ اعتراض مکاتیب کی اشاعت پسند کی۔ اس لیے جب آپ اس پر لکھیں تو ان حقائق کو نگاہ میں رکھیں۔ اس خط کی رسید کا انتظار رہے گا۔ والسلام

(معین الدین احمد)

بابائے اُردو نے مولانا کی زندگی میں تو کبھی "انکشاف" نہ کیا لیکن ان کی رحلت کے دو چار روز بعد اسلامیہ کالج لاہور کے طلباء کی بزمِ فروغِ اردو سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"مرحوم مولانا ابوالکلام آزاد نے انہیں بلا کر کہا تھا کہ وہ اردو کی حمایت سے دست کش ہو جائیں ورنہ ان کے مکان میں ناجائز چرس یا افیون رکھ کر پکڑوا دیا جائے گا۔"

راقم نے بابائے اُردو کے اس انکشاف یا الزام پر ۲ مارچ ۱۹۵۹ء کے چٹان میں اداریہ لکھا اور ان سے سوال کیا کہ اس روایت کی حقیقت کیا ہے؟ بابائے اردو کو معلوم تھا کہ وہ پاکستان میں اس طرز کی روایتیں بآسانی گھڑ سکتے ہیں۔ انہوں نے روایت گھڑلی اور پاکستان کے سیاسی ذہن سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ اس کے برعکس بابائے اردو کے ایک شاگرد ڈاکٹر عبادت بریلوی پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور نے "نقوش" کے شخصیات نمبر میں ایک دوسری کہانی لکھی کہ "حکومتِ ہند اور بابائے اُردو کے درمیان انجمن ترقی اُردو کے معاملات طے کرنے کے لیے کئی دن تک طویل گفت گو ہوتی رہی۔ حکومت کی طرف سے مولانا ابوالکلام آزادؔ اس کام کے لیے مقرر تھے۔ مولانا دورانِ گفت گو میں بار بار یہی کہتے کہ حکومت یہ نہیں چاہتی کہ آپ ہندوستان میں رہیں۔ مولوی صاحب (بابائے اردو) سے نہ رہا گیا۔ جل کر کہنے لگے۔ آپ بار بار حکومت

کا ذکر کرتے ہیں کہ حکومت یہ نہیں چاہتی، حکومت وہ نہیں چاہتی۔ حکومت اب کہاں ہے؟ وہ تو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ختم ہوگئی۔ آپ اپنے آپ کو حکومت سمجھتے ہیں۔ بابائے اردو نے بیان کیا کہ مولانا آزادؔ کو یہ بات بڑی تو بہت معلوم ہوئی، کیونکہ جب میں نے یہ بات کہی تو ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا ظاہر ہے کہ یہ سفید جھوٹ تھا۔ بابائے اُردو اس کس بل کے انسان ہی نہ تھے کہ ۱۵ اگست کے بعد مولانا سے اس انداز میں گفتگو کرتے یا حکومت ہند ان سے مذاکرہ کرتی۔ اللہ تعالیٰ ہی علیم وخبیر ہیں، کہ بابائے اردو نے ڈاکٹر عبادت بریلوی کو اپنی فرضی جرأت سے آگاہ کیا۔ یا ڈاکٹر صاحب نے ان کی شخصیت کو بالا کرنے کے لیے افسانہ وضع کیا۔ پروفیسر آل احمد سرور بابائے اُردو کے بعد انجمن ترقی اُردو ہند کے سکرٹری تھے۔ انہوں نے راقم کو اپنے ایک خط محررہ ۲۳ اپریل ۱۹۵۹ء میں لکھا کہ مولانا آزادؔ کے متعلق مولوی عبدالحق صاحب کے ریمارک دیکھ کر خیال آیا تھا کہ صورتِ حال سے آپ کو آگاہ کردوں۔ مگر بعد میں حقیقت خود ہی سامنے آگئی۔ مولوی عبدالحق صاحب میرے بزرگ و محترم ہیں اور مجھے ان سے بہت عقیدت ہے مگر مولانا مرحوم کے متعلق ان کی رائے مجھے معلوم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے انجمن کی بڑی مدد کی۔ اگر وہ فساد کے زمانے میں حفاظت کا انتظام نہ کرتے تو کتب خانہ بالکل برباد ہوگیا ہوتا۔ مولانا نے اگر مولوی صاحب کو پاکستان جانے کا مشورہ دیا ہوگا تو اس بنا پر کہ وہ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں کام کرنا چاہتے تھے۔ اور یہ کسی طرح مناسب نہ تھا کیونکہ ان حالات میں دونوں طرف غلط فہمی اور کام میں نقصان کا قوی احتمال تھا۔ انجمن کی مولانا آزاد نے جو مدد کی ہے وہ سب پر ظاہر ہے اور مولانا کے کردار کی بلندی کسی سے پوشیدہ نہیں۔"

بابائے اُردو نے جو کچھ کہا اور ڈاکٹر عبادت بریلوی نے جو لکھا اس کی حقیقت مولانا آزادؔ کے اس ایک خط سے آشکار ہو جاتی ہے۔ جو آپ نے ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو مولوی عبدالحق کے نام لکھا، لیکن وہ خط بابائے اردو نے جیتے جی اخفا میں رکھا۔ پھر جب ان کا انتقال ہوگیا تو ابوسلمان شاہجہانپوری نے مکاتیب ابوالکلام میں شائع کیا۔ خط حسب ذیل ہے۔

۲۰ اکتوبر ۱۹۴۸ء دھلی

جنابِ من

آپ اپنے خط مورخہ ۱۸ اکتوبر میں لکھتے ہیں:"آپ نے انجمن کے متعلق جو مشورہ

دیا تھا، اس سے مجھے اتفاق ہے۔" مشورہ سے مقصود غالباً یہ معاملہ ہے کہ اب انجمن ترقی اردو کو پاکستان منتقل کر دیا جائے۔ اگر میرا یہ قیاس صحیح ہے تو مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آپ نے صورت حال کی جو تعبیر کی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ براہ عنایت اپنے فیصلے کو میرے مشورے کا جامہ نہ پہنائیے۔

اس سلسلہ میں جو حالات پیش آئے وہ حسب ذیل ہیں۔ دھلی کے فساد کے بعد جب آپ آئے تو آپ نے مجھے یقین دلایا کہ انجمن بدستور اپنے کاموں کو ساری و جاری رکھنا چاہتی ہے اور آپ ایک نیا مکان دفتر کے لیے ڈھونڈھ رہے ہیں۔ اس کے بعد آپ کراچی چلے گئے اور ایک عرصہ تک کوئی خبر آپ کی نہیں ملی۔ اب آپ آئے تو آپ کے پرمٹ سے معلوم ہوا کہ آپ نے انڈین یونین کی سکونت ترک کر دی ہے۔ اور پاکستان کے باشندے ہونے کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ ساتھ ہی معلوم ہوا کہ کراچی میں آپ نے ایک مکان حاصل کر لیا ہے اور انجمن کو وہاں منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ چند دنوں کے بعد جب آپ مجھ سے ملے تو میں نے یہ رائے ظاہر کی کہ تعطل و تعلیق کی موجودہ صورت حال جلد سے جلد ختم کر دینی چاہیے۔ آپ نے ایک قدم پاکستان میں جما یا ہے اور دوسرا یہاں رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ طرز عمل انجمن کے لیے مفید نہ ہوگا۔ اس پر آپ نے کہا کہ آپ کو کراچی میں ایک بہت اچھا مکان مل گیا ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ انجمن کو وہاں منتقل کر دیں۔ پس اس بارے میں آپ نے جو رائے بھی قائم کی ہے، آپ کی رائے ہے۔ اسے میرے مشورے سے تعبیر کرنا صحیح نہیں ہو سکتا۔

جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے میں بار بار یہ خیال ظاہر کر چکا ہوں کہ انجمن ہندوستان میں قائم ہوئی تھی اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کیوں وہ اپنا کام یہاں جاری نہ رکھے؟ جہاں تک گورنمنٹ آف انڈیا کا تعلق ہے وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی خواہشمند نہیں ہے کہ انجمن اپنے کاموں کو یہاں بند کر دے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اسی سال ایجوکیشن منسٹری نے انجمن کے لیے ایک گرانٹ منظور کی ہے اور اسے کام میں نہ لانے کی پوری ذمہ داری ارکان انجمن کے سر ہے۔ چار لاکھ عمارت کے لیے اور چالیس ہزار سالانہ انجمن کے

کاموں کے لیے گورنمنٹ منظور کر چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو گورنمنٹ انجمن کو گرانٹ دے رہی ہے وہ انجمن کے اجراء کار کی مخالف کیسے ہو سکتی ہے؟

آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ گرانٹ کی درخواست انٹیرم گورنمنٹ کے زمانہ میں کی گئی تھی اس وقت مالیات کا محکمہ مسٹر لیاقت علی کے ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے گرانٹ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب نئی قومی حکومت بنی تو اس عہد میں از سر نو یہ معاملہ اٹھایا گیا اور گرانٹ منظور کی گئی۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انجمن پورے سکون اور جمعیت کے ساتھ اپنے کاموں کو آگے بڑھا سکتی ہے۔ بشرطیکہ کام کرنے کا ارادہ ہو۔ میں چاہتا ہوں اس سلسلہ میں کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ اس لیے مہربانی کر کے ۲۶ اکتوبر کے مجوزہ جلسہ کے سامنے اصل واقعہ پیش کر دیا جائے۔ والسلام

ابوالکلام

سید صاحب بہر حال ایک علمی شخصیت تھے۔ انہوں نے علامہ شبلی کی جانشینی کا حق ادا کیا علامہ اقبال اکثر دینی مسائل میں ان سے رجوع کرتے اور ان کے اس درجہ معترف تھے کہ انہیں استاذ الکل لکھا۔ سید صاحب کی مولانا سے کشیدہ خاطری کا سبب آخر تک معلوم نہ ہو سکا۔ ظاہراً ایک ہی شکایت تھی کہ الہلال (دورِ اول) کے بعض مضامین "الحریت فی الاسلام" "تذکار نزول قرآن" "حبشہ کی تاریخ کا ایک ورق" "قصص بنی اسرائیل" اور "مشہد اکبر" مولانا کے نام سے کسی مجموعہ میں چھپ گئے تو مولانا نے اس انتساب کی تردید نہ کی۔ سید صاحب کا دعویٰ تھا کہ یہ مضامین ان کے قلم سے تھے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ مضامین سید صاحب کے قلم سے تھے یا نہیں؟ اور تھے تو کس قدر؟ کیونکہ سید صاحب کا طرز نگارش ہمیشہ ان سے مختلف رہا ان کی تمام تحریروں کا رنگ ہی دوسرا ہے۔ ان مضامین سے مولانا ہی کا طرز جھلکتا ہے۔ مولانا اور سید صاحب کی وفات کے بعد جب ان مضامین کی ملکیت کا سوال پیدا کیا گیا اور سید صاحب کے بعض عقیدت مندوں نے دعویٰ کیا تو مولانا کے مخلصین نے جوابی مضامین میں اس دعوی کی تغلیط کی اور لکھا کہ ان مضامین کا طرز نگارش مولانا کا اسلوب نگارش ہے اور اگر وہ مضامین سید صاحب کے تھے تو الہلال سے رخصت ہونے کے بعد ان کی کسی تحریر میں اس رنگ کی جھلک یا پرتو نہیں۔ حقیقتاً یہ ایک غلط بحث تھی۔ جن مجموعوں میں یہ مضامین چھپے وہ مولانا نے مرتب نہیں کیے تھے۔ مولانا قلعہ احمد نگر میں نظر بند تھے تو اس دوران میں بعض چلتروں

نے الہلال کے دستیاب شماروں میں سے بعض مضامین اخذ کیے اور اپنی دوکانداری کے لیے چھاپ لیے۔ مولانا کو ان مجموعوں کا علم ہی نہ تھا۔ جب انہیں معلوم ہوا تو انہوں نے ناشروں کی اس حرکت پر افسوس کیا۔ لیکن وہ کس سے کہتے اور کیا کہتے ؟ اگر فی الواقعہ یہ کوئی بہت بڑا زیان تھا تو سید صاحب خود مولانا کو لکھ سکتے تھے۔ پھر ان مضامین کی اہمیت ایسی نہ تھی کہ مولانا نے خود کسی مجموعہ میں شامل کیا ہو یا اس سے کچھ حاصل کیا ہو۔ جو لوگ اس طرح کی حرکتیں کرتے رہے وہ ان سے اعتنا ہی نہ کرتے تھے۔ لاہور کے ایک پبلشر نے ایک بوسیدہ قلم مصنف سے خدیجہ نام کا ڈرامہ لکھوا کر مولانا کے نام سے شائع کیا۔ اور دیباچہ میں لکھا کہ ہیں نے آئندہ اپنی زندگی اس طرح کی تحریروں کے لیے وقف کر دی ہے۔ پورا ڈرامہ مولانا کی ادبی عظمت کے خلاف ایک بازاری مذاق تھا۔ اور اس کی زبان انتہائی ناقص تھی۔ لیکن مولانا ان چیزوں کا نوٹس ہی نہ لیتے تھے ہو ں نا کے علم میں سید صاحب کی ذہنی ناراضی آئی اور ان مضامین کا ذکر ہوا تو فرمایا ان کی ناراضی میرے لیے تعجب کا باعث ہے۔ میرے علم میں ایسا کوئی مجموعہ نہیں کسی پبلشر نے کوئی غلطی کی ہے تو اس کی تصحیح وہ خود کر سکتے تھے، الہلال کے جس مضمون کو وہ اپنے قلم سے منسوب کرنا چاہتے ہیں، مجھے کوئی عذر نہیں وہ اس پر اپنا حق قائم کر سکتے ہیں۔

ایک عجیب حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب نے اپنے تمام مضامین کے مجموعے شائع کرائے لیکن الہلال کے مبینہ مضامین کو شامل نہ کیا۔ مولانا نے ایسے کسی مجموعہ کی ضرورت ہی محسوس نہ کی اور نہ ان مضامین پر کبھی کوئی دعویٰ کیا۔ ان مضامین میں انشاء کا بانکپن ضرور ہے لیکن فکر و نظر کی متاع نہیں۔ ایک ہفتہ وار جریدے کی روایت کے شگفتہ مضمون ہیں۔ اگر فی الواقعہ مذکورہ مضمون سید صاحب کے قلم سے تھے تو ان دو چار مضمونوں کے لیے سید صاحب کا یکایک اس بنا پر ناراض ہو جانا کہ مولانا کے نام سے کسی ناشری مجموعہ میں چھپ گئے ہیں، ان کے مقام و مرتبہ سے بعید تھا ؎

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

الہلال صرف ان چار مضمونوں کی وجہ سے نہ ابھرا تھا۔ اس میں سینکڑوں مضمون چھپے اور وہ سحر مولانا کے قلم کی بدولت تھا۔ جس نے الہلال کو الہلال بنا دیا۔ سید صاحبؒ نے الہلال کے ادارہ تحریر سے الگ ہو کر جن خطرناک بدگمانیوں کا اظہار کیا مولانا نے ہر ایک کا جواب دیا۔ اور وہ جواب عبدالماجد نے مدۃ العمر کے بعد دارالمصنفین سے بہ لطائف الحیل حاصل کر کے مکتوبات سلیمانی میں شائع کر دیا۔ سید صاحبؒ

کی بدگمانیاں رفع ہو چکی تھیں تو انہوں نے یوسف ثانی کے عنوان سے مولانا کو خراج ادا کیا۔ اور اس پر ختم کیا کہ ان سطروں کو لکھتے وقت مجھ کو یہ دھوکا ہو رہا ہے کہ میں خود ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ یا شمس الائمہ سرخسیؒ اور اُمیہؒ بن عبدالعزیزؒ اندلسی کے حالات تو نہیں لکھ رہا۔ پھر جب ترجمان القرآن کی دو نو جلدیں شائع ہو گئیں تو سید صاحب نے اس کے مجالس و مطالب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ترجمان القرآن وقت کی اہم چیز ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو گھر گھر پھیلایا جائے اور نوجوانوں کو اس کے مطالعہ کی ترغیب دی جائے۔ اور ہر اسلامی دارالمطالعہ میں اس کا ایک نسخہ منگوا کر رکھا جائے۔“ لیکن اپنی عمر کے آخری موڑ میں سید صاحب مولانا سے ناراض ہو گئے۔ تو شدنی و ناشدنی سبھی کچھ ان کی زبان پر آ گیا۔ جو ان کی علمی وجاہت کے منافی تھا۔ اس سلسلہ میں مسعود علی ندوی اور معین الدین ندوی نے راقم کو جو خطوط لکھے۔ ان میں تو ناراضی سے انکار کیا۔ اور سید صاحب کے مولانا سے اخلاص کا ذکر کیا۔ لیکن عبدالماجد نے راقم کے نام اپنے خط بابت ۱۹ مارچ ۱۹۳۸ء میں تسلیم کیا کہ ”سید صاحب کو مولانا سے متعدد رنجشیں اور شکایتیں رہیں جن کا اظہار وہ اپنی صحبتوں میں برابر کرتے تھے۔ سید صاحب کو غبارِ خاطر اور تذکرہ کے متعدد بیانات پر اعتراض تھا مثلاً مولانا کا سفر عراق یا مولانا کے مورثوں میں فلاں فلاں بزرگ کا ہونا ان سب کو وہ افسانہ سمجھتے تھے۔ اسی طرح ترجمان القرآن کے وہ ذرا بھی قائل نہ تھے۔“

راقم نے بعض دوسرے خطوط کے ساتھ ۱۵ فروری ۱۹۶۵ء کے چٹان میں یہ خط شائع کیا۔ اس وقت مسعود علی ندوی اور معین الدین ندوی حیات تھے۔ اس خط کے ضمن میں راقم نے لکھا تھا کہ ”مولانا نے کبھی خلوت و جلوت میں اشارۃً یا کنایۃً کبھی سید صاحب کے خلاف کوئی لفظ نہیں کہا ہمیشہ احترام سے ذکر کیا اور ان کی علمی خدمات کو سراہا۔ سید صاحب کی رنجشیں اور شکایتیں کیا تھیں عبدالماجد نے سبھی کچھ لکھا لیکن ان کی چہرہ کشائی نہ کی۔ اور نہ دارالمصنفین سے معلوم ہو سکا۔ حتیٰ کہ سید صاحب کے غالی عقیدت مند بھی اس سلسلہ میں کچھ بتانے سے قاصر رہے۔ فی الواقعہ سید صاحب کو شخصی یا حزبی کوئی سی رنجش یا شکایت نہ تھی۔ اگر کچھ تھا تو معاصرت کا روایتی شعار تھا۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں ”علما کا علم قبول کرو لیکن ایک کے خلاف دوسرے کے قول کا یقین نہ کرو کہ بخدا بکریوں میں بھی وہ جلن نہیں ہوتی جیسی علماء میں ہوتی ہے۔“ اسی طرح ابوحازم کا قول ہے کہ ہمارے زمانے کی حالت یہ ہے کہ عالم اپنے سے بڑے عالم میں کیڑے نکالتا ہے۔“

مولانا کو بتایا گیا کہ سید صاحب ان سے متعلق پاکستان میں اس قسم کی باتیں کرتے ہیں تو فرمایا کہ ان کے متعلق اپنی سوچ کو غلط راستہ پر ڈال کر میں زبان کی معصیت کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ سید صاحب کو میرے بزرگوں کے متعلق کوئی سا شبہ ہے تو ان کی رنجش یا شکایت مجھ سے کیا ہوئی؟ میں نے تذکرہ میں لکھا ہے کہ "میں حسب و نسب کا استخواں فروش نہیں اور کبھی اس طرح نقد عزت و شرف کے حصول کی جستجو نہیں کی۔ اسلام کے نزدیک ایک انسان کا حسب و نسب اس کا علم و عمل ہے"۔

عبدالماجد کی اس روایت پر کہ سید صاحب ترجمان القرآن کے ذرا بھی قائل نہ تھے۔ راقم نے چٹان میں ان سے سوال کیا تھا کہ ترجمان القرآن پر سید صاحب نے معارف پر جو تبصرہ کیا تھا، وہ تقیہ تھا، تسامح تھا یا ظاہر و باطن کا تضاد؟

اگر سید صاحب کو فی الواقع کوئی شکایت یا رنجش ہوتی تو غلام محمد بی اے (عثمانیہ) مولف "تذکرہ سلیمان" ضرور لکھتے۔ انہوں نے عقیدت کے غلو میں سید صاحب کو ضیاء بخش الہلال لکھا اور الہلال سے ان کی علیحدگی کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا کہ "الہلال پر نام چونکہ مولانا آزاد کا ہوتا تھا اس لیے بہت سوں کو پتہ بھی نہ چل سکا کہ الہلال کس کی کرامت سے بدر کامل بن گیا ہے۔ مگر جب ایک سال کی رفاقت کے بعد بعض وجوہ سے صاحب کرامت ہستی بے تعلق ہو گئی تو جو بدر تھا وہ ہلال بھی نہ رہ سکا، محاق بننے لگا۔ مولانا آزاد گھبرائے، سید صاحب کو خط لکھا کہ آپ آ کر الہلال بالکل لے لیجیے اور جس طرح جی چاہے اسے ایڈٹ کیجیے۔ صرف اپنے مضامین دے دیا کروں گا اور کچھ تعلق نہ ہو گا۔"

گویا الہلال کے لیے عملہ کی تلاش مولانا کا نقص تھا اور سید صاحب کے بغیر الہلال کا سبو خالی ہو جاتا تھا۔ سید صاحب الہلال کے دورِ اول میں غلام محمد کی روایت کے مطابق ایک سال منسلک رہے اور الہلال اس دور میں دو سال چار مہینے نکلا۔ پھر ضبطی ضمانت کے باعث بند ہو گیا۔ غلام محمد کے نزدیک غالباً اسی بندش کا نام محاق تھا۔ پھر ایک سال بعد البلاغ نکلا اور پورے پانچ ماہ جاری رہا۔ مولانا مارچ ۱۹۱۶ء میں بنگال بدر نہ کیے جاتے اور ۳۰ مارچ ۱۹۱۶ء سے یکم جنوری ۱۹۲۰ء تک رانچی (آسام) میں نظر بند نہ ہوتے تو الہلال سید صاحب کی عملہ سے علیحدگی کے بعد بھی چل رہا تھا۔ حکومت قدغن عائد نہ کرتی تو البلاغ جاری رہتا۔ لیکن مولانا کی نظر بندی سے صورتِ حال مختلف ہو گئی اور رہا ہوئے تو ان کے شب و روز سیاست کے ہو گئے۔

سید صاحب نے پاکستان آکر مولانا کے خلاف بہت سی باتیں کیں۔ کچھ تو وہی تھیں جن کا عبدالماجد کے حوالے سے ذکر آچکا ہے اور کئی ان کے شعلہ گفتار کی بعض دوسری چنگاریاں تھیں۔

۱۔ یہ کہ مولانا ملک سے باہر نہیں گئے۔ ان کا سفر عراق محض افسانہ ہے۔ یہ کہنا کہ بغداد میں کسی علمی صحبت، یا تعلیمی حلقہ سے مستفید ہوئے سراسر دروغ ہے۔

۲۔ ترجمان القرآن کا ایک انتساب مصنوعی کہانی ہے۔

۳۔ مسجد کانپور کی تحریک کے زمانہ میں مولانا بیماری کے عذر پر مسوری چلے گئے۔ اس موضوع پر الہلال میں جو کچھ نکلا وہ ان کے (سید صاحب) قلم سے تھا۔

سید صاحب نے اپنے ایک عقیدت مند کو "شہید اکبر" کے سلسلہ میں خط لکھا اور اس نے وہ خط چھپوا دیا۔ سید صاحب خود تو سامنے نہیں آتے لیکن مولانا کے خلاف کراچی کے ایک ماہنامہ میں یہ سب باتیں لکھوائیں انہی دنوں سید صاحب لاہور آئے تو احباب کے ہاں ایک دعوت میں مولانا کا ذکر چھڑ گیا۔ سید صاحب نے ان تجاہلاً فرمایا "ابوالکلام کا ذکر نہ کرو"۔ ایک نیازمند نے عرض کیا غالباً "آپ مولانا سے کچھ ناراض ہیں"۔ سید صاحب نے کہا "میں اس کا نام بھی برداشت نہیں کر سکتا"۔ اور یہ شرکاء محفل کے لیے ایک پراسرار جواب تھا۔ مولانا غلام رسول مہر اور ڈاکٹر سید عبداللہ بھی وہاں موجود تھے۔ دونوں ششدر رہ گئے کہ سید صاحب کس بلندی کے انسان ہیں اور کس سطح سے بول رہے ہیں۔

رہا یہ اعتراض کہ مولانا عراق نہیں گئے اور قیام عراق کا افسانہ وضع کیا تو یہ چیز اس طرح صاف ہو گئی کہ مولانا کی پہلی برسی پر پروفیسر ہمایوں کبیر نے مولانا سے متعلق مختلف افراد کے مضامین کا مجموعہ شائع کیا اس میں ایک مضمون مشہور فرانسیسی مستشرق لوئی مسکان کے قلم سے تھا اس نے لکھا کہ وہ اور مولانا آزاد ۸-۱۹۰۷ء میں بغداد کی مسجد مرجان میں حاجی علی آلوسی سے پڑھتے رہے اور حاجی علی آلوسی کے خزانہ علم و فضل سے جو موتی چنے ان سے مولانا آزاد کی نگاہیں پہلے ہی آشنا تھیں۔

سید صاحب کا دوسرا اعتراض ترجمان القرآن کے انتساب پر تھا۔ کہ محض عبارت آرائی ہے اور ساری کہانی مصنوعی ہے۔ اس کا رد بھی مولانا کی وفات کے اگلے ہی سال دسمبر ۱۹۵۹ء کے برہان دہلی میں ایک خط کی اشاعت سے ہو گیا۔ مولانا محمد یوسف کوکن ایم۔ اے مصنف "ابن تیمیہ" کو مولانا حکیم فضل الرحمٰن سواتی نے ایک طویل خط لکھا۔ جس میں اس شخص کی نشاندہی بھی کی جس کے نام ترجمان القرآن کا انتساب ہے

اس کا نام مولوی دین محمد قندھاری تھا۔ اور وہ اس خط کے مطابق جیسا کہ ترجمان القرآن میں درج ہے، قندھار سے پیدل کوئٹہ پہنچا۔ وہاں سے تین ہم وطن سوداگروں کے ساتھ آگرہ آیا اور آگرہ سے رانچی چلا گیا۔ وہاں مولانا سے استفادہ کر کے چپ چاپ لوٹ گیا، کچھ عرصہ مولانا عبد الباری کے فرنگی محل لکھنؤ میں استاد رہا۔ پھر شاہجہانپور چلا گیا۔ الہلال سے اس کے عشق کا یہ حال تھا کہ حکیم فضل الرحمٰن سواتی کو اس کے مطالعہ کا شوق دلایا پھر اپنے استاد مولانا عبد الحنان کو رغبت دلائی۔ حکیم فضل الرحمٰن ان کے لیے عاریتاً "البلاغ" کے تین پرچے لے گئے۔ اور کابل سے چار دن کی مسافت پیدل طے کر کے نعمان پہنچے۔ مولانا عبد الحنان نے مطالعہ کیا تو کہنے لگے "مولانا آزاد فی الواقعہ بڑے حق گو اور جری معلوم ہوتے ہیں"۔

سید صاحب کو مسجد کانپور کے سلسلہ میں شاید یاد نہ رہا کہ مولانا سے متعلق وہ "حیات شبلی" میں کیا لکھ چکے ہیں۔ انہوں نے نجی محفلوں میں بھی کہا اور ایک عقیدت مند کو خط بھی لکھا کہ مولانا مسجد کانپور کی تحریک کے دنوں میں بیماری کے عذر پر سوری چلے گئے تھے اور الہلال میں اس سلسلہ کے مضامین ان کے دستِ صاحب، قلم سے نکلے تھے لیکن سید صاحب نے حیات شبلی (صفحہ ۶۰۷) میں تحریر کیا ہے کہ "مولانا ابوالکلام اس زمانہ میں مسلمانوں کے سب سے مقبول راہنما اور اس تحریک کی جان تھے۔ علامہ شبلی نے مولانا کو لکھا برادرم۔ کانپور کا معاملہ جس طرح ہوا فیصل ہو گیا۔ اب سر دست اس سے آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں۔" اس صفحہ سے پہلے صفحہ ۶۰۱ پر لکھا کہ اس واقعہ کو واقعہ بنانے میں تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو مسلمانان کانپور کی پرجوش حمایت میں کھڑا کر دینے اور مقتول شہیدوں کے عزیزوں کی دلدہی اور دستگیری، زخمیوں کی غمخواری و تیمارداری اور قیدیوں کی قانونی چارہ گوئی کا غیر محدود جذبہ جس کی زبان وقلم کا سب سے زیادہ مرہون ہے وہ مولانا ابوالکلام آزاد کی ذات ہے۔" حیات شبلی ۱۹۴۳ء میں مکمل ہوئی اور اس وقت سید صاحب کا دل مولانا کے معاملہ میں برہم نہیں تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ سید صاحب اور ان کے بعض ندوی دوستوں نے مولانا سے ان کا ذہنی کھچاؤ بڑھایا۔ اور ان کے متعلق اہانت کی ہر تحریک پر اندر خانہ صاد کیا۔ حتیٰ کہ ہندوستانی مسلمانوں کی بیداری سے متعلق اپنی بعض کتابوں میں مولانا کی ہر نوعی خدمات سے صرف نظر کیا۔ سید صاحب نے حیات شبلی ہی کے صفحہ ۶۵۶ پر لکھا ہے کہ:

"ملک میں ندوہ کے انقلاب و اصلاح کا صور جس نے پھونکا وہ مولانا ابوالکلام کا آتش ریز قلم تھا۔"

اسی طرح حیات شبلی کے صفحہ ۵۰۰ پر ندوہ کے اجلاس لکھنؤ ۱۹۱۲ء کی روداد بیان کرتے ہوئے علامہ رشید رضا مصری کی صدارتی تقریر کا ذکر کیا کہ انہوں نے عربی زبان میں ڈھائی گھنٹہ تک ایک دل آویز و فصیح تقریر ارشاد فرمائی۔ ان کا انداز بیان ایسا دلچسپ تھا کہ سماں بندھ گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد عربی تقریر کا خلاصہ اُردو میں بتانے کے لیے کھڑے ہوئے تو بجائے خود سحر بیانی سے دلوں میں تلاطم برپا کر دیئے۔ ان کی قادر الکلامی کے خوب خوب مناظر سامنے آئے۔"

یہ صحیح ہے کہ سید صاحب نے اپنے قلم سے ایک آدھ خط کے سوا مولانا کے خلاف کچھ نہ لکھا۔ یا بعض نجی خطوں میں چٹکیاں لیتے رہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عمر کے آخری دور میں مولانا کے خلاف خوب کلوخ اندازی کی۔ ان کا نام آتے ہی بھڑک اُٹھتے۔ اس ناراضی کا سبب کوئی ٹھوس نہ تھا۔ اگر مسلم لیگ کی سیاست کے باعث کشیدہ ہوتے تو اس طرز کی باتیں نہ کرتے۔ سید صاحب لیگ کے ساتھ کبھی نہ رہے تھے۔ خود علامہ شبلی لیگ کے مخالف تھے۔ ان کے ساتھیوں کا ذہن بھی لیگی سیاست سے متفق نہ تھا۔ مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمۃ کی بیعت کے بعد ان کی کایا کلپ ضرور ہوئی اور شاید اسی فضا کا اثر تھا کہ وہ تھانوی گروپ کی سیاسی شرمندگی مٹانے کے لیے مولانا کے خلاف گل کرتے لگے۔ مولانا احتشام الحق تھانوی کی تحریک پر پاکستان آ گئے لیکن جس خواب کو لے کر پاکستان آئے تھے اس کی تعبیر سے محروم رہے پاکستان نے ان کے تبحر علمی سے فائدہ نہ اٹھایا۔ بلکہ ان کے ساتھ ہر سیاسی وعدہ دوشیزہ کی کہہ مکرنی ہو گیا۔

سید صاحب کی ناراضی کے ایسے ہی کچھ اور سبب تھے۔ مثلاً دو تو علامہ شبلی سے فیض یاب تھے۔ سید صاحب تو ان کے شاگرد رشید تھے لیکن مولانا ایک دوست تھے۔ علامہ شبلی آزاد سے بے تکلف تھے اور یہ سید صاحب کی معاصرت کو گوارا نہ تھا۔ مولانا سیاست کی رفعتوں کو پہنچ گئے تو پرانے دوستوں سے بے تعلق سے ہو گئے۔ سید صاحب کو اس کی شکایت رہی۔ جب مولانا قلعہ احمد نگر سے رہا ہوئے اور ۱۹۴۶ء میں غبار خاطر چھپی تو سید صاحب نے جون ۱۹۴۶ء کے معارف میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

> "مخاطب تنہا" صدیق مکرم حبیب الرحمٰن خان شیروانی ہیں جن کے ساتھ ان کے چہل سالہ تعلقات محبت ہیں۔ لیکن بعض ان کے ایسے صدیق بھی زندہ ہیں جن کو گو دوستی کا دعویٰ نہیں لیکن نیاز مندی کا تو ہر حال ہے۔ اور جن کی مدت اس چالیس سال کے تعلق سے بھی زیادہ ہے۔ اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ لسان الغیب حافظ نے اس واقعہ کی پیش گوئی صدیوں

پہلے اس شعر میں فرمادی تھی ؂

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی
بیاد آر حریفاں بادہ پیما را

اللہ تعالیٰ نے ان کو ذہانت اور حافظہ کی غیر معمولی دولت اور قوت اظہار و بیان کی بے مثال فراوانی عنایت فرمائی ہے۔ اور یہی ان کے خداداد فضل و کمال کے ایوان کے ستون ہیں۔ ان کو جو کچھ ملا ہے وہ سراسر عطاء الوہیت ہے ؂

ایں سعادت بزور بازو نیست

سید صاحب کو اپنے ماضی کی دوستانہ محفلوں کا احساس تھا مولانا انہیں صدیق عزیز لکھتے رہے اور وہی تاثر و تصور اس تبصرہ میں ابل آیا تھا۔ مولانا امین احسن اصلاحی راوی تھے کہ سید صاحب نے کئی دفعہ مولانا کو دار المصنفین میں بلانے کی سعی کی۔ مولانا نے وعدہ کیا سید صاحب نے سج دھج سے انتظام کیا لیکن عین موقع پر تار آجاتا رہا کہ مولانا فلاں وجہ سے نہیں آرہے۔ سید صاحب مولانا سے کچھ اور توقعات بھی رکھتے تھے لیکن مولانا ان توقعات میں نہ شریک ہوئے اور نہ کبھی سید صاحب کے علمی کارناموں پر قلم اٹھایا۔ حتیٰ کہ حیات شبلی کے سلسلہ میں بھی تعاون نہ کیا۔ اور اس پر کوئی رائے دینے سے بھی گریز کیا۔ یہی چھوٹی چھوٹی رنجشیں مولانا اشرف علی تھانویؒ کی حلقہ بگوشی کے بعد عبد الماجد دریا آبادی کے پہانے بغض کی وساطت سے سید صاحب کو اس سطح پر لے آئیں کہ وہ مولانا کی سیرت کو یورپ کی پراپاگنڈا روایت کے مطابق اتھل پتھل کرنے پر تل گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ علامہ شبلی شاعرانہ طبیعت رکھتے تھے اور عطیہ فیضی کے نام ان کے خطوط میں انگشت نمائی کا سروسامان ہے۔ خود مولانا کے نام علامہ شبلی کا خط محررہ ۵ دسمبر ۱۹۰۹ء کندہ قصاب سے باہر کی چیز نہ تھا۔ علامہ نے مولانا کو لکھا:

"بے شبہ مری خواہش ہے کہ چند روز دنیا سے الگ بسر کروں۔ ایسی حالت میں ایک تصنیف بھی انجام پائے۔ لیکن متصل دن رات تو وحشت کدہ میں بسر نہیں ہوسکتے۔ شیعوں کے عملی فلسفہ کی کوئی صورت پیدا ہو تو البتہ ممکن ہے۔"

اور عملی فلسفہ کیا ہے؟ راقم نے خود سید معین الدین ندوی ناظم دار المصنفین سے اس بارے میں استفسار کیا تو ان کا جواب تھا "آپ جانتے ہیں، صرف نظر کیجئے۔ لیکن سید صاحب نے اس کی اشاعت

کے وقت صرف نظر نہ کیا۔ اور سہو ہو گیا۔ علامہ اقبالؒ بھی ابتدائی عمر میں اسی کوچہ سے نکلے تھے جس کوچہ کی سیاحت کے مفروضہ پر سید صاحب نے مولانا کو معاف نہ کیا۔ لیکن انہوں نے سید صاحب کو استاذ الکل لکھا اور سید صاحب کے محبوب و مطاع ہو گئے۔ عبدالرزاق کانپوری نے "یاد ایام" میں علامہ شبلی کے تذکرے میں بعض بے تکلف باتیں لکھیں۔ مثلاً یہ کہ وہ خوبصورت چہروں سے اُنس رکھتے تھے۔ انہیں کالی کلوٹی صورت گوارا ہی نہ تھی۔ ایک دفعہ ان کا خوبرو ذاتی ملازم چند دن چھٹی پر گیا تو عارضی طور پر ایک دوسرا نوکر دے گیا۔ وہ کالا بھجنگ تھا۔ علامہ نے اس سے کہا: "تمہارے اندر آنے کی ضرورت نہیں تم دروازے پر کھانا رکھ کر کھٹکھٹا دیا کرو۔ میں خود اٹھا لیا کروں گا۔"

سید صاحب نے عبدالرزاق کانپوری کو "یاد ایام" کا مسودہ واپس کرتے ہوئے ذیل کا خط لکھا۔

"مکرم!

السلام علیکم۔ یاد ایام کی اصل اور کاپیاں واپس مرسل ہیں۔ میں دوبارہ عرض کرتا ہوں کہ آپ نے مولانا شبلی کے حال میں نہایت بے تکلفی سے بعض واقعات نقل کیے ہیں۔ جو احباب کے لیے اور وہ بھی آغاز شباب کے لیے ہوتے ہیں۔ دور جوانی اخذ چنانکہ تو دانی۔ مگر اب وہ اواخر عمر میں ایک مقدس کام کے بانی ہوئے تو ان کا تذکرہ کرنا اور لکھنا بالکل نامناسب ہے۔ گناہ کا ستر چاہیے۔ نہ کہ تشہیر۔ اس لیے از راہ عنایت بلکہ اس دوستی کے واسطے سے جو آپ کو مولانا مرحوم سے تھی یہ عرض کرتا ہوں کہ ان واقعات پر پردہ ڈالیے تاکہ ان کا نیک نام ضائع نہ ہو اور یوں بھی عیب و گناہ کا برملا اظہار اور فخر مسلمان کے لیے زیبا نہیں۔

والسلام

سید سلیمان

کاش! سید صاحب اپنے اس خط ہی کو نظیر بنا لیتے لیکن انہوں نے مولانا کے متعلق فرضی روایتوں کا برملا اظہار کیا۔ اور اس پر فخر کیا انہیں یاد نہ رہا کہ یہ چیزیں مسلمان کے لیے زیبا نہیں۔ ان راویوں پر اعتماد کرنا جو عمر کے آخری دن تک لہو و لعب میں رہے ہوں۔ سید صاحب علیہ الرحمۃ کی شان سے فروتر تھا۔

میں سیاہ کو سفید کہنے سے انکار کرتا ہوں

ابو الکلام آزاد ——

© OneUrdu.com